وَ قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ)

(جامعہ کا پیغام طلبائے مدارس اسلامیہ کے نام)

مجلّہ

شاہراہِ علم

(محرم الحرام - تا - جمادی الاخریٰ ۱۴۳۰ھ)

"تعارف العلوم"

مدیر
ابو حمزہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

اس امت نے انسانوں کو کتنے علوم مدون کر کے فراہم کیے، اس سلسلے میں امام رازیؒ اپنی کتاب "الانوار فی حقائق الاسرار" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "امتِ محمدیہ ﷺ کے مدون کردہ علوم کی تعداد ۶۰ ر ہے، امام عبدالرحمٰن بن محمد بسطامیؒ کی رائے کے مطابق ۱۰۰ ر علوم ہیں، شیخ عصام الدین احمد ابن مصطفیٰ طاش کبریٰؒ زادہ کی تحقیق کے مطابق ۵۰۰ ر ہیں، اور بعض نے اس سے بھی کئی گنا زیادہ شمار کرائے، کسی کو اگر یہ شبہ ہو کہ یہ سب مبالغہ آرائی ہے، تو اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، یا تو تعصب یا تاریخ سے عدم واقفیت، کیوں کہ یہ بات بالکل عیاں اور واضح ہے، آپ "علمائے اسلام" کے تصنیفی، تالیفی، اور علمی کارناموں کو اٹھا کر پڑھئے، بات سمجھ میں آجائے گی۔

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر

وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ)

شاہراہِ علم

''تعارف العلوم''

(جامعہ کا پیغام طلبائے مدارس اسلامیہ کے نام)

زیر سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہٗ العالی

مدیر: ابوحمزہ　　نائب مدیر: ابوعبدالفتاح

جلد	:	۶
شمارہ نمبر	:	۵۳۔تا۔۵۸
ماہ	:	محرم الحرام-تا-جمادی الاخری ۱۴۳۰ھ
زرتعاون	:	۱۰۰/روپیہ

ترسیل زر کا پتہ

''دفترِ شاہراہِ علم''

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر-۴۲۵۴۱۵

فہرست مضامین

۱) اداریہ	ابوحمزہ وستانوی	۵
۲) علمِ قراءت	قاری حسین احمد صاحب قاسمی معروفی	۲۴
۳) علم تفسیر	مولانا ریاض صاحب اشاعتی	۴۹
۴) علوم قرآن کی اہمیت وافادیت	مولانا افتخار احمد قاسمی بستوی	۵۵
۵) علوم حدیث اور محدثین کی گراں قدر خدمات	مولانا عبدالرحمن ملی ندوی	۶۶
۶) علم اسماء الرجال-ایک تعارف	مولانا رضوان الدین صاحب معروفی	۷۸
۷) علم توحید	قاری مختار چارنیری	۹۹
۸) مقاصدِ شریعت/موجودہ ضرورت	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	۱۰۴
۹) علم فقہ	مولانا جاوید صاحب اشاعتی	۱۲۲
۱۰) قواعد فقہ-ایک تعارف	مفتی محمد جعفر صاحب	۱۳۰
۱۱) تدوین فقہ واصول فقہ	مفتی عبدالقیوم صاحب مالیگاؤں	۱۴۹
۱۲) علم الافتاء ایک تعارف	مفتی محمد جعفر صاحب	۱۵۶
۱۳) علم الخلاف	قاری انصار صاحب مرواسی	۱۸۵
۱۴) علم سیرت	مولانا عبدالمتین کانڑگاؤں	۱۹۱
۱۵) فن تاریخ میں مسلمانوں کا کردار	عبدالستار الاعظمی	۱۹۸
۱۶) علم تصوف	مولانا افتخار احمد صاحب قاسمی سمستی پوری	۲۰۵
۱۷) الغزو الفکری	مولانا حذیفہ وستانوی	۲۱۰
۱۸) علم تعبیر	مولانا عبدالستار الاعظمی	۲۷۱
۱۹) علم نحو	مولانا عبدالعظیم صاحب	۲۷۷
۲۰) فن صرف	مولانا مرشد صاحب	۲۸۶

۲۱) علم اللغۃ کی اہمیت	مفتی محمد اشفاق خان، عادل آبادی	۲۹۷
۲۲) عربی زبان وادب اپنے جامع ومانع تعارف کے آئینہ میں/ ابوفیضان زاہد بن عبدالخالق الندوی		۳۰۸
۲۳) زبان وادب اور اردو، منظر وپس منظر	مولانا افتخار احمد قاسمی بستی پوری	۳۱۸
۲۴) شعروشاعری اسلام کی نظر میں	مولانا ولی اللہ ولی قاسمی بستوی	۳۳۶
۲۵) علمِ بلاغت	رشید الدین المعروف الاعظمی	۳۴۲
۲۶) علم منطق	ابوخدیجہ اشاعتی	۳۴۷
۲۷) علم حساب، علم فرائض: ایک مطالعہ اور ایک جائزہ	مولانا رفیق احمد صاحب	۳۵۲
۲۸) علم جغرافیا	توصیف خان غازی پوری	۳۵۷
۲۹) الفلسفۃ (فیہ مافیہ)	ڈاکٹر فخر الاسلام الہ آبادی	۳۶۰
۳۰) علم ہیئت	ڈاکٹر فخر الاسلام الہ آبادی	۳۸۹
۳۱) دنیا کے باطل مذاہب: ایک تعارف ایک جائزہ	مولانا افتخار صاحب قاسمی بستوی	۴۱۰
۳۲) باطل فرقوں کی ریشہ دوانیاں اور ہماری ذمے داریاں/مولانا افتخار احمد قاسمی بستوی		۴۳۱
۳۳) تعارف علم طب نبوی	ابوفیضان زاہد الندوی	۴۶۰
۳۴) تقریر ضرورت اہمیت تعارف اور اسلوب	مولانا حذیفہ وستانوی	۴۶۹
۳۵) تحریر وقلم: اہمیت ضرورت اسلوب	مولانا حذیفہ وستانوی	۴۹۵
۳۶) تحسین خط اور رموز اوقاف	مولانا افتخار احمد قاسمی بستوی	۵۱۹
۳۷) فن خط	مولانا عبدالرحیم زاہد القاسمی	۵۲۷
۳۸) اسلام سرمایہ داریت واشتراکیت کے درمیان تقابل/ابوحمزہ وستانوی		۵۳۴
۳۹) سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ بحران-اسباب اور حل/مولانا عیسیٰ منصوری		۵۴۲
۴۰) نذرانہ شاہراہِ علم	مولانا ولی اللہ ولی قاسمی بستوی	۵۵۱

کمپوزنگ: طلباء جامعہ کمپیوٹر خصوصا اویس پشور، سیٹنگ: محمد مہر علی قاسمی (دھنباد، جھارکھنڈ)

''حمد''

(میں تو اس قابل نہ تھا)

نتیجۂ فکر: ''ولی اللہ ولی قاسمی بستوی''

''استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر''

حمد ہے تیری خدایا، میں تو اس قابل نہ تھا　　خانۂ کعبہ دکھایا، میں تو اس قابل نہ تھا

جلوۂ زیبا دکھایا، میں تو اس قابل نہ تھا　　اپنا پروانہ بنایا، میں تو اس قابل نہ تھا

ذکر، الا اللہ کا ہونٹوں پہ ہے شام و سحر　　میرے دل کو جگمگایا، میں تو اس قابل نہ تھا

تشنگی حد سے بڑھی تھی، تو نے آسودہ کیا　　کاسۂ زمزم پلایا، میں تو اس قابل نہ تھا

بارشِ رحمت سے تو نے دل کو ٹھنڈا کر دیا　　اپنا خود مہماں بنایا، میں تو اس قابل نہ تھا

میں تو اک بھٹکا ہوا، آہو تھا تجھ سے دور تھا　　مجھ کو اپنے در بلایا، میں تو اس قابل نہ تھا

تیرے فضلِ خاص سے مجھ کو میسّر ہو گیا　　　　گنبدِ خضراء کا سایہ پایا، میں تو اس قابل نہ تھا

روضۂ اطہر پہ آیا ، اور جالی چوم کر　　　　نعت کا نغمہ سنایا ، میں تو اس قابل نہ تھا

رحمۃ للعالمیں کے در پہ آ کر اے وَلیؔ　　　　حال ، دل کا کہہ سنایا ، میں تو اس قابل نہ تھا

یہ حمد پاک، بتاریخ ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰ دسمبر ۲۰۰۸ء بروز سنیچر بوقت ۱۱ بج کر ۱۵ منٹ رات، بمقام مسجد حرام، باب العمرہ، کعبۂ مقدسہ کے روبرو کہی گئی۔ (ولی بستوی)

اداریہ:

تعارفِ علومِ اسلامیہ: ضرورت، اہمیت

ابوحمزہ دوستانوی

اللہ رب العزت نے انسان کو اپنی قدرت کاملہ سے بڑا عجیب اور حیرت انگیز بنایا، اور دیگر حیوانات کے مقابلے میں اس کو ہر چیز، امتیازی اور عمدہ سے عمدہ صورت میں عطا کی، اس کا ظاہر بڑا جان دار و شان دار، خوب صورت اور بالکل مناسب بنایا، جس کو ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْم'' کے ذریعے بیان کر دیا کہ ہم نے انسان کو بہترین ڈھانچے میں وجود بخشا، اس کی ہر چیز موافق اور مناسب جگہ پر رکھی، جس کی وجہ سے وہ ہر کام بغیر کسی مشقت اور تکلیف کے، آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ دیگر مخلوقات کی طرح اُسے تکلف کی ضرورت نہیں، اسی لیے انسان آج دنیا میں ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں کوئی دوسری مخلوق انسان کی طرح ترقی نہ کر سکی؟

اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ جہاں اللہ نے انسان کو علم مطلق محدود، اور عقل مطلق محدود سے مالا مال کیا، وہیں اسے مناسب جسم اور اعضا سے بھی سرفراز کیا؛ اسی لیے قرآن کہتا ہے: ''وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَ حَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ'' ہم نے انسان کو مکرم بنایا، اس طور پر کہ اس کے لیے کائنات کو مسخر کر دیا، اور اسے عقل بھی دی کہ وہ طیبات کو پسند کرتا ہے، وہ بگڑے اور سڑے ہوئے کے درمیان تمیز آسانی سے کر لیتا ہے، یہاں تک کہ پاک اور ناپاک میں بھی امتیاز کر لیتا ہے، بل کہ وہ ادنیٰ اور اعلیٰ کا بھی معیار قائم کر لیتا ہے، یہی دنیا

میں کرامت انسانی ہے۔

مگر وہ ''ظاہر پرست'' ہو کر اسی کو اپنی صلاحیتوں کا مرکز بنا دے، یہ درست نہیں، کیوں کہ یہ تمام چیزیں دینے کے باوجود، ہم نے اس کے لیے موت کو مقدر کر رکھا ہے، تاکہ وہ صرف ظاہر ہی کا ہو کر نہ رہ جائے، بل کہ باطن پر بھی پوری توجہ دے، کیوں کہ آخرت کی بزرگی اور کامیابی کا مدار ''ظاہریت'' پر نہیں، بل کہ ''باطنیت'' پر ہے، کیوں کہ اللہ کا اعلان ہے: ''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ'' گویا اگر تم صرف دنیا میں کرامت، عزت، اور بزرگی چاہتے ہو، تو وہ تمہیں ''ظاہریت'' پر محنت کرنے سے مل جائے گی، نئی نئی ایجادات واختراعات سے حاصل ہو جائے گی۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم سورۂ کہف میں بیان کردہ اس گمراہ شخص کی مانند قیاس کرنے لگو، جس نے کہا تھا: ''مَا اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ ھٰذِہٖٓ اَبَدًا وَّ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْھَا مُنْقَلَبًا'' اس نے مال واولاد کی کثرت دیکھ کر یہ کہا تھا کہ: میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ مال واسباب ہمیشہ رہیں گے، لیکن ساتھ ساتھ میں یہ بھی اعتقاد رکھتا ہوں کہ قیامت قائم نہ ہوگی اور اگر قیامت قائم ہو بھی گئی اور مجھے پروردگار عالم کے حضور حاضر کر دیا گیا، تو وہاں بھی بہتری ہی ملے گی؛ گویا اس نے اپنی دنیا کی ''کرامت'' (شرافت ووجاہت) کو آخرت پر قیاس کیا کہ جب اللہ نے ہمیں یہاں یہ سب کچھ دیا ہے، تو اس کا مطلب وہ ہم سے راضی ہے، تو آخرت میں رضامندی کی وجہ سے اس سے بہتر عطا کرے گا، مگر یہ اس کی خام خیالی اور قیاس مع الفارق تھا۔

قرآن کریم نے ایسے ہی لوگوں کی اصلاح کے لیے اس واقعے کو بیان کیا، جو یا تو آخرت کے منکر ہیں، یا بالفرض والمحال قیامِ آخرت کی صورت میں ''کرامتِ دنیوی'' کو ''کرامتِ اخروی'' پر قیاس کرتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم نے اس کی اصلاح کرنے والے کا قول بھی بیان کیا: ''ولو لا اذ دخلت جنتک قلت ما شاء اللّٰہ لا قوۃ الا باللّٰہ'' یعنی یہ جو اپنے اسباب دنیا پر شیخی بگھار رہا ہے، صحیح نہیں ہے۔ بل کہ تو ان اسباب دنیا کے ملنے پر اللہ کا شکر بجا لا کر یہ کہتا، واقعتاً اس میں میرا کمال نہیں بل کہ سب کرنے اور دھرنے والی ذات تو اللہ کی ہے۔

گویا قرآن نے اپنا بالکل معتدل موقف واضح کیا کہ ''دنیوی کرامت'' محض اپنی ذات پر اعتماد کی صورت میں بے سود ہے، مگر یہی دنیا ملے اور پھر اس پر بھی اللہ ہی کا شکر بجا لائے اور اس کا انعام اسے تصور کرے، اللہ ہی کے کہنے کے مطابق اس میں تصرف کرے، تو یہی دنیوی کرامت آخرت کی کامیابی کا سبب بن سکتی ہے۔ گویا اسلام یہ کہنا چاہتا ہے، کہ ہم ''رہبانیت'' کے قائل نہیں، بل کہ تم جس طرح ''زھد فی الدنیا'' سے اللہ تک پہنچ سکتے ہو، بس بالکل اسی طرح ''انفاق فی سبیل اللہ'' سے بھی اللہ تک پہنچ سکتے ہو، لہٰذا اسلام ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا، مگر آخرت اور اللہ سے غافل ہو کر دنیا میں منہمک ہونے سے بھی روکتا ہے؛ ہاں! اگر کوئی شخص صحابہ کی طرح آخرت اور اللہ کو پیشِ نظر رکھ کر دنیا میں مشغول ہوتا ہے، تو یہ بھی محمود اور امرِ مستحسن ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''رجال لا تلھیھم تجارۃ و لا بیع عن ذکر اللّٰہ'' کہ صحابہ، اُن کی تجارت اور بیع یعنی دنیوی مشغولیت انھیں آخرت سے بیزار نہیں ہونے دیتی تھی۔

قرآن کریم نے ''کَرَّمْنَا'' اور ''اَکْرَمَکُمْ'' کہا، ''دنیوی کرامت'' تو بنی نوع انسانی کو تھوڑی سی محنت کرنے

سے دنیا میں بھی حاصل ہوجاتی ہے، مگر حقیقی بلند ترین کرامت اور بزرگی محض باطن کی اصلاح ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔
اسی لیے قرآن نے کہا: ''ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم'' کہ اللہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو، اور ''دنیوی کرامت'' بھی اللہ ہی دینے والا ہے۔

گویا آخرت کی کامیابی کا مدار نہ تو کثرتِ دنیا ہے، نہ کثرتِ علم، نہ کثرتِ جاہ ہے، نہ کثرتِ اولاد، نہ کثرتِ مقبولیت ہے، نہ کثرتِ حسن، نہ کثرتِ طاقت ہے اور نہ کثرتِ عقل، بل کہ صرف اور صرف کثرتِ تقویٰ ہے، جو جتنا متقی ہوگا، کل قیامت کے دن اللہ کا اتنا ہی قریب ہوگا، اور عند اللہ اتنا ہی معزز و مکرم ہوگا، مگر تقویٰ کا مفہوم یہ بھی نہیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف کسی غار میں عبادت کے لیے جاں گزیں ہوکر، دنیا سے کنارہ کش ہوجائے گا، بل کہ تقویٰ لوگوں کے درمیان رہ کر بھی حاصل ہوسکتا ہے، اسی لیے ایک بزرگ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے، کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص ''کعبۃ اللہ'' سے چمٹ کر، گڑگڑا کر رو رہا ہے، مگر کہا کہ اس کا قلب اللہ سے غافل ہے، اور ایک شخص بازار میں اپنی دوکان پر تجارت میں مشغول ہے، مگر کہا کہ اس کا قلب اللہ کی طرف متوجہ ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ ہر ایسی چیز جو اللہ سے غافل کردے وہ ''دنیا'' کہلاتی ہے۔ اس میں مست رہنے والا ''دنیادار'' کہلائے گا۔ اور ہر ایسی چیز جو اللہ سے تعلق جوڑے، اللہ کی طرف میلان بڑھائے وہ ''آخرت'' کہلائے گی۔ چاہے وہ کتنی ہی زیب و زینت کی شکل میں ہو۔ (تھانویؒ)

اسی لیے علما نے تقویٰ کے مختلف درجات بیان کیے ہیں، علما فرماتے ہیں: تقوے کا ادنیٰ درجہ تو یہ کہ آدمی کفر اور شرک سے اجتناب کرے، اسی لیے کہا گیا کہ ہر کلمہ گو متقی ہوتا ہے، یعنی کچھ نہ کچھ درجہ اللہ کے خوف کا اس میں پایا جاتا ہے، اسی لیے تو وہ کفر اور شرک سے اجتناب کرتا ہے؛ قرآن کریم کے بالکل آغاز میں جو کہا گیا: ''ھدیً للمتقین'' یہ قرآن متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں: ''ای للمسلمین'' یعنی مسلمانوں کے لیے، کیوں کہ ہر مسلمان اور مؤمن متقی ہوتا ہے؛ گویا اس آیت میں اسی تقویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ تقوے کا دوسرا درجہ، بدعات و خرافات سے اجتناب۔ تقوے کا تیسرا درجہ، گناہ کبیرہ سے اجتناب۔ تقوے کا چوتھا درجہ، صغائر سے اجتناب۔ تقوے کا پانچواں درجہ، مکروہات سے اجتناب۔ اور تقویٰ کا اعلیٰ ترین درجہ مباحات سے اجتناب۔

یہ بات بھی ذہن نشین ہوجانی چاہیے کہ ہر چیز کا تقویٰ الگ الگ ہوتا ہے، مثلاً: نماز کا تقویٰ، وساوس سے بچ کر خشوع و خضوع کے ساتھ اسے ادا کرنا، روزے کا تقویٰ، کھانے پینے وغیرہ کے ساتھ ساتھ بدنظری، چغل خوری، جھوٹ، ظلم و ایذائے بشر وغیرہ سے اجتناب کرنا، یہ روزے کا تقویٰ کہا جائے گا۔ طالب علم کا تقویٰ یہ ہے کہ جو کچھ علم حاصل کرے، اس پر عمل کرتے ہوئے ہر طرح کے گناہ اور برائی سے پرہیز کرے، ساتھ ہی ساتھ سبق میں حاضری دے، وغیرہ، تاجر کا تقویٰ، دھوکہ دہی، جھوٹی قسم، عیب پوشی سے احتراز کرنا ہے۔

اللہ ہمیں ''کرامتِ دنیاوی و اخروی'' دونوں سے نواز دے۔ آمین یا رب العالمین!

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ بزرگی، کرامت اور عزت حاصل ہوتی ہے، مختلف مقامات پر مختلف اسباب

وذرائع سے۔دنیوی عزت اور کرامت حاصل ہوتی ہے محض ''ظاہریت پرستی'' سے، لیکن اخروی کرامت اور عزت حاصل ہوتی ہے ''باطن'' کو سنوارنے سے۔اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اچھے پیرائے میں بیان کیا ہے: ''إن اللّٰہ لا ینظر إلی صورکم ولا إلی اجسامکم ولکن ینظر إلی قلوبکم واعمالکم '' کہ اللہ تمہاری شکل وصورت اور جسم یعنی ظاہر کو نہیں دیکھتا، اللہ یہ دیکھتا ہے کہ تمہارا دل اور تمہارا عمل کیسا ہے؟ یعنی باطن کو دیکھتا ہے۔مگر قربان جایئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات کی جامعیت پر کہ صرف ''إلی قلوبکم '' پر اکتفا نہیں کیا، بل کہ ''إلی اعمالکم '' کو بھی ذکر کیا، کہیں کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ میرا باطن بہت صاف ستھرا ہے، چاہے ظاہر کیسا ہی کیوں نہ ہو، اور سینے کی طرف اشارہ کر کے کہے: ''التقوی ھاھنا '' جیسا عصر حاضر میں یہ بات لوگوں میں عام ہے، کہ لباس غیر شرعی، چہرہ غیر شرعی، اطوار وکردار غیر شرعی، اور اگر کوئی دینی خیر خواہی کے طور پر یہ کہہ دے کہ برادرم! ذرا اسلامی وضع قطع کی طرف توجہ دیں، تو کہتے ہیں: ''التقوی ھاھنا '' حالاں کہ حدیث پاک میں مذکور اعمال کا مقصد غالباً یہی ہے۔

تقویٰ کا تعلق اگر چہ باطن سے ہے، مگر باطن میں جب تقویٰ ہوگا، تو خود بہ خود اس کا ظہور ظاہر پر ہوگا، اور ظاہر اور باطن یکساں ہو جائیں گے، ورنہ دعویٰ برائے دعویٰ ہوگا، حقیقت سے اس کا کوئی سروکار نہ ہوگا، قرآن کریم نے صاف کہہ دیا ''ولا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن تقی '' تم خود اپنی صفائی اور پاکی بیان مت کرو، اللہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ کس میں کتنا تقویٰ ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان جو کچھ اللہ کے لیے کرے، تو لوگوں کے سامنے وہ تقویٰ، طہارت کا دعویٰ نہ کرے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ میں جس کے لیے عمل کر رہا ہوں، وہ اسمِ تفضیل کے ساتھ بیان کرتا ہے'اعلم' جانتا ہی نہیں خوب اچھی طرح جانتا ہے؛ تو اب وہ باطن اور ظاہر دونوں پر محنت کرے گا، اصل کامیابی یعنی دنیا اور آخرت دونوں جہان کی عزت، کرامت اور بزرگی، اسی طرح حاصل ہوگی، جیسے کہ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اولیائے کرام رحمہم اللہ، فقہائے عظام قدس اللہ اسرارہم وبرد اللہ مضاجعہم، اور محدثینؒ وغیرہ کو حاصل ہوئی۔

اسلام میں ظاہر کی بھی پوری رعایت کرنے کو کہا گیا ہے، اسی لیے ''فاسق'' کی اصطلاح مستعمل ہے، اور باطن کی بھی خوب رعایت کی گئی، اسی لیے ''منافق'' کی اصطلاح وضع کی گئی، یعنی اگر ظاہر اسلامی تعلیمات کے برخلاف ہو، تو فسق ہے اور اگر ظاہر تو موافق ہو، مگر باطن اسلامی تعلیمات کا مخالف ہو، تو نفاق۔نتیجتاً ''ان اللّٰہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک '': یعنی شرک اور کفر کے علاوہ سب معاف ہونے کی گنجائش ہے، مگر مشرک اور کافر کی مغفرت نہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ فسق مع الایمان یعنی دل میں ایمان ہو، مگر ظاہر اسلامی نہ ہو، تو جہنم سے خلاصی ہو کر جنت میں دخول ممکن ہے، مگر نفاق کے بارے میں کہا گیا: ''ان المنافقین فی الدرک الأسفل من النار '' گویا نفاق کی سزا سخت اور دائمی ہوگی۔

تو معلوم ہوا کہ اگر ظاہر میں کمی رہے گی، تو برداشت ہو سکے گی، باطن کی خرابی نا قابل برداشت ہوگی، اور اگر دونوں یکساں ہوں، اور ایمان سے معمور ہو، تو مسلم صالح اور مؤمن صالح جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے دعا کی ''توفنی

مسلما و الحقنی بالصالحین " کہ اسلام پر زندہ رکھ کر اور اسی پر موت دے، اپنی فرماں برداری پر اور وفات کے بعد صالحین کے زمرے میں شامل کردے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی "رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی و علی والدی و ان اعمل صالحا ترضاہ و ادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین " کہ اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے اس بات کی کہ میں تیرا شکر ادا کروں، اس بات پر کہ تو نے مجھ پر انعام کیا اور میرے والدین پر بھی، اور ایسا عمل صالح کرنے کی توفیق دے کہ جس سے تو راضی ہو جائے، اور اپنی رحمت خاصہ سے مجھے اپنے نیک و صالح بندوں میں شامل فرما!

حضرات انبیائے کرامؑ میں دو ایسے جلیل القدر انبیا دعا کر رہے ہیں، جنہیں اللہ رب العزت نے دنیوی کرامت میں سب سے بڑی کرامت اور عزت یعنی سلطنت اور بادشاہت عطا کر رکھی تھی، تو وہ "ظاہریت پرستی" کے دلدادہ نہ ہونے کی وجہ سے اسی پر رضامند نہیں ہوئے، بل کہ دعا کی کہ اے اللہ! آخرت کی عزت سے بھی سرفراز فرما، اسی طرح ابو الانبیا سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے بھی دعا کی: "رب ھب لی حکما و الحقنی بالصالحین " یعنی اے میرے پروردگار! مجھے نبوت (یا علم) عطا کردے، ساتھ ہی ساتھ صالحین میں شمار فرما، یعنی آخرت کی کرامت عطا فرما، اور وہ صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے، جب کہ ایمان اسلام اور عمل صالح ہو، ورنہ اُخروی عزت کا تصور امر مشکل ہے، لہٰذا ہمیں صرف "ظاہریت پرستی" پر اکتفا نہ کرتے ہوئے (جیسا کہ اہل مغرب نے کیا)، اپنے باطن کی اصلاح بھی کرنا ضروری ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جب کہ ہمارے پاس علم دین ہو، اس کے بغیر ہم صحیح معنی میں اس چیز کو نہیں سمجھ سکتے، دنیا میں جن لوگوں کو دنیوی عزت ملی، وہ اسی پر نازاں ہو کر رہ گئے، اور حضرت یوسفؑ، حضرت سلیمانؑ اور خود نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفی احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرامؓ کا حال یہ رہا ہے کہ وہ دنیوی عزت کے ملنے کے بعد، بل کہ پرواہ کیے بغیر، آخرت کی دائمی عزت کے حصول کے لیے دعا کرتے ہوئے، انتھک محنتیں کرتے رہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحابہؓ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہا "اعمقھم علما " علم کے اعتبار سے پوری امت میں سب سے زیادہ گہرائی کے حامل تھے، اسی وجہ سے عمل میں بھی پیش پیش تھے، لہٰذا ہم علم ہی پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں، علم کیا ہے؟ اسلام اور علم، انسان اور علم، ان دونوں میں کتنا تعلق ہے؟ علم کی تقسیم ہے یا نہیں؟ علمائے اسلام کی کیا خدمات ہیں؟ علوم اسلامیہ کی کتنی تعداد ہے؟ علم اور فن میں کیا فرق ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

علم اور فطرت انسانی:

علم اور انسان یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، جتنا انسان کو علم کی ضرورت ہے، اتنا کھانے اور پینے کی نہیں، کیوں کہ کھانا اور پینا یہ "ظاہریت" کے بقا کے لیے ہے، اور علم، باطنیت کی بقا اور اصلاح کے لیے ہے، اور باطن کی

اہمیت تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ کیسی زبردست ہے، اسی لیے اگر آپ تخلیق انسانی کے بعد کے واقعہ کو بغور پڑھیں، جس کو قرآن نے بیان کیا ہے، تو معلوم ہوگا کہ اللہ نے ہی انسان کو پیدا کرنے کے بعد، سب سے پہلے اس کی روحانی غذا کا ہی اہتمام کیا، اور بعد میں سکونت یعنی رہن سہن کا، اور اخیر میں ارشاد فرمایا: "وَکُلَا" یعنی کھانے پینے کا انتظام۔

مگر افسوس کہ جہاں زمانہ گذرنے سے انسان کے دوسرے اعمال میں بے ترتیبی واقع ہوئی، وہیں علم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، جہاں انسان نے دیگر اشیائے غیر مقصودہ کو مقصود بنایا، اور مقصود کو ترک کردیا، وہاں علم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، انسان نے اچھے کھانے پینے، اچھا رہن سہن اور اچھی بود و باش کو مقصدِ حیات سمجھ کر اپنی تمام کوششوں کو اس پر مرکوز کردیا، اور علم سے ناطہ توڑ دیا، یا کمزور کردیا، اس کو ترتیب میں آخری نمبر پر رکھ دیا، اور مادیت کا شکار ہوگیا، جس کے بھیانک نتائج اس وقت دنیا کے سامنے ہیں، کیوں کہ جب کوئی لُبّ لُباب اور مغز کو چھوڑ کر قشر یعنی چھلکے کے پیچھے لگ جاتا ہے، تو ظاہری بات ہے کچھ حاصل نہیں ہوتا، نہ مٹھاس، نہ کھٹاس، نہ لذت اور نہ کچھ اور، بل کہ کفِ افسوس ملنے کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں لگتا، بس بالکل ہو بہو اسی طرح جب "علمِ دین" کو چھوڑ کر "مادیت" کو ہدفِ زیست بنایا، تو ایسا ہی ہوتا ہے، بل کہ کل قیامت کے دن افسوس اور حسرت، اس کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا، اور انسان کہے گا: "یا حسرتا علی ما فرطت فی جنب اللہ و ان کنت لمن الساخرین" ہائے افسوس! (مادیت میں لگ کر مقصدِ حیات سے غافل رہنے پر) اس چیز پر جو اللہ کے پہلو میں گنوادی (یعنی وقت کو علم اور عبادت میں نہ لگا کر ضائع کیا) کبھی کہے گا: "لو ان لنا کرۃ فنکون من المحسنین" مگر سب بے سود ثابت ہوگا، کوئی بھی حسرت کام نہ آئے گی۔

عزیزو! ایسی نازک گھڑی سے پہلے تیار ہوجایئے، اور غفلت سے بیدار ہو کر ذرا ہوش کے ناخن لیجیے! ورنہ خسارہ ہی خسارہ ہاتھ آئے گا، اور ابد الآباد کے لیے مصیبت میں یعنی جہنم کے عذاب میں پھنس جائیں گے۔

علم اور اسلام:

اسلام کا نظریۂ علم، بالکل واضح ہے، اسلام نے اول یوم ہی سے علم کی ترغیب دی ہے، اور اس کے بے شمار فضائل اور مناقب بیان کیے ہیں، بل کہ اسے مقصدِ حیات اور عبادت کا لازمی عنصر قرار دیا ہے، سب سے پہلی وحی علم ہی کے بارے میں نازل ہوئی، کیوں کہ علم کے بغیر معرفتِ الٰہی ممکن نہیں، اور معرفتِ الٰہی کے بغیر اس کی عبادت صحیح معنوں میں متصور نہیں، اور عبادت کے بغیر زندگی نہیں، گویا زندگی کو بامقصد گذارنے کے لیے علم زینہ اور وسیلہ ہے، اور بغیر وسیلے اور زینے کے انسان کا بلندی پر چڑھنا ممکن نہیں، اسی طرح اللہ تک پہنچنا بھی بغیر علم کے ممکن نہیں، اسی لیے بعض مفسرین نے: "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کی تفسیر "الا لیعلمون" سے کی ہے، یعنی پہلے "یعلمون" تب جا کر "یعبدون" "علی وجہ المطلوب" ادا ہوگا، ورنہ بغیر علم کے "یعبدون" کا تصور کما حقہٗ ناممکن ہے، جیسے وضو کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی، آگ کے بغیر لذیذ کھانا نہیں پک سکتا، بالکل اسی طرح علم کے بغیر لذیذ یعنی صحیح عبادت نہیں ہوسکتی، اسی

لیے غارِ حرا کی پہلی وحی میں ''اِقرأ باسم ربک'' کہا ''اعبد ربک'' نہیں کہا

اس سے معلوم ہوا کہ علم وسیلۂ عبادت ہے بل کہ امام ابن شہاب زہریؒ تو کہا کرتے تھے، کہ عبادتوں میں سب سے افضل عبادت ''تحصیلِ علم'' ہے، اب یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی علم اور اسلام کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسلام نے دنیا میں بے شمار انقلاب پیدا کیے، اس میں سے ایک علمی انقلاب بھی ہے، اسی لیے اسلام نے معاملات اور معاشرت کے احکام پر اکتفا نہیں کیا، بل کہ ان علوم شرعیہ کے ساتھ ساتھ علوم کونیہ، علوم تجربیہ سے بھی بحث کی، اور ہر طرح کے علم کو نیّت کی درستگی کی صورت میں مفید اور باعث اجر و ثواب گردانا، بل کہ کسی کو فرض کفایہ، کسی کو فرض عین، کسی کو مستحب اور کسی کو مندوب قرار دیا۔

اسلام نے اہلِ علم کو سب سے افضل قرار دیا قرآن نے اعلان کیا: ''انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء''، کہیں ''قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون''، کہیں قلم کی قسم کھا کر کتابت علم کی طرف اہتمام کا اشارہ دیا: ''ن والقلم وما یسطرون''، کہیں تفکر اور تدبر کی دعوت دی اور کہا: ''ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصر ھل تری من فطور''، کہیں کہا: ''أفلا یتدبرون القرآن''، کبھی حقائق کو معلوم کرنے کے لیے ''سیروا فی الارض فانظروا'' کہہ کر حوصلہ افزائی کی، کہیں خود اپنی خلقت پر غور و فکر کی دعوت دی: ''وفی انفسکم أفلا تبصرون'' کہا، تم خود اپنی ذات پر غور و فکر نہیں کرتے، کہیں چاند اور سورج کی منزلوں، رات و دن کے آنے جانے کو معجزۂ الٰہی کے طور پر بیان کیا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے ''علوم'' کے دروازے کھول کر رکھ دیے اور مسلمانوں کو اس میں غوطہ زنی کی دعوت دی، اور بابِ علم میں مسابقہ آرائی پر آمادہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ''امت مسلمہ'' نے اس باب میں بے مثال کردار ادا کیا، اور ہر فن میں اولیت کا اسے شرف حاصل ہوئے، تاریخ نے اپنے صفحات پر نقش کرلیا کہ روئے زمین پر تخلیق آدم سے لے کر اب تک اگر پڑھنے لکھنے کا ریکارڈ کسی کے نام ہے، تو وہ اسی امت محمدیہ کے نام ہے جس نے علم کی تحصیل، تالیف و تصنیف، تدوین و تحقیق، جدت اور ابتکار، اور دقت و عمق میں جو عظیم کردار ادا کیا، کوئی نہ اس سے پہلے اس کا ہمسر ہوسکا اور نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔

آغوشِ اسلام میں اتنے علوم و فنون پلے بڑھے اور وجود میں آئے کہ اس کا احاطہ ناممکن ہے، آج دنیا میں جو بھی ظاہری و باطنی ترقی ہو رہی ہے وہ سب امتِ مسلمہ کے فیض بے مثال کا نتیجہ اور ثمرہ ہے، ان تمام علوم کی تخم ریزی اسلام اور اہلِ اسلام نے ہی کی ہے، اور چھان پھٹک کا صحیح حق اسی نے ادا کیا ہے (یعنی فلاسفۂ یونان، ہند، فارس وغیرہ نے اپنی کاوشوں میں جو ٹھوکریں کھائی تھیں، ان کی تحقیقات کا غائرانہ اور ناقدانہ مطالعہ کرکے اس کی نشاندہی کی) اللہ علمائے اسلام کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ آمین!

آج اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی، فلسفۂ ہند، فلسفۂ فارس، فلسفۂ روما کے دوش پر ہے، تو سراسر ناانصافی اور غلط بیانی ہے، اور تاریخِ حقائق میں تحریف ہے، اس لیے کہ اہلِ اسلام نے ان فلسفوں میں جو

غش اور کھوٹ تھی، اسے چھان کرمنقیٰ کیا، ''علم وحی'' کے بعد، جوکہ خالق و مالک نے الاخریٰ۱۴۲۳ھ ور وسیع علم سے عطا کیا تھا، ان عقلی علوم کی طرف التفات کی؟

انصاف پسندوں کو یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک علم پر محنت کر کے ''انسانوں'' کو صحیح رُخ پر لاکھڑا کیا، اسی کے روشن کئے ہوئے چراغوں سے آج دنیا روشنی حاصل کر رہی ہے، ''انسانیت'' کو اس بات پر مسلمانوں کا احسان مند ہونا چاہیے اور بجائے اس کے کہ وہ ان پر ظلم کرے انہیں مزید موقع دینا چاہیے، تا کہ ''مکار'' مغرب کی طرح علم کے نام پر دنیا ضلالت وگمراہی کی راہ سے ہٹ کر مدلل و مبرہن اسلام کو قبول کرلے، اگر واقعتاً ان میں ''علمیت پسندی'' اور ''جذبۂ معرفت'' ہے، کیوں کہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے اس کے بغیر کوئی چھٹکارہ ہی نہیں۔

کیا لوگوں کی عقلیں ماری گئی ہیں اور بینائی سلب ہوچکی ہے، اس بات کے سلسلہ میں کہ ''امتِ محمدیہ'' کے ہزاروں افراد نے اپنی قیمتی زندگیوں کو محض انسانیت کی نفع رسانی کی لیے صرف کردیا، یا اور ''اخرجت للناس'' کا حق ادا کردیا، جس کے نتیجہ میں کتابوں سے مکتبے کے مکتبے بھر گئے، آج ان کی کاوشوں کے عُشرِ عشیر کی طباعت کے بعد یہ حال ہے، حالاں کہ ابھی تو اس سے دس گنا کاوش مخطوطات کی صورت میں طباعت کی منتظر ہے، اور اعدائے اسلام نے دشمنی کی خاطر کتنے بڑے ذخیرے کو تو برباد کردیا، یا جلادیا، یا سمندروں کی نذر کردیا۔

علوم کی تعداد:

اس امت نے انسانوں کو کتنے علوم مدون کر کے فراہم کیے، اس سلسلے میں امام رازیؒ اپنی کتاب ''الأنوار فی حقائق الأسرار'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدون کردہ علوم کی تعداد ۶۰/ ہے، امام عبدالرحمن بن محمد بسطامیؒ کی رائے کے مطابق ۱۰۰/ علوم ہیں، شیخ عصام الدین احمد ابن مصطفی طاش کبریٰ زادہ کی تحقیق کے مطابق ۵۰۰/ ہیں، اور بعض نے اس سے بھی کئی گنا زیادہ شمار کرائے، کسی کو اگر یہ شبہ ہو کہ یہ سب مبالغہ آرائی ہے، تو اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، یا تو تعصب یا تاریخ سے عدمِ واقفیت، کیوں کہ یہ بات بالکل عیاں اور واضح ہے، آپ ''علمائے اسلام'' کے تصنیفی، تالیفی، اور علمی کارناموں کو اٹھا کر پڑھیے، بات سمجھ میں آجائے گی۔

اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اس مذہب نے علم کو دین کا ایک لازمی جز اور عضو قرار دے دیا، جس کے بغیر کسی کو چارۂ کار نہیں اور اعلان کیا: ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة''۔

عجیب وغریب تصانیف:

علمائے اسلام نے تصنیف و تالیف کے باب میں بڑے ہی حیرت انگیز شاہکار چھوڑے، مثلاً ''الشرف الوافی'' ایک عجیب کتاب ہے جس میں مصنف ایک ساتھ پانچ علوم کے بارے میں ایک ہی سطر میں بحث کرتے ہیں: علم فقہ، علم عروض، علم تاریخ، علم نحو، علم قوافی۔ اگر آپ دائیں سے شروع کریں، تو ایک علم، اور اگر بائیں سے تو دوسرا علم،

اگر درمیانی سطر سے شروع کریں تو تیسرا علم۔ اسی طرح پانچ علوم کو ایک صفحہ میں لکھتے ہیں، آج اس جیسا لکھنا تو در کنار، اس کتاب کا سمجھنا ہی بڑا مشکل ہے۔

اسی طرح شیخ محمد امین صدر الدین الشیر وانی رحمہ اللہ جو گیارھویں صدی کے مایۂ ناز عالم گذرے ہیں، انہوں نے تو ایک کتاب تصنیف کی جس میں ۵۳ علوم عقلیہ و نقلیہ کو سمیٹ دیا، جن کا نام "الفوائد الخاقانیہ الاحمدیۃ الخانیۃ" ہے، جس کو اس طرح مرتب کیا کہ احمد عثمانی خلیفہ کے لشکر کی طرح اس کا "مقدمہ" "میمنہ" "میسرہ" "قلب" ہے، مقدمے میں علم کی ماہیئت اور تقسیم کو بیان کیا، "قلب" میں علوم شرعیہ تحریر کئے، "میمنہ" میں علوم ادبیہ کو تحریر کیے، اور "میسرہ" میں علوم عقلیہ کو تحریر کیا، "ساقہ" میں آداب الخلوق کو تحریر کئے، اور اتنے ہی علوم پر اکتفا اس لیے کیا کہ بادشاہ کا نام احمد تھا، اور ابجد کے اعتبار سے اس کا عدد اتنا ہی نکلتا ہے۔

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ نے "صفحات من صبر العلماء علی شدائد العلم و تحصیلہ" میں ابن عقیلؒ کے بارے میں بیان کیا ہے، کہ آپ نے اپنے زمانہ کے تمام علوم کو ایک ہی کتاب "الفنون" میں جمع کر دیا، جو چار سو جلدوں میں مکمل ہوئی۔ (اللہ اکبر)

اسلام کی آغوش میں پروان چڑھنے والے علوم پر ایک طائرانہ نظر:

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس نے زبردست علمی انقلاب برپا کیا، اتنے علوم معرض وجود میں آئے کہ اس کا کلی احاطہ ناممکن ہے، مگر ہم کوشش کرتے ہیں، کہ ان علوم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے، تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو سکے کہ ابھی ہمیں اور کتنی محنت کرنے کی ضرورت ہے، شیخ الازنیقیؒ نے اپنی کتاب "مدینۃ العلوم" میں علوم کو سمیٹ کر اس پر سرسری نگاہ ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے، ہم اسی کو یہاں بیان کرنے جا رہے ہیں۔

علامہ ازنیقیؒ نے اولاً علوم کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور پھر ان سات کو علوم کے مختلف درجات میں بہترین انداز میں تقسیم کیا ہے، "الدوحۃ" عربی زبان میں کہتے ہیں، ایسے درخت کو جو بے شمار شاخوں اور ٹہنیوں پر مشتمل ہو، ہر درخت میں سات اصول کو بیان کیا ہے، اور پھر ہر اصل کے تحت مختلف مناسب علوم کو جگہ دی ہے، ایسا غالباً اس لیے کیا تاکہ ذہن نشینی میں سہولت ہو جائے، گویا علوم کے مجموعے کو، درخت اور اس کی ٹہنیوں سے تعبیر کیا۔

الدوحۃ الاولی: علوم خطیہ کے بیان میں، اس کے دو شعبے ہیں: شعبۂ اولی خط و کتابت کے استعمال ہونے والے ادوات اور طریقہ کار تعلق سے رکھتا ہے، جس میں علم الادوات، علم قوانین، کتابت علم تحسین حروف، علم املا اور علم خط مصحف وغیرہ علوم شامل ہے۔

الدوحۃ الثانیۃ: علوم ادبیہ عربیہ کے بیان میں، اس کے تین شعبے ہیں: شعبۂ اولی: ان علوم کے بیان میں جن کا تعلق مفردات سے ہو۔ شعبۂ ثانیہ: مرکبات کے بیان میں اور شعبۂ ثالثہ: مرکبات کی فروعات کے بیان میں۔

علم المفردات کے ذیل میں علم مخارج حروف، علم اللغۃ، علم الوضع، علم الاشتقاق، علم الصرف، علم النحو، علم معانی، علم قرض الشعر، علم الانشاء، علم التاریخ، علم مغازی، علم السیر، علم الطبقات، علم الامثال وغیرہ علوم شامل ہیں۔

دوحة ثالثة: اس میں دو شعبے اور شاخیں ہیں:

پہلا: علوم الیہ، یعنی ان علوم کے بیان میں جو کسی چیز کی تحصیل میں غلطی سے محفوظ رکھے، اس میں علم منطق وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا: مناظرہ اور درس میں خطا سے بچانے والے علوم کے بیان میں جیسے علم الجدل، علم النظر، علم الخلاف، علم آداب تدریس وغیرہ۔

دوحة رابعة: اس میں ان علوم کو شامل کیا گیا ہے، جس کا تعلق اعیان سے ہو، اس کے بھی دو شعبے ہیں:

پہلا: ان علوم کے بیان میں جو محض رائے اور عقل سے بحث کرے، جیسے علم حکمت، علم فلسفہ وغیرہ۔

دوسرا شعبہ: ان علوم کے بیان میں جو محض نقل پر مبنی ہوں، جیسے علم اصول الدین، علم اصول دین کو ۹ ر شعبوں اور حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

حصہ اول: علم الٰہی۔

حصہ دوم: علم فروع علم الٰہی جیسے علم امارات نبوت وغیرہ۔

حصہ سوم: علم طبعیہ جیسے علم طب، علم البیطرہ، علم الفراسۃ، علم احکام النجوم، علم الطلسمات، علم الکیمیاء، علم الفلاحۃ (کاشتکاری)۔

حصہ چہارم: علم طبعی کی فروعات کے بیان میں، جیسے علم النباتات، علم الحیوان، علم المعادن، علم الجو، علم قوس قزح۔

حصہ پنجم: دوحۃ رابعۃ کی فروعات کے بیان میں، جیسے علم التشریح، علم الصیدلۃ، علم ترکیب انواع مواد، علم الفصد، علم مقدار اوزان وغیرہ۔

حصہ ششم: علم ہندسہ کی فروعات کے بیان میں، جیسے علم المرایا، علم المساحۃ، علم انباط میاہ، علم آلات حرب، علم السباحۃ۔

حصہ ہفتم: علوم ہیئت کے بیان میں، جیسے علم جغرافیہ، علم المواقیت وغیرہ۔

حصہ ہشتم: علوم عدد کے بیان میں، جیسے ریاضی، الجبرا وغیرہ۔

حصہ نہم: علوم موسیقی کے بیان میں۔

دوحة خامسة: علوم حکمیہ کے بیان میں، اس کے چار شعبے ہوں گے:

پہلا: علم الاخلاق　　دوسرا: علم تدبیر منزل　　تیسرا: علم سیاست

چوتھا، مذکورہ علوم کی فروعات کے بیان میں، جیسے: علم آداب سلطان ووزراء، علم الاحتساب، علم قودِ عسکر وغیرہ۔

دوحة سادسة: علوم شرعیہ کے بیان میں، اس کے شعبے یہ ہیں: علم القرآن، علم روایتِ حدیث، علم تفسیر قرآن، علم درایتِ حدیث، علم الکلام، علم اصول، فقہ، علم الفقہ وغیرہ۔

دوحة سابعة: میں ان علوم کو بیان کیا ہے جس کا تعلق اعمال سے ہے اور اس کو علوم تصفیہ کا نام دیا، جیسے تزکیۂ نفس۔ اس کی معرفت کے دو طریقے ہیں: نمبر ایک بہ طریقِ عقل اور نمبر دو بہ طریقِ عمل، جیسے اسرار العبادات، یعنی عبادات کی حکمتوں کے بیان میں، علم العادات، علم آداب، توبہ، علم فوائد الصبر، علم الرجاء والخوف وغیرہ۔

غرض یہ کہ اللہ رب العزت کی جانب سے نازل ہونے والی آخری ''وحی'' کی بنیاد جب ''اقرأ'' یعنی ''علم'' پر ڈالی گئی، تو پھر اس کی وسعتوں اور رفعتوں کا پوچھنا ہی کیا! انسان کے لیے گویا روحانی و مادی ترقی کی راہیں کھول دی گئیں، اور اتنے علوم اس کی برکت سے وجود میں آ گئے کہ آج اس کا احصاء بھی ناممکن ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے یہاں پر تمام علوم کے تعارف کا قصد نہیں کیا، بل کہ صرف انہیں علوم کے تعارف کو بیان کریں گے، جو آج کل مدارس کے نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں، اور چند وہ علوم وفنون جن سے واقفیت علما وطلبا کے لیے ضروری ہے اور وہ بھی مختصر طور پر، ورنہ اس کی تفصیل آپ راغب الطباخ کی کتاب ''الثقافة الاسلامیة'' میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جس کا اردو ترجمہ ''تاریخ افکار و علوم اسلامی'' میں ہیں، جو مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہو چکی ہے، جس کی جلد اول کے پانچ سو صفحات میں صرف علوم القرآن اور علوم الحدیث کی معلومات کو یکجا کیا گیا ہے، اور جلد دوم میں علم الفقہ، علم الکلام والتصوف، علم النحو، علم الصرف، علم الاشتقاق، علم البلاغة، علم الجدل، علمِ تاریخ، علمِ طبقات الرجال، علمِ تراجم، علمِ لغت کو تقریباً چار سو پچاس صفحات میں بیان کیا گیا۔

اسی طرح امام رازیؒ کی کتاب ''الانوار فی حقائق الاسرار'' کا بھی ''ساٹھ علوم'' کے نام سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسی طرح ''آئینہ اصطلاحات علوم'' سے بھی اختصار کے ساتھ ضروری معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

ملاحظہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ علوم میں سے بہت سے حوادثِ زمانہ کے شکار ہو کر ناپید ہو چکے ہیں، بہتوں کے نام بدل گئے ہیں، یا کسی دوسرے علوم میں ضم ہو گئے ہیں، مگر یہ بات حقیقت ہے کہ ان کا کسی زمانہ میں وجود ضرور تھا۔

اس بات کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہوگا کہ اسلامی چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ محنت علوم شرعیہ پر کی، کیوں کہ وہی اس کی زندگی کے لیے بہ منزلۂ روح کے ہے، اس لیے برابر ہر زمانہ میں اس کو پڑھا پڑھایا جاتا رہا، اس پر تصنیف و تالیف کی جاتی رہی، اور کی جا رہی ہے، اور کی جاتی رہے گی۔ اسی لیے علامہ ابن خلدونؒ نے بھی تحریر کیا ہے، کہ علوم شرعیہ نقلیہ پر ہر زمانے میں امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری صلاحیتوں کو صرف کر دیا، اس کو سمجھنے سمجھانے میں سہولت کے لیے بے شمار ''اصطلاحات'' وضع کی گئیں اور اس پر خوب محنتیں کی گئیں یہاں تک علومِ شرعیہ بالکل منقح مہذب ہو کر منظر عام پر آ گئے اور باقی رہے۔

لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں علم کی جو بھی فضیلت اور [illegible] بیان کی گئی ہے اس کا اولین مصداق تو یہی علوم شرعیہ اسلامیہ ہیں، یہاں نیت کے بل بوتے پر دوسرے علوم ثانوی درجے میں اس میں شامل ہو سکتے ہیں، اگرچہ عصر حاضر میں "بدأ الاسلام غریباو سیعود غریبا" والی پیشین گوئی کے پیش نظر اُمت کا بڑا طبقہ اس کے برعکس تصور کرتا ہے، اور علوم تکوینیہ (سائنس ٹیکنالوجی) وغیرہ کو ان فضائل کا مصداق سمجھتا ہے، اور "علم دین" کو بے وقعت گردانتا ہے، مگر بے وقعت گردانے سے کچھ نہیں ہوتا، ہمیں (یعنی علوم دین سے وابستہ افراد کو) تو یہ دیکھنا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں کس کی وقعت ہے، اگر علومِ دینیہ اور تقویٰ کی وقعت ہے تو ان شاء اللہ ہم حاملینِ علومِ دین ہی اللہ کے یہاں بلند مقام پر فائز ہوں گے، لہٰذا ہمیں ان کی پرواہ اور علوم کی توقیر اور حقارت کی طرف توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم پورے انہماک کے ساتھ دینی علوم کو سیکھنے سکھانے اور اس پر عمل کرنے میں مشغول ہو جائیں۔

علم کا صحیح اسلامی مفہوم:

اِختراعات کے اس دور میں جو فتنوں کے عروج کا دور ہے، جہاں بہت سارے الفاظ و اصطلاحات کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر غیر اصل کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی، انہیں میں سے ایک علم بھی ہے، "روشن خیال" مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہمارا اچھا خاصا سنجیدہ دین دار طبقہ بھی بے جا وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، معنیٰ علم میں بے جا وسعت دینے کے درپے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علم ایک اِکائی ہے، اس کی تقسیم ممکن نہیں، لہٰذا علم دین اور علم دنیا یہ تقسیم غلط ہے، تمام علوم ایک ہی ہیں۔ قرآن وحدیث نے جس علم کی فضیلت بیان کی ہے، وہ ان تمام کو شامل ہے، جب کہ علمائے ربانیین اور راسخین فی العلم کی اکثریت بلکہ جمہور علما اس کے قائل ہیں کہ یا تو علم کی تقسیم ہی مُسلّم نہیں، علم صرف ایک ہے اور وہ ہے علم دین، کیوں کہ وہ آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے، لہٰذا قرآن وحدیث میں جو فضیلت وارد ہے، وہ صرف اسی کی ہے، کسی اور کی نہیں، اور دنیوی علم، علم کے زمرے میں داخل ہی نہیں، وہ تو فن، ہنر اور کاریگری ہے، وہ علم کہے جانے کے قائل ہی نہیں، تب ان کا بھی موقف یہی ہے کہ علم اِکائی نہیں بلکہ علم ایک ہی ہے، اور اگر لغتاً معلومات کے معنیٰ میں لیا جائے تب تو تقسیم کے سوا چارۂ کار نہیں، آخرت کی فکر پیدا کرنے والا علم دین، اور دنیا اور معاش کا مسئلہ حل کرنے والا علم دنیا۔ اسی کو علم معاش وعلم معاد بھی کہتے ہیں۔

حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: علم کا شرف معلوم کے شرف پر موقوف ہے، اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے حالات اس علم میں بیان کیے جائیں۔

علم دین کا معلوم حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے، اور تمام علم دین کا حاصل بھی یہی ہے، اور دیگر تمام علوم کا معلوم ماسوی اللہ ہے، پس جو نسبت دنیا یا ماسوی اللہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، وہی نسبت علوم دنیویہ کو علم دین کے ساتھ ہوگی، اور اس کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔ ع۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حق تعالیٰ کی ذات وصفات تو کسی چیز کے ساتھ کچھ نسبت نہیں رکھتی، وہ باقی اور سب فانی، وہ زندہ اور سب مردہ، وہ غنی اور سب محتاج، وہ موجود اور سب معدوم (کل شیٔ ھالک الا وجھہ)۔

غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت نہیں قرار دی جاسکتی ہے، سوائے اس کے کہ علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے، اور علم دنیا پر معدوم کا، اب میرا دعویٰ قریب الفہم ہوگیا ہے، کہ علم دین کے سامنے دیگر علوم علم کہلانے کے مستحق ہی نہیں، تو مقابلہ کیا کیا جائے! علوم دنیا کو علم مت کہو، فن کہو، پیشہ کہو، حرفت کہو۔ (انفاس عیسیٰ)

شیخ الاسلام ترجمان اہل سنت والجماعت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ تو "جدید دور میں علم اور اس کا استعمال، فتنۂ الفاظ کا جائزہ" کے تحت فرماتے ہیں: موجودہ دور کے علمی و ذہنی فتنوں میں سے ایک بڑا فتنۂ "فریب الفاظ" کا بھی ہے، ایک لفظ جسے ہم بولتے ہیں، وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایسے حقائق پر مشتمل ہوتا ہے، جو بالکل صحیح و صادق، مقدس و متبرک، اور نہایت معقول و محمود ہے، مگر اسی لفظ کے عام لغوی معنی کی وسعت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے بہ طور تلبیس و تلمیع، ایک ایسے معنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بجائے مقبول ہونے کے مردود اور مذموم ہوتا ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب کو مغالطہ دے کر محض خوش نما اور دل فریب الفاظ سے مسحور کردیں۔

آزادی، مساوات، تہذیب، ترقی اور اسی طرح کے اور الفاظ ہیں، جو اگر اپنے اصلی و حقیقی معانی میں مستعمل ہوں، نہایت محمود، مستحسن اور قابلِ تعریف ہیں، لیکن جب کسی زشت و شنیع مفہوم کو خوبصورت ظاہر کرنے کے لیے یہی الفاظ بہ طور نقاب استعمال ہونے لگیں، تو یہ خالص تلبیس و خداع ہے۔ ٹھیک یہی صورت آج کل لفظ "علم" کے متعلق واقع ہوئی ہے۔

کسی مسلم اسکول کا افتتاح ہو، کسی کالج کی بنیاد رکھی جائے، کسی یونیورسٹی کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہو، آپ دیکھتے ہیں کہ حضرات مقررین کس شدومد سے "علم" کے فضائل میں قرآنِ پاک کی بہت سی آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث پڑھتے رہتے ہیں، گویا اپنے اس طرزِ عمل سے مخاطبین پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جدید علم کے ایسے ایسے فضائل قرآن پاک میں موجود ہیں، حالاں کہ قرآن کریم کو ایک سرسری نظر سے پڑھ جایئے تو ظاہر ہوجائے گا کہ وہ خود علم کی دو قسمیں قرار دیتا ہے:

ایک علم نافع و مطلوب و محبوب دوسرا مضر و مردود ------ اس کے نزدیک ایک علم زہر ہے، دوسرا تریاق، ایک پاک شراب ہے، دوسرا محض سراب۔ ایک سبب ہلاکت ہے، دوسرا سامانِ نجات۔ ایک آسمان کی بلندیوں پر اٹھانے والا ہے، دوسرا اسفل السافلین کی پستیوں میں پہونچانے والا۔

جو علم اپنے اثرات کے اعتبار سے آخر کار خشیت الٰہی اور رغبتِ آخرت پر منتج نہ ہو، جو علم انسان کو خدا سے نڈر اور زندگی کے آخری انجام سے بالکل غافل کردے، جو علم ایسی مادی دنیا کی لذت وانبساط و شہوات حیوانیہ کو (خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ شکل میں ہوں) انسان کا معبود ٹھہرائے، کیا ایسا علم بارگاہ رب العزت میں درخوراعتنا یا لائق التفات ٹھہر سکتا ہے؟ یا قرآن حکیم اس کے اکتساب کی ایک لمحے کے لیے بھی ترغیب دے سکتا ہے؟

قرآن تو ایسے علم کی نسبت صاف طور پر یہ حکم دیتا ہے: "فاعرض عن من تولی عن ذکرنا ولم یرد الا الحیوۃ الدنیا ذلک مبلغھم من العلم "یعنی تو منھ پھیر لے اس کی طرف سے، جس نے ہماری بات سے منہ پھیر لیا اور جس کا مقصد اس دنیوی زندگی سے آگے کچھ نہیں، ان کے علم کی رسائی اور پرواز یہیں تک ہے۔

اس کے بالمقابل ایک وہ لوگ ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کی مخلوق پر رحم کھاتے ہیں اور ادب وتہذیب کے قاعدوں پر عمل کرتے ہیں۔ اخلاقی پاکیزگی ان کا جوہر ہے، ایمان کے نور سے ان کے دل روشن ہیں۔ غرض کہ علم ان کے اندر انابت الی اللہ، رحمت علی الخلائق کے اوصاف پیدا کرتا ہے، تو اسی طرح کے اولوا العلم کے حق میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات"۔

قرآن پاک نے ایک شخص (قارون) کا ذکر کیا ہے، جس کی دنیوی دولت اب تک ضرب المثل ہے۔ جس کے خزائن کی کثرت کا اندازہ "ان مفاتحہ" کے الفاظ سے ہو سکتا ہے، جس کا سامان دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں حتیٰ کہ بہت سے تمنا کرتے تھے کہ "یالیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ لذو حظ عظیم" اس نے ترقی کی اس معراج پر پہونچ کر ایک علم کا دعویٰ کیا تھا، جس کے ذریعہ اس کو یہ عروج حاصل ہوا "قال انما اوتیتہ علی علم عندی"۔

بہر حال وہ علم تھا، اس کے بالمقابل دوسرا گروہ تھا، جس کا ذکر حق تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے: "وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن آمن وعمل صالحا" یہ "الذین اوتوا العلم" اس علم والے تھے جو قارون کے اس تمام ترقیات اور علم وہنر کو حقیر سمجھ رہے تھے اور اُدھار کو نقد پر ترجیح دے رہے تھے۔ قرآن کریم نے تو ایک آیت میں مسئلہ کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا ہے: "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"۔

اس "انما" کے لفظ پر غور کیجئے۔ گویا جو علم قلب میں خشیت الٰہی پیدا نہ کرے، وہ علم ہی نہیں۔ ایسے اصطلاحی علم سے جہل ہزار درجے بہتر ہے۔

حدیث صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم سے پناہ مانگی ہے، جو نفع سے خالی ہو قرآن کریم میں بھی ہے: "وتعلمون مایضرھم ولا ینفعھم "معلوم ہوا کہ علم نافع بھی ہوتا ہے اور مضر بھی۔

پس ایسے علوم جو انسان کو شیطان یا درندہ بنا دیں یا اسے ترقی یافتہ بہائم کے زمرہ میں داخل کر دیں۔ ان کی طرف ترغیب دلانے کے موقع پر مطلق علم کے فضائل قرآن وحدیث سے پیش کرنا، انتہائی تلبیس اور گمراہی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ علوم وفنون حاصل نہ کیے جائیں، لیکن درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر علم وفن کی ترقی کا حاصل یہی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں تو فی الحقیقت ایسے علم سے جہل بہتر ہے، اگر علم وفن کی چکا چوند کرنے والی ترقیات مذہبی اور دینی علم وتہذیب کے ماتحت رہتیں تو دنیا کو ایسے بھیانک نتائج ہرگز نہ دیکھنے پڑتے۔

(بیداری، حیدرآباد، سندھ، جون ۲۰۰۶ء)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک علم دین اور دنیا کے اعتبار سے۔ اور دوسرا نفع اور

نقصان کے اعتبار سے۔ تحصیل علم دین تو خیر الناس والا عمل یعنی انسانوں کے لیے ایک بہترین کام ہے، البتہ علم دنیا کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، ہاں اگر اچھی نیت ہو مثلاً کسبِ حلال کی نیت سے دینی تمام احکام کی رعایت کرتے ہوئے اسے حاصل کیا جائے تو ہو سکتا ہے کارِ ثواب ہو جائے، جب کہ کوئی حلال چیز کا کسب حلال طریقے سے ہو، اور اگر محض "علمِ دنیا" ہی مقصود ہو، تب تو ہلاکت اور ضرر کے علاوہ کچھ بھی نہیں، جتنی احادیث اور آیات فضیلتِ علم میں وارد ہوئی ہیں وہ سب علم دین کے بارے میں ہیں۔

حضرت تھانویؒ تو فرماتے ہیں کہ علم نام ہی علمِ نافع کا ہے، ورنہ اگر عمل نہ ہو تو علم نہیں معلومات ہے، چاہے علمِ دین ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ ایسا علم دین جس پر عمل نہیں بندہ پر حجت اور دلیل بن جاتا ہے، جو ازدیادِ عذاب کا سبب ہوگا، اسی لیے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں، کہ علم کا ثمرہ اور اس کی حقیقی علامت اللہ تعالیٰ کی خشیت ہے، لہٰذا ہر طالب علم اور عالم کو بار بار جائزہ لینا چاہیے کہ یہ علامت اس میں پیدا ہوئی یا نہیں؟ تاکہ منزل تک رسائی کا پتہ چل سکے، اور منزل ہے تقویٰ، اگر تقویٰ پیدا ہو رہا ہے، تو گویا سفر صحیح منزل اور صحیح سمت کی طرف چل رہا ہے اور اگر خشیت، تواضع، اِنابت الی اللہ، حسنِ اخلاق وغیرہ اوصافِ حمیدہ کے بجائے' بے فکری، سستی، تکبر، انانیت، حبِ جاہ، حبِ مال اور نفس پرستی کے آثار نظر آئیں تو سمجھ جایئے کہ آپ منزل سے بھٹک چکے ہیں، کیوں کہ علم آپ کو منزل تک نہیں پہنچا رہا ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے۔

مقاصد کے جداگانہ اثرات:

یہ بات امرِ مسلم ہے کہ جیسا مقصد ویسا اس کا اثر مرتب ہوتا ہے، چاہے حالاً، چاہے مآلاً، کیوں کہ مقاصد جمع ہے مقصد کی، جس کے معنی ہیں کہ جس کی طرف ارادہ کیا جائے، یعنی انسان کو اللہ نے عقل اور علم دو عظیم نعمتیں عطا کی ہیں، ان دونوں کی وجہ امام بیضاویؒ کی تحقیق کے مطابق انسان کے دل میں کسی بھی چیز کے کرنے کا داعیہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے، جب اس کی نظر میں وہ کام فی الحال یا مستقبل میں یا تو نفع بخش ہو، یا دفعِ ضرر کے طور پر اسے محسوس کرتا ہو، اس کے بغیر انسان کبھی بھی کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، جب علم وعقل کی روشنی میں اُسے ایسا محسوس ہو کہ اس کام کے کرنے سے اسے جلبِ منفعت یعنی فائدہ ہے، یا کم از کم دفعِ ضرر یعنی نقصان سے بچاؤ ہے، تو ہی وہ کام کرے گا، ورنہ ہرگز نہیں کرے گا: اب یہ ایک الگ بات ہے کہ ہر ایک کے سوچنے کا پیمانہ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، ایک شخص کسی کام کو نفع بخش سمجھتا ہے، تو دوسرا اسی کو نقصان دہ سمجھتا ہے لہٰذا وہ اپنے علم اور عقل ہی کی بنیاد پر کوئی بھی فیصلہ کرے گا۔

اب جب مقصد سمجھ میں آ گیا، تو یہ بھی جاننا ضروری ہے، کہ مقصد اور نیت ہی پر نتائج مرتب ہوتے ہیں، لہٰذا علم دین اور علم دنیا دونوں کے جب مقاصد ہی الگ الگ ہیں، تو اس کے اثرات اور نتائج بھی ویسے ہی ہوں گے، علم دین کا مقصد اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے، تو ظاہری بات ہے کہ اس کے اثرات اگر طالب علم کی نیت درست ہے، تو اچھے ہی ہوں گے، اور دنیا و آخرت میں بھلائی حاصل ہو جائے گی، دنیا میں اگر نہ بھی ہو تو

آخرت میں بہرحال کامیابی لازمی ہے، اور علم دنیا کا مقصد تو محض مال و دولت، عزت وجاہ ہے، تو ظاہری بات ہے کہ اس کے اثرات بھی ویسے ہی مرتب ہوں گے، یعنی ہوسکتا ہے دنیا میں کچھ آج مل جائے اور کچھ کل مل جائے، مگر آخرت فراموشی کی وجہ سے وما لھم فی الآخرۃ من خلاق یعنی آخرت میں کچھ بھی نہ ہوگا۔

انسان اور تعارف:

قرآن کریم ایک پیغام ربانی ہے، جو انسانوں کے تمام ضروری امور کا صحیح حل پیش کرتا ہے، بس انسان کو ضرورت ہے نور علم حاصل کرنے کے بعد عقل سلیم کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی قرآن کریم نے جہاں بہت سے مسائل کو حل کیا ہے، وہیں "مسئلہ تعارف" کو بھی حل کیا ہے، اس کی علت اور حکمت اس کی ضرورت، اور حدود، قیود اور فوائد کو بیان کیا ہے، تو آیئے! ہم کتاب اللہ کی روشنی میں اس کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تعارف کی علت وحکمت:

اللہ رب العزت نے سورۂ حجرات میں ایک مقام پر ارشاد فرمایا: "وَ جعلنا کم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" "اور ہم نے تمہیں مختلف خاندانوں اور قبائل میں تقسیم کردیا تا کہ تم ایک دوسرے کو (آسانی) سے پہچان سکو۔ اس کا سیدھا سادھا مفہوم تو یہ ہے کہ ہم نے انسان کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا، مگر بعد میں جب کثرت ہوگئی، تو خاندانوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا، تا کہ آپس میں ایک دوسرے کو آسانی کے ساتھ جان سکیں، کیوں کہ اگر ایک نام کے بہت سارے ہوں قبیلہ وغیرہ کا ذکر ہی نہیں، تو کیسے ایک دوسرے کا باہم امتیاز ہو سکے گا۔ معلوم ہوا، اختلاف قبائل سے ایک دوسری کی معرفت میں آسانی ہوتی ہے، اسی کو کہتے ہیں کہ اختلاف اگر صحیح خطوط واصول پر ہو، تو رحمت ہوتا ہے، اور اگر اصول سے ہٹ کر ہو تو زحمت ہوتا ہے۔

تعارف کی حدود:

قرآن کریم نے محض "تعارفوا" پر اکتفا کر کے بات ختم نہیں کی بل کہ آگے کہا "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کہ کہیں "فتنۂ فریب الفاظ" میں مبتلا ہوکر انسان "تعارف" کو غلط رخ نہ دیدے، اور دنیوی اغراض کو مثلاً حسب، نسب، مال و دولت، عزت وجاہ، فقیری و غربت وغیرہ کو بنیاد بنا کر اس کا غلط استعمال نہ کرنے لگے، فوراً کہہ دیا یہ بات پیش نظر رہے کہ "تعارف" کو بنیاد بنا کر مالداری یا سرداری وغیرہ کو توقیر و تعظیم کا ذریعہ مت بناؤ، اگر تم آخرت کو پیش نظر رکھتے ہو، تو کسی کی عزت یا منقبت کے لیے شکل وصورت اور مال و دولت کو نہ دیکھو، بل کہ یہ دیکھو کہ اس میں تقویٰ کتنا ہے۔

ضرورتِ تعارف:

اس آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "تعارف" کی ضرورت کب پڑتی ہے؟ "تعارف" کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب کسی چیز میں کثرت ہوجائے تو باہم مماثل ہونے کی وجہ سے امر مشتبہ نہ ہوجائے، اس سے تعارف کی

ضرورت پیش آتی ہے۔

فوائدِ تعارف:

تعارف کا فائدہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا کیا، تو اس کا نام بھی "انسان" تجویز کیا، کیوں کہ اس کے امتیازات اور خصائص میں اہم امتیاز یہ تھا کہ کسی بھی چیز سے مانوس ہونے کی کوشش کرتا ہے، کیوں کہ جب اسے کسی چیز سے انسیت حاصل ہوجاتی ہے، تو وہ اس کا گرویدہ ہوجاتا ہے، اب ظاہری بات ہے کہ انسیت کو حاصل کرنے کے لیے اس چیز کے حقائق سے مالہ و ماعلیہ سے واقف ہونا ضروری ہے، تا کہ وہ یہ فیصلہ کرسکے کہ مجھے اس سے کیا فائدہ اور کیا نقصان ہے، اور یہ معرفت تعارف کے بغیر ناممکن ہے، اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ جب وہ کسی سے انسیت حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو سب سے پہلے اس سے پوچھتا ہے آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ کی قابلیت کیا ہے؟ آپ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر بعد میں چل کر اگر انسیت ہوئی تو کچھ آگے بات بڑھائے گا۔

تعارف العلوم کی ضرورت:

بس ایسا ہی کچھ "تعارف علوم" کے ساتھ بھی ہوا پہلے اس میں تنوع زیادہ نہ تھا، لہٰذا تعارف کی ضرورت پیش نہ آئی، مگر جب خاتم النبیین و سید ولد آدم سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بابرکت ہوئی، اور آپ پر کامل و مکمل آخری وحی نازل ہوئی، تو گویا انسان کے لیے قرآن وحدیث کی صورت میں "علم کا بحرِ بے کراں" ہاتھ لگ گیا، اور مسلمان نے اس میں غوطہ زنی شروع کردی، پھر کیا تھا "ما نفدت کلمات اللہ" کا جملہ صحیح صادق آیا، اور علم پر علم معلومات پر معلومات نتائج پر نتائج ظہور پذیر ہوتے گئے، اور انسان علوم وحی کی گہرائی میں جا جا کر لعل و جواہر نکالنے لگا، یہاں تک کہ علوم کا انبار لگ گیا، کہیں علوم نقلیہ تو کہیں علوم عقلیہ، کہیں علوم عالیہ تو کہیں علوم آلیہ، کہیں علوم مقصودہ تو کہیں غیر مقصودہ، کہیں علوم نافعہ تو کہیں غیر نافعہ، کہیں علوم کونیہ تو کہیں علوم تجربیہ اور پھر ان موٹی موٹی تقسیموں کی بھی تقسیم در تقسیم۔

غرض علوم مین اتنا تنوع ہوا کہ شاید تاریخ بشر میں ایسا کبھی نہیں ہوا، تو اب یہاں بھی تمیز اور فرق کے لیے علوم کی کثرت کی وجہ سے تعارف کی ضرورت پیش آئی، کیوں کہ انسان اپنی مختصری زندگی میں جس طرح سارے عالم کے انسانوں سے مانوس نہیں ہوسکتا تھا، تو جن سے تعارف ہوجاتا ہے ان میں سے جس میں نفع عاجل یا آجل اور دفع ضرر عاجل یا آجل کلی یا جزوی دیکھتا ہے، اس سے تعلق قائم کرلیتا ہے، اور جہاں تک ہوسکے اس سے وفاشعاری کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح علوم میں بھی جب کثرت ہوگئی، اور انسان تمام "علوم" پر دسترس حاصل کرنے سے قاصر ہوگیا، تو ضرورت پیش آئی کہ کون سا علم تعارف کے بعد اس کے لیے حال یا مآل میں نفع بخش ثابت ہوسکتا ہے، تا کہ وہ اسی جانب اپنی توجہ کو مبذول کردے۔ لہٰذا کسی بھی علم میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس علم کے رتبے اور مقام کو اس کے

فوائد کو جاننا ضروری ہوگیا، جب یہ چیز اس کے پیشِ نظر ہو تو وہ اپنے قیمتی وقت کو الاخری ۱۴۴۳ھ نا اپنے لیے سعادت تصور کرے گا اور اس میں مہارت حاصل کرے گا۔

انحطاطِ علمی کے اس دور میں ہمارے علما جہاں انحطاطِ علمی کو دور کرنے کے لیے بہت سی تدابیر کو بروئے کار لائے ان ہی میں ''تعارف علوم اسلامیہ'' بھی اہل عرب نے کہیں ''الثقافة الاسلامية'' کے نام سے کہیں ''الحضارة الاسلامية'' کے نام سے اور کہیں ''تعارف العلوم الاسلامية'' کے نام سے کتابیں لکھیں، اور اسے مستقل ایک اہم میدان اور ضروری امر محسوس کیا، ایک فن کی حیثیت دے کر اس پر خوب کام کیا، تاکہ علوم اسلامیہ کی گرتی ہوئی وقعت اور اہمیت کو، امت کی نگاہوں میں خاص طور پر نوجوانوں کی نظر میں سدھارا جائے، اور ''اسباب زوال امت'' میں سے ایک سبب کو حل کرنے کی کوشش کی جائے، اس لیے کہ زوال کا اصل سبب ہی ہے اسلام اور علوم اسلام سے بُعد او رووری ہے، کیوں کہ جب علم ہی نہیں تو تعلیمات اسلامیہ اور ''تقاضائے ایمانی'' پر عمل کیسا؟ اور جب عمل نہیں تو ایمان میں ضعف اور جب ایمان میں ضعف تو تنزل لازمی، کیوں کہ اللہ کا اعلان ہے ''و لا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ''یعنی نہ ہمت ہارو اور نہ ڈرو اگر ایمان (مضبوط اور مستحکم) رہا تو سربلندی یقینی ہے۔

آپ کو اس سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ''تعارف علوم اسلامیہ'' کتنا اہم موضوع ہے، ہم نے بھی جب مدارس میں طلبہ میں سستی، کاہلی، غفلت اور علوم اسلامیہ کے لیے جدوجہد میں کمی محسوس کی تو مناسب سمجھا کہ ہمیں اپنے تئیں اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ انحطاط علمی کے دور میں، محنت کا جذبہ بیدار ہو، غفلت کا طلسم ٹوٹے اور یوں طلبہ اپنے بھولے ہوئے سبق کو دوہرانے کی کوشش کریں، اور اپنے اسلاف کی یاد تازہ ہو جائے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں، ایں قصۂ پارینہ را

امید ہے کہ طلبہ ضرور اس جانب توجہ دیں گے اور ''تعارف علوم اسلامیہ'' کو پڑھنے کے بعد جہد مسلسل کا آغاز کریں گے اور خواب غفلت سے بیدار ہوں گے، تاکہ ضلالت کی گھٹاٹوپ تاریکیوں کو چھانٹ کر ایمان کی کرنوں سے ہدایت کی راہ کو منور کردیں، اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو حقیقت سے آشنا کردیں۔

اللہ کرے ہماری یہ ادنیٰ کوشش کارگر ثابت ہو اور 'شاید کے اتر جائے ترے دل میں میری بات' کا مصداق ٹھہر جائیں۔

تنبیہ: وقت نعمتِ کبریٰ ہے جس کا حساب قیامت میں دو مرتبہ ہوگا: ''و شبابک فیما ابلاہ و عمرک فیما افناہ'' سے معلوم ہوتا ہے، لہٰذا وقت کی قدر ازحد ضروری ہے، ورنہ کل قیامت کے دن انسان کہے گا ''یا حسرتا علی ما فرطت فی جنب اللہ'' ہائے اللہ! ــــــــ غفلت کیے جانے پر افسوس اور پھر وہاں ندامت کوئی کام نہ آئے گی، اس ندامت سے قبل اپنے آپ کو آخرت کے لیے تیار کرنے کی کوشش کریں۔ عصرِ حاضر میں شیطانی قوتوں کے غلبے کی وجہ سے باطل طاقتوں نے سب سے زیادہ اسی پر محنت کی ہے، ایسے ایسے آلات بنا دیئے کہ انسان اللہ سے غافل ہو کر

اسی میں اپنا وقت ضائع کرتا رہتا ہے، مثلاً ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، انٹرنیٹ، ڈی وی ڈی پلیئر، وی سی ڈی پلیئر، موبائل، گیمز، کھیل کود کے آلات کی بہتات، اخبارات ورسائل وغیرہ وغیرہ۔لہٰذا علوم اسلامیہ کے تعارف کے بعد طلبہ سے عاجزانہ التماس ہے کہ وہ ان تمام آلاتِ لغو کو خیر باد کہہ کر پورے انہماک اور لگن کے ساتھ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوجائیں۔وتوبوا الی اللّٰہ جمیعاً ایھا المؤمنون لعلکم تفلحون

علوم اسلامیہ کے تعارف کے لیے عربی میں تو بے شمار کتابیں لکھی جاچکی ہیں، جو عام طور پر ''الحضارۃ الاسلامیۃ، الثقافۃ الاسلامیۃ، تعارف العلوم الاسلامیۃ'' سے ملتے جلتے ناموں سے مطبوع ہیں۔البتہ اردو میں اس پر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا، ہر فن کی عربی کتابوں کی شروحات کے شروع میں اس فن سے متعلق مختصر طور پر تعارف ذکر کیا جاتا ہے۔البتہ پچھلے چند سالوں میں اردو میں اس طرح کی مستقل کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔وہ یہ ہیں:

مقدمات العلوم (صدیق ارکانی صاحب)　　آئینہ اصطلاحات العلوم (مولانا عبدالرحمن لہرپوری)

افکار و علوم اسلامیہ کی تاریخ (راغب الطباخ)　　الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند (مولانا عبدالحی حسنیؒ)

کشاف اصطلاحات الفنون (محمد تھانوی)　　احوال المصنفین (مولانا حنیف گنگوہی)

کلمات تشکر

ادارہ سب پہلے اس رب کریم کا شکر گذار ہے، جس نے مسلمانوں میں عموماً اور طلبہ میں خصوصی بیداری پیدا کرنے کی ہمیں توفیق دی اور وقفہ وقفہ سے مجلہ کے خصوصی شمارے محض اس کی توفیق اور نصرت سے منظر عام پر آتے رہے، اب تک تقریباً ۶ خصوصی شمارے شائع ہوچکے ہیں: ۱) تعطیلات اور طلبہ۔ ۲) دورِ حاضر کی تحریکات، فتنے، فرقے، سازشیں اور ہمارا لائحہ عمل۔ ۳) دفاع حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم۔ ۴) اسلام اور علم جدید۔ ۵) توشۂ طلبہ۔ ۶) فقہ المناسبات اور اب یہ ساتواں خصوصی شمارہ ''تعارف علوم اسلامیہ'' قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

حدیث مبارک میں وارد ہے کہ: ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ'' لہٰذا ہم جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا کے تمام اساتذۂ کرام، خاص طور پر درجات عالمیت وفضیلت کے اساتذۂ عظام کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اس مجلہ میں بھرپور قلمی وفکری تعاون پیش کیا اور پوری محنت اور عرق ریزی سے مختلف علوم کے تعارف پر مضامین تیار کیے۔اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں انہیں اس کا بہتر سے بہتر بدلہ نصیب فرمائیں، اور طلبۂ جامعہ کے بھی ممنون و مشکور ہیں کہ وہ مجلہ کے ہمیشہ منتظر رہتے ہیں، اور اسے دل چسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں جو ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اور اخیر میں وکیفیہ ڈاٹ کوم نام عربی ویب سائٹ کے بھی شکر گذار ہیں، جس سے ہمیں مختصر انداز میں عربی زبان میں مواد فراہم ہوا، اللہ مذکورہ ویب سائٹ کے ذمہ داروں اور کارکنوں کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔

اخیر میں ہم قارئین سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس مجلّے کو قدر کی نظر سے دیکھیں اور اس سے علمی اور عملی

فائدہ اٹھائیں اور مجھے، ادارے کو، اور متعلقین جامعہ کو اپنی دعائے نیم شبی میں یادرکھیں [illegible]

حامل قرآن کامرتبہ

"حَامِلُ الْقُرْآنِ حَامِلُ رَأْيَةِ الْإِسْلَامِ مَنْ أَكْرَمَهُ فَقَدْ أَكْرَمَهُ اللّٰهُ
وَ مَنْ أَهَانَهُ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ"

یعنی حامل قرآن اسلام کا علمبردار ہے جس نے اس کی عزت کی اس نے اللہ کی عزت کی
اور جس نے اس کو ذلیل کیا اس نے اللہ کو ذلیل کیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے۔
(کنز العمال، فضائل حفظ القرآن، ص ۴۳)

علمِ قراءت و تجوید اور علمِ وقوف

بہ قلم: قاری حسین احمد صاحب قاسمی معروفی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

علمِ قراءت:

الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب و لم یجعل لہ عوجا، کما قال اللّٰہ تعالی قرآنا عربیا غیر ذی عوج لعلھم یتقون ○ و قال فی موضع آخر بلسان عربی مبین ○ و قال: و رتلنہ ترتیلا ○ و قال: و رتل القرآن ترتیلا ○۔

و الصلاۃ و السلام علی عبدہ و رسولہ القائل: ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف فاقرء وا ما تیسر منہ۔ (بخاری)

و قال (صلی اللہ علیہ وسلم) ان اللّٰہ یحب ان یقرأ القرآن کما انزل ۔ (ابن خزیمہؒ)

قرآن کریم کی تلاوت اور اس کا (تجوید اور وقف کی رعایت کے ساتھ) پڑھنا تمام مسلمانوں کے لیے لازمی چیز اور ایک محکم فریضہ ہے، نہ تو اس سے کوئی چارہ ہے نہ ہی بے نیازی، اور اس سے بے نیازی کا ہونا ممکن بھی نہیں ہے، کیوں کہ تمام نمازوں میں قرآن کا پڑھنا ضروری ہے۔ نیز اللہ تعالی کی عبادت اور اس کے تقرب کا بہترین ذریعہ تلاوت قرآن ہی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: "عن ابی ذر رضی اللّٰہ تعالی عنہ قال قال رسول اللّٰہ (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) انکم لا ترجعون الی اللّٰہ بشیء افضل مما خرج منہ یعنی القرآن"۔ (رواہ الحاکم

وصححه ابو داؤد في مراسله عن جبير بن نفير والترمذي عن ابي امامة بمعناه) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب، اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کرسکتے، جو خود حق تعالیٰ سبحانہ سے نکلی ہے، یعنی کلام پاک۔

متعدد روایات سے یہ مضمون ثابت ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے دربار میں، کلام پاک سے بڑھ کر تقرب کسی چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔

امام احمد بن محمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ میں نے حق تعالیٰ شانہٗ کی خواب میں زیارت کی، تو پوچھا کہ سب سے بہترین چیز، جس سے آپ کے دربار میں تقرب ہو، کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ احمد! میرا کلام ہے، میں نے عرض کیا: سمجھ کر، یا بلا سمجھے؟ ارشاد ہوا کہ سمجھ کر پڑھے یا بلا سمجھے، دونوں طرح موجبِ تقرب ہے۔

اس حدیث شریف کی توضیح اور تلاوت کلام پاک کا سب سے بہتر طریقہ تقرب ہونے کی تشریح، بقیۃ السلف حجۃ الخلف حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کی تفسیر سے مستنبط ہوتی ہے: جس کا حاصل یہ ہے کہ سلوک الی اللہ یعنی مرتبۂ احسان، حق سبحانہٗ وتقدس کی حضوری کا نام ہے، جو تین طریقوں سے حاصل ہوسکتی ہے، اول تصور: جس کو عرف شرع میں تفکر وتدبر سے تعبیر کرتے ہیں اور صوفیہ کے یہاں مراقبے سے، دوسرا: ذکرِ لسان ہے، اور تیسرا: تلاوتِ کلام پاک۔

سب سے اول طریقہ بھی چوں کہ ذکر قلبی ہے، اس لیے دراصل طریقے دو ہی ہیں: اول ذِکر عام ہے، زبانی ہو یا قلبی؛ دوسرے تلاوت۔ (فضائل قرآن، ص ۳۴)

لفظ قراءت کا استعمال دو چیزوں کے لیے ہوتا ہے: کبھی تو پڑھنے اور تلاوت کے لیے اور کبھی فنِ قراءت کے لیے۔

ہم فن قراءت کے متعلق آپ کی خدمت میں کچھ اہم معلومات پیش کر رہے ہیں:

علومِ اسلامیہ میں سے ایک علم، علم قراءت ہے اور یہ پہلے معلوم ہوچکا کہ تلاوتِ قرآن، قرب الٰہی کا سب سے اہم ذریعہ ہے، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جب بھی قرآن پڑھا جائے گا، تو کسی نہ کسی کی قراءت اور روایت وطریق پر ہی پڑھا جائے گا، مثلاً غیر منقسم ہندوستان اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں امام عاصمؒ کی قراءت بہ روایت حفصؒ بطریق شاطبیؒ پڑھی جاتی ہے۔

حضرت امام حفص رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت:

امام حفصؒ ۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰ھ میں بہ عمر ۹۰ سال کوفہ میں وفات پائی ہے۔ اس وقت دس قراء تیں بالکل صحیح صحیح، امت کے پاس موجود ہیں، اور قراءت سبعہ کے خلاف کبھی کسی نے ایک حرف بھی نہیں کہا، اور ان میں سے مکہ اور مدینہ والوں کی قراءت، خاص طور پر قریشی ہونے کی وجہ سے زیادہ امتیاز رکھتی ہے، لیکن اس پر یہ مقبولیت خدا داد ہے، کہ صدیوں سے مکاتب اور مدارس میں امام حفصؒ ہی کی روایت پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، اور ایک ہزار حفاظ

میں سے نوسونا نوے کو یہی ایک روایت یاد ہے، اور ایسا تو کوئی بھی نہ نکلے گا جسے یہ الاخری • یا ذکرہ اور دوسری یاد ہوں۔(حالاں کہ نحوی حضرات کے گمان کے مطابق تو امام عاصمؒ کی قراءت مروج ہوئی ہی نہ چاہیے تھی، کیوں کہ ہمزات کی تحقیق کی وجہ سے وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں)۔ ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔ لیکن تواترِ عملی کے ساتھ امام عاصم کوفی اور امام حفص کوفی کی قراءت وروایت بہ طریق حفص پورے ہندوستان وپاکستان اور بنگلہ دیش میں رائج ہے اور سعودی گورنمنٹ کی طرف سے چھپنے والے قرآن کریم میں امام عاصم کوفی کی قراءت اور امام حفص کوفی کی روایت سے پڑھنے ہی کی تاکید کی گئی ہے۔ اب ہم علم قراءت کی اہمیت وفضیلت پر قدرِ روشنی ڈالتے ہیں۔

علم قراءت کی تعریف:

اس علم کو کہتے ہیں جس سے کلمات قرآنیہ میں قرآن مجید کے ناقلین کا وہ اتفاق اور اختلاف معلوم ہو جو نبی کریم علیہ السلام سے سن لینے کی بنا پر ہے، اپنی رائے کے بنا پر نہیں۔ طاش کبریٰ زادہ فرماتے ہیں کہ علم قراءت ایسا علم ہے، جس میں کلام اللہ کے الفاظ کی صورتوں کے متعلق الفاظ متواترہ کے طریقے سے بحث کی جائے۔

ایک تعریف یہ بھی ہے کہ علمِ قراءت اس علم کا نام ہے، جس میں وہ الفاظ ومسائل بیان کئے جائیں جو باعتبار موضوع کئی طرح سے آئے ہیں، بالفاظ دیگر جس میں اختلافات قراءت متواترہ مشہورہ کے اعتبار سے صور نظم قرآنی پر بحث کی جائے۔ (تذکرۃ الفنون)

تو معلوم ہوا کہ علم قراءت کا موضوع، کلماتِ قرآنیہ ہیں، کیوں کہ ان ہی کلمات کے تلفظ اور حالات سے بحث ہوتی ہے۔ اور اس کا فائدہ اور مقصد یہ ہے کہ زبان غلطی سے محفوظ رہتی ہے، اور قرآن مجید ہر طرح کی تحریف وتغیر اور خطا سے محفوظ رہتا ہے، اور ائمۂ کرام کی تمام قراءتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔

علم قراءت کا وجود تو پہلے دن سے ہے، جب کہ حضرت جبریل امینؑ کے واسطے سے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوا۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کو اللہ کے قول "و رتل القرآن ترتیلا" (قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو، کہ ایک ایک حرف الگ الگ ہو۔ حضرت تھانویؒ) کے مطابق ترتیل وتجوید سے ہی صحابہ کے سامنے پڑھتے تھے، اور ترتیل کے ساتھ اللہ نے نازل بھی فرمایا ہے، چناں چہ ارشادِ ربانی ہے "و رتلنہ ترتیلا" اور اس کو ہم نے بہت ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے، نیز فرمایا "و قرآنا فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث و نزلناہ تنزیلا" (بنی اسرائیل: پ ۱۵) قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا ہے، تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، اور ہم نے اس کو اتارنے میں بھی تدریج کا خیال رکھا ہے ہے، اور صحابہ کرام نے بغیر کسی کمی بیشی کے، اپنی فصیح ترین زبان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا، پھر اپنے بعد والوں کو اسی طرح سے تعلیم دی، چناں چہ صاحب خلاصۃ البیان فرماتے ہیں: فانہم اخذوا انکما منبعزہ۔ (حوالہ)

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم قراءتِ قرآن میں، قبائلِ عرب کی لغتوں کا خیال فرماتے تھے، اور یہ اس

امت پر اللہ تعالیٰ کا فضلِ خاص ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سات حروف پر نازل کیا ہے۔ الاخری ۱۴۴۲ھ

سبعۃ احرف میں نازل کرنے کی حکمت اور سبب:

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو، برخلاف دیگر انبیاء ورسل کے، عرب وعجم، سرخ وسیاہ، تمام مخلوقات اور تمام اقوامِ عالم کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، اور قرآن لغت عربی میں نازل ہوا تھا، لغات جدا جدا تھے، زبانیں متفرق تھیں، ایک کا دوسرے کی لغت میں پڑھنا، نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن تھا، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''وان امتی لاتطیق ذالک۔۔۔الخ'' لغت واحد پر قراءت کا حکم تکلیف مالا یطاق ہوتا، اس کے علاوہ دیگر مصالح بھی تھے۔ اس لیے امت کی سہولت وآسانی کے پیش نظر قرآن مجید کو سات حروف پر نازل فرمایا۔ (التبشیر: ص ۹)

قرآن کریم کے سات حروف میں نازل ہونے کا مطلب:

حدیث پاک میں ہے ''ان ھذا القرآن اُنزِلَ علی سبعۃ أحرف فاقرؤوا ماتیسر منہ'' (بخاری مع القسطلانی)۔ یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس اس میں جو تمہارے لیے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو، اسی طرح مسلم شریف کی روایت ہے ''إن اللہ یأمرک أن تقرأ أمتک القرآن علی سبعۃ أحرف فأیما حرف قرءوا علیہ فقد اصابوا''۔

سات حروف سے کیا مراد ہے؟:

یہ بڑی معرکۃ الآرا اور طویل بحث ہے، اور علوم قرآن کے مشکل ترین مباحث میں سے ہے۔

یہ یاد رہے کہ جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ معناً متواتر ہے، چناں چہ مشہور محدث امام ابوعبید قاسم بن سلام نے اس کے تواتر کی تصریح کی ہے، اور حدیث وقراءت کے معروف امام علامہ ابن الجزریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مستقل کتاب (جزء) میں اس حدیث کے تمام طرق جمع کیے ہیں، اور ان کے مطابق یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب، ہشام بن حکیم بن حزام، عبدالرحمن بن عوف، اُبی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس، ابوسعید خدری، حذیفہ بن الیمان، ابوبکرہ، عمرو بن عاص، زید بن ارقم، انس بن مالک، سمرہ بن جندب، عمر بن ابی سلمہ، ابوجہم، ابوطلحہ، ام ایوب انصاریہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مروی ہے، اس کے علاوہ متعدد محدثین نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر یہ اعلان فرمایا کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہو جائیں، جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہو کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہے، چناں چہ صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت کھڑی ہوگئی جسے شمار نہیں کیا جا سکا۔

سبعۃ احرف کا مطلب:

اس کی مراد کے سلسلے میں آرا ونظریات کا شدید اختلاف ملتا ہے، تقریباً ۳۵ اقوال علامہ ابن عربیؒ نے بیان

فرماے ہیں۔چند یہ ہیں:

۱-بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد سات مشہور قاریوں کی قراءتیں ہیں،لیکن یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے،کیوں کہ قرآن کریم کی متواتر قراءتیں،اِن سات قراءتوں میں منحصر نہیں ہیں،بل کہ اور بھی متعدد قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں،یہ سات قراءتیں تو محض اس لیے مشہور ہوگئیں کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے ایک کتاب میں ان سات مشہور قراء کی قراءتیں جمع کردی تھیں،نہ تو ان کا یہ مقصد تھا کہ قراءتیں سات میں منحصر ہیں اور نہ وہ حروف سبعہ کی تشریح ان سات قراءتوں سے کرنا چاہتے تھے۔

۲-اسی بنا پر بعض علما نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حروف سے مراد تمام قراءتیں ہیں،لیکن سات کے لفظ سے سات کا مخصوص عدد مراد نہیں ہے،بل کہ اس سے مراد کثرت ہے،اور عربی زبان میں سات کا لفظ،محض کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کے لیے بھی اکثر استعمال ہوتا ہے،یہاں بھی حدیث کا مقصد سات کے عدد کو خاص کرنا نہیں،بل کہ کثرت ہے،علمائے متقدمین میں سے قاضی عیاضؒ کا یہی مسلک ہے،اور آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بھی یہی قول اختیار فرمایا ہے۔

لیکن یہ قول اس لیے درست معلوم نہیں ہوتا کہ بخاریؒ اور مسلمؒ کی ایک حدیث میں،حضرت ابن عباسؓ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ''اقرأني جبريل علی حرف فراجعته فلم ازل استزيده و يزيدني حتی انتهی الی سبعة احرف'' مجھے حضرت جبرئیل نے قرآن کریم ایک حرف پر پڑھایا،تو میں نے ان سے مراجعت کی اور میں زیادتی طلب کرتا رہا،اور وہ قرآن کریم کے حروف میں اضافہ کرتے رہے،یہاں تک کہ سات حروف تک پہنچ گئے۔

اسی کی تفصیل صحیح مسلم کی ایک روایت میں،حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنوغفار کے تالاب کے پاس تھے کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرئیلؑ آئے فرمایا کہ اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ کی ساری امت قرآن کریم کو ایک ہی حرف پر پڑھے،اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں،میری امت میں اس کی طاقت نہیں،پھر حضرت جبرئیلؑ دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا:اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت قرآن کریم کو دو حرف پر پڑھے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:میں اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں،میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے،پھر وہ تیسری دفعہ آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کریم کو تین حرف پر پڑھے،آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں،پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت قرآن کریم کو سات حروف پر پڑھے،پس وہ جس حرف پر پڑھیں گے ان کی قراءت درست ہوگی''۔

ان روایات کا سیاق صاف بتا رہا ہے کہ یہاں سات سے مراد محض کثرت نہیں،بل کہ سات کا مخصوص عدد

ہے، اس لیے ان احادیث کی روشنی میں یہ قول قابل قبول معلوم نہیں ہوتا، چناں چہ **بلا خوفِ تردید** تردید کی ہے۔

بعض دوسرے علما مثلاً حافظ ابن جریر طبریؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ مذکورہ حدیث میں سات حروف سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں، چوں کہ اہلِ عرب مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ہر قبیلے کی زبان عربی ہونے کے باوجود، دوسرے قبیلے سے تھوڑی تھوڑی مختلف تھی، امام ابو حاتم سجستانیؒ نے ان قبائل کے نام بھی معین کر کے بتا دیے ہیں اور فرمایا ہے کہ قرآن کریم ان سات قبائل کی لغات پر نازل ہوا ہے: قریش، ہذیل، تیم الرباب، ازد، ربیعہ، ہوازن، اور سعد بن بکر۔ اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے بعض حضرات سے نقل کر کے ان کی جگہ یہ قبائل بتائے ہیں: ہذیل، کنانہ، قیس، ضبہ، تیم الرباب، اسد بن خزیمہ اور قریش۔

لیکن بہت سے محققین مثلاً حافظ ابن عبدالبرؒ، علامہ سیوطیؒ اور علامہ ابن الجزریؒ وغیرہ نے اس قول کی بھی تردید کی ہے، اول تو اس لیے کہ عرب کے قبائل بہت سے تھے، ان میں سے صرف ان سات کے انتخاب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیمؓ کے درمیان قرآن کریم کی تلاوت میں اختلاف ہوا، جس کا مفصل واقعہ صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے، حالاں کہ یہ دونوں حضرات قریشی تھے، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصدیق فرمائی، اور وجہ یہ بتائی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اس پر امام طحاویؒ نے بھی یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ سات حروف سے مراد سات قبائل کی لغات ہیں، تو یہ اُس آیت کے خلاف ہوگا جس میں ارشاد ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ" اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان میں۔

اور یہ بات طے شدہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی۔ اس لیے ظاہر یہی ہے کہ قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا ہے، امام طحاویؒ کی اس بات کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کریم کے جمع ثانی کا ارادہ فرمایا، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ایک جماعت کو مصحف تیار کرنے کا حکم دیا، اس وقت انہیں یہ ہدایت فرمائی تھی: "اذا اختلفتم انتم فی شیء من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش فإنما نزل بلسانهم"۔

جب قرآن کریم (کی کتابت) میں تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہو تو اسے قریش کی لغت پر لکھنا، کیوں کہ قرآن کریم انہیں کی زبان میں نازل ہوا ہے؛ اس میں حضرت عثمانؓ نے تصریح فرمادی کہ قرآن کریم صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

امام طحاویؒ کا قول جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نازل تو صرف قریش کی لغت پر ہوا تھا، لیکن چوں کہ اہلِ عرب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک کے لیے اس ایک لغت پر قرآن کریم کی تلاوت دشوار تھی، اس لیے ابتدائے اسلام میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایسے مرادفات متعین فرما دیئے تھے، جن سے وہ تلاوت کر سکیں، یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کے لغات سے منتخب کئے گئے تھے، اور یہ بالکل

ایسے تھے جیسے ''تَعَالَ'' کی جگہ ''ھَلُمَّ یا اَقْبِلْ یا اُدْنُ'' پڑھ دیا جائے، سب کے معنی ایک ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی، اور جب اہلِ عرب قرآنی زبان کے عادی ہوگئے، اور ان کے لیے اسی اصلی لغت پر قرآن کریم کی تلاوت آسان ہوگئی، تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دور کیا، جسے عرضۂ اخیرہ کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر مرادفات سے پڑھنے کی اجازت ختم کردی گئی اور ایک طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔

اس قول کے مطابق ''سات حروف'' والی حدیث اُسی زمانے سے متعلق ہے، جب تلاوت میں مرادفات استعمال کرنے کی اجازت تھی اور اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے کہ اُسے ایک مخصوص زمانے تک سات حروف پر پڑھا جاسکے گا، اور سات حروف سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے ہر کلمے میں سات مرادفات کی اجازت ہے، بل کہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کیے جاسکتے ہیں، ان کی تعداد سات ہے اور اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کرلے، بل کہ متبادل الفاظ کی تعیین بھی خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی اور ہر شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح قرآن سکھلایا تھا جو اس کے لیے آسان ہو۔ لہٰذا صرف ان مرادفات کی اجازت دی گئی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھے، امام طحاویؒ کے علاوہ حضرت سفیان بن عیینہؒ، ابن وہبؒ اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے، بل کہ حافظ ابن عبدالبرؒ نے تو اس قول کو اکثر علما کی طرف منسوب کیا ہے۔

یہ قول پچھلے تمام اقوال کے مقابلے میں زیادہ قرینِ قیاس ہے، اور اس کے قائلین اپنی دلیل میں مسندِ احمد کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ''ان جبرئیل علیہ السلام قال یا محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اقرأ القرآن علی حرف، قال میکائیل استزدہ حتی بلغ سبعۃ أحرف، قال کل شاف کاف مالم تخلط آیۃ عذاب برحمۃ او رحمۃ بعذاب، نحو قولک تعالَ و اَقْبِلْ و ھَلُمَّ و اِذْھَبْ و اَسْرِعْ و عَجِّلْ''۔

''جبرئیل علیہ السلام نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے) کہا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن کریم کو ایک حرف پر پڑھیے، میکائیل علیہ السلام نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے) کہا اس میں اضافہ کروائیے یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تاوقتے کہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کی آیت کو عذاب کی آیت سے مخلوط نہ کردیں، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تعالَ (آؤ) کے معنی کو اَقْبِلْ، ھَلُمَّ، اِذْھَبْ، اَسْرِعْ اور عَجِّلْ کے الفاظ سے ادا کریں''۔

اس قول پر اور تو کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن ایک اُلجھن اس میں بھی باقی رہتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی جو مختلف قراءتیں آج تک متواتر چلی آرہی ہیں، اس قول کے مطابق ان کی حیثیت واضح نہیں ہوتی، اگر ان قراءتوں کو ''سات حروف'' سے الگ کوئی چیز قرار دیا جائے، تو اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ احادیث کے وسیع ذخیرے

میں ''احرف'' کے اختلاف کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور لفظی اختلاف کا ذکر نہیں کیا، پھر ''سات حرف'' سے یہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں ''سبعة احرف'' کے علاوہ ایک اور قسم کا اختلاف بھی تھا، اس اُلجھن کا کوئی اطمینان بخش حل اس قول کے قائلین کے یہاں مجھے نہیں مل سکا۔ (علوم القرآن، ص ۱۰۵، ۱۰۶)

سبعة احرف کی راجح تشریح:

قرآن کریم کے ''سات حروف'' کی سب سے بہتر تشریح و تعبیر یہ ہے کہ حدیث میں ''حروف کے اختلاف'' سے مراد ''قراءتوں کا اختلاف'' ہے اور سات حروف سے مراد ''اختلافِ قراءات'' کی سات نوعیتیں ہیں، چناں چہ قراءتیں تو اگرچہ سات سے زائد ہیں، لیکن ان قراءتوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ سات اقسام میں منحصر ہیں اور یہ قول متقدمین میں سے، سب سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ملتا ہے۔ مشہور مفسر قرآن علامہ نظام الدین قمی نیشاپوریؒ اپنی تفسیر ''غرائب القرآن و رغائب الفرقان'' میں لکھتے ہیں کہ احرفِ سبعہ کے بارے امام مالکؒ کا یہ مذہب منقول ہے، کہ اس سے مراد قراءات میں مندرجۂ ذیل سات قسم کے اختلافات ہیں:

۱) مفرد اور جمع کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں لفظ مفرد آیا ہو اور دوسری میں صیغۂ جمع، مثلاً ''وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ'' اور ''كَلِمٰتُ رَبِّكَ''۔

۲) تذکیر و تانیث کا اختلاف: کہ ایک میں لفظ مذکر استعمال ہو، اور دوسری میں مؤنث جیسے ''لَا يُقْبَلُ'' اور ''لَا تُقْبَلُ''۔

۳) وجوہِ اعراب کا اختلاف: کہ زیر زبر وغیرہ بدل جائیں، مثلاً ''هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ'' اور ''غَيْرِ اللّٰهِ''۔

۴) صرفی ہیئت کا اختلاف: جیسے ''يَعْرِشُوْنَ اور يَعْرُشُوْنَ''۔

۵) ادوات یعنی حروفِ نحویہ کا اختلاف: جیسے ''لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ'' اور ''لٰكِنِ الشَّيٰطِيْنُ''۔

۶) تبدیلیٔ حرف کا اختلاف: جیسے ''تعلمونَ'' اور ''يعلمونَ'' اور ''ننشزها'' اور ''ننشرها''۔

۷) لہجوں کا اختلاف: جیسے تخفیف، تفخیم، امالہ، مد، قصر، اظہار اور ادغام وغیرہ۔

پھر یہی قول علامہ ابن قتیبہؒ، امام ابوالفضل رازیؒ، قاضی ابوبکر بن الطیب باقلانیؒ اور محقق ابن الجزری رحمہم اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔ یہ تمام حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ سات حروف سے مراد، اختلافِ قراءت کی سات نوعیتیں ہیں، البتہ نوعیتوں کی تعیین میں ان کا آپس میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے اور یہ فرق استقراء کی وجہ سے ہے، تاہم امام ابوالفضل رازیؒ کا استقراء جامع مانع اور مستحکم ہے، کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف چھوٹا نہیں ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں کہ قراءات کا اختلاف سات اقسام میں منحصر ہے:

۱) اسماء کا اختلاف　　۲) افعال کا اختلاف　　۳) وجوہ اعراب کا اختلاف

۴) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف ۵) تقدیم وتاخیر کا اختلاف ۶) ابدال تبدیلی کا اختلاف

۷) لہجوں کا اختلاف

بہر حال گرچہ استقراء کی وجوہ میں اختلاف تو پایا جاتا ہے، لیکن امام مالک، علامہ ابن قتیبہ، امام ابوالفضل رازیؒ، محقق ابن الجزریؒ اور قاضی باقلانی پانچوں حضرات متفق ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد قراءت کے وہ اختلافات ہیں جو سات نوعیتوں میں منحصر ہیں۔

''سبعۃ احرف'' کی یہ تشریح سب سے زیادہ بہتر ہے، حدیث کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے، اور یہ مختلف طریقے اپنی نوعیتوں کے لحاظ سے سات ہیں، ان سات نوعیتوں کی کوئی تعیین چوں کہ کسی حدیث میں موجود نہیں ہے، اس لیے یقین کے ساتھ تو کسی کے استقراء کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ حدیث میں وہی مراد ہے، لیکن بہ ظاہر امام ابوالفضل رازیؒ کا استقراء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہ موجودہ قراءات کی تمام انواع کو جامع ہے۔

وجوہ ترجیح:

''سبعۂ احرف'' کی تشریح میں جتنے اقوال، حدیث، تفسیر اور علوم قرآن کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں، ان میں سے یہ قول کہ سات حروف سے مراد اختلافِ قراءت کی سات نوعیتیں ہیں سب سے زیادہ راجح، قابلِ اعتماد اور اطمینان بخش ہے، اور اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

(۱) اس قول کے مطابق حروف اور قراءات کو دو الگ الگ چیزیں نہیں قرار دینا پڑتا۔ جب کہ علامہ ابن جریرؒ اور امام طحاویؒ کے نزدیک دونوں الگ الگ ہیں۔

(۲) علامہ ابن جریرؒ کے قول کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ سات حروف میں سے چھ منسوخ یا متروک ہوگئے اور صرف ایک 'حرفِ قریش' باقی رہ گیا؛ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ (تفصیل دیکھیے، علوم القرآن: ص ۱۱۱)

(۳) اس قول کے مطابق ''سات حروف'' کے معنی بلا تکلف صحیح ہو جاتے ہیں، جب کہ دوسرے اقوال میں یا تو حروف کے معنی میں، یا سات کے عدد میں تاویل کرنا پڑتی ہے۔

(۴) ''سبعۃ احرف'' کے باب میں جتنے علما کے اقوال ہماری نظر سے گذرے ہیں، ان میں سب سے زیادہ جلیل القدر اور عہد رسالت سے قریب تر ہستی امام مالکؒ کی ہے اور وہ علامہ نیشاپوریؒ کے بیان کے مطابق اسی قول کے قائل ہیں۔

(۵) علامہ ابن قتیبہؒ اور محقق فن علامہ ابن جزریؒ دونوں علم قراءت کے مسلم الثبوت امام ہیں، اور دونوں اسی قول کے قائل ہیں۔ نیز علامہ جزریؒ تو فرماتے ہیں ''میں اس حدیث کے بارے میں اشکالات میں مبتلا رہا، اور اس پر تیس سال سے زیادہ غور وفکر کرتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس کی ایسی تشریح کھول دی جو انشاء اللہ صحیح ہوگی۔

خلاصۂ کلام: اس طویل بحث سے یہ نتیجہ اور خلاصہ نکلا کہ:

(۱) امت کی آسانی کی خاطر، آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ فرمائش کی کہ قرآن کریم کی تلاوت کو صرف ایک ہی طریقے میں منحصر نہ رکھا جائے بل کہ اُسے مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی جائے ، چناں چہ قرآن کریم سات حروف پر نازل کر دیا گیا۔

(۲) سات حروف پر نازل کرنے کا راجح ترین مطلب یہ ہے کہ اس کی قراءت میں سات نوعیتوں کے اختلافات رکھے گئے، جن کے تحت بہت سی قراءتیں وجود میں آگئیں۔

(۳) شروع شروع میں ان سات وجوہِ اختلاف میں سے، اختلافِ الفاظ ومرادفات کی قسم بہت عام تھی ،لیکن رفتہ رفتہ انسیت بڑھتی گئی اور یہ قسم کم ہوتی گئی ، یہاں تک کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عرضۂ اخیرہ میں تو اس قسم کے اختلافات بہت کم کر دیے گئے، اور زیادہ تر صیغوں کی بناوٹ، تذکیر وتانیث، افراد وجمع معروف ومجہول اور لہجوں کے اختلافات باقی رہے۔

(۴) جتنے اختلافات عرضۂ اخیرہ کے وقت باقی رہ گئے تھے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سب کو (سات) مصاحف میں اس طرح جمع فرما دیا کہ ان کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا،لہٰذا قراءتوں کے بیشتر اختلافات اس میں سما گئے، اور جو قراءتیں اس طرح ایک مصحف میں نہیں سما سکیں، انہیں دوسرے مصاحف میں ظاہر کر دیا، اسی بنا پر عثمانی مصاحف میں کہیں کہیں ایک ایک' دو دو لفظ کا اختلاف پیدا ہوا۔

غلط فہمی کا ازالہ:

سبعۃ احرف کی مذکورہ بحث پڑھنے والا، سرسری طور پر اس شبہے میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم جیسی بنیادی کتاب کے بارے میں، جو حفاظت خداوندی کے تحت، آج تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے محفوظ چلی آرہی ہے، مسلمانوں میں اتنا زبردست اختلافِ آرا کیسے پیدا ہو گیا۔

لیکن اگر کوئی سبعۃ احرف کے متعلق، مذکورہ بالا اقوال میں غور وخوض کرے گا، تو اس کو بآسانی جواب معلوم ہو جائے گا کہ یہ اختلاف محض نظریاتی نوعیت کا ہے، عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقانیت وصداقت اور اس کے بعینہٖ محفوظ رہنے پر، اس اختلاف کا کوئی ادنیٰ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا۔ (تفصیل کے لیے علوم القرآن: ص ۵۸، ۵۷، ۱۵۶)

نیز اس اختلاف کی نوعیت وحقیقت تضاد وتناقض کی نہیں ہے بل کہ از قسم تنوع وتغایر ہے۔

(دیکھیے علم قراءت اور قراءِ سبعہ: ص ۳۳-۳۵)

علم قراءت سے متعلق اسلاف کی خدمات اور توجہات:

مسلمانوں نے ہر دور اور زمانے میں قرآن کریم کی قراءتوں کی طرف توجہ کی ہے، اور اس کی حفاظت کی ہمہ جہتی کوشش کی ہے۔ اور ہر زمانے میں خصوصیت کے ساتھ کوئی علاقہ اور شہر مشہور رہا ہے، ایسے ہی رجال کار بھی اس فن

کے تعلق سے قرائے کرام کے نام سے مشہور رہے ہیں۔

چناں چہ عہد صحابہ میں خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم مشہور تھے، نیز خلیفہ اول اور ثانی کو جمع قرآن کا شرف بھی حاصل رہا ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلی مرتبہ قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع فرمایا، جب کہ اس سے پہلے قرآن کریم متفرق طور پر ہڈیوں، چھالوں، پتھروں اور چمڑوں پر لکھا ہوا تھا، دوسری مرتبہ حضرت عثمان غنیؓ نے بہت ہی اہتمام سے جمع کرایا، اور وہ تمام چیزیں جو قرآن سے نہیں تھیں اسے نکال دیا مثلاً شرح منسوخ اور تعلیق وغیرہ؛ اور لغت قریش پر محفوظ کرکے مختلف سات نسخے لکھوا کر بلادِ اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجوا دیا۔

فائدہ: حفاظتِ قرآن کا کئی مرحلہ ہے مثلاً: عہد رسالت میں کتابت قرآن، عہد صدیقی میں جمع قرآن (اول)، عہد عثمانی میں جمع قرآن (ثانی)، تسہیلِ تلاوت کے اقدامات (نقطے، حرکات، احزاب یا منزلیں، اجزا، یا پارے، اخماس اور اعشار، رکوع، رموزِ اوقاف وغیرہ) قرآن کریم کی طباعت (تفصیل کے لیے دیکھئے: علوم القرآن، معلم التجوید للمتعلم المستفید)۔

عہد صحابہ میں خلفائے راشدینؓ کے علاوہ مشہور قراء میں، حضرت ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ (کاتب وحی وجامع قرآن)، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابو درداءؓ (جامع قرآن)، ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن ابی السائب، اور ان کے علاوہ بہت سے صحابہ کرامؓ، انصار و مہاجرین میں سے شمار کیے جاتے تھے؛ نیز بعض صحابہ کرامؓ کے بارے میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے توصیفی کلمات بھی ارشاد فرمائے ہیں مثلاً ''أقرؤکم أبي'' اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی قراءت سننے کے بعد فرمایا ''لقد أوتیت مزماراً من مزامیر آل داؤد'' (یقیناً تجھے آل داؤد کا ساز دیا گیا ہے)۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ سے فرمایا ''اقرأ علي القرآن'' مجھے قرآن سناؤ۔ (بخاری)

عہد تابعین کے قراء حضرات:

عہد تابعین میں بہت سے قرائے کرام مشہور ہوئے ہیں اور لوگوں نے انہیں مقام و عزت سے نوازا ہے، اور وہ حضرات مختلف علاقوں اور شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، چناں چہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے پڑھنے والوں کی پانچ جماعتیں ہیں:

(۱) مدنیین۔ (۲) مکیین۔ (۳) کوفیین۔ (۴) بصریین۔ (۵) شامیین۔

قرائے مدنیین: حضرت سعید بن مسیبؒ، عروہ بن زبیرؒ، ابن شہابؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، عطاء بن یسارؒ، ابوداؤد عبدالرحمن الاعرج، ابوبکر محمد بن مسلمؒ، اور ابوعبداللہ مسلم بن جندبؒ وغیرہ۔

قرائے مکیین: حضرت مجاہدؒ، طاؤسؒ، ابوعاصم عبیدؒ، عطاء بن ابی رباح، اور عکرمہ مولیٰ ابن عباسؒ وغیرہ۔

قرائے کوفیین: حضرت علقمہؒ، اسود بن یزیدؒ، ابوعبدالرحمن السلمیؒ، سعید بن جبیرؒ، ابومسلم کوفیؒ، ابومیسرہ ہمدانیؒ، ابویزید کوفیؒ، ابومریمؒ، ابومعاویہؒ، ابوعمرانؒ اور ابوعمرو عامرؒ وغیرہ۔

قرائے بصریین: حضرت حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، قتادہؒ، ابو العالیہؒ، ابو رجاءؒ، اور نصر بن عاصم وغیرہ۔

قرائے شامیین: حضرت مغیرہ بن شہابؒ اور خلیفہ بن سعدؒ وغیرہ (تفصیل کے لیے دیکھئے علم قراءت اور قراء سبعہ۔ و۔ تذکرۃ الفنون)۔

لیکن عہد تابعین کے بعد تمام علوم اسلامیہ میں حیرت انگیز پھیلاؤ ہوا، اور علمائے کرام متعدد حصوں میں تقسیم ہو گئے مثلاً:

(۱) وہ جو قرآن کے مطالب حل کرنے اور قرآن وحدیث سے مسائل کے استخراج واستنباط کی طرف متوجہ ہو گئے۔

(۲) وہ جو مخلوق سے الگ تھلگ ہو کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

(۳) وہ جنہوں نے خود کو قرآن پڑھانے، اور اس کا طریقۂ ادا سکھانے کے لیے مخصوص اور فارغ کر دیا۔

(۴) وہ جو ان کے علاوہ دیگر علوم میں مشغول ہو گئے، پس جس نے جس علم کے لیے خود کو فارغ کر لیا، وہ اسی میں مشہور ہو گیا، اور اس علم کی نسبت اس کی طرف ہونے لگی، اور لوگ اس کی اقتدا کرنے لگے۔ اور اصل یہ ہے کہ اسلاف کرام کو قرب الٰہی کی دولت بدرجۂ کمال حاصل تھی، جس کی برکت سے ان کی ہمتیں عالی اور حوصلے نہایت بلند تھے، وہ قرآن و حدیث کے لفظی ومعنوی تمام علوم کے جامع تھے، وہ قاری بھی تھے اور مفسر بھی، فقیہ بھی تھے اور نمازی بھی، مجاہد بھی تھے اور زاہد بھی، متقی بھی تھے اور عابد بھی، پھر بعد کے لوگوں میں، چوں کہ قرب کے درجہ میں کمی آ گئی، اس لیے ان کے حوصلے بھی اس قدر فراخ نہ رہے۔ ان حضرات نے اپنی اپنی استعداد اور فہم کے مطابق، ایک ایک علم کو اختیار کیا، اور اس میں ماہر بن گئے، کوئی قراءت کی طرف مائل ہوا، کوئی تفسیر کی طرف، کسی نے حدیث میں کمال حاصل کیا، کسی نے فقہ میں، کوئی صرفی بن گیا، کوئی نحوی، بعض خلوت نشیں درویش بن گئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب ان ائمہ کرام کا دور آیا تو چوں کہ خود کو انہوں نے اس فن کے لیے فارغ ومخصوص کر لیا تھا، عوام وخواص سب ان پر اعتماد کرتے تھے، اس لیے اب قراءت کی نسبت ان حضرات کی طرف ہونے لگی؛ نیز اس وقت حالت یہ تھی کہ صدر اول جو معراج علمی کا زمانہ تھا وہ رہو چکا تھا، اس فن کی طرف توجہ میں کمی، اور ہمتوں میں ضعف آ گیا تھا اور احساس شدید ہو رہا تھا کہ ان حضرات کے بعد اس وقت اتنے بڑے عالم پیدا نہ ہو سکیں گے، اس لیے اس وقت کے بڑے بڑے علما نے فن قراءت کی امامت کا منصب ان ہی حضرات کے سپرد کیا، اور انہیں امام مان کر خود ان کے مقلد بن گیے، نیز ان حضرات ائمہ قراءت کے ذریعہ، علم قراءت نے رواج وشہرت پائی۔ (ایضاح الحشر)

علم قراءت کی قسمیں:

علم قراءت کی دو قسمیں ہیں: قراءت متواترہ (جو تواتر سے ثابت ہے)۔ قراءت غیر متواترہ (جو تواتر سے ثابت نہیں ہے یعنی شاذہ)۔ پھر قراءت متواترہ کی دو قسمیں ہیں: متواترہ متفقہ (جس کے تواتر پر سب کا اتفاق ہے)۔ متواترہ غیر متفقہ (جس کے تواتر میں اختلاف ہے)۔

قراءت متواترہ متفقہ سے قراءت سبعہ اور غیر متفقہ سے قراءت ثلاثہ (القراءات: ۱۷۲) مراد ہیں۔

قسمت کی خوبی:

قبل اس کے کہ آپ قرائے سبعہ کے نام سے واقف ہوں، یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تابعین کے بعد بہت سے قرائے کرام ہوئے ہیں، لیکن لوگوں نے قراء سبعہ پر اتفاق کیا ہے، اور ان کی قراءت کو مدوّن کیا ہے، جیسا کہ فقہ میں ائمہ اربعہ پر اتفاق کیا، اور ان کو امام مانا ہے، پھر قرائے سبعہ کے بعد جو مشہور ہیں، وہ قرائے عشرہ ہیں ان کی قراءت تواتر اور اہمیت کے لحاظ سے قراءت سبعہ سے کم درجے کی ہے۔

قرائے سبعہ یا عشرہ کی طرف انتساب:

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قراءت کی تمام وجوہ کا سرچشمہ، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے، اور جملہ قراءت منزل من اللہ ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف، یا کم از کم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا زمانہ قریب تھا، ان کی طرف کیوں نہیں منسوب کی گئیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ وجوہ قراءت، عرب کے قبائل اور ان کی لغات کے موافق نازل ہوئی ہیں، اس لیے ہر وجہ کی نسبت اس کی طرف کی گئی ہے جس نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے، تاکہ ان تمام وجوہ کو ناقلین سے معلوم کر کے پوری طرح یاد اور محفوظ کر سکیں۔

نیز ہم ایک متواتر طریق کے محتاج ہیں، جس سے اس وجہ کی قرآنیت کا علم و یقین حاصل ہو جائے، جو ہم تک پہونچی ہے، اس لیے ناقلین نے ہر وجہ کی نسبت اس شخص کی طرف کی جو اپنے زمانہ میں اس کو پڑھتا تھا، پس دورِ صحابہ میں حضرت عثمان، علی، ابن مسعود، اُبی بن کعب، رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ کی قراءت کہتے تھے۔ تابعین کے دور میں ابو جعفر مجاہدؒ، عبدالرحمن سلمی رحمہم اللہ وغیرہ کی قراءت کہلاتی تھیں، امام ابوعبید بن سلامؒ نے اپنی کتاب ”کتاب القراء ات“ کے آغاز میں ان صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ اور تبع تابعین کے اسمائے گرامی کا ذکر کیا ہے، جو وجوہ قراءت کے ناقلین ہیں۔

قرائے سبعہ و عشرہ اور ان کے روات:

اسمائے قاریان	وفات	راوی اول	وفات	راوی دوم	وفات
نافع بن عبدالرحمن مدنیؒ	۱۶۰	قالونؒ	۲۲۰	ورشؒ	۱۹۷
عبداللہ بن کثیر مکیؒ	۱۲۰	قنبلؒ	۲۹۱	بزیؒ	۲۴۰
ابوعمرو بصریؒ	۱۵۴	دوری بصریؒ	۲۴۶	سوسیؒ	۲۶۱
عبداللہ بن عامر شامیؒ	۱۱۸	ہشامؒ	۲۴۶	ابن ذکوانؒ	۲۴۲

عاصم کوفیؒ	۱۲۷	شعبہؒ	۱۹۳	حفصؒ	۱۹۰
حمزہ کوفیؒ	۱۵۶	خلفؒ	۲۲۰	خلادؒ	۲۲۰
کسائی کوفیؒ	۱۶۹	ابوالحارثؒ	۲۴۰	علی دوریؒ	۲۴۶
ابوجعفر یزید مدنیؒ	۱۳۰ھ	ابن وردانؒ	۱۶۰	ابن جمازؒ	۱۷۰
ابو یعقوب حضرمیؒ	۲۲۵ھ	رویسؒ	۲۳۸	روحؒ	۲۳۴
خلف بزار کوفیؒ	۲۲۰	اسحاق وراقؒ	۲۸۶	ادریس عبدالکریمؒ	۲۹۲

علم قراءت کی اصل اور اس کا سرچشمہ:

ان تمام قراء کی قراءت کی اصل اور مدار نقل پر ہے، قیاس کا کوئی دخل نہیں ہے، بل کہ ہر قراءت کسی نہ کسی جلیل القدر صحابیؓ تک پہنچتی ہے، چناں چہ حضرت عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں: ''أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أن تقرئوا القرآن کما علّمتم ''یعنی تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ قرآن کو اسی طرح پڑھو، جس طرح تمہیں سکھلایا گیا ہے۔علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں:

وما لقیاس في القراءۃ مدخل فدونک ما فیہ الرضاء متکفلا

قراءت میں قیاس کو کوئی دخل نہیں، پس تو ان کی حفاظت کا ذمہ دار بن کر اس کو مضبوط پکڑ لے، جس میں ناقلین کی پسندیدگی ہے۔

ماقبل میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ائمہ قراءت مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے، اور لوگوں نے ان سے قراءت حاصل کرنا شروع کر دیا، اور علم قراءت میں کمال حاصل کرنے کے لیے ان ائمہ سے رجوع کرنے لگے، کسی نے ایک قراءت، کسی نے دو، کسی نے تین اور کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ یاد کیں۔

اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ، پوری امت میں مسلّم تھا، اور ہر جگہ اس کے مطابق عمل ہوتا تھا۔ اور وہ یہ کہ صرف وہ قراءت قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی، جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:

(۱) مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی صرف ونحو کے قواعد کے مطابق ہو۔

(۳) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو اور ائمہ قراءت میں مشہور بھی ہو۔

بہر حال علامہ ابن مجاہدؒ کے عمل سے، جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے، ان کی قراءت کی اصل کچھ اس طرح ہے۔

علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ ابن کثیر مکیؒ، نافع مدنیؒ اور ابو عمرو بصریؒ کی قراءت کا مرجع حضرت ابی ابن کعبؓ ہیں۔ ابن عامر شامیؒ کی قراءت کا مرجع عثمان بن عفانؓ ہیں۔ اور عاصمؒ، حمزہؒ اور کسائیؒ کوفیین کی قراءت کا مرجع حضرت

عثمانؓ اور ابن مسعودؓ ہیں۔

اب اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے؛ یہ تمام تفصیلات مستند کتابوں سے لی گئی ہیں، پھر بھی اگر کوئی کمی ہے، تو بندہ عاجز کا قصور اور کم علمی ہے، اور صحیح باتیں اللہ کے فضل سے ہیں۔

''علم تجوید''

تلاوتِ قرآن کریم میں حروف قرآنیہ کے مخارج وصفات اور تجویدی قواعد واصول کی رعایت اور پابندی نہایت ضروری ہے، اور جو علم خاص طور سے ان مقاصد کی ادائیگی کے لیے مدون کیا گیا ہے، اسی کو ''علم تجوید''، ''علم اداء'' اور ''علم ترتیل'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اسی علم تجوید سے متعلق چند گذارشات آپ کی خدمت عالیہ میں پیش ہیں۔

تجوید کے لغوی معنیٰ ''تحسین الشي'' یا ''جعل الشيء جيدا'' یعنی کسی شئی کو اچھا اور عمدہ کرنا، اور سنوارنا۔

تعریف: علمائے تجوید اور مجودین کے محاورہ اور اصطلاح میں تجوید نام ہے ''علم یبحث فیه عن مخارج الحروف وصفاتها وعن طرق تصحيح الحروف وتحسينها'' علم تجوید، ایسا علم ہے جس میں مخارج وصفاتِ حروف سے، اور تصحیح وتحسینِ حروف کے طریقوں سے بحث کی جائے۔

اقسامِ تجوید: تجوید کی دو قسمیں ہیں: (۱) تجوید علمی: ایسے قواعد واصول اور ضابطوں کا جاننا ہے، جن کو علمائے تجوید اور ائمۂ قراءت نے مدون کیا ہے۔ مثلاً مخارج وصفات اور احکامِ ترکیبیہ وغیرہ۔ (۲) تجوید عملی: حروف قرآنیہ کو مقررہ مخارج سے، مع جمیع صفات لازمہ وعارضہ اور مقررہ اصول وقواعد کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

وجہ تسمیہ: اس علم میں وصل ووقف کی درستگی اور مخارج وصفات کی عمدگی سے قرآن کریم کو سنوار کر پڑھنے کے قواعد کا بیان ہوتا ہے، اس لیے اس کا نام ''تجوید'' ہوا۔

موضوع: ''الحروف الهجائية القرآنية من حيث المخارج والصفات'' تجوید کا موضوع ہے قرآن کریم کے حروف تہجی مخارج وصفات کے اعتبار سے۔ کیوں کہ تجوید میں حروفِ قرآنیہ کے، ان ہی حالات واوصاف اور عوارضات سے بحث ہوتی ہے، بعض لوگوں نے حروف احادیث بھی فرمایا ہے۔

غرض وغایت: ''صون اللسان عن الخطأ في اداء القرآن وتلاوة القرآن كما انزل وتحسين القراءة'' یعنی: (۱) قرآن کی ادائیگی میں زبان کا محفوظ رہنا۔ (۲) نزول کے مطابق قرآن کی تلاوت کرنا۔ (۳) قراءت کا عمدہ کرنا۔

یعنی حرف کو ہر جگہ اور ہر حال میں، اس کے مقررہ مخرج سے تمام صفات لازمہ اور عارضہ کے ساتھ، نہایت

لطافت اور نرمی سے بغیر کسی تکلف و تصنع کے ادا کرنا، اور اس کے لیے اس قدر تکرار و مشق کرنا کہ تصحیحِ حروف، قاری قرآن کی عادتِ ثانیہ بن جائے، اور اس کی فطرت اور اس کا ملکہ بن جائے۔

فائدہ وثمرہ: حصول رضاء الرب وسعادۃ الدارین، چناں چہ علامہ جزریؒ فرماتے ہیں "من یحسن التجوید یظفر بالرشد" یعنی جو شخص تجوید کو اچھی طرح جانے گا وہ نیکی وہدایت پالے گا۔

ارکان: (۱) مخارجِ حروف۔ (۲) صفات۔ (۳) احکامِ ترکیبیہ، مثلاً اخفاء، ادغام اور مد وغیرہ۔

(۴) زبان سے محنت وریاضت، جیسا کہ علامہ جزریؒ (م ۸۳۳ھ) فرماتے ہیں:

لیس بینہ وبین ترکہ　　　إلا ریاضۃ امریٔ بفکہ

فضیلت ومرتبہ: یہ فن سب اشرف وافضل ہے اس لیے کہ اس کا تعلق کلام اللہ سے ہے جو اشرف الکلام ہے۔

حکم: قواعد تجوید کا یاد کرنا فرض کفایہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اڑتالیس میل (۲۵/۷۷ کیلومیٹر) کی حد میں ایک ماہر تجوید کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ سب گنہ گار ہوں گے، اور قواعد تجوید کے مطابق قرآن کریم کو صحیح پڑھنا ہر عاقل وبالغ پر فرض عین ہے، یعنی اس حد تک کہ حروف ومعانی میں تبدیلی پیدا نہ ہو۔

علم تجوید اور قراءت کی تدوین اور اس کے مدونین:

اہلِ عرب چوں کہ اہل زبان تھے اور قراءت وتلاوت سینہ بسینہ چلی آرہی تھی، لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور دعوتِ اسلام بیرونِ عرب پہنچی تو عرب وعجم کے اختلاط سے عربیت کے صاف ستھرے اور خاص لب ولہجہ میں نوع بنوع کی خامیاں اور نقائص پیدا ہونے لگے، تو اس زمانہ کے ائمہ فن اور ماہرینِ لغت مثلاً ابوالاسود دؤلیؒ (م ۶۱ھ) خلیل بن احمدؒ (م ۱۷۰/۱۶۰ھ) سیبویہؒ (م ۱۵۳ھ) اخفشؒ (م ۳۳۸ھ) فراءؒ (م ۲۰۷ھ) اسحٰق جرمیؒ (م ۲۲۵ھ) اور مبردؒ (م ۲۸۵ھ) وغیرہ نے شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کی کہ صرف، نحو، لغت اور حروف عربیہ کے مخارج وصفات وغیرہ کی مکمل اور جامع تشریح کی جائے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور ہدایت کی روشنی میں ایسے اصول وقواعد کی بنیاد رکھی جائے کہ عربی فصاحت اور طرزِ ادا عجمی اختلاط سے مجروح اور متاثر نہ ہوتے ہوئے بالکل محفوظ ہوجائے، پس اس فن کی وضع وترتیب تقریباً ۱۵ھ سے شروع ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری صدی تک وجوہِ قراءت اور تجویدی اصول وقواعد کے لکھنے کا دستور نہیں تھا، تیسری صدی میں ابوعبید قاسم بن سلامؒ (م ۲۲۴ھ) نے کتاب القراءات تصنیف کی، اور فنِ تجوید میں سب سے پہلے موسیٰ بن عبید اللہ بغدادی (م ۳۲۵ھ) نے کتاب تصنیف کی، اس کے بعد تجوید وقراءت میں بہت سی کتابیں تالیف ہوئیں۔

تجوید وقراءت کی تصانیف کا سرسری جائزہ:

علم قراءت اور تجوید پر باقاعدہ تصانیف کا آغاز تیسری صدی سے ہوتا ہے، بعض حضرات نے اور پہلے بھی لکھا ہے۔

تیسری صدی میں ۷/، چوتھی صدی میں ۲۵/ سے زائد، پانچویں صدالاخریٰ ۱۴۳۷ھ سے زائد، چھٹی صدی میں ۳۰/، ساتویں صدی میں ۳۰/، آٹھویں صدی میں ۵۰/ سے زائد، نویں صدی میں ۳۰/ سے زائد، دسویں صدی میں ۱۵/، گیارھویں صدی میں ۳/، بارھویں صدی میں ۲/، تیرھویں صدی میں ۴/، چودھویں صدی میں ۵۰/ زائد کتابیں لکھی گئیں۔

چودھویں صدی میں خاص علم تجوید پر، تصانیف کی تعداد سو سے زائد ہیں، اس سرسری جائزہ سے تقریباً پانچ سو تصانیف کا سراغ ملتا ہے۔

رواں پندرھویں صدی:

فن تجوید پر بے شمار تصانیف وتالیفات ہیں بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ چودھویں صدی کا آخر اور رواں پندرھویں صدی، علم القراءات والتجوید کے لیے علمی و تصنیفی صدی ہے، علمائے عرب کے ساتھ بیرون عرب اور برصغیر کے علما اور قراء پوری بیداری کے ساتھ اس علم کی تعلیمی، تصنیفی اور تربیتی خدمات پر کمربستہ نظر آرہے ہیں، علمائے عرب نے بطور خاص اہتمام کیا ہے جدید اور مستقل تصانیف کے قدیم مآخذ اور مصادر کی، از سر نو تصحیح و تحقیق اور جدید انداز پر مفصل تعلیقات کے ساتھ طباعت واشاعت کی برابر خبریں آرہی ہیں، اسی کے ساتھ برصغیر میں کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اچھا خاصا کام ہوا اور ہو رہا ہے۔

فائدہ: تلاوت وقراءتِ قرآن کے کئی طریقے ہیں، عموماً تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں ترتیل، حدر اور تدویر۔

ترتیل: نہایت اطمنان سے پڑھنا، حدر: جلدی جلدی پڑھنا، تدویر: دونوں کے مابین پڑھنا لیکن ان کے علاوہ دو قسمیں اور بھی ہیں۔ ۱) تحقیق: ترتیل سے بھی زیادہ اطمنان سے پڑھنا، ھذرمہ: حدر سے بھی تیز پڑھنا۔ ان تمام قسموں میں رعایت تجوید ضروری ہے۔

فائدہ: یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ قلت تلاوت کے ترتیل بہتر ہے یا کثرتِ تلاوت کے ساتھ حدر بہتر ہے، تو حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، مجاہدؒ، علامہ جزریؒ، امام غزالیؒ قراء سبعہ میں سے امام عاصمؒ حمزہؒ اور ورش کے نزدیک ترتیل افضل ہے۔ حضرت علیؓ ایک جماعت صحابہؓ وتابعینؒ امام شافعیؒ، اور قراء سبعہ میں سے ابن کثیرؒ، ابوعمر بصریؒ اور قالون حدر کی افضلیت کے قائل ہیں۔ اور امام کسائیؒ اور ابن عامر شامیؒ تدویر کو افضل کہتے ہیں۔

ترتیل کا منشا قرآن کریم کے معانی ومطالب میں غور وفکر ہے، اور حدر کثرت تلاوت کے لیے ہوتا ہے، جب کہ تجویر میں دونوں باتیں بیک وقت مدنظر ہوتی ہیں، عجیب بات ہے کہ ہمارے ماحول میں عموماً جلسوں کے لیے ترتیل، فرض نمازوں کی لیے تدویر اور تراویح کے لیے حدر اختیار کیا جاتا ہے۔

ادلہ اربعہ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس) اور فقہ واقوالِ علما سے تجوید کا ثبوت:

قرآن: ''ورتل القران ترتیلا'' علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں ''ای جود القران تجویدا''۔ اور حضرت

علیؓ فرماتے ہیں:الترتیل ھو تجوید الحروف و معرفۃ الوقوف ۔

(۲)"الذین اتیتھم الکتب یتلو نہ حق تلاوتہ" امام غزالیؒ فرماتے ہیں، کہ حق تلاوت یہ ہے کہ تلاوت میں، زبان، عقل اور دل تینوں شریک ہوں چناں چہ زبان کا حصہ حروف کی تصحیح، عقل کا حصہ معانی و مطالب کی تفسیر، اور دل کا حصہ اطاعت و نصیحت پذیری ہے۔

حدیث: رب قاریٔ للقران و القران یلعنہ،یعنی بہت سے لوگ قرآن کی تلاوت اس حال میں کرتے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے،اس کے بعد صاحب نہایۃ القول المفید لکھتے ہیں:أی اذا اخل بمبانیہ أو بمعانیہ أو بالعمل بما فیہ و من جملۃ العمل بما فیہ ترتیلہ و تلاوتہ حق تلاوتہ۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس وعید میں تین طرح کے آدمی داخل ہیں:(۱) بے عمل ۔(۲) تحریف کرنے والا۔(۳) غلط پڑھنے والا۔

حضرت شیخ زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "تالی قرآن،قرآن شریف میں پڑھتا ہے:(الا لعنۃ اللہ علی الظلمین) اسی طرح (لعنۃ اللہ علی الکاذبین) اور خود اس کا مستحق ہوتا ہے۔اللھم احفظنا من اللعنۃ

ایک روایت میں ہے "القران حجۃ لک او علیک " اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث ہیں،جن میں غلط پڑھنے پر وعید بیان کی گئی ہیں۔(تفصیل کے لیے مطولات فن کا مطالعہ فرمائیں)۔

اجماع: علامہ شیخ محمد مکی نصر "نہایۃ القول المفید" میں فرماتے ہیں:

فقد اجتمعت الامۃ المعصومۃ من الخطأ علی وجوب التجوید من زمن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) الی زماننا ھذا و لم یختلف فیہ عن احد منھم و ھذا من اقوی الحجج ۔

یعنی امت معصومہ عن الخطاء (وہ امت جس کا اجماع غلطی سے محفوظ ہے) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے لے کر ہمارے اس زمانہ تک،تجوید کے وجوب پر اتفاق کیا ہے،اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے،اور یہ اجماع قوی ترین دلیل ہے، بل کہ امام رازیؒ،علامہ جزریؒ،امام سیوطیؒ،علامہ قسطلانیؒ،علامہ دانیؒ،شیخ مکی بن ابی طالبؒ وغیرہ،اس کی فرضیت کے قائل ہیں چناں چہ ملا علی قاری فرماتے ہیں:"ھذا العلم لا خلاف فیہ أنہ فرض کفایۃ و العمل بہ فرض عین علی صاحب کل قراءۃ و روایۃ و لو کانت القراءۃ قسنۃ "۔

قیاس: قرآن عربی ہے اور تجوید کے قواعد کی مخالفت سے بعض دفعہ عجمی بن جاتا ہے،مثلاً ضاد کی جگہ ڈال، یا حرکتوں کا مجہول ادا کرنا۔(۲) قرآن لفظ و معنی دونوں کا نام ہے،پس معانی کی طرح الفاظ کی تصحیح بھی ضروری ہے۔(۳) تجوید سے تلاوت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔(۴) معانی موقوف ہیں الفاظ پر،اور اول کی صحت ثانی پر موقوف ہے،یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ اس کے خلاف سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

فقہ: فقہائے کرام کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو تجوید سے پڑھنا واجب اور نہایت ضروری ہے، کیوں کہ بعض دفعہ تجوید کی غلطی سے معنی اس حد تک بدل جاتے ہے کہ نماز فاسد ہو جاتی ہے،اور اس معاملہ میں خود اس کا خیال معتبر نہیں،

تل کہ کسی محقق اور ماہر قاری کی شہادت ضروری ہے، اور اگر تصحیح حروف کی کوشش نہ کرے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔

اقوالِ علمائے کرام: علامہ جزریؒ، المقدمۃ الجزریۃ میں فرماتے ہیں:

والاخذ بالتجوید حتم لازم من لم یجود القران آثم
لانہ بہ الالہ انزلا وھکذا منہ الینا وصلا

(۲) اورنگ زیب عالمگیرؒ کے استاذ صاحب تفسیراتِ احمدیہ ملا جیونؒ فرماتے ہیں "حق تعالیٰ نے قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے، اور لوگوں پر اس کو واجب بھی کردیا ہے"۔

(۳) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "شریعت میں سات چیزوں کی رعایت کا نام ترتیل ہے" ان میں سے ہر حرف کو ان کے مخرج سے نکالنا، وقف وابتدا کا لحاظ رکھنا، حرکات ثلثہ کو صاف ادا کرنا بھی شامل ہے۔

(۴) صاحب علم الصیغہ مفتی عنایتؒ فرماتے ہیں کہ "جو شخص صحیح پڑھنے پر قادر نہیں اور کوشش بھی نہیں کرتا تو وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ گناہوں میں گذارتا ہے"۔

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو تجوید وصحت سے پڑھنا لازم اور ضروری ہے، اور اس کے چھوڑنے پر سخت گناہ ہے، خصوصاً وہ شخص زیادہ ہی گنہ گار ہوگا جو لاپرواہی سے چھوڑے، جیسا کی صاحب خلاصۃ البیان فرماتے ہیں "فلما ثبت امر اللہ تعالی بالترتیل أی التجوید وجب الاخذ بہ ولزم الاثم علی ترکہ لاسیما لمن لایبالی شانہ"۔

{علم الوقف والابتداء}

جس طرح سے تلاوت قرآن میں مخارج وصفات کی رعایت واجب اور ضروری ہے، اور غلط پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے اسی طرح وقف کرنے اور ٹھہرنے میں بھی اس طریقے کی رعایت ضروری ہے، جس طریقہ سے اہلِ عرب ٹھہرتے ہیں، کیوں کہ بعض مرتبہ غلط جگہ وقف کرنے سے معنی مقصود کے خلاف ہوجاتا ہے یا خلاف ہونے کا وہم ہوتا ہے۔

قاری کی مثال مسافر کی ہے، اور اوقاف مثلِ منازل اور اسٹیشن کے ہیں، تو جس طرح مسافر درمیان سفر بلاضرورت ٹھہرنا پسند نہیں کرتا، اسی طرح سے بلاضرورت ہر مقطع پر وقف بھی قاری کے لیے ناپسندیدہ ہے، اور مسافر جس طرح ٹھہرنے کے لیے سرسبز وشاداب جگہ تلاش کرتا ہے اور چٹیل میدان جہاں سایہ اور پانی نہ ہو ٹھہرنا پسند نہیں کرتا، ایسے ہی قاری قرآن کے لیے وقف کے واسطے صحیح جگہ ہونی چاہیے جہاں معنی میں کوئی خلل نہ ہوتا ہو، لہٰذا علم وقف سے متعلق چند باتیں ملاحظہ فرمالیں:

لغوی معنی: "الکف عن القول او العمل" کسی کام یا بات سے رکنا اور ٹھہرنا۔

اصطلاحی تعریف: وہ علم ہے جس کے ذریعہ وقف کرنے کے قواعد اور اس کی جگہوں کا علم ہو۔

موضوع علم وقف: کلمہ اور کلام (بات چیت) ہے۔ کیوں کہ وقف کی دو حیثیت ہے: (۱) ایک یہ کہ وقف کس

طرح کیا جائے ۔دوسرے یہ کہ وقف کہاں کیا جائے ،تو بحیثیت کیفیت وقف ،وقف کا تعلق کلمہ کے آخر سے ہے ،اور بہ حیثیت محلِ وقف ،وقف کا تعلق ،انتہائے کلام یعنی کلام کے آخر سے ہے ۔

مقصد : (۱) وضاحتِ کلام (۲) صحتِ وقف ۔یعنی معنیٰ کا واضح ہونا اور وقف میں غلطی کرنے سے بچنا ۔

فائدہ وثمرہ : دونوں جہان میں سرخ روئی (کامیابی) حاصل کرنا ۔

حکم : اتنا علم وقف سیکھنا ،جس سے قرآن پاک پڑھتے وقت ،صحیح وقف کر سکے فرض عین ہے ،اور تمام علم وقف کا سیکھنا فرض کفایہ ہے ،یعنی سوا ستتر (۷۷٫۲۵) کیلومیٹر کے اندر ،ایک ایسے ماہر قاری کا ہونا ضروری ہے ،جو مکمل علمِ وقف کا جاننے والا ہو ،ورنہ سب گنہگار ہوں گے ۔

ارکان : علم وقف کے دو رکن ہیں :۱) کیفیتِ وقف (وقف کیسے کیا جائے ۔۲) محل وقف (وقف کہاں کیا جائے)۔

ماخذ اور اصل : یہ علم ،اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے ،نیز اس کا ماخذ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ اثر بھی ہے ،جس کو ابو جعفر نحاس نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ،نحاس نے کہا مجھ سے محمد بن جعفر انباری نے بیان کیا ان سے ہلال بن العلا نے کہا تھا کہ ان سے ان کے والد اور عبداللہ بن جعفر دونوں نے کہا کہ ہم سے عبداللہ بن عمر والرقی نے زید بن ابیسہ کے واسطے سے قاسم بن عوف البکری کا یہ قول بیان کیا کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ”لَقَدْ عِشْنَا بُرْهَةً مِنْ دَهْرِنَا وَاِنَّ اَحَدَنَا لَيُؤْتَى الْاِيْمَانَ قَبْلَ الْقُرْاٰنِ وَتَنْزِلُ السُّوْرَةُ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَتَعَلَّمُ حَلَالَهَا وَحَرَامَهَا وَمَا يَنْبَغِيْ اَنْ يُوْقَفَ عِنْدَهُ مِنْهَا كَمَا تَتَعَلَّمُوْنَ اَنْتُمُ الْيَوْمَ الْقُرْاٰنَ ـ وَلَقَدْ رَاَيْنَا الْيَوْمَ رِجَالًا يُؤْتٰى اَحَدُهُمُ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ الْاِيْمَانِ فَيَقْرَاُ مَا بَيْنَ فَاتِحَتِهٖ اِلٰى خَاتِمَتِهٖ وَمَا يَدْرِيْ مَا اٰمِرُهٗ وَلَا زَاجِرُهٗ وَلَا مَا يَنْبَغِيْ اَنْ يُوْقَفَ عِنْدَهُ مِنْهُ ،انہی کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ”وَ كُلُّ حَرْفٍ يُنَادِيْ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكَ لِتَعْمَلَ بِيْ وَتَتَّعِظَ بِمَوَاعِظِيْ “۔

یعنی ہم اپنے زمانہ میں ،ایک لمبے عرصہ تک اس طرح زندگی بسر کرتے رہے ،کہ ہم میں سے ہر ایک شخص ،قرآن حاصل کرنے سے پہلے ہی ایمان لے آتا تھا ،اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سورت نازل ہوتی ،تو ہم سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سورت کے حلال وحرام کی تعلیم (اسی طرح) حاصل کرتے ،اور ان مقامات کو معلوم کرتے تھے ،جہاں پر قراءت میں وقف کرنا چاہیے ،جس طرح تم آج کل قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہو ،اور اس کا متن وعبارات سیکھتے ہو ،اور بلاشبہ آج ہم بہ کثرت ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں ،جن میں سے کسی کو ایمان لانے سے پہلے قرآن کی تلاوت کا موقع ملتا ہے ،اور وہ فاتحۃ القرآن سے خاتمۃ القرآن تک ،پورے کا پورا پڑھ جاتا ہے ،مگر اسے اتنی بھی تمیز نہیں ہوتی کہ قرآن کا امر کیا ہے اور نہ اس کے زجر سے آگاہ ہوتا ہے اور نہ اس بات کو جانتا ہے اور نہ ہی معلوم کرتا ہے کہ قرآن پڑھتے وقت اس میں وقف کے مقامات کیا کیا ہیں ،حالاں کہ قرآن کا حرف حرف ندا اور اعلان کرتا ہے کہ میں تیری طرف اللہ کا بھیجا ہوا قاصد ہوں کہ تو مجھ پر عمل کرے اور میرے موعظت سے نصیحت حاصل کرے ۔

امام نحاس کا قول ہے کہ یہ اثر ،اس بات پر دلالت کرتا ہے ،کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اوقاف کی تعلیم

بھی، اسی طرح حاصل کرتے تھے، جس طرح وہ قرآن کو سیکھتے تھے، یہاں تک کہ الاخری میں عقل کا قول ہے، کہ بلا شبہ معرفتِ وقف ہی، مذہبِ اہلِ سنت کو، مذہبِ معتزلہ سے جدا اور ممتاز کرتی ہے اور بین المذہبین فصل واضح کرتی ہے۔
(مفہوم وخلاصہ تفہیم الوقوف، ص ۴۴،۳۶)

ابوجعفر النحاسؒ نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا" کی تفسیر "بيِّنه تبيينا" سے کی ہے۔ اس کے بعد النحاس اس تفسیر کی شرح میں فرماتے ہیں کہ "فهمن التبيين تفصيلَ الحروفِ والوقفِ على ماتم معناه منها" "یعنی تبیین کہتے ہیں حروف واضح طور پر صاف صاف ادا کرنا، اور یہ بدون تجوید ممکن نہیں، اور وقف ایسا موقع پر کرنا جہاں کلام کے معانی پورے ہورہے ہوں، یہ تفسیر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر کے ہم معنی ہے۔ (مستفاد از معلم الاداء، ص ۲۷)

فضیلت و مرتبہ: یہ بھی تجوید ہی کی طرح اہم ہے، کیوں کہ اس کا ثبوت بھی اسی آیت پاک سے ہے، جس سے تجوید کا ہے۔

واضعین علم وقف: علم القراءات جو ایک سمندر ہے، علم تجوید کی طرح علم وقف بھی اس سمندر کی ایک نہر اور شاخ ہے، لیکن تجوید وقراءت کی طرف جتنی توجہ مبذول کی گئی اتنی علم وقف کی طرف نہیں کی گئی، پھر بھی جب اس کی طرف نظر دوڑائی گئی تو اچھی خاصی تعداد سامنے آئی، چناں چہ علامہ جزریؒ کی تحقیق کے مطابق، علم وقف وابتدا کو، سب سے پہلے مدون کرنے والے، شیبہ بن نصاح مقری مدنی کوفی (متوفی ۱۳۰ھ) ہیں، جنھوں نے کتاب الوقوف لکھی، علامہ جزری فرماتے ہیں "هو اول من الّف في الوقوف" اور علم وقف، علمِ قراءت سے تقریباً ۱۲۵ رسال قبل مدون ہوا، پھر سلسلہ بڑھتا گیا اور تیرہویں صدی تک سیکڑوں اہم کتابیں تصنیف ہوئیں، اردو زبان میں جامع الوقف، اور معرفۃ الوقوف بہت ہی مشہور ہیں، اور اس پر بہت سے مختصر اور مطول حواشی تحریر کیے گئے۔

وقف اور علمِ وقف میں فرق:

یہ ہے کہ وقف کے معنی کسی کام یا بات سے رکنا ٹھہرنا۔ اور علم وقف، اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ قرآن پاک کے معنی کی وضاحت اور پہچان ہو، اور اس میں وقف کرنے کے طریقے اور وقف کرنے کی جگہوں سے متعلق بحث ہو۔

ادلۂ اربعہ (قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس) سے علمِ وقف کا ثبوت

قرآن کریم ----: "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا" "قرآن کو ترتیل سے پڑھو (مزمل)۔ اس آیت پاک کی تفسیر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے یوں کی ہے "اَلتَّرْتِيْلُ هُوَ تَجْوِيْدُ الْحُرُوْفِ وَمَعْرِفَةُ الْوُقُوْفِ" "یعنی ترتیل نام ہے حروف کی تجوید اور وقف وابتداء کی پہچان کا، اس اثر کو امام بیہقی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے، اس تفسیر میں ترتیل کے دو جز بیان فرمائے ہیں: (۱) تجوید الحروف (۲) معرفۃ الوقوف، پس تجوید الحروف کی طرح معرفۃ الوقوف بھی ترتیل کا ایک جز اور اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ (معلم الاداء، ص ۲۶)

امر کی تاکید کے لیے "تَرْتِیلًا" مصدر بھی ذکر فرمایا جس سے امر میں مبالغہ اور تاکید مقصود ہے اور مصدر پر جو تنوین ہے وہ مبالغہ کے لیے ہے۔(ایضا،ص۲۶)

حدیث___:عدی بن حاتم طائیؓ سے روایت ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخص آئے، ان میں سے ایک شخص نے کہا "مَنْ یطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَقَدْ رَشَدَ وَ مَنْ یَّعْصِہِمَا " اور اس پر اختیاری طور سے وقف کر دیا، اس صورت میں معنی یہ ہو گئے، کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی وہ بامراد ہوا، اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ بھی بامراد ہوا۔العیاذ باللہ!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتے ہی فرمایا "قُمْ" اٹھ یہاں سے، یا یہ فرمایا "اِذْھَبْ" چلا جا یہاں سے، اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "بِئْسَ الْخَطِیْبُ اَنْتَ " تو برا خطیب ہے۔

علامہ اشمونیؒ نے یہ کلمات بھی روایت کیے ہیں "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیماً اس سے کہا کہ یوں کہو "وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَقَدْ غَوٰی "یعنی جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ نامراد ہوا۔ [redacted]

اس روایت میں یہ واضح دلیل ہے کہ خطیب کے غلط جگہ وقف کرنے سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے روک دیا۔معلوم ہوا کہ جب گفتگو میں بھی، وقف کی بے اعتدالی، نہایت ناگوار اور بھونڈا طرز ہے، تو کلام اللہ میں یہ بے اعتدالی کس درجہ مکروہ اور قبیح ہوگی، اور اس سے بچنا کس قدر ضروری ہے، حالاں کہ اس خطیب کا مقصد خیر ہی تھا نہ کہ شر۔(الجواہر النقیہ:ص ۱۹۱)

حدیث___۲:عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ ؓ قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ یَقْطَعُ قِرَائَتَہٗ یَقُوْلُ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ثُمَّ یَقِفُ، ثُمَّ یَقُوْلُ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" ثُمَّ یَقِفُ، وَ کَانَ یَقْرَأُ "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ"۔

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت میں ہر آیت کو جدا جدا کر کے علیحدہ علیحدہ اس طرح پڑھتے تھے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" پر ٹھہرتے، پھر "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پر وقف فرماتے، پھر "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" پر وقف کرتے۔(شمائل ترمذی:۲۶۵،۲ حضرت شیخ والشمائل المحمدیہ:۱۱۰)

حدیث___۳:جریرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی کہ ہم ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کریں، اور خیر خواہی کرنے کی وضاحت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرمادی کہ ہم لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور ان کو قرآن کی تعلیم دیں، اور وقف کے مواقع بھی بتائیں، جن کی دوران تلاوت ضرورت پڑتی رہتی ہے، اور ابتدا و اعادہ کے مواقع بھی بتائیں، کہ جملہ مستانفہ کہاں کہاں سے شروع ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ میری امت کو قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ محل وقف وابتدا کی بھی تعلیم دینا۔

اجماع امت___:(ا)علامہ ابوعمرو عثمان الدانیؒ لکھتے ہیں، حدیث ابن عمرؓ اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم وقوف توقیفی ہے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے، اس کی باقاعدہ صحابہ کرامؓ کو تعلیم دی ہے، اور اس پر صحابہؓ کا

اجماع ہے، پس یہ علم، اجتہادی اور قیاسی نہیں۔

(۲) علامہ جزریؒ لکھتے ہیں، کہ حضرت علیؓ کا ارشاد: "الترتیل ھو تجوید الحروف ومعرفة الوقوف" اس بات کی دلیل ہے، کہ علم تجوید سیکھنا اور وقف وابتداء کے مواقع کا جاننا واجب ہے، اور ابن عمرؓ والی حدیث، اس بات کی قوی حجت ہے کہ علم اوقاف کا سیکھنا، اجماع صحابہؓ سے ثابت ہے، پس اجماع صحابہ اس کے وجوب کی دلیل ہے۔

فائدہ: اس کی تائید حضرت علی، ابن عباس، جریر اور قتادہ رضی اللہ عنہم کے اعمال واقوال سے بھی ہوتی ہے۔ (معلم، ص ۴۲، ۴۳)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وقوف کی تعلیم پر جو اہتمام تھا، یہ ان کا اپنا فعل قرار نہیں دیا جاسکتا، بل کہ یہ کہنا چاہیے، کہ یہ ان کا معمول، تعلیمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھا۔

لہٰذا: ان آثار کو، احادیث مرفوعہ کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔ نیز حضرت ابن عمرؓ کا یہ فرمانا "لقد عشنا برھة ۔۔الخ" دلالت کرتا ہے کہ وقف کا اہتمام، جمیع صحابہؓ میں تھا جس سے اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم ثابت ہوا۔ (الجواہر النقیہ، ص ۱۹۱)

قیاس ۔۔۔۔ ہر زبان وبیان میں، وقف کی وجہ سے، معنی میں تغیر کا ہوجانا بالکل واضح ہے، مثلاً: اردو میں یہ ایک جملہ ہے "پڑھو مت کھیلو" اس میں اگر "پڑھو" پر وقف کردیا جائے اور "مت کھیلو" کو الگ بولا جائے، یا "پڑھو مت" پر وقف کیا جائے اور "کھیلو" کو الگ بولا جائے، تو پہلی صورت میں، پڑھنے کا حکم اور کھیلنے کی نفی سمجھ میں آئے گی، اور دوسری صورت میں، پڑھنے کی نفی اور کھیلنے کا حکم سمجھ میں آتا ہے۔ تو کلام اللہ میں یہ بے اعتدالی، کس درجہ مکروہ اور بری ہوگی، کہ یہ تو بہت ہی لطیف اور پاکیزہ کلام ہے، جیسا کہ خطیب کے غلط جگہ وقف کرنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی گرانی ہوئی۔

فائدہ ۔۔۔۱: علم وقف کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے، کہ یہ فن، خلف کی ایک جلیل القدر جماعت سے منقول اور مشہور ہے، اور وہ حضرات یہ ہیں:

(۱) امام نافع مدنی (۲) امام یعقوب بن اسحاق صاحب نافع (۳) امام ابوحاتم سجستانی (۴) امام محمد بن عیسیٰ (۵) امام احمد بن موسیٰ (۶) امام علی بن حمزہ الکسائی (۷) قرائے کوفہ (امام عاصم، امام حمزہ اور امام کسائی) (۸) امام اخفش سعید (۹) امام ابوعبیدہ معمر بن مثنی (۱۰) امام محمد بن یزید (۱۱) امام القتبی (۱۲) امام الدینوری (۱۳) امام ابومحمد الحسن بن علی العمانی (۱۴) امام ابوعمرو الدانی (۱۵) امام ابوجعفر بن طیفور السجاوندی (۱۶) امام ابوجعفر یزید بن القعقاع رحمہم اللہ وغیرہم۔

فائدہ ۔۔۔۔۲: (۱) برمحل وقف کرنا فی الجملہ قرآن کا حسن دوبالا کردیتا ہے، اسی واسطے کہا جاتا ہے:

"الوقف من حسن القرآن"

(۲) امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں "من لم یعرف الوقف لم یعرف القرآن" جس نے وقف اور محل وقف

کونہ پہچانا اس نے قرآن نہیں سمجھا۔

(۳) علامہ جزریؒ فرماتے ہیں "الوقف حلیۃ التلاوۃ و زینۃ القاری و فھم المستمع و فخر العالم و بہ یعرف الفرق بین المعنیین المختلفتین و النقیضین المتنافیین و الحکمین المتغایرین "یعنی وقف، تلاوت کا زیور، قاری کی زینت، سننے والے کا فہم اور عالم کا فخر ہے، اور اسی کے ذریعہ دو مختلف معنوں، دو متنافی نقیضوں اور دو متغایر حکموں میں فرق معلوم ہوتا ہے۔

(۴) علامہ ابن الانباریؒ فرماتے ہیں "من تمام معرفۃ القرآن، معرفۃ الوقف و الابتداء" قرآن کی پوری معرفت میں سے ایک علم معرفۃ الوقف والابتداء ہے۔

فائدہ ۔۔۔۔ ۳: اصطلاحات علم الوقوف والابتدا

علم وقف وابتدا میں استعمال ہونے والی اصطلاحات: وقف، سکتہ، سکوت، قطع، کیفیتِ وقف، محل وقف، کیفیتِ وقف بلحاظ ادا، بلحاظ اصل، بلحاظ رسم، بلحاظ وصل، وقف بالاسکان، بالاشمام، بالروم، بالابدال علی الابدال، بالالحاق، بالحذف، بالنقل والحذف، بالابدال والادغام، وقف بالسکون، بالتشدید، بالاظہار، بالاثبات، وقف موافق رسم و وصل، وقف موافق رسم ومخالفِ وصل، وقف موافق وصل ومخالف رسم، وقف موافق اصل ورسم، وقفہ، سکتہ، سکتۂ طویلہ، سکتۂ لطیفہ، وقیفہ، وقفۂ خفیفہ، وقفۂ یسیرہ، سکتۂ قصیرہ، سکتہ یسیرہ، مختلسہ، مقللہ، خفیفہ، قطع حقیقی، قطع اتفاقی، مقطع، موقوف، موقوف علیہ ۔۔۔ وقف تام، کافی، اکفی، حسن، احسن، قبیح، اقبح، صحیح، اصح۔

وقف اختیاری، اضطراری، اختباری، انتظاری آیت مختلف فیہ، وقف لازم، وقف مطلق، وقف جائز، وقف مجوز، وقف مرخص، قیل علیہ الوقف، کذالک، قف، صل، صلی، لاوقف علیہ، لاابتداء منہ، قیل علیہا لوقف، آیت لا، وقف معانقہ، وقف مراقبہ، وقف النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)، وقف منزل یا جبرئیل، وقف غفران، وقف کفران۔

ابتدا: کیفیتِ ابتدا، محلِ ابتداء، ابتدائے حقیقی، ابتدائے اصطلاحی، ابتدائے حکمی، ابتدا تقدیری، ابتدا بالحرکۃ، ابتدائے احسن، ابتدائے حسن صحیح، ابتدائے قبیح۔

اعادہ: اعادۂ حسن، اعادۂ احسن، اعادہ قبیح، اعادہ اقبح۔

وصل: کیفیت وصل، وصل بنیت وصل، وصل بنیت وقف، وصل حرکت بالحرکت، وصل سکون بالسکون وصل حرکت بالسکون، وصل سکون بالحرکت، محل وصل، وصل حقیقی، وصل اصطلاحی۔

(ان تمام کی تعریفات وتفصیلات فن کی بڑی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں۔)

تم بحمد اللہ تعالیٰ ومنہ وتوفیقہ والصلاۃ علی نبیہ الکریم وحبیبہ

علم قراءت کے مراجع ومصادر عربی:

(۱) التیسیر (ابو عمرو عثمان الدانیؒ)

(۲) جامع البیان فی القراءت السبع	(ابو عمرو عثمان الدانیؒ)
(۳) قصیدہ لامیہ المعروف بالشاطبیہ	(علامہ شاطبیؒ)
(۴) النشر فی القراءت العشر	(محقق فن علامہ جزریؒ)
(۵) تحبیر التیسیر	(محقق فن علامہ جزریؒ)
(۶) غایۃ النہایہ فی طبقات القراء	(محقق فن علامہ جزریؒ)
(۷) تقریب النشر	(محقق فن علامہ جزریؒ)
(۸) ارشاد المبتدی و تذکرۃ المنتہی فی القراءت العشر	(محقق فن علامہ جزریؒ)
(۹) کتاب المختصر فی القراءت العشر	(محقق فن علامہ جزریؒ)
(۱۰) المہذب فی اجراء القراءت العشرۃ	(محقق فن علامہ جزریؒ)
(۱۱) الحجۃ للقراءۃ السبعۃ	(ابو الحسن علی بن عبد الغفار الفارسیؒ)
(۱۲) الکشف عن وجوہ القراءت	(مکی بن ابی طالبؒ)
(۱۳) کتاب القراءت	(ابو حاتم سہیل بن محمد السجستانیؒ)
(۱۴) کتاب القراءت	(ابو عبید قاسم بن سلامؒ)
(۱۵) کتاب القراءت	(قاضی اسماعیل ابو اسحاق)
(۱۶) کتاب القراءت	(ثعلب ابو العباس کوفی بنداس)
(۱۷) حجۃ القراءات	(ابو زرعہ عبد اللہ نجلہؒ)
(۱۸) کتاب التذکرہ فی القراءۃ	(الشیخ ابو الحسن طاہر بن غلبونؒ)
(۱۹) البدور الزاہرۃ	(الشیخ عبد الفتاح القاضیؒ)
(۲۰) کتاب التبصرۃ	(ابو محمد مکی القرطبیؒ)
(۲۱) آداب القراءت	(عبد اللہ بن مسلم الدین پوریؒ)
(۲۲) القرات العشر المتواترۃ	(الشیخ محمد کریم راجحؒ)
(۲۳) اشہر المصطلحات فی فن الاداء و علم القراءات	(احمد محمود عبد السمیع الحفیانؒ)
(۲۴) الکتاب الموضح فی وجوہ القراءات و عللھا	(امام نصر بن علی المعروف بابن مریمؒ)
(۲۵) القراءات احکامہا و مصدرہا	(الدکتور سفیان محمد اسماعیلؒ)
(۲۶) المنہج فی القراءات السبع	(عبد اللہ بن علی البغدادیؒ)
(۲۷) غیث النفع فی القراءات السبع	(ولی اللہ سید علی النوری الصفاقسیؒ)

(۲۸) کتاب القراءت　　(احمد بن جبیر رحمہ اللہ)

اردو مراجع و مصادر:

(۲۹) تنشیط الطبع فی اجراء السبع　　(حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ)
(۳۰) جامع القراءات　　(قاری محب الدین صاحب رحمہ اللہ)
(۳۱) کاشف الابہام　　(قاری محب الدین صاحب رحمہ اللہ)
(۳۲) احیاء المعانی (۱) و (۲)　　(قاری ظہیر الدین معروفی رحمہ اللہ)
(۳۳) اصول ورش عن نافع مدنی　　(قاری ظہیر الدین معروفی رحمہ اللہ)
(۳۴) اجراء السبعۃ المتواترۃ　　(قاری ظہیر الدین معروفی رحمہ اللہ)
(۳۵) الفوائد المحبیہ　　(قاری محمد انیس صاحب فیض آبادی رحمہ اللہ)
(۳۶) الفوائد المتمہ لقراءات العشر　　(قاری محمد انیس صاحب فیض آبادی رحمہ اللہ)
(۳۷) الفوائد المکملۃ للقرات العشر　　(قاری محمد انیس صاحب فیض آبادی رحمہ اللہ)
(۳۸) تیسیر الطبع فی اجراء السبع　　(قاری محمد حسین مالیگانوی رحمہ اللہ)
(۳۹) روح القراءت　　(قاری ابو الحسن صاحب اعظمی)
(۴۰) علم قراءت اور قراء سبعہ　　(قاری ابو الحسن صاحب اعظمی)
(۴۱) تیسیر القراءت فی السبع المتواترات　　(قاری ابو الحسن صاحب اعظمی)
(۴۲) قراءات عشرہ کا حامل قرآن مجید　　(قاری ابو الحسن صاحب اعظمی)

علم تفسیر

مولانا ریاض صاحب اشاعتی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

علم تفسیر شریعت کے ان بنیادی علوم میں سے ایک علم ہے جس کا تعلق قرآن کریم سے ہے، جس میں یہ بات ملحوظ خاطر ہے کہ علم تفسیر کا جاننے والا شریعت کے احکام و مسائل کو قرآن کریم کی الفاظ و نصوص سے استنباط و استخراج کی قوت حاصل کرلے۔ مخلوق کو خالق کے حقوق کی یاد دہانی کی نسبت سے ۔ اور عبادت گزار کو آخرت کے دن کے لیے مکمل تیاری پر متنبہ کرنے کی نسبت سے ۔ اور انسان کو شیطان اور نفس کے فریب کاریوں سے بچانے کی نسبت سے اور اس کے علاوہ اور جو چیزیں نتیجۃً

مومن کو اس سے حاصل ہوتی ہے وہ اللہ کے کلام کی معرفت کاملہ اور اس کے رموز و اسرار الٰہی کی معانی پر اطلاع ہوتا ہے۔

فن تفسیر کی تعریف اور اس کا موضوع:

امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب البرہان میں علم تفسیر کی تعریف اس طرح فرمائی ہے کہ وہ ایسا علم ہے جس میں قرآن کریم کے احوال سے بحث ہوتی ہے اس حیثیت سے کہ علم تفسیر کلام اللہ کی مراد پر بقدر طاقت بشری دلالت کرتا ہے۔علامہ صدیق بن حسین قنوجی اپنی کتاب ''ابجد العلوم'' میں تعریف فرماتے ہیں: یہ ایسا علم ہے جو نظم قرآن کے معانی کے متعلق بقدر بشری طاقت عربی لغت کے تقاضے کے اعتبار سے بحث کرتا ہے۔

تفسیر لغت میں وضاحت اور بیان کو کہتے ہیں قرآن کریم کی آیت میں یہ کلمہ اسی معنی میں آیا ہے: ''ولا یاتونک بمثل الا جئنک بالحق و احسن تفسیرا ای احسن بیانا و تفصیلا ''۔(الفرقان ۳۳)

علم تفسیر کا موضوع کلام اللہ ہے، جو ہر حکمت کا سر چشمہ اور فضلیت کا معدن ہے، پس اس کی غایت کلام اللہ کے معانی کی فہم تک پہونچنا ہے اور اس کے احکام کا استنباط و استخراج اور اس کی مراد کا جاننا ہے۔تا کہ اس سے دنیاوی و اُخروی سعادتوں سے سرفراز و مالا مال ہو، اللہ کا کلام چوں کہ بڑا ہی مقدس اور بابرکت اور معنی خیز ہوتا ہے، لہذا کلام اللہ کے ذریعہ خلق خداوندی کے احوال، اور ان کے احکام، اور دیگر اہم ترین نتائج بر آمد کرنے ہوتے ہیں، اس لیے دیگر علوم کی طرح ہر شخص قرآن کریم کی تفسیر کے لائق نہیں ہو سکتا، بل کہ اس کے لیے کسبی و وہبی علوم و فہم کا ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر صحیح نتائج بر آمد نہیں ہو سکتے اور ناقص فہم و فراست اور علم کی بنیاد پر گمراہیاں جنم لے سکتی ہیں۔اسی لیے علما نے علم تفسیر پر مہارت کے لیے ذیل میں دیئے جانے والے امور کے لحاظ کو ضروری قرار دیا۔

تفسیر کے لیے کن علوم کا جاننا ضروری ہے:

یہاں سے علما نے بیان فرمایا ہے کہ علم تفسیر کی معرفت موقوف ہے کسبی علوم کی معرفت پر۔اور کسبی علوم یہ ہیں: علم لغت، علم نحو، علم صرف، علم اشتقاق، علم معانی، علم بدیع، علم قرأت، علم اصول دین، علم اصول فقہ، علم اسباب نزول، علم القصص، علم الناسخ و منسوخ، علم فقہ، علم احادیث جو آیات مجملہ اور آیات مبہمہ کی تفسیر کرتی ہیں۔مزید وہبی علوم پر جو اللہ تعالیٰ بندے کو محض تقوی و طہارت، اخلاصِ نیت اور اپنے فضل و احسان سے عطا کرتے ہیں۔ان سارے علوم کے علاوہ یا بعض کے بغیر علم تفسیر سے تعرض کرنے والے پر اندیشہ ہے کہ کہیں وہ خود گمراہ نہ ہو یا دوسروں کو گمراہ کرے۔

فضیلت: علم تفسیر کی فضیلت تمام مسلمانوں کی طرف نظر کرتے ہوئے تمام علوم میں زیادہ مشرف و مکرم و ارفع علم ہے۔

اصفہانیؒ نے فرمایا اس کی شرافت چند وجوہ سے ہے:

ا)باعتبار موضوع کے۔اس لیے کہ اس کا موضوع کلام ربانی ہے۔

دوسرے باعتبار غرض کے۔اس لیے کہ اس کی غرض اعتصام بحبل اللہ اور اعتصام بالعروۃ الوثقیٰ ہے اور اس کے ذریعہ سعادت حقیقی تک وصول ہے جو آخری غایت ہے۔

تیسرے اس کی شدت حاجت کی بنا پر۔ جیسا کہ فرمایا کہ ہر کمال دینی و دنیوی علوم شرعیہ اور معارف دینیہ کے جاننے کا محتاج ہے، اور علوم شرعیہ کا جاننا موقوف ہے کتاب اللہ کے جاننے پر۔ معلوم ہوا کہ علم تفسیر انسان کی مادی و معنوی تمام ضروریات کا کفیل ہے۔

علوم تفسیر کے مآخذ:

سب سے پہلے جس ذات گرامی نے قرآن کریم کی تفسیر فرمائی وہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے آپ ہی نے قرآن کریم کے نصوص والفاظ کی بہ حکم خداوندی تفسیر فرمائی، اس کے پوشیدہ معانی کے راز کھولے اور اس کے اسرار و حکم اپنی شاگردوں اور صحابہ کرام کی جماعت کو کھول کھول کر سمجھائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ حکم اور ذمہ داری دی گئی تھی کہ آپ قرآن کریم کے معانی کھول کھول کر لوگوں کے سامنے واضح کریں۔ جیسا کہ فرمایا (لتبین للناس ما انزال الیھم) النحل ۴۴۔ ابن خلدونؒ اپنے مقدمے میں فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجمل میں وضاحت فرماتے اور ناسخ کو منسوخ سے الگ کرتے اور اپنے صحابہ کو سکھاتے تو انہیں معلوم ہوگیا کہ اسباب نزول اور آیات کا مقتضائے حال آپ صلی اللہ علیہ سلم سے کیا بیان فرمایا۔ جیسا کہ صحابہؓ نے سمجھ لیا اللہ تعالیٰ کے قول (اذا جاء نصر اللہ والفتح) سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے دے ہے۔ (ابو لعیل اور بیہقی ۔ابن مردویہ ابن عمر سے اس بات کو نقل فرمایا ہے) چناں چہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب تفسیر تمام صحابہ کرام کو معلوم تھا جنہوں نے جتنی آیتیں اور جتنی سورتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تفسیر و تشریح کے انداز پر سیکھیں وہ ان تمام آیتوں اور سورتوں کو اپنے شاگردوں اور تابعین عظام کو اسی انداز و اسلوب سے سمجھاتے اور بتاتے رہے، کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن الفاظ و نصوص کی جو بھی تفسیر فرمائی ہے وہ اپنی طرف سے نہیں بل کہ خداوند قدوس کی طرف سے ہے "وما ینطق عن الھویٰ ان ھوالا وحی یوحیٰ" کا صاف مطلب سمجھ کر اسی تفسر میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کرتے، اس کے لیے صحابہ بڑی مشقتیں برداشت کرتے، تفسیر کے سلسلے میں صحابہ کرام نے بڑا اونچا مرتبہ حاصل کیا، مشہور مفسرین صحابہ میں خلفائے اربعہ کا نام سرفہرست ہے۔ حضرت علیؓ خلیفہ رابع اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے متعلق جو بھی تم پوچھنا چاہو مجھ سے پوچھو، کیوں کہ خدا کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں کہ رات میں اتری یا دن میں، نرم زمین پر اُتری یا پہاڑ میں۔

صحابہ کرام نے تفسیر کے حوالے سے سب سے اونچا مقام حضرت ابن مسعودؓ کا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تعلیم و تفسیر حاصل کرنے کے لیے چار صحابہ کرام کا خاص طور سے نام لیا تھا، جن میں حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ، حضرت اُبی ابن کعبؓ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہ اور حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ شامل ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تفسیر کرنے والوں میں سب سے پہلے حضرت عبد اللہ ابن مسعود کا نام لیا، یہ ان کے تفسیر کے میدان میں سب سے بلند مقام پر فائز ہونے کی دلیل ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی ایک صفت

میں کئی افراد کا نام شمار کیا جائے تو جس شخص کا نام سب سے پہلے لیا جائے وہ اس صفت میں سب سے اعلیٰ اور بلند ہوتا ہے۔

مذکورہ حدیث میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے تفسیر قرآن اور تعلیم کتاب اللہ کے لیے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا نام لیا جو آپ کے علمِ تفسیر کے میدان میں سب سے ماہر ہونے کی نبوی شہادت ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کے بعد سب سے اونچا مقام تفسیر کے میدان میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفسیر کتاب کے لیے اور تاویل قرآن کے لیے خصوصیت کے ساتھ دعا دی تھی اور فرمایا تھا: ”اللھم علّمه تاویله“ خدایا! ابن عباس کو تفسیر کا علم عطا فرما! اس دعا کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ ابن عباس کو عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود قرآن کریم کی تفسیر کا ایسا گہرا اور پختہ علم عطا فرمایا تھا کہ آپ کو امت، امتِ مسلمہ ترجمان القرآن رئیس المفسرین اور حبر الامۃ کے نام سے آج بھی کرتی ہے اور آپ نے ایسے شاگردوں کو میدان تفسیر میں آگے بڑھایا جنھوں نے پوری جاں فشانی اور اخلاصِ نیت کے ساتھ قرآن کریم کی تفسیر کو سیکھ کر تبعِ تابعین تک یہ امانت پوری طرح پہونچادی۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں مفسر قرآن حضرت مجاہد ابن جبیر کا نام سرِ فہرست ہے، جنھوں نے اپنے استاذ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے علم تفسیر سیکھنے میں ایسا ذوق وشوق دکھلایا کہ قرآن کریم کی تفسیر حرف بہ حرف اپنے استاذ سے سیکھی۔ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ حضرت مجاہدؒ نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے قرآن کریم کی ایک ایک لفظ الم سے لے کر من الجنة والناس تک تین مرتبہ ختم فرمایا۔ خود حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں اپنے استاذ ابن عباس کو ایک ایک لفظ اور ایک آیت پر روکتا، اس کی تفسیر وتشریح پوچھتا اس طرح پھر آگے بڑھتا۔ اسی طریقے سے میں نے پورا قرآن، پوری تفسیر وتشریح کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن عباس کے پاس تین مرتبہ مکمل کیا۔

اور صحابہ میں سے مفسرین عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو ترجمان القرآن ورئیس المفسرین کے القاب سے پکارے جاتے تھے اور حبر الامۃ کے نام سے پکارے جاتے تھے اور تابعین میں مشہور مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہ مولی ابن عباسؓ، طاؤسؒ، عطا بن ابی رباح، ان تمام نے ابن عباسؓ سے سنا اور روایت کیا اور ابن مسعودؓ سے علقمہ، اسود بن یزید النخعی، عبیدہ بن عمر، اسلمانی، اور عمرو بن شرجیل نے روایت کیا ہے پھر نیچے والا طبقہ آتا ہے صغار تابعین کا اور تبع تابعین کا پس روایت کو مدون کیا گیا اور علم حدیث سے الگ کیا گیا تو اس طبقہ تالیہ میں پہلی مرتبہ کتابیں ظاہر ہوئی جو علم تفسیر سے متعلق تھی کہا جاتا ہے کہ عبدالملک ابن جریج متوفی ۱۴۹ھ نے سب سے پہلے ان احادیث کو جمع کیا جو تفسیر سے متعلق مستقل ایک کتاب میں ہے۔ اور کچھ کتابیں ایسی ہیں جس میں زیادہ تر توجہ الفاظ قرآن کی تفسیر پر ہے اور اسی طرح الفاظ معانی کی وضاحت پر ہے جیسے امام راغب اصفہانی کی مفردات القرآن۔ اور غریب القرآن بجستانی کی اور کچھ تفاسیر ایسی جن میں پوری توجہ صرف ان آیات کی تفسیر پر ہے جو احکام شرعیہ سے متعلق ہوں مثلاً تفسیر احکام القرآن امام شافعیؒ، ابن عربی اور قرطبی کی احکام القران اور بعض تفاسیر میں زیادہ توجہ، علمی اصلاحات جو قرآن کی عبارات میں ہیں اسے تفسیر علمی کا نام دیا جاتا ہے جو قرآن اور علم کونی میں ربطہ تو ظاہر کرتی ہیں،

جیسے کہ طنطاوی کی تفسیر جوھری المعاصر اس جیسی کتابیں امام غزالی، ابوالفضل مرسی ۔الاخوف رحمہم اللہ نے مختلف لکھیں۔

اور آخیری قسم وہ تفاسیر ہیں، جن میں زیادہ اہتمام علوم عربیہ پر ہے جیسا کہ نحو وبیان وبدیع، اور اسی طرح بلاغت اور اعجاز جو قرآن کی آیتیں ہیں ۔اس سلسلے میں بعض مصنفین نے الگ طریقہ اختیار کیا۔ مثلاً الشیخ مکی ابن ابی طالب عکبری، صرخدی۔ اور باقلانی۔ الرمانی۔ الرافعی کی تصنیفات ابن جریر عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا: کہ اس قرآن میں سارے علوم گنائے گئے۔ اور ہر چیز کو ہمارے اس سے الگ کیا لیکن ہمارے علم قرآن کی بیان کردہ علوم رسائی سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالی نے سچ فرمایا: ہم نے کتاب میں کسی چیز کو کم نہیں کیا۔

پھر اس کے بعد علم تفسیر کی تصانیف آگے بڑھی اور اسانید کو حذف کیا گیا، اور متعدد روایات ایک دوسرے کے ساتھ نسبت کی بنا پر جمع کیا گیا۔ پھر علماء مفسرین، روایات کے لینے میں تنقید کا طریقہ اپنایا، اور روایات میں طریق تمیز کو اپنایا تا کہ صحیح احادیث کو قبول کیا جاوے اور ضعیف کو رد کیا جاوے ۔ اس سلسلے میں علامہ محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن، معتبر مانی جاتی ہے۔ جو نہایت عظیم الشان بھی ہے اور بہت پہلے جو تفسیر ہم تک پہونچی کامل طریقہ سے وہ یہ تفسیر ہے۔ اس اعتبار سے کہ تفسیر علما کی گواہی سے یہ تفسیر عظیم اور جدید کہلائی، اور یہ تیس ۳۰ رموٹی جلدوں میں ہے۔

تفسیر کی قسمیں:

اور کتب تفسیر قسم ہا قسم کی اور متعدد آنے لگی یہاں تک ان کو شمار میں نہیں لایا جا سکتا ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امت اسلامیہ کا اپنے رب کی کتاب کے ساتھ اہتمام شان اور اس کے ساتھ مشغولیت کی ۔اور امت کا بہت زیادہ محنتیں صرف کرنے مختلف نوع سے کتاب اللہ کی تفسیر کے لیے۔

بعض علما نے کتاب تفاسیر کو شمار کیا ہے جو معروف ہیں، لیکن علمی اعتبار سے تقسیم کی جیسا کے آگے آرہا ہے۔

(۱)　تفسیر بالماثور یعنی قرآن کی تفسیر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یا نفس قرآن سے اور اقوال صحابہ سے پھر اقوال تابعین سے۔

اس نوع کی تفاسیر تفسیر طبری، تفسیر بحر العلوم، السمرقندی، معالم التنزیل البغوی، الدر المنثور للسیوطی، تفسیر ابن کثیر۔

(۲)　تفسیر بالرائے، وہ اسباب النزول پر اعتماد کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر مجتہد کے اجتہاد سے، اس طرح احکامات کی آیات کی دلالت پر اعتماد کرتے ہوئے ناسخ ومنسوخ پر وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تفسیر بالرائے اگر اس کو مقید نہ کیا جائے تفسیر کی شرائط وضوابط کے ساتھ تو گمراہی کا خطرہ ہے اور تعصب کے دروازے کھولنے کا سبب ہے بل کہ کلام اللہ کی مراد سے باہر کر دیتی ہے، لیکن تفسیر بالرائے کی مشہور کتابیں، اور مفسرین کی پائے استقامت کو ہی پہونچی ہوئی۔ اور علمی دائرے میں چلنے والی، اور مستحسن اقوال سے

خروج نہ کرنے والی اور بالکل صحیح نہج پر قائم، وہ "مفاتیح الغیب" امام رازی کی ہے، "انوار التنزیل" بیضاوی کی ہے، "روح المعانی" آلوسی کی اور لباب النقول خازنی کی۔

المصادر والمراجع:

معالم التنزیل (ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی)

تفسیر القرآن العظیم (ابن کثیر دمشقی)

اعراب القرآن و بیانہ (محی الدین الدرویش)

اعراب القرآن صرفہ و بیانہ (محمود الصافی)

الاعراب المفصل (____________________)

مفاتیح الغیب (فخر الدین محمد بن عمر الرازی)

فی ظلال القرآن (سید قطب)

تفسیر النسفی (عبداللہ بن محمود النسفی الحنفی)

تفسیر الخازن (علاؤ الدین علی ابن محمد البغدادی)

تفسیر الجلالین (جلال الدین المحلی و السیوطی)

تفسیر الآلوسی (شہاب الدین محمد الآلوسی)

احکام القرآن (ابو بکر جصاص الحنفی)

احکام القرآن (ابو عبداللہ محمد ابن ادریس الشافعی)

احکام القرآن (ابو بکر ابن العربی المالکی)

الدر المنثور فی التفسیر بالماثور (جلال الدین سیوطی)

البحر المحیط (ابو عبداللہ محمد ابو حیان الغرناطی)

تفسیر ابی السعود (ابو السعود محمد بن محمد العمادی الحنفی)

تفسیر القاسمی المسمی (محسن التاویل) (جمال الدین القاسمی)

تفسیر النیسابوری (نظام الدین الحسن بن محمد الحسین الخراسانی النیسابوری)

فتح القدیر فی الجمع بین الروایۃ و الدرایۃ فی التفسیر (محمد بن علی الشوکانی)

جامع البیان عن تاویل ای القرآن (ابو جعفر محمد بن جریر الطبری)

الجامع لأحکام القرآن (ابو عبداللہ محمد ابن احمد الانصاری القرطبی)

املاء ما من بہ الرحمن من وجوہ الاعراب و القراءات فی جمیع القرآن (محب الدین ابو البقاء العکبری)

الکشاف عن حقائق التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل (ابو القاسم محمود بن عمر الخوارزمی الزمخشری)

اردو مصادر و مراجع:

تفسیر عثمانی (شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی)

بیان القرآن (حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

معارف القرآن (مفتی محمد شفیع صاحب)

گلدستۂ تفاسیر (مولانا عبدالقیوم صاحب، مہاجر مدنی)

تفسیر ماجدی (مولانا عبدالماجد دریا آبادی)

قرآنی افادات	(مولانا ابوالحسن علی ندوی)
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	(مولانا منظور نعمانی)
دروس القرآن	(مولانا منظور نعمانی)
تفسیر میرٹھی	(مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی)
تفسیر عزیزی	(مولانا عبدالعزیز محدث دہلوی)
انوار القرآن	(مولانا نعیم صاحب)
تفسیر انوار البیان	(مولانا عاشق الہی بلند شہری)
اشرف التفاسیر	(افادات حکیم الامتؒ)
تفسیر ابن کثیر	(مترجم: انظر شاہ کشمیری)
تفسیر نسفی	(مترجم: انظر شاہ کشمیری)
زبدۃ التفاسیر	(حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ)
ہدایت القرآن	(مولانا سعید صاحب پالن پوری)
معارف القرآن ادریسی	(حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ)

علوم قرآن کی اہمیت وافادیت

بہ قلم: افتخار احمد قاسمی بستوی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم، آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تا کہ تمام انسان و

جنات کو راہِ ہدایت ملے اور خداوندِ قدوس کی رضا و جنت کے مستحق بنیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو کلام اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے اس کی مراد جاننا ازبس ضروری ہے مختلف علوم وفنون کی مدد سے انسانی امکانی طاقت خرچ کر کے کلام الٰہی کی مراد جاننے کی ماضی میں ہمارے اسلاف کی طرف سے بڑی مبارک کوششیں کی گئی ہیں جو "علوم قرآن" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

علومِ قرآن کے مقاصد و منافع:

اسلاف کی قرآن کریم کے معانی و مطالب واضح کرنے کے سلسلے کی جو مثبت و مبارک کوششیں نبی آخر الزماں کی احادیث کی روشنی میں کی گئی ہیں انہیں کو "علوم تفسیر" کہا جاتا ہے، جو صرف ایک علم کا نام نہیں ہے، بل کہ مختلف علوم وفنون کو کشید کر کے قرآن کے مفاہیم کو سمجھائے جانے کا نام ہے۔ اسی کو علمی حلقوں کو علومِ قرآن سے یاد کیا جاتا ہے جس کا پورا مدار، اور مکمل انحصار قرآنِ کریم کے الفاظ ونصوص کی مدد سے احکامِ خداوندی کی وضاحت ہے، قرآن کریم میں ذکر کردہ توحید و رسالت اور آخرت کے مضمون کو کھولنے کے ساتھ خدا کی قدرت، عظمت، علم، جلال اور جبروت کو بیان کرتا ہے۔ قرآن پر اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کا جواب اسی علم کی مدد سے دیا جاتا ہے، قرآن کریم کے محاسن و بلاغت پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے، جس سے بندگانِ خدا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ اقوام پر کیا کیا انعامات اتارے ہیں، کیا کیا سزائیں دی ہیں اور کتنے قسم کے واقعات، کتنی اقوام کے ساتھ پیش آئے ہیں موت کے حالات، حشر ونشر کی باتیں، حساب وکتاب کا ذکر، میدان محشر میں بندوں کی حالت اور جنت وجہنم میں داخل ہونے کی حالت پھر جنت کی بے شمار نعمتیں اور جہنم کے دل دوز عذاب اور حمیم وغساق کی خطرناک حالت، ان تمام چیزوں کی وضاحت علوم قرآن کی مدد سے خدا کے بندوں کے سامنے آجاتی ہے۔

قرآن کے پوشیدہ جواہرات:

قرآن کریم میں کیا کیا علوم چھپے ہیں؟ اور کیا کیا ہیرے جواہرات اللہ تعالیٰ نے اس ابدی کتاب میں سموئے ہیں، علما و فضلا کی رائے اس سلسلے میں متعدد ہے، بعض حضرات نے تو فرمایا ہے کہ اتنے علوم ونکات اس میں پوشیدہ ہیں انسان اس کی تہ تک رسائی نہیں کر سکتا۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غفلت پردازوں کے دلوں کو اپنی پوشیدہ دانائی کی باتوں کے لیے بند کر دیا ہے وہ حکمت ودانش مندی کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ ہاں! اتقیا، صلحا، علما و فضلا کے لیے ہر روز قرآن کریم کے بحرِ بے کنار سے موتی مونگا نکالنے اور اس کی فصاحت وبلاغت سے لطف اندوز کے مواقع آتے ہیں۔

علومِ قرآن اور علامہ زرکشیؒ:

علامہ بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی (متوفی ۷۹۴ھ) نے "البرہان فی علوم القرآن" کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے: قرآن کے علوم کا احاطہ انسانی طاقت کے باہر ہے، انسان قرآن کے معانی و مفاہیم اپنی طاقت کے اعتبار سے

جتنا سمجھ لے جائے اس کی سعادت ہے، اس کے حصول کے لیے اپنی سی کوشش واجب ہے۔ زرکشی ؒ نے بھی قرآن کے علوم پر حتی المقدور کوشش کی اور ''البرهان في علوم قرآن'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس کے اہم عناوین کچھ اس طرح ہیں: ا۔آیات کے اسباب نزول۔ ۲۔آیات کے درمیان مناسبت۔ ۳۔فواصل کا علم۔ ۴۔ظاہر کی معرفت۔۵۔متشابہات کا علم۔۶۔مبہمات کا علم۔اس طرح علامہ زرکشیؒ نے قرآنی علوم کی سینتالیس اقسام بیان فرمائی ہیں جن تمام کا ذکر تو یہاں نہیں کیا جاسکتا۔ہاں اس میں چند مگر اہم عناوین کے تحت یہاں کچھ گفتگو ضروری جائے گی۔مثلاً شانِ نزول کا علم بڑی اہمیت کا حامل ہے،اسی طرح متشابہات، مبہمات اور آیتوں کے درمیان مناسبت کی معرفت بھی کافی اہم ہے، مکی مدنی سورتیں، علم رسم الخط، ناسخ ومنسوخ کا علم قرآن کی تلاوت کے آداب وغیرہ کی جانکاری ضروری ہے۔

علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے علوم کی اقسام کو یہ کہہ کر ختم فرمایا ہے کہ ''واعلم انه مامن نوع من هذه الانواع الا ولو اراد احد استقصاءه لاستفرغ عمره ثم لم يحكم امره ولكن اقتصرنا من كل نوع على اصوله والرمز إلى بعض فصوله فان الصناعة طويلة و العمر قصير وما عسى ان يبلغ لسان التقصير''۔ (البرہان فی علوم القرآن)

یہ جاننا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا تمام اقسام میں سے کوئی بھی قسم ایسی نہیں ہے، جسے ہلکے پن سے لیا جائے بل کہ ہر ایک کی یہ حالت ہے کہ اگر انسان پوری عمر بھی صرف کر کے کسی ایک قسم پر مکمل تحقیق پیش کرے، تو یہ بھی نہیں کر سکتا۔اسی لیے ہم نے ہر ہر قسم کے اصولی مباحث پر اشارہ کرنے پر اکتفا کیا ہے، کیوں کہ اس کی معلومات زیادہ ہیں اور عمر کم، اور کوتاہ عمل کی زبان وہاں تک کہاں رسائی حاصل کرسکتی ہے۔

اب آگے کی سطور میں علوم قرآن کے کچھ اہم عنوانات پر مختصر گفتگو کی جائے گی۔

شانِ نزول:

اسباب نزول کے موضوع پر بڑے بڑے علمائے کرام نے روشنی ڈالی ہے، امام بخاریؒ کے استاذ علی ابن المدینی رحمۃ اللہ علیہ نے شان نزول پر الگ سے رسالہ رقم فرمایا ہے، علامہ واحدی اور علامہ سیوطیؒ کی بھی تحریریں پائی جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی ''الفوز الكبير في اصول التفسير'' میں شان نزول پر بڑی عمدہ اور اصولی بحث کی ہے۔

شان نزول جاننا اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کی آیت کا صحیح معنی اسی وقت معلوم ہوسکتا ہے جب کہ ہم کو شان نزول کی واقفیت ہو، کبھی کبھی آیت میں الفاظ عام ہوتے ہیں اور تخصیص پر دلیل موجود ہوتی ہے، تو یہاں شانِ نزول صحیح معنی اور مرادی مفہوم کی رہنمائی کرتے ہیں، بعض مرتبہ شدید قسم کا اشکال پیدا ہوجاتا ہے، اور اس کا حل مشکل ہوتا ہے تو شانِ نزول سے اس کا حل آسان ہوجاتا ہے۔

آیتوں کے درمیان ربط:

قرآن کریم کے ربط آیات کے سلسلے میں مفسرین اور اصولیین کی دو رائیں ہیں: ایک تو یہ کہ قرآن کی آیات میں ربط تلاش کرنے کی مطلق ضرورت نہیں، اس لیے کہ قرآن حسب حالات امت کو اپنے احکام و مسائل بتلاتا رہا اور حالات میں مناسبت و ربط نہیں ہوا کرتا اور کبھی کبھی بے ربطی ہی اچھی لگتی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے اول سے آخر تک پورا قرآن آپس میں مربوط و منظم شکل میں اترا ہے، ایک عام آدمی کا کلام اگر غیر مربوط ہو تو دیوانے کی بڑ سے تعبیر کرنے لگتے ہیں، یہ تو احکم الحاکمین کا کلام ہے، اس میں ربط کیوں نہ ہوگا۔ (مستفاد علوم القرآن، مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی) اس لیے ربط آیات کے عنوان پر متقدمین و متاخرین، علمائے کرام نے کلام کیا ہے۔ علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علم شریف تحذبہ العقول و یعرف بہ قدر القائل فیما یقول ۔ "ربط کا جاننا" یہ ایک شریف علم ہے، اس سے عقل کو جلا سکتا ہے اور کہنے والے کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابو جعفر بن الزبیرؒ نے ربط بین الآیات کے موضوع پر مستقل ایک تصنیف چھوڑی ہے جس کا نام "البرھان في مناسبة ترتیب سورة القرآن" ہے۔ اسی طرح علامہ بقاعیؒ نے بھی "نظم الدرر في تناسب الآیات و السور" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ "بیان القرآن" نامی اپنی تفسیر قرآن میں ربط آیات کا حد درجے اہتمام فرمایا ہے، اور بعض مل کہا اکثر مقامات پر ربط آیات کی تقریر بالکل اچھوتی اور روہی معلوم ہوتی ہے۔

شیخ ابو الحسن شہرابانیؒ کا کہنا ہے کہ علامہ ابو بکر نیشاپوریؒ نے سب سے پہلے ربط آیات قرآنیہ پر گفتگو فرمائی اور فرمایا کہ جن کا علم و تقویٰ ضرب المثل ہوتا ہے، وہ ہر لمحہ اسی فکر اور اسی اُدھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ یہ آیت اُس آیت کے پہلو میں کیوں لائی گئی ہے، یہ سورت اُس سورت کے بعد لانے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

متشابہات کا علم:

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے ایک ہی واقعہ کو مختلف مقامات پر، مختلف سورتوں اور آیتوں میں ذکر فرمایا ہے، لیکن انوکھی بات یہ ہے کہ ہر جگہ ہر مقام پر اسلوب کلام بدلا ہوا ملے گا۔

اسی طرز کلام کو علمی حلقوں میں "متشابہات کا علم" کے نام سے جانا جاتا ہے، اس موضوع پر قدیم و جدید علمائے امت نے قلم اٹھایا ہے اور کافی حد تک اسلامی مواد چھوڑا ہے۔ علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ہدایة المرتاب في المتشابة" کے نام سے کتاب لکھی ہے، اور تاج القراء علامہ ابو القاسم کرمانیؒ نے "البرھان في متشابه القرآن" کے نام سے اور علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے "درة التنزیل و غرة التاویل" کے نام سے کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔

مبہمات کا علم:

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں بہت ساری جگہوں پر آیتوں میں مبہم الفاظ استعمال فرمائے ہیں، جن کی تعیین بعض مرتبہ احادیث میں کردی گئی ہے، تو جہاں جہاں آیات مبہمات کی تعیین احادیث میں موجود ہو اس کا علم ایک تفسیری

اشتغال رکھنے والے کو ہونا از بس ضروری ہے، جیسے کہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۸ر میں ایک ایسی مسجد جس کا خمیر تقویٰ پر اٹھایا گیا ہے"، اس میں "مسجد مبہم" ہے، اس کی تعیین "مسجد قبا" سے کی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ اللیل کی آیت ۱۹ر میں اللہ تعالیٰ نے ایک صحابی کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنا مال اپنے ہی تزکیہ کے لیے دیتے ہیں، کسی کا ان کے ذمے احسان ہوا اور اس کو اتارنا مقصود ہو ایسا نہیں ہوتا، تو اس طرح یہاں "صحابی" کا ابہام موجود ہے جس کی تعیین کا علم ہونا ضروری ہے۔

علمائے اصول تفسیر نے اس کا موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، چناں چہ علامہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ سہیلی نے ایک کتاب اسی موضوع پر تصنیف فرمائی ہے جس کا نام "التعریف و الاعلام بما أبهم فی القرآن من الأسماء و الاعلام" ہے؛ اسی طرح امام بن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "التکمیل والإتمام" ہے۔

سورتوں کے آغاز کا اسلوب:

قرآن کریم میں جتنی بھی سورتیں ہیں جن کی تعداد علمائے تفسیر نے ۱۱۴ر بتلائی ہے، تمام کی تمام دس طرح کی خصوصیتوں میں سے کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور رکھتی ہیں، اس کی توضیح یہ ہے کہ سورتوں کا آغاز ۱۰ر طرح کے کلام میں سے کسی نہ کسی نوع کلام سے ضرور ہوگا۔ اور وہ یہ ہیں: ۱) سورتوں کے آغاز میں حمد و ثنا کے الفاظ ہوں گے۔ ۲) حروف تہجی و حروف مقطعات سے آغاز ہوگا۔ ۳) ندا۔ ۴) شروع سورت کے جملے خبریہ ہوں گے۔ ۵) شرط ہوگی۔ ۶) امر ہوگا۔ ۷) استفہام۔ ۸) دعا۔ ۹) تعلیل۔ ۱۰) قسم۔

اس علم پر بھی علمائے تفسیر نے کتابیں لکھی ہیں، چناں چہ علامہ ابن ابی الاصبع نے "الخواطر والسوانح فی أسرار الفواتح" تصنیف کی ہے، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے "اتقان فی علوم القرآن" میں اسی سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔

مکی مدنی سورتیں:

علمائے تفسیر نے قرآن کریم کی سورتوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے، بعض سورتیں مکی ہیں تو بعض مدنی، اگر کوئی مکی مدنی سورتوں کی جانکاری رکھتا ہے تو اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ناسخ و منسوخ آیات کی معلومات رکھے گا جس سے احکام مستنبط کرنے میں کافی مدد ملے گی، نیز پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کے مخاطبین کو کس انداز سے کلام کیا ہے اور باشندگان مدینہ سے خطاب کا کیا اسلوب رہا ہے۔

مکی مدنی سورتوں کی تعریف میں علمائے تفسیر کا اختلاف رہا ہے بعض کا قول ہے کہ مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی سورتوں کو مکی کہا جاتا ہے اور مدینہ میں اترنے والی سورتوں کو مدنی کہتے ہیں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ ہجرت سے

پیشتر نازل ہونے والی سورتیں مکی کہلاتی ہیں اور ہجرت کے بعد نازل ہونے والی سورتیں مدنی کہلاتی ہیں، اور کچھ دوسرے اکابر کا کہنا ہے کہ جن سورتوں میں اہل مکہ کو خطاب ہے انہیں مکی اور جن میں اہل مدینہ کو خطاب ہے انہیں مدنی کہنا چاہیے۔

اب ہمیں کسی سورت کو مکی یا مدنی کہنا ہو تو انہیں تعریفات کی روشنی میں انہیں مکی یا مدنی کہیں، یا پھر نقل پر اعتماد کرتے ہوئے جن سورتوں کا مکی ہونا منقول ہو، انہیں مکی جانیں جن کا مدنی ہونا منقول ہو، انہیں مدنی جانیں۔

ان تمام گذارشات کے باوجود کچھ مسائل سورتوں کے نزول کے اعتبار سے اب بھی رہ جاتے ہیں کہ جو آیات یا سورتیں رات میں نازل ہوئیں انہیں کیا کہیں، جو مکہ مدینہ کے علاوہ مقامات پر اتری ہیں، انہیں کیا کہیں؟ اسی طرح جو سورتیں مکہ میں بھی اتری ہیں اور پھر مدینہ میں بھی دوبارہ ان کا نزول ہے ان کو کیا کہنا چاہیے۔ اس طرح کی باتیں بہر حال قابل تحقیق و مطالعہ ہیں۔

سات لغات پر قرآن کا نزول:

بخاری و مسلم میں صحیح حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جبرئیل امین نے مجھے قرآن ایک لغت پر پڑھایا تو پھر میں نے ان سے مراجعت کی تو انہوں نے ایک پر اضافہ فرمایا یہاں تک کہ سات لغات پر مجھے قرآن پڑھایا۔ ایک دوسری حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کریم سات لغات پر اترا ہے تو جس کو جو آسان لگے؛ اسی طرح پڑھتا رہے۔ (بخاری و مسلم) حدیث شریف میں "سبعة احرف" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کی تشریح و تعیین میں علمائے حدیث کی آرا مختلف رہی ہیں، سب سے قوی تر اور مضبوط بات یہ ہے کہ اس سے سات لغات مراد لی جائیں جو عرب کے مختلف قبیلے بولا کرتے تھے، اور مطلب یہ لیا جائے کہ قرآن کا ایک حصہ لغت قریش پر اترا ہے، ایک حصہ لغت ہزیل پر، ایک حصہ بنو تمیم کی زبان میں اترا ہے تو ایک حصہ "ازد" و "ربیعہ" قبیلے کی زبان میں اترا ہے، اسی طرح قبیلہ ہوازن اور سعد بن بکر کے قبیلوں کی زبان میں قرآن کریم کا ایک ایک حصہ نازل ہوا ہے۔

اس وضاحت سے "سبعة احرف" کی پوری تشریح دل نشیں اور اطمنان بخش ہو جاتی ہے۔

کس قبیلے کی زبان میں قرأت ہو؟

مذکورہ بالا سات قبیلوں میں سے کس کی زبان میں قرأتِ قرآن کا جواز ہے؟ اور کس کی زبان میں نہیں اس سوال کا جواب یہ ہے؟ ان تمام قبائل میں سے کسی بھی قبیلے کی زبان میں قرأت قرآن اس شرط پر جائز ہے کہ وہ اکابر امت سے منقول و مروی ہو، اس میں اجتہاد و رائے کا ذرہ برابر بھی دخل نہ ہو اس لیے کہ پورا دین اسلام سماعی اور منقول ہے کسی بھی ایک مسئلے میں اپنی ذاتی رائے کا قطعاً دخل نہیں ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابیؓ

کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبرئیل امین کی ملاقات الاخری تو آپ ۱۴۳۲ھ نے دریافت فرمایا کہ جبرئیل! مجھے تو ایک اُمی قوم کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔ جس میں بوڑھے، جوان، بچے، غلام، باندی، اور مرد، وعورت، ہر طرح کے لوگ ہیں پڑھے لکھے بھی ہیں ان پڑھ بھی ہیں تو قرآن کریم کی تلاوت کے بارے میں خدا کا کیا فیصلہ ہے حضرت جبرئیل نے اس سوال کے جواب میں فرمایا (قرآن کی تلاوت کی آسانی کے لیے) قرآن کریم سات لغات پر اُتارا گیا ہے (جس لغت پر جو چاہے پڑھے، اس کی اجازات ہے)۔

تدوین قرآن کے مراحل:

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب جب اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے تو اس کی حفاظت کا بھی پہلے ہی دن سے انتظام فرمایا ہے۔

چناں چہ جب قرآن کریم کا نزول شروع ہوا، تو اس کے مخاطب ایسے افراد بنائے گئے جن کا حافظہ ضرب المثل تھا، جتنا قرآن نازل ہوتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو اسے سنا دیتے، وہ کامل طور پر اپنے سنوں میں اسے محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دیتے، اس طرح سے سینوں میں قرآن کریم کی بے مثال تدوین کامل پختگی سے جاری رہا۔

اس کے ساتھ ساتھ تحریری تدوین بھی چلتی رہی لیکن وہ مختلف لوگوں کے پاس مختلف لکھنے کی چیزوں میں مرقوم رہی، قرآن کے جتنے بھی اجزا نازل ہوتے، اسے صحابہ اپنے پاس لکھنے کی موجودہ چیزوں پر لکھ کر محفوظ کر لیتے، ایک ایک جزقرآن کریم کا اتنی کثیر مقدار میں لوگوں نے لکھا کہ اس قلیل تعداد بھی حد تواتر تک بے کھٹک پہونچ جاتی ہے

-

یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف آیتوں کو مختلف مقامات پر صحابہ کو لکھنے کا مکلف بناتے، اور یہ فرماتے کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ، فلاں آیت کے بعد تحریر کرنا ہے، اس طرح آیتو ں وکلموں کی ترتیب بھی توقیفی ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا رسم الخط توقیفی ہے، چناں چہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک حدیث نبوی اس طرح منقول ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف اوقات وحالات میں مختلف سورتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہتی تھیں، آپ کا اس سلسلے میں طریقے کا ریہ تھا کہ جب بھی قرآن کریم کا کوئی ٹکڑا، یا کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ کا تبان وحی سے جس کو چاہتے بلا کر اس کو اس کی مقررہ جگہ پر تحریر کرواتے"۔

(احمد عن عثمانؓ)

بعد ازاں وقت گزرتا گیا، حالات بدلے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زمانۂ خلافت آیا، تو بعض ناگریز و ناگفتہ حالات کے پیش نظر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس حضرت عمر بن خطابؓ نے آکر مستقل اصرار کیا کہ قرآن کریم کو ایک جگہ ایک ہی مصحف میں جمع کیا جائے، مسلسل و مستقل اصرار کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو شرح صدر ہوا، پھر آپؓ نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کو کتابت قرآنی کے لیے حکم فرمایا۔

آغاز میں ان کو شرح صدر نہ تھا، لیکن بعد میں شرح صدر ہوا اور جمع قرآن کا عمل شروع ہو کر تکمیل کی منزل

سے ہم کنار ہوا۔

آگے چل کر حضرت عمر بن خطابؓ کا زمانہ آیا، پھر آپ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ثالث مقرر ہوئے، تو انہوں نے تمام باشندگان ملک کو ایک ہی مصحف پر جمع کرنے کا فریضہ انجام دیا، اور نوع درنوع کے جتنے قرآنی نسخے تھے، انہیں جلا کر امت کو ایک ہی مصحف پر متحد کرنے کا فریضہ انجام دیا، جو نسخے جلائے گئے تھے، ان میں بعض چیزیں بعض سے مختلط اور غیر مربوط تھیں، بعض چیزیں متفرق طور پر اس میں موجود تھیں جو بعد میں آگے چل کر اختلاف وانتشار کا باعث بن سکتی تھی، انہیں حضرت عثمان غنیؓ نے ختم کر کے ایک بڑی بھاری حکمت عملی کے ذریعے امت کی شیرازہ بندی فرمائی۔

قرآن کریم پر اعراب:

چوں کہ معنیٔ آیت کا تعلق اعراب سے ایسا ہے کہ تھوڑی سی تبدیلی سے معنی کافی حد تک بدل سکتے ہیں اس لیے جب قرآن کریم کی تلاوت کا شیوع عجم کے مسلمانوں میں عام ہوا تو زبر زیر پیش کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوئی ایسے حالات میں علمائے امت نے اعراب کی تصحیح اور قرآن کریم کو زبر زیر پیش سے آراستہ کرنے میں بے پناہ دل چسپی لی۔ پھر قرآن کریم کے اعراب کی تصحیح میں علمائے امت نے مستقل تحریریں چھوڑیں۔

امام مکی بن ابی طالبؒ نے ''المشکل فی اعراب القرآن'' لکھی، امام عکبریؒ نے ''املاً ما منّ به الرحمان من وجوہ الاعراب والقرأت فی القرآن'' تصنیف فرمائی۔ ابوحیان نحوی نے ''البحر المحیط'' لکھ کر امت پر ایک بڑا احسان فرمایا۔

یہ بات معلوم ہے کہ اعراب قرآن، اور اس سے متعلق احکام ومسائل مستقل ایک فن کی حیثیت رکھتے ہیں، ترکیب جملے کی ساخت، اور مختلف حالات میں مختلف طرح کی ترکیبیں اور اس سے معنی کی تبدیلی، یہ ایک ایسا فن ہے جس میں بڑے بڑے علما نے اپنی جولانیاں دکھلائی ہیں، اور اس کے آداب واحکام منضبط کئے ہیں۔

ابوحیان التوحیدیؒ نے لکھا ہے کہ ''سیرفی'' سے میں نے ''قائما بالقسط'' کے بارے میں سوال کیا کہ ''قائما'' منصوب کیوں ہے، انہوں نے بتایا کہ حال ہے، اس لیے منصوب ہے میں نے پوچھا: کس کا حال ہے، کہنے لگے: اللہ کا، میں نے کہاں، اللہ تعالی کا حال کہاں ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا: کہ لفظ اللہ کا حال ہے، نہ کہ وہ حال جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

رموز اوقاف کا علم:

علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ رموز اوقاف کا علم ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے آدمی کو یہ جانکاری ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں کس جگہ وقف بہتر ہے، کس طرح قرآن کریم پڑھا جائے کہ فلاں مقررہ جگہ پر جا کر ہی سانس ٹوٹے اور معنی بدلنے نہ پائے، لہٰذا اس سے بڑے فوائد وابستہ ہیں۔ اگر اس کی جانکاری نہ ہو تو کہیں نہ کہیں تو معانی بالکل

ہی بدل جاتے ہیں، اور کہیں لہجہ تبدیل ہوتا ہے، کہیں تو کفر و شرک تک کے معانی بن جاتے ہیں جس لیے رموز واوقاف کا علم از حد ضروری ہے چناں چہ علامہ ابو بکر بن مجاہدؒ لکھتے ہیں کہ رموز واوقاف کے علم پر مکمل قابو پانے کے لے ایک اچھا نحوی ہونا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح مختلف قرأتوں کی جانکاری کے ساتھ تفسیر وقصص کا علم، لغت واشتقاق کا علم اور اس کے متعلقات کا جاننا بھی ضروری ہے۔

وقف کی اکثر قراء کے نزدیک ۴ رقسمیں ہیں:

۱-وقف تام مختار ۲-وقف کافی جائز- ۳-وقف حسن مفہوم- ۴-وقف قبیح متروک ان مذکورہ بالا چاروں اقسام کی قرآن کریم میں بے شمار مثالیں ہیں۔

اس موضوع پر بھی علمائے امت اور قاریان عصر نے خوب طبع آزمائی کی ہے۔ چناں چہ ابن الانباری، ابن عبادالدانی، اور علامہ زجاج نحوی' ان سبھی حضرات نے اس فن کی خوب خدمت کی ہے، اس موضوع پر علامہ زجاج رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف' القطع والاستیناف'' بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے؛ اسی طرح علامہ دانی کی ''الاکتفاء فی الوقف والابتداء '' بھی قابل ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جس طرح اہمیت و فضیلت کے ساتھ قرآن کریم سیکھتے تھے، اسی طرح اہمیت وفضیلت کے ساتھ رموز واوقاف بھی سیکھتے تھے۔

قرآن کریم کا رسم الخط توقیفی ہے:

قرآن کریم کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ حضرت جبرئیل امینؑ کے واسطے سے خداوند قدوس کا نازل کردہ ہے، جسے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر نازل کیا ہے اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قرآن کے جو الفاظ وحروف جس انداز واسلوب سے قرآن کریم میں مکتوب ہیں ان کو اسی طرح لکھنا لازم ہے)اس لیے کہ وہ الفاظ وحروف اسی انداز واسلوب سے لکھے گئے ہیں، جس انداز سے اللہ تعالی نے حضرت جبرئیلؑ کے واسطے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھوایا ہے، چناں چہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب کوئی آیت لے کر، آسمان سے اترتے، تو قرآن کی آیت سنا کر یہ بھی بتلاتے تھے کہ اس آیت کو کہاں لکھا جائے گا اور اس کے حروف والفاظ کے لکھنے کا کیا طریقہ ہوگا، اس کا رسم الخط کس انداز کا ہوگا۔لہٰذا آج بھی جب ہم قرآن کھولتے ہیں تو اس میں مصحف عثمانی کے رسم الخط کا لکھا ہوا قرآن ہم کو ملتا ہے، جس کی اتباع لازم ہے، ہم پر لازم ہے کہ جب قرآن کی کوئی آیت کسی مضمون مقالے یا کسی دوسری جگہ نقل کریں تو جوں کی توں ہی نقل کریں، اس لیے کہ قرآن کریم کا رسم الخط بھی توقیفی ہے۔

بخاری شریف میں رسم الخط کے تعلق سے ایک واقعہ درج ہے، کہ صحابہ میں لفظ ''تابوت'' کی کتابت اور اس کے رسم الخط کے سلسلے میں اختلاف ہوا کہ اسے کیسے لکھا جائے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا کہ اس ''التابوت ''کو، گول ''ۃ'' کے ساتھ''التابوۃ'' لکھا جائے، کچھ قریش کے لوگ وہاں تھے انہوں نے کہا: نہیں! اس کو

لمبی "ت" کے ساتھ "التابوت" لکھا جائے، یہ اختلاف اور یہ واقعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ثالث کی خدمت میں پیش ہوا تو حضرت عثمان غنی نے فیصلہ سنایا "التابوت" لمبی 'ت' کے ساتھ ہی لکھا جائے، اس لیے کہ قرآن کریم قریش کی زبان میں اترا ہے، اور قریش کا رسم الخط یہی ہے۔(بخاری عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

چناں چہ قرآن کریم کا رسم الخط مصحف عثمانی کے مطابق لکھا جائے گا، چند مثالیں مصحف عثمانی کے رسم الخط کی آپ بھی ملاحظہ فرمائیں جنہیں آپ عربی کے جملوں میں تو عربی کے رسم الخط کے مطابق لکھیں گے، لیکن آیت قرآنی کے طور پر مصحف عثمانی کے مطابق ہی لکھا جائے گا "لاذبحنه" سورۂ نمل میں یہ لفظ "لا اذبحنه" حرف الف کے ساتھ مصحف عثمانی کی اتباع میں لکھا ہے، اسی طرح سورۂ نحل: آیت ۹۰ میں "ایتائی ذی القربی" یا کے اضافے کے ساتھ، سورۂ اعراف: ۱۴۵ میں "ساوریکم دار الفاسقین" ہمزہ کے بعد "واؤ" کے اضافے کے ساتھ۔

سورۂ فاتحہ: ۱ میں پہلی آیت "بسم اللہ" الف کے حذف کے ساتھ، اور سورۂ شوریٰ: ۲۴ میں "و یمح اللہ الباطل" واؤ کے حذف کے ساتھ، یہ سب مثالیں مصحفِ عثمانی کے توقیفی رسم الخط کی ہیں، اسی علم سے متعلق یہ بات بھی ہے کہ عربی زبان کے علاوہ کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کو قرآن کہیں گے یا نہیں؟ اس کی معلومات رکھنا بھی ضروری ہے جس کی تفصیل اختلافِ ائمہ کے ساتھ مطوّلات کی زینت ہے۔

قرآن کریم اور آیاتِ قرآنی کی فضیلت:

قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب ہے جس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اسی سے لگالینا کافی ہے کہ اسی کتاب میں اب نجات کا انحصار مضمر ہے، جتنی بھی اقوام اس وقت روئے زمین پر موجود ہیں سب کی نجات کا راز صرف اسی کتابِ ہدایت کے مان لینے میں پوشیدہ ہے۔ پھر جن لوگوں نے اس کی اطاعت کرلی اب اسی کے الفاظ کی تلاوت مسلسل ترقی درجات کا باعث ہے، اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونا عین مرضی مولیٰ ہے۔

قرآن کریم میں آنے والی سورتوں کی علیحدہ فضیلت ہے، مثلاً: اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ جس نے قرآن کریم کی سورۂ یٰس کو ایک مرتبہ پڑھ لیا اس کو ۱۰ قرآن کریم کا انعامی ثواب ملے گا، جس نے سورۂ زلزال دو مرتبہ پڑھی، اس کو پورے قرآن کا ثواب ملے گا، جس نے ۴ مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھی، اس کو پورے قرآن کا ثواب ملے گا، جس نے ۳ مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کی اس کو بھی پورے قرآن کا ثواب ملتا ہے۔

اسی طرح معوذتین پڑھنے سے ہر طرح کی بلاو مصیبت سے حفاظت رہتی ہے، شیطان کے اثرات سے آدمی محفوظ رہتا ہے، ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: ابی! قرآن کی کونسی آیت سب سے عظیم الشان مرتبہ رکھتی ہے، "ابی رضی اللہ عنہ" بولے: اللہ اس کے رسول کو بہتر معلوم ہے! پھر حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی سوال دہرایا کہ کون سی آیت قرآن کریم کی سب سے عظیم مرتبہ والی ہے، تو ابی بن کعبؓ نے جواب دیا کہ "آیۃ الکرسی" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاباشی دی اور میری معلومات پر خوشی کا بے حد

اظہار فرمایا۔

الحاصل علوم قرآن کے حوالے سے بے شمار باتیں ایسی ہیں جن کا جاننا اور اس پر عمل کرنا آدمی کی دنیوی و اخروی دونوں جگہ کی راحت ونجات کے لیے کافی ہے۔اس لیے ہر مسلمان کو خصوصاً اور تمام اقوام وملل کو عموماً قرآن کریم کے سنجیدہ مطالعے کی دعوت دی جاری ہے کہ فیضِ محمد کے جام سے جسے بھی نوش کرنا ہے کرلے،یہی وہ در ہے یہاں سے کسی طرح کی محرومی نہیں ہوتی،ہاں پندارِ خودی کو توڑ کر ہی آنا پڑتا ہے ؎

آتا ہے جو بزمِ جاناں میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے عقل وخرد کے دیوانے یہاں عقل وخرد کا کام نہیں

المصادر والمراجع:

مباحث في علوم القرآن (صبحي الصالح)

لباب النقول في اسباب النزول (سيوطي)

اعجاز القرآن (امام باقلاني)

اعجاز القرآن والبلاغة النبوية (صادق الرافعي)

تاويل المشكل القرآن (مسلم ابن قتيبه)　　　متشابه القرآن (قاضي عبد الجبار بن احمد)

البرهان في علوم القرآن (محمد بن عبد الله الزركشي)

الاتقان في علوم القرآن (ابو بكر جلال الدين سيوطي)

التبيان لبعض المباحث المتعلقة بالقرآن على طريق الاتقان (شيخ طاهر الجزائري)

مناهل العرفان في علوم القرآن (محمد عبد العظيم الزرقاني)

المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الكريم (محمد فؤاد عبد الباقي)

المرشد إلى آيات القرآن الكريم وكلماته (محمد فارس بركات الدمشقي)

الجامع لمواضيع آيات القرآن الكريم (محمد فارس بركات الدمشقي)

تفسير غريب القرآن (امام عبد الله بن مسلم بن قتيبه)

المفردات في غريب القرآن (ابو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الاصفهاني)

اردو مصادر ومراجع:

علوم القرآن　　　(شیخ الاسلام حضرت تقی عثمانی)

مطالعہ قرآن اصول ومبادی　　　(مولانا علی میاں ندوی)

قصص معارف القرآن	(مفتی شفیع صاحب)
قصص القرآن	(مولانا حفظ الرحمن سوہاروی)
علوم القرآن	(صبحی صالح)
تفسیروں میں اسرائیلی روایات	(اسیرادروی)
محاضرات قرآن	(محمود احمد غازی)
قرآن مجید کا تعارف	(صدرالدین اصلاحی)
وحی الٰہی	(سعید احمد اکبرآبادی)
تدوین قرآن	(مولانا مناظر حسن گیلانی)
قرآن اور علم جدید	(محمد رفیع الدین)
اعلام القرآن	(عبدالماجد دریا آبادی)
ہدایت کے چراغ	(عبدالرحمن مظاہری)
قاموس القرآن	(سجاد میرٹھی)
مفردات القرآن	(عبدالرشید نعمانی)
فضائل قرآن مجید	(حضرت شیخ زکریاؒ)
حفاظت قرآن	(قاری طیب صاحبؒ)
اعجاز القرآن	(علامہ شبیر احمد عثمانی)
نباتات القرآن	(اقتدار حسین فاروقی)
قرآن اور سائنس	(نجات اللہ صدیقی)
قرآن اور سائنسی انکشافات	(انور بن اختر)
قرآن بائبل اور سائنس	(منہاج الدین منائی)
قرآن کریم کا اعجاز بیان	(رضی الاسلام ندوی)
قرآن کے فنی محاسن	(غلام احمد حریری)
چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں	(شہاب الدین ندوی)
تبیان الراسخ (جو تاریخ تفسیر سے مشہور ہے)	(عبدالصمد صارم)
قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ	(عبداللہ عباس ندوی)

علوم حدیث اور محدثین کی گراں قدر خدمات

(مولانا)عبدالرحمن ملی ندوی
استاذ جامعہ اکل کوا

قرآن وحدیث یہی دو اساسی اور بنیادی شریعت الہیہ کے مصادر ہیں، اور دونوں وحی الٰہی ہیں، جن کو اصطلاح میں وحی متلو اور وحی غیر متلو سے تعبیر کیا جاتا ہے، وحی متلو یعنی قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ تو خود اللہ نے لیا ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت کی طرف سے اطمینان ہے،لیکن وحی غیر متلو حدیث پاک کی حفاظت کا کوئی صریح خدائی وعدہ نہ تھا اس لیے علمائے اسلام نے اس کی جانب فکر مبذول کی، اور تدوین حدیث جیسا مبارک عمل شروع کیا، طبعاً سوال پیدا ہو رہا تھا کہ احادیث کے باب میں کس پر اعتبار و بھروسہ کیا جائے، اور کس کی حدیث قبول کی جائے۔

اس لیے علما نے کچھ اصول و قواعد منضبط کئے ہیں جس کے نتیجہ میں علم وجود میں آیا جسے ''علوم الحدیث'' یا علم اصول الحدیث'' کہا جاتا ہے، جس کی بیسوں انواع واقسام ہیں اور ہر نوع کے متعلق بیسیوں کتابیں کتب خانوں کی زینت بنی ہیں، یہ ایک امتیاز ہے اس امت کے علما کا کہ انہوں نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حالات، ارشادات، اور واقعات ہی نہیں بل کہ کیفیات تک کی حفاظت کی ہے، دنیا میں کوئی ایسی امت نہیں جس نے اسطرح اپنے نبی کے حالات محفوظ کئے ہوں۔

اس امت میں ہزاروں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی ذہانت اور قوت حفظ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے اور ایک بے مثال امتیاز پیدا کیا، انہوں نے صرف احادیث کی حفاظت ہی نہیں کی بل کہ ان سے متعلق دوسرے علوم وفنون کو بھی محفوظ کر کے، اس کو ہر طرح فروغ دیا۔

حفظ حدیث ہی کے سلسلہ میں ''جرح وتعدیل'' کا فن، رجال کا فن، اور اسی کے ساتھ رواۃ حدیث کی صحت روایت، امانت ودیانت علمی جیسا عمل وجود میں آیا، جس کے نتیجہ میں لاکھوں روایت کرنے والوں کے حالات تاریخ میں محفوظ ہو گئے۔

علم حدیث سے شغف رکھنے والے ہر شخص کے لیے اصول حدیث اور محدثین کی اصطلاحات سے واقفیت بہت ضروری ہے۔تاکہ وہ ''صحیح'' وسقیم'' اور مقبول ومردود'' احادیث کے درمیان امتیاز کرسکے، علما نے اس فن کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ابتدا ہی سے اس اہم فن کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی، علماء کا کوئی دور خدمت حدیث سے خالی نہیں ہے۔کبھی تو ائمہ حدیث نے حفظ حدیث کے ذریعہ خدمت کی، کبھی تدوین کے ذریعہ، کبھی طالبان علوم حدیث کو فن رجال میں پختگی پر ابھارنے کے ذریعہ' کبھی حدیث پاک کو مختلف مراتب ومدارج میں منقسم کر کے، کبھی حدیث پر وارد ہونے والے شبہات کو دور کر کے، اور بعض مرتبہ واضعین حدیث کا پردہ چاک کر کے، اور کبھی حدیث پاک کے ایسے اصول وقواعد منضبط ومرتب کر کے جس کے ذریعہ حدیث ''حدیث مقبول'' کہلاتی ہے یا پھر ''حدیث مردود'' ''مقبول'' جسے

محدثین کے حلقوں میں پذیرائی ہوئی اور ''مردود'' جسے ان حلقوں نے شرف قبولیت نہیں بخشا، اس طرح حدیث پاک کے مختلف النوع علوم وجود میں آئے، جن کو باکمال محدثین اور ماہر رجال حدیث نے ہر دور میں نسلاً بعد نسل امت کے تمام افراد تک پہونچایا۔

اور جن کو محققین کے سنجیدہ اقلام اور ان کی تاریخی تالیفات وکتابوں نے اپنے سینوں میں محفوظ کیا ہو۔

جب ہم ''علوم الحدیث'' کا لفظ بولتے اور سنتے ہیں تو ''دفعۃً'' ہمارے اذہان میں ایسے بہت بڑے کتب خانہ کا تصور آجاتا ہے جو ''فن حدیث'' کی مختلف النوع تاریخی شروحات سے مزین ہو، یہ اس امت کا وہ قابل تحسین کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک محفوظ رہے گا۔

علم حدیث کی تعریف روایۃً و درایۃً:

رجال جرح وتعدیل نے علوم حدیث کو دو بنیادی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک علم حدیث بطور ''روایت'' دوسرے بطور ''درایت'' ''روایت'' کے معنی یہ ہوئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، کو منضبط کیا جائے، اور ''درایت حدیث'' وہ ہے جس پر خاص طور سے علم حدیث کی اصطلاح صادق آتی ہے، وہ علم ہے جس کے ذریعہ اصول، قوانین، سند، ومتن، معلوم کئے جائیں، جیسا کہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''لمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث'' میں شیخ علی بن مدینیؒ کے بعض گراں قدر مصطلحات حدیث کا ذکر کئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی منقول ہے کہ امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) نے سب سے پہلے مباحث حدیث کو اپنی کتاب ''الرسالۃ'' میں مدون کیا لیکن علامہ ذہبیؒ نے تدوین سنت نبویہ کا کارنامہ سن ۲۳ ہجری میں انجام دیا ہے۔ اور امام شافعیؒ کا زمانہ ۲۰۴ھ کا ہے۔ دوسری صدی کے اواخر میں مستقل ابواب کی شکل میں علوم حدیث کے بعض مباحث پر تالیفی کام کی ابتداء ہوئی، اس میں سبقت امام علی مدینیؒ (متوفی ۲۳۴ھ) کو حاصل ہے۔ جہاں تک چوتھی ہجری کا زمانہ ہے تو یہ مختلف اسلامی علوم ومعارف کی ترقی اور کثرت تالیفات کا زمانہ ہے۔ آج تک بھی بحمد اللہ گراں قدر اور عمدۃ تصانیف منظر عام پر آرہی ہیں، ساتویں اور دسویں ہجری کے درمیان کا زمانہ تصانیف کی کثرت اور تالیفات کی بہتات کا زمانہ کہلاتا ہے۔

بیان علوم حدیث کا جائزہ

ہم کسی بھی پہلو سے جملہ علوم حدیث کا احاطہ کرنا چاہیں تو ہم علمائے حدیث کی موثر وجامع تصانیف اور تقسیمات حدیث سے مستغنی نہیں ہوسکتے، اور خاص کر ان تقسیمات سے جن کا احاطہ شیخ ڈاکٹر نورالدین عتر نے اپنی منفرد کتاب ''منہج النقد فی علوم الحدیث'' میں کیا ہے۔ ان تقسیمات میں سے کا چند ذکر درج ذیل ہے۔

علوم رواۃ حدیث

یہ وہ علم ہے جس کا تعلق راوی حدیث کے حالات زندگی اور اس کے مبلغ علم ومرتبہ اور اس کی دیانتی زندگی سے ہے کہ کن حالات میں اس راوی کی حدیث قابل قبول ہوگی قبول روایت کے لیے بھی شرائط ہیں جیسے کہ اس کے رو کے

لیے، علوم حدیث کی اس قسم میں علمائے حدیث اور اصحاب جرح وتعدیل رواۃ صحابہ الاخریٰ ۱۴۳۲ھ کی زندگی متعارف کراتے ہیں اور ساتھ ہی رواۃ حدیث کی تواریخ ان کے مختلف طبقات اسماء وکنیات اور القاب سے متعارف کراتے ہیں۔

ان مباحث کی فروع قید تحریر سے باہر ہیں۔خاص طور پر شرائط عدالت اور اس کے مسائل جرح وتعدیل اور اس کے آداب، اس اہم موضوع پر شیخ ابن عبدالبرؒ نے ایک تاریخی تالیف ترتیب دی ہے۔ ''الاِستیعاب في أسماء الأصحاب'' کے نام سے اسی طرح ''ابن اثیر'' نے بھی ایک گرامایہ، یہ کتاب ''أسد الغابة في معرفة الصحابة'' کے نام سے ترتیب دی ہے۔ان ہی مباحث میں ایک چیز ثقہ اور غیر ثقہ کی معرفت بھی ہے۔ اس باب میں ماہرین کی کثیر تعداد میں کتابیں دست یاب ہیں۔جن میں سرفہرست ''ابن حبان'' کی ''الثقات'' علامہ ذہبیؒ کی ''تذکرة الحفاظ'' ''ابن عدیؒ کی ''الکامل في الضعفاء'' علامہ ذہبیؒ کی ''میزان الاِعتدال'' اور ابوحاتم رازیؒ کی ''کتاب الجرح والتعدیل'' اسی طرح علوم رواۃ حدیث میں ''مدلسین'' کی معرفت بھی شامل ہے۔اس اہم موضوع پر علمائے حدیث اور رواۃ محققین نے بے مثال تصانیف ترتیب دی ہیں۔جن میں خاص کر علامہ برہان حلبي الحافظ کی کتاب ''التبیین في أسماء المدلسین'' ''ابن حجرؒ کی 'تعریفات أهل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس'' ہے علمائے تواریخ نے رواۃ سے متعلق قابل قدر کتابیں تصنیف کی ہیں۔جیسے امام بخاریؒ کی ''الکبیر'' ہے طبقات رواۃ میں بھی علمائے حدیث نے کامیاب قلم کاری کی ہے۔جیسے ابن سعد کی ''الطبقات الکبریٰ'' جس سے ان تابعین رواۃ سے تعارف حاصل ہوتا ہے جو طبقہ صحابہ کرام کے بعد ہوئے۔

۲) علوم روایت حدیث

یہ قسم پانچ انواع پر مشتمل ہے:

۱) آداب طالب حدیث ۲-آداب محدث ۳-کیفیت سماع حدیث اور اس کو حفظ کے طور پر ضبط کرنا۔ ۴-صفت روایت حدیث اور اس کے ادائیگی کی شرط ۵-کتابتِ حدیث کیفیت ضبط، ان میں سے ہر نوع کی مختلف فروع اور شاخیں ہیں جن کو ہم مختصراً ذکر کررہے ہیں۔

۱۔طالب حدیث کے آداب میں سب سے پہلی چیز اخلاص نیت ہے اور محدثین سے اخذ حدیث میں کامل درجہ کی محنت وکاوش کا اظہار علم کے مطابق عمل کرنا اساتذہ کا احترام اور ان کی توقیر کرنا، طالبین حدیث، ساتھیوں کو فائدہ پہونچانا، طلب حدیث میں علمی اسلوب پیش نظر رکھنا، مصطلحات حدیث سے خاص شغف رکھنا۔

۲۔آداب محدث ۔آداب محدث میں بنیادی شئی یہی اخلاص اور تصحیح نیت ہے۔فضائل سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا، بیان حدیث کے لیے اپنی علمی اہلیت وقابلیت کو مدنظر رکھنا، بیان حدیث میں غلطی کے امکان پر اس سے رک جانا، تدریس حدیث میں جو اولیت کا مقام رکھتا ہے اس کی توقیر کرنا، خود حدیث پاک کا احترام کرنا، تصنیف وتالیف اور علمی انتاج سے خاص اہتمام وتعلق رکھنا، اسی اشتغال بالحدیث کے نتیجہ میں حدیث پاک کی بڑی وقیع اور قابل قدر تا

لیفات اور جوامع منصۂ شہود میں آچکی ہیں۔ جیسے علامہ بخاریؒ کی "الجامع الصحیح للبخاری" امام مسلمؒ کی "مسلم" امام ترمذی کی "الترمذی" اسی طرح "سنن ابوداؤد" "نسائی" "ابن ماجہ" ساتھ ہی "مصنفات" کی طرف بھی ائمہ حدیث نے پوری توجہ مبذول کی، جیسے "مصنف عبد الرزاق" "مصنف ابن ابوشیبہ" اسی طرح "مستدرکات" بھی جیسے "مستدرک حاکم" "وغیرہ" اور "مسانید" "مسند امام احمد" "مسند أبو یعلی موصلی" "أطراف" میں "تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف" "امام مِزیؒ کی" اور "ذخائر المواریث فی الدلالة علی مواضع الحدیث" "امام نابلسیؒ کی" اور "معاجم" میں "المعجم الکبیر" "الأوسط" "الصغیر" "امام طبرانی کی اصول حدیث سے متعلق دیگر جامع ترین تالیفات ترتیب دی گئی ہیں جیسے کتاب جامع الاصول من احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ابن کثیرؒ کی شیخ علی متقی ہندی کی کتاب "کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال" "امام سیوطی کی "الجامع الکبیر" اسی طرح "زوائد" میں مجمع الزوائد ومنبع الفوائد" علامہ ہیثمیؒ کی، اور علامہ ابن حجرؒ کی "المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة" اور تخریج مصنفات میں علامہ زیلعیؒ کی "نصب الرایة لأحادیث الهدایة" اور علامہ عراقی کی "المغنی عن تحمل الأسفار فی الأسفار فی تخریج ما فی الاحیاء من الأخبار" اور ابن حجر کی "التلخیص الخبیر فی تخریج أحادیث الرافعی الکبیر" اور اس کے علاوہ بھی بہت سی محقق ومدلل کتابیں کتب خانوں کی زینت بنی جارہی ہیں۔

مختصراً یہ کہ علما محدثین اور رواۃ محققین نے علوم روایت حدیث سے اپنا بے مثال قلبی تعلق استوار کیا ہے، اور اس کی طرف اپنی خصوصی توجہ مبذول کی ہے، کہ ان علوم سے جان کاری رکھنے والا ہر آدمی ششدر و حیران رہ جاتا ہے، کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں، جو مصادر و مرجع کا درجہ رکھتی ہیں، جیسے علامہ رامہرمزیؒ کی "المحدث الفاصل بین الراوی والواعی" اسی طرح خطیب بغدادی کی دو اہم کتابیں "الکفایة فی علم الروایة" اور "الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع"۔ اسی طرح علامہ یحصبی کی "الالماع فی اصول الروایة وتقیید السماع" بھی قارئین کی زینت نظر بنی ہیں۔

حدیث مقبول ومردود:

علم حدیث پر دسترس اور کامل نظر رکھنے سے ہم حدیث کی صحت نسبت کو اچھی طرح جان سکتے ہیں، کہ اس حدیث کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہے یا اس میں کذب کا احتمال ہے کہ ہم مروی شدہ حدیث پر "حسن" یا "ضعیف" کا حکم لگاسکیں۔

اس علم کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، ایک "مقبول" اور دوسرے "مردود" حدیث مقبول کی چار قسمیں ہیں: ۱۔ صحیح ۲۔ حسن ۳۔ صحیح لغیرہ ۴۔ حسن لغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کی مختص تعریفیں ہیں، اور علما نے ان میں سے ہر ایک کے متعلق بحثیں بھی کی ہیں، جسے ہم صرف بطور مثال ہی کے پیش کرسکتے ہیں نہ کہ بطور حصر۔

حدیث صحیح کی تعریف

حدیث صحیح وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو اور از اول تا آخر تمام رواۃ ثقہ عادل اور پختگی حفظ کے مالک ہوں اور اس میں کسی قسم کا شذوذ اور علت نہ پائی جاتی ہو، اس کے مصادر بھی کافی مقدار میں ہوں جیسے امام مالک کی ''موطا'' اور امام ابوعبداللہ کی بخاری، صحیح اور مسلم بن حجاج قشیری کی ، صحیح ابن خزیمہ کی صحیح ابن خزیمہ ابن حبان کی صحیح، ضیاء الدین مقدسی کی ''المختارۃ'' اور ان کے علاوہ صحیحین پر جو ''مستدرکات'' و''مستخرجات'' لکھی گئی ہیں۔

جہاں تک حدیث مردود کا تعلق ہے تو اس کی اقسام میں زیادہ مشہور یہ ہیں، جیسے حدیث ضعیف، متروک، مطروح، موضوع، مضعف، ان میں سے ہر ایک کی مستقل تعریفیں اور مسائل ہیں۔

عدالت راوی کے مختل ہونے کی وجہ سے اور حدیث مقبول کے شرائط میں سے کسی بھی شرط کے مفقود ہو جانے سے وہ حدیث ضعیف بن جاتی ہے، چاہے پھر وہ ضبط حدیث کے بارے میں شرط مفقود ہو یا سند حدیث کے بارے میں، یا متن حدیث کے شذوذ کی وجہ سے یا کسی اور اہم علت کے سبب۔

جمہور علما نے حدیث ضعیف کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مذکورہ شرائط کے ساتھ ہی ان ضعیف احادیث پر فضائل اعمال کے باب میں ہی ان پر عمل جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

حدیث مردود جو وضع اور گڑھی ہوئی ہوتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بطور کذب منسوب کی جاتی ہے، اسی وجہ سے اسباب وضع کی معرفت و جانکاری ضروری ہے، ساتھ ہی وضاعین حدیث کے حالات بھی معلوم کئے جانے چاہیے، کہ وہ حدیث پاک میں وضعیت کے وسائل و اسباب کس طرح اختیار کرتے ہیں، اور حدیث موضوع کی کیا علامات ہیں، علامت وضعیت راوی میں ہے یا مروی شدہ حدیث میں، ذیل میں چند ایسی کتابوں کی نشاندہی کی جاتی ہی، جو احادیث موضوعہ کے باب میں تحریر کی گئی ہیں، جیسے علامہ سیوطی کی ''اللآلئی المصنوعہ فی الأحادیث عن الأحادیث الموضوعۃ'' اور علامہ ابن عراق کنانی کی کتاب ''تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الأحادیث الشنیعۃ الموضوعۃ''، اور علامہ ابن قیم کی شہرہ آفاق کتاب ''المنار المنیف فی الصحیح و الضعیف'' ملاعلی قاریؒ کی کتاب ''المصنوع فی الحدیث الموضوع'' بھی شامل ہے۔

علوم متن حدیث

''متن'' حدیث کی اصطلاح میں وہ ہے، جس تک کلام کی سند صحیح طریق سے پہونچے، یعنی ''متن'' وہ ''نص'' ہے، جو سلسلہ رواۃ کے ذریعہ ہم تک صحیح طور پر پہونچے، ڈاکٹر نور الدین عتر اپنی کتاب ''منہج النقد فی علوم الحدیث'' میں رقم طراز ہیں، کہ ہم اس قسم کو، تین اقسام میں منقسم کر سکتے ہیں:

۱) ''علوم المتن'' اس کے قائل کے اعتبار سے۔　　۲) ''علوم المتن'' کی شروحات۔

۳) وہ علوم جو مروی شدہ ''متن'' کے مقابلہ و مقارنہ سے مختلف روایات و احادیث میں پیدا ہوئے۔

پھر علماحدیث نے ان میں سے ہر ایک کی تقسیم کی ہے، جس کو ہم ذیل میں الاخریٰ ۱۴۴۳ھ کرتے ہیں:

علوم متن: (اس کے کہنے والے کے اعتبار سے) چار حیثیتیں رکھتا ہے:

۱) **حدیث قدسی:** یہ وہ حدیث جس کی نسبت براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف فرماتے ہوں یہ کہتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا (یہ قرآن کے علاوہ)،علمانے ان جیسی تمام احادیث کو مستقل ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے۔جیسے ''الاِتحافات السنیۃ فی الأحادیث القدسیۃ'' امام مناویؒ کی۔

۲) **حدیث مرفوع:** یہ وہ قسم ہے جس کی نسبت خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہو،قول، فعل، اور تقریر کے اعتبار سے۔اس فن میں بھی علمائے حدیث کی بے مثال تالیفات ہیں۔حدیث مرفوع والی قسم ایسی ہے، جو دوسرے سابقہ اقسام کو اپنے اندر ضم کرتی ہے۔

۳) **حدیث موقوف:** وہ حدیث جس کی نسبت صحابہ کرامؓ کی طرف کی جاتی ہے۔

۴) **حدیث مقطوع:** وہ حدیث جس کی نسبت تابعین کی طرف کی جاتی ہے۔

حدیث ''موقوف''، اور ''مقطوع'' سے متعلق بہت سے مصادری تصنیفات بھی ہیں۔جن میں ''مصنف عبدالرزاق'' ''مصنف ابن ابوشیبہ'' شامل ہیں۔اسی طرح تفسیر کی وہ کتابیں بھی اس میں شامل ہیں جو تفسیر ماثور کا درجہ رکھتی ہیں۔جیسے علامہ ابن جریر کی ''تفسیر ابن جریر''۔جہاں تک معاملہ ہے ''علوم متن'' کا بحیثیت ''درایت متن'' کے، تو اس میں اہم وہ غریب الحدیث ہے، جس کا تعلق احادیث کے متن سے ہو۔الفاظ کے غموض سے انکا فہم وادراک مشکل ہوتا ہو، جیسے کلمہ ''سقب'' کی تعین میں جو ''الجار أحق بسقبہ'' میں واقع ہے۔(پڑوسی زیادہ مستحق ہے اس کے قرب کی وجہ سے)۔جس کو امام بخاریؒ اور دیگر محدثین نے ابورافع سے بیان کیا ہے۔

علمائے محققین نے ''غریب الحدیث'' کی شروحات میں قابل اعتناء کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں ابن الاثیر کی ''النہایۃ فی غریب الحدیث'' اور ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب ''غریب الحدیث'' بھی شامل ہے۔اور جہاں تک تعلق ہے ''علوم درایت متن'' کا، تو یہ ایک ایسا علم ہے جس کا تعلق اسباب ورود حدیث سے ہے۔اور یہ علم ایک بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتا ہے، فہم حدیث کے لیے، جیسے قرآن کریم کی تفسیر کے لیے اسباب نزول آیات کی معرفت و جانکاری ضروری ہے۔اسباب ورود حدیث کے باب میں بہت سی اہم تصانیف ہیں۔جیسے امام سیوطیؒ کی ''اَللُّمع'' اور محدث ابن حمزہ حسینیؒ کی ''البیان و التعریف فی أسباب ورود الحدیث الشریف''۔

دیگر علوم حدیث میں سے ایک اہم علم حدیث کے ناسخ ومنسوخ ہونے کا علم بھی ہے، جس کا علامہ ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمیؒ نے اپنی کتاب ''الاِعتبار فی الناسخ و المنسوخ من الآثار'' میں احاطہ کیا ہے، اور انہی علوم میں سے ایک علم ''مشکل الحدیث'' یا ''مختلف الحدیث'' بھی ہے، یہ وہ علم ہے جس کا ظاہر قواعد علوم حدیث سے متعارض ہو، جس کی وجہ سے معنی کے باطل ہونے کا وہم ہوتا ہو، یا یہ کہ جس کا ظاہر ایسا ہو کہ دوسری نص شرعی سے ٹکراتا ہو، جس کا ازالہ کرنا

ازحد ضروری ہے، ورنہ بہت سے اہل علم حضرات وہم کا شکار ہو سکتے ہیں۔اس اہم فن پر علامہ ابن قتیبہ نیساپوریؒ نے اپنی کتاب ”تأویل مختلف الحدیث“ میں اور علامہ ابو جعفر طحاویؒ نے ”مشکل الآثار“ میں اور علامہ ابن مبارکؒ نے ”مشکل الحدیث“ میں، گراں قدر قلم کاری کی ہے۔

(۵) علوم سند: ”سند“ وہ مبارک سلسلہ رواۃ ہے، جنہوں نے حدیث پاک کو ایک دوسرے سے اس طور پر نقل کیا ہو کہ اس حدیث کا سلسلہ، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جائے ،علامہ ابن مبارک نے فرمایا کہ اسناد میرے نزدیک دین ہی کا ایک حصہ ہے، اگر ”علم اسناد“ نہ ہو، تو دین ہی ضائع ہو جائے گا، اور دین وشریعت میں ہر شخص جو چاہے گا کہے گا۔

علوم سند کی دو قسمیں ہیں: ۱) قسم بحیثیت ”اتصال سند“ کے ہے۔اور یہ قسم مشتمل ہے حدیث کے اِن اقسام پر جیسے ”حدیث متصل“، ”مسند“، ”معنعن“، ”موٴنن“، ”مسلسل“، ”عالی“، ”نازل“ اس کے علاوہ دیگر اقسام حدیث۔

۲) قسم ہے بحیثیت ”انقطاع سند“ کے یہ ان اقسام پر مشتمل ہے ”منقطع“، ”مرسل“، ”معلق“، ”معضل“، ”مدلس“ اور ”مرسل خفی“۔

ڈاکٹر نور الدین عتر فرماتے ہیں کہ اسناد کے جمع کرنے اور ان کے احاطہ کرنے میں علمائے محدثین نے ہر دور میں انتھک محنتیں وکاوشیں صرف کی ہیں، حتی کہ انہوں نے مختلف ممالک اور دشوار گذار شہروں کا تک سفر کیا ہے؛ گویا کہ اسناد حدیث پر مطلع ہونے کے لیے پوری کائنات کا چکر لگایا ہے، تاکہ ہر مشکل ”سند“ کے متعلق معلومات جمع کی جائیں۔اس باب میں بھی علمائے حدیث کی قابل تحسین تالیفات موجود ہیں، جیسے علامہ سخاویؒ کی ”الاحادیث المسلسلة“ اور ابو حاتم رازیؒ کی ”المراسیل“ ابن حجرؒ کی ”تغلیق التعلیق“ اور حافظ علائیؒ کی ”جامع التحصیل لاحکام المراسیل“ اور خطیب بغدادیؒ کی ”تمییز المزید فی متصل الاسانید“ وغیرہ۔

”علوم سند“ کی مختلف تعریفیں اور بحثیں ہیں، جو علمائے حدیث نے ہر دور میں کی ہیں؛ اس باب میں قابل ذکر وہ چیز ہے، جس کا تعلق ”حدیث مسلسل“ سے ہے، جس کے رجال، سند، روایت کرنے میں ہر دور میں ایک ہی صفت سے متصف رہے ہوں، جیسے حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جس میں آپؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”إن من الشعر حکمة“ جس کو شیخین نے روایت کی ہے۔اسی طرح حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ خدا رحم کرے لبید شاعر پر، کہ اس نے کتنا عمدہ کلام کہا ہے، اشعار پیش ہیں۔

ذھب الذین یعاش فی أکنافھم　وبقیت فی خلف کجلد الأجرب

یتأکلون خیانة مذمومة　ویعاب سائلھم وإن لم یشغب

ترجمہ: وہ لوگ چل بسے جن کے زیر سایہ زندگی بسر ہوتی تھی۔اور میں پیچھے رہ گیا جیسے خارش زدہ شخص کی صرف چمڑی باقی رہ جاتی ہے، وہ لوگ قابلِ مذمت خیانتی مال کھالیتے ہیں۔اور ان سے صرف پوچھنے والے کو بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چاہے وہ بے چارہ بلا کسی شور شرابے کے چپکے سے ہی پوچھتا ہو۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ رحم کرے لبید شاعر پر کاش کہ وہ ہمارا زمانہ پاتا۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ، حضرت عائشہؓ سے متعلق فرماتے ہیں، کہ خدا حضرت عائشہؓ پر رحم فرمائے کہ کیا کیفیت ہوتی، اگر وہ ہمارا زمانہ پاتیں؟ اسی طرح یہ حدیث ہر راوی سے تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے، کہ خدا فلاں پر رحم کرے کہ کیا کیفیت ہوتی، اگر وہ ہمارا یہ زمانہ پاتے۔

''علوم حدیث'' میں وہ علوم بھی شمار کئے جاتے ہیں، جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سند حدیث اور متن کے درمیان مشترک ہیں، جس سے یہ علوم پیدا ہوتے ہیں، ''سند ومتن'' کا مقارنہ دیگر احادیث وروایات سے کرنے کے بعد، تاکہ قاری ''حدیث'' کا تفرد جان سکے، یا پھر اس کی ''کثرت روایت'' پھر اس حدیث کا دوسری حدیث کے ساتھ ''اتفاق'' یا ''اختلاف'' جان سکے، اور یہ جانکاری ہوگی، حدیث کی اقسام جاننے سے؛ ان میں سے پہلی قسم ''تفرد حدیث'' ہے، جو مشتمل ہے ''حدیث غریب'' اور ''حدیث فرد'' پر۔ ان میں سے ہر ایک کی مختلف قسمیں ہیں۔

جن ائمۂ حدیث نے اس باب میں اہم تالیفات ترتیب دی ہیں، ان میں امام ابوداود بجستانیؒ کا بھی شمار ہوتا ہے، جن کی ''السنن'' کے نام سے مشہور کتاب ہے، اسی طرح امام دارقطنی کی کتاب ''الأفراد'' بھی ہے۔

اور دوسری قسم ہے ''کثرت رواۃ حدیث'' سے متعلق، اور یہ مشتمل ہے ان اقسام پر، جیسے حدیث متواتر، مشہور، مستفیض، عزیز، تابع، اور شاہد جیسی احادیث کے ساتھ، اور ان میں سے ہر قسم کی مختلف ابحاث واقسام ہیں، جیسے حدیث متواتر، وہ صحیح حدیث جسے اتنی بڑی جماعت نقل کرے کہ اس پر کذب اور جھوٹ کا گمان کیا ہی نہ جا سکے، وہ حدیث متواتر کہلاتی ہے، بشرطیکہ اول سند سے لے کر وسط وآخر تک، روایت کی کثرت جوں کی توں قائم رہے، جیسے یہ حدیث جسے امام بخاریؒ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت کی ہے ''من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار'' متفق علیہ۔

اس روایت کو تقریباً ستر صحابہ کرامؓ نے انہی الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے، علوم حدیث کی اس قسم میں بھی گراں قدر تصانیف ہیں، علامہ سیوطیؒ کی ''الأزهار المتناثرة في الأخبار المتواترة'' اور علامہ کتانیؒ کی کتاب ''نظم المتناثر في حديث المتواتر'' اور علامہ سخاویؒ کی کتاب ''المقاصد الحسنة في الأحاديث المشهورة على الألسنة''۔

تیسری قسم ہے ''اختلاف روایت'' اس قسم میں اہل ثقہ کے ابحاث زیر بحث آتے ہیں، اس میں حدیث کی یہ اقسام شامل ہیں: شاذ، محفوظ، منکر، معروف، مضطرب، مقلوب، مدرج، مصحف، اور معل۔

''اختلاف رواۃ'' ایک اہم اور اساسی فن ہے، جس کی طرف اعتناء کرنا ضروری ہے، اور جس سے خود محدث کو گراں مایہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

''سند حدیث'' کے اعتبار سے بھی اور متن کے اعتبار سے بھی، بعض مرتبہ کسی راوی کا وہم ظاہر ہوتا ہے، یا یہ کہ اختلاف رواۃ سے خود حدیث مضبوط ہوتی ہے، اس طرح کے دیگر بہت سے فوائد بھی۔

"حدیث مقلوب" کے باب میں علمائے حدیث بر سبیل تذکرہ ذکر کرتے ہیں کہ سب سے بڑا امتحان جو محدثین نے کسی شخص کے حفظ حدیث کی قدرت یا حدیث پاک کے سلسلہ میں اس کے مقام ومرتبہ کی جانچ کے لیے لیا ہے، وہ ہے جس سے امام بخاریؒ کو سامنا کرنا پڑا تھا، جب امام صاحبؒ سب سے پہلے بغداد پہونچے، تو اس وقت کے علمائے حدیث نے تمام احادیث کے "متون واسانید" کو بدل ڈالا، اوران کی صحت کی جانچ کے لیے دس دس افراد متعین کیے، اور ہر ایک کو دس دس احادیث دے دی گئیں، جب امام صاحب اپنی مجلس میں پُرسکون حالت میں بیٹھ گئے تو پہلے دس میں سے ایک شخص نے، آپ کی طرف سوال کرتے ہوئے، پیش قدمی کی، اور آپ پر پہلی حدیث مع "سند مقلوب" کے پیش کی، ہر حدیث پر امام بخاریؒ نے فرمایا "لا أعرفه" اس حدیث کو اس سند کے ساتھ میں نہیں جانتا، پھر دوسری حدیث پیش کی گئی، پھر تیسری، یہاں تک تمام احادیث پیش کی گئیں، اور ہر حدیث پر امام صاحبؒ یہی فرماتے کہ میں نہیں جانتا، پھر دوسرے دس میں سے بھی ایک شخص نے یہی "سند مقلوب" کے ساتھ حدیث پیش کی، تو امام صاحبؒ بس صرف اتناہی فرماتے کہ میں نہیں جانتا، یہاں تک کہ تمام افراد نے پوری سو احادیث پیش کیں، اور ہر ایک کے جواب میں امام صاحبؒ یہی فرماتے رہے کہ "لا أعرفه" اس حدیث کو اس سند کے ساتھ میں نہیں جانتا، جب تمام افراد اپنی، سند مقلوب، کی احادیث پیش کرنے سے فارغ ہوگئے، تو پھر امام صاحبؒ پہلے دس میں سے اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا کہ دیکھو تم نے جو پہلی حدیث پیش کی اس کی سند اس طرح نہیں ہے، بل کہ اس طرح ہے، اور پھر صحیح سند پیش کی، اس طرح تمام سو احادیث کو صحیح سند کے ساتھ پیش کیا، تب وہاں حاضر لوگوں نے امام صاحبؒ کی ذہانت و ذکاوت اور غیر معمولی یادداشت کا اعتراف کیا، اور حفظ حدیث میں امام صاحبؒ کا لوہا مان لیا، جن علما کی اس باب میں کتابیں کتب خانوں کی زینت بنی ہیں۔ ان میں سرفہرست ابن حجرؒ کی کتاب "المقترب في بيان المضطرب" ہے، اسی طرح خطیب بغدادی کی "الفصل للوصل المدرج في النقل" اور ابو سلیمان خطابیؒ کی "إصلاح خطأ المحدثين" اور علامہ رازیؒ کی "علل الحديث" اور دارقطنی کی "التصحيف" بھی شامل ہے۔

غرض کہ ہر دور میں علمائے محدثین اور جرح و تعدیل کے ماہرین نے علوم حدیث کے باب میں لازوال، پائیدار، مضبوط، محکم، اور پورے عزم وحزم کے ساتھ انتھک کاوشیں اور محنتیں صرف کی ہیں، جو آج تک روز روشن کی طرح عیاں اور ظاہر ہیں۔

خدا تعالی ان تمام کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین!

المصادر والمراجع:

الجامع الصحيح للامام البخاري　　　　الجامع الصحيح للامام المسلم

سنن الترمذی (ابوعیسی الترمذی)
الموطا للامام مالک
مصنف ابن شیبہ (الامام ابن شیبہ)
سنن دار قطنی (الامام الدار قطنی)
سنن بیہقی (الامام البیہقی)
شرح السنۃ (امام البغوی)
جامع الاصول (ابن الاثیر الجزری)
الترغیب و الترھیب (امام المنذری)
کتاب الکنی و الاسماء (الدولابی)
کتاب الانساب (السمعانی)
الضعفاء (امام البخاری)
الجرح و التعدیل (ابوحاتم الرازی)
لسان المیزان (العسقلانی)
السنة قبل التدوین (محمد عجاج الخطیب)
علوم الحدیث (امام ابن الصلاح)
تدریب الراوی (جلال الدین السیوطی)
علوم الحدیث و مصطلحہ (صبحی الصالح)
قواعد فی علوم الحدیث (ظفر احمد التھانوی)
احکام الاحکام (تقی الدین ابن دقیق العید)
نصب الرایہ (الامام جمال الزیلعی)
شرح معانی الآثار (الطحاوی)
آثار السنن (حسن النیموی)
اعلاء السنن (مولانا ظفر التھانوی)
مفتاح کنوز السنة (فؤاد عبد الباقی)
الموضوعات (عبدالرحمن الجوزی)
معرفة علوم الحدیث (امام الحاکم النیسابوری)
اعراب الحدیث النبوی (ابو البقاء العکبری)
کتاب علل الحدیث (ابوحاتم الرازی)
حیاۃ الصحابة (یوسف الکاندھلوی)
تھذیب التھذیب (العسقلانی)
تذکرۃ الحفاظ (الذھبی)
سنن ابی داؤد (سلیمان ابن الاشعث السجستانی)
سنن النسائی (ابوعبدالرحمن احمد ابن شعیب النسائی)
سنن ابن ماجہ (ابوعبداللہ محمد ابن یزید ابن ماجہ)
مصنف عبدالرزاق (ابوبکر عبدالرزاق ابن ھمام الحمیری)
مسند الامام احمد (ابوعبداللہ احمد بن محمد الحنبل الشیبانی)
ریاض الصالحین (ابوزکریا محی الدین النووی)
مجمع الزوائد و منبع الفوائد (نور الدین علی ابن بکر الھیثمی)
العمدۃ فی الاحکام (تقی الدین ابو محمد عبدالغنی المقدسی)

اللباب فی الجمع بین السنة الکتاب (ابو محمد المنبجی)

المنقی من اخبار المصطفی (ابو البرکات عبد السلام ابن تیمیه الحرانی)

بلوغ المرام من ادلة الاحکام (احمد ابن حجر العسقلانی)

الجامع الصغیر من حدیث البشیر النذیر (ابوبکر السیوطی)

نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار من احادیث (محمد ابن علی الشوکانی)

المعجم المفهرس لالفاظ الحدیث النبوی (جماعة من المتشرقین)

کشف الخفاء و مزیل الالباس (اسماعیل العجلونی)

تذکرة الموضوعات (ابو الفضل محمد بن طاهر المقدسی)

المصنوع فی معرفة الحدیث الموضوع (الشیخ علی القاری)

الاعتبار فی الناسخ و المنسوخ من الآثار (ابوبکر محمد بن موسی الحازمی)

البیان و التعریف فی اسباب ورود الشریف (ابراهیم بن محمد الحسینی الدمشقی)

الفائق فی غریب الحدیث (ابو القاسم جار اللہ الزمخشری)

النهایة فی غریب الحدیث (امام مجد الدین الجزری)

الاستیعاب فی معرفة الاصحاب (ابو عمر یوسف بن عبداللہ القرطبی)

اسد الغابة فی معرفة الصحابه (عز الدین ابن الاثیر)

الاصابة فی تمییز الصحابه (ابن حجر العسقلانی)

کتاب الضعفاء و المتروکین (احمد بن شعیب النسائی)

میزان الاعتدال (شمس الدین محمد ابن احمد الذهبی)

الرفع و التکمیل فی الجرح و التعدیل (ابو الحسنات محمد عبد الحی اللکهنوی)

الاجوبة الفاضلة للاسئلة العشرة الکاملة (محمد عبد الحی اللکهنوی)

السنة و مکانتها فی التشریع الاسلامی (مصطفی السباعی)

بحوث فی تاریخ السنة المشرفة (اکرم ضیاء العمری)

المحدث الفاصل بین الراوی و الواعی (الامام الرامهرمزی)

الالماع الی معرفة اصول الروایة و تقیید السماع (امام الیحصبی)

اردو مصادر و مراجع:

شمائل ترمذی	(مولانا زکریا صاحبؒ)	معارف الحدیث	(مولانا منظور نعمانی)
ترجمان السنہ	(مولانا بدر عالم میرٹھی)	علوم الحدیث	(مولانا عبیداللہ اسعدی)
اصول حدیث	(مولانا اویس نگرامی ندوی)	محاضرات حدیث	(محمود احمد غازی)
درس ترمذی	(مولانا تقی صاحب)	جواہر الحکم	(علامہ بدر عالم میرٹھی)
تحفۃ الاخیار	(خرم علی)	ترجمان الحدیث	(سید محمود حسن)
فضائل اعمال	(شیخ زکریا)	گفتار رسول	(سلیمان قاسمی)
ریاض الحدیث	(مجیب اللہ ندوی)		
زاد سفر	(آمۃ اللہ تسنیم)		
شرح اربعین	(عاشق الٰہی میرٹھی)		
فکر آخرت	(عبدالقوی)		
امداد الباری	(عبدالجبار الاعظمی)		
انوار الباری	(افادات علامہ کشمیری)		
نصر الحدیث	(حبیب الرحمن اعظمی)		
اصطلاحات حدیث	(مولانا افتخار احمد قاسمی)		
مبادیات حدیث	(مفتی سعید صاحب)		
شرح مقدمہ عبدالحق	(مولانا سعد مشتاق)		
آثار الحدیث	(خالد محمود)		
حجیت حدیث	(مولانا تقی صاحب)		
آسان اصول حدیث	(خالد سیف اللہ)		
اصول حدیث	(مفتی نظام الدین اعظمی)		
حدیث کا درایتی معیار	(تقی امین)		
حدیث رسول کا قرآنی معیار	(قاری طیب صاحب)		
کتابت حدیث عہد رسالت وعہد صحابہ	(مفتی رفیع صاحب)		
مطالعۂ حدیث کے اصول ومبادی	(مولانا علی میاں ندوی)		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علم اسماء الرجال۔۔۔۔۔۔ایک تعارف

مولانا رضوان الدین معروفی
شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

قرآن کی طرح احادیث کا تحفظ بھی نظام غیبی کے سائے میں

یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ اگر کسی کو مکلف کیا جائے کہ دودھ پیو، کرسی پر بیٹھو تو وہاں دودھ اور کرسی کا پایا جانا ضروری ہے ورنہ یہ حکم لغو قرار پائے گا، بل کہ اگر کسی ذی عقل وباشعور شخص کا حکم ہوگا تو اس کا حکم کرنا ہی دلیل ہے کہ وہ شئی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے جب ''لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ، اطیعو اللّٰہ و اطیعو الرسول'' اور ''ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا'' جیسی آیات میں پوری انسانیت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کا حکم دیا ہے، تو یہی دلیل ہے کہ آخری انسان تک اور آخری زمانہ تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کا ہر قول وفعل محفوظ ہوگا۔

آیت کریمہ ''انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ الحافظون'' میں ''الذکر'' سے صرف الفاظ قرآنی نہیں مراد ہیں بل کہ الفاظ ومعانی دونوں مراد ہیں، اور قرآن کے معانی کا ہی دوسرا نام ''حدیث'' ہے۔

کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی آیات قرآنیہ کی تبیین وتذکیر ہی میں صرف فرمائی ہے اور یہی آپ کا فرض منصبی تھا، ارشاد ربانی ہے: ''وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم'' بل کہ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کی حفاظت سے زیادہ اہمیت معانی کی حفاظت کو حاصل ہے، کیوں کہ الفاظ کا تحفظ تو معانی کے تحفظ کے لئے ہوا کرتا ہے۔

اب اگر معانی کے تحفظ کی ضمانت نہ ہو تو یقیناً معنوی تحریفات کو قرآن مجید میں راہ مل جائے گی، اور مراد الٰہی کو جاننا پھر اس پر عمل کرنا ناممکن ہوجائے گا، پس اس عقلی پہلو سے بھی معانی قرآن (یعنی احادیث) کا تحفظ ضروری ہوا۔

حافظ ابن حزمؒ (۴۵۷) لکھتے ہیں:

تمام اہل لغت اہل شرائع کا اس پر اتفاق ہے کہ جو وحی بھی (خواہ متلو ہو یا غیر متلو جیسا کہ ''انزل اللّٰہ علیک الکتب والحکمۃ'' میں دونوں کو ذکر فرمایا) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی وہ اللہ کی طرف سے اتارا ہوا ذکر ہے، اور یہ پوری وحی الٰہی اللہ کی حفاظت میں ہے۔۔۔۔۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت حفاظت میں الذکر کا مصداق صرف

قرآن کریم ہے اور وہ بھی الفاظ کی حد تک ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے ۔۔۔۔لفظ الذکر کا مصداق ہر وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ،الفاظ ہوں یا معنیٰ قرآن ہو یا سنت دونوں وحی الٰہی ہیں۔قرآن کی مراد سنت ہی سے تو واضح ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ آیتِ کریمہ کے مصداق میں احادیث کا تحفظ بھی داخل ہے۔رہ گئی یہ بات کہ احادیث کس طرح محفوظ رہیں تو امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ”سنت کا ذخیرہ مجموعی طور پر محدثین کے پاس موجود ہے کوبعض محدثین کے ہاں زیادہ اور بعض کے ہاں کم ،لیکن اگر تمام محدثین کی حدیثوں کو یکجا کیا جائے تو سنت کا پورا ذخیرہ جمع ہوجاتا ہے۔

ہاں ہر محدث کی جمع کردہ احادیث کو الگ الگ لیا جائے تو ہر محدث سے کچھ نہ کچھ حدیثیں رہ گئی ہیں ،لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو حدیثیں ایک محدث سے رہ جاتی ہے وہ دوسرے کے ہاں مل جاتی ہیں ۔(الرسالہ:۴۳)

حفاظت حدیث کے بعض اہم اسباب وعوامل

پھر اللہ نے احادیث کی حفاظت کے اسباب وعوامل بھی اس کے شایانِ شان مقدر فرمایا مثلاً:

(۱)قرآن مجید نے مختلف آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو اپنانے کا حکم دیا ”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ“ ”ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا “۔

(۲)نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کو محفوظ رکھنے،دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری دی مثلاً فرمایا ”بلغوا عنی ولو آیۃ“ ”ان الناس لکم تبع وان رجالاً یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین وان اتوکم فاستوصوا بھم خیرا “۔(جامع ترمذی:۲/۸۹)

(۳)کتمان علم کی وعیدوں کے ذریعہ سے اس کی حفاظت اور تبلیغ کی طرف متوجہ کیا گیا مثلاً ارشاد نبوی ہے: ”من سئل عن علم ثم کتمہ الجم یوم القیامۃ بلجام من النار “(جامع ترمذی:۲/۹۳)

اس لئے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ”لو وضعتم الصمصامۃ علی ھذہ (واشار الی قفاہ) ثم ظننت انی انفذ کلمۃ سمعتھا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل ان تجیزوا علی لانفذتھا “۔(صحیح بخاری:۱/۲۷)

ترجمہ: کہ اگر تم میری گردن پر یہ تلوار رکھدو اور اس وقت مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنی ہوئی حدیث یاد آجائے اور مجھے یہ خیال ہو کہ تمہاری تلوار چلنے سے پہلے ہی میں یہ حدیث سنا سکوں گا تو ضرور سنا دوں گا۔

(۴)کذب فی الحدیث کی وعید سے ڈرایا گیا مثلاً ”من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار “۔

(۵)صحابی میں (جو احادیث کے اولین محافظین ہیں) عدالتِ تامہ اور ضبط واتقان کی قوت کاملہ کا ہونا۔

(۶)پھر بعد کے اولین محدثین کو بھی حیرت انگیز بے مثال قوت حافظہ کا نصیب ہونا۔

یہ وہ اسباب تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے حدیث میں کسی قسم کی قطع وبرید بہت مشکل ہے تاہم ہمیشہ باطل نے حق کے ساتھ پنجہ آزمائی کی ناکام کوشش کی ہے اس موقع پر بھی باطل اور اہلِ باطل نے چاہا کہ احادیثِ نبویہ میں

اپنی
من گھڑت باتیں شامل کر کے پورے ذخیرۂ حدیث کو ساقط الاعتبار بنا دیں۔ مگر چوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ساتھ حدیث کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اس لئے اس نے اس کے لئے امت کے غیور او رباشعور، اسلامی حمیت سے مخمور طبقہ کو اس اہم کام کے لئے منتخب فرمایا۔ چناں چہ ان مقدس انسانوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسی غیرت کا مظاہرہ کیا کہ ہماری ہوتے ہوئے اسلام اور دین وشریعت کے ان مآخذ (یعنی قرآن وسنت) پر کوئی آنچ آئے یہ نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ اس وقت کے محدثین علما نے حدیث سے متعلق بہت سے علوم مدون کئے اور انہوں نے فن حدیث کو مہذب و منقح کیا رواۃ کی تحقیق وتنقید کی ضعیف رواۃ کو ثقات سے متمیز کیا، احادیث کی علل خفیہ پر متنبہ کیا تو اس طرح علم حدیث کی بہت سی انواع ہوگئیں۔

حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری (۴۰۵ھ) نے ایک کتاب علوم حدیث تالیف کی اس میں پچاس انواع کو بیان کیا، پھر حافظ ابن الصلاح (۶۴۳، ۶۴۴) نے مقدمہ میں اور علامہ نووی نے تقریب میں ۶۵ انواع کا ذکر کیا، اور علامہ سیوطیؒ نے اضافہ کرکے تدریب میں ۹۳ انواع بیان کیا ہے، اور علامہ حازمی نے تو کتاب ''العجالہ'' میں فرمایا کہ علم الحدیث یشتمل علی انواع کثیرۃ تبلغ مائۃ کل نوع منھا نوع مستقل ''علم حدیث کثیر انواع پر مشتمل جن کی تعداد سو تک پہنچ رہی ہے اور ہر نوع اس کی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

ان ہی انواع میں ایک عظیم نوع ''علم اسماء الرجال'' ہے۔

گروہ ایک جو یا تھا علم نبیؐ کا — لگایا پتہ اس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح وتعدیل کے وضع قانون — نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

علم اسماء الرجال کی تعریف:

یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ رواۃِ حدیث کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تحقیق کی جاتی ہے، مثلاً راوی کی تاریخ ولادت، تاریخِ وفات، نام حسب ونسب، کنیت والقاب، دین ودیانت، تقوی طہارت، عقائد ونظریات، علم وفہم، قوتِ ضبط واتقان، عدالت وثقافت، علمی استفادہ، شیوخ وتلامذہ ذاتی معاشرتی واخلاقی احوال وغیرہ ان امور کی تحقیق کے بعد اس راوی کی حدیث مقبول یا مردود قرار پائی ہے۔

غرض وغایت:

اس فن کی غرض وغایت ہے راوی کے احوال کی روشنی مین صحت وسقم اور ردو قبول کے اعتبار سے حدیث کا درجہ متعین کرنا۔

موضوع:

راویان حدیث کی زندگی۔ اوران کے ذاتی وصفاتی احوال۔

فن اسماء الرجال اس امت کا امتیازی فن:

مسلمانوں نے اپنے دین و دینیات اور اسلام واسلامیات تک رسائی اور اس کے بقاء و تحفظ کے لئے یہ ایک ایسا نزالا نہایت ہی اہم فن ایجاد کیا ہے، جو صرف اور صرف مسلمانوں ہی میں پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ کوئی قوم ماضی میں نہ حال میں اب تک اس فن کو دریافت نہیں کرسکی دوسرے مذاہب کو تو چھوڑئے عالمِ ادیان کے دو بڑے مذہب یہودیت وعیسائیت، ان مذاہب کے پیرو کار و پیشوایان بھی اپنی نسبت نشئتِ اول سے مربوط نہیں کرسکتے نہ ہی اپنی ان مذہبی کتابوں کی محفوظیت اور ربانیانِ مذاہب سے ثبوت پر کوئی دلیل پیش کرسکتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کے پاس ناقلینِ مذہب کی کڑیاں محفوظ و مربوط نہیں ہیں۔

اسی لئے دشمانِ اسلام نے اسلام کی اس امیازی خوبی کا اعتراف کیا ہے، ایک مشہور دشمنِ اسلام ڈاکٹر اسپنگر نے لکھا ہے، جو ابن حجر کی ''الاصابۃ'' کے مقدمہ میں مذکور ہے ''کوئی قوم نہ دنیا من ایسی گذری ہے نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصیتوں کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے''۔

اور یہ علم اسماء الرجال دراصل علم الاسناد ہے اور علم الاسناد کے متعلق علامہ ابن حزم فرماتے ہین ''ثقہ کا ثقہ سے بلا انقطاع (اتصالِ سند کے ساتھ) حدیث نبویؐ کو نقل کرنا یہ وہ نعمت ہے جس سے اللہ تعالی نے خاص اس امت کو نوازا ہے''۔ (تدریب: ۱۸۳)

فن اسماء الرجال کی اہمیت:

اس کی اہمیت خود اس کی تعریف اور اس کی غرض وغایت سے ظاہر ہے کہ یہ فن ہمیں بتلاتا ہے کہ کون سا راوی کیسا ہے؟ اس کی دینی و مذہبی حالت کیسی ہے؟ فہم وفراست اور قوتِ حفظ کا کیا حال ہے؟ اہل سنت والجماعت کے صاف وشفاف مشرب سے ہٹ کر کسی اور طریق سے تو اپنی پیاس نہیں بجھاتا؟ کسی غیر مذہب کا داعی تو نہیں؟

ظاہری بات ہے کہ ان باتوں کا جاننا خود مقصود تو نہیں بلکہ مقصود اور واجب تو حدیث کا علم ہے مگر چوں کہ اس پر حدیث کے ثبوت وعدمِ ثبوت اور صحت وسقم کا علم موقوف ہے۔ اس لئے ''مقدمۃ الواجب واجب'' کے قانون کے مطابق علم اسماء الرجال کو بھی واجب اور غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دینا پڑے گا۔ یہ فن ایسا سدِ سکندری ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی باطل کبھی بھی حق کے ساتھ خلط ملط ہو ہی نہیں سکتا ہے، اور نہ ہی حق کی کسی کڑی کو کوئی گم کرسکتا ہے، اور نہ غیر حق کو حق بتا سکتا ہے، بنی اسرائیل میں یہ علم نہیں تھا، اور انہوں نے مذہب ومذہبیات کی خبر دینے والے کی صداقت وعدالت اور اس کی دروغ گوئی وافتراء پردازی کی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور نہ ہی ان کے پاس کوئی معیار تھا اسی وجہ سے وہ کسی بات کے رد وقبول میں افراط وتفریط کا شکار ہوتے چلے گئے۔

جب وہ رد کرنے پر آئے تو کوہِ طور پر کلام باری بلا واسطہ سن کر بھی سو طرح کے شبہات نکالنے لگے، اور جب وہ قبول کرنے پر آئے تو اندھادھند اپنے احبار و رُہبان کی ہر بات پر سر دھننے لگے اور اس کو دین و شریعت اور حکم الٰہی تصور کرنے لگے۔

مگر اسلام نے اس افراط و تفریط کے غیر متوازن نظریہ کی بیخ کنی کی اور ایک معتدل قانونِ تحقیق اور آئینِ تنقید عطا کیا، تاکہ نہ یہ ہو کہ ہر کان میں پڑنے والی بات کو صحیح سمجھ لیا جاوے، اور نہ یہ ہو کہ قطعیات و محتملات میں بھی کیڑے نکالے جائیں۔

قرآن کریم نے اس موقع پر اپنے چند قوانین پیش کئے:

(۱) پہلا قانون

"یا ایھا الذین امنوا ان جائکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین"۔

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو کہیں تم کسی قوم کے ساتھ نادانی کا سلوک کر بیٹھو، پھر اپنے کیے ہوئے پر نادم ہونا پڑے۔

(۲) دوسرا قانون

"یا ایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم و لا تجسسوا"

اے ایمان والو! بہتیرے گمان سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہوا کرتے ہیں، اور عیوب مت ٹٹولو۔

ان دونوں آیتوں سے تحقیق رجال کا کیسا صاف ستھرا اور معتدل اصول سمجھ میں آیا۔

(۳) تیسرا قانون

"فاذا جاءھم أمر من الامن او الخوف اذا عوا بہ و لو ردوہ الی الرسول و الی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم"۔

اگر ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے، تو اس کا وہ چرچا کرنے لگتے ہیں، اور اگر اسے رسول اور ان میں سے اولوالامر کے حوالہ کرتے تو وہ لوگ جو ان میں سے استنباط کرتے ہیں جان لیتے۔

اس تیسرے قانون نے یہ بتلایا کہ اگر خود تحقیق کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اہل تحقیق سے رجوع کرلو پھر کوئی قدم اٹھاؤ۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسی اندھی تقلید سے منع فرمایا ہے حضرت ابوہریرہ راوی ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکون فی آخر الزمان دجالون کذابون یاتونکم من الاحادیث بما لم تسمعوا انتم و لا آباءکم فایاکم و ایاھم و لا یضلونکم و لا یفتنونکم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخر زمانے میں دجال اور جھوٹے پیدا ہوں گے، تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جسے نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء و اجداد نے، سو تم ان سے بچ کر رہنا، وہ تمہیں گمراہ نہ

کردیں اور فتنہ میں نہ ڈالدیں ۔(مقدمہ مسلم:۱۰)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بئس اخو العشیرۃ---------یہ(آنے والا) اپنے خاندان کا برا شخص ہے۔عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان عبداللہ رجل صالح ---عبداللہ ایک نیک انسان ہے۔اسی طرح ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے راوی کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے اس کی بے اعتمادی کو یوں ظاہر فرمایا:

"کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع " آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرتا رہے ۔(مقدمہ مسلم:۸)

ان آیات و روایات سے معلوم ہوا کہ صحیح وضعیف احادیث کی تمیز ، بلکہ شرع وغیر شرع کی تمیز کے لئے علم الاسناد کو کیا اہمیت حاصل ہے۔

اسی لیے عبداللہ ابن المبارکؒ نے علم الاسناد کے سیکھنے کو دین قرار دیا ہے،آپ فرماتے ہیں:"الاسناد من الدین ولولا الاسناد لقال من شاء ما شاء "۔

روایات کی سند دین کا ہی ایک حصہ ہے اگر یہ سند نہ ہوتیں تو جس کے منہ میں جو آتا وہ بک دیتا،سفیان بن عیینہ کا بیان ہے ایک محدث نے ایک دن حدیثیں بیان کرنی شروع کی تو میں نے کہا کہ حضرت بغیر سیڑھی کے چھت پر چڑھنا چاہتے ہو۔(تدریب:۱/ ۳۶)

سفیان ثوری کا مقولہ مشہور ہے:"الاسناد سلاح المومن "امام اوزاعی نے ارشاد فرمایا:"ما ذھاب العلم الذھاب الاسناد "علامہ ابن سیرین فرماتے ہیں:"ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم "۔

محدثین کرام نہ صرف مطلق سند بلکہ سند عالی کی ہمیشہ تلاش میں رہتے تھے،امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ سند عالی کی جستجو اسلاف کی سنت ہے، اس لئے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے تلامذہ صرف اس غرض سے کوفہ سے مدینہ سفر کر کے جایا کرتے تھے کہ وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے احادیث حاصل کرینگے۔

بخاری شریف میں ہے کہ اسی مقصد کے تحت حضرت جابر بن عبداللہ نے صرف ایک حدیث کے لئے مدینہ سے شام کا سفر کیا، یحی بن معین کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو کسی نے سوال کیا "ماذا تشتھی؟" تو جواب میں ارشاد فرمایا:"بیت خالی و سند عالی"

تحقیق رجال اور علم اسانید کی اسی اہمیت کی بنا پر محدثین نے ہمیشہ اس پر غیر معمولی توجہ دی ہے اور اس کے لئے بڑی بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں،جس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

مشہور محدث شعبہ بن الحجاج (م۱۶۰ھ) نے ابو اسحق سے ایک حدیث سنی"من توضأ فاحسن الوضوء ثم دخل المسجد فصلی رکعتین و استغفر اللہ غفر اللہ لہ "حدیث سن کر آپ نے ابو اسحق سے پوچھا کہ تم سے کسی نے یہ حدیث بیان کی ،انہوں نے عبداللہ بن عطا عن عقبہ حضرت شعبہ نے پھر سوال کیا کہ کیا عبداللہ بن عطا نے عقبہ سے سنا

ہے؟

اس جرح وقدح اور کرید کرنے پر ابو اسحق بگڑ اٹھے، اس وقت مجلس میں ایک اور محدث مسعر بن کدام بھی موجود تھے انہوں نے کہا آپ نے شیخ کو ناراض کر دیا، مسعر نے بتایا کہ عبد اللہ بن عطا مکہ میں ہے، شعبہ نے اس حدیث کی تحقیق کے لئے مکہ کا سفر کیا، شعبہ کا بیان ہے کہ میرا ارادہ حج کا نہیں تھا، میرا مقصد سفر صرف حدیث کی تحقیق کرنا تھا، میں نے عبد اللہ بن عطا سے مل کر پوچھا کہ یہ حدیث تم سے کس نے بیان کی؟ اس نے کہا کہ سعد بن ابراہیم نے حضرت مالک بن انس سے۔ معلوم ہوا کہ وہ مدینہ سے میں رہتے ہیں، یہ سن کر میں نے مکہ سے مدینہ کا سفر کیا اور سعد سے ملاقات کر کے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ مجھ سے زیاد بن مخراق نے بیان کیا ہے میں نے کہا کہ بڑی پریشان کن بات ہے، زیاد بن مخراق کوفہ کا رہنے والا ہے پھر مدینہ میں رہنے لگا تھا مگر آج کل وہ بصرہ میں ہے، اب میں نے بصرہ کا رخ کیا اور زیاد بن مخراق سے مل کر اس سے اس حدیث کے راوی کے متعلق پوچھا کہ تم سے کس نے اس حدیث کو بیان کیا تو اس نے کہا کہ وہ آپ کے کام کا نہیں ہے میں نے پھر کہا نام بتاؤ؟ اس نے دوبارہ کہا کہ آپ اس کو قبول نہیں کریں گے، میں نے تیسری بار کہا بتاؤ تو سہی، تب اس نے کہا: حدثني شهر بن حوشب عن ابي ريحانة عن عقبة" جوں ہی زیاد بن مخراق نے شہر بن حوشب کا نام لیا تو میں نے کہا "دمر علي هذا الحديث" اس حدیث نے تو مجھے مار ہی ڈالا۔

اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو مجھے اتنی محبوب ہوتی کہ میں اپنی آل اولاد، مال و دولت سب کچھ قربان کر دیتا۔

اور علامہ ابن المدینی تو فرماتے ہیں: "الفقه في معاني الحديث نصف العلم، و معرفة الرجال نصف العلم" معانی حدیث میں غور کرنا نصف علم ہے تو معرفت رجال بھی نصف علم ہے۔

(آثار الحدیث: ۴۰۰ بحوالہ مقدمہ تہذیب: ۴)

فن اسماء الرجال کی ضرورت اور اس کی تدوین

اس عنوان کے تحت ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ فن اسماء الرجال کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کہتے ہیں کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" جس کی کوکھ سے بہت سی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ ہمارا پورا ذخیرۂ احادیث مل کہ پورا دین ہم تک جو پہونچا ہے وہ رجال و اشخاص کے واسطوں سے۔ محدثین کرام نے تو ان رجال کے مختلف اعتبارات سے متعدد طبقے بنائے ہیں مگر ہم ان کو تقریب فہم کے لئے صرف دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں، صحابہ، غیر صحابہ۔

طبقہ صحابہ

یہ وہ پاکباز ہستیاں ہیں جن کی عدالت وصداقت اور حفظ و امانت مسلم تھیں اور "الصحابة كلهم عدول" کا کلیہ ان کے متعلق مشہور تھا۔ یہ طبقہ جرح وقدح و تعدیل اور نقد و تحقیق سے بالاتر اور مستثنیٰ تھا۔

طبقہ غیر صحابہ

دوسرے طبقہ کے متعلق اس قسم کی کوئی ضمانت نہیں تھی اور وہ مرحلہ جرح والتعدیل سے گزرے ان سے نقل روایات میں بے احتیاطی، کذب بیانی وغیرہ کا امکان تھا اور بعضوں سے اس کا صدور بھی ہوا۔ اس لئے اس طبقے کی بنا پر اب ضرورت ہوئی ایک ایسے فن کی جس کی مدد سے راویوں کے صدق وکذب کو پرکھا اور جانچا جا سکے اور کھرے کھوٹے کا پتہ لگایا جا سکے، چناں چہ اسی مقصد کے تحت نقد رجال وتحقیق اسانید کے لئے ایک فن کی تدوین عمل میں آئی جس کا نام "اسماء الرجال" رکھا گیا۔

اس اجمال کی تشریح

پہلا طبقہ صحابہ: اوپر جن طبقوں کا ذکر آتا ہے ہم اس کی کسی قدر تفصیل کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نظام قدرت اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت وحکمت کا یہ کرشمہ کہ احادیث مبارکہ کے اولین ناقلین امت کا وہ طبقہ بنا جس کو ہم صحابہ کے نام سے جانتے ہیں، صحابہ کا یہ گروہ عشق الٰہی، حب نبوی دیانت وامانت تقوی وطہارت دینی حمیت و شجاعت، اخلاق بلندی وانسانی شرافت، فکر آخرت تبتل وانابت خوف وخشیت اور حفظ واتقان اور فہم صحیح کے اعلیٰ مقام پر فائز تھا۔ ان میں ایک طرف تو عشق نبوی کے نتیجہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر ادا پر نقل وحرکت ہر قول وفعل کی بہت دھیان سے سنتے دوسروں سے معلوم کرتے پھر اس پر عمل کرتے اور یہ دوسروں تک پہونچانے کا کامل جوش وخروش۔ دوسری طرف خوف خدا اور قوت حفظ اتقان کی ایسی عظیم صفت کہ ان صفات کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ نقل روایات میں وہ کسی بے احتیاطی لاپرواہی چہ جائے کہ دروغ گوئی وجعل سازی کے شکار ہو جائیں، خصوصاً جب کہ ان کا حال یہ تھا کہ جب وہ کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بیان کرتے تو کانپ جایا کرتے تھے، بعض صحابہ کا تو معمول تھا کہ وہ جب حدیث بیان کرتے تو پہلے "من کذب علی متعمداً فلیتبوٴ مقعده من النار" والی حدیث ضرور پڑھ لیا کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نقل فرمایا کہ:

"یبتدأ حدیثه فقال قال رسول اللّٰہ الصادق والمصدق ابو القاسم صلی اللّٰہ علیه وسلم من کذب علی متعمداً" الخ۔ اور یہ احتیاط پورے طبقہ صحابہ میں پائی جاتی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: واللّٰہ ما کنا نکذب ولا کنا ندری ما الکذب۔ واللہ نہ ہم جھوٹ بولتے تھے نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کسے کہتے ہیں۔ (الجامع لاخلاق الراوی)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "لیس کلنا کان یسمع حدیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کانت لنا ضیعة واشغال ولکن الناس لم یکونوا یکذبون یومئذ فیحدث الشاهد والغائب"۔ (المحدث الفاصل)

صحابہ اگرچہ انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح معصوم نہیں تھے، مگر ان کی اسی صداقت وعدالت، امانت ودیانت

صحتِ فہم وفراست کی بنا پر محدثین کے مابین یہ کلیہ متفقہ طور پر مشہور ومسلم تھا کہ "الصحابۃ کلھم عدول" سارے صحابہ عادل ہیں، اس لئے صحابہ کا طبقہ جرح وتعدیل سے بالاتر ہے، ہر ہر صحابی کی روایت بلا کسی تحقیق وتنقید کے قبول کرلی جائے گی۔

اور صحابہ کی عدالت کا راز بتلاتے ہوئے امام الحرمین فرماتے ہیں:

والسبب فی عدم الفحص عن عدالتھم انھم حملۃ الشریعۃ فلو ثبت التوقف فی روایتھم لا نحصرت الشریعۃ علی عصرہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ولما استرسلت سائر الاعصار۔ (تدریب الراوی: ۲/ ۲۱۴)

صحابہ کی عدالت کے متعلق تحقیق نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ حاملین شریعت ہیں، اگر ان ہی کی روایت میں توقف ہونے لگے تو شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ہی محدود ہوکر رہ جائے گی بعد کے زمانوں تک نہ پہنچ سکے گی۔

یہاں صحابہ کی مجموعی زندگی میں چند ایک علمی اختلافات بعض عملی کمزوریاں اور بعض لغزشیں کچھ اختلافی فتنے ضرور مل جائیں گے مگر یہ چیزیں صحابہ کی عدالت وثقاہت میں حارج نہیں ہیں۔

علامہ نوویؒ نے لکھا ہے:

"وکلھم عدول ومتأولون فی حروبھم وغیرھا ولم یخرج شئی من ذلک احدا منھم من العدالۃ لانھم مجتھدون اختلفوا فی مسائل من حل الاجتھاد کما یختلف المجتھدون"۔

ترجمہ: سارے صحابہ عادل تھے، آپس کی لڑائیوں میں تاوی کرنے والے تھے اور ان میں سے کوئی چیز کسی صحابی کو بھی دائرہ عدالت سے خارج کرنے والی نہیں، کیوں کہ وہ مجتہد اجتہاد کے مواقع پر ان حضرات کا اختلاف ہوا ہے جیسے ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے۔

دوسرا طبقہ: طبقہ غیر صحابہ:

حدیث کی روایت کرنے والوں کا دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو صحابہ کے ماسوا ہیں، ان میں تابعین اتباع ہر وہ لوگ بھی شامل تھے جو منافقانہ انداز میں مسلمان کے گروہ میں خلط ملط ہوگئے تھے، اس دوسرے طبقے کو ہم اپنے موضوع کے اعتبار سے تین گروہ میں تقسیم کرسکتے ہیں:

اول دشمنان اسلام　　دوم کبار تابعین　　سوم اوساط تابعین اور تبع تابعین

پہلا گروہ: دشمنانِ اسلام

یہ وہ بدترین اور خبیث افراد تھے جن کے خمیر میں اسلام دشمنی کا عقیدہ شامل تھا، جو اپنی منافقانہ خباثت کو چھپا کر اسلامی لباس میں ملبوس ہوکر مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہوگئے تھے، اللہ نے اسلام کو وجود بخشا، پروان چڑھایا، اسلام تو آیا ہی تھا چمکنے کے لئے پھلتا پھولتا رہا اور مخالفین حسد وعداوت کی آگ میں جلتے رہے اسلام کو مٹانے کی سازشوں،

کوششوں میں لگے رہے مناسب مواقع کی تلاش میں رہے مگر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک کسی کو سانس وڈکار لینے کی ہمت نہیں ہوئی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بعض ناگفتہ بہ حالات پیدا ہوئے جس کے نتیجہ میں حضرت عثمان کی شہادت کا قصہ بھی پیش آیا، پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جنگ صفین اور جنگ جمل کی مسموم فضاؤں مین مسلمانوں میں شدید ایسے اختلافات پیش ہوئے اس موقع پر دشمنان اسلام کو موقع غنیمت نظر آیا، چناں چہ عبداللہ بن سبا یہودی نے احادیث کو گھڑنے کا کام شروع کیا اور کرایا۔ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی۔ "اول من کذب عبد اللہ ابن سباء" "سب سے پہلے جس نے جھوٹی حدیثیں بنانے کا کام کیا وہ عبداللہ ابن سبا نے اپنی جماعت بنائی اور مختلف ممالک میں اپنے نمائندے بھیج دیئے، اور روافض وضع احادیث میں پیش پیش تھے، خوف خدا اور خوف آخرت سے بے نیازی نے اس معاملہ میں ان کو تاجری بنا دیا کہ وہ ہر چیز کو حدیث بنا دیا کرتے تھے، چناں چہ حماد بن مسلمہ کہتے ہیں کہ روافض کے ایک شیخ نے مجھ سے بیان کیا کہ "کنا اذا استحسنا شیئاً جعلناہ حدیثا" جب ہمیں کوئی بات اچھی لگتی تو ہم اسے حدیث بنا دیتے، امام مالک سے جب روافض کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: "لا تکلموا ولا تروا عنھم عنھم فانھم یکذبون" "ان سے بات نہ کرو اور ان سے روایت نہ کرو، کیوں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ خلیلی کا بیان ہے کہ روافض نے حضرت علی اور ان کے اہل خانہ کے فضائل میں تقریباً تین لاکھ حدیثیں گڑھی ہیں، ۔محدث عامر شعبی جو پہلے رافضیوں کے امام تھے پھر تائب ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اگر میں چاہوں کہ لوگ میرے غلام ہو جائیں تو یا میرے گھر کو سونے سے بھر دیں یا میرے گھر کا طواف کریں بایں عوض کہ میں علی ابن ابی طالب کے فضائل میں حدیثیں گڑھوں تو وہ ضرور ایسا کریں گے، مگر خدا کی قسم میں تو ہرگز یہ نہیں کروں گا، روافض کی طرح خوارج حدیثیں وضع کرنے میں بڑے بے باک تھے، عراق اس زمانہ میں اہلِ تشیع کا مرکز تھا، اس کے متعلق امام زہری فرماتے ہیں: "یخرج الحدیث من عندنا شبرا فیرجع من العراق ذراعا" (السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی: ص ۹۳) ہمارے یہاں سے حدیثیں ایک بالش کی نکلتی ہیں اور جب عراق سے لوٹتی ہیں تو ایک گز کی ہو جاتی ہیں۔

اسی لیے امام مالک نے فرمایا کہ عراق دار الضرب ہے، "یعنی حدیث ڈھالنے کی فیکٹری"، جہاں سکوں کی طرح حدیث بڑی تعداد میں ڈھالی جاتی ہے۔

الغرض وضع وکذب کا بازار گرم تھا یہ موقع نہیں کہ اس کی سرگرمیاں تفصیل سے بتلائی جائیں، اس لیے اس اجمال پر اکتفاء کیا جاتا ہے، ان گھناؤنے حالات میں صحابہ کرام نے اخذ روایات میں اپنی احتیاط مزید بڑھادی، چناں چہ حضرت علی نے اعلان کر دیا "حدثوا الناس مایعرفون ودعوا ماینکرون" "لوگوں سے وہی روایات بیان کرو جو ان کے درمیان معروف ہیں اور جن کو وہ جانتے ہیں اور جن کو نہیں جانتے ہیں ان کو چھوڑ دو یہ احتیاط بڑھتی رہی بڑھتی رہی یہاں تک کہ اس فتنۂ سبائیہ کے ظہور کے بعد اسانید کا مطالبہ شروع ہو گیا، مقدمہ صحیح مسلم میں امام محمد بن سیرین کا یہ قول منقول ہے: لم یکونوا یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنۃ قالوا اسموا لنا رجالکم فینظر الی اھل السنۃ

فیز خذ حدیثھم و ینظر الی اھل البدع فلا یز خذ حدیثھم“۔ (مقدمہ صحیح مسلم) الاخری ۱۴۳۰ھ

ایک مرتبہ بشر بن کعب عدوی حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوکر کچھ حدیثیں سنانے لگے، مگر ابن عباس نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، بشر نے تعجب سے پوچھا کہ ایسا کیوں تو ابن عباس نے حقیقت ظاہر فرمائی۔

انا کنا اذا اسمعنا رجلا یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتدرتہ ابصارنا و اصغینا الیہ فلما رکب الناس الصعب والذلول لم ناخذ من الناس الا ما نعرف۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

ہم جب سنتے کہ کوئی شخص قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہا ہے تو ہماری آنکھیں اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں ہمارے کان لپک پڑتے ہیں لیکن جب لوگوں نے کچی پکی سواریوں پر سواری شروع کردی تو اب ہم صرف انہی حدیثوں کو لیتے جن کی صحت وثبوت کا ہم کو علم ہوتا۔

بہر حال ان احوال نامرضیہ میں نقد رجال کا کام شرع ہو چکا تھا، اگر چہ ابھی اس کو فن کی حیثیت حاصل نہ تھی، لیکن صحابہ کی ایسی عظیم احتیاطی تدبیر کے نتیجہ میں سبائی فکر کامیاب نہ ہوسکی، اور پورا ذخیرۂ حدیث دینی چمک ومک کے ساتھ محفوظ رہا۔

دوسرا گروہ:

اس گروہ سے مراد تابعین خصوصا کبار تابعین کی جماعت ہے، اگر چہ ان لوگوں کا حال صحابہ جیسا تو نہ تھا، مگر چوں کہ صحابہ ہی کے پروردہ اور تربیت کردہ تھے اس لیے دین وایمان کی صیانت وحفاظت کا جوہر ان میں رچی انداز میں کارفرما تھا اس لیے یہ حضرات کذب وافتراء سے پاک تھے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں ”طبقہ تابعین میں انتہائی تحقیق وتفتیش اور غایت درجہ تنقید کے بعد بھی کوئی راوی کاذب نہیں ملا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

حافظ شمس الدین سخاوی ایک جگہ لکھتے ہیں: ”پہلی صدی ہجری جو صحابہ وتابعین کے دور میں گزری اس میں حارث اعور اور مختار کذاب جیسے اشخاص کو چھوڑ کر کسی ضعیف الروایہ شخص کا تقریبا وجود نہ تھا، پھر پہلی صدی گزر کر جب دوسری آئی تو اس کے اوئل میں اوساط تابعین کی ایک جماعت وجود میں آئی جو زیادہ تر حدیث کو زبانی یاد رکھنے، اور اپنے سینے میں محفوظ رکھنے کے لحاظ سے ضعیف سمجھی گئی ہے۔

تیسرا گروہ:

اس میں اوساط تابعین اور عام تبع تابعین شامل ہیں اس طبقے میں بے شک کذب کا ظہور ہوا، اور اہل ہوئی نے حق وباطل اور صدق وکذب کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی مگر حق تعالی شانہٗ نے اپنی شریعت کی حفاظت کے لیے بڑے بڑے علماء کی ایک زبردست جماعت پیدا کردی، جیسے امام مالک، امام عبدالرحمن بن عمرو الاوزاعی، سفیان ابن ثوری، شعبہ بن الحجاج العتکی، ابن جریج، ان حضرات نے بالقاء ربانی نقد رواۃ کے لیے ایک نئے فن کی بنیاد رکھی جس کے

ذریعہ ہر ہر راوی کے حالات معلوم کر کے جرح و تعدیل کی روشنی میں کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کیا، یہی فن اسماء الرجال کے نام سے موسوم ہے۔

فن اسماء الرجال کا تدریجی ارتقاء

عہد بہ عہد

احادیث کی صحت اور اس کے حقیقی مفہوم و مراد کی تعیین کا ابتداء ہی سے بڑا اہتمام رہا، اکابر صحابہ ہی کے دور سے حدیث کے اس پہلو پر پوری توجہ تھی، جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک مسئلہ کے سلسلے میں فاطمہ بنت قیس کی روایت کو یہ کہہ کر تسلیم نہ کرنا کہ ایک عورت کے بیان سے ہم قرآن کے فیصلے نہیں کر سکتے، خدا کو معلوم اس نے فرمانِ رسول کو صحیح سمجھا یا نہیں، یا درکھا یا نہیں، یا بھول ہوگئی۔ حضرت ابن عبداللہ بن عمرؓ کے ایک روایت کے مفہوم بیان کرنے پر حضرت عائشہ کا نقد کرنا، حضرت عبداللہ بن عباس کا حضرت ابوہریرہ پر روایت کے مفہوم کی تعیین میں تنقید کرنا خود احادیث میں مذکور ہے۔ راوی کے مقام و مرتبہ اس کی ذہانت و فطانت اور استنباطِ مسائل کی صلاحیت کو پرکھا جاتا ہے، اس طرح روایت کے بیان مفہوم کو دین و شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی، مشاہیر صحابہ کی اس پہلو پر گہری نگاہ اور پوری توجہ تھی، بہت سے ناموں میں سے اس سلسلہ میں عبداللہ بن عباس، عبادہ بن صامت، انس بن مالک، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے ہیں، ان حضرات کا نقد و تبصرہ کا تذکرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے، لیکن اس کی نوعیت کم ہی آتی تھی، کیوں کہ تمام صحابہ سنت نبوی کے مزاج شناس اور اس پر عمل کرنے کے سلسلے میں اپنی مثال آپ تھے، دوسری بات یہ ہے کہ خدا اور رسول کے غیر مبہم اور واضح فرمان سے ان کی عدالت نا قابل بحث تھی، ان پر کسی طرح کی جرح ممکن ہی نہ تھی، سوائے اس کے کہ روایت کے مفہوم سمجھنے میں اتفاقاً خطا ہوجائے، یا کوئی بھول ہوجائے جو انسانی فطرت ہے، خطا و نسیان ہی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، کیوں کہ ان کا زہد و تقویٰ خشیت الٰہی فرمان رسول سے والہانہ وابستگی بیان مسائل میں کامل احتیاط ان کی زندگی کا طرہ امتیاز تھا، خیر القرون کی پہلی صدی اسی خیر و برکت کے پاکیزہ ماحول میں گزری۔

دوسری صدی کا آغاز:

البتہ جب پہلی صدی ختم ہوتی ہے اور ایک ایک کر کے صحابہ کرام اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں خیر و برکت اور صلاح و تقویٰ کا وہ بلند ترین معیار نہ رہا، اور خالص تابعین کا دور آیا جنہوں نے براہ راست صحابہ کرام سے احادیث نبوی کو نہیں سنا تھا، اس دور میں راویوں کی جانچ پڑتال اور تنقید و تبصرہ کی ضرورت پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہوگئی، اس طرف جلیل القدر اور مشاہیر تابعین میں سے حضرت شعبی، سعید بن مسیب اور ابن سیرین نے خصوصیت سے توجہ فرمائی، لیکن پھر بھی اکابرین تابعین کا غلبہ تھا۔ طبیعتوں میں صلاح و تقویٰ کا جذبہ پوری قوت کے ساتھ موجود تھا، اس لیے تنقید رواۃ کی ضرورت کم پڑتی تھی، یہ میدان ابھی کچھ وسیع نہیں تھا، اس کا دائرہ افراد و اشخاص کی ایک مخصوص تعداد

ہی تک محدود تھا، اس دائرہ میں وہ لوگ تھے جن سے نادانستہ غلطیاں ظہور پذیر ہوجاتی تھیں، یا ۱۱۰ھ میں فسادِ عقیدہ کی بو آجاتی تھی، یا وہ مذہبی وسیاسی گروہ بندیوں کا شکار تھا، اور جب دوسری صدی شروع ہوجاتی ہے تو تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت راویانِ حدیث میں شامل ہوجاتی ہے، تبع تابعین کے بہت سے ضعیف راوی بھی اس میدان میں آگئے، غلطیوں کا ظہور ہونے لگا، مرسل روایتیں عام طور پر بیان کی جانے لگیں اور موقوف روایتوں کو مرفوع بنا کر پیش کیا جانے لگا، اس طرح مختلف طرح کی خامیاں اور کمزوریاں اور غلطیاں وخیل ہوگئیں، ۱۵۰ھ کے آتے آتے مسلمانوں میں سیاسی گروہ بندیوں پر شباب آگیا، بنوامیہ کی حکومت ختم ہوئے چوتھائی صدی کی مدت ختم ہوچکی تھی، اب عباسیوں کا پرچم اقبال لہرا رہا تھا، خیر القرون سے بعد کی وجہ سے وہ دینی صلابت باقی نہ رہی، عباسی حکومت کا یونانی فلسفہ کی طرف رجحان ہوگیا، اور فلسفہ کی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کردینے کا حکومتی سطح پر سلسلہ شروع ہوا، اور لوگ اس کی تحصیل میں لگ گئے، جس کی وجہ سے شریعت کے مسائل میں فلسفیانہ موشگافیاں ہونے لگیں، بے بنیاد روایتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی جرأت بڑھ گئی، مختلف فرقے وجود میں آگئے، اور ہر فرقہ شدت کے ساتھ اپنے مسلک کی تائید میں مصروف تھا، گروہی عصبیت نے راہ پائی، کذب بیانی، جھوٹ اور غلطیوں میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوگیا، مختلف ملکوں میں اور شہروں میں ہر ذہن ومزاج ہر قوم وملت کے لوگ اسلامی دائرے میں داخل ہوگئے، ہر فرقہ اپنی کچھ مخصوص سندیں اور روایتیں رکھنے لگا اور ان کی نشر واشاعت میں مصروف ہوگیا، ان میں سے بعض فرقوں کا مقصد اسلام کے خلاف سازش کرنا تھا، اسلامی تعلیمات وروایات کے دامن کو داغدار بنانا تھا، زیادہ تر فرقہ بندی اور گروہ بندی کی عصبیت اور تنگ نظری نے کذب بیانی اور جھوٹ روایتوں کے گڑھنے پر ان کو آمادہ کیا، علماء اسلام نے اس صورتِ حال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا، ان کی روایتوں کا جانچا ان کی سندوں کو پرکھا، بحث وتمحیص، تفتیش وجستجو کریداور تنقید پر زیادہ توجہ کی، اور انہوں نے راویوں کے حالات معلوم کرنے کی جدوجہد بڑے پیمانے پر کی، ہر اسلامی شہر میں جاکر وہاں کے مشائخ سے مل کر شیوخ حدیث سے براہ راست مل کر شہر کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر ہر راوی حدیث کے متعلق پوری معلومات فراہم کی، اس سلسلہ میں محدثین نے پورے عالمِ اسلام میں چل کر ہر قابل ذکر راوی حدیث سے ملاقات کی دوسروں سے ان کے بارے میں پوچھا جانچا پرکھا اور قلم بند کیا انہیں حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں انہوں نے جرح وتعدیل کے ذریعہ ان کی روایتوں کی حیثیت کو واضح کیا، اور ان راویوں کی نشاندہی کردی جو روایت کے معیار پر پورے نہیں اترتے، دوسری صدی کے اختتام تک بڑے پیمانے پر تنقید رواۃ کا کام ہر طرف شروع ہوگیا، اور راویوں کے حالات معلوم کرکے ان کی روایتوں کے رد وقبول کا فیصلہ کیا گیا، تبع تابعین کا آخری دور تھا، اسی دور میں فن اسماء الرجال میں تصنیفوں کا آغاز ہوا، ان محدثین اور علماء اسماء الرجال میں سرفہرست شعبہ ابن الحجاج متوفی ۱۶۵ھ، امام مالک متوفی ۱۷۹ھ، معمر متوفی ۱۵۳ھ، ہشام متوفی ۱۴۶ھ کے اسماء گرامی ہیں، ان کے بعد ائمہ فن اسماء الرجال میں نمایاں نام عبداللہ بن مبارک متوفی ۱۸۱ھ، ہشیم متوفی ۱۸۳ھ اور سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ کے آتے ہیں، درجہ بہ درجہ فن وسعت اختیار کرتا جارہا تھا، کیوں کہ یہ وقت کی سب سے اہم ضرورت کی حیثیت اختیار کرچکا تھا، اس لیے علماء اسلام اور محدثین عظام کا بڑا گروہ

میدان میں آ گیا، اورانہوں نے حقِ تحقیق ادا کیا، ان میں یحی ابن سعید القطان متوفی ۱۹۸ھ اور عبد الرحمن ابن المہدی متوفی ۱۹۸ھ کے نام جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یحی القطان ہی وہ شخص ہیں جن کے بارے میں علامہ ذہبی نے لکھا ہے:

قال احمد بن حنبل ما رأیت بعینی مثل یحی بن سعید القطان: امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مجھے یحی بن سعید القطان جیسا کوئی نظر نہیں آیا۔ یحی القطان پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے راویوں کی تنقید کو باقاعدہ ایک فن کی شکل دیدی، انہوں نے راویوں کے بارے میں مخصوص حکم کا اظہار کیا، اوران کو ضبط کیا اور عام محدثین نے ان کے راویوں کو احترام کی نگاہوں سے دیکھا اور اسماء الرجال کی کتابیں ان کے اقوال وآراء سے بھری پڑی ہیں۔

تیسری صدی کا آغاز:

پھران حضرات کے شاگردوں نے رواۃ کی تحقیق کا کام سنبھالا، ان میں یحی ابن معین، علی ابن مدینی، امام احمد بن حنبل کے نام سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے، پھر ان کے تلامذہ نے فن اسماء الرجال کو ایک مکمل فن بنا دیا اور فن میں ضخیم ضخیم کتابیں تصنیف کیں، جیسے امام بخاری، امام مسلم، ابو زرعہ رازی، ابو حاتم رازی، یہ بہت ناموں میں سے چند نام ہیں، اس کے بعد ان کے شاگردوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اس میں مزید اضافہ کیا، ان میں کچھ نمایاں نام یہ ہیں: امام ترمذی، امام نسائی، وغیرہ اس طرح تیسری صدی کے اخیر تک یہ فن معراج کمال کو پہونچ کر ایک عظیم الشان فن بن گیا، اور دنیا کی کسی قوم ومذہب کی کوئی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے آج تک عاجز ہے، اس فن میں لاکھوں اشخاص کی زندگی کے سارے پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ اب ہر شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگیا کہ یہ شخص روایت حدیث میں قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، اور تیسری صدی کے نصف اول میں صحیح ترین حدیثوں کو جمع کرنے کی مہم پایۂ تکمیل کو پہونچ گئی، اور درجنوں احادیث کے مجموعے مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیے گئے کیوں کہ اب جھوٹی، موضوع اور بے بنیاد روایتوں کی چھانٹنے، علحدہ کرنے اور صحیح حدیثوں کو منتخب کرنے کی ایسی کسوٹی مہیا ہو چکی تھی کہ اس میں غلطی کا احتمال ختم ہو چکا تھا، حدیثوں کے مجموعے تو بہت پہلے سے موجود تھے لیکن صحاح ستہ کی ترتیب کا شرف تیسری صدی کو حاصل ہوا۔ (فن اسماء الرجال: مؤلف اسیر ادروی)

علم اسماء الرجال اور علم الجرح والتعدیل کا باہمی ربط

ابتداء یہ دونوں دو مستقل فن تھے، اگر چہ کہ دونوں کا مآل اور انجام کار اور بناء وتاسیس کی غرض ایک ہی تھی وہ یہ کہ احادیث کا صحیح مقام ودرجہ جانا جا سکے، مگر دونوں کے درمیان جو فرق تھا وہ یہ کہ علم اسماء رجال سے صرف اشخاص کی زندگیاں ان کے احوال وکوائف معلوم ہوتے تھے، اور اس اعتبار سے تو یہ فن علم التاریخ کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ابتداء میں اس فن کو تاریخ ہی کا نام دیا جاتا تھا، چناں چہ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں تاریخ کے نام سے موسوم تھیں، مثلاً: التاریخ الکبیر للبخاری، التاریخ الصغیر للبخاری، تاریخ ابن خثیمہ، وغیرہ۔

اور فنِ جرح و تعدیل کا مقصد تھا، راوی کے حالات و اوصاف کو دیکھ کر ان کی کیفیات متعین کر دینا اور نقل روایات کے باب میں اس کی مقبولیت و مردودیت کا درجہ بتلا دینا کہ کون سا راوی ثقہ صدوق ہے، اور کونسا راوی کاذب و مردود ہے، مگر چوں کہ یہ دونوں فن باہم لازم ملزوم تھے بایں طور کہ محض احوال رواۃ کا معلوم کرنا مقصود نہیں تھا کہ اصل مقصود تو اس کی راویانہ حیثیت درجہ کو جاننا تھا اور درجہ بندی کا یہ کام بغیر تاریخ جانے ہوئے نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے متاخرین محدثین نے دونوں کو ایک ساتھ جمع کرنا شروع کر دیا چناں چہ ان کی تصنیفات میں تاریخ رجال اور جرح تعدیل کے اصول کے مطابق ان کی درجہ بندی بھی ساتھ نظر آتی ہے اور دونوں یکجا کرنے کا یہ طرز اس لئے اپنایا کہ امت کے لئے استفادہ آسان ہو جائے، مثلاً دیکھئے ہم ایک راوی کے لئے ابن حجر کی تہذیب التقریب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک ہی صفحہ پر راوی کی زندگی اور اس کی راویانہ حیثیت دونوں ہمیں مل جاتی ہیں۔

فتنۂ وضع حدیث اور اساطین امت کی دفاعی کوششیں:

یہ بات بخوبی سامنے آچکی کہ وضع حدیث کا فتنہ کتنا سنگین مہلک اور کس قدر پلاننگ اور جوش و خروش کے ساتھ کیسے بڑے پیمانے پر پھیلتا جا رہا تھا مگر صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین اور بعد کے علمبرداران اسلام، محافظین ملت، پاسبان شریعت، علمائے امت نے کمر بستہ ہو کر اس فتنہ کا خوب خوب مقابلہ کیا، طاقت سے بھی اور علم و فن کے ذریعہ سے بھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کو عبداللہ بن سباء کی فتنہ انگیزی کی خبریں پہنچیں تو آپ نے فرمایا: مالی ولھذا الخبیث الاسود۔ اس کالے خبیث سے مجھے کیا لینا دینا۔ علامہ ابن حجر تو فرماتے ہیں کہ قد احرقھم علی فی خلافتہ۔ اس جماعت کو حضرت علی نے اپنے زمانہ خلافت میں آگ میں ڈلوا دیا تھا۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ حضرت علی نے ان کے متعلق فرمایا: قاتلھم اللّٰہ ای عصابۃ سودوا ای حدیث من حدیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم و افسدوا۔ اللہ ان کو ہلاک کرے انہوں نے کتنی پاکیزہ جماعتوں کو سیاہ کر ڈالا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی حدیثوں کو فاسد کر دیا۔ (تذکرہ الحفاظ)

اس نہج پر محدثین نے بھی واضعین حدیث کے ساتھ سخت موقف اختیار کیا ان کے نزدیک حدیث وضع کرنے والا گویا اسی سلوک کا مستحق ہے جو سلوک مرتد اور مفسد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ابو العباس سراج کہتے ہیں کہ میں محمد بن اسماعیل بخاری کے پاس حاضر ہوا اور ان کو ابن کرام کا ایک مکتوب دیا جس میں چند احادیث کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، ان میں زہری سالم اور سالم کے والد کی سند سے یہ روایت بھی تھی: الایمان لا یزید و لا ینقص۔ ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں ہے۔ تو امام بخاری نے خط کی پشت پر لکھا، من حدث بھذا استوجب بہ الضرب الشدید و الحبس الطویل۔ جس نے یہ حدیث بیان کی ہے وہ سخت سزا اور طویل قید کا مستحق ہے۔ وضع حدیث کا مرتکب اکبر کبائر کا مرتکب گردانا گیا ہے، اور ابو محمد الجوینی نے اس کی تکفیر کی ہے۔ اسی طرح ائمہ مالکیہ میں ناصر الدین ابن المنیر نے بھی اس کی تکفیر کی ہے علامہ ذہبی نے ابوداؤد کے حوالے سے لکھا ہے کہ یحیی بن معین

نے سوید الانباری کے بارے میں کہا ہے وہ ''حلال الدم'' ہے۔حاکم کہتے ہیں کہ الاخیری یہ روایت :من عشق و عف و کتم و مات مات شہیدا۔ جس نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور اپنے عشق کو چھپایا اور اسی حالت میں مر گیا تو اس کی موت شہادت ہے۔جب یحی بن معین کو معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا ''لو کان لی فرس و رمح غزوت سویدا'' اگر میرے پاس گھوڑا اور نیزہ ہوتا تو میں سوید سے ''جنگ کرتا''۔

ابن عتیبہ نے معلّی کے بارے میں کہا کہ اگر وہ ابن جریج سے فلاں (موضوع) روایت بیان کرتا ہے تو اس کی گردن مار دینے کی ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ عبد الکریم بن ابی العوجا اور محمد بن مصلوب جیسے کذابوں کو قتل کی سزا دی گئی۔ایسے مجرموں کی گواہی مردود اور اس کی ثقاہت مجروح ہے۔وہ اگر توبہ بھی کر لے تب بھی اہل علم کے نزدیک وہ نا قابل اعتبار ہے اس کی کوئی روایت قبول نہیں کی جائے گی، امام احمد بن حنبل سے ایک راوی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایک جھوٹی حدیث بیان کی پھر توبہ کر لی تو انہوں نے جواب دیا، اس کی توبہ اللہ اور اس کے درمیان، مگر اس سے حدیث کبھی نہیں روایت کی جائے گی۔

خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں ایک زندیق کو قتل کے لئے لایا گیا تو وہ کہنے لگا تم مجھے تو قتل کر دو گے لیکن ان ایک ہزار حدیثوں کا کیا کرو گے جو میں نے وضع کر کے چالو کر دی ہیں، ہارون رشید نے فوراً جواب دیا:

فاین انت یا عدو اللہ عن ابی اسحٰق الفزاری وابن المبارک ینخلانہا فیخرجانہا حرفا حرفا'' اے دشمن خدا تو ابو اسحٰق فزاری اور ابن مبارک سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے جو ان کو چھلنی کی طرح چھان کر ایک ایک حرف نکال پھینکیں گے''۔ (معرفتہ علوم الحدیث)

اس کے علاوہ محدثین و علما نے اپنی کوششیں آگے بڑھاتے ہوئے مستقل فن اسماء الرجال کو قائم فرمایا جس کے اندر ایسے اصول و قواعد بنائے جس کی مدد سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔اس کے لئے انہوں نے چند بنیادی کام کئے:

۱) اسانید کی تحقیق اعلیٰ معیار پر شروع کر دی اور اس کے لئے بڑے اہم قواعد منضبط کئے۔

۲) سند اور متن سے متعلق کچھ ایسی علامات متعین فرمائی جس سے موضوع روایات صحیح روایات سے تمیز ہو جائیں، جن کی تفصیل اسماء الرجال کی کتابوں سے معلوم ہوتی ہیں۔

۳) تحقیق احادیث کے لئے محدثین نے حدیثی ملکہ راسخہ اور وجدانی فنی کو بھی بنیاد بنایا کیوں کہ ان محدثین کرام کو حق تعالیٰ شانہٗ نے وہ نور باطن اور وجدانی ملکہ عطا فرمایا تھا کہ کسی راوی کی روایت سننے و دیکھنے کی ساتھ ہی سمجھ جاتے تھے کہ یہ راوی جھوٹا ہے یا سچا۔روایت صحیح ہے یا ضعیف و موضوع:

حافظ ابن قیم سے سوال کیا گیا کہ کیا ممکن ہے کہ بغیر سند کے دیکھے ہوئے حدیث موضوع کا علم ہو جائے؟ تو حافظ صاحب نے فرمایا کہ یہ بڑا عظیم القدر سوال ہے بغیر سند کے دیکھے ہوئے وہی شخص حدیث کو پہچان سکتا ہے جس کے گوشت و پوست میں حدیث سرایت کر چکی ہو اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و اوامر و نواہی اور

آپ کے مرغوبات ومرضیات ہر وقت اس کی نظر کے سامنے ہوں، گویا کہ وہ حضور ﷺ کی مجلس مبارک میں صحابہ کرام کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ ایسا شخص حدیث کو سنتے ہی بغیر سند کے دیکھے ہوئے سمجھ جاتا ہے کہ یہ ارشاد نبوی ہے یا نہیں؟ یہ ایسا ہے کہ جس طرح فقہائے حنفیہ یا فقہائے شافعیہ طرز کلام سے پہچان لیتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے یا امام شافعی کا۔ صراف (سنار) جس طرح سونا دیکھ کر کھرے کھوٹے کا اندازہ کر لیتا ہے، اسی طرح یہ حضرات محدثین بھی حدیث پاک سے اشتغال اور طول ممارست کی وجہ سے غلط وصحیح میں امتیاز کر لیتے تھے۔

ربیع بن خیثم ایک جلیل القدر تابعی ہیں فرماتے ہیں:۔ ''ان من الحدیث حدیثا له ضوء کضوء النهار وان من الحدیث حدیثا له ظلمه: کظلمة اللیل نعرفه بها'' بیشک بعض حدیثیں روایتوں میں روشنی ہوتی ہے، دن کی روشنی کی مانند اور بعض میں ایک تاریکی ہوتی ہے، رات کی تاریکی کی مانند جس سے ہم اس کا (صحیح وغلط) ہونا پہنچانتے ہیں۔

عبدالرحمن بن مہدی نے فرمایا: کہ حدیث کی معرفت ایک الہام ہے، بسا اوقات اگر تم کسی عالم سے جو حدیث کی علت بیان کرتا ہے، دلیل طلب کرو تو وہ دلیل نہیں پیش کر سکتا۔

علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں: حدیث منکر کو سنکر محدث کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور قلب اس سے نفرت کرتا ہے۔

شیخ ابوالحسن علی بن عروہ حنبلی ''کتاب الکواکب'' میں فرماتے ہیں کہ:۔ جسکی فطرت سلیم ہو اور قلب اس کا نور تقوی سے منور ہو، اور صدق واخلاص اس کا مزاج ثانی بن چکا ہو، سنتے ہی اس کو جھوٹ وسچ کا پتہ چل جاتا ہے، بعض بزرگان دین نے فرمایا کہ جب کوئی جھوٹ بولنے کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کا کلام پورا ہونے کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کا کلام پورا ہونے سے پہلے ہی میں اس کی مراد کو سمجھ جاتا ہوں (کہ وہ جھوٹا ہے) اللہ تعالی نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:۔ ''ولتعرفنهم فی لحن القول'' اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ کو ایسا خاص نور فراست عطا کیا کہ آپ اسکے ذریعہ منافقین کو ان کے لب ولہجہ سے پہنچان لیتے ہیں کہ یہ نفاق کی بات ہے۔

حافظ بلقینی کا ارشاد ہے: اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی انسان کی چند سالوں تک خدمت کرے گا تو وہ اس کی ان تمام چیزوں سے واقف ہو جائے گا جو اسے پسند ہیں یا ناپسند، پس اگر کوئی دعوی کرے کہ وہ فلاں چیز کو ناپسند کرتا ہے، جس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ وہ پسند کرتا ہے تو فقط اس کی بات سنتے ہی سے اس کی تکذیب کر دے گا۔

علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں: محدثین کرام کا کسی حدیث کو موضوع قرار دینے کا تعلق اکثر حدیث کے متن اور اس کے الفاظ سے ہوتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرات محدثین کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کے کثرت استعمال سے ایک خاص ذوق وملکہ حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اور دوسرے کے الفاظ میں تمیز

کر لیتے ہیں۔ (از فن اسماء الرجال مولف الشیخ الدکتور تقی الدین الندوی المظاہری)

فن اسماء الرجال کی اولین اہم شخصیات

(۱) شعبہ بن الحجاج العتکی الازدی الواسطی ثم البصری المولود ۸۲ھ المتوفی ۱۶۰ھ

حضرت شعبہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے راویان حدیث کے حالات کی جستجو تحقیق وتنقید کا آغاز کیا اور سب سے پہلے انہوں نے ہی ثقہ راویوں کی فہرست سے ضعیف اور متروک راویوں کو چھانٹ کر علحدہ کیا، اور ان راویوں کی نشاندہی کی۔ امام احمدؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں: ھو امۃ وحدہ فی ھذا الشان 'وہ اس سلسلہ میں تن تنہا ایک جماعت کے قائم مقام ہیں۔

امام شافعیؒ ان کے بارے میں کہتے ہیں: ''لولا شعبہ ماعرف الحدیث بالعراق'' اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں صحیح طور پر حدیث کا علم نہ ہوتا۔

(۲) یحیٰ القطان التمیمی المولود ۱۲۰ھ المتوفی ۱۹۸ھ

امام احمد بن حنبل نے ان کے متعلق فرمایا: ''ما رأیت بعینی مثل یحیی القطان'' میں نے اپنی آنکھ سے یحیٰ القطان کا ثانی نہیں دیکھا۔ ایک محدیث بندار کہتے ہیں کہ میں اپنے بیس سالہ تجربہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ ان سے کبھی کوئی معصیت صادر نہیں ہوئی۔

(۳) ابن سعد الزہری ابوعبداللہ البغدادی المولود ۱۶۸ھ

آپ کی مشہورترین کتاب ''طبقات الصحابہ'' ہے جو پوری دنیا میں طبقات ابن سعد کے نام سے جانی جاتی ہے۔

(۴) یحیٰ بن معین البغدادی المولود ۱۵۸ھ المتوفی ۲۳۳ھ

یہ رجال حدیث کے بہت بڑے مورخ اور امام ہیں۔ امام بخاریؒ کے شیوخ میں سے ہیں۔ علامہ ذہبی نے ان کو سید الحفاظ کا لقب دیا ہے، ابن حجر ان کو امام الجرح والتعدیل کہتے ہیں۔

(۵) علی بن مدینی ابوالحسن علی بن عبداللہ بن جعفر بن نجیح السعدی المدینی ثم البصری المولود ۱۶۱ھ المتوفی ۲۳۴ھ

امام احمد غایتِ احترام میں نام کے بجائے صرف ان کی کنیت سے ان کو یاد کرتے تھے۔ امام نوویؒ کا بیان ہے کہ ابن المدینی کی تصانیف کی تعداد دوسو کے قریب ہیں، ان بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) الاسامی والکنی/۸ جلدیں۔ (۲) الطبقات/۱۰ جلدیں۔ (۳) قبائل العرب/۱۰ جلدیں۔
(۴) التاریخ/۱۰ جلدیں۔ (۵) اختلاف الحدیث۔ (۶) مذاہب المحدثین وغیرہ۔

(۶) ابوخیثمہ: زہیر بن حرب بن شداد ابوخیثمہ النسائی البغدادی المولود ۱۶۰ھ المتوفی ۲۳۴ھ

(۷) امام احمد بن حنبلؒ: احمد بن محمد بن حنبل الذہلی الشیبانی المروزی المولود ۱۶۴ھ المتوفی ۲۴۱ھ

آپ کے علمی وعملی جلالت قدر شان استقامت تقوی وخشیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

آپ کی تصانیف میں: (۱)مسند الامام احمد۔(۲)الناسخ والمنسوخ ۔(۳)[illegible]۔
(۴)التفسیر ۔(۵)فضائل الصحابہ۔(۶)المناسک وغیرہ۔
(۸)الفلاس عمرو بن علی بن بحر ابو حفص السقاء الفلاس البغدادی المتوفی ۲۴۹ھ
آپ کی تصانیف میں: (۱)المسند۔(۲)العلل ۔(۳)التاریخ۔
(۹)امام بخاریؒ:محمد بن اسماعیل بن ابراہیم البخاری المولود ۱۹۴ھ المتوفی ۲۵۶ھ
آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فن حدیث کے لئے کچھ مستحکم اصول بنائے اور ایک خاص معیار پر پرکھ حدیثوں کو جمع کیا،اس سے پہلے کے احادیث کے مجموع صحت کے اس کڑے والتزام سے خالی تھے۔
آپ کی تصانیف میں صحیح بخاری کے علاوہ:
(۱)التاریخ الکبری۔(۲)التاریخ الاوسط۔(۳)التاریخ الصغیر۔(۴)کتاب الکنی۔(۵)کتاب الضعفاء۔
(۱۰)امام مسلم ابو الحسن مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری النیشاپوری المولود ۲۰۴ھ المتوفی ۲۶۱ھ۔۔۔آپ کی تصانیف میں صحیح مسلم کے علاوہ المسند الکبری، الکنی والاسماء، الافراد والوحدان الاقران، العلل، الطبقات، کتاب اولاد الصحابہ وغیرہ۔
ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد اجلہ علماء ومحدثین کی ہے،جنہوں نے خصوصیت سے فن اسماء الرجال میں بے مثال کارنامے انجام دئے ہیں۔مثلاً:
(۱)ابوزرعہ رازی ۲۶۴ھ۔(۲)ابوحاتم رازی ۲۷۷ھ۔ (۳)امام ترمذی ۲۷۹ھ۔ (۴) ابن ابی خیثمہ ۲۷۹ھ۔
(۵)ابن الجارود ۳۰۷ھ۔(۶)الدولابی ۳۱۰ھ۔(۷)ابن خزیمہ ۳۱۱ھ۔(۸)ابن ابی حاتم ۳۲۷ھ۔
(۹)ابن حبان ۳۵۴ھ۔(۱۰)ابن عدی ۳۶۵ھ۔(۱۱)دارقطنی۔(۱۲)حاکم۔(۱۳)ابن مندہ۔
(۱۴)خطیب بغدادی۔(۱۵)السمعانی۔(۱۶)ابن جوزی۔(۱۷)ابن حجہ وغیرہ۔

فن اسماء الرجال کی اہم اور مشہور کتابیں

فن اسماء الرجال میں رجال کے مختلف پہلوؤں اور طبقوں کو سامنے رکھ کر کتابیں لکھی گئی ہیں۔مثلاً:
(۱) حالات صحابہؓ پر:
(۱)معرفۃ من نزل من الصحابہ سائر البلدان از:علی بن المدینی ۲۳۴ھ
(۲)کتاب المعرفۃ از:ابومحمد عبداللہ بن عیسیٰ مروزی ۲۹۳ھ
(۳)کتاب الصحابہ از:ابن حبان بستی ۳۵۴ھ
(۴)الاستیعاب از:ابو یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز قرطبی ملکی ۳۶۸ھ
(۵)اسد الغابہ از:علامہ ابن الاثیر ۶۳۰ھ

(۱)الاصابہ فی التمییز الصحابہ		از:ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ

(۲) تاریخ رجال پر:

(۱) تاریخ الرواۃ		از:یحی بن معین ۲۳۳ھ

(۲)التاریخ		از:امام احمد بن حنبل ۲۴۱ھ

(۳)التاریخ الکبیر۔الاوسط۔الصغیر		از:امام بخاریؒ ۲۵۶ھ

(۴) تاریخ بغداد		از:احمد بن علی بغدادی شافعی ۴۹۳ھ

(۵)الجمع بین رجال الصحیحین		از:ابوالفضل محمد بن طاہر المقدسی ۵۰۷ھ

(۶)المغنی فی اسماء رجال الحدیث		از:شیخ محمد

(۷) کتاب الکمال فی اسماء الرجال		از علامہ قزوینی ۶۶۳ھ

(۸)تہذیب الکمال فی اسماء الرجال		از علامہ جمال الدین مزی دمشقی ۷۴۲ھ

(۹) تذھیب تہذیب الکمال		از:حافظ محمد بن احمد بن عثمان الذہبی ۷۴۸ھ

(۱۰) تعجیل المعنفعہ بزوائد رجال الائمۃ الاربعۃ از:حافظ ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ

(۱۱) تہذیب التہذیب		از:حافظ ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ

(۱۲) تقریب التہذیب		از:حافظ ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ

(۳) طبقات پر

(۱)الطبقات الکبری		از:محمد بن سعد الواقدی ۲۳۰ھ

(۲)طبقات التابعین		از:مسلم بن حجاج القشیری ۲۶۱ھ

(۳) کتاب التابعین		از:ابن حبان بستی ۳۵۴ھ

(۴)طبقات المحدثین والرواۃ		از:علامہ حافظ ابو نعیم الاصبانی ۴۳۰ھ

(۵) تذکرۃ الحفاظ		از حافظ شمس الدین ذہبی ۷۴۸ھ

(۴) اسماء کنی والقاب پر

(۱)الاسامی والکنی		از:علی عبداللہ بن جعفر المداینی ۲۲۴ھ

(۲)الاسماء والکنی		از:امام احمد بن حنبلؒ ۲۴۱ھ

(۳)الکنی۔نام کی امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ		عبدالرحمن بن ابی حاتم کی کتابیں

(۴) فتح الباب فی الکنی والالقاب		از:ابن مندہ اصبہانی ۳۹۵ھ

(۵)المؤلف والمختلف		از:شیخ عبدالغنی اسدی مصر ۳۳۲ھ

(۶)المشتبہ فی النسبۃ		از:شیخ عبدالغنی اسدی مصر ۳۳۲ھ

(۷)المشتبہ فی اسماء الرجال		از:حافظ محمد بن احمد عثمان ذہبی ۷۴۸ھ

(۸)نزھۃ الباب فی الالقاب — از:ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ

(۵)انساب پر

(۱)الانساب المسمہ — از:شیخ محمد بن طامقدسی ۵۰۷ھ

(۲)الانساب — از:علامہ سمعانی ۵۶۲ھ

(۳)اللباب — از:علی بن محمد شیبانی ۶۳۰ھ

(۶)جرح وتعدیل:

اس عنوان پر بعضوں نے اپنی تصنیف میں صرف کذابین وضعفاء کو موضوع بنایا اور بعضوں نے صرف ثقات کو اور بعضوں نے ثقات وضعفاء دونوں کو

(۱)الجرح والتعدیل — از:احمد بن حنبلؒ ۲۴۱ھ

(۲)الجرح والتعدیل والضعفاء — از:جوزجانی ۲۵۹ھ

(۳)الضعفاء — از:امام بخاریؒ ۲۵۶ھ

(۴)تاریخ الضعفاء والمتروکین — از:امام نسائی ۳۰۳ھ

(۵)الجرح والتعدیل — از:امام رازیؒ ۳۲۷ھ

(۶)کتاب الضعفاء والمتروکین — از:علامہ ابن الجوزی ۵۹۷ھ

(۷)الثقات — از:ابوحاتم بن حبان بستی ۳۵۴ھ

(۸)میزان الاعتدال — از:حافظ شمس الدین ذھبی ۷۴۸ھ

(۹)لسان المیزان — از:حافظ ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ

(۱۰)طبقات المدلسین — از:حافظ ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ

(۷)احادیث موضوعہ پر:

اس عنوان پر احادیث موضوعہ کے علاوہ ان راویوں کو بھی جمع کیا ہے، اور ان پر کلام کیا ہے، جن کو ائمہ فن نے مجروح قرار دیا ہے۔

(۱)تذکرۃ الموضوعات — از:علامہ مقدسی

(۲)الموضوعات — از:علامہ ہمدانی جوزقی

(۳)الموضوعات الکبری — از:علامہ ابن الجوزی

(۴)تحذیر الخواص عن اکاذیب القصاص — از:علامہ سیوطی ۹۱۱ھ

(۵)اللآلی المصنوعۃ — از:علامہ سیوطی ۹۱۱ھ

(۶)التعقبات — از:علامہ سیوطی ۹۱۱ھ

(۷)تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ — از:علامہ ابن العراق الکنانی ۹۶۳ھ

(۸)الفوائد المجموعۃ — از:علامہ شوکانی

(۹)المقاصد الحسنہ　　از:علامہ سخاوی ۹۰۲ھ

(۱۰)موضوعات صغریٰ،موضوعات کبریٰ　　از:ملا علی قاری ۱۰۱۴ھ

(از فن اسماء الرجال وغیرہ)

تعارفِ علم توحید و عقائد

قاری مختار احمد چارنیری
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

جب کوئی علم اپنے متعلقات و مقامات اور مقاصد کے اعتبار سے دیگر علوم کے مقابلے بڑے ہی فضل و کمال اور گونا گوں خوبیوں کا حامل ہو تو یقیناً ایسا علم قدر و منزلت اور عظمت و رفعت میں تمام علوم سے اعلیٰ اور اپنے ماننے والوں کے نزدیک شرف و فخر میں سب سے بالا ہوتا ہے۔

مذکورہ تمہیدی کلمات سے ہماری مراد ایک ایسا ہی پر عظمت و پر رونق علم الٰہی ہے، جس کا موضوع بحث کائنات اور کائنات کی اشیا نہیں، بل کہ خود کائنات کے خالق اور عرش و فرش کے مالک کی ذاتِ اقدس ہے جو اول بھی ہے آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، لہٰذا انہی ابدی اور دائمی صفات سے متصف علم ''علم توحید'' کہلاتا ہے، اہلِ فن کے نزدیک اس علم کے اور بھی متعدد نام ہیں، جن میں سے چند ایک مع وجوہِ تسمیہ کچھ اس طرح ہیں:

(۱)　علمِ توحید اصل میں اللہ عزوجل کی وحدانیت کے اثبات کی ان بحثوں کو اُجاگر کرتا ہے، جو ایمان اور اساسِ ایمان کا منبع و سرچشمہ ہے، اس لیے بعض حضرات اس کو علمِ توحید سے یاد کرتے ہیں۔

(۲)　علمِ توحید کا تعلق چوں کہ ایمان و اسلام کی اصل اور ان کے بنیادی عقیدے سے ہے، اس لیے بعض اہلِ علم حضرات، اس کو ''علمِ اصولِ دین'' کا خوبصورت اور جامع لبادہ پہناتے ہیں۔

(۳)　علمِ توحید کو، علم عقیدہ بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہ علم ان امور پر مشتمل ہے، جن کا ہر مسلمان اعتقاد رکھتا اور ان پر ایمان بھی لاتا ہے۔

(۴)　علمِ توحید کے تحت بحث و تفصیل اور بے شمار عقلی و نقلی استدلالات کے پائے جانے کی بناء پر بعض حضرات اس کو علم کلام سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں علم کلام کی تعریف کچھ یوں فرماتے ہیں، کہ علم کلام وہ علم ہے جو عقائد ایمانیہ پر دلائل عقلیہ سے مدلّل ہو اور اعتقادات کے اندر سلف صالحین اور اہلِ سنت والجماعت کے مذہب سے انحراف کرنے والے مبتدعین کا بھرپور رد کرتا ہو۔

اگر ہم علمِ توحید کے آغاز اور امتِ اسلامیہ میں اس کی تعمیر اور نشو ونما [illegible] اچھا ہے تو سب سے پہلے ہمارے لیے اس مذہبِ مقبول اور دینِ حنیف کے وقتِ آغاز کا قدرے جائزہ لینا ضروری ہوگا۔ چناں چہ نبی اُمی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم، اہلِ عرب وعجم ہر دو سے یہ ارشاد فرماتے تھے، کہ عقیدے اور ایمان کا سہارا مکمل سادگی وسہولت اور اطاعت ومحبت کے ساتھ اپنے دلوں کے لیے براہِ راست غلاف وڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت فرماتے، جن میں اصلِ ایمان، فروعاتِ ایمان اور متعلقاتِ ایمان کا تذکرہ ہوتا، اور صحابہ کرام ان پاکیزہ ارشادات کو اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے ذریعہ بطیبِ خاطر قبول فرماتے اور اپنے بلند و معیاری ذوقِ ادب اور اپنی صاف وشفاف فطرتِ سلیمہ کے مطابق ان کے کماحقہٗ معانی ومفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور بطورِ احتیاط ان کی تفصیل وکیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے، کیوں کہ انہیں اسی کا حکم دیا گیا تھا اور وہ خود بھی اسی کے داعی ومدعی تھے، جیسا کہ آیتِ قرآنیہ کا آخری حصہ ان ہی اہلِ دل اور اسلامی سپوتوں کے صاف وشفاف عقیدے اور ایمان کی مقبولیت کا مژدہ سنا رہا ہے، قولِ خداوندی ہے: ”ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن امّ الکتاب و اُخر متشٰبھٰت فامّا الّذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ و ابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون اٰمنّا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب“ آیت ہذا کے ذریعہ معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ کس طرح قیل وقال اور چوں وچرا سے قطعِ نظر، خلوصِ نیت اور صدقِ دلی کے ساتھ، اطاعت وعمل کی طرف متوجہ ہوجاتے، سلف صالحین کے دورِ آغاز میں یہی مطلوبہ نہج، برابر اپنی آب وتاب کے ساتھ قائم ودائم رہا، اور اسی پر عمل درآمد بھی ہوتا رہا، جس کی ایک جھلک امام مالک امام دارالہجرۃ کے مسئلہ میں ہم کو ملتی ہے۔

چناں چہ زمانہ شاہد ہے کہ جس وقت آپ سے قولِ خداوندی ”الرحمن علی العرش استوی“ میں استواء سے متعلق سوال کیا گیا تو جواب دیا کہ استواء یعنی ذاتِ خداوندی کا عرش پر مستوی ہوجانا تو یہ مجہول نہیں ہے، ہاں! البتہ اس کی کیفیت اور طریقۂ استواء تو یہ معلوم نہیں ہے اور رہا اس چیز کے بارے میں سوال کرنا تو یہ بدعت سے خالی نہیں ہے۔ یہ تو تھا سابقین اولین کا محتاط رویہ، لیکن آج نام نہاد ترقیاں (جن میں امتِ اسلامیہ داخل ہوچکی ہے) جیسے شہروں اور ملکوں پر غلبہ، ایمان میں کثرتِ بینونت، افتراق ونفاق کا ظہور، یونانی فکروسوچ کا شہرہ، امتوں اور جماعتوں کا انتشار، طبیعت وخصلت اور حکماء کا اختلاف اور اسلام میں داخل ہونے والوں کے لیے قدیم اور موروثی اسلامی شعائر کا جدید اور تعجب خیز لگنا، یہ اور ایسی ہی سب بے شمار بخششیں جن کا محور صرف دنیا کی خود ساختہ رنگینیاں ہیں اس سے پہلے کبھی بھی اسلام سے وابستہ نہیں رہیں۔

اختلافِ اوّل کی جڑ عقل پرستی اور خلافت وحکومت

انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا ہمارے لیے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لیے مبعوث فرمایا ہے کہ آخرت کی بدبختی سے نجات حاصل کرنے کے راستے اور طریقے ہم کو بتائیں کیوں کہ آخرت کی زندگی میں بدبختی سے بھی سابقہ پڑے گا اور خوش بختی سے بھی۔ اور ہم دونوں سے ناواقف ہیں، پھر یہ عقیدہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے قبر، حشر و نشر، جنت و دوزخ، تمام چیزوں کو وجود بخشا ہے، غرض یہ سارے بنیادی عقائد ہیں، جن پر عقلی دلائل لاکر ان کا ثبوت دیا گیا ہے، اور کتاب و سنت ان کے دلائل سے پُر ہیں۔

چناں چہ سلف صالحین، علمائے متقدمین اور حضراتِ محققین نے بقول علامہ ابن خلدون ان ہی ادلہ کو پیش نظر رکھا، مگر رفتہ رفتہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان عقائد کی تفاصیل میں اختلاف واقع ہو گیا جس کا باعث زیادہ تر آیات متشابہات ہوئیں، اسی پر بس نہیں، بل کہ یہ اختلاف علما کو بحث و مباحثہ اور مناظرہ کی طرف کھینچ لایا اور یوں "اختلاف، اختلاف" کی صدائیں سنائی دینے لگی۔

ثانیاً: خلافت و حکومت بھی اختلاف کا موضوع بحث، بنی لہٰذا ایک جماعت نے اپنی صوابدید کے مطابق امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہ کی حمایت و ہمنوائی کا فیصلہ کیا اور اس سلسلہ میں غلو برتنے لگی تو دوسری جماعت اپنے اپنے مطالبات کے مدنظر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ڈٹ گئی پھر کچھ منفی سوچ کے نتیجے میں ان کے مقابلے کے لیے ایک اور گروپ یعنی فرقہ خارجیہ کا وجود ہو گیا اور اس طرح ہوتے ہوتے مرجیہ، جبریہ اور قدریہ وغیرہ کا بھی ظہور ہوتا گیا جو بزعم خود اپنے تمام اعمال و افعال کو مقتضیات و مقدرات الٰہی کا سچا مصداق سمجھتے تھے۔ فرقہ قدریہ کے نظریہ کے تئیں عطاء بن یسار اور معبد الجہنی، حسن بصری کی فکر اور سوچ کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ اور امراء لوگ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں، پھر بڑی بے دردی کے ساتھ ان کے مال و دولت کو بٹورتے ہیں اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے، تو ہم اپنا ہر کام اللہ کی قضا و قدر کے مطابق ہی کرتے ہیں، لیکن قارئین کرام باوجود اس سبب کچھ کے ایسے حالات میں یہ بات باعث مسرت ہے کہ یکتائے روزگار اور مشہور زمانہ حضرات تابعین عظام ان باطل عقیدہ بہروپیوں کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس حساس اور نازک موضوع پر دلائل عقلیہ و نقلیہ سے مدلل کئی ایک ایسے جامع اور رمانع رسائل کا تریاق، خواص و عوام کی نذر کر دیا کہ جو انہیں ان دوست نما دشمن کے زہر ہلاہل سے بچا سکے، ان ہی خدا رسیدہ بزرگوں میں سے چند نام بقول ڈاکٹر وھبہ ذحیلی یہ ہیں۔
ابو الاسود دؤلی متوفی ۶۹ھ۔ یحییٰ بن معمر متوفی ۸۹ھ۔ عبد اللہ بن اسحاق الحضرمی متوفی ۱۱۷ھ۔

ایمانی معاملات میں نونک جھونک:

سابقہ اجمالی اختلاف کی وضاحت ایں کہ کتاب اللہ میں بہت سی آیات ظاہر الدلالت والمعنیٰ ایسی وارد ہیں جو ذات باری سے ہر عیب و نقص کا دفاع کرتی ہیں جن پر ہمارا ایمان لانا واجب ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین سے ان آیات کی وہی تفسیر منقول ہے جو بظاہر ہو سکتی ہے، پھر چند آیات ایسی بھی ہیں جن سے تشبہ فی الذات اور تشبہ فی الصفات مفہوم ہوتا ہے جن کے متعلق ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم انہیں کلام اللہ جانیں اور معنی کی کرید میں نہ لگیں اور نہ ہی تاویلات کی الجھن میں پھنسیں کیوں کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری آزمائش کے لیے ایسی آیات نازل فرمائی ہوں، یہی ہم اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ لیکن اسی دور میں باری تعالیٰ کی یہ صفات وحیدہ بحث و مباحثہ اور اختلاف کا محل بن گئی اور ایک مبتدع فرقہ ان آیات متشابہات کی چھان بین کرتے کرتے تشبہ کی طرف

جھک گیا: بعض اس قدر آگے بڑھ گئے کہ تشبہ فی الذات کے قائل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ، چہرہ، پیداور قدم ماننے لگے اوران بے شمار آیات سے نظر پھیر لی، جو شب و روز ذات قدوس کو ان تمام چیزوں سے مطلقاً منزہ ومبرہ قرار دے رہی تھی، پھر جب ان کو تجسیم پر منہ توڑ جواب دیا گیا تو کہنے لگے "جسم لا کالا جسام" کہ وہ دیگر اجسام سے انوکھا جسم ہے، گویا انہوں نے اپنے ہی اقوال میں تناقض، تضاد اور نفی واثبات کو جمع کر دیا۔ دوسرا فریق تشبہ فی الصفات کو لے کر اٹھا اور ذات باری تعالیٰ کے لیے جہت، استواء، نزول، صوت اور حرف کا قائل ہو گیا یہ فرقہ بھی تاویلات باردہ کا سہارا لیتے ہوئے کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کی آواز ہے مگر اور آوازوں کی طرح نہیں، اور اسی طرح یہ سب صفات ہیں مگر متعارف یعنی ہماری صفات کی طرح نہیں ہیں۔

یہ ہے وہ (رنج والم بھری) داستان اختلاف جس نے ایک متحد و منفرد اسلامی سوسائٹی میں سر ابھارا، جس کے طفیل ملتِ اسلامیہ میں معصیتیں اور بدگمانیاں ظاہر ہوئیں اور پھر عام ہوتی چلی گئیں، عوام الناس صغائر و کبائر کے متعلق سوال کرتے اور ہر فرقہ انہیں اپنے نظریات کے تئیں جواب دیتا، چناں چہ مرجئہ نے کہا (لا یضر مع الایمان معصیة) اگر ایمان صحیح و سالم ہو تو معصیت مضر نہیں ہے، معتزلہ کہنے لگا (المنزلة بین المنزلتین لا الی هؤلاء و لا الی هؤلاء) کہ ایسا شخص نہ ہی مؤمن ہے نہ ہی کافر، بل کہ وہ ایک ایسی منزل کا مسافر ہے جو ایمان اور کفر کے درمیان ہے۔ اسی طرح دورِ عباسی میں جب خلیفہ مامون نے فلسفۂ یونان کو عربی جامہ پہنایا تو چند مسلمان فلاسفیوں نے بھی حکمائے یونان کے ساتھ ہم خیالی اور ہم رنگی ظاہر کی جس سے اسلام کے اردگرد ثقافتی جنگ اور فکری ٹکراؤ کا ایک نیا باب کھل گیا، تاہم بعض اسلامی فلاسفہ نے بہت سے مقامات پر فلاسفۂ یونان سے اختلاف کیا اور ان کے اقوال و خیالات کو باطل ٹھہرایا۔

معتزلہ اور ایمان کا دفاع:

گزرتے وقت کے ساتھ جب علوم و صناعات کی کثرت ہوئی، لوگوں کو تحقیق و تالیف کا شوق ہوا اور متکلمین نے تنزیہ باری تعالیٰ کے موضوع پر قلم سنبھالا تو ساتھ ساتھ معتزلہ کا فرقہ پیدا ہو گیا جس نے اس لوائے فکری اور بزعم خود افراط و تفریط کے چیلنج کو قبول کیا اور تنزیہ باری تعالیٰ کے خیال کو اس قدر عموم بخشا کہ جسمانیت کے ساتھ ساتھ بہت سی صفات باری تعالیٰ کا بھی انکار کر بیٹھے مثلاً سمع و بصر، علم و قدرت اور ارادہ و حیات، کیوں کہ بقول ان کے یہ صفات جسم کو مستلزم ہیں، ساتھ ہی معتزلین نے تنزیہ باری تعالیٰ وغیرہ کے عقلی و نقلی دفاع میں اپنی بے لگام زبانوں کو گویا اہل سنت و الجماعت پر مسلط کر دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے امام اہل سنت والجماعت ابوالحسن اشعری بصری کو کھڑا کیا، جنہوں نے تادمِ حیات مذہب اہل سنت والجماعت کو مضبوطی سے تھامے رکھا، جس طرح ابو منصور ماتریدی نے اپنے دور میں یہ باگ ڈور سنبھالا اور اس اہم مگر نزاکت بھرے موضوع پر کئی کتابیں تالیف فرمائیں، پھر ان دونوں حضرات کے بعد امام باقلانی محمد بن طیبؒ نے ابوالحسن اشعری کے طرز پر چند اہم کتب تصنیف فرمائیں مثلاً: (التمهيد في الرد على الملاحدة و المعطلة و الرافضة و الخوارج و المعتزلة) الانتصاف، البيان، الابانة عن ابطال

مذہب اہل الکفر والدیانۃ۔

آخر میں قبل اس کے کہ ہم علم توحید یا علم عقیدہ یا علم اصول دین کے مراجع کو جان لیں۔ یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ علم شریف (علم توحید) جس کا موضوع من کل الوجوہ ذات وصفات الٰہی ہے اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ تمام مغیبات ومرئیات پر ایمان رکھیں مثلاً بلاتفریق تمام انبیاء ورسل، ملائکہ تمام کتب وصحفِ سابقہ، قضاوقدر، خیر وشر، بعث بعدالموت، حساب ومیزان، جنت وجہنم، دیدار الٰہی، اور علاوہ ازیں ان تمام چیزوں پر جن کا تعلق عقیدہ اور لوازماتِ عقیدہ سے ہے۔

چند اہم مراجع: اہل سنت والجماعت کے حضرات سلف وخلف کی چند اہم تصانیف جو عقائد اسلامیہ کے لیے مراجع کی حیثیت رکھتی ہے:

(۱) مقالات الاسلامیین
(۲) الابانۃ عن اصول الدیانۃ (امام اشعری رحمہ اللہ)
(۳) کتاب التوحید (ابو منصور ماتریدی)
(۴) المنقذ من الضلال
(۵) تہافت الفلاسفۃ (امام غزالی رحمہ اللہ)
(۶) الشامل فی اصول الدین (امام جوینی رحمہ اللہ)
(۷) العقائد النسفیۃ
(۸) رسالۃ العقائد (امام قشیری رحمہ اللہ)
(۹) قصۃ الایمان (شیخ ندیم الجسر)
(۱۰) العقیدۃ الاسلامیۃ (شیخ عبدالرحمن حنبکہ)
(۱۱) الانصاف (امام الباقلانی)
(۱۲) تثبیت دلائل النبوۃ (امام الھمداتی)
(۱۳) اصول الدین (ابو منصور التمیمی)
(۱۴) کبری الیقینیات الکونیۃ (رمضان البوطی)
(۱۵) احیاء علوم الدین (امام الغزالی)
(۱۶) المذاہب الاسلامیۃ (ابو زھرۃ المصری)
(۱۷) الملل و النحل (للامام الشہرستانی)
(۱۸) النبوۃ و الانبیاء (ابو الحسن الندوی)
(۱۹) شرح الطحاویۃ فی عقیدۃ السلفیۃ (علی ابن علی الحنفی)
(۲۰) الفرق بین الفرق (ابو منصور عبدالقاہر البغدادی)

اردو مصادر و مراجع:

علم الکلام (علامہ ادریس کاندھلوی) — اسلام کے بنیادی عقائد (علامہ شبیر احمد عثمانی)
بہشتی ثمر (حضرت تھانوی) — تحفہ اثناء عشریہ (شاہ عبدالعزیز)
اسلامی عقیدے (شاہ عبدالحق) — تاریخ مذاہب اسلام (ابو زہرہ مصری)
کتاب الروح (ابن القیم) — اسلام کیا ہے؟ (مولانا منظور نعمانی)
ملتِ اسلامیہ اور افکار و اعتقاد کا المیہ (ابو عدنان سہیل)

زیر نظر مضمون کی تکمیل کے بعد، بارگاہ ایزدی میں عرض پرداز ہوں، کہ باری تعالیٰ آج جب کہ ہر طرف دنیوی رنگ رلیوں کی خاطر عقائد و ایمانیات کا تاج محل ڈگمگا رہا ہے، اپنے ہی فضل وکرم سے تادم حیات ہم سب کے

عقائدوایمان کی حفاظت وبقاء کے اسباب مہیا فرمائے، اور ہر وہ کام جس سے مخلصین منتظمین جامعہ کا مقصد خدمت دین متین کے ساتھ ساتھ خادمینِ دین مبین (طالبینِ علوم نبوت) کو متحرک وفعال بنانا ہے، شرف قبولیت سے سرفراز فرمائے۔آمین آمین یارب العالمین!

مقاصدِ شریعت/موجودہ ضرورت

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی
دارالإفتاء
جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کواں نندبار، مہاراشٹر

لغۃً: قصد ومقصد "فعل قصد" سے مشتق ہیں، اور مقصد استقامتِ طریق، عدل وانصاف اور توسط کو کہا جاتا ہے، مقصد اسمِ مکان ہے، جمع اس کی مقاصد آتی ہے۔

اصطلاحاً: اصولیوں کے نزدیک مقاصدِ شرع سے مراد وہ معانی اور حکمتیں ہیں، جن کو شارع (اللہ رب العزت) اپنے احکام کے ذریعے ثابت کرنا چاہتا ہے۔

ہمارا اور آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں کوئی شی بلا مقصد اور فضول و بے کار نہیں ہے، کیوں کہ کائنات اور اس کی ہر چیز کا خالق ومالک اللہ تعالی ہے قرآن پاک میں وارد ہے:{ذلکم اللہ ربکم لا إلٰہ إلا ھو خالق کل شيء}۔یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، کوئی خدا نہیں بجز اس کے، ہر شی کا پیدا کرنے والا۔(الأنعام:۱۰۲) اس کا کوئی خلق وامر بلا مقصد اور حکمت ومصلحت سے عاری وخالی نہیں ہے، تو وہ عظیم شریعت جس کو خاتم الشرائع کہا گیا، جس کو قیامت تک تمام آنے والی انسانیت کے لیے مشعلِ راہ اور دستورِ زندگی قرار دیا گیا، جس کے مطابق زندگی گزارنے پر دنیوی زندگی میں چین وسکون اور آخرت میں فلاح وبہبود کی ضمانت (Guarantee) دی گئی، اور جس کے اکمال کو اتمامِ نعمت سے تعبیر کیا گیا ہو، بھلا وہ بلا مقصد کیسے ہوسکتی ہے، اس کے بھی کچھ مقاصد ومصالح ہیں، جنہیں شارع ثابت کرنا چاہتا ہے۔

اسلامی شریعت کے احکام درحقیقت انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں، انسانیت کی دنیوی کامیابی اور اخروی سعادت ونجات کے لیے مشروع (Legal) کیے گئے ہیں، احکامِ اسلام زندگی کے ہر شعبہ اور تمام مراحل پہ اس بات کی ضمانت (Guarantee) فراہم کرتے ہیں کہ اس دھرتی پر بسنے والی تمام انسانیت کے مابین عدل وانصاف، امن وآشتی، صداقت وراستی، اور خیر وبھلائی عام ہو، اور ہر قسم کا ظلم وزبردستی، تشدد وحق تلفی، بے انصافی اور نابرابری کا خاتمہ ہو، تاکہ ہر فردِ بشر اپنے خالق ومالک کا مطیع وفرمانبردار بن کر زندگی گزارے، اور دوسروں کے

لیے نفع رساں بن کر آخرت کی ہمیشہ ہمیش کی کامیابیوں اور مسرتوں سے ہمکنار ہو، یہی حقیقی کامیابی اور انسان کی اصل قیمت ہے، کہ وہ دوسروں کے لیے کس قدر نفع رساں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''خیر الناس من ینفع الناس فکن نافعاً لھم''۔ لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہونچائے، پس تم لوگوں کے حق میں نافع بنو۔ (کنز العمال: ۱۶/۵۴، رقم الحدیث: ۴۴۱۴۷)

احکامِ اسلام پوری انسانی زندگی پر محیط ہیں، اور اس کے ہر ہر حکم میں انسانی فلاح ومصلحت کی روح کارفرما ہے، اور ان ہی مصالح ومقاصد کے اردگرد تمام احکام گھومتے ہیں، اور نئے مسائل کا استنباط بھی اسی روح ومزاجِ شریعت کے مطابق کیا جاتا ہے۔

آیئے ہم ان مصالح ومقاصد پر اجمالاً روشنی ڈالتے ہیں، تاکہ اسلامی احکام کے محاسن اور خوبیاں اپنوں اور غیروں کے سامنے واضح ہو جائیں، اور نت نئے مسائل کے حل میں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

علامہ ابو اسحق شاطبیؒ نے ''الموافقات'' میں مقاصد ومصالحِ شرعیہ کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

۱-مقاصدِ ضروریہ　۲-مقاصدِ حاجیہ　۳-مقاصدِ تحسینیہ

۱- **مقاصدِ ضروریہ:** -ان مقصدوں کو کہا جاتا ہے، جو انسانوں کی دینی ودنیوی مصلحتوں کے قیام وبقاء کے لیے ضروری ہیں، اگر یہ مقاصد فوت ہو جائیں تو دنیوی نظام اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، اور دنیا میں فساد واضطراب (Commotion\Distraction) اور اتلافِ جان ومال عام ہو جاتا ہے، اور تباہیٔ دنیا کے ساتھ ساتھ بربادیٔ آخرت بھی لازم آتی ہے، جیسا کہ آج کل کے حالات اس پر شاہدِ عدل ہیں۔

غور کیا جائے تو دینِ اسلام کے جتنے احکام ہیں، درحقیقت ان میں بنیادی طور پر پانچ مقاصد ومصالح کارفرما ہیں: حفاظتِ دین، حفاظتِ نفس، حفاظتِ نسل، حفاظتِ عقل، اور حفاظتِ مال۔ ''مجموع الضروریات خمسة: وهي حفظ الدين والنفس والنسل والمال والعقل، وقد قالوا انها مراعاة في كل ملة''۔ (الموافقات للشاطبي)

۱/ حفاظتِ دین:

دین، علماء شریعت کے نزدیک وہ طریق ونظام، اور اس عقیدہ وعمل کے مجموعے کا نام ہے، جسے اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی دنیوی صلاح اور اخروی فلاح کے لیے وضع فرمایا ہے، اور سلیم الفطرت لوگ اپنی مرضی واختیار سے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ الدين هو وضع إلهي سائق لذوي العقول باختيارهم المحمود إلى الخير بالذات، وهو يشتمل العقائد والأعمال۔ (نور الأنوار ص ۶)

دین انسان کی ضرورت ہے، اس کے ذریعے وہ دنیوی مصائب اور مشکلات کا کامیابی کے ساتھ دفاع کرتا ہے، ورنہ وہ طرح طرح کی نفسیاتی امراض (Psychics Diseases)، شکست خوردگی اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے، دینِ صحیح انسانی نفسیات میں ہونے والی شکست وریخت (Damage) سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اور اسے روحانی بلندیوں سے ہمکنار کرتا ہے، اور اس کے خالق و مالک سے اس کے رشتے کو استوار کرتا ہے، اسی لئے اس کو مقاصدِ شریعت میں اولین ترجیح حاصل ہے۔

آج دینداری نہ ہونے کی وجہ سے پوری انسانیت مصائب ومشکلات سے دوچار اور کرب واضطراب میں مبتلا ہے، خواہ اپنے کرب واضطراب کو دور کرنے کی خاطر ہی سہی، دین کی ضرورت ان لوگوں کو بھی محسوس ہونے لگی ہے، جو آج تک دین کو دہشت گردی کا نام دے رہے تھے، اور آج وہ اس طرح کا بیان دینے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے تصوف کا سہارا لینے اور اس کو عام کرنے کی ضرورت ہے

ع

جب دیا دکھ بتوں نے تو خدا یاد آیا

۲/ حفاظتِ جان:

دین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت جان کو حاصل ہے، تحفظِ جان ہی کے لیے اللہ رب العزت نے پوری کائنات کو بنایا اور ملائکہ کی لامتناہی تعداد کو انسان کی حفاظت پر مامور کردیا۔{هو الذي خلق لكم ما في الأرض جميعاً} وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمیں میں ہے سب کا سب۔(البقرۃ:۲۹)

{له معقبات من بين يديه ومن خلفه يحفظونه من أمر الله} ہر ایک کے لیے باری باری آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی وہ اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔(الرعد:۱۱)

عن أبي أمامة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: وكل بالمؤمن تسعون ومائة ملك يذبون عنه ما لم يقدر عليه، من ذلك البصر تسعة أملاك يذبون عنه كما يذب عن قصعة العسل من الذباب في اليوم الصائف، وما لو بدا لكم لرأيتموه على جبل وسهل، كلهم باسط يديه فاغر فاه وما لو وكل العبد فيه إلى نفسه طرفة عين خطفته الشياطين۔

(المعجم الكبير للطبراني: ۱۶۸، ۱۶۷/۸، رقم الحديث: ۷۷۰۴۔روح المعاني: ۸/ ۱۶۲)

کائنات کی تمام چیزوں کو انسانوں کے لیے مسخر (Subdued\Conquered) کردیا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:{الله الذي خلق السماوات والأرض وأنزل من السماء ماء فأخرج به من الثمرات رزقاً لكم،

وسخر لكم الفلك لتجري في البحر بأمره، وسخر لكم الأنهار، وسخر لكم الشمس والقمر دائبين، وسخر لكم الليل والنهار}۔ اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور اور زمین کو پیدا کیا، اور آسمانوں سے پانی اتارا، پھر اس (پانی) سے (مختلف) پھل تمہارے لیے بطور رزق پیدا کئے، اور تمہارے (نفع کے) لیے کشتی کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلے، اور تمہارے (نفع کے) لیے دریاؤں کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا، اور تمہارے (نفع کے) لئے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا جو دوام رکھنے والے ہیں، اور تمارے (نفع کے) لئے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر کردیا۔ (ابراهيم:۳۳)

غرضیکہ افلاک کا پورا نظام اور عالمِ ارض کی تمام چیزوں کو انسانی حفاظت پر لگادیا۔

جو چیزیں اس کے لیے مفید (Useful\Profitable) تھیں ان کو حلال، اور جو چیزیں مضر (Hurtful) تھیں ان کو حرام قرار دیا، حلال کو استعمال کرنے اور حرام کے تناول سے دور رہنے کا حکم دیا۔

ارشادِ خداوندی ہے: {يأيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحاً} اے پیغمبرو! نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔　　　　(المؤمنون: ۵۱)

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''يا أيها الناس! إن الله طيب لا يقبل إلا طيب، وإن الله تعالى أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين، فقال: {يا أيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحاً إني بما تعملون عليم}۔ وقال: {يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم}''۔

''ثم ذكر الرجل يطيل السفر، أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء: ''يا رب يا رب''۔ ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذي بالحرام، فأنى يستجاب له''۔

(الآداب للبيهقي: ص ۱۶۰، رقم الحديث: ۴۲۰، باب في تطيب المطعم والملبس واجتناب الحرام واتقاء الشبهات)

قال القرطبي: سوى الله تعالى بين النبيين والمؤمنين في الخطاب بوجوب أكل الحلال وتجنب الحرام۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حلال اشیاء کے تناول اور حرام اشیاء سے احتراز کے واجب ہونے کے سلسلے میں انبیاء اور مؤمنین کو خطاب میں برابر قرار دیا ہے۔ (قرطبي: ۱۲/۱۲۸)

تحفظِ جان ہی کے لیے قتلِ ناحق کو حرام قرار دیا گیا، اور قاتل کے لیے قصاص (Punishment\Retribution) کی سزا تجویز کی گئی فرمانِ باری تعالیٰ ہے: {ولا تقتلوا النفس التي حرم الله إلا بالحق}۔ اور جس شخص (کی جان) کو اللہ نے محفوظ قرار دیا ہے اسے قتل مت کرو، ہاں مگر حق پر۔ (بني اسرائيل: ۳۳)

{وما كان لمؤمن أن يقتل مؤمنا إلا خطأ}۔اور یہ کسی مؤمن کے شایان نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کر دے بجز اس کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔(النساء:۹۲)

{ومن يقتل مؤمناً متعمداً فجزاءه جهنم خالداً فيها}اور جو کوئی کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔(النساء:۹۳)

{من قتل نفساً بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعاً ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً}۔جو کوئی کسی کو کسی جان کے (عوض کے) یا زمین پر فساد (کے عوض) کے بغیر مار ڈالے تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو مار ڈالا، اور جس نے ایک کو بچالیا، تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو بچالیا۔(المائدة:۳۲)

بلکہ ہر عضو کے بدلے اسی عضو سے قصاص لینے کا حکم رکھا گیا۔{وكتبنا عليهم فيها أن النفس بالنفس والعين بالعين والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص}۔اور ہم نے ان پر اس میں یہ فرض کر دیا تھا کہ وہ جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا ناک اور کان کا کان اور دانت کا دانت اور زخموں میں قصاص ہے۔(المائدة:۴۵)

تحفظِ جان کے لیے احکام شرعیہ میں متعدد رخصتیں دی گئیں، مثلاً:

۱/ جب تناول کے لیے کوئی حلال چیز نہ ہو، اور ہلاکت کا یا قرب ہلاکت کا غالب گمان ہو تو اس قدر حرام چیز کے استعمال کی اجازت دی گئی جس سے جان بچ جائے۔

{فمن اضطر في مخمصة غير متجانف لإثم، فإن الله غفور رحيم}۔ہاں جو کوئی بھوک کی شدت سے بیقرار ہو جائے، گناہ کی طرف رغبت کے بغیر، سو اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے۔(المائدة:۳)

الضرورة بلوغه حداً إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب وهذا يبيح تناول الحرام"۔

(الموسوعة الفقهية: ۲۸/۱۹۱)

۲/ اگر کوئی شخص بیمار ہو اور علاج میں کوئی حلال چیز کارگر نہ ہو، اور حرام چیز کے تناول سے شفاء کا غالب گمان ہو، تو بقدرِ ضرورت اسے اس کے تناول کی رخصت دی گئی۔علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ففي النهاية عن الذخيرة: يجوز إن علم فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر۔ اهـ. وكذا اختاره صاحب الهداية في التجنيس فقال: لو عرف فكتب الفاتحة بالدم على جبهته وأنفه جاز للاستشفاء وبالبول أيضاً إن علم فيه شفاء لا بأس به، لكن لم ينقل وهذا لأن الحرمة ساقطة عند الاستشفاء كحل الخمر والميتة للعطشان والجائع۔ اهـ من البحر۔ (شامي:۱/۳۶۵، كتاب الطهارة، باب المياه، مطلب في

التداوي بالمحرم)

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جانیں کس قدر اہمیت کی حامل ہیں، اور محض کسی کی جانب سے لاحق خطرات جب تک کہ وہ حقیقۃً واقع نہ ہوں کی بناء پر، اس کو موت کی نیند سلا دینا کبھی بھی جائز نہیں ہوسکتا، ورنہ ہر آدمی یہی کہے گا کہ فلاں کی جانب سے میری جان یا میرے ملک کو خطرہ لاحق ہے، اس لیے اس کو موت کے گھاٹ اتار دینا میرے لیے جائز ہے۔

یاد رکھیں! اگر اس طرح کے جواز کو ثابت کیا جائے گا، تو وہ یک طرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ ہوگا، اور یہ دنیا قتل وغارت گری کا میدان بن جائیگی، جیسا کہ ہم اس کا مشاہدہ کررہے ہیں۔

۳-حفاظتِ عقل:

عقل انسان کا وصفِ امتیازی ہے، اس وصف کی وجہ سے اسے تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے، اور اسی وصف کی وجہ سے وہ شریعت کا مخاطب بھی ہے۔ والقول الصحیح في باب العقل أن العقل معتبر لاثبات الأھلیة۔ (أي أھلیة الوجوب)۔ (الحسامي: ص ۱۳۷)

حفاظتِ عقل کے لیے شریعت نے تعلیم کو ضروری قرار دیا، کیوں کہ تعلیم سے عقلِ انسانی صیقل ہوتی ہے، اور عقل اوہام وخرافات سے بچ جاتی ہے۔ خدائے پاک کا فرمان ہے: {اقرأ باسم ربک الذي خلق}۔ آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام سے جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے۔ (العلق: ۱)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم"۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔ (شعب الایمان للبیھقي: ۲/۲۵۴، رقم الحدیث: ۱۶۶۱)

اور شریعت نے ایسی تمام چیزوں کے استعمال سے منع فرمایا، جو عقل کو نقصان پہونچاتی ہیں، مثلاً شراب پینا اور نشہ آور چیز کا استعمال کرنا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: {یآیھا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ}۔ اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس نری گندی باتیں ہیں شیطان کے کام، سو اس سے بچتے رہو۔ (المائدة: ۹۰)

ارشادِ نبوی ہے: "کل مسکر حرام"۔ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ (صحیح مسلم: ۷/۸۹، رقم الحدیث: ۵۱۷۶)

أسماء الأشربة المحرمة في الجملة___أما الأسماء فثمانیة: الخمر والسکر ونقیع الزبیب ونبیذ التمر والفضیخ والباذق والطلاء ویسمی المثلث والجمھوري ویسمی أبو یوسفي۔

(تحفة الفقھاء: ۳/۳۲۵، کتاب الأشربة)

آج اگر شراب، نشہ آور چیزوں، اور منشیات کے استعمال پر پابندی لگادی جائے، اور لوگ ان چیزوں کے استعمال سے اپنے آپ کو باز رکھیں، تو یقینا شفا خانوں (Hospitals) پناہ گزین کیمپوں (Refugee campus) اور قید خانوں (Prisons\Jails) کی وہ تعداد باقی نہ رہے گی جو موجود ہے۔

۴- حفاظتِ نسل:

اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا فرمایا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: {خلق الإنسان من علق}۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ (العلق: ۲)

اور اس کا مقصد و منشا یہ ہے کہ بنی نوع انسان تا قیامت اس کی نائب بن کر اصلاح فی الارض اور اقامتِ شرائع کا فرض انجام دیتی رہے، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: {وإذ قال ربک للملائکة إني جاعل في الأرض خليفة}۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب تیرے پرودگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں۔ (البقرۃ: ۳۰)

اور یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہوسکتا ہے جبکہ نکاح اور شادی کے ذریعے نسلِ انسانی کی افزائش ہوتی رہے، نسلِ انسانی کی افزائش کے لیے نکاح وشادی کا تعین اس لیے کیا گیا، کہ محض افزائشِ نسل مطلوب نہیں، بلکہ ایسی نسل مطلوب ہے، جو خدائی مقصد و منشا کو پورا کرے (اصلاح فی الارض اور اقامتِ شرائع)۔

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ یہ افزائش صحیح طریقے پر ہو، ورنہ فاسد طریقے سے ہونے والی افزائش خود فاسد ہوتی ہے، تو اس سے اصلاح فی الارض کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے، فقہ کا قاعدہ ہے: ''المبني علی الفاسد فاسد''۔ ''ما بني علی فاسد أو باطل فهو فاسد و باطل۔ (موسوعة القواعد الفقهية: ۹/۴۳۹)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {إنک إن تذرهم يضلوا عبادک ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا}۔ اگر تو انہیں رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ ہی کرتے رہیں گے اور ان کے محض کافر و فاجر ہی اولاد پیدا ہوتی رہے گی۔ (نوح: ۲۷)

جس معاشرہ نے افزائشِ نسل کے اس طریقِ صحیح سے انحراف و اعراض کیا، آج وہ اپنی اس سنگین غلطی کا خمیازہ بھگت رہا ہے، پورا معاشرہ اس غلطی کی تباہ کاریوں سے لرز رہا ہے۔

اسلامی شریعت نے حفاظتِ نسل کے لیے نکاح پر زور دیا، اس کو سنت قرار دیا۔ عن عبيد بن سعد عن النبي صلی اللہ علیه وسلم قال: من أحب فطرتي فليستن بسنتي، ومن سنتي النكاح۔ (سنن الکبری للبیهقي ۷/۱۲۴، رقم الحديث ۱۳۴۵۱)

عن عائشة قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: النکاح من سنتي، فمن لم یعمل بسنتي فلیس مني۔ (ابن ماجہ: ص ۱۳۳، أبواب النکاح)

رہبانیت کو منع فرمایا ۔عن سعد بن أبي وقاص أن اللہ أبدلنا بالرہبانیة الحنیفیة السمحة۔
(کشف الخفاء للعجلوني: ۲/۳۴۵، حرف اللام ألف)

بے نکاح مرد وعورت کے نکاح کا حکم دیا ۔{وأنکحوا الأیامی منکم والصالحین من عبادکم وإمائکم إن یکونوا فقراء یغنهم اللہ من فضله واللہ واسع علیم}۔اور تم اپنے بے نکاحوں کا نکاح کرو، اور تمہارے غلام اور باندیوں میں جو اس کے (یعنی نکاح کے) لائق ہوں ان کا بھی، اگر یہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کردے گا، اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا جاننے والا ہے۔(النور: ۳۲)

مناسب جوڑا ملنے پر نکاح کا حکم دیا ۔عن علي بن أبي طالب أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال له: یا علي! ثلاث لا تؤخرها، الصلاة إذا أتت ، والجنازة إذا حضرت ، والأیم إذا وجدت لها کفؤاً۔(ترمذي ۱/۱۳۳، باب ماجاء في الوقت الأول من الفضل، رقم الحدیث ۱۷۱)

جو لوگ نکاح پر قدرت نہیں رکھتے ان کے لیے روزوں کا حکم دیا ۔قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا معشر الشباب ! من استطاع منکم الباءة فلیتزوج، فإنه أغض للبصر، وأحصن للفرج۔ ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فإنه له وجاء۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو قدرت رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ نکاح کرلیں، کیوں کہ یہ نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت میں زیادہ معاون ہے ۔اور جو نکاح پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے، کیوں کہ روزہ اس کے (گناہ سے بچنے کے) لیے ڈھال ہے۔

(صحیح مسلم: ۵/۲۹۴، رقم الحدیث: ۳۳۸۴، صحیح بخاري: ص ۹۳۴، رقم الحدیث: ۵۰۶۶)

نکاح کو آسان بنانے کا حکم دیا ۔عن عائشة قالت: قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: إن أعظم النکاح برکة أیسره مؤنة۔ رواه البیہقي في شعب الإیمان۔ (مشکوۃ: ص ۲۶۸، کتاب النکاح)

پھر اس رشتہ کو مضبوط وپائیدار بنانے کے لیے مرد وعورت دونوں کے حقوق وفرائض متعین کیے ۔{ولهن مثل الذي علیهن بالمعروف}۔اور عورتوں کا (بھی) حق ہے جیسا کہ عورتوں پر حق ہے موافق دستور (شرعی) کے۔
(البقرة: ۲۲۸)

حفاظتِ نسل کی خاطر شریعت نے زنا کو حرام قرار دیا ۔{ولا تقربوا الزنا إنه کان فاحشة وساء سبیلاً}۔اور زنا کے پاس بھی مت جاؤ یقیناً وہ بڑی بے حیائی ہے اور بری راہ ہے ۔(بني اسرائیل: ۳۲)

عن أبي هريرة قال: قال رسو ل الله صلى الله عليه وسلم: لا يزني الزاني وهو حين يزني مؤمن ـ اهـ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: زنا کرنے والا نہیں زنا کرتا ہے جس وقت وہ زنا کرتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو۔

(سنن نسائي: ۴/۳۶۷، رقم الحديث: ۷۱۴۶)

زنا کرنے والوں کے لیے سخت سزا رکھی۔{الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة}۔ زنا کار عورت اور زنا کار مرد ہو (دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کو سو سو دڑے مارو۔

(النور: ۲)

اور غیر فطری جنسی عمل کو بھی حرام قرار دیا۔{وجاءه قومه يهرعون إليه ومن قبل كانوا يعملون السيئات، قال يقوم هؤلاء بناتي هن أطهر لكم فاتقوا الله ولا تخزون في ضيفي أليس منكم رجل رشيد}۔ اور ان کے پاس ان کی قوم (کے لوگ) دوڑے ہوئے آئے اور وہ پہلے ہی سے بدکاریاں کرتے تھے، (لوط علیہ السلام) بولے اے میری قوم یہ میری بیٹیاں (بھی تو موجود) ہیں یہ تمہارے حق میں پاکیزہ ہیں سو اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں۔(ھود: ۷۸)

{ولوطاً إذ قال لقومه أتأتون الفاحشة وأنتم تبصرون}۔ اور لوط (کو بھی ہم نے پیمبر بنا کر بھیجا تھا) جبکہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ ارے! کیا تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو، درآنحالیکہ سمجھ رکھتے ہو۔{أئنكم لتأتون الرجال شهوة من دون النساء بل أنتم قوم مسرفون}۔ ارے! تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر! مگر ہاں تم لوگ ہی ہو جاہلیت میں (مبتلا)۔(النمل: ۵۴_۵۵)

{واللذان يأتيانها منكم فآذوهما}۔ اور تم میں سے کوئی دو جو وہ کام کریں انہیں اذیت پہنچاؤ۔(النساء: ۱۶)

نیز ان تمام اسباب وذرائع کو جو زنا اور بے راہ روی تک پہونچانے والے تھے، کو بھی منع کر دیا، مثلاً:

۱ر مرد وعورت کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا۔{قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم، ذلك أزكى لهم، إن الله خبير بما يصنعون۔ وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن}۔ آپ ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے حق میں زیادہ صفائی کی بات ہے بیشک اللہ کو سب کچھ خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اور آپ کہہ دیجئے ایمان والیوں سے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھیں۔(النور: ۲۹_۳۰)

۲ر غیروں کے سامنے زیب وزینت کی آرائش اور جنسی ہیجان پیدا کرنے والی چیزوں کو حرام قرار دیا گیا:

{يأيها النبي قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن}۔ اے نبی آپ

کہہ دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور (عام) ایمان والوں کی عورتوں سے اللہ کی سبیل پر(?) کہ اپنے اوپر نیچی کرلیا کریں اپنی چادریں تھوڑی سی۔(الأحزاب:۵۹)

{ولا یبدین زینتھن إلا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن} اور اپنا سنگار ظاہر نہ ہونے دیں مگر ہاں جو اس میں سے کھلا ہی رہتا ہے، اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔(النور:۳۱)

{فلا تخضعن بالقول فیطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولاً معروفاً}۔{وقرن في بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیة الأولی}۔ تو تم بولی میں نزاکت مت اختیار کرو کہ (اس سے) ایسے شخص کو خیال (فاسد) پیدا ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے اور قاعدے کے موافق بات کہا کرو۔ اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور جاہلیت قدیم کے مطابق اپنے کو دکھاتی مت پھرو۔(الأحزاب:۳۲۔۳۳)

۵- حفاظتِ مال:

شریعت نے جس چیز کی ذاتی قیمت تسلیم کی وہ شریعت کی نگاہ میں مال ہے، ایسا مال قابل احترام ہے، تمام جائز طریقوں سے مال سے انتفاع درست ہے، مال مقصود نہیں بلکہ محض وہ انسان کی دنیوی ضرورتوں کی تکمیل، اور اخروی سعادت ونجات کی تحصیل کا ذریعہ ہے، اگر اس کو جائز طریقوں سے حاصل کیا جائے، اور درست مواقع میں خرچ کیا جائے، اور وہ انسان کو اللہ تعالی سے غافل نہ کردے، تو یہ مال اللہ کی نعمت ہے، اور اگر اس کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے یا غلط جگہوں میں خرچ کیا جائے، یا وہ انسان کو اس کے خالق ورزاق سے غافل کردے، تو یہ نعمت نہیں زحمت ہے، اور اخروی تباہی وبربادی کا باعث ہے۔

مال کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام مال میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، اور انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اصلاً اس مال کا مالک اللہ ہے۔{إن اللہ اشتری من المؤمنین أنفسھم وأموالھم بأن لھم الجنة}۔ بلاشبہ اللہ نے مؤمنین سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس کے عوض میں کہ انہیں جنت ملے گی۔(التوبة:۱۱۱)

{ومما رزقناھم ینفقون}۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔(البقرة:۳)

{وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرة ولا تنس نصیبک من الدنیا}۔ اور جو کچھ تجھے اللہ نے دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کر اور دنیا سے (بھی) اپنا حصہ فراموش مت کر۔(القصص:۷۷)

اور اس نے اسے انسان کے منافع کے لیے عطا فرمایا ہے، اس تعلیم کے ساتھ وہ اپنی ذات اور متعلقین کے ساتھ ساتھ سماج کے دیگر افراد کے لیے اپنے مال میں دینی ذمہ داری محسوس کرے۔{وفي أموالھم حق للسائل والمحروم}۔ اور ان کے مال میں حق رہتا تھا سوالی اور غیر سوالی (سب) کا۔(الذریت:۱۹)

تحصیلِ مال کے طریقوں سے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ:

۱/ اس کے لیے محنت وعمل ہو۔{وابتغوا من فضل اللہ}۔اوراللہ کی روزی تلاش کرو۔(الجمعۃ:۱۰)

حدیث پاک میں وارد ہے:''طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ''۔رواہ البیہقي في شعب الإیمان۔حلال کمائی کا طلب کرنا فرائضِ خمسہ کے بعد ایک فریضہ ہے۔(مشکوۃ:ص۲۴۲)

۲/ مزدورکواس کی پوری اجرت دی جائے اورمزدورکواس کی اجرت دینے میں تاخیر نہ کی جائے۔قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ثلاثۃ أنا خصمھم یوم القیامۃ؛ رجل أعطی بي ثم غدر، ورجل باع حراً فأکل ثمنہ، ورجل استأجر أجیراً فاستوفی منہ ولم یوفہ أجرہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:''حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کی طرف سے خود مدعی بنوں گا، ایک وہ شخص جس نے میرا نام لیکر عہد کیا پھر دھوکہ دیا، دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد کو بیچا اور اس کی قیمت کھالی، تیسرا وہ شخص جس نے مزدور سے محنت تو پوری لی مگر اس کی مزدوری نہ دی''۔

(صحیح بخاري:۱/۳۰۲، باب إثم من منع الأجیر۔ابن ماجہ:۱/۱۷۶، الرھون، باب أجر الأجراء)

عن عبد اللہ بن عمرو قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''أعطوا الأجیر الأجر قبل أن یجف عرقہ''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:''مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو''۔(ابن ماجہ:۲/۱۷۶)

۳/ مال گردش میں رہے، اس لیے تجارت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔عن أبي سعید قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: التاجر الصدوق الأمین مع النبیین والصدیقین والشھداء۔رواہ الترمذي والدارمي والدارقطني۔(مشکوۃ:ص۲۴۳، کتاب البیوع، باب المساھلۃ في المعاملۃ، ترمذي۲/۲۵۸، البیوع، باب ما جاء في التجار وتسمیۃ النبي صلی اللہ علیہ وسلم إیاھم)

عن معاذ بن جبل قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''إن أطیب الکسب کسب التجار الذین إذا حدثوا لم یکذبوا، وإذا ائتمنوا لم یخونوا، وإذا وعدوا لم یخلفوا، وإذا اشتروا لم یذموا، وإذا باعوا لم یطروا، وإذا کان علیھم لم یمطلوا، وإذا کان لھم لم یعسروا''۔(الآداب للبیقي:ص۳۰۴، رقم الحدیث:۱۰۰۱، باب ما یکرہ من التجارۃ)

۴/ سود کو حرام قرار دیتا ہے، کہ اس سے شفقت وہمدردی کے جذبات ختم ہوتے ہیں۔{أحل اللہ البیع وحرم الربوا}۔اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔(البقرۃ:۲۷۵)

عن جابر قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال: ھم

سو اء۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، اور اس کے لکھنے والے پر اور اس کے دونوں گواہوں پر، اور فرمایا (گناہ میں) سب برابر کے شریک ہیں۔ (مسلم: ۲/۲۷)

۵/ مال کے ارتکاز و احتکار (Monopoly\Monopolization) کو منع کرتا ہے، کیوں کہ اس سے عام انسانیت مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔ عن معمر قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من احتکر فهو خاطیء۔ رواه مسلم ۔ (مشکوۃ: ص ۲۵۰، کتاب البیوع، باب الاحتکار، المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۰/۴۴۵، رقم الحدیث: ۱۰۸۶۔ السنن الکبری للبیهقي: ۶/۴۹، رقم الحدیث: ۱۱۱۴۷)

عن عمر عن النبي صلی اللہ علیه وسلم قال: الجالب مرزوق والمحتکر ملعون۔

رواه ابن ماجة والدارمي۔ (مشکوۃ: ص ۲۵۱)

مالی معاملات میں جھگڑوں اور منازعات سے بچنے کے لیے معاملات کو صاف ستھرے طریقے سے انجام دینے کی تاکید کرتا ہے۔ أما العاقد فیشترط فیه العقل والتمییز فلا یصح عقد المجنون ولا السکران ولا الصبي غیر الممیز ــــــ وأما المعقود علیه فیشترط فیه ستة شروط: طهارة العین، الانتفاع به، ملکیة العاقد له، القدرة علی تسلیمه، العلم به، کون المبیع مقبوضاً۔

(فقه السنة: ۳/۱۵۰، شروط البیع)

عن ابن عمر قال: قال رجل للنبي صلی اللہ علیه وسلم: إني أخدع في البیوع فقال: إذا بایعت فقل لا خلابة فکان الرجل یقوله۔ متفق علیه۔ (مشکوۃ: ص ۲۴۴، کتاب البیوع، باب الخیار)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: المؤمن أخو المؤمن۔ فلا یحل للمؤمن أن یبتاع علی بیع أخیه۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مومن مومن کا بھائی ہے، لہٰذا کسی مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرے۔ (صحیح مسلم: ۵/۳۱۷، رقم الحدیث: ۳۴۴۹)

معاملات کو قیدِ تحریر میں لانے اور اس پر گواہ بنانے کا حکم دیتا ہے۔ {یاأیها الذین آمنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمی فاکتبوه} اے ایمان والو! جب ادھار کا معاملہ کسی مدتِ معین تک کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ {وأشهدوا إذا تبایعتم} اور جب خرید و فروخت کرتے ہو (تب بھی) گواہ کر لیا کرو۔ (البقرۃ: ۲۸۲)

مالداری اور غریبی کی کھائی پاٹنے اور مال میں عدل و برابری کو قائم کرنے کے لیے نیک کاموں میں خرچ کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اور بخل و کنجوسی سے منع کرتا ہے۔ {ولا یحسبن الذین یبخلون بما آتاهم اللہ من فضله هو خیرا لهم بل هو شر لهم سیطوقون ما بخلوا به یوم القیامة} اور جو لوگ کہ اس مال میں بخل کرتے رہتے

ہیں جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ (مال) ان کے حق میں اچھا ہے، نہیں، بلکہ ان کے حق میں (بہت) برا ہے، یقیناً انہیں قیامت کے دن طوق پہنایا جائے گا اس (مال) کا جس میں انہوں نے بخل کیا۔(آل عمران:۱۸۰)

{و اللہ لا یحب کل مختال فخور، الذین یبخلون و یأمرون الناس بالبخل}۔اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔(وہ لوگ ایسے ہیں) جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔(الحدید:۲۴،۲۳)

{ویل لکل ھمزۃ لمزۃ، الذي جمع مالاً و عددہ، یحسب أن مالہ أخلدہ} کم بختی ہے پس پشت عیب جوئی کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا (رہتا) ہو اور اسے گنتا رہتا ہو، وہ یہ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔ (الھمزۃ:۱۔۳)

{و الذین یکنزون الذھب و الفضۃ و لا ینفقونھا في سبیل اللہ فبشرھم بعذاب ألیم، یوم یحمی علیھا في نار جھنم فتکوی بھا جباھھم و جنوبھم و ظھورھم ھذا ما کنزتم لأنفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون}۔اور جو لوگ کہ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں آپ انہیں ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے، اس روز (واقع ہوگا) جبکہ اس (سونے چاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں کو اور ان کے پہلوؤں کو اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا، یہی ہے وہ جسے تم اپنے واسطے جمع کرتے رہے تھے، سو اب مزہ چکھو اپنے جمع کرنے کا۔

(التوبۃ:۳۵،۳۴)

تحفظ مال کی خاطر مال پر دست درازی کرنے والے چوروں اور رہزنوں کے لیے سخت سزائیں مقرر کی، اور دوسروں کے مال ہتھیانے والوں اور اس کو نقصان پہونچانے والوں پر ضمان و تاوان کو واجب کیا۔{السارق و السارقۃ فاقطعوا أیدیھما جزاءً بما کسبا نکالاً من اللہ}۔اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو ان کے کرتوتوں کے عوض میں اللہ کی طرف سے۔(المائدۃ:۳۸)

{إنما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون في الأرض فسادا أن یقتلوا أو یصلبوا أو تقطع أیدیھم و أرجلھم من خلاف أو ینفوا من الأرض}۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹے جائیں، یا وہ ملک سے نکال دیے جائیں۔(المائدۃ:۳۳)

آج پوری دنیا مشکلات و پریشانیوں میں مبتلا ہے، بے چینی و اضطراب کے انتہائی خطرناک بھنور میں پھنستے

جاری ہے، اور اس سے نکلنے کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں اور جتنے قوانین بنائے جارہے ہیں، بجائے اس کے کہ اُن سے اِن مشکلات سے خلاصی وچھٹکارامل جاتا، اس میں مزید اضافہ ہورہا ہے، اوردن بدن پریشانیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟؟

اس کی وجہ ہے ان تدبیروں اور قوانین کا ضعف ونقص، جوان مشکلات سے خلاصی اور چھٹکارے کے لیے تجویز کئے جارہے ہیں، کیوں کہ ان کو کمزور انسانوں کے کمزور ہاتھوں اور کمزور دماغوں نے وضع کیا، جبکہ ان سے نکلنے کے لیے ایسی تدابیر اور قوانین کی ضرورت ہے، جسے مدبرِ حقیقی اور حاکمِ اصلی نے وضع کیا ہو، اور وہ ہے خالقِ کائنات کی ذاتِ مقدس، کیوں کہ حقیقی مدبر اور حاکم وہی ہے۔{یدبر الأمر من السماء إلی الأرض ثم یعرج إلیه في یوم کان مقدارہ ألف سنة مما تعدون}۔ آسمان سے زمین تک وہی ہر امر کی تدبیر کرتا ہے، پھر (یہ امر) اس کے پاس پہنچ جائے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کی ہوگی۔(السجدۃ:۵)

{ألا له الخلق والأمر تبرک الله رب العالمین}۔ یاد رکھو اسی کے لئے خاص ہے آفرینش (بھی) اور حکومت (بھی) برکت سے بھرا ہوا ہے، اللہ سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔(الأعراف:۵۴)

اس لیے سربراہانِ اقوامِ عالم اور قائدینِ ملل کو، عدل وانصاف کی نظر سے قوانینِ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور انہیں اپنے زیرِ اثر مملکتوں میں نافذ کرکے، اپنی رعایا کے لیے امن وسکون کی زندگی فراہم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، تبھی وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہوسکتے ہیں، ورنہ اس تغافل وتساہل اور اعراض عن الحقیقت پر کل قیامت کے دن انہیں جواب دہ ہونا ہوگا۔

۲- مقاصدِ حاجیہ:

مقاصدِ حاجیہ ان مقاصد کو کہا جاتا ہے جن سے مکلفین کی زندگی حرج وتنگی سے نکل کر وسعت وکشادگی میں آجاتی ہو، ان مقاصد کے حصول کے لئے شریعت نے بہت سے احکام جاری کئے۔ مثلاً

ا۔ کوئی شخص قیام پر قادر نہیں تو اس کے لئے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی، اگر زمین پر سجدہ کی قدرت نہیں تو اشارہ سے رکوع وسجدہ کے ساتھ، اگر بیٹھنے پر قدرت نہیں تو داہنی طرف کروٹ قبلہ رخ ہوکر، اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو چت لیٹ کر قبلہ کی جانب اپنے پیر رکھ کر نماز پڑھنے کی رخصت دی گئی۔

عن علي بن أبي طالب کرم الله وجهه عن النبي صلی الله علیه وسلم قال: یصلي المریض قائماً فإن لم یستطع صلی قاعداً، فإن لم یستطع إن یسجد أومأ وجعل سجودہ أخفض من رکوعه فإن لم یستطع أن یصلي قاعداً صلی علی جنبیه الأیمن مستقبلة فإن لم یستطع صلی مستلقیاً رجلاہ مما یلي

القبلة۔(نصب الرایۃ:۱۷۹/ ۲)

۲/ اگر کوئی شخص سفرِ شرعی پر ہے، یا بیمار ہے تو اس کے لئے قصر وافطار کی اجازت دی گئی۔{وإذا ضربتم في الأرض فليس عليكم جناح أن تقصروا من الصلوة}۔اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کر دیا کرو۔(النساء:۱۰۱)

{ومن كان مريضاً أو على سفر فعدة من أيام أخر، يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر}۔اور کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو (اس پر) دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) اللہ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔(البقرۃ:۱۸۵)

۳/ اگر پانی نہ ہو، یا ہو مگر استعمال سے عاجز ہو، یا استعمال کی وجہ سے ازدیادِ مرض، یا صحت یابی میں تاخیر کا اندیشہ ہو، تو تیمم کو جائز قرار دیا گیا۔

{وإن كنتم مرضى أو على سفر أو جاء أحد منكم من الغائط أو لمستم النساء فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيداً طيباً فامسحوا بوجوهكم وأيديكم منه، ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج ولكن يريد ليطهركم}۔اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو، یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس سے مسح کر لیا کرو، اللہ نہیں چاہتا کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ (تو یہ) چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک وصاف رکھے۔

(المائدۃ:۶)

ويجوز للمريض والمسافر أن يتيمم إذا لم يستطع الوضوء أو الغسل وإن أجنب المسافر ومعه من الماء مقدار ما يتوضأ به يتيمم عندنا، ولم يستعمل الماء، ويتيمم لصلاة الجنازة في المصر إذا خاف فوتها وكذلك لصلاة عندنا۔(المبسوط للسرخسي:۱/۲۵۲، باب التيمم)

۴/ حائضہ اور نفساء پر روزوں کی قضاء لازم ہے، مگر نمازوں کی قضاء لازم نہیں۔

عن عائشة كانت إحدانا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا طهرت من حيضها تقضي الصيام، ولا تقضي الصلاة۔(نصب الراية للزيلعي۲۵۴/۱)

۵/ شکار کو مباح کر دیا گیا۔{أحل لكم صيد البحر وطعامه متاعاً لكم وللسيارة}۔تمہارے لئے دریائی شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا تمہارے نفع کے لئے اور قافلوں کے لئے۔(المائدۃ:۹۶)

۶/ پاکیزہ چیزوں سے انتفاع کو مباح قرار دیا، جیسا کہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے اور سواری وغیرہ کی تمام چیزیں، بشرطیکہ ان میں اسراف اور تفاخر نہ ہو۔قال النبي صلى الله عليه وسلم: ''كلوا واشربوا

وتصدقوا والبسوا في غير مخيلة ولا سرف فإن الله سبحانه يحب أن يرى آثر نعمته على عبده''۔ (الدر المنثور ۱۴۸/۳)

قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا في غير إسراف ولا مخيلة، وقال ابن عباس: ''كل ما شئت والبس ما شئت، ما أخطأتك اثنتان: سرف أو مخيلة''۔

(صحيح بخاري: ص ۱۰۵۱، كتاب اللباس، كنز العمال: ۲۷۴/۶، رقم الحديث: ۱۷۱۹۳، كتاب الزينة والتجمل، الباب الأول في الترغيب فيه، وكذا في السنن الكبرى للنسائي: ۴۱/۲، رقم الحديث: ۲۳۳۰، كتاب الزكاة، الاختيال في الصدقة۔ الآداب للبيهقي: ص ۱۹۴، رقم الحديث: ۶۳۱، باب من أحب أن يكون ثوبه حسنا)

۳- مقاصدِ تحسینیہ:

ان مقاصد سے مقاصدِ ضروریہ اور مقاصدِ حاجیہ کی تکمیل ہوتی ہے، ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بھی شارع نے مکلفین کو کچھ تعلیمات دے رکھی ہے۔ مثلاً

۱/ مکارمِ اخلاق پر مشتمل تعلیمات ۔{وعباد الرحمن الذين يمشون على الأرض هوناً وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاماً، والذين يبيتون لربهم سجداً وقياماً}۔ اور (خدائے) رحمن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمیں پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب ان سے جہالت والے لوگ بات چیت کرتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں خیر۔ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ وقیام میں لگے رہتے ہیں۔

(الفرقان: ۶۳، ۶۴)

قال الله عز وجل: {والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس والله يحب المحسنين}۔ اور غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (آل عمران: ۱۳۴)

عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ''ليس الشديد بالصرعة، ولكن الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب''۔

(الآداب للبيهقي: ص ۶۰، رقم الحديث: ۱۷۱، باب كظم الغيظ وترك الغضب)

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ثلاث من كن فيه حاسبه الله حساباً يسيراً، وأدخله الجنة، قلت: ما هو يا رسول الله؟ قال: تصل من قطعك، وتعطي من حرمك، وتعفو عمن ظلمك۔ (المعجم الأوسط للطبراني: ۲۶۳/۱، رقم الحديث: ۹۰۹)

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المسلم أخو المسلم لا يخونه ولا يكذبه ولا

يخذله، كل المسلم على المسلم حرام، عرضه وماله ودمه، التقوى ههنا، بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم۔(سنن الترمذي: ۴/۱۰۳، باب ما جاء في شفقة المسلم على المسلم)

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المؤمن مرآة المؤمن، والمؤمن أخو المؤمن من حيث لقيه يكف عنه ضيعته ويحوطه من ورائه۔

(شعب الايمان للبيهقي ۶/۱۱۳، رقم الحديث ۷۶۳۵)

۲/ پاکی وطہارت کی تعلیمات۔{وثيابك فطهر}۔اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے۔(المدثر:۴)

{إن الله يحب التوابين ويحب المتطهرين}۔بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتا ہے پاک وصاف رہنے والوں سے۔(البقرة:۲۲۲)

{فيه رجال يحبون أن يتطهروا، والله يحب المطّهرين}۔اس میں (ایسے) آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔(التوبة:۱۰۸)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''الطهور نصف الإيمان''۔

(مشكوة:۱/۹۷، رقم الحديث: ۲۹۵، كتاب الطهارة، الفصل الثالث)

عن سعد بن أبي وقاص رفعه: إن الله طيب يحب الطيب، نظيف يحب النظافة، كريم يحب الكرم، جواد يحب الجود، فنظفوا أفنيتكم، ولا تشبهوا باليهود۔(كشف الخفاء للعجلوني: ۱/۲۰۱)

۳/ سترِ عورت، اخذِ زینت، نفل نماز اور صدقہ کے ذریعے تقرب کی تعلیمات۔{يبني آدم قد أنزلنا عليكم لباساً يواري سوآتكم وريشاً ولباس التقوى ذلك خير}۔اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے (جو) تمہارے پردہ والے بدن کو چھپاتا ہے، اور (موجب) زینت بھی ہے اور تقوی کا لباس (اس سے بھی) بڑھ کر ہے۔(سورة الأعراف:۲۶)

{يبني آدم خذوا زينتكم عند كل مسجد}۔اے اولادِ آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔

(الأعراف:۳۱)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله جميل يحب الجمال، الكبر من بطر الحق وغمط الناس۔(الآداب للبيهقي: ص۱۹۳، باب من أحب أن يكون ثوبه حسنا)

۴/ آدابِ اکل وشرب۔عن عمر بن أبي سلمة يقول: كنت غلاماً في حجر رسول الله صلى الله عليه وسلم، وكانت يدي تطيش في الصحفة، فقال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا غلام! سم الله، وكل بيمينك، وكل مما يليك، فما زالت تلك طعمتي بعد۔

(صحيح بخاري: ص ۹۸۷، رقم الحديث: ۵۳۷۶، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين)

عن عبد الله بن أبي قتادة، عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا شرب أحدكم فلا يتنفس في الإناء۔ اھ۔ (صحیح بخاری: ص ۱۰۲۷، رقم الحدیث: ۵۶۳۰، باب النهي عن التنفس في الإناء)

عن ثمامة بن عبد الله قال: كان أنس يتنفس في الإناء مرتين أو ثلاثاً، وزعم أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يتنفس ثلاثاً۔ (صحیح بخاری: ص ۱۰۲۷، رقم الحدیث: ۵۶۳۱، باب الشرب بنفسین أو ثلاثة)

۵/ فضول خرچی اور بخل سے بچنے کی تعلیم۔ {ولا تبذر تبذيراً، إن المبذرين كانوا إخوان الشياطين وكان الشيطان لربه كفوراً}۔ اور مال کو فضولیات میں نہ اڑا، بیشک فضولیات میں اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ (بني إسرائيل: ۲۶، ۲۷)

{كلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا يحب المسرفين}۔ کھاؤ اور پیو لیکن اسراف سے کام نہ لو، بیشک وہ (اللہ) مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ (الأعراف: ۳۱)

{والله لا يحب كل مختال فخور، الذين يبخلون ويأمرون الناس بالبخل}۔ اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔ (وہ لوگ ایسے ہیں) جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ (الحدید: ۲۳، ۲۴)

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما من يوم يصبح العباد فيه إلا ملكان ينزلان، فيقول أحدهما: اللهم أعط منفقاً خلفاً، ويقول الآخر: اللهم أعط ممسكاً تلفاً۔ (الآداب للبيهقي: ص ۳۱، باب في فضل الإنفاق بالمعروف وكراهية البخل والإمساك)

والله ولي التوفيق

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے:

(۱) الموافقات للشاطبی (ابو اسحق الشاطبی)
(۲) المقاصد الشرعیۃ للخادمی (نور الدین الخادمی)
(۳) ادب الدنیا والدین (ابو الحسن ماوردی)
(۴) حجۃ اللہ البالغۃ (عربی) (محدث شاہ ولی اللہ دہلوی)
(۵) الاجتہاد المقاصدی (نور الدین مختار الخادمی)
(۶) طرق الکشف عن مقاصد الشارع (الدکتور نعمان جغیم)
(۷) احیاء علوم الدین (امام محمود الغزالی)
(۸) کامل البرہان (اردو) (مولانا سعید صاحب پالن پوری)
(۹) طرق الکشف عن مقاصد الشارع (نعمان جغیم)
(۱۰) اسلامی احکام اور ان کی حکمتیں (مترجم: مولانا محمد خالد محمود)
(۱۱) رحمۃ اللہ الواسعۃ (اردو) مفتی سعید پالنپوری صاحب
(۱۲) قواعد المقاصد عند الامام الشاطبی (عبد الرحمن ابراہیم

الکیلانی)

(۱۳) نظریۃ المقاصد (اسماعیل الحسنی)　(۱۴) مقاصد شریعت "تعارف اور تطبیق"

(۱۵) مقاصد شریعت "عصری تناظر میں" (ڈاکٹر جمال الدین عطیہ)

علم فقہ

مولانا جاوید صاحب اشاعتی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

قارئین کرام! علم فقہ مکلف بندوں کے افعال سے بحث کرتا ہے یہی اس علم کا موضوع ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ علم بندے کی انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے، بندہ کا کوئی عمل اس کی دسترس ورہنمائی سے باہر نہیں ہے۔ یہ اس علم کی وسعت وہمہ گیری کا وہ روشن اور نمایاں پہلو ہے جو اس کو دیگر تمام علوم اسلامیہ سے ممتاز کردیتا ہے۔تو آیئے! اس علم عظیم کے سلسلے میں کچھ تعارفی معلومات ذیل میں ملاحظہ کریں، یہ معلومات ۵ سرخیوں پر مشتمل ہے: ۱رفقہ کا لغوی واصطلاحی مفہوم۔ ۲رفقہ اسلامی کی جامعیت۔ ۳رفقہ اسلامی کا آغاز وارتقاء۔ ۴رخیر القرون کے فقہی مذاہب۔ ۵ردور حاضر میں رائج مسالک اربعہ مع تعارف ائمہ۔

(۱) فقہ کا لغوی واصطلاحی مفہوم:

(الف) فقہ: اس لفظ کا استعمال لغت عرب میں متعدد اسلوب ومعنی میں ہوا ہے، فَقِہَ یَفْقَہُ فِقْھاً بروزن سمع یسمع بمعنی جاننا، سمجھنا۔قرآن کریم کی آیت "قالو ایشعیب ما نفقہ کثیرا" میں یہی معنی مراد ہے۔

(ب) فقہ یفقہ فقاھۃً بروزن کرم یکرم بمعنی فہم وادراک میں گہرائی حاصل کرنا، اسی سے فقیہ اور فقہاء ہے، یعنی مضبوط علم اور گہری سمجھ رکھنے والے۔حدیث پاک: خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاِسلام إذا فقھوا میں یہی معنی مراد ہے۔

رہی بات اصطلاحی مفہوم کی تو چوں کہ دین اسلام اور احکام قرآنیہ کی تفہیم کے لیے بہت سارے علوم درکار ہیں، اس لیے علوم اسلامیہ کی تقسیم وتدوین سے پہلے فقہ کا اطلاق نہایت وسیع الذیل مفہوم پر ہوتا تھا جس میں بہت سارے علوم سماجاتے تھے۔چناں چہ متقدمین فقہاء اور ائمہ دین کے نزدیک فقہ کے اصطلاحی مفہوم میں موجودہ فقہ اسلامی کے علاوہ دیگر بہت سے شرعی علوم بھی شامل تھے، مثلاً: علم عقائد، علم تصوف وغیرہ۔گویا ان حضرات کے نزدیک اِن تمام علوم اسلامیہ کی گہری واقفیت اور فہم وادراک کا نام فقہ تھا، اس لیے کہ کتاب وسنت میں جہاں کہیں فقہ کا لفظ دین

کی فہم کے معنی میں استعمال ہوا ہے، وہاں پورے دین کی فہم مراد ہے۔

مثلاً: آیت کریمہ: فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین (التوبۃ) میں۔ اور اسی طرح آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی اُس مشہور دعا میں جو زبان رسالتِ مآب سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں صادر ہوئی یعنی ''اللھم علمہ الکتاب وفقھہ فی الدین ''۔ (الصحیح للبخاری) یہاں حضرت ابن عباسؓ کے لیے فقیہ ہونے کی دعا فرمائی گئی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ حضرت ابن عباس کسی ایک علم میں مقامِ درک نہیں رکھتے تھے، وہ تو کئی علوم کے فقیہ تھے، پتہ چلا کہ ان حضرات کے یہاں پورے دین کی فہم رکھنے والے کو فقیہ کہا جاتا تھا۔

الغرض! فقہ کا اصطلاحی مفہوم متقدمین کے نزدیک نہایت کشادہ تھا لیکن بعد میں جب اہل تحقیق نے علوم اسلامیہ کی یک نوعی جزئیات کے اعتبار سے تقسیم وتدوین کا عظیم کارنامہ انجام دیا، اور ہر فن کا دائرہ اور حدود مقرر کیں، تو فقہ کے مفہوم میں صرف شریعت کے عملی احکام کا وہ علم شامل رہا جو ان کے دلائل سے حاصل ہوا ہو، جس کی اہل فن نے مختلف تعریفات کی ہیں، چناں چہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک فقہ کی مشہور تعریف یہ ہے: ''الفقہ ھو العلم بالاحکام الشرعیۃ العملیۃ المکتسب من أدلتھا التفصلیۃ''، احکام شرعیہ عملیہ کا اُن کے تفصیلی دلائل کے ذریعہ حاصل ہونے والا علم ''فقہ'' کہلاتا ہے۔

اور علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں فقہ کی تعریف میں یوں رقم طراز ہیں: ''الفقہ معرفۃ احکام اللہ تعالی فی افعال۔۔۔ الخ'' یعنی مکلف بندوں کے افعال سے متعلق جو احکامات ہیں۔ مثلاً: جائز وناجائز، اباحت واستحباب، اور کراہت وغیرہ۔ ان کے جاننے کو فقہ کہتے ہیں جب کہ یہ احکامات کتاب وسنت اور شریعت کے مقرر کردہ دیگر دلائل سے ماخوذ ہوں۔

الحاصل حلال وحرام کی پہچان کا واحد راستہ علم فقہ ہے، اور ہر مسلمان بندہ یا بندی اس چیز کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے کی محتاج ہے، کیوں کہ اس کے بغیر رضائے الٰہی کا حصول ممکن نہیں جو زندگی کا مقصد اولین ہے۔

(۲) فقہ اسلامی کی جامعیت:

اگر اس علم کے داخلی مضامین ومباحث پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ علم ایک فرد کو فرد کے ساتھ، خاندان کو خاندان کے ساتھ، قوم کو قوم کے ساتھ، ملک کو ملک کے ساتھ، کیسے کامیاب برتاؤ رکھنا چاہیے، جس پر دنیوی کامیابیوں کا مدار ہے، اور بالخصوص انسان کو اپنے رب کے ساتھ کیسے تعلق قائم ومضبوط رکھنا چاہیے جس پر اُخروی کامیابیوں کا تمام تر مدار ہے، اس طرح کی جملہ ہدایات کیسے حسین انداز میں پیش کرتا ہے۔

داخلی مضامین:

☆ عبادات: یہ ابواب فقہیہ کا سب سے پہلا عنوان ہے جس میں درج ذیل امور زیر بحث آتے ہیں:

(۱) پانی، برتن، بدن وغیرہ کی پاکی صفائی کے مسائل۔

(ب) نماز، روزہ، زکوۃ، حج کی ادائیگی کے صحیح طریقے۔
(ج) نذر و قسم کو پورا کرنے کی تعلیم۔
(د) بندے اگر آسمانی مصیبت سے دوچار ہوں تو بارانِ رحمت کی طلب کے لیے نماز استسقاء۔
(ھ) کوئی مرجائے تو میت کے لیے جانکنی کے عالم سے لے کر اس کو سپرد خاک کرنے تک کی ہدایات۔
(و) عیدین کے موقع پر بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہو کر اپنی شادمانیوں کا اظہار۔
(ز) مریضوں مسافروں اور دیگر معذروں کے لیے خصوصی رعایتیں و سہولتیں وغیرہ۔

بہرحال ان عبادات کا مقصد یہ ہے بندہ اپنے رب کے حقوق کی انجام دہی کر کے اس کی رضا حاصل کرلے۔

☆معاملات شہریت:

اس عنوان کے تحت درج ذیل امور زیر بحث آتے ہیں:

(ا) تجارت پیشہ لوگوں کے لیے کامیاب تجارت کے اصول اور خرید و فروخت کے مسائل۔
(ب) کاشتکاروں کے لیے زراعت کے اصول مثلاً زمین کی جوتائی اور کھیتی کی آبیاری، کچے اور پکے پھلوں کی بیع کے طریقے وغیرہ۔
(ج) نقدین (سونا چاندی) کی بیع کے متعلق ہدایات۔
(د) رہن (اشیاء کو گروی رکھنے کے احکام) کاروباری شرکت کے مسائل وغیرہ، مذکورہ چیزیں موجودہ دور کی اصطلاح میں قانون شہریت کہلاتی ہیں۔

☆شخصی معاملات:

یعنی وہ نجی مسائل جو ہر شخص کو ازدواجی مراحل سے گزرنے اور خاندانی حدود میں قدم رکھتے وقت پیش آتے ہیں، مثلاً: نکاح کے مسائل، زوجین کے ایک دوسرے پر حقوق، میراث کے گراں قدر احکام، نسب، طلاق، عدت، لعان، ظہار، خُلع وغیرہ۔

☆سزاؤں کے احکام:

گروہِ انسانی کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اپنی طاقت وقوت کا بے جا استعمال کر کے کمزوروں اور بے بسوں پر ظلم وستم روا رکھتا ہے، اور اس کو اپنے تئیں حکمرانی اور اقتدار تصور کرتا ہے، اپنے مفادات کی خاطر بے گناہ لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کے ساتھ کھلواڑ کرنا، امن پسندوں کا سکون غارت کرنا، خدا کی سرزمین پر سر اٹھانا، قانون خداوندی کی مخالفت کرنا، ان کا مشغلہ ہوتا ہے، ایسے اہل جرائم کی گوشمالی اور سرکوبی کے لیے مختلف سزاؤں پر مشتمل قوانین بھی فقہ اسلامی میں موجود ہیں جو کتاب الحدود والعقوبات کے عنوان کے تحت ذکر کیے جاتے ہیں، مثلاً حد سرقہ، قصاص، حد زنا، حد شراب نوشی، وغیرہ جن کو آج کی اصطلاح میں ''قانون عقوبات'' کہا جاتا ہے۔

☆عدالتی احکام:

اس عنوان کے تحت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان قاضی اور اسلامی عدالت کا جج لوگوں کے مابین اختلافی معاملات وتنازعات کا تصفیہ کس طرح کرے، اوران کے درمیان انصاف کیسے قائم کرے اس کے جزوی اور تفصیلی امور یہ ہیں:

۱۔ثبوت شہادت ویمین،ثبوت بینہ،اقرار۔ ۲۔آداب قضاء۔

۳۔قاضی فیصلہ کے لیے کس وقت کا انتخاب کرے،وغیرہ۔

☆امامت وخلافت کے احکام:

اس عنوان کے تحت ،اسلامی حکومت کا قیام کس طرح عمل میں آئے ،نظام حکومت چلانے کے لیے خلیفہ المسلمین کا انتخاب،حاکم اور رعایا کے درمیان اپنے متعلقہ حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں معاہدے،وغیرہ امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے،ان کو دستوری احکام بھی کہا جاتا ہے۔

☆ریاستی احکام:

اس عنوان کے ذیلی امور یہ ہیں:

۱۔ایک اسلامی ملک اور دیگر ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات کیسے قائم کئے جائیں۔

۲۔مسلمانوں کے زیر حکومت امن معاہدے تحت سکونت پذیر غیر مسلموں کے حقوق کی رعایت۔

۳۔حکومت کے خلاف برسرپیکار باغیوں اور دہشت گردوں سے نبرد آزمائی کے لیے جہادی سرگرمیاں۔

۴۔روئے زمین پر حتی الامکان دعوت دین عام کرنے کی راہیں ہموار کرنا،وغیرہ۔

(۳)فقہ اسلامی کا آغاز وارتقاء:

فقہ اسلامی کا سنگ بنیاد تو نزول وحی کے زمانہ ہی میں رکھا جا چکا تھا، کیوں کہ اولاً ان آیتوں کا نزول ہوا جو ایمانیات واعتقادات سے متعلق ہیں،بعدازاں حسب ضرورت عملی احکام کی آیتوں کا نزول شروع ہوا۔مثال کے طور پر صحابہ کرام کو جب کوئی نیا مسئلہ درپیش ہوتا تو دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کرتے،آپ علیہ الصلوۃ والسلام کچھ دیر توقف فرماتے،تا آنکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کا حل لے کر تشریف لاتے اب آپ علیہ السلام اپنے قول وفعل کے ذریعہ اس کی تشریح وتوضیح فرماتے۔

علاوہ ازیں صحابہ کرام کی ایک جماعت تو بغرض تعلیم وتعلم ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہا کرتیں،اورآیات قرآنی اوراحادیث نبوی کی تشریح وتعلیم کا سلسلہ جاری رہتا۔

جن صحابہ نے درسگاہِ نبوت سے بکثرت علمی استفادہ کیا وہ اس گروہِ مقدس میں ”جماعت قراء“ کے نام سے متعارف تھے۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کی وفات کے بعد، صحابہ کرام اپنے الاخری محل آرجہ لیے کے لیے مذکورہ جماعت سے رجوع فرمایا کرتے تھے'ان حضرات قراءؓ کے پاس کسی بھی نو پیش آمدہ مسئلہ کے حل کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے، اگر وہ کتاب میں مل جاتا، تو حدیث پاک کی طرف رجوع کی حاجت نہ تھی؛ اور اگر نہ ملتا، تب حدیثِ رسول میں تلاش کرتے۔ اس طرح تلاش وتتبع کے بعد کوئی حکم شرعی سب کی نگرانی میں طے پاتا۔ اور اگر وہ حکم حدیث میں بھی نہ ہوتا، تو تمام حضرات شرعی حدود کے مطابق اس نو پیش آمدہ مسئلہ کی نظائر وامثال پر تدبر کر کے اجتہاد فرماتے، اگر سب کی رائے متحد وموافق ہوتی تو یہ حکم اجماع صحابہ کی روشنی میں متفق علیہ ہوتا اور اگر کسی کی رائے مختلف ہو جاتی تو حکم بھی اختلافی ہوتا، لیکن اختلاف کرنے والے صحابی کو اپنے اعتماد کے مطابق یہ اختیار رہتا کہ وہ اس کو اپنا قول یا مذہب یا فتویٰ قرار دے، یہ فقہ اسلامی کے ارتقاء کی ابتدائی منزل تھی۔

(۴) خیر القرون کے فقہی مذاہب ومسالک:

چوں کہ اجتہادی مسائل میں اختلافِ رائے ایک فطری بات تھی اور غالباً اس میں بعد والوں کے لیے یہ درس ہو کہ اختلاف رائے کے باوجود شریعت کا اتباع ممکن ہے، چناں چہ اسی کے نتیجہ میں بہت سے صحابہ کے اپنے اپنے مذاہب منظرِ عام پر آئے مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود کا مذہب، حضرت ابنِ عمر کا مذہب اور حضرت عائشہ کا مذہب، یعنی اُس دور کے جدید مسائل میں ان حضرات کے مسالک صحابہ میں مشہور ومعروف تھے۔ پھر بعد میں فقہائے تابعین نے اپنے پیش روؤں کے طرزِ عمل کو سامنے رکھ کر قرآن وسنت سے بے شمار احکامات کا استنباط کیا، جن میں سرفہرست مدینہ منورہ کے وہ سات فقہا ہیں جو اہل علم کے نزدیک محتاجِ تعارف نہیں، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ۱ر سعید بن مسیب، ۲ر عروہ بن زبیر، ۳ر قاسم بن محمد، ۴ر خارجہ بن زید، ۵ر ابوبکر بن عبدالرحمان، ۶ر سلیمان بن یسار، ۷ر عبیداللہ بن عبداللہ۔ اور مدینہ منورہ کے علاوہ، مکہ مکرمہ، دمشق، کوفہ اور بصرہ میں فقہاء کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ جن کے پاس مسائل فقہیہ کی تخریج کے لیے اپنے اپنے اصول وآراء اور نظریات تھے۔ البتہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں، اہل فن میں اس بارے میں دو بنیادی رائیں اور نظریات پائے جاتے تھے، ایک یہ کہ حدیث کے ظاہر سے استدلال کرنا زیادہ بہتر ہے۔ دوسرا یہ کہ ظاہرِ حدیث کے ساتھ اس کے درایتی پہلو پر بھی گہری نظر رکھ کر استدلال کرنا زیادہ مفید ہے: اس نظریہ کے حاملین کو "فقہائے اہل رائے" کہا جاتا تھا۔

(۵) دورِ حاضر میں رائج مسالک اَربعہ:

ابھی دوسری صدی ختم ہونے کو تھی کہ علمائے فقہ کی ایک بڑی تعداد ظاہر ہوئی جنھوں نے اس فن کو مزید تر اشا نکھارا اور مزید براں ایسے باکمال افراد تیار کر دیئے جو ان کے مشن کو آگے بڑھاتے رہے چناں چہ ان شاگردوں نے اپنے اپنے اساتذہ ومشائخ کے مذاہب کو تحریری شکل دیں ان پر کتابیں تصنیف کیں، اس طرح یہ مذاہب عوام تک پہونچے اور اپنے اپنے علاقوں میں مقبولیت پائیں۔ اسی دور کے ائمہ فقہ میں ائمہ اربعہ کا بھی شمار ہے۔ جن کے جلیل القدر

شاگردوں نے اپنے اساتذہ کرام کے مذاہب پر کتابیں تصنیف کیں اور ان کے اختلافات نے دھڑوں کو مزید وسعت بخشی؛ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عام مسلمانوں میں ان تحریر کردہ مذاہب کو خصوصی مقبولیت ملتی چلی گئی، تا آں کہ امت مسلمہ اس وقت سے آج تک ان ائمہ اربعہ کے مسالک کی بڑے اعتماد کے ساتھ تقلید کر رہی ہے۔

☆ائمہ اربعہ کا مختصر تعارف:

(۱) امام اعظم ابوحنیفہؒ: فقہ اسلامی کے جلیل القدر امام اعظم، دوسری صدی کے مشہور تابعی ہیں آپ کا اسم گرامی، نعمان بن ثابت ہے آپ سن ۸۰ھ تا ۱۵۰ھ بقید حیات رہے۔

جیسا کہ پچھلی کی سطروں میں گزرا کہ فقہا کے مابین استدلال کے سلسلہ میں دو قسم کے نظریات پائے جاتے تھے بعض حدیث کے ظاہر سے استدلال کے قائل تھے اور بعض ظاہر حدیث کے ساتھ اس کے درایتی پہلو کو بھی مدنظر رکھتے تھے۔

حضرت امام صاحبؒ اسی آخر الذکر نظریہ کے حامل تھے اسی لیے آپ کی قوت استدلال اتنی ٹھوس تھی کہ آپ لوہے کے کھمبے کو سونے کا ثابت کر سکتے تھے اور معترض کو تسلیم کرنا پڑتا۔

آپ کا مسلک، مسلک حنفی کے نام سے معروف ہی نہیں بل کہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں سب مسالک سے زیادہ مقبول اور رائج العمل ہے۔

تلامذہ: آپ کے تلامذہ بے شمار ہیں جن میں چند قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) امام ابو یوسفؒ۔ (۲) امام محمد بن حسن شیبانیؒ (۳) امام زفر بن ہذیلؒ۔

مذہب حنفی کی چند معرکۃ الآراء کتابیں:

(۱) الجامع الکبیر (۲) الجامع الصغیر (۳) السیر الکبیر (۴) السیر الصغیر

(۵) الزیادات (۶) المبسوط (۷) کتب النوادر۔

یہ سب امام محمد کی تصنیف کردہ ہیں۔

(۸) بدائع الصنائع۔علامہ کاسانی کی (۹) رد المحتار (علامہ ابن عابدین کی)

(۱۰) کتاب الکافی (۱۱) تحفۃ الفقہاء (علاء الدین السمرقندی)

(۱۲) الھدایہ شرح البدایہ (ابوبکر المرغینانی)

(۲) امام مالک ابن انسؒ:

آپ کا نام گرامی: مالک ابن انس ہے، آپ امام دار الہجرت کے لقب سے مشہور ہیں۔ سن ۹۳ھ سے ۱۷۹ھ تک بقید حیات رہے۔ آپ کے اصولِ اجتہاد میں۔ دلائل شرعیہ کتاب وسنت اجماع اور قیاس کے علاوہ

تعامل اہل مدینہ بھی پیش نظر ہے۔

تلامذہ : آپ سے استفادہ کرنے والوں میں۔عبدالرحمن بن قاسم مصری،عبداللہ بن وہب ، اشہب ابن عبدالعزیز،عبداللہ بن عبدالحکم قابل ذکر ہیں۔

آپ کا مسلک : مسلک مالکی کے نام سے متعارف ہے جو دنیا کے مختلف خطوں میں رائج ہے۔مثلا مغرب عربی،افریقہ،خلیج عرب وغیرہ۔

فقہ مالکی پر چند اہم کتابیں:

(۱)المؤطا　(۲)بدایۃ المجتہد(ابن رشد القرطبی)

(۳)الذخیرۃ　(۴)مواھب الجلیل(محمد ابن محمد المغربی)

(۵)حاشیۃ الدسوقی　(۶)المدونۃ الکبری(سعید ابن حبیب التنوخی)

(۳)امام شافعیؒ:

آپ کا نام گرامی : محمد بن ادریس الشافعی ہے۔آپ سن ۱۵۰ھ سے ۲۰۴ھ تک بقید حیات رہے۔آپ کے اساتذہ میں حضرت امام مالک ابن انسؒ بھی ہیں۔

آپ کا مسلک مسلک شافعی کہلاتا ہے،اس مذہب کی تقلید کرنے والے آج کل مصر،عراق،شام،انڈونیشیا، وغیرہ ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

تلامذہ : آپ کے چند مشہور تلامذہ یہ ہیں،امام یوسف بن یحی بویطی،امام اسماعیل مزنی،امام ربیع بن سلیمان مرادی،حرملہ ابن یحیٰ۔

فقہ شافعی پر کچھ اہم کتابیں:

(۱)الام (۲)الرسالۃ　(۳)روضۃ الطالبین

(۴)فتح العزیز شرح الوجیز (۵)المجموع(یحی ابن شرف النووی)

(۶)المھذب(ابو اسحاق الشیرازی)(۷)تحفۃ المحتاج لابن حجر الھیثمی

(۸)تحفۃ المحتاج لشرح المنھاج(احمد ابن حجر الھیثمی)

(۴)امام احمد ابن حنبلؒ:

آپ کا نام گرامی : احمد بن حنبل ہے۔آپ ۱۶۴ھ سے ۲۴۱ تک،بقید حیات رہے۔آپ کے مسلک کا نام مذہب حنبلی ہے،آپ کے متبعین کو حنابلہ کہا جاتا ہے۔

اس مذہب کی تقلید کرنے والے آج کل نجد،خلیج عرب کے بعض ممالک اور مصر وغیرہ میں موجود ہیں۔

تلامذہ : آپ سے علمی فیض حاصل کرنے والے چند مشہور شاگرد یہ ہیں: صالح بن امام احمد،ابوبکر اثرم،

امام مروزی، احمد بن محمد، ابراہیم حربی۔

مسلک حنبلی کی چند اہم کتابیں:

(۱) مختصر الخرقی　(۲) المغنی لابن قدامہ　(۳) الروض المربع

(۴) الفروع لابن مفلح　(۵) کشاف القناع (منصور ابن یونس البھوطی)

(۶) الشرح الکبیر علی متن المقنع (شمس الدین عبدالرحمن ابن قدامہ)

اخیر میں دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان فقہائے عظام کی تربت پر اپنی رحمتوں کی بارش برساتا رہے۔ آج دنیائے اسلام ان کی عظمتوں، بلندیوں اور عرق ریزیوں کو دست بستہ ہو کر سلام عقیدت پیش کرتی ہے کہ انہوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح کتاب وسنت کے پھولوں سے احکام اسلامیہ کا رس چوس چوس کر امت کے سامنے پیش کر دیا۔

الفقہ العام پر عصری اسلوب میں لکھی گئی چند کتابیں:

الاحوال الشخصية (مصطفی السباعی)　الفقه الاسلامی و ادلته (وهبة الزحیلی)

نظرية الضرورة الشرعية (وهبة الزحیلی)　فقه الزكاة (يوسف القرضاوی)

فتاوی المعاصرة (يوسف القرضاوی)　الموسوعة الفقهية (جماعة من العلماء)

فصول فی الفقه الاسلامی العام (محمد فوزی)　الشركات فی الفقه الاسلامی (علی الخفيف)

آثار الحرب فی الفقه الاسلام (وهبة الزحيلی)　التشريع فی الجنائی فی الاسلام (عبدالقادر العودة)

الاسلام و العلاقات الدولية فی السلم و الحرب (محمد شلتوت)

التعبير عن الارادة فی الفقه السلامی (وحيد الدين سوار)

الفقه الاسلامی فی ثوبه الجديد (مصطفی الزرقاء)

اردو مصادر و مراجع:

بہشتی زیور (حضرت تھانوی)　فقہی مقالات (مولانا تقی صاحب)

عمدۃ الفقہ (مولانا زوار حسین صاحب)　علم الفقہ (مولانا عبدالشکور صاحب)

جواہر الفقہ (مفتی شفیع صاحب)　محاضرات فقہ (محمود احمد غازی)

اسلامی فقہ (مولانا مجیب اللہ ندوی)　فقہ اسلامی، تعارف اور تاریخ (فہیم اختر ندوی)

نوادر الفقہ (مولانا رفیع عثمانی)　اسلام اور جدید معیشت و تجارت (مفتی تقی صاحب)

غرر کی صورتیں (مولانا اعجاز صمدانی)　جدید فقہی مسائل (مولانا خالد سیف اللہ)

مباحث فقہیہ (قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ)　مسائل رفعت (مولانا رفعت علی صاحب)

مسائل سود (مفتی حبیب الرحمن خیر آبادی)　مسئلہ سود (مفتی شفیع صاحب)

جدید فقہی مباحث (فقہ اکیڈمی دہلی)　قاموس الفقہ (خالد سیف اللہ)

دین کی باتیں (مقالہ حضرت تھانوی)　معلم الحجاج (سعید احمد صاحب)

جنات کے حالات و احکام (بدرالدین شبلی)　ایضاح النوادر (مفتی شبیر احمد)

ایضاح المناسک (مفتی شبیر احمد)　　الحیلۃ الناجزہ (حضرت تھانوی) ۱۴۳۰ھ
غرر اور اس کے اثرات (مولانا اعجاز صمدانی)　　اسلامی قانون واجارہ عصر حاضر میں (مولانا جنید عثمانی)
آپ کے مسائل اور ان کا حل (مولانا یوسف لدھیانوی)　شرکت ومضاربت عصر حاضر میں (مولانا عمران صاحب عثمانی)

فجزاھم اللّٰہ عنا وعن جمیع أھل الإسلام

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن　　خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

قواعدِ فقہ ایک تعارف

(مفتی) محمد جعفر ملی رحمانی
دار الافتاء: جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

اسلام ایک دائمی وابدی دین ہے، نزولِ قرآن اور ورودِ حدیث کے مبارک زمانے سے لے کر قیامت تک، تمام پیش آنے والے مسائل کا حل اس میں موجود ہے، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قرآنی علوم میں مہارت وبصیرت ہو، ذخائرِ احادیث پر درایت کے ساتھ گہری نظر ہو، اور فقہائے کرام نے دین کے عمومی مزاج ومذاق کو سامنے رکھ کر جن اصول وقواعد اور کتبِ فقہ کو مرتب ومدون کیا، اس سے پوری واقفیت ہو، اگر کسی عالم، فقیہ اور قاضی ومفتی میں یہ تین چیزیں جمع ہوں تو بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے، کہ وہ ہر نئے پیش آنے والے مسئلہ کا حل شریعتِ اسلامی کے عین مطابق پیش کرسکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ احکامِ اسلام کا اولین مصدر کتاب اللہ ہے، بعدہ ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ہیں، پھر اجماعِ امت وقیاس ہیں۔

اگر کسی مسئلہ کا حل ان تینوں مصادر میں موجود نہ ہو تو اسے قواعدِ فقہیہ کی روشنی میں ہی حل کیا جاتا ہے، جس سے ان کی اہمیت، افادیت وضرورت ظاہر وعیاں ہوتی ہے۔

قواعدِ فقہیہ کا علم، علومِ شریعت میں اپنا ایک عظیم مقام رکھتا ہے، قواعدِ فقہیہ پر جس شخص کی بھی نگاہ ہوگی وہ تمام علمِ فقہ کا احاطہ کرلے گا، اور جسے علمِ فقہ عطا کیا گیا اسے خیرِ کثیر مل گیا، کیوں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ''۔ (اللہ رب العزت جس سے کوئی بھلائی چاہتے ہیں اسے دین کی سمجھ (علمِ فقہ) عطا فرماتے ہیں)۔　(رواہ احمد فی مسندہ: ۲/۹۴)

متقدمین ومتاخرین علماء نے علمِ قواعدِ فقہ کی جانب خاص توجہ دی، کیوں کہ مذاہبِ فقہاء کے متعدد ہونے، ان کے طریقہائے استنباط کے الگ الگ ہونے، اور مسائلِ فقہیہ کی کثرت وتنوع اس بات کی متقاضی

تھی کہ کچھ ایسے قواعدِ کلیہ اور اصولِ عامہ وضع کیے جائیں جو ان بے شمار مسائلِ مختلفہ کو یکجا کرسکیں، تا کہ حکمِ شرعی کا طالب الگ الگ جزئیات اور مختلف مسائل کے احکام میں سرگرداں وحیران نہ ہو، چنانچہ کبارِ فقہاء کرام نے ائمہ مجتہدین کے تمام مسائلِ اجتہادیہ، اور ان کے اصول استنباط کو سامنے رکھ کر ان علل کا سراغ لگالیا جن کی بنیادوں پر ان حضرات نے استنباط فرمایا ہے، اولاً ان حضرات نے ان احکامِ متشابہ کی انواع کا استقصاء کیا جو مسائلِ مختلفہ کو حاوی اور جامع ہیں، پھر شبیہ کو اس کی شبیہ کے ساتھ اور نظیر کو اس کی نظیر کے ساتھ جمع فرما کر اسے کسی ایک ضابطہ کے تحت لے آئیں، یہی وہ ضابطہ اور قاعدہ ہے جو تمام مسائلِ متحدہ کو ایک حکم کے تحت جمع کر کے، انہیں ایک لڑی میں پرو کر رکھ دیتا ہے۔

حضرات فقہاء کرام کا یہی عظیم الشان، جلیل القدر عمل، احکامِ فقہیہ کی علل کے استنباط واستخراج کے لیے اساسِ سلیم، اور قیاسِ صحیح کی حیثیت رکھتا ہے۔

علماء مالکیہ کے ایک بڑے عالم شہاب الدین قَرَافی (جن کی فقہ اور اصولِ فقہ پر بہت سی کتابیں ہیں) فرماتے ہیں: شریعتِ محمدیہ کے مسائل، اصول اور فروع پر مشتمل ہیں، اور اس کے اصول کی دو قسمیں ہیں:

(۱) **اصولِ فقہ:** وہ قواعدِ احکام جو بالخصوص عربی الفاظ کی پیداوار ہیں، مثلاً امر کا وجوب کے لیے ہونا، اور نہی کا تحریم کے لیے۔ عام، خاص، مشترک، اور مؤول وغیرہ۔

(۲) **قواعدِ کلیہ فقہیہ:** یہ وہ قواعدِ فقہیہ ہیں جو اسرار و حکمِ شرع پر مشتمل ہیں، اور ہر قاعدہ اپنے اندر بے شمار و بے حساب مسائلِ شریعت کو سموئے ہوئے ہے۔

قواعدِ فقہیہ کا مقام

قواعدِ فقہ کو علمِ فقہ میں ایک بلند و بالا مقام حاصل ہے، جو شخص جس قدر قواعد کا احاطہ کرے گا اسی قدر اس کی عظمت اور شرافت میں اضافہ ہوگا، قواعد سے رونقِ فقہ نہ صرف بڑھے گی، بل کہ علمِ فقہ کی معرفت حاصل ہوگی، اور فتویٰ دینے واحکام بتلانے کی راہیں منکشف ہوں گی۔

اگر کسی شخص کے سامنے محض فقہ کی جزئیات ہوں اور قواعد نہ ہوں، اور انہیں جزئیات پر مسائل کا استنباط وتخریج کرے تو مسائل وفروع باہم مختلف ایک دوسرے کی نقیض بن کر سامنے آئیں گے، نتیجۃً وہ تنگ دل و مایوس ہوگا، اور بے شمار و بے انتہا جزئیات کو یاد کرنے بیٹھ جائے گا، جب کہ جزئیات اتنی ہیں کہ اگر پوری عمر بھی اس کے یاد کرنے میں لگادی جائے تو عمر ختم ہوجائے گی، مگر تمام جزئیات یاد نہ ہوسکیں گی، اس کے برخلاف قواعد محدود ہیں، اگر کوئی شخص اس کے حفظ وضبط کا اہتمام کرلیں تو وہ اکثر جزئیات کے یاد کرنے سے بے نیاز ہوجائے

گا، کیوں کہ جزئیات قواعد میں مندرج ہیں۔

قواعدِ فقہیہ کے معنی اور اس کی تعریف:

قواعد، قاعدۃ کی جمع ہے، اور قاعدہ کے معنی بنیاد کے ہے، ارشادِ ربانی ہے: ”وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمَاعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ“۔

ترجمہ: اور جب کہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی، اور اسماعیل بھی، اے ہمارے پروردگار، ہم سے قبول فرمایئے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۲۷)

قواعدِ فقہ کو، قواعد اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بناءِ فقہ کی بنیاد ہیں۔

قاعدہ کے معنی لغوی:

قاعدہ کے ایک معنی ضابطہ ہے، اور ضابطہ اس امرِ کلی کو کہا جاتا ہے، جو جزئیات پر منطبق ہو، مثلاً یہ ضابطہ ”کُلُّ اُذُوْنٍ وَلُوْدٌ وَکُلُّ صَمُوْخٍ بَیُوْضٌ“۔ کہ جس حیوان کا خارجی کان ہو، اس کی نسل بطریقِ ولادت بڑھتی ہے، اور جس کا خارجی کان نہ ہو بلکہ محض کان کا سوراخ ہو، اس کی نسل بطریقِ انڈا بڑھتی ہے (جیسے پرندہ، اور مچھلی وغیرہ)۔ (المعجم الوسیط: ۲/۵۵۵)

قاعدہ کے معنی اصطلاحی:

قاعدہ کے معنی اصطلاحی میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، اور اس اختلاف کی وجہ مفہوم قاعدہ میں اختلاف ہے، کہ قاعدہ، قضیہ کلیہ ہے یا قضیہ اغلبیہ واکثریہ ہے؟ جن لوگوں کے نزدیک قاعدہ قضیہ کلیہ ہے، انہوں نے اس کی تعریف ایسے الفاظ سے کی جو اس کے قضیہ کلیہ ہونے پر دال ہوں۔ مثلاً

(۱) اَلْقَاعِدَۃُ قَضِیَّۃٌ کُلِّیَّۃٌ مُنْطَبِقَۃٌ عَلٰی جَمِیْعِ جُزْئِیَّاتِھَا۔ قاعدہ وہ قضیہ کلیہ ہے جو اپنی تمام جزئیات پر منطبق ہو۔ (التعریفات للجرجانی: ص ۱۷۷)

(۲) قَضِیَّۃٌ کُلِّیَّۃٌ یَتَعَرَّفُ مِنْھَا اَحْکَامُ جُزْئِیَّاتِھَا۔

قاعدہ وہ قضیہ کلیہ ہے جس سے اس کی جزئیات کے احکام معلوم ہوں۔

(۳) حُکْمٌ کُلِّیٌّ یَنْطَبِقُ عَلٰی جَمِیْعِ جُزْئِیَّاتِہٖ یَتَعَرَّفُ اَحْکَامُھَا مِنْہُ۔

قاعدہ وہ حکمِ کلی ہے جو اپنی تمام جزئیات پر منطبق ہو، تاکہ اس حکمِ کلی کے ذریعہ اس کی تمام جزئیات کے احکام معلوم ہوں۔

ان تینوں تعریفات کی عبارتیں گرچہ الگ الگ ہیں، مگر معنی ومطلب ایک ہی ہے، کہ قاعدہ ایسا حکم، یا امرِ کلی، یا

قضیہ کلیہ ہے، جس سے اُن جزئیات کے احکام معلوم ہوتے ہیں، جو اس [illegible] تحت مندرج وداخل ہیں، اور یہ قاعدہ ان جزئیات پر منطبق ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے قاعدہ کی مستثنیات کی جانب نظر کی، انہوں نے قاعدہ کو قضیہ اغلبیہ واکثریہ قرار دے کر اس کی ان الفاظ سے تعریف کی، جو اس کے اغلبی واکثری ہونے پر دال ہیں۔

"اَلْقَاعِدَۃُ حُکْمٌ اَکْثَرِیٌّ لَا کُلِّیٌّ، یَنْطَبِقُ عَلٰی اَکْثَرِ جُزْئِیَاتِہٖ لِتُعْرَفَ اَحْکَامُہَا مِنْہُ"۔

قاعدہ ایسا حکم اکثری ہوتا ہے نہ کہ کلی جو اپنی اکثر جزئیات پر منطبق ہوتا ہے، تا کہ اس کے ذریعہ ان جزئیات کے احکام معلوم ہوں۔

مگر اتنی بات تو صاف ہے کہ قاعدہ کی اصطلاحی تعریف میں فقہاء کے اس اختلاف کی وجہ سے ان کی کلیت ختم نہیں ہوتی، جیسا کہ امام شاطبیؒ اپنی کتاب "موافقات" میں رقم طراز ہیں: "جب قواعد کا قواعدِ کلیہ ہونا ثابت ہو گیا تو بعض جزئیات کا اس کے مقتضی وحکم سے تخلف، انہیں ان کی کلیت سے خارج نہیں کرتا، نیز غالب اکثری بنگاہِ شریعت اعتبارِ قطعی رکھتا ہے"۔

قواعدِ فقہیہ اور قواعدِ اصولیہ کے مابین فرق:

علمِ فقہ اور علمِ اصولِ فقہ کے مابین چولی دامن کا ساتھ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات آدمی ان دونوں کو ایک ہی یقین کر لیتا ہے، یہ بات معقول بھی ہے، کیوں کہ ان میں سے ایک اصل اور دوسرا اس کی فرع ہے، جیسے درخت اور اس کی شاخیں کہ ان دونوں میں وحدت ہے، چنانچہ جو شخص اصولی ہوگا وہ فقیہ بھی ہوگا، اور جو فقیہ ہوگا وہ اصولی بھی ہوگا، فقیہ ہو اور اصولی نہ ہو ایسا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ فقیہ وہ ہے جو استنباطِ مسائل کی قدرت رکھے، اور استنباطِ مسائل کی قدرت اصولوں کو جانے بغیر ممکن نہیں ہے۔

علمِ فقہ اور علمِ اصولِ فقہ میں اس اتحاد کے باوجود یہ دونوں علم ایک دوسرے سے الگ الگ اور مستقل حیثیت کے مالک ہیں، کیوں کہ دونوں کا موضوع، دونوں سے استمداد، دونوں کا ثمرہ، اور دونوں کو پڑھنے کی غرض وغایت جدا جدا ہے، مثلاً علمِ اصولِ فقہ کا موضوع، اجمالی دلائلِ فقہ اور احکام ہیں۔ اور علمِ فقہ کا موضوع، افعالِ مکلفین، یعنی مکلف سے سرزد ہونے والے ہر فعل کا حکمِ شرعی کیا ہے؟ پھر قواعدِ علمِ اصولِ فقہ، قواعدِ علمِ فقہ سے الگ ہیں۔

علمِ اصولِ فقہ اور علمِ فقہ دونوں کے قواعد میں فرق وتمیز سب سے پہلے امام شہاب الدین قرافی نے کیا۔ جیسا کہ آپ اپنی کتاب "الفروق" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں: "شریعتِ محمدیہ اصول وفروع پر مشتمل ہے اور اس کے اصول کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اصولِ فقہ: جس میں درحقیقت عربی الفاظ سے پیدا ہونے والے قواعد ہیں ------- الخ۔

(۲) قواعدِ کلیہ فقہیہ: جو اسرار و حِکَمِ شرع پر مشتمل ہیں ------------ الخ۔

ایک دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں، کہ تمام قواعد، اصولِ فقہ میں مستوعب نہیں، بلکہ ائمۂ فتویٰ وفقہاء کے نزدیک شریعتِ اسلامی کے اور بھی بہت سے قواعد ہیں، جو کتبِ اصول میں بالکل ہی نہیں پائے جاتے۔

قواعدِ اصول وقواعدِ فقہ کے مابین وجوہِ فرق:

(۱) قواعد اصول کا تعلق، غالب احوال میں الفاظ اور احکام پر ان کی دلالتوں سے ہوتا ہے، جب کہ قواعد فقہ کا تعلق براہ راست احکام سے ہوتا ہے۔

(۲) قواعد اصول اس لیے وضع کیے گئے تاکہ مجتہد طریقہائے استنباط واستدلال اور ادلۂ اجمالیہ سے، احکامِ کلیہ کے استخراج میں مناہجِ بحث ونظر کو یاد رکھ سکیں، جب کہ قواعد فقہ کو اس لیے وضع کیا گیا کہ ابواب مختلفہ کے مسائل کو حکمِ واحد کے تحت مربوط کیا جاسکے۔

(۳) قواعد اصول پر احکام اجمالیہ مبنی ہوتے ہیں، اور ان احکام اجمالیہ کے واسطے سے فقیہ دلائل تفصیلیہ کے ذریعہ مسائل جزئیہ کے احکام کا استنباط کرتا ہے، جب کہ حوادث متشابہ کے احکام، خود ان قواعد سے معلل ہوتے ہیں، اور انہیں پر موقوف ہوتے ہیں، اور یہی قواعد ان کی اصل وبنیاد قرار پاتے ہیں۔

(۴) قواعد اصول، ابواب اصول، مواضع اصول اور مسائل اصول میں محصور ہوتے ہیں، جب کہ قواعد فقہ محصور ومحدود نہیں، بلکہ وہ بے شمار ہیں اور فقہ کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

قواعدِ فقہ پڑھنے کا فائدہ:

قواعدِ فقہ پڑھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے، کہ مسائلِ فقہیہ کو ان کے احکام کے ساتھ یاد رکھنا آسان ہوجاتا ہے، جیسا کہ امام قَرافی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ''مَنْ ضَبَطَ الْفِقْهَ بِقَوَاعِدِه اِسْتَغْنیٰ عَنْ حِفْظِ اَكْثَرِ الْجُزْئِيَّاتِ لِانْدِرَاجِهَا فِي الْكُلِّيَّاتِ''۔

جو شخص قواعد کے ساتھ فقہ کو یاد کرلے، وہ اکثر جزئیات کو یاد کرنے سے بے نیاز ہوجاتا ہے، کیوں کہ جزئیات کلیات میں مندرج ہوتی ہیں، درآنحالانکہ جزئیاتِ فقہ بے شمار ہونے کی وجہ سے، انسان ان کے یاد رکھنے پر قادر نہیں، اور قواعد کا یاد کرنا اس کے بس میں ہے۔

(۲) قواعد فقہ کے پڑھنے سے ایک عالم میں ایسا ملکۂ فقہیہ پیدا ہوتا ہے، جس سے وہ باآسانی مسائلِ

جدیدہ کے احکامِ شرعیہ متعین کرسکتا ہے، اس لیے بعض علماء نے قواعد فقہ کے پڑھنے کو قاضی اور مفتی کے لیے فرضِ عین اور دوسروں کے لیے فرضِ کفایہ قرار دیا۔

قواعدِ فقہیہ اور ان کے مراتب:

قواعد نہ تو ایک ہی نوع کے ہیں، اور نہ ہی درجہ ورتبہ میں یکساں ہیں، بلکہ قواعد کی کئی قسمیں اور مراتب ہیں، اور اس تنوع وتفاوت مراتب کے دو بنیادی سبب ہیں۔

(۱) کبھی قاعدہ، اپنے ماتحت تمام مسائل وفروع کو شامل ہوتا ہے۔

(۲) کبھی مضمون قاعدہ متفق علیہ ہوتا ہے یا مختلف فیہ۔

سبب اول کے لحاظ سے قواعد فقہیہ کے تین مراتب ہیں:

مرتبۂ اولیٰ: قواعد کلیہ کبریٰ (جن کو ہم قواعد اساسیہ بھی کہتے ہیں) یہ وہ قواعد ہیں کہ ان کے تحت، فقہ کے بڑے بڑے ابواب، اس کے مسائل، اور افعال مکلفین داخل ہیں (گرچہ تمام افعال نہ ہی)، یہ چھ قاعدے ہیں۔

(۱) ''إنّما الأعمالُ بالنّيّات'' یا ''الأمورُ بمقاصدها''۔[1]

احکام امور مقاصد کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔

(۲) ''اليقينُ لايزولُ بالشّكّ'' یا ''اليقينُ لايرتفعُ بالشّكّ'' یقین شک سے ختم نہیں ہوتا۔

(۳) ''المشقّةُ تجلبُ التّيسير'' ۔مشقت آسانی پیدا کرتی ہے۔

(۴) ''لاضررَ ولاضرار'' یا ''الضّررُ يزالُ'' ۔ضرر وتکلیف کو زائل کیا جاتا ہے۔

(۵) ''العادةُ مُحَكَّمَةٌ''۔

عادت فیصلہ کرنے والی ہوتی ہے، یعنی اثبات حکم شرعی میں عادت کو حَکَم بنایا جاتا ہے۔

(۶) ''إعمالُ الكلامِ أولى من إهماله'' ۔کلام کو کارآمد بنانا اسے بے کار کردینے سے بہتر ہے۔

مرتبۂ ثانیہ: ایسے قواعد کہ ان کے تحت بھی مختلف ابوابِ فقہ کے بے شمار مسائل داخل ہیں، مگر ان میں وہ وسعت وشمولیت نہیں جو مرتبۂ اولیٰ میں ہے، اس طرح کے قواعد کی دو قسمیں ہیں۔

قسم اول: وہ قواعد جو قواعد کبریٰ کے تحت داخل ہیں اور انہیں پر مرتب ہیں۔

قسم دوم: وہ قواعد جو قواعد کبریٰ میں سے کسی کے تحت داخل نہیں۔

مثال قسم اول: ''الضّروراتُ تبيحُ المحظوراتِ'' ۔ضرورتیں ممنوعات شرعیہ کو مباح قرار دیتی ہیں۔

یہ قاعدہ قواعد کلیہ کبریٰ میں سے قاعدہ "اَلْمَشَقَّةُ تَجْلِبُ التَّيْسِيْرَ" پر مبنی ہے۔ اور قاعدہ "لَایُنکَرُ تَغَیُّرُ الْاَحْکَامِ الْاِجْتِهَادِيَّةِ بِتَغَیُّرِ الْاَزْمَانِ" ۔ یہ قاعدہ قواعد کلیہ کبریٰ میں سے "اَلْعَادَةُ مُحَكَّمَةٌ" کے تحت داخل ہے۔

مثال قسم دوم: قاعدہ: "اَلْاِجْتِهَادُ لَا یُنْقَضُ بِالْاِجْتِهَادِ اَوْ بِمِثْلِهٖ" ۔ اجتہاد، اجتہاد سے نہیں ٹوٹتا۔

اور قاعدہ: "اَلتَّصَرُّفُ عَلَی الرَّعِيَّةِ مَنُوْطٌ بِالْمَصْلَحَةِ" ۔ رعایہ کے حق میں تصرف ان کی مصلحت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔

مرتبۂ ثالثہ: وہ قواعد جو عام نہیں بلکہ وہ کسی باب یا جزء باب کے ساتھ مختص ہیں، انہیں ضوابط کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ امام عبدالوہاب ابن السبکیؒ فرماتے ہیں: "فَالْقَاعِدَةُ الْاَمْرُ الْكُلِّيُّ الَّذِيْ يَنْطَبِقُ عَلَيْهِ جُزْئِيَّاتٌ كَثِيْرَةٌ تُفْهَمُ اَحْكَامُهَا مِنْهَا" ۔ قاعدہ وہ حکم کلی ہے جس پر بہت سی جزئیات منطبق ہوں، اور اس سے اُن کے احکام مفہوم ہوں، اور جس قاعدہ سے کسی ایک باب کی جزئیات یا ایک ہی طرح کی بہت سی صورتوں کو منظم کرنا مقصود ہو اسے ضابطہ کہا جاتا ہے۔

"وَالْغَالِبُ فِيْمَا قُصِدَ بِبَابٍ وَقُصِدَ بِهٖ نَظْمُ صُوَرٍ مُتَشَابِهَةٍ اَنْ یُسَمّٰی ضَابِطًا" ۔

(الأشباہ والنظائر: ۱/۱۱)

مثال ضابطہ: "اِنَّ الْمُحْرِمَ اِذَا اَخَّرَ النُّسُكَ عَنِ الْوَقْتِ الْمُوَقَّتِ لَهٗ اَوْ قَدَّمَهٗ لَزِمَهٗ دَمٌ" ۔ جب محرم کسی ایسے واجب کو مؤخر و مقدم کرے جس کے لیے شریعت نے وقت متعین کر دیا، تو اس پر دم لازم ہوگا۔

سبب ثانی (کبھی مضمون قاعدہ متفق علیہ ہوتا ہے، یا مختلف فیہ) کے لحاظ سے باعتبار مراتب قواعد کی دو قسمیں ہوں گی:

مرتبۂ اولیٰ: وہ قواعد جن کے مضمون پر جمیع فقہاء و مختلف مذاہب متفق ہوں، اس مرتبہ کے قواعد میں تمام قواعد کلیہ کبریٰ اور دیگر اکثر قواعد داخل ہیں۔

مرتبۂ ثانیہ: وہ قواعد مذہبیہ جو کسی خاص مذہب کے ساتھ مختص ہوں، یا ایسے قواعد کہ ان کے مضمون پر بعض فقہاء ہی عمل کرتے ہوں، جب کہ وہ بھی ابواب مختلفہ کے بہت سے مسائل کو شامل ہوتے ہیں۔

مثلاً قاعدہ: "لَا حُجَّةَ مَعَ الْاِحْتِمَالِ النَّاشِئِ عَنْ دَلِيْلٍ" ۔

اس قاعدہ پر احناف و حنابلہ تو عمل کرتے ہیں مگر شافعیہ عمل نہیں کرتے۔

یا یہ قاعدہ: "اَلْاَصْلُ اَنَّ جَوَازَ الْبَيْعِ يَتْبَعُ الضَّمَانَ" ۔ جواز بیع ضمان کے تابع ہوتا ہے۔ اس پر

احناف عمل کرتے ہیں شوافع نہیں۔

شوافع فرماتے ہیں: ''جَوَازُ الْبَیعِ یَتْبَعُ الطَّھَارَۃَ''۔ جواز بیع طہارت کے تابع ہوتا ہے۔

قاعدہ اور ضابطہ کے مابین فرق:

اکثر فقہاء کرام لفظ قاعدہ بول کر ضابطہ کو اور ضابطہ بول کر قاعدہ کو مراد لیتے ہیں۔

مگر قاعدہ اور ضابطہ کے مابین دو بنیادی فرق ہیں:

(۱) قاعدہ مختلف ابواب کی بہت سی جزئیات کو جامع ہوتا ہے اور اسی کے ماتحت بے شمار مسائل فقہیہ داخل ہوتے ہیں۔ جب کہ ضابطہ، ابواب فقہ میں سے کسی ایک باب کے ساتھ مختص ہوتا ہے، اور صرف اسی باب کے مسائل اس ضابطہ کے ساتھ متعلّق ہوتے ہیں۔

(۲) عموماً قاعدہ کے مضمون پر جمیع مذاہب یا اکثر مذاہب متفق ہوتے ہیں، جب کہ ضابطہ مذہب معین کے ساتھ مختص ہوتا ہے۔

قواعدِ فقہیہ کے مصادر:

جتنے قواعد فقہیہ ہیں، ہر ایک کا کوئی نہ کوئی منشاء اور اساس ورود ہے، جسے ہم مصدر یا مأخذ قاعدہ کہتے ہیں۔

مصادرِ قواعد کی تین بنیادی قسمیں ہیں:

قسم اول: ایسے قواعد جن کا مصدر کتاب اللہ، اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

جن قواعد کا مصدر قرآن کریم ہے، وہ قواعد، انواعِ قواعد میں سب سے اعلیٰ واولیٰ ہے، کیوں کہ کتاب اللہ ہی اصل شریعت ہے، اور بقیہ تمام دلائل کا مرجع بھی وہی ہے۔

قرآن کریم کی بعض آیتیں جو بمنزلہ قواعد ہیں، اور بے شمار مسائل کو مستوعب وشامل ہیں، مثلاً:

(۱) فرمان خداوندی: وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔

ترجمہ: حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے۔ (سورۃ البقرۃ:۲۷۵)

اس آیت مبارکہ نے اپنے مختصر الفاظ کے باوجود بیوع کی تمام حلال وحرام قسموں کو جمع کرلیا، سوائے ان بیوع کے جو اس آیت سے مستثنیٰ ہیں۔

(۲) فرمانِ خداوندی: ''وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ''۔

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ۔ (سورۃ البقرۃ:۱۸۸)

یہ آیت کریمہ ہر اس غیر شرعی معاملہ اور تصرف کو حرام قرار دیتی ہے جو ہر اس طریقے سے لوگوں کے مال کھانے اور انہیں ضائع کرنے کا سبب بنتا ہے، مثلاً: چوری، غصب، مبیع یا ثمن کی جہالت، ایک دوسرے کو تکلیف دینا، دھوکہ دینا، اور ہر ایسا عقد و معاملہ جس میں غلط و باطل طریقہ سے لوگوں کا مال کھانا لازم آتا ہے۔

(۳) فرمان خداوندی: ''خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ''۔

ترجمہ: اور سرسری برتاؤ کو قبول کرلیا کیجیے اور نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجیے۔ اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جایا کیجیے۔

(سورۃ الاعراف:۱۹۹)

علامہ قرطبی وغیرہ فرماتے ہیں: یہ آیت مقدسہ تین کلموں یا تین جملوں سے مرکب ہے، مگر یہ شریعت کے تمام قواعد ماموراتِ و منہیات کو متضمن ہے۔

''خُذِ الْعَفْوَ'' اس جزء کے تحت قطع رحمی کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی، گناہ گاروں کے ساتھ عفو و درگزر، مومنوں کے ساتھ حسن سلوک اور دیگر حسن اخلاق کے احکام داخل ہیں۔

''وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ'' اس جزء کے تحت رشتہ ناطہ کو جوڑنا، حلال و حرام، نگاہوں کو نیچے رکھنا، اور اخروی زندگی کی تیاری کے احکام داخل ہیں۔

''وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ'' اس جزء کے تحت علم سے وابستگی پر تحریض، اہل ظلم سے اعراض، بے وقوفوں سے لڑنے بھڑنے سے اجتناب اور دیگر اخلاق حمیدہ اور افعال رشیدہ کے احکام داخل ہیں۔

یہ آیت تمام مکارم اخلاق کو جامع ہے۔ اسی لیے امام جعفر فرماتے ہیں: اللہ رب العزت نے اس آیت میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکارم اخلاق کا حکم فرمایا، پورے قرآن کریم میں مکارم اخلاق سے متعلق اس سے جامع کوئی آیت نہیں ہے۔

(۴) فرمان خداوندی: ''يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ''۔

ترجمہ: اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔ (سورۃ المائدۃ:۱)

آیت میں اللہ رب العزت نے عقود و معاملات کو پورا کرنے کا حکم بصیغۂ امر فرمایا، جو ہر عقد مشروع کو پورا کرنے اور ہر ایسی چیز کے احترام کا تقاضا کر رہا ہے، جس کا ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ التزام کیا کرتا ہے۔

(۵) فرمان خداوندی: ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ''۔

ترجمہ: سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے

گا۔(سورۃ الزلزال:۷،۸)

اوران جیسی دیگر آیتیں جوبطور قواعد کتاب اللہ میں مذکورو محفوظ ہیں۔

جس طرح بعض قرآنی آیات بطور قواعد کے ہیں،اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بعض فرامین بھی قواعد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف شرابوں کا حکم دریافت کیا گیا،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''کُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ''۔ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

یہ حدیث اپنے مختصر الفاظ کے باوجود اپنے اندر اس قدر جامعیت رکھتی ہے کہ ہر نشہ آور چیز کی حرمت کو ثابت کرتی ہے،خواہ وہ انگور سے بنی ہو،یا غیر انگور سے،سیال ہو یا جامد (جیسے بھنگ،چرس،گانجا وغیرہ) زمین سے اگتی ہو یا کسی حیوان سے حاصل ہوتی ہو۔یا پھر اس ترقی یافتہ دور میں مختلف کیمکلس وغیرہ سے بنائی جاتی ہو۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:''لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ''۔

یہ قاعدہ کلیہ کبریٰ ہے،یہ حدیث کسی کو ضرر پہونچانے یا تکلیف دینے کی تمام انواع واقسام اوراس کی صورتوں کو حرام قرار دیتی ہے،کیوں کہ حدیث میں''لا''نافیہ،مفید استغراقِ جنس ہے،گرچہ حدیث بطور خبر وارد ہے،مگر نہی کے معنی میں ہے۔تو حدیث کا معنی ومطلب یہ ہوگا کہ ہر ضرر وضرار کو چھوڑ دو۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:''اَلْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ اھـ۔ مسلمانوں پر اپنی شرطوں کا پاس ولحاظ لازم ہے۔(ابوداؤد:۵۰۶،ترمذی:۱/۲۵۱)۔

حدیث پاک کا یہ مطلب ہے کہ متعاقدین (معاملہ کرنے والے دو شخص یا اس سے زائد) باہم جن شرطوں پر راضی ہوں،ان پر ان شرطوں کا احترام واجب ہے۔سوائے ان شرطوں کے جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دیں۔

قسم ثانی: وہ قواعد جن کا مصدر منصوص نہیں ہے۔ان کی کئی ایک قسمیں ہیں:

۱/ (قسم اول) وہ قواعدِ فقہیہ جنکا مصدر اجماع ہے۔جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب ہے۔

مثلاً:(۱)''لَا اِجْتِهَادَ مَعَ النَّصِّ''۔نص کے ہوتے ہوئے کوئی اجتہاد اور قیاس قابل قبول نہیں۔

یہ قاعدہ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ جس مسئلہ کے حکم میں کتاب اللہ،یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اجماع امت کی کوئی صراحت موجود ہو تو اس کے حکم کو ثابت کرنے کے لئے اجتہاد کرنا حرام ہے،کیوں کہ اجتہاد کی ضرورت نص کی عدم موجودگی کی صورت میں ہوا کرتی ہے،جب نص موجود ہے تو قیاس کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہاں فہمِ نص اور دلالتِ نص میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

(۲) "اَلْاِجْتِہَادُ لَایُنْقَضُ بِمِثْلِہٖ" یا "بِالْاِجْتِہَادِ"۔ اجتہاد، اجتہاد سے نہیں ٹوٹتا۔ یہ بات متفق علیہ ہے کہ جب دعاوی وخصومات میں احکامِ اجتہادیہ کے ذریعہ ایک دفعہ فیصلہ کردیا گیا، اور وہ نافذ ہوگیا، تو اب اس فیصلہ کو اجتہادِ ثانی نہیں توڑ سکتا، کیونکہ اجتہادِ ثانی اجتہادِ اول سے اَولیٰ نہیں ہے۔ اور اگر اجتہادِ ثانی سے اجتہادِ اول ٹوٹ جائے، تو ثانی ثالث سے اور ثالث رابع سے ٹوٹتا جائے گا، اور احکام کو کوئی استقرار ودوام حاصل نہیں ہوگا۔

ہاں! جب اجتہاد، نصِ شرعی کے خلاف ہو، یا اجتہادِ صحیح کے طریق سے ہٹ کر ہو یا اس میں خطأ فاحش ہو تو اس صورت میں اجتہادِ ثانی اول کے لئے ناقض ہوگا۔

۲/ (قسم دوم) اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں:

قسمِ اول: وہ قواعدِ فقہیہ جن کا استنباط فقہائے کرام نے عام احکامِ شرعیہ سے کیا ہے، اور ان کے استنباط میں ان حضرات نے ان نصوص سے استدلال فرمایا ہے جو کتاب اللہ، سنت، اجماع اور معقول نصوص کو مشتمل ہیں۔

مثال (۱): قاعدہ: "اَلْاُمُوْرُ بِمَقَاصِدِھَا"۔ (کاموں کا حکم مقاصد کے اعتبار سے ہوتا ہے) کا استنباط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" سے ہے۔

مثال (۲): قاعدہ: "اَلْیَقِیْنُ لَایَزُوْلُ بِالشَّکِّ" کا استنباط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "اِذَاشَکَّ اَحَدُکُمْ فِیْ صَلَاتِہٖ فَلَمْ یَدْرِکَمْ صَلّٰی اَثَلَاثًا اَمْ اَرْبَعًا؟ فَلْیَطْرَحِ الشَّکَّ وَلْیَبْنِ عَلٰی مَا اسْتَیْقَنَ"۔ "مسلم شریف" (جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک واقع ہو اور یہ نہ جانتا ہو کہ کتنی رکعتیں پڑھی، تین یا چار، تو شک کو چھوڑ دے اور جتنی رکعتوں کے پڑھنے پر یقین ہو اسی پر بناء کرے)۔

مثال (۳): قاعدہ: "اَلْمَشَقَّۃُ تَجْلِبُ التَّیْسِیْرَ"۔ یہ قاعدہ رفعِ حرج رُخصِ شرعیہ کا قاعدہ مانا جاتا ہے، اس کی دلیلیں کتاب وسنت اور اجماع ومعقول میں بے شمار ہیں۔

مثال (۴): قاعدہ: "اَلْعَادَۃُ مُحَکَّمَۃٌ"۔ یہ قاعدہ اعتبارِ عرف اور جن مسائل میں کوئی نص نہیں، وہاں عرف کو حکم بنانے کا قاعدہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس کی دلیلیں بھی کتاب وسنت اور اجماع میں بے شمار ہیں۔ جیسے فرمان خداوندی:

"خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاھِلِیْنَ"۔

ترجمہ: سرسری برتاؤ کو قبول کرلیا کیجئے اور نیک کام کی تعلیم کردیا کیجئے اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہوجایا کیجئے۔

(سورۂ اعراف:۱۹۹)

اور ''وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''۔

ترجمہ: اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو۔(سورۂ نساء:۱۹)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ''خُذِيْ مَا يَكْفِيْكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوْفِ''۔

ترجمہ: تو اپنے شوہر کے مال میں سے اس قدر لے لیا کر، جو تیرے اور تیری اولاد کے گذران کے لئے کافی ہو۔
(صحیح البخاری:۸/ ۸۰۸)

مثال (۵): قاعدہ: ''إِعْمَالُ الْكَلَامِ أَوْلٰى مِنْ إِهْمَالِهٖ''۔

ترجمہ: کلام کو کارآمد بنانا اسے بیکار کردینے سے بہتر ہے۔

اس قاعدہ کی دلیل فرمان خداوندی: ''مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ''۔

ترجمہ: وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا، مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔(سورۂ ق:۱۸)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

''إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى عِنْدَ كُلِّ لِسَانِ قَائِلٍ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ عَبْدٌ وَلْيَنْظُرْ مَا يَقُوْلُ''

ترجمہ: بیشک اللہ تعالی ہر کہنے والے کی زبان کے پاس موجود ہوتے ہیں، اس لئے بندہ کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے، اور کیا کہہ رہا ہے ذرا اس کو سوچ لے۔

(اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی:۵/ ۴۵۴، الحلیۃ:۸/ ۱۶۰، ۵۲، ۳، بحوالہ موسوعۃ القواعد الفقہیہ:۱/ ۴۱)

قسم دوم: وہ قواعد فقہیہ جنہیں فقہائے کرام استدلال قیاس فقہی کے موقع پر لے آئیں، اور یہی قواعد احکام فقہیہ اجتہادیہ کی تعلیلات سمجھے جاتے ہیں، یہ قواعد بھی کسی نہ کسی دلیل شرعی کے تحت داخل ہیں، خواہ دلیل، دلیل متفق علیہ ہو، مثلاً: کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع امت، یا دیگر دلائل کے تحت داخل ہوں گے، مثلاً: قیاس، استصحاب، مصلحت یا استصلاح، عرف، اور استقراء وغیرہ، جن سے احکام شرعیہ کے لیے استدلال کیا جاتا ہے۔

یہ بات بعید از قیاس ہے کہ کوئی فقیہ مجتہد کسی مسئلہ فقہیہ کے حکم کی بنیاد محض اپنی رائے یا خواہش نفسانی پر رکھے، کیوں کہ یہ لوگ بڑے متقی اور خدا ترس تھے، انہیں ہمہ وقت آخرت اور اس کی جوابدہی کا استحضار رہا کرتا تھا۔

اس طرح کے قواعد کی مثال (۱): ''إِنَّمَا يَثْبُتُ الْحُكْمُ بِثُبُوْتِ السَّبَبِ''۔

ترجمہ: ثبوت سبب سے ہی حکم ثابت ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسا اصولی فقہی قاعدہ ہے جس کا استنباط فقہا مجتہدین نے اجماع اور معقول نصوص سے کیا۔

اس قاعدہ پر آپ یہ تفریع فرما سکتے ہیں کہ نماز ظہر کا وجوب اور بندہ کے ذمہ اس کا متعلق ہونا زوال شمس

سے ثابت ہوگا (کیوں کہ وہ سبب ہے)، معلوم ہوا کہ زوالِ شمس ثبوتِ وجوبِ الظہر کا سبب ہے، اگر زوال ثابت نہ ہو تو وجوب بھی ثابت نہ ہوگا۔

اس قاعدہ کے لیے فرمان خداوندی: "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْءَانَ الْفَجْرِ" سے استدلال کیا جاتا ہے۔

مثال (۲): "اَلْاَیْمَانُ فِیْ جَمِیْعِ الْخُصُوْمَاتِ مَوْضُوْعَۃٌ فِیْ جَانِبِ الْمُدَّعٰی عَلَیْہِ اِلَّا فِی الْقَسَامَۃِ"۔

ترجمہ: تمام مقدمات میں قسمیں جانب مدعیٰ علیہ میں موضوع ہیں، سوائے قسامت کے۔

یہ قاعدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث: "اَلْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَ الْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعٰی عَلَیْہِ" (رواہ البخاری) سے مستنبط وماخوذ ہے۔

مثال (۳): "اِذَا اجْتَمَعَتِ الْاِشَارَۃُ وَ الْعِبَارَۃُ وَ اخْتَلَفَ مُوْجِبُھُمَا غَلَبَتِ الْاِشَارَۃُ"۔

ترجمہ: جب اشارہ اور زبانی کلام دونوں جمع ہوں اور دونوں کا حکم مختلف ہو تو اشارہ کو غلبہ دیا جائے گا۔ (الاشباہ والنظائر للسیوطی: ص ۳۱۴)

یہ قاعدہ معقول اور عرف سے مستنبط ہے۔

مثال (۴): "اِذَا وَجَبَتْ مُخَالَفَۃُ اَصْلٍ اَوْ قَاعِدَۃٍ وَجَبَ تَقْلِیْلُ الْمُخَالَفَۃِ مَا اَمْکَنَ"۔

ترجمہ: جب کسی اصل یا قاعدہ کی مخالفت لازم آئے تو حتی الامکان مخالفت کو کم کرنا واجب ہے۔

یہ قاعدہ معقول نصوص سے مستنبط ہے، جو حرج ومشقت کے لیے رافع ہے، جیسے فرمان خداوندی ہے:

"لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا"۔

ترجمہ: اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا مگر اس کی بساط کے مطابق۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۸۶)

اور آپ کا ارشاد: "اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ فَخُذُوْا مِنْہُ مَا اسْتَطَعْتُمْ"۔

ترجمہ: جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک ممکن ہو اسے کر گزرو۔ (ابن ماجہ: ص ۲)

اور اس طرح کی دیگر مثالیں۔

کیا قواعد فقہیہ سے اثباتِ احکام درست ہے؟

جب کسی حادثہ یا نئے پیش آمدہ مسئلہ کے حکم سے متعلق کوئی نص یا اجماع، یا قیاس موجود نہ ہو تو کیا اس صورت میں قواعد فقہیہ کو دلائل احکام شرعیہ میں سے ایک دلیل قرار دے کر ان سے احکام کا اثبات صحیح ہوگا؟ یا بالفاظ دیگر، کیا قاعدۂ فقہیہ کو دلیل شرعی قرار دے کر اس سے احکام شرعیہ کا استنباط جائز ہوگا؟

مجلہ احکام عدلیہ صفحہ ۱۰ ار میں یہ بات لکھی ہے کہ اسلامی عدالتوں سے جب تک کسی نقل صریح سے واقف نہ ہوں، محض کسی قاعدہ کو بنیاد بنا کر فیصلہ نہ کریں۔

عالم جلیل، فقیہ عظیم علامہ مصطفی زرقاء فرماتے ہیں: ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی قاعدہ میں مستثنیات نہ ہوں، ہر قاعدہ میں ضرور کچھ نہ کچھ مستثنیات ہوتی ہیں، اور وہ بالخصوص احکام استحسانی کی متقاضی ہوتی ہیں، اس لیے ججوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے فیصلوں کی بنیاد نصِ آخر کو چھوڑ کر محض کسی قاعدہ پر رکھیں، اس لیے کہ گرچہ ان قواعد کی قدر و قیمت وعظمت بہت کچھ ہے، مگر وہ کثیر المستثنیات ہیں، وہ قانون داں بننے کے لیے دستور کی حیثیت تو ضرور رکھتے ہیں، لیکن فیصلہ وقضاء کے لیے نصوص کی نہیں۔

علامہ ابن نجیم اور علامہ مصطفی زرقاء کی ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ استنباطِ احکام کے لیے قواعد فقہیہ کا اعتبار بطور دلائل دو وجہوں سے نہیں ہوسکتا۔

وجہِ اول: قواعد فروع مختلفہ کا ثمرہ اور ان کے لیے جامع ورابط ہیں۔

اور یہ بات معقول نہیں ہوگی کہ ثمرۂ فروع و جامع فروع ہی کو احکامِ فروع کے استنباط کے لیے دلیل قرار دیا جائے۔

وجہ ثانی: ان قواعد کا بڑا حصہ مستثنیات سے خالی نہیں، تو کبھی یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ جس فرع ومسئلہ کا حکم زیر بحث ہے وہ ان ہی مستثنیات میں داخل ہو، اس لیے ان قواعد کی اساس پر بناءِ حکم جائز نہیں، اور نہ ہی ان پر احکام فروع کی تخریج جائز ہے، لیکن جب مسائلِ فقہیہ مدونہ پر، مسائلِ جدیدہ وحادثہ کو قیاس کرکے ان کے احکام کی تخریج ہوگی تو ان قواعد کی حیثیت دلائلِ شرعیہ کے لیے ایسے شواہد کی ہوگی، جن سے تخریج احکام میں ایک گونہ انسیت حاصل ہوسکتی ہے۔

مگر مطلقاً یہ کہنا کہ قواعد پر بناء حکم جائز نہیں، صحیح معلوم نہیں ہوتا، اور وہ اس لیے کہ تمام قواعد، اصول و مصدر کے لحاظ سے یکساں نہیں بلکہ مختلف ہیں بالہٰذا جن قواعد کا مصدر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہو، یا جو قواعد کتاب اللہ، یا سنت رسول اللہ کی دلائلِ واضحہ پر مبنی ہوں، یا کسی ایسی دلیل شرعی پر مبنی ہوں جو علماشریعت کے نزدیک معتبر ہے، تو ان کے ذریعہ استنباطِ احکام، اصدار فتاویٰ اور ان کے مطابق الزامِ قضاء جائز ہوگا۔

علامہ ابن نجیم اور علامہ زرقاء کی جو تحریر اوپر گذری کہ قواعد پر بناء حکم جائز نہیں، یا مقتضائے قواعد کے مطابق فتویٰ دینا صحیح نہیں، ان کی یہ بات عام قواعد کے متعلق ہے، جن قواعد کا مصدر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وسلم) یا کوئی معتبر دلیل شرعی ہو وہ اس عام سے خارج ہیں اور ان پر **الاخریٰ کا حکم** جاری ہے۔

قواعدِ فقہیہ کی تدوین وتاریخ:

قواعدِ فقہیہ کی تدوین وتاریخ کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱-دورِ تکوین (Formation period)

۲-دورِ تدوین (Recording period)

۳-دورِ تنسیق (Harmonization period)

دورِ تکوین:

دورِ تکوین سے مراد، دورِ تشریع ہے، جس میں قواعدِ فقہیہ کی بنیاد پڑی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت نے ''جوامع الکلم'' عطا فرمایا، (کما قال صلی اللہ علیہ وسلم: أوتیت جوامع الکلم) اس لیے آپ کی احادیثِ شریفہ بہت سے فقہی احکام کو ثابت کرنے میں قواعدِ فقہیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً:

۱-آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ''الخراج بالضمان''۔ ''العجماء جرحها جبار''۔ ''لا ضرر ولا ضرار''۔ ''ما أسكر كثيره فقليله حرام''۔ ''البينة على المدعي واليمين على من أنكر''۔ ''المنيحة مردودة والعارية موداة والدين مقضي والزعيم غارم''۔ ''المؤمنون تتكافأ دمائهم ويسعى بذمتهم أدناهم وهم يد على من سواهم''۔

یہ تمام حدیثیں فقہاء کرام کے نزدیک مستقل قواعد ہیں۔

اسی طرح جب ہم آثارِ صحابہ اور اقوالِ تابعین پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے بھی بہت سے ایسے اقوال ملتے ہیں، جن کی حیثیت قواعد کی ہے، مثلاً:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قولِ مشہور: ''مقاطع الحقوق عند الشروط''۔ شرطوں کے لگانے پر حقوق رد ہوتے ہیں لزومِ شروط میں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول: ''كل شيء في القرآن فهو مخير''۔ کفاروں اور ان میں تخییر میں، قاضی شریح بن الحارث الکندیؒ کا قول: ''من شرط على نفسه طائعاً غير مكره فهو عليه''۔ جواز ولزومِ شرط میں۔ اور لیث بن سعدؒ کا قول: ''من أقر عندنا بشيء ألزمناه إياه''۔ لزومِ اقرار کے حوالہ سے قواعد ہیں۔

دورِ تدوین:

قواعدِ فقہ کا دوسرا دور فقہاء مجتہدین کی فقہ کے استحکام کے بعد شروع ہوتا ہے، کیوں کہ اس دور میں فن

فقہ نے دیگر فنون کے مقابلہ میں ایک الگ شناخت بنالی تھی، فقہاء کرام کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں جزئیاتِ مستنبطہ منتشرہ کو ایسے قواعدِ کلیہ اور اصولِ عامہ کی لڑی میں پرونے کی ضرورت تھی جو انہیں یکجا کرسکیں، تا کہ حکمِ شرعی کا طالب شخص الگ الگ جزئیات ومختلف مسائل کے احکام میں سرگرداں نہ ہو۔

چنانچہ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے حضرت امام ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب ''کتاب الخراج'' میں بہت سے قواعدِ فقہیہ ذکر فرمائے ہیں مثلاً:

۱-''التعزیر إلی الإمام علی قدر عظم الجرم وصغرہ''۔

۲-''کل من مات من المسلمین لا وارث لہ فمالہ لبیت المال''۔

۳-''لیس للإمام أن یخرج شیئاً من ید أحد إلا بحق ثابت معروف'' وغیرہ۔

(کتاب الخراج،ص ۱۸۰)

حضرت امام محمدؒ نے بھی اپنی کتاب ''کتاب الأصل'' میں ایسی عبارتیں تحریر فرمائی جو قواعد کی حیثیت رکھتی ہیں مثلاً:

''ولو أن رجلاً کان متوضیاً فوقع في قلبه أنه أحدث وکان ذلک أکبر رأیه فأفضل ذلک أن یعید الوضوء وإن لم یفعل وصلی علی وضوءہ الأول کان عندنا في سعة لأنه عندنا علی وضوء حتی یستیقن بالحدث''۔ اس عبارت سے قاعدہ: ''الیقین لا یزول بالشک''۔ ثابت ہوتا ہے۔

مبسوط کی یہ عبارت اور اس جیسی دیگر عبارتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ امام محمدؒ کے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ قواعدِ فقہیہ کی مستقل تدوین ہونی چاہیے، اسی لیے کہیں کہیں امام موصوفؒ نے کسی قاعدہ کو بیان فرمایا، اور اس پر بعض مسائلِ فقہیہ کی تفریع بھی فرمائی، مثلاً:

۱-''کل أمر لا یحل إلا بملک أو نکاح فإنه لا یحرم لشيء''۔ ہر ایسا امر جو بغیر ملک یا نکاح کے حلال نہ ہو وہ کسی شئی سے حرام نہ ہوگا۔

چنانچہ جب تک عقدِ نکاح یا عقدِ ملک کے ختم ہونے پر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں شاہد نہ ہوں، ان کے ختم یا ثابت ہونے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

۲-''التحري یجوز في کل ما جازت فیه الضرورة''۔ جس چیز میں ضرورت جائز ہوتی ہے اس میں تحری بھی جائز ہوتی ہے۔ مثلاً:

پانی کے دو برتن پاک اور ناپاک میں جب اشتباہ ہو تو وضو کے لیے تحری واجب نہیں، تیمم کرلے، کیوں کہ وہ وضو کا بدل ہے، البتہ پینے کے لیے تحری کرے گا۔

۳- ''لایجتمع الأجر و الضمان''۔ اجرت وتاوان دونوں جمع نہیں ہوتے۔ مزدور خاص کے ہاتھوں دورانِ عمل کوئی نقصان ہوتو اس پر تاوان لازم نہیں ہوتا، یہ قاعدہ اس کا مؤید ہے۔

۴- ''کل شيء کره أکله و الانتفاع به علی وجه من الوجوه فشراءه و بیعه مکروه, و کل شيء لا بأس بالانتفاع به فلا بأس ببیعه''۔ جس شئ کا کھانا یا اس سے انتفاع کسی بھی طریق سے مکروہ ہوتو اس کا خریدنا او ربیچنا بھی مکروہ ہوتا ہے، اور جس شئ سے انتفاع میں کوئی مضائقہ نہیں اس کے بیچنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

چوتھی صدی ہجری میں ابو طاہر دباس نے باضابطہ اس فن کی تدوین کی بنیاد رکھی، جیسا کہ علامہ سیوطیؒ اور علامہ ابن نجیمؒ نے اس فن کی تدوین پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ ابو طاہر دباس نے امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کو سامنے رکھ کر سترہ ایسے قواعد مرتب کیے، جن پر فقہ حنفی کی تمام جزئیات منطبق ہوجاتی ہیں۔(الأشباه لابن نجیم: ۱۶، الأشباه للسیوطي: ۳۵) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قواعدِ فقہ کے مدونِ اول ابو طاہر دباس حنفی ہیں، آپ نے جن سترہ قواعد کو مرتب فرمایا، ان میں پانچ قواعد تو وہی ہیں، جن کو ہم قواعدِ اساسی کہتے ہیں۔

(۱) الأمور بمقصادها　(۲) الضرر یزال　(۳) العادة محکمة

(۴) الیقین لا یزول بالشک　(۵) المشقة تجلب التیسیر۔

پانچویں صدی ہجری میں ابو زید دبوسی نے ''تاسیس النظر'' تالیف فرمائی، جس میں ستہتر قواعد ذکر کیے گئے، پھر اس کے بعد ساتویں صدی میں اس سلسلے میں اہم کام ہوا، اس صدی کے مایۂ ناز عالم، علامہ محمد بن ابراہیم الجاجرمی السہلکی نے ''القواعد في فروع الشافعیة'' امام عز الدین بن عبد السلام نے ''قواعد الأحکام في مصالح الأنام'' اور فقہاء مالکیہ میں سے علامہ محمد بن عبد اللہ بن راشد البکری القفصی نے ''المذهب في ضبط قواعد المذهب'' جیسی عظیم الشان اور شہرہ آفاق کتابیں تالیف فرمائیں۔

آٹھویں صدی ہجری کو تدوینِ قواعد کے لیے سنہرے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس صدی میں بالخصوص علماء شوافع نے اس فن کی تدوین کی جانب خوب توجہ دی، اور بڑی معرکہ آرا کتابیں تالیف فرمائیں۔ مثلاً:

الأشباه و النظائر لابن الوکیل الشافعي

الأشباه و النظائر لتاج الدین السبکي

الأشباه و النظائر لجمال الدین الإسنوي

المنثور في القواعد لبدر الدین الزرکشي

القواعد في الفقه لابن رجب الحنبلي

القواعد في الفروع لعلي بن عثمان العرفي

كتاب القواعد للمقري المالكي، وغیرہ۔

نویں صدی ہجری میں بھی اس فن پر کافی کام ہوا، جس میں محمد بن محمد الزبیدی کی ''أسنی المقاصد في تحرير القواعد'' ابن الہائم المقدسی کی ''القواعد المنظومة'' تقي الدين الحصنی کی ''كتاب القواعد'' عبدالرحمن بن علي المقدسی کی ''نظم الذخائر في الأشباه والنظائر'' ابن عبد الہادی کی ''القواعد والضوابط'' ابن غازی المالکی کی ''الكليات الفقهية والقواعد'' وغیرہ۔

دسویں صدی ہجری کو اس فن کی تدوین کا دورِ نشاط کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا، علامہ سیوطیؒ نے فقہ کے اہم قواعد کو اپنی کتاب ''الأشباه والنظائر'' میں جمع فرمایا، اس صدی میں علامہ ابوالحسن الزقاق التجیبی المالکی نے کتب سابقین مثلاً ''الفروق للقرافي'' اور ''كتاب القواعد للمقري'' وغیرہ سے قواعد کو منتخب کر کے ان کو ترتیب دیا، اور علامہ ابن نجیم حنفیؒ نے ابن سبکی اور سیوطی کے طرز پر اپنی کتاب ''الأشباه والنظائر'' تالیف فرمائی۔

اسی طرح گردشِ دوراں کے ساتھ ساتھ گیارہویں اور اس کے بعد کی صدیوں میں قواعدِ فقہ کی تدوین وترتیب کا کام ہوتا چلا آیا۔

۳۔ دورِ تنسیق

جیسا کہ گذشتہ تفصیل سے آپ یہ بات جان چکے کہ مختلف صدیوں میں قواعد کی تدوین وترتیب کا کام چلتا رہا، لیکن اتنی ساری جد وجہد اور سعی پیہم کے باوجود قواعد فقہ مختلف مدونات میں بکھرے ہوئے تھے، اوران مدونات میں دوسرے بعض فنون فقہیہ بھی داخل تھے، مثلاً فروق اور پہلیاں وغیرہ، یہاں تک کہ جب تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں سلطان غازی عبدالعزیز خان عثمان کا زمانہ آیا، تو آپ نے اس وقت کے کبار علماء وفقہاء کی ایک کمیٹی تشکیل دے کر، ان قواعد کی تدوین وترتیب کو آخری شکل دی، جو ''مجلة الأحكام العدلية'' کے نام سے معروف ہے، یہ وہ مجلہ ہے جو اس دور میں عدالتوں میں قانون کی حیثیت رکھتا تھا، اور عدالتوں کے فیصلے مجلہ میں موجود قواعد کی روشنی ہی میں ہوا کرتے تھے، اب تیرہویں صدی کے بعد چودھویں صدی میں بھی اس فن کی ترتیب وتبویب، تعمیمِ افادیت واہمیت اور تسہیل الانتفاع والفہم کے اعتبار سے خوب سے خوب تر کام ہورہا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم

مصادر القواعد الفقهية في المذاهب الأربعة

في المذهب الحنفي

أصول الكرخي لأبي الحسن الكرخي

تاسيس النظر	لأبي زيد الدبوسي
الاشباه و النظائر	لابن نجيم الحنفي
خاتمة مجامع الحقائق	لابي السعيد الخادمي
مجلة الاحكام العدلية العثمانية	لجنة من علماء الدولة
الفرائد البهية في القواعد و الفوائد الفقهية	لابن حمزة الحسيني

في المذهب المالكي

الفروق	للقرافي
القواعد	للمقري المالكي
ايضاح المسالك إلى قواعد الإمام مالك	للونشريسي

الاسعاف بالطلب مختصر شرح المنهج المنتخب على قواعد المذهب للتواني

في المذهب الشافعي

قواعد الاحكام في مصالح الانام	لعز الدين بن عبد السلام
كتاب الاشباه و النظائر	لابن الوكيل الشافعي
المجموع المذهب في قواعد المذهب	للعلائي
مختصر قواعد العلائي	
الاشباه و النظائر	لتاج الدين ابن السبكي
المنثور في ترتيب القواعد الفقهية او القواعد في الفروع	للزركشي
شرح قواعد الزركشي او حاشية على قواعد الزركشي	لسراج الدين العبادي
الاشباه و النظائر	لابن الملقن

القواعد — لأبی بکر الحصنی الشافعی

الاشباه والنظائر — للسیوطی

الاستغناء فی الفروق والاستثناء — لبدر الدین البکری

فی المذہب الحنبلی

القواعد النورانیة الفقہیة — لابن تیمیة

القواعد الفقہیة — المنسوبة إلی ابن قاضی الجبل

تقریر القواعد وتحریر الفوائد المشہور بالقواعد — لابن رجب الحنبلی

القواعد الکلیة والضوابط الفقہیة — لابن عبد الہادی

قواعد مجلة الاحکام الشرعیة علی مذہب الامام احمد بن حنبل / لاحمد بن عبد اللہ القاری الحنفی

تدوین فقہ و اصول فقہ

مفتی عبد القیوم صاحب مالیگاؤں
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

تاریخ اسلامی میں فقہ اسلامی کا کام اور نام بہت ہی روشن، تابناک اور گراں قدر ہے، اگر یہ سوال کیا جائے کہ اسلام دین کامل، اس میں حیات انسانی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ کے لیے مکمل ہدایت اور رہنمائی ہے تو یہ دعویٰ ہے، اس عظیم دعویٰ کی دلیل و حجت اور برہان کیا ہے؟ تو جواب میں ہم اپنے فقہاء کرام کی پوری فقہی کاوش اور مساعی کو پیش کر سکتے ہیں۔

نیز فقہ اسلامی کو انسان کی متنوع زندگی سے ہم آہنگ اور موافق کرنے کے لیے سارے فقہا و محدثین نے وہ محنتیں اور ریاضتیں کی ہیں جس کی مثال ہم کو مذاہب وادیان عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی یہاں ایک دو نہیں بل کہ بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں خاک دانِ عالم سے ایسے رجالِ عزم و حوصلہ اور مردانِ کار اٹھے، ہیں جنھوں نے اس مقدس کام کے لیے اپنی عمریں کھپائی اور زندگیاں قربان کی ہیں خداوند عالم ان پاک طینت نفوس کو پوری امت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں۔ چناں چہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں جب ائمہ مجتہدین اصول فقہ کی تدوین میں مصروف

تھے۔ کتاب وسنت میں بیان کردہ جزئی احکام کے پردے میں پوشیدہ کلمات کی درایت کا کام زور وشور سے جاری تھا، یہی زمانہ تھا جب قواعد کلیہ کے علم کی بنیاد بھی رکھی جاچکی تھی۔ چناں چہ امام ابو یوسفؒ امام محمد بن شیبانی اور امام محمد ادریس شافعی کی فقہی تالیفات میں ایسے قواعد بکھرے ہوئے ہیں جن کو بعد میں آنے والے فقہا نے مرتب کیا۔

بہر حال قواعد کلیہ کا یہ جداگانہ علم بھی ہمارے فقہائے مجتہدین کے افکار وخیالات اور ان کے زرخیز ذہن و دماغ کی ایک ایسی پیداوار ہے جس نے تمام الجھی ہوئی فقہی گتھیوں کے سلجھانے اور ان کو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے۔ اسی لیے علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں بجا طور پر لکھا کہ یہ فن اس ملت اسلامیہ کی ایجاد ہے اور اس میں اہلِ اسلام کو امتیاز اور برتری حاصل ہے۔

مذکورہ بالا تمہیدی کلمات سے اس علم کی اہمیت، افادیت اور خصوصیت کافی حد تک اجاگر ہوجاتی ہے، چناں چہ اب اس سلسلہ کی تفصیلی گفتگو اور اس علم کی بنیادی اور ضروری باتوں کو ذکر کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا سوال جو آدمی کو اس موڑ پر پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ فقہ اسلامی کی یہ مضبوط وپائیدار عمارت کیسے مکمل ہوئی اور کن بنیادوں پر اس عمارتِ جلیلہ کی تعمیر ہوئی، نیز اس کی جملہ فروعات کو کیسے محفوظ کیا گیا، اور اس کے اصول، مراجع، اسباب ووسائل کیا ہیں۔

یہ سوال انسان کے اس انتہائی حیرت انگیز سوال کے مانند ہے جو اس کو کسی نظام، کسی صنعت یا کسی نئی ایجاد کے متعلق ہوتا ہے، چناں چہ آدمی اس کے وسائل ُطریقے، نظریات اور اس کے اصول وقواعد کے متعلق جانکاری کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ مذکورہ سوالات کے جوابات سے قبل اس فن کی تعریفات اور اہلِ اسلام کے اس کے ساتھ مراسم کو بیان کرنا بہت ہی مناسب ہوگا۔

تعریفات:

اہلِ اصول کے نزدیک اصول فقہ کی تعریف: دلائل شریعت میں اس عنوان سے غور وخوض کرنا کہ ان سے احکام اور مسائل مکلف کا استنباط ہو۔ دوسری تعریف: اصول فقہ وہ علم ہے جس سے احکام شرعیہ فرعیہ کو ان کے اجمالی دلائل یقینیہ سے نکالنے کا طریقہ معلوم ہو۔

قاضی بیضاویؒ نے اصول فقہ کی تعریف اس انداز میں فرمائی ہے۔ اجمالاً دلائل فقہ کو جاننا اور ان دلائل سے استفادہ کے طریقہ نیز مستفید کے حال کو پہچاننا اصول فقہ کہلاتا ہے۔

فقہ کی بنیاد اور اس کا استحکام کیسے ہوا:

جب ہم امت اسلامیہ کے عمدہ نقوش اور اس کے فضائل کو جاننا چاہیں گے تو اس علم کے ساتھ ادنی غفلت اور بے توجہی ہرگز نہ پائے گے بل کہ اس علم کی آبیاری اور خدمت میں امت مسلمہ کو گزشتہ اور موجودہ تمام ہی امتوں پر فوقیت اور امتیاز حاصل ہے اس لیے کہ اوروں کے پاس علم اصول کی طرح کامل ودقیق کوئی ایسا مستقل علم نہیں ہے جس

سے وہ اپنے قوانین اور دستورِ حیات کو محفوظ و مستحکم کر سکیں، یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے شناور علامہ عبدالرحمن بن خلدون نے اپنے مقدمہ میں صاف لکھ دیا کہ یہ فن یعنی اصول فقہ اس ملت کا ایجاد کردہ ہے، لہٰذا ذیل میں ہم وہ عظیم الشان اور پاکیزہ وجوہات کو بیان کر رہے ہیں جن سے اس فن کے مقاصد اور اس کے تقاضوں پر کافی حد تک بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

اسباب و مقاصد:

(۱) پہلا مقصد شریعت اسلامیہ کی حفاظت: اس لیے کہ علم اصول فقہ ان دلائل شریعت کا محافظ و نگہبان ہے، جن سے لوگ تجاوز نہیں کر سکتے جس طریقہ سے احکامات شرعیہ کے دلائل اور سندوں کو محفوظ کیا گیا، نیز جس طرح شریعت کے اصلی اور فرعی مصادر و مراجع کی وضاحت و تشریح کی گئی تاکہ پوری شریعت اپنے تمام قواعد کے ساتھ محفوظ ہو جائے، ان تمام ضروری رعایتوں کے ساتھ جن کی پوری ملتِ اسلامیہ کو اپنے پیش آمدہ حالات و حادثات میں ضرورت پڑتی ہے۔

(۲) منجملہ وجوہات کہ دوسری وجہ یہ ہے کہ تمام مسلمان شریعت کے اوامر کی تعمیل اور بجا آوری کریں جو شریعت ان کو قرآنِ کریم میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

اسی امر کے پیشِ نظر حضرات علمائے کرام کی کوششیں معرض وجود میں آئیں تاکہ کتاب و سنت کے احکام میں تطبیق اور تنفیذ کا عمل جاری ہو سکے۔

(۳) اس علم کے اہتمام و اعتناء کے سلسلے میں سب سے اہم وجہ وہ مضبوط رغبت اور لگن تھی جو امت میں دو مدرسوں اور طریقوں کے وجود میں آنے کے وقت پیدا ہوئی یعنی طریقہ اہل حدیث اور طریقہ اصحاب الرائے۔ چناں چہ عصر اول اس بات کا شاہد ہے کہ یہ دونوں مدرسے اور طریقے حجاز و عراق میں موجود تھے اور بہت سارے مواقع پر ان دونوں فریقوں کے متبعین کے مابین شدید نزاع اور ایک دوسرے کی جانب سے تہمت اور الزام تراشی بھی ہوتی رہی۔

چناں چہ ان حالات میں علم اصول فقہ کی سخت ضرورت تھی تاکہ شدید اختلاف کی بیخ کنی ہو اور اہل اسلام کی صفوں میں اتحاد قائم ہو، نیز اس علم کے ذریعے استنباط احکام کی دیوار کو مستحکم و متفق علیہ قواعد و اصول کے ذریعے محدود و محصور کرنا بھی ایک لازم و ضروری امر تھا۔ تاکہ ہر متجاوزِ شریعت کو منہ توڑ جواب ملے اور ہر حقیقت کے متلاشی کو رہبری و رہنمائی مل سکے۔

(۴) اس علم کی ایجاد و ارتقاء کی آخری وجہ حضرات فقہائے کے مابین اختلاف اور مختلف اوقات میں ان کی آراء و خیالات کا جدا ہونا تھا نیز اس مقبول اختلاف سے واقف ہونا جو شریعت میں قابل اعتبار اور دین میں توسع اور رحمت کا باعث ہے، اور اس اختلاف سے آگاہی بھی مقصود تھی جس کی بنیاد نفس پرستی، تعصب اور من کی چاہت پر تھی۔

موضوعات اصول فقہ:

علم اصول فقہ کے موضوعات کا انحصار شریعت مطہرہ کے ان دلائل کلیہ پر ہے، کہ جن سے احکام شرع کے استنباط و استخراج کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، چناں چہ اصول فقہ نے جن موضوعات کو اپنا مرکز بحث و تمحیص بنایا ہے۔ وہ

مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اصول فقہ کا سب سے اولین موضوع شریعت اسلامیہ کے وہ مصادر و مراجع ہیں جن سے ہر صاحب ایمان احکاماتِ دین کی سیرابی حاصل کرتا ہے، پھر ان بافیض مصادر کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم کے مراجع جو قابل عمل ہونے میں تمام اہل اسلام کے نزدیک متفق علیہ ہیں، وہ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہیں، جنہیں مصادر اربعہ اسلامیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دوسرے وہ مصادر جن کے معمول بہا ہونے میں حضرات فقہائے کرام کے مابین اختلاف ہے، وہ مصلحت مرسلہ، استحسان، قول صحابی، سد ذرائع کے اصول، دلیل استصحاب اور شرائع سابقہ ہیں۔

پھر مذکورہ دونوں ہی قسم کے مراجع و مصادر میں مختلف بحثیں بمعتدد مسائل، کئی قواعد اور فروعات ہیں۔

(۲) اصول فقہ کا دوسرا مرکز گفتگو وہ احکامات کلیہ ہیں جو دلائل سابقہ سے ثابت ہیں پھر مصادر شریعت سے ثابت ہونے والے احکامات کلیہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم وہ جن کو احکامات تکلیفیہ سے جانا جاتا ہے، یعنی وہ احکام جو فرد مکلف کے لیے ہیں، اور وہ پانچ ہیں:

(۱) وجوب اس کے مقابل (۲) حرمت (۳) مندوب اس کے مقابل (۴) کراہت (۵) پھر اباحت۔

حکم تکلیفی کی مثال جیسے صیام کے لیے وجوب، زنا کے لیے حرمت، صلاۃِ نافلہ کے لیے ندب، اور تشبُّہات میں شرکت کے لیے مکروہ، اور عام افعالِ عادیہ کے لیے اباحت کے الفاظ ہیں۔

احکام کلیہ کی دوسری قسم احکام وضعیہ ہیں اور یہ بھی پہلی قسم سے متعلق ہیں، اور وہ، سبب، شرط، رکن، مانع، صحت، فساد، رخصت، عزیمت ہیں۔

(۳) علم اصول فقہ کا تیسرا موضوع شریعت کے احکام میں اجتہاد، مجتہد کی شرائط اور اس کی صفات ہیں، جیسا کہ اس کے مقابل ایک دوسرا مسئلہ مجتہد کی تقلید اور اس کا حکم زیر بحث ہوتا ہے؛ نیز یہ بھی کہ مقلد کسے کہتے ہے، کب اس پر تقلید واجب ہوتی ہے، اور کس صورت میں مقلد کے لیے تقلید جائز نہیں۔

(۴) اصول فقہ کا چوتھا محل گفتگو تعارضِ ادلہ ہے، کہ یہ تعارض دلائل میں کب ہوتا ہے، اور دو متعارض دلیلوں میں ترجیح کیسے ممکن ہوتی ہے، ساتھ ہی دلیل قوی اور دلیل صحیح کو اس کے ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے پہچاننا بھی اس موضوع کا حصہ ہے، لیکن اس موضوع کے مسائل انتہائی دقیق، پیچیدہ اور تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔

(۵) اصول فقہ میں کتاب وسنت کی نصوص کی دلالتوں میں بھی بحث کی جاتی ہے، جو دلالتیں ہمیں نصوص واردہ اور قواعدِ استنباط سے احکام شرعیہ کے استخراج کی کیفیت بتلاتی ہیں، پھر یہ دلالتیں مختلف النوع ہیں، کہیں دلالت نظم ہے، تو کہیں دلالت فحوی یعنی دلالت النص، تو کبھی دلالت اقتضاء، اور کسی جگہ دلالت ضرورت ہے، نیز الفاظ بھی مختلف نوعیت کے ہیں۔ کوئی عام تو کوئی خاص، کہیں مطلق تو کہیں مقید؛ پھر یہ جاننا بھی اس کا حصہ ہے، کہ کہاں مطلق کو مقید بنایا جائے، اور کس موقع پر عام میں تخصیص روا ہوگی، اور کس جگہ مطلق کو اس کے وصف اطلاق پر باقی رکھنا ضروری ہے وغیرہ۔

اس بات کا جاننا بھی مفید علم ہے، کہ علم اصول فقہ کے تمام ہی موضوعات الاخری اولیٰ اور عربی اکثر لغت عربیہ کے علوم ہیں، جس لغت میں کلام الٰہی نازل ہوا، اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مافی الضمیر کی ادائی گی کا ذریعہ بنایا؛ نیز تفسیر، حدیث، منطق، علم خلافیات اور فروعاتِ فقہیہ کا علم بھی ان موضوعات کی بنیادیں ہیں۔

علم اصول فقہ کے اولین خدام:

جیسا کہ ماقبل میں معلوم ہوا کہ اصول فقہ اسلام میں بعد والوں کی ایجاد ہے حضرات صحابہ اس سے بے نیاز تھے کیوں کہ الفاظ سے معانی کے سمجھنے کے لیے اس زبانی ملکہ کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی جو ان میں فطری طور پر پایا جاتا تھا۔ وہ قوانین جن کی احکام الٰہیہ سمجھنے کے لیے ضرورت پیش آتی ہے سب انہیں معلوم تھے، پھر جب سلف کا زمانہ ختم ہوا اور بعد والا زمانہ آیا اور تمام علوم صنعتوں میں تبدیل ہوگئے تو فقہاء اور ارباب اجتہاد کو ان اصول وقوانین کو حاصل کرنے کی ضرورت پڑی۔ تاکہ دلائل سے احکام کا استنباط کیا جاسکے چناں چہ انہوں نے اسے ایک مستقل فن بنادیا اور وہ قوانین مرتب فرما کر ان کا نام اصول فقہ رکھ دیا، جیسا کہ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں، کہ اصول فقہ کی خدمت کا شرف اول حضرت امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعیؒ کو حاصل ہے چناں چہ آپ نے سب سے پہلے اپنی مشہور کتاب "الرسالة" نامی تصنیف فرمائی، علامہ بن خلدون مزید لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ کی علم اصول میں اس کے علاوہ بھی تصنیفات ہیں جیسے 'جماع العلم، ابطال الاستحسان، اختلاف الحدیث" گویا آپ ہی کے دستِ اقدس پر اس علم کا ارتقاء اور اس کی نشوونما ہوئی، جب کہ اس سے قبل یہ علم معروف ومشہور نہ تھا، البتہ فی الواقع موجود ضرور تھا۔

حضرت امام شافعیؒ کے بعد دیگر حضرات فقہاء نے اس میدان میں تسلسل کے ساتھ کام کیا، اور بہت ساری تصنیفات وتالیفات معرضِ وجود میں آئیں۔

پھر فقہائے احناف وشوافع ہر دو کا طریقہ کار اس سلسلہ میں جداگانہ ہے۔

شافعی اہل اصول کا طریقہ اور چند اہم کتابیں:

انہوں نے حضرت امام شافعیؒ کے ہی منہج وطریقہ کو اپنے لیے معیار قرار دیا، جو امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الرسالة" میں اختیار کیا ہے، چناں چہ ان حضرات نے سوال وجواب کے طریقہ کو پسند کیا؛ نیز اولاً یہ حضرات مسائل کو واضح کرکے ان پر دلائل کو پیش فرماتے، اس طرح قواعد کی وضاحت وتنقیح کرتے اور اکثر ان کا طرز کلام 'فان قلت کذا، قلنا کذا" ہوتا یہ وہ طریقہ ہے، جس کو طریقۃ الفقلة سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس منہج وطریقہ کی کتابیں: علامہ جوینیؒ کی 'البرھان"، علامہ ابوحامد غزالیؒ کی "المستصفی"، امام رازیؒ کی "المحصول"، علامہ بیضاویؒ کی 'منہاج الاصول"، اور علامہ آمدیؒ کی "الاِحکام فی اصول الاحکام" ہیں۔

حنفی اہل اصول کا منہج، اور ان کی چند اہم کتابیں:

فقہاء حنفیہ اس میں بڑے ماہر تھے، وہ فقہی نکات کے دریا میں غوطہ لگا کر مقدور بھر مسائل فقہیہ سے ان

قوانین کے موتی چن لیتے ہیں، اور ایک خاص طریقہ سے اصول وقواعد کے مبادی کو اخذ کرتے ہیں۔

فقہاء احناف کی مشہور کتابوں میں امام کرخیؒ کی ''الاصول'' اور امام جصاص رازیؒ کی ''الاصول''، علامہ دبوسی کی ''تقویم الادلہ''۔ ''اصول السرخسی''۔ ''اصول البزدوی''۔ اور اس کی شرح علامہ علاؤالدین البخاری کی ''کشف الاسرار'' شامل ہیں۔

منہج متاخرین:

متاخرین اہل اصول نے قواعد کے اثبات وترتیب میں ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جو سابقہ دونوں طریقوں کے محاسن اور خصوصیات کا جامع ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ پہلے اصل اور قاعدہ کو لکھتے، پھر دلائل اور براہین سے اس کو ثابت کرتے اور جتنی فروعات فقہیہ اس کے تحت داخل ہو سکتی ہیں ان سب کو ذکر کرتے اس کے بعد جتنے مسائل اس قاعدہ اور اصل سے مستثنیٰ ہیں، انہیں ان کے اسباب کے ساتھ بیان کرتے چناں چہ اس جامع طریقہ پر لکھی جانے والی چند تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) بدیع النظام الجامع بین اصول البزدوی والاحکام اس کے مولف ابن ساعاتی حنفی ہے، جنہوں نے علامہ آمدی کی کتاب الاحکام اور بزدوی کی اصول البزدوی کو ایک جگہ ترتیب سے جمع کر دیا اور اس کا نام مختصر البدائع رکھا۔ (۲) تنقیح الاصول صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود کی۔ (۳) علامہ بن عبد الشکور کی مسلم الثبوت۔ (۴) امام تاج الدین السبکی کی جمع الجوامع۔ (۵) علامہ کمال الدین بن الہمام کی التحریر۔

اور انہیں حضرات کے طرز وطریقہ پر علامہ شوکانی نے ارشاد الفحول اور علامہ خضری نے اصول الفقہ اور علامہ خلاف نے اصول الفقہ تصنیف فرمائی۔

اصول فقہ کے اس وسیع وعریض میدان میں علمائے متکلمین نے بھی زبردست کام کیا اور انتہائی گراں قدر تصنیف سے امت کو بہرہ ور کیا یہی وجہ تھی کہ ہمارے علما کو اہل کلام کے طرز پر بھی لکھنا پڑا۔

اس سلسلہ میں ارباب کلام کی سب سے بہتر تصنیف امام الحرمین کی کتاب البرھان اور امام غزالی کی المستصفی ہے، جن کا ذکر ماقبل میں ہو چکا، یہ دونوں اشعری ہیں، اسی طرح عبد الجبار کی کتاب العھد، اور ابوالحسین بصری کی کتاب العھد کی شرح المعتمد بہترین کتابیں ہیں۔

یہ دونوں معتزلہ تھے پھر ان چاروں کتابوں کی تلخیص پچھلے متکلمین میں دو زبردست عالموں یعنی امام فخر الدین اور ابن خطیب نے کی، انہوں نے اپنی تلخیص کا نام ''کتاب الاحکام'' تجویز کیا اور تحقیق واستدلال میں دونوں کے طریقے الگ الگ ہے ابن خطیب نے دلائل کا انبار لگا دیا، اور فخر الدین آمدی نے مذاہب اور تفریع مسائل پر زور دیا۔

اصول فقہ پر مزید معتبر تصنیفات یہ ہیں:

اصول الفقہ (محمد ابو زہرہ مصری)

اصول التشریع الاسلامی (علی حزب اللہ)

النسخ فی القرآن الکریم (مصطفی زید)

مدخل الفقہ الاسلامی (دکتور محمد سلام)

المنخول من تعلیقات الاصول (محمد حسن هیتو)

المسودہ فی اصول الفقہ (ابو البرکات عبد السلام ابن تیمیہ)

قواعد الاحکام فی مصالح الأنام (عز الدین ابن السلام)

اعلام الموقعین عن رب العالمین (ابن القیم الجوزیہ)

الموفقات فی اصول الشرعیہ (ابو اسحاق ابراہیم الشاطبی)

تاریخ التشریع الاسلامی (محمد الخضری)

تاریخ التشریع الاسلامی (عبد اللطیف السبکی)

مصادر التشریع الاسلامی فیما لا نص فیہ (عبد الواہاب خلاف)

محاضرات فی تاریخ الفقہ الاسلامی (محمد یوسف موسی)

محاضرات فی اسباب اختلاف الفقہاء (علی الخفیف)

الشریعۃ الاسلامیۃ صالحۃ لکل زمان ومکان (محمد الخضر)

تفسیر النصوص فی الشریعۃ الاسلامیۃ (محمد ادیب صالح)

مصادر التشریع الاسلامی ومناہج الاستنباط (محمد ادیب صالح)

ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ (محمد سعید البوطی)

اصول الفقہ (عبد الرحمن صابونی)

اردو مصادر و مراجع:

اصول الفقہ (مفتی عبیداللہ اسعدی)

فقہ حنفی کے اصول وضوابط (مفتی محمد زید ندوی)

آسان اصول فقہ (مولانا خالد سیف اللہ)

امداد الاصول (مولانا مہربان علی بڑوتوی)

ادب القاضی (محمود احمد غازی)

اصطلاحات اصول فقہ (مولانا افتخار احمد قاسمی)

عصر حاضر کے مسائل اور ان کا حل (فہیم اختر ندوی)

ضرورت وحاجت (مولانا مجاہد الاسلام قاسمی)

مقدمہ اسلامی عدالت (مولانا مجاہد الاسلام قاسمی آلاخری ۱۴۳۰ھ

امام ابوحنیفہ کے تدوین وقانونِ اسلامی (ڈاکٹر حمیداللہ)

فقہ اسلامی اصول،خدمات اور تقاضے (خصوصی شمارہ سہ ماہی "صفا"، حیدرآباد)

اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو پوری امت مسلمہ کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور ہمیں ان کے علوم ومعارف سے بہرہ اندوز ہونے کی بیش از بیش توفیق عنایت فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین۔

قرآن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کتنے لوگوں کو بلند کرتے ہیں اور کتنے لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَ یَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ۔(رواہ مسلم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس کتاب (قرآن پاک) کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست وذلیل کرتا ہے۔

علم الافتاء / ایک تعارف

ازقلم: محمد جعفر ملی رحمانی

دارالافتاء: جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا نندربار

علمِ افتاء علمِ فقہ ہی کی ایک عظیم الخطر (Big danger) کبیر الموقع (Great post) کثیر الفضل (Many favor) شاخ وفرع ہے، جس شخص کو پیش آمدہ مسئلہ کا حکمِ شرعی معلوم نہ ہو، اور وہ کسی راسخ فی علم الشریعۃ سے اس کا حکمِ شرعی دریافت کرے تو اس کو استفتاء، اور اس راسخ فی علم الشریعۃ کا ادلۂ شرعیہ کو سامنے رکھ کر اس کے حکم کو بیان کرنا فتوی کہلاتا ہے، فتوی کی بنیاد علمِ فقہ پر ہی ہے، اس لیے علمِ فقہ کی تعریف، اس کی فضیلت، اور افتاء کی شروط وضوابط اور آداب کو اجمالاً اس مضمون میں ذکر کیا گیا ہے۔

فقہ کی تعریف:

فقہ کے معنی جاننا، اور اصولیوں کی اصطلاح میں لفظِ فقہ کا اطلاق دلائلِ تفصیلیہ سے منتخب کردہ جزئیات وفروعات کو جاننے پر ہوتا ہے۔

اہلِ حقیقت اولیاء اللہ کے نزدیک فقیہ وہ شخص ہے جس کے علم وعمل میں مطابقت وموافقت ہو، امام حسن بصری

فرماتے ہیں: فقیہ وہ ہے جو دنیا سے معرض، آخرت کا راغب، اور اپنے عیوب سے آگاہ ہو۔الاخری ۱۴۳۲ھ

دین میں تفقہ فرضِ کفایہ ہے :

ہر زمانہ اور ہر علاقے میں ایسے ماہر علماء ومفتیانِ کرام کا وجود ناگزیر ہے جو بوقتِ ضرورت امت کی دینی رہنمائی کا فرض انجام دے سکیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين، ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون}۔ سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تا کہ دین میں سمجھ پیدا کریں، اور تا کہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جب ان کی طرف لوٹ کر آئیں، تا کہ وہ بچتے رہیں۔ (التوبۃ:۱۲۲)

قال القرطبي: وفي هذا إيجاب التفقه في الكتاب والسنة وأنه على الكفاية دون الأعيان. ويدل عليه أيضا قوله تعالى: {فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لاتعلمون}۔ (قرطبی: ۸/۲۹۴)

فقہ سراپا خیر وانعام ہے :

جس شخص کو تفقہ فی الدین ملا وہ خیرِ کثیر سے بہرہ ور ہوا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {يؤتي الحكمة من يشاء ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا}۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سمجھ عطا فرماتا ہے، اور جس کو سمجھ ملی اس کو بڑی خوبی ملی۔ (البقرۃ:۲۶۹)

امام مالک بن انسؒ فرماتے ہیں: آیت میں "حکمۃ" سے مراد اللہ کے دین کی معرفت، اس کی سمجھ اور اس کا اتباع ہے۔ (قرطبی: ۳/۳۳۰)

حضرت مجاہدؒ کی اس تفسیر کی تائید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے "من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين"۔ اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۷۱)

اس حدیث میں "تفقہ فی الدین" کو خیر قرار دیا گیا۔

فقہ میں اشتغال افضل ترین عبادت :

دینی مسائل کی تعلیم وتعلم، حوادث ونوازل کے احکام معلوم کر کے امت کی رہنمائی کرنا، نہ صرف عبادت بلکہ افضل ترین عبادت ہے، کیوں کہ عبادت کا نفع لازم ہے، اور احکامِ شرع کو جان کر امت کی رہنمائی کرنا نفعِ متعدی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: "لفقيه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد"۔ ایک فقیہ شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے بڑھا ہوا ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی: ۲/۲۶۶، رقم الحدیث: ۱۷۱۲)

"لكل شيء دعامة ودعامة الإسلام الفقه في الدين"۔ ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے اور دین کا ستون تفقہ فی الدین ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی: ۲/۲۶۷، رقم الحدیث: ۱۷۱۶)

تفقہ سے دین میں ثبات وتصلب حاصل ہوتا ہے :

جس شخص کو تفقہ فی الدین حاصل ہوتا ہے، اسے مسائلِ دینیہ واحکامِ شرعیہ پر پورا اطمینان وانشراح ہوتا ہے،

نہ زمانہ کی گردش اس کو راہِ حق سے ہٹا سکتی ہے، اور نہ کوئی لالچ و دھمکی اس کی ثبات قدمی میں تزلزل پیدا کر سکتی ہے، بل کہ وہ پوری یکسوئی سے احکامِ شرع پر عامل ہوتا ہے، برخلاف اس شخص کے جو نِرا عابد ہے، کہ وہ حالات اور فتوحات سے بہت جلد متأثر ہوتا ہے، اور حق پر قائم رہنا اس کے لیے مشکل ہوجاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لو أن هذه وقعت على هذه يعني السماء على الأرض وزال كل شيء عن مكانه ماترك العالم علمه ولو فتحت الدنيا على عابد لترك عبادة ربه تبارك وتعالى''۔ اگر آسمان زمین پر گر پڑے اور ہر چیز اپنی جگہ چھوڑ دے تب بھی عالم اپنے علم کو نہیں چھوڑے گا، جبکہ نرے عابد پر دنیا کے دہانے کھول دیے جائیں تو وہ اپنے رب کی عبادت چھوڑ بیٹھے گا۔
(الفقیہ والمتفقہ:۱/ ۱۸، تفضیل الفقہاء علی العباد)

رواۃِ حدیث دوافروش اور فقہاء معالج ہیں:

ایک شخص سلیمان اعمش کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے آیا، اتفاق سے وہاں حضرت امام ابوحنیفہ بھی تشریف رکھتے تھے، حضرت اعمش نے امام صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا، اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ امام صاحب نے اپنی رائے بتادی، اس پر اعمش نے پوچھا یہ جواب آپ نے کہاں سے دیا؟ امام صاحب نے جواب دیا اس روایت سے جو آپ نے ہم سے بیان فرمائی، یہ سن کر اعمش بول اٹھے ''نحن صيادلة وأنتم أطباء''۔ (الفقیہ والمتفقہ)

ہم مسلمان ہیں، زندگی کے خواہ کسی بھی شعبہ سے متعلق ہوں، احکامِ اسلام کے پابند و مکلف ہیں، اس لیے علمِ دین کی تحصیل و تعلیم ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''طلب العلم فريضة على كل مسلم''۔ (شعب الایمان للبیہقی:۲/ ۲۵۴، رقم الحدیث:۱۶۶۶)

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ کس قدر علمِ دین کا حاصل کرنا فرض ہے؟ تو علامہ شامی فرماتے ہیں: فرائضِ خمسہ: کلمہ، نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور اخلاص کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، کیوں کہ صحتِ عمل اسی پر موقوف ہے، اسی طرح علمِ حلال و حرام، اور علمِ ریاء کا حاصل کرنا بھی فرض ہے، کیوں کہ عابد ریاء کے سبب اپنے عمل کے ثواب سے محروم ہوتا ہے، علمِ حسد و عُجب کا حاصل کرنا بھی فرض ہے، کیوں کہ یہ دونوں چیزیں نیک عمل کو ایسے ہی کھا جاتی ہیں، جیسے آگ لکڑی کو، خرید و فروخت، نکاح و طلاق کا علم اس شخص پر حاصل کرنا فرض ہے، جو ان امور میں داخل ہونا چاہتا ہے، اُن الفاظ و کلمات کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے جس سے انسان اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ (ردالمحتار:۱/ ۱۲۶)

احکامِ شرعیہ کو معلوم کرنے کے دو ہی طریقے ہیں:

۱/ **طریقِ اجتہاد:** اور یہ طریقہ ان مجتہدین پر لازم ہے جن میں اجتہاد کی کلی یا جزئی شرطیں پائی جائیں، ان کے لیے ان مسائل میں تقلید جائز نہیں جن میں وہ خود اجتہاد کر سکتے ہیں۔

۲/ **طریقِ تقلید وفتوی:** اور یہ طریقہ اس جاہل پر لازم ہے جو درجۂ اجتہاد کو نہیں پہونچ سکا، اس کے لیے کسی بھی مسئلہ میں صاحبِ علم سے سوال کرنا واجب ہے، لقولہ تعالی: {فسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون}۔ سو

تم اہلِ کتاب سے پوچھ دیکھو اگر تم علم نہیں رکھتے۔(الانبیاء:۷)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بھی مسلمان کے لیے کوئی بھی تصرف یا فعل اس وقت تک جائز نہیں، جب تک کہ وہ اس تصرف یا فعل کے بارے میں حکمِ خداوندی کو نہ جان لیں، جاہل کے حق میں فتوی ایسا ہی ہے، جیسے مجتہد کے حق میں اس کا اجتہاد، فقہ کا قاعدہ ہے:''الفتوی في حق الجاهل كالاجتهاد''۔یعنی جس طرح مجتہد پر اپنے اجتہاد کے مطابق عمل واجب ہے اسی طرح جاہل پر فتوی کے مطابق عمل واجب ہے، اور جب تک حکم شرعی کو معلوم نہ کرلے تب تک اس کے لیے کوئی تصرف جائز نہیں ہے۔(موسوعۃ القواعد الفقہیۃ:۸/۱۴)

لیکن یہ حکم اس مفتی کے فتوی کا ہے، جس میں شروطِ اجتہاد پائی جاتی ہوں، ورنہ نہ تو اس سے پوچھنا جائز اور نہ اس کے فتوی پر عمل جائز، مگر جب مفتی کسی معتمد وموثوق کتاب کو سامنے رکھ کر فتوی دیتا ہو تو اس صورت میں اس سے سوال کرنا اور اس کے فتوی پر عمل کرنا دونوں جائز ہیں۔

شروطِ افتاء:

۱/افتاء کا منصب جلیل اس شخص کو سونپا جائے جس میں اس کی اہلیت ہو، اور اہلیت افتاء کے لیے درج ذیل شرطیں پائی جانی چاہیے مسلمان ہو، عاقل ہو، بالغ ہو، عدالت وورع، دیانت وصیانت، ثقہ وامانت، فقاہتِ نفس، سلامتِ ذہن، مضبوطیِ فکر، صحت تصرف واستنباط، متیقظ وبیدار مغزی، اور فسق سے سلامتی جیسے اوصاف سے متصف ہو، مدارکِ شرع کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس وغیرہ سے پوری طرح واقف ہو کہ ان میں کون واجب التقدیم ہے اور کون واجب التاخیر ہے۔

کتاب اللہ:- کتاب کا کم از کم اتنا علم ہونا چاہیے کہ وہ آیاتِ احکام (جس کی مقدار پانچ سو آیتیں ہیں) سے واقف ہو۔

سنت رسول اللہ:-سنت میں سے احادیثِ احکام کا علم ہو، جس کی مقدار بقولِ علما تین ہزار احادیث ہیں۔

المراد من الكتاب وهو مقدار خمس مائة آية لأنه أصل الشرع, وهكذا المراد من السنة بعضها وهو مقدار ثلاثة آلاف علی ما قالوا۔(نور الانوار:ص ۷)

پوری تین ہزار حدیثوں کا یاد ہونا لازم نہیں، بل کہ اپنے پاس ایسے کسی نسخۂ صحیحہ کا ہونا کافی ہے، جس میں احکام سے متعلق تمام حدیثیں جمع کی گئی ہوں، تا کہ فتوی دیتے وقت اس کی مراجعت کرسکے، اور اگر ان احادیث کو یاد کرنے کی قدرت ہو تو یاد کرلیں، یہ احسن ہے۔

اجماع:- مواقعِ اجماع کی تمیز ہو، تا کہ خلافِ اجماع فتوی نہ دے، جمیع مواقعِ اجماع وخلاف کا یاد کرنا لازم نہیں، بلکہ جب بھی کسی مسئلہ میں فتوی دے تو اس بات کو ملحوظ رکھے کہ وہ مخالفِ اجماع نہ ہو:''لا يجوز مخالفة الإجماع''۔(قواعد الفقہ:ص ۱۱۰)

۲/ناسخ ومنسوخ کی معرفت

احکام سے متعلق آیاتِ قرآنیہ واحادیثِ نبویہ میں ناسخ ومنسوخ کی معر[illegible] ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام ناسخ ومنسوخ یاد ہوں، بل کہ اتنا جاننا کافی ہے کہ جس آیت یا جس حدیث کو بنیاد بنا کر، کسی واقعہ کے بارے میں فتوی دیا جارہا ہے، وہ آیت یا حدیث منسوخ تو نہیں ہے۔

۳/ معرفتِ صحیح وضعیف

جس حدیث کی بنیاد پر فتوی دیا جارہا ہے اس کی صحت کا علم ہو، اور اس سلسلہ میں ان ائمۂ ثقات پر اعتماد جائز ہے جنھوں نے اس عظیم کام کو انجام دیا۔

۴/ فقہ کا عالم اور اہم مسائلِ فقہ واس کی فروعات کا ضابط ہو۔

۵/ معرفتِ اصول فقہ وقواعد

۶/ معرفتِ لغت ونحو

لغت ونحو کا اتنا علم ہو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں وارد خطاب عرب کو اس حد تک سمجھ سکے کہ کلام صریح، ظاہر، مجمل، حقیقت، مجاز، عام، خاص، محکم، متشابہ، مطلق، مقید، نص، اشارہ اور مفہوم وغیرہ میں تمیز کر سکے۔

۷/ ناس اور احوال کی معرفت

۸/ عدل وانصاف

۹/ اگر کسی خاتون میں اوپر ذکر کردہ شرطیں پائی جاتی ہیں تو اس کے لیے بھی فتوی دینا جائز ہے، ہمارے سامنے اس کی نظیر صاحب تحفۃ الفقہاء کی بیٹی کا یہ واقعہ ہے، علامہ ابن عدیم اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ فاطمہ بنت احمد بن ابی احمد سمرقندی (زوجہ صاحب بدائع) بڑی مہارت کے ساتھ مذہب ابوحنیفہ کو نقل کرتی تھیں، ان کے شوہر علامہ کاسانی کو بسا اوقات فتوی میں وہم ہوتا تو تصویب کے لیے اپنی بیوی کے پاس بھیج دیتے، اور وہ انہیں وجہ خطا بتلادیتی تو وہ ان کے قول کی طرف رجوع کر لیتے۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا: کہ وہ فتوی دیا کرتی تھیں، ان کے شوہر علامہ کاسانی ان کا بڑا احترام واکرام فرماتے تھے، پہلے ان کے فتوی کا یہ حال تھا کہ اس پر ان کی اور ان کے والد علاء الدین سمرقندی کی تحریر ہوا کرتی تھی، جب علامہ کاسانی سے نکاح ہوا تو اب اس پر تین تحریریں ہوا کرتی تھیں۔ و کانت الفتوی أولاً یخرج علیہا خطہا و خط أبیہا السمرقندی، فلما تزوجت بالکاساني، صاحب ''البدائع'' کانت الفتوی تخرج بخط الثلاثۃ۔ (بدائع الصنائع: ۱/ ۷۵، ۷۶)

یہ کم سے کم وہ شرطیں ہیں جن کے متعلق حضرات علما کا یہ کہنا ہے، کہ جب تک یہ شرطیں نہ پائی جائیں، اس وقت تک فتوی دینا درست نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ زمانے کے مفتیوں کو فتوی دینا جائز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: موجودہ زمانہ کے غالب اور اکثر مفتیانِ کرام میں افتاء کی مذکورہ بالا شرطیں نہ پائے جانے کے باوجود ان کے لیے فتوی دینا جائز ہے، کیوں کہ ان کی حیثیت ناقلِ فتاوی کی ہے، اور ناقلِ فتاوی میں ان شرطوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ علامہ

شامیؒ فرماتے ہیں: ما يصدر من غير الأهل ليس بإفتاء حقيقة وإنما هو حكاية عن المجتهد: أنه قائل بكذا۔(رسم المفتی:ص۱۳۰)

أما في زماننا فيكتفي بالحفظ كما في القنية وغيرها فيحل الإفتاء بقول الإمام بل يجب وإن لم نعلم من أين قال؟۔(رسم المفتی:ص۱۲۹)

قال الشامي رحمه الله: إن باب القياس مسدود في زماننا، وإنما للعلماء النقل من الكتب المعتمدة كما صرحوا به۔ (شامی:۱۳/ ۵۱۱)

ضوابطِ إفتاء:

۱ر فتوی دینا نیت خالصہ وصالحہ سے ہو۔

قال تعالى:{وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلوة ويؤتوا الزكوة وذلك دين القيمة}۔ حالاں کہ انہیں یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ دین کو اسی کے لیے خالص رکھیں یکسو ہوکر، اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوۃ دیا کریں، یہی طریقہ ہے(ان) درست مضامین کا۔

(البینۃ:۵)

وقال صلى الله عليه وسلم: ''إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى الخ''۔ ثوابِ اعمال نیتوں پر موقوف ہے، اور ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔(صحیح بخاری:رقم الحدیث:۱)

وقال بعض السلف: من أحب أن يسأل فليس بأهل أن يسأل۔ جو شخص اس کا خواہاں ہو کہ لوگ اس سے پوچھے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔

اس لیے فتوی دینے میں یہ نیت ہونی چاہیے کہ لوگوں کو احکامِ شریعت معلوم ہوں اور وہ خدائی دین پر عامل ہوں۔

۲ر افتاء میں اللہ سے مدد طلب کرے، اور اسی کے نام سے فتوی کا آغاز کرے، فتوی دیتے وقت مفتی کو چاہیے کہ لاحول ولاقوۃ إلا باللہ پڑھے، جیسا کہ مکحول ومالک رحمہما اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ یہ دونوں حضرات اس وقت تک فتوی نہیں دیتے تھے جب تک کہ لاحول ولاقوۃ إلا باللہ نہ پڑھ لیتے، علامہ صیمری وغیرہ فرماتے ہیں جب مفتی فتوی دینے کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ اللہ رب العزت سے(اصابتِ حق وصحتِ اجابت کی) دعا کرے۔

۳ر طالب علم لوگوں کے سامنے علما کے فتاوی نقل کرسکتا ہے، جبکہ اس کو یہ فتاوی یاد ہوں، ان کی دلیل وصحت جانتا ہو، اور ضوابطِ نقل کا التزام رکھتا ہو۔

۴ر اگر کسی شخص نے ابوابِ فقہ میں سے صرف کسی ایک باب میں پوری مہارت حاصل کرلی، یعنی تخصص کیا تو اس کے لیے اس باب میں فتوی دینا جائز ہے۔ مثلاً بینک، حصص وشیئرز کے معاملات، ابوابِ مواریث وفرائض وغیرہ۔

۵ر بغیر علم کے فتوی دینا حرام ہے۔

اللہ رب العزت کا فرمان ہے:{قل إنما حرم ربي الفواحش ما ظهر منها وما بطن والإثم والبغي بغير

الحق وأن تشركوا بالله ما لم ينزل به سلطاناً وأن تقولوا على الله ما لا تعلمون}۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے تو بس بیہودگیوں کو حرام کیا ہے ان میں سے جو ظاہر ہوں (ان کو بھی) اور جو پوشیدہ ہوں (ان کو بھی) اور گناہ کو اور ناحق کسی پر زیادتی کو اور اس کو کہ تم اللہ کے ساتھ شریک کرو، جس کے لیے (اللہ نے) کوئی دلیل نہیں اتاری او راس کو کہ تم اللہ کے ذمہ ایسی بات جھوٹ لگا دو جس کی تم کوئی سند نہیں رکھتے۔

(الأعراف:۳۳)

قال صلی اللہ علیہ وسلم: ''من أفتي بغير علم كان إثمه على من أفتاه''۔ جو شخص بغیر علم کے فتوی دے، اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ (سنن ابی داود، رقم الحدیث:۳۶۵۷)

۶/ غیر مستحق کو فتوی دینے کے لیے متعین نہ کیا جائے۔

خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں: امام المسلمین کو چاہیے کہ مفتیوں کے احوال کا جائزہ لیتا رہے، پھر جو شخص فتوی دینے کی صلاحیت وقابلیت رکھے اس کو اس منصب پر متعین ومقرر کرے، اور جو اس قابل نہیں اس کو فتوی دینے سے روک دے، اور دوبارہ فتوی دینے سے باز رہنے کی تاکید کردے، اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس کو سزا سے ڈرائے۔

فتوی دینے کی صلاحیت وقابلیت معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہوگا، کہ علمائے وقت سے دریافت کرے، اور معتمد علما کی اخبار پر اعتماد کرلے۔

۷/ کوئی شخص منصب افتاء پر اس وقت تک نہ بیٹھیں، جب تک کہ اس زمانے کے اہل علم اس کو فتوی دینے کی اجازت نہ دے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: ''ما أفتيت حتى شهد لي سبعون أني أهل لذلك''۔ وفي رواية: ما أفتيت حتى سألت من هو أعلم مني: هل يراني موضعاً لذلك''۔ میں نے فتوی نہ دیا، یہاں تک کہ ستر لوگوں نے میرے حق میں یہ شہادت دی کہ آپ فتوی دینے کے اہل ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے: میں نے فتوی نہیں دیا، یہاں تک کہ میں نے اپنے سے زیادہ علم رکھنے والوں سے پوچھا، کیا وہ مجھے اس منصب کے قابل دیکھتے ہیں؟

امام مالکؒ ہی کا مقولہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کسی شئ کا اہل نہ سمجھے، یہاں تک کہ اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے سے سوال کرلیں، کہ کیا میں اس کا اہل ہوں؟

امام مالک کے اس مقولہ میں ان لوگوں کے لیے بڑا درس ہے، جو خود ہی اس کا فیصلہ کرلیتے ہیں کہ ہم فلاں چیز کے اہل ہیں۔

امام مالک سے پوچھا گیا، اگر علمائے عصر آپ کو فتوی دینے سے روک دے تو آپ کیا کریں گے؟ آپ نے جواب دیا میں باز آجاؤں گا۔ قيل له: لو نهوك (يعني نهاك العلماء عن الفتوى؟) فقال رحمه الله: كنت انتهي۔

۸/ فتوی دیتے وقت مفتی خواہشِ نفس سے پوری طرح فارغ ہو، یہاں تک کہ خود اپنی ذات، دشمن اور دوست، سب

برابر ہوں۔

قال تعالی: {ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا اعدلوا ھو أقرب للتقوی واتقوا اللّٰہ إن اللّٰہ خبیر بما تعملون}۔ اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر نہ آمادہ کردے کہ تم (اس کے ساتھ) انصاف ہی نہ کرو، انصاف کرتے رہو (کہ) وہ تقوی سے بہت قریب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ کو اس کی (پوری) خبر ہے کہ تم کیا کرتے رہتے ہو۔ (المائدۃ:۸)

شیخ ابوعمرو بن صلاح فرماتے ہیں: مفتی کو راوی کی طرح ہونا چاہیے، کہ اس میں قرابت وعداوت، جلب منفعت ودفع مضرت موثر نہیں ہوتی۔

صاحب الحاوی فرماتے ہیں: جب مفتی اپنے فتوی میں کسی شخص معین کو دشمنی کی وجہ سے نشانہ بنائے، تو خود مفتی اس شخص کا خصم وفریق بن جاتا ہے، اور اس کا فتوی اس کے دشمن کے حق میں ایسا ہی ناقابل قبول بن جاتا ہے، جیسا کہ اس کی شہادت اس کے دشمن کے خلاف ناقابل قبول ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ منصبِ افتاء ایک عظیم امانت ہے، اس منصب پر فائز ہونے والے کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے رہے، اور ہمہ وقت اس بات کو ذہن میں رکھے، کہ کل قیامت کے روز اپنے فتوی وغیرہ میں ہر استعمال کئے جانے والے کلمہ کے بارے میں، حساب دینا ہوگا۔ فتوی میں اپنے لیے، اپنے دوست کے لیے، اپنے قریبی کے لیے نرمی، اور دوسروں کے لیے سختی کو روا نہ رکھے، کیوں کہ وہ اللہ رب العزت کی طرف سے اس کا فرمان لکھنے والا ہے، اور تمام لوگ اللہ تعالی کی نگاہ میں یکساں ہیں۔

قواعدِ افتاء:

۱۔ معرفتِ طبقاتِ فقہا: مفتی جس کے قول پر فتوی دے رہا ہے، اسے اس کے حال کی معرفت لازم ہے تاکہ روایتِ مسائل، درایتِ دلائل اور طبقاتِ فقہاء میں اس کے مرتبہ سے آگاہ ہو، اور مختلف رائیں رکھنے والے فقہاء کے درمیان امتیاز کر سکے، اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے پر قدرت حاصل ہو۔

فقہاء کے سات طبقے ہیں:

(۱) مجتہدین مطلق: وہ حضرات فقہاء جنہوں نے شریعت میں اجتہاد کیا، مثلاً ائمہ اربعہ، کہ انہوں نے قواعد اصول کی بنیاد رکھی، اور اصول وفروع میں کسی کی تقلید کئے بغیر، ادلہ اربعہ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس) سے فروعی احکام مستنبط کئے۔

(۲) مجتہدین فی المذہب: جیسے: امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، امام محمد بن الحسن بن واقد ابو عبداللہ الشیبانی، جو اپنے استاذ کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی روشنی میں ادلہ اربعہ سے استنباطِ احکام کی قدرت رکھتے ہیں۔

(۳) مجتہدین فی المسائل: جن جزئیات ومسائل میں امام اعظم اور ان کے تلامذہ سے کوئی روایت منقول نہیں یہ حضرات اپنے اجتہاد سے ان کے احکام بیان کرتے ہیں، مثلاً امام خصاف، امام طحاوی، امام کرخی، حلوائی، سرخسی،

بزدوی، اور قاضی خان وغیرہ، یہ حضرات امام صاحب کی نہ اصول میں مخالفت کرتے ہیں نہ فروع میں، البتہ امام صاحب کے اصول کو سامنے رکھ کر ان جزئیات وفروعات کے احکام مستنبط کرتے ہیں، جن کے بارے میں امام اعظم سے کوئی قول منقول نہیں ہے۔

(۴) اصحابِ تخریج: یہ وہ حضرات فقہاء ہیں جو مجتہدین نہیں مقلدین ہیں، لیکن اصول اور ان کے مآخذ سے واقف ہوتے ہیں، جب صاحب مذہب یا اس کے تلامذہ میں سے کوئی مجمل یا ذوجہتین قول منقول ہوتا ہے، تو اپنی خداداد صلاحیت سے، امام کے بیان کردہ اصولوں اور نظائر وامثال پر قیاس کرکے تفصیل یا تعیین جیسے عظیم کام کو انجام دیتے ہیں، جیسے کہ ہم ہدایہ وغیرہ میں پڑھتے ہیں ''کذا فی تخریج الکرخی'' یا ''کذا فی تخریج الرازی''۔

(۵) اصحابِ ترجیح: یہ حضرات فقہاء بھی مقلدین ہی ہیں، جب صاحب مذہب یا ان کے شاگردوں میں سے، کسی ایک ہی مسئلہ میں دو روایتیں منقول ہوتی ہیں تو یہ حضرات کسی ایک روایت کو ''ھذا أولی'' ''ھذا أصح روایۃ'' ''ھذا أوضح'' ''ھذا أوفق للقیاس'' اور ''ھذا أرفق للناس'' جیسی تعبیرات سے راجح قرار دیتے ہیں۔

(۶) اصحابِ تمییز: یہ حضرات بھی مقلدین ہیں، مگر اقوی، قوی اور ضعیف کے درمیان تمیز، اور ظاہر روایت، ظاہر مذہب اور روایتِ نادرہ کے مابین فرق کرسکتے ہیں، جیسے متونِ معتبرہ، کنز، مختار، وقایہ اور مجمع کے مصنفین رحمہم اللہ تعالی۔

(۷) وہ فقہاء جو مقلدِ محض ہیں، جو مختلف اقوال، کارآمد اور نکمے کے درمیان نہ تمیز پر قادر ہوتے ہیں، اور نہ ہی ان کو دایاں بایاں سمجھتا ہے، بل کہ جو کچھ ملے ان سب کو اپنی کتابوں میں جمع کرلیتے ہیں۔ خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو ان کی تقلید کرتے ہیں۔

نوٹ: فقہاء کرام کی یہ درجہ بندی علامہ ابنِ کمال پاشا نے فرمائی ہے، حضرات علمائے کرام نے اس کو بنظرِ استحسان دیکھا، مگر ہر طبقہ کی جو مثالیں دی گئیں، ان میں مناقشہ ہے۔ (فلیراجع إلی رسم المفتی)

۲- معرفتِ طبقاتِ مسائل: درجہ بندی کے لحاظ سے مسائل کی تین قسمیں ہوں گی:

۱/ مسائلِ ظاہر الروایۃ۔ ۲/ مسائلِ نوادر۔ ۳/ مسائلِ نوازل۔

مسائلِ ظاہر الروایۃ: کتبِ ظاہر الروایۃ (جامع صغیر، جامع کبیر، سیر کبیر، سیر صغیر، زیادات، الزیادات، مبسوط) امام محمد کی تصنیف فرمودہ ہیں، ان کتابوں میں آپ نے ائمۂ مذہب سے مروی اقوال کو جمع فرمایا ہے، ان کو مسائلِ ظاہر الروایۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ امام محمد سے قابلِ اعتماد راویوں کے ذریعے منقول ہیں۔

مسائلِ نوادر: ان چھ کتابوں کے علاوہ امام محمد کی دیگر کتابیں بھی ہیں، مگر ان کو آپ کا کوئی ایک شاگرد ہی روایت کرتا ہے، اس لیے ان کے مسائل کو مسائلِ نوادر کہا جاتا ہے۔

مسائلِ نوازل: مجتہدین کے زمانہ گزر جانے کے بعد جو حوادث ونوازل (نئے مسائل) پیش آئے، اور ان کے احکام مجتہدین سے منقول نہیں تھے، بعد کے اکابر نے دلائل سے ان کے احکام بیان کیے، ایسے مسائل کو مسائلِ نوازل کہا جاتا ہے، فقیہ ابو اللیث سمرقندی کی ''کتاب النوازل'' غالباً اسی قسم کے مسائل کا مجموعہ ہے۔

طبقاتِ مسائل کا جاننا اس لیے ضروری ہے تاکہ عند الافتاء اس کا لحاظ رکھا جاسکے۔

۳- یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کلامِ شارع (کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ) میں مفہومِ مخالف معتبر نہیں، البتہ عام بول چال، معاملات وعقلیات عباراتِ فقہیہ اور حضراتِ صحابہ کے وہ اقوال جو رائے واجتہاد سے جانے جاسکتے ہیں، میں مفہومِ مخالف معتبر ہے، بشرطیکہ وہ کسی صریح بات کے خلاف نہ ہو، کیوں کہ صریح بات مفہوم پر مقدم ہوتی ہے۔

۴- عرف وعادت کا خیال رکھیں، کیوں کہ کبھی اس پر حکم کا دارومدار ہوتا ہے، اور عرف وعادت کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں، جیسا کہ فقہ کا قاعدہ ہے: ''لاینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان''۔ (دررالحکام: ۱/۴۸)

''الثابت بالعرف کالثابت بالنص''۔ اور ثابت بالعرف ثابت بالنص کی طرح ہوتا ہے۔ (قواعد الفقہ: ۷۴)

عرف سے مراد وہ عرف ہے جو عقل کی رو سے دلوں میں جم جائے، اور سلیم فطرتیں اس کو قبول کرلیں۔

عادت سے مراد وہ بات جو کسی عقلی ربط کے بغیر بار بار پیش آئے۔

لیکن اتنی بات یاد رہے کہ عرفِ عام اور عادتِ غالبہ ہی معتبر ہوتی ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ اس کے اعتبار سے ترکِ منصوص لازم نہ آتا ہو، بلکہ محض تخصیصِ نص لازم آتا ہو، رہا عرفِ خاص تو اس کا اعتبار ان دونوں صورتوں میں نہیں کیا جائے گا، وہ صرف عرف والوں کے حق میں اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ نہ ترکِ نص لازم آئے اور نہ تخصیصِ نص۔

۵- عبادات میں امام صاحب کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔

۶- مسائلِ قضاء میں امام ابو یوسف کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔

۷- مسائلِ ذوی الارحام میں امام محمد کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔

۸- قیاس اور استحسان میں تعارض کی صورت میں استحسان کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی، الا فی مسائل۔

۹- ظاہر روایت پر فتوی دیا جائے گا۔

۱۰- اختلافِ روایات کی صورت میں درایت (دلیل) کا لحاظ کیا جائیگا، یعنی جب کسی مسئلہ میں امام صاحب سے مختلف روایتیں منقول ہوں تو ان میں سے جو دلیل کے اعتبار سے قوی ہو، اس کو لینا بہتر ہے۔

۱۱- کفر کے فتوی میں احتیاط برتی جائے گی، یعنی کسی ایسے مسلمان کی تکفیر کا فتوی نہیں دیا جائیگا، جس کے کلام کو اچھے محمل پر محمول کیا جاسکتا ہو، یا جس کے کلام کے کفر ہونے میں روایتیں مختلف ہوں، خواہ اختلاف پیدا کرنے والی روایت ضعیف ہو۔

۱۲- مرجوع عنہ قول منسوخ قول ہوتا ہے، اس لیے اس صورت میں اس قول کو تلاش کرنا ضروری ہے، جس کی طرف مجتہد نے رجوع کیا ہے، اور اسی پر عمل کیا جائے گا۔

۱۳- کسی قول کا متون میں ہونا اس کی ضمنی تصحیح ہے، کیوں کہ ان متون کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں صحیح اقوال کو لینے کا التزام کیا ہے لہٰذا جو اقوال متون سے باہر ہیں، جب تک ان کی صراحۃً تصحیح نہ کی جائے وہ صحیح کے مقابل ہوں گے، اور

صریح تصحیح کے بعدان کومتون کے اقوال پر مقدم کیا جائیگا، کیوں کہ تصحیح صریح تصحیح ضمنی الالتزامی پر مقدم ہوتی ہے۔

متونِ معتبرہ یہ ھیں: بداية المبتدی، مختصر القدوری، المختار، النقاية، الوقاية، كنز الدقائق، ملتقی الأبحر۔ یہ کچھ اساسی اور بنیادی قواعد ہیں، جن کو''رسم المفتی'' کو سامنے رکھ کر اجمالاً ذکر کیا گیا، ان کی تفصیل کے لیے آپ رسم المفتی دیکھ سکتے ہیں۔

تحدیدِ متقدمین ومتأخرین:

(۱)علامہ ذہبیؒ نے تیسری صدی کے ختم کو متقدمین اور متاخرین کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا، یعنی تیسری صدی کے ختم تک جو علما گزرے وہ متقدمین اور جو اس کے بعد والے ہیں وہ متاخرین، قال الذهبي: الحد الفاصل بين العلماء المتقدمين والمتأخرين رأس القرن الثالث، وهو الثلاث مائة فالمتقدمون من قبله والمتاخرين من بعده ۔
(رسائل ابن عابدین: ۱/ ۱۶۱)

(۲)اس سلسلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ جن علما نے امام صاحب اور صاحبین کا زمانہ پایا اور ان سے استفادہ کیا وہ متقدمین اور جنہوں نے نہیں پایا وہ متاخرین۔

(۳)تیسرا قول یہ ہے کہ امام محمدؒ تک کہ علما پر لفظ متقدمین اور ان کے بعد حافظ الدین بخاری تک کے علما پر متاخرین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ اعلم

۱۴-جب کسی مسئلہ میں متقدمین سے کوئی روایت نہ ہو اور متاخرین میں اختلاف ہو تو اکثر حضرات کے اس قول کو لیا جائے جس پر مشہور اکابر مثلاً ابو حفص کبیر، ابو جعفر ہندوانی، ابو اللیث سمرقندی، اور امام طحاوی رحمہم اللہ نے اعتماد کیا ہو۔

۱۵-اگر کسی مسئلہ میں نہ متقدمین کا کوئی قول ہو اور نہ متاخرین کا، اور مفتی مقلد ہو تو اس کی اپنی رائے میں جو افقہ ہے اس کے قول کو اختیار کر لے، اور جواب میں اسی کا حوالہ دے، مثلاً فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم اس سلسلہ میں یہ فرماتے ہیں: یہ اس وقت ممکن ہے جب اس بارے میں ان کا کوئی قول ہو، اور اگر نہ ہو تو ان سے رابطہ قائم کر کے، ان کی رائے معلوم کرے، محض اٹکل سے جواب نہ لکھدے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی سے ڈرے۔ (فتاوی قاضی خان بر حاشیہ عالمگیری: ۱/ ۳)۔{قل إن الذين يفترون على الله الكذب لا يفلحون}۔ آپ کہہ دیجئے کہ یقیناً جو لوگ اللہ پر جھوٹ گڑھتے رہتے ہیں وہ فلاح نہیں پانے کے۔
(یونس: ۶۹)

۱۶-قواعدِ کلیہ سے فتوی نہ دے، بلکہ صریح جز ئیہ کا اہتمام کرے، کیوں کہ شاید ہی کوئی واقعہ یا ایسا جز ئیہ ہوگا، جس کا کتبِ مذہب میں تذکرہ نہ ہو، یا تو بعینہ وہ جز ئیہ مذکور ہوتا ہے یا ایسا قاعدہ کلیہ مل جاتا ہے جو طالب حکم جز ئیہ کو شامل ہوتا ہے۔

۱۷-نظیر سے فتوی نہ دے، ممکن ہے وہ نظیر زیر تحقیق واقعہ سے ملتی جلتی ہو، مگر دونوں کا حکم الگ الگ ہو، اور آپ کی نظر وہاں تک نہ پہونچ سکے، کیوں کہ بہت سے مسائل شکل وصورت میں یکساں ہوتے ہیں اور حکم میں مختلف، اس طرح کے

مسائل پر علمانے مستقل کتابیں لکھیں، جیسے الاَ شباہ والنظائر، الفروق للقرافی وغیرہ۔

نوازل کیا ھے، ان کو کس طرح حل کیا جائے گا؟؟

نوازل نازلۃ کی جمع ہے، نزل ینزل سے صیغہ اسمِ فاعل، بمعنی اترنے والی، یعنی پیش آمدہ سختی ومصیبت۔

اصطلاحِ احناف میں نوازل کا اطلاق فتاوی اور واقعات پر ہوتا ہے، اور فتاوی وواقعات وہ مسائل ہیں جن کو متاخرین فقہاء نے اس وقت مستنبط کیا جب ان سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا، اور انہوں نے اس سلسلہ میں متقدمین اہلِ مذہب کی کوئی روایت نہیں پائی، اور یہاں متاخرین سے مراد امام ابو یوسف، امام محمد کے تلامذہ اوران کے تلامذہ کے تلامذہ وغیرہ مراد ہیں۔

اسبابِ نوازل:

بنیادی طور پر دو سببوں سے نئے مسئلوں نے جنم لے لیا: (۱) علمی وصنعتی ترقی وپیش قدمی۔ (۲) فسق وفجور

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا تھا: "تحدث للناس أقضية بقدر ما أحدثوا من الفجور"۔ لوگ جس قدر فجور میں مبتلا ہوں گے اس قدر نئے مسائل پیدا ہوں گے۔ (المنتقی شرح الموطا للباجی: ۶/ ۱۴۰)

نوازل سے متعلق حکمِ اجتهاد اور اس کی اهمیت:

اسلام قیامت تک آنے والی تمام انسانیت کے لیے دین ہے، اور اس میں اس کے تمام مسائل کا حل موجود ہے، اور یہ حل اسی وقت ممکن ہے جبکہ امت کا ایک طبقہ جو اس کا اہل ہو نوازل میں اجتہاد کر کے اس کے حکمِ شرعی سے لوگوں کو مطلع کریں، معلوم ہوا کہ نوازل میں اجتہاد واجب کفایہ ہے۔

اجتہاد فی النوازل کی اہمیت بنیادی طور پر ان تین باتوں سے عیاں ہوتی ہے:

(۱) اجتہاد فی النوازل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ شریعت ہر مکان وزمان کے لیے ہے۔

(۲) اجتہاد فی النوازل کے ذریعہ امت کو اس بات پر متنبہ وبیدار کیا جاتا ہے کہ جن مسائل میں وہ مبتلا ہو رہی ہے، وہ قواعدِ دین اور مقاصدِ شرعیہ کے مخالف ہیں۔

(۳) اجتہاد فی النوازل کے ذریعہ تمام شعبہائے زندگی میں احکامِ شرع پر عمل پیرا ہونے کی کھلی وصریح دعوت دی جاتی ہے وغیرہ۔

نوازل (مسائلِ جدیدہ) کو حل کرنے کا طریقہ:

نوازل کو حل کرنے کے لیے بنیادی طور پر یہ تین باتیں ضروری ہوتی ہیں:

(۱) تصورِ نازلہ (Portry in the mind) (۲) تکییفِ نازلہ (Conditioning fitting)

(۳) تطبیقِ نازلہ (Adaptation)

تصور: کسی بھی شئ پر حکمِ شرعی لگانے کے لیے اس کا صحیح خاکہ ذہن میں ہونا ضروری ہوتا ہے، کیوں کہ تصورِ شئ اصل اور اس پر حکمِ شرعی کا لگانا اس کی فرع ہے، اور بدونِ اصل فرع کا تصور نہیں ہوا کرتا۔

تصورِ شئ کے لیے دو چیزیں درکار ہوتی ہیں: (۱) فہمِ نفسِ نازلہ، کہ فی ذاتہ یہ کیا ہے؟ (۲) فہمِ اثراتِ نازلہ، کہ اس سے

کون کون سے اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

تکییف: سے مراد اصولِ شرعیہ میں سے کسی اصل کی طرف کسی مسئلہ کو پھیرنا۔

تطبیق: سے مراد نازلہ پر حکمِ شرعی کو اتارنا، چسپاں کرنا۔

اب ان تینوں باتوں کو آپ درج ذیل مسئلہ سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، مثلاً مسئلہ بیمہ نازلہ ہے۔

بیمہ کی حقیقت یقین دہانی ہے، کمپنی بیمہ کرانے والے افراد کو بعض خطرات سے حفاظت اور بعض نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کراتی ہے، کمپنی بیمہ کے طالب شخص سے ایک متعینہ رقم بالاقساط وصول کرتی رہتی ہے، اور ایک معینہ مدت کے بعد اسے یا اس کے پسماندگان کو حسبِ شرائط واپس کرتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ فی صد کے حساب سے مزید رقم بھی بطور سود دیتی ہے۔ اس کی متعدد قسمیں ہیں، زندگی کا بیمہ (Life insurance)، املاک کا بیمہ (Goods insurance)، ذمہ داری کا بیمہ (Third party insurance)، مستندات کا بیمہ وغیرہ، عقد کی یہ صورت سود و قمار پر مشتمل ہے۔ (یہ ہے تصورِ نازلہ)

اب ہم نے اس عقد کو دلائلِ شرعیہ

{یاایھا الذین آمنوا لاتاکلوا الربوا أضعافاًمضاعفةً وتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون}۔ (آل عمران ۱۳۰)

{إن الذين يأكلون الربوا لا يقومون إلا كما يقوم الذي يتخبطه الشيطان من المس}۔ (البقرة ۲۷۵)

{یاایھا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون}۔ (المائدۃ ۹۰) {یمحق اللّٰہ الربوا ویربي الصدقات}۔ (البقرۃ ۲۷۶) {یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقي من الربوا إن کنتم مؤمنین}۔ (البقرۃ ۲۷۸) ((عن جابر لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ)) ۔ (ابوداود: ۲/ ۱۱۷، صحیح مسلم: ۲/ ۲۷) کی طرف پھیرا، تو یہ سب دلیلیں سود و قمار کو حرام قرار دیتی ہیں۔ (یہ ہے تکییف)

اس لیے بیمہ حرام قرار پایا۔ (یہ ہے تطبیق)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شخص تصورِ نازلہ، تکییف اور تطبیق کے ذریعہ احکامِ شرعیہ معلوم کرسکتا ہے؟

نہیں ہرگز نہیں! اس کے لیے کچھ ضوابط ہیں:

۱- نئے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کوشاں شخص کے لیے، مصادر و دلائلِ احکام سے پوری طرح واقف ہونا، مقاصدِ شرعیہ کا عالم ہونا، علمِ لسانِ عرب کا حامل اور اصولِ فقہ کا عارف ہونا، نیز غور و فکر میں اپنی پوری طاقت صرف کرنا ضروری ہے۔

۲- جس حکمِ شرعی کا استنباط کیا گیا اس کا کسی معتبر دلیلِ شرعی کی طرف منسوب ہونا لابدی ہے، کبھی یہ دلیل نص، اجماع، قیاس تو کبھی استصلاح وغیرہ ہوسکتی ہے۔

لمحہ فکریہ:

نوجوان مفتیانِ کرام جن کو اللہ رب العزت نے فقہی ملکہ، تصورِ صحیح اور فہمِ دقیق کی دولت سے نوازا، بسا اوقات

جدید مسائل کے حل میں ان کے قلمِ افتاء سے نصوصِ کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ الاخری ۱۴۳۲ھ اجماع جیسی عظیم غلطیاں ہوجاتی ہیں، عامۃً اس کی دو وجہیں ہوتی ہیں: (۱) تاویل واجتہاد۔ (۲) بعض خارجی موثرات سے متاثر ہونا۔ جیسے بعض لوگوں نے سودی بینکوں کے معاملات کو حلال اور اس میں عمل کو جائز قرار دیا، حالاں کہ یہ صریح نصوص کی مخالفت ہے، اور بعض لوگوں نے ٹی وی وغیرہ پر خبریں پڑھنے اور پروگرام پیش کرنے کے لیے عورتوں کی مشارکت کو جائز قرار دیا، حالاں کہ یہ مقاصدِ شرعیہ اور قواعدِ کلیہ کے مخالف ہے۔

جب کہ دوسرے بعض خود ساختہ مفتیان جو فقہی ملکہ، تصورِ صحیح اور فہمِ دقیق سے محروم ہونے کے باوجود جدید مسائل کے حل میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، اور فقہی ذوق وتحقیق سے عاری، مقاصدِ شرعیہ سے ناواقف، دلائلِ شرعیہ سے تہی دامن اور قرآن وحدیث کا خاطر خواہ علم نہ ہونے کی وجہ سے، اپنے فتوی میں محض عرف ورواج، عمومِ بلوی، تعامل اور ضرورت جیسی دلیلوں کو ذکر کر کے بہت سی ناجائز وحرام چیزوں کے حلال وجواز کا فتوی دیتے ہیں، جب کہ انہیں سمجھنا چاہیے کہ عرف ورواج کے بدلنے سے صرف وہی مسائلِ اجتہادیہ بدلتے ہیں، جن کی بنا فقہائے کرام نے اپنے زمانے کے عرف ورواج پر رکھی تھی، اور آج وہ عرف بدل چکا۔

اسی طرح عمومِ بلوی کا اعتبار مسائلِ منصوص میں نہیں ہوتا، بل کہ مسائلِ اجتہادیہ میں ہوتا ہے، ورنہ آج غیبت، سود خوری، گانا، موسیقی اور غیر اسلامی تہواروں میں شرکت وغیرہ عام ہو چکا ہے، کیا اس ابتلا کی وجہ سے ان کی حرمتِ منصوصہ ختم ہوجائے گی؟

اسی طرح تعاملِ ناس سے ہر تعامل مراد نہیں، بل کہ وہی تعامل مراد ہے جس پر علمائے عصر نے کوئی نکیر نہ کی ہو۔

اسی طرح ضرورت وہی ہے جس کو شریعت نے ضرورت قرار دیا: ''الضرورۃ بلوغہ حداً إن لم یتناول الممنوع ھلک أو قارب وھذا یبیح تناول الحرام''۔ ضرورت کی حد یہ ہے کہ آدمی ممنوع چیز کے استعمال نہ کرنے سے ہلاک ہوجائے یا ہلاکت سے قریب ہوجائے۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۲۸/۱۹۱)

آج لوگوں کا یہ حال بن چکا ہے کہ ان کی زیغوں نے ضرورتوں کا درجہ لے لیا، تو کیا ہم ان کی وجہ سے ان کو محرماتِ شرعیہ کے استعمال کی رخصت دیں گے؟

ہمارے دور کے مفتیانِ کرام کے لیے مسائلِ جدیدہ حل کرنے کے لیے دو چیزیں درکار ہیں: اجتہاد اور تدین، اجتہاد سے مراد یہاں یہ ہے کہ فقہاء کے اقوال وواقعات پر صحیح طور پر منطبق کرنا آتا ہو، اور یہ اجتہاد ختم نہیں ہوا، بل کہ قیامت تک باقی رہے گا۔

اور تدین سے مراد یہ ہے کہ اغراض کا تابع نہ ہو، کہ کھینچ تان کرنا جائز کو حدِ جواز میں لائے۔

آدابِ فتوی نویسی

سوال وصول کرنے کے بعد:

☆ سوال وصول کر کے مستفتی کے سامنے ہی غور سے پڑھیں، اغلاط کو درست اور شکستہ لفظ کو مکمل کریں۔

☆ اگر سوال ناقص اور مبہم ہو تو قابلِ وضاحت امور خود سائل سے سوالنامہ پر لکھوالیں، اگر وہ [illegible] الفاظ نہیں لکھ سکتا تو آپ اسے املاء کرواسکتے ہیں۔

☆ اگر سوال میں اضافے کا موقع نہ بنتا ہو تو جواب میں یوں لکھیں: ''سائل نے زبانی طور پر اضافی بات بتائی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو۔۔۔۔۔۔۔''

☆ یا یوں لکھیں: ''جیسا کہ سائل کے زبانی بیان سے معلوم ہوا۔۔۔۔۔۔۔''

سوال کی تکمیل سائل سے کروائیے:

☆ جواب کی توضیح اور اس میں درج حقائق کی صحت کی تمام تر ذمہ داری سائل پر ڈالیں، سوال مبہم ہو تو خود سے اس کا کوئی مطلب متعین کر کے جواب نہ لکھیں، سائل کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے، بہتر یہ ہے کہ جب سوال میں ایسا ابہام یا اجمال ہو جو سمجھ میں نہ آئے تو مستفتی کو بالمشافہہ حاضر ہونے کو کہہ دیں، ڈاک سے آمدہ سوال پر ''فلاں فلاں امور کی وضاحت کریں'' لکھ کر بھیج دیں۔

تردید یا تشقیق ممنوع ہے:

☆ جواب کبھی تردید یا تشقیق کے ساتھ نہ دیں، یعنی یوں نہ لکھیں: ''اگر سائل کی نیت یہ تھی تو حکم یہ ہوگا، اگر یہ نیت تھی تو حکم یوں ہوگا'' یا ''فلاں صورت ہو تو یہ حکم ہے ورنہ یہ حکم''۔ اس سے تزویر (جعل سازی) اور غلط بیانی کا دروازہ کھل جاتا ہے، سائل کو جس صورت میں فائدہ ہوتا ہے، وہ دانستہ، شعوری یا لاشعوری طور پر یا نادانستہ اس کا دعویٰ کرنے لگتا ہے، نیز ان شقوں کے خلط ہونے کا امکان ہے، ہر سائل کو اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ ہر شق کے جواب کو علیحدہ علیحدہ کر کے اس کے صحیح محمل پر منطبق کر سکے، لہٰذا سوال وصول کرتے وقت غور سے پڑھ کر تردید یا تشقیق کر کے سوال کو منقح تو کر لیں، مگر جواب میں تمام صورتیں نہ لکھیں، تنقیح کرتے وقت اشارہ یا کنایہ میں بھی سائل کو یہ پتہ نہ چلنے دیں کہ کونسی صورت میں اس کا فائدہ ہے؟ اس سے حقیقت کو واضح کروائیں لیکن خود حکم کو مبہم رکھیں۔

جواب لکھتے وقت

جواب کو قاطعِ اشکال ہونا چاہئیے:

☆ جواب کو ہمیشہ ایسا ہونا چاہیے جس سے منشأِ اشکال ختم ہو جائے، بعض مرتبہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں، کہ ان کا جواب دیے بغیر سائل کی تشنگی دور نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اصل جواب کے ساتھ اس امر کی وضاحت بھی کرنی چاہیے، مثلاً: سائل نے پوچھا: شوہر نے طلاق دیدی ہے لیکن بیوی حائضہ تھی یا حمل سے تھی، ایسے سوال میں صرف یہ لکھ دینا کافی نہیں، ''طلاق واقع ہوگئی'' بلکہ یہ بھی لکھنا چاہیے: ''حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے'' یا ''حمل طلاق سے مانع نہیں''۔

حلِ استفتاء کی چار بنیادیں:

☆ استفتاء کے حل کے لیے چار کام بالترتیب کیے جاتے ہیں:

(۱) تجزیہ و تحلیل (۲) تنقیح و تہذیب (۳) نکتۃ الغور کی تعیین (۴) مراجع و مظان کا انتخاب اور ان سے صحیح استنباط۔

☆جواب کی صحت ان امور اربعہ کو صحیح صحیح انجام دینے پر موقوف ہے، لہٰذا اس میں الاحوط فالاحوط پر عمل کریں اور ہمت وچستی سے کام لیں، اس کا طریقہ متداولہ یہ ہے:

☆استفتاء لینے کے بعد مراجعتِ کتب سے پہلے اسے کئی بار اچھی طرح غور سے پڑھیں پھر اس کے بعد:

۱-سوال کو اچھی طرح تجزی کریں، امورِ مسؤلہ اصلیہ وضمنیہ کو الگ الگ کریں، یہ تجزیہ وتحلیل ہے۔

۲-کوئی چیز مبہم یا نامکمل ہو تو مستفتی سے پوچھ کر اسے واضح اور مکمل کریں، یہ تنقیح وتہذیب ہے۔

۳-اہم اور بنیادی نکات کو مشخص کریں، بہتر ہے کہ انہیں خط کشیدہ کر دیں، یہ نکتۃ الغور کی تعیین ہے۔

۴-اس کے بعد مظانِ مسئلہ سے مراجعت شروع کریں، اور فہمِ سلیم اور استنباطِ صحیح کو بروئے کار لاتے ہوئے عبارات کی درست تطبیق کریں۔

کم از کم تین مرتبہ:

☆جس طرح مدرس کو چاہیے کہ سبق کی تیاری کے لیے تین مرتبہ مطالعہ کرے: پہلی مرتبہ فہم کے لیے، دوسری مرتبہ افہام کے لیے، اور تیسری مرتبہ تسہیلِ افہام کے لیے، اسی طرح مفتی کو چاہیے کہ سوال کو تین مرتبہ پڑھے:

۱) پہلی مرتبہ تجزیہ وتحلیل کر کے سوال کے مختلف اجزا کو سمجھے، اصل اور ضمنی امورِ مسئولہ کی صحیح صحیح تعیین کرے، اور تنقیح کر کے سوال کے اہم نکات کو خط کشیدہ کرے۔

۲) دوسری مرتبہ اس مرکزی نکتہ کو سمجھنے کوشش کرے جو اصل امرِ مسؤل ہے، اور اس پر سارے سوال کا مدار ہے۔

۳) پھر جب مراجع ومظان میں مسئلہ سے متعلق عبارات تلاش کرلے، اور سوال میں پوچھی گئی باتوں پر ان کی تطبیق کر چکے، تو جواب کی عبارت سوال کے اسلوب کے مطابق ترتیب دینے، اور اس کو آسان الفاظ میں ڈھالنے کے لیے ایک مرتبہ اور سوال کا مطالعہ کریں۔

جواب لکھنے کا معیاری طریقہ:

☆جواب لکھنے کا معیاری طریقہ یہ نہیں، کہ آپ استفتاء پڑھتے ہی جھٹ کسی جزئیہ کی تلاش میں لگ جائیں، افتاء کے باب میں اصل الاصول یہ ہے کہ سوال میں پوچھے گئے امر کی حقیقت کو سمجھیں، سوال کا تجزیہ وتحلیل اور تنقیح وتہذیب کر کے نکتۃ الغور منقح کریں، پھر اس پر عباراتِ فقہیہ، صریحی ہوں یا استنباطی صحیح طور سے منطبق کریں، اس طرزِ عمل کے مطابق مشق کرنے سے رفتہ رفتہ افتاء کی اہلیت اور ملکۂ فقہیہ پیدا ہوجاتا ہے، اس کے بغیر کثیر تعداد میں فتاوی لکھنے کے باوجود کامیابی کی ضمانت نہیں۔

جزئیات کی تلاش:

☆یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے کہ اصولوں سے بے دھڑک جوابات کی بجائے، جزئیات تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے، اس کے لیے فقہی کتب اور ان کے مصنفین کے اسلوب ومزاج سے واقفیت نہایت ضروری ہے، اس لیے وقتاً فوقتاً کتب خانہ میں جاکر مختلف کتبِ فقہ وفتاویٰ کا مطالعہ کرتے رہیں، ایک مرتبہ جس کتاب کو ہاتھ میں لیں، اس سے

عمومی اور جامع واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہی اس کو رکھیں، یہ عادت وسعتِ مطالعہ الاخری ۱۴۳۸ھ ہے۔

☆ کتابوں سے مراجعت، دلجمعی اور مستقل مزاجی کا کام ہے، اس میں پوری ''جہد'' صرف کرنے کے بعد ہی ''لم أجده'' کا قول معتبر ہوتا ہے۔

کلیات سے اجتناب:

☆ تلاشِ بسیار کے بعد بھی صریح جزئیہ نہ ملے اور جواب کلیات سے دیا ہو تو آخر میں لکھ دیں: ''یہ جواب کلیات سے دیا ہے (یا قواعد کو سامنے رکھ کر دیا ہے) کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا، لہٰذا دوسرے حضرات سے بھی رجوع کر لیا جائے''۔

کلیات سے سوال:

☆ سائل اگر کلیات سے سوال کرے، مثلاً کسی شخص نے اپنی ساس کو شہوت سے چھو لیا، کیا حکم ہے؟ تو جواب میں لکھ دیں: ''کلیات سے سوال کرنا اصول کے خلاف ہے، جزئیات ظاہر کر کے پوری بات لکھو، پھر جواب معلوم کرو'' ایسے شخص کو ہرگز کلی حکم نہ بتائیں، نہ جانے کہاں منطبق کرے، پھر اگر وہ صورتِ مسئلہ بتا دے تو بطورِ احتیاط جواب کے آغاز میں ان الفاظ کے ساتھ پیش بندی کریں: ''اگر سوال میں لکھی گئی بات واقعہ کے مطابق ہے تو۔۔۔۔۔''

مراجع ومظان:

☆ سوال کی تنقیح وتہذیب، تحلیل وتجزیہ اور نکتۃ الغور کی تعیین کے بعد کتب سے مراجعت کی باری آتی ہے، مراجعت کرتے وقت ایک آدھ کتاب دیکھ کر جواب لکھنا ٹھیک نہیں ہے، بل کہ کئی کتابیں دیکھ کر جواب لکھا جائے، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ایک سے زیادہ کتب سے مراجعت میں مسئلہ کے ہر پہلو سے آشنائی حاصل ہوگی، اور اس کے ساتھ کئی اور مسائل بھی نظر سے گذر جائیں گے، جو وسعتِ مطالعہ کی کلید اور بوقتِ ضرورت بہت مفید سرمایہ ہیں، البتہ حوالہ ایک کا نقل کر دینا کافی ہے۔

☆ حلِ استفتاء کے بعد اردو فتاویٰ سے اس غرض سے رجوع کیا جا سکتا ہے، تا کہ معلوم ہو سکے کہ اکابر نے ایسے استفتاء کے جواب میں کیا تحریر فرمایا ہے، اور راقم کی تحریر میں ان کی تحریرات سے کتنا بُعد ہے؟ خاص طور پر امداد الفتاوی، امداد المفتیین، امداد الأحکام، احسن الفتاوی، خیر الفتاوی، اور جواہر الفقہ کی مراجعت ہونی چاہیے۔

☆ اردو فتاویٰ سے بعینہٖ انہی کے الفاظ سے استفادہ خودفریبی ہے، اس سے کبھی بھی فتویٰ لکھنے کی استعداد پیدا نہیں ہوگی، ہاں اگر کسی مسئلے میں یہ دیکھنا ہو کہ اکابر نے کیا لکھا ہے، اور پھر اس سے اخذ کی ضرورت پڑ جائے تو کوشش کی جائے کہ کم از کم الفاظ اپنے ہوں، تا کہ منقولہ مضمون کی صحیح تعبیر کی اہلیت پیدا ہو سکے، اور اگر انہی الفاظ کا نقل کرنا ضروری ہو تو واوین ('''') میں نقل کیا جائے، تا کہ باقی عبارت سے ممتاز ہو۔

☆ معمول ہے کہ ایسے مسائل جن میں اشتباہ والتباس ہو، یا ان میں اپنے موقف کی تائید وتقویت مقصود ہو تو اکابر کے فتاویٰ کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔

☆ عربی حوالہ دیتے وقت اردو فتاویٰ کے حوالوں پر ہرگز اکتفاء نہ کریں، بل کہ اصل کتاب کی طرف مراجعت کر کے جلد

اور صفحات لکھیں، اگر تتبع کے باوجود ماخذِ اصلی دستیاب نہ ہو، تو اس بات کے اظہار کے لیے کہ ماخذ تک رسائی ممکن نہ ہو سکی، ماخذِ ثانوی سے حوالہ دیا جارہا ہے "بحوالہ فلاں کتب" کی قید لکھی جاتی ہے۔

لاأدري کی ڈھال:

☆ اگر مسئلہ باوجود کوشش کے نہ ملے تو صاف کہہ دیں کہ مجھے یہ مسئلہ معلوم نہ ہوسکا، آپ دوسرے حضرات سے پوچھ لیں، جواب صرف اس صورت میں دیں جب اپنی تحقیق، مسئلہ کی تخریج اور جواب کی صحت پر پورا یقین ہوجائے، کہ وہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ نے سمجھا ہے، بغیر تحقیق کے مسئلہ بتانا ناجائز وحرام ہے، مسئلہ نہ آتا ہو تو اس کے لیے "لا أدري" کا قانون ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

☆ "إذا لم يقل العالم لا أدري فقد أصيبت مقاتله"۔ یعنی جب کسی عالم کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، اور اس نے اس پر "لا أدري" نہیں کہا اور اٹکل سے جواب دے دیا، تو اس پر شیطان ونفس کی ایسی ضرب لگی ہے گویا اسے قتل ہی کر دیا، "مقاتل" ان اعضاء کو کہتے ہیں جن پر ضرب لگنے کے بعد آدمی زندہ نہ رہ سکے۔

مذاہبِ أربعہ کے اصل مآخذ:

☆ مفتی کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ اپنے امام کی فقہ کے مطابق فتوی دے، لیکن اس کی سوچ کا وسیع ہونا، احکام کی علل ودلائل پر گہری نظر ہونا، مسائل کے استنباط کا ملکہ ہونا، اور دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، دوسرے مذاہب کی تحقیقات سے واقفیت کے لیے "الفقه المقارن" پر مبنی کتب مثلاً: "بداية المجتهد، المغني، المدونة الكبرى، الفقه الإسلامي وأدلته" دیکھا کریں، یہ کتب مذاہبِ اربعہ کے اقوال نقل کرتی ہیں، لیکن جب کسی فقہ کا مسئلہ لینا ہو تو اس کی اپنی بنیادی کتب دیکھنا ضروری ہے، اس سلسلے میں فقہ شافعی کے لیے "نهاية المحتاج للرملي، مغني المحتاج للخطيب، اور شرح المهذب للنووي" تین کتابیں اصل ہیں، فقہ مالکی کے لیے: "شرح مختصر الخليل" پر دسوقی کا حاشیہ، "شرح دردير" کا حاشیہ اور "حاشية الحطاب" جس کا نام "المواهب الجليل" ہے، بنیادی ہیں، حنبلی مذہب کے لیے "كشاف القناع" اور بہوتی کی "شرح منتهى الإرادات" بہت اچھی ہیں۔

حکم کی تحلیل کیا کریں:

☆ سوچ میں وسعت پیدا کرنے کا نسخہ یہ ہے کہ درج بالا کتب کا گہری نظر سے مطالعہ کریں، نیز حکم کی تحلیل بھی کیا کریں، یعنی وہ شرع منزّل ہے یا شرع مؤوّل؟ قطعی ہے یا ظنی؟ منصوص ہے یا مستنبط؟ متفق علیہ ہے یا مختلف فیہ؟ منقول من الکتاب والسنۃ ہے یا معقول ومجتہد فیہ؟ اگر منقول ہے تو کس سے ثابت ہے؟ اور اس کا درجہ کیا ہے؟ اگر معقول ہے تو مجتہد کا قول ہے یا بعد کے ائمہ کا؟ اور کس اصل سے ماخوذ ہے؟ نیز وہ اصل کتاب وسنت میں مذکور ہے یا نفسِ اصل ہی

ماخوذ ومستنبط ہے؟ پھر اس کی معقولیت اب بھی باقی ہے یا صرف اسی زمانے کے رائج عرف یا مزاج کے تابع تھی؟ لیکن ایسا کرتے ہوئے غایتِ احتیاط، تمام ائمہ مجتہدین کا انتہائی ادب واحترام اور ان سے عقیدت ومحبت کا پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اعتدال ضروری ھے:

☆ جدید مسائل میں غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ راہِ اعتدال اپنائی جائے، نہ ایسا جمود ہو کہ کتاب وسنت کی نصوص اور فقہاء ومجتہدین کی تحقیقات کو ایک ہی درجہ دے دیا جائے، نہ ایسا تجدد ہو کہ ہر نئی بات کو قبول کرلیا جائے، اس بارے میں افراط وتفریط سے بچنا نہایت ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ کتاب وسنت کی قائم کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھ جائیں، یا شریعت کی حدود سے تجاوز کرکے تجدد واباحت کے راستے کھول دیں، کہ دین میں تصحیف اکبر الکبائر ہے، اور ایسا بھی نہ ہو کہ بدلے ہوئے حالات واقتدار، تغیر پذیر عرف وعادات، اور تبدیل شدہ نظام واطوار سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہر جزئیہ میں متقدمین کے اجتہادات واستنباطات اور ان کے عہد کے حالات پر مبنی احکام ومسائل اور فتاویٰ پر بلا ضرورت اصرار وجمود ہو، اس طرزِ عمل سے عام لوگوں میں دین سے بددلی اور بے دینی کی طرف میلان پیدا ہوگا، سلف نے فرمایا ہے: ''من جهل بأهل زمانه فهو جاهل'' اس لیے مفتی کو یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جہاں دین کی مسلمات کے دائرے سے نکلنا اور سلف صالحین کے اجتہادات کو نظر انداز کرنا ناقابلِ عفو گمراہی ہے، وہیں فقہی جزئیات پر جمود، شریعت کے مصالح ومقاصد سے بے خبری اور اس کی روح سے بے اعتنائی ہے، جو پہلے امر سے قباحت میں زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔

اجتماعی مسائل میں مشاورت ناگزیر ھے:

☆ ایسے اجتماعی مسائل جو پوری امت کو درپیش ہیں، یا ملک کے تمام مسلمانوں کو درپیش ہیں، ان میں انفرادی فتویٰ نہیں دینا چاہیے، ان میں مفتیانِ کرام کی باہمی مشاورت نہایت ضروری ہے۔

عملِ اکابر:

☆ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ستم رسیدہ عورتوں کی مشکلات کا فقہی حل تلاش کرنے کے لیے متعدد حضرات کو ''الحیلة الناجزة'' کی ترتیب کے لیے مقرر فرمایا، حضرت مفتی شفیع صاحب اور مولانا عبدالکریم گمتھلوی رحمہما اللہ ان میں شامل تھے، اس میں کئی مسائل میں فقہ مالکی پر فتوی دیا گیا ہے، لیکن اس فتوی کو اس وقت تک شائع نہیں کیا گیا، جب تک ہندوستان کے تمام اربابِ افتاء سے مراجعت نہیں ہوگئی، اور اصحابِ افتاء کی آراء اور تقدیریں حاصل نہیں ہوگئیں، حرمین شریفین کے فقہاء سے خط وکتابت ہوئی، ان تمام مراحل کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کرایا گیا، پاکستان میں بھی مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ایک مجلس قائم کررکھی تھی، جو آج بھی ''مجلسِ تحقیق مسائل حاضرہ'' کے نام سے موجود ہے، مجلس کی طرف سے کئی رسائل شائع ہوئے، ایک ایک مسئلہ پر بعض اوقات دو دو سال تک تحقیق ہوتی رہی، سعودی عرب میں ''مجمع

الفقه الإسلامي" اور ہندوستان میں "اسلامک فقہ اکیڈمی" فقہی مسائل کے حل کے لیے اجتماعی غور وفکر کی بہترین مثالیں ہیں۔

اسلوبِ فتوی

معتدل اور متوازن عبارت:

☆فتویٰ کی عبارت معتدل، متوازن اور متناسب ہونی چاہیے، اس میں ایجازِ مخل ہونا اطناب ممل، یعنی حد سے زیادہ اختصار بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ تحریر میں کسی قسم کا الجھاؤ یا ابہام قبیح عیب ہے، اور ضرورت سے زیادہ تطویل بھی مناسب نہیں، کیونکہ یہ وعظ وتعلیم یا تصنیف وتالیف کا موقع نہیں ہے، اِلا یہ کہ کسی اہم مسئلے میں حکامِ وقت کو توجہ دلانی ہو، یا اس کی اہمیت عوام کے دل میں بٹھانی ہو تو مکمل تفصیل ووضاحت میں حرج نہیں۔

☆فتویٰ میں مناسب الفاظ کے چناؤ اور بامعنی ومتداول تعبیرات کے انتخاب پر خصوصی توجہ دینی چاہیے، ایسے ٹھیٹھ عالمانہ الفاظ بھی نہ ہوں جن کا مطلب سائل نہ سمجھے، اور نہ ایسے عامیانہ ہوں جو ابتذال کی حد میں آتے ہوں۔

عام فہم اور آسان زبان:

☆جواب ہمیشہ عام فہم اور آسان زبان میں تحریر کیا جائے، تاکہ مخاطب اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لے اور نتیجے تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہو، علمی اصطلاحات اور عربی وفارسی تراکیب استعمال نہ کی جائیں، پہلے زمانے میں علمِ دین کا چرچا، اور عربی وفارسی علمی زبانوں کے طور پر معروف تھیں، اس لیے لوگ علمی وفقہی اصطلاحات سے نامانوس نہ تھے، مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر بحیثیتِ مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا تھا، اگر خود نہ سمجھتا تو اکثر جگہوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو کنز، کافیہ تک پڑھے ہوئے تھے، وہ اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا سکتے تھے، اب صورتِ حال ویسی نہیں رہی، اس لیے سائل عامی ہو تو جواب کی عبارت اس کی ذہنی سطح کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہیے۔

سوال کی تان:

☆سوال کے آخری حصے کو غور سے پڑھ کر دیکھنا چاہیے، کہ سوال کی تان کہاں آکر ٹوٹ رہی ہے، پھر اس کے مطابق الفاظ لے کر جواب ڈھالنا چاہیے تاکہ "السوال معاد في الجواب" سے استفادہ کرتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں مستفتی کی تشفی کی جاسکے۔

معیاری جواب کی خصوصیت:

☆صحیح اور معیاری جواب کا بنیادی وصف یہ ہے، کہ مستفتی کو وہ حکم صاف صاف معلوم ہوجائے، جس کے معلوم نہ ہونے کے سبب استفتاء کی ضرورت پیش آئی، اگر اس کی الجھن حل نہیں ہوتی اور مستفتی اس کا جواب پڑھنے کے بعد اسے واضح طور پر معلوم نہیں ہوپاتا کہ اب وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ تو مفتی نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔

فتوی نویسی کا بہترین اسلوب:

☆مفصل فتاوی میں بعض اوقات مسئلے کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جوابات اس طرح گڈمڈ ہوجاتے ہیں

کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے، اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے **الف تا یا پورا الفتویٰ** پڑھنا پڑتا ہے، بل کہ بعض اوقات پورے فتویٰ کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا، اس لیے فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہیے، تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کرلے، اور جس شخص کو دلائل سے دل چسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے، فتویٰ میں عام آدمی کے لیے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے، دلائل اہلِ علم کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے عام آدمی کو فتوی کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہوجانی چاہیے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا مختصراً جواب کیا ہے؟ اس جواب کے بعد اہلِ علم کے لیے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دیدیے جائیں۔

☆ خلاصہ یہ کہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب بقول مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یہ ہے: ''پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے ہی لفظ سے مل جائے، پھر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے، نہیں پڑھنا چاہتا تو چھوڑ دے، نرا حکم معلوم کرنے کے لیے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے''۔

☆ بعض صورتوں میں جبکہ جواب میں شقیں زیادہ ہوں تو حکم کو منضبط شکل میں لانے کے لیے آخر میں خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

☆ سوال کی عبارت کا باریک بینی سے جائزہ لے کر مستفتی کے محتاج الیہ تمام امور کا بالاستیعاب جواب دینا چاہیے، تاکہ اسے کسی قسم کی تشنگی نہ رہے، اور اعادۂ سوال کی ضرورت نہ پڑے۔

تہ در تہ سوال:

☆ سوال بعض اوقات تہہ در تہہ ہوتا ہے، اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو خلط ملط کرکے پوچھتا ہے، ایسے مواقع پر سوال کا تجزیہ و تنقیح کرکے حل طلب امور کو عقلی و معروضی ترتیب دے کر لکھ دیا جائے: ''اس مسئلے میں یہ باتیں قابلِ غور ہیں'' پھر ان منقّح امور کا ترتیب وار جواب دیا جائے۔

اسلوب الحکیم:

☆ مفتی کے لیے جائز ہے کہ ''اسلوب الحکیم'' اختیار کرتے ہوئے اصل پوچھی گئی بات کے بجائے جو بات انفع للسائل ہے اسے تحریر کرے۔ قال اللّٰہ تعالی: {یسألونک ماذا ینفقون؟قل ما أنفقتم من خیر فللوالدین والأقربین والیتمی والمساکین وابن السبیل}۔

مفید اضافات:

☆ یہ بھی درست ہے کہ پوچھی گئی باتوں کے علاوہ حسبِ موقع وضرورت مفید باتوں کا اضافہ کردیا جائے، اتباعاً للحدیث المعروف: ''ھو الطھور ماؤہ والحل میتتہ'' امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں باب باندھا ہے: ''باب من أجاب السائل بأکثر مما سألہ'' پھر اس میں حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما ذکر کی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ما یلبس المحرم؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لا یلبس القمیص ولا السراویل ولا البرنس ولا ثوبا مسہ

الورس أو الزعفران، فإن لم يجد النعلين فليلبس الخفين، وليقطعهما حتى يكونا تحت الكعبين''۔

مختصر جواب کب مناسب ہے؟

☆جو مسائل بہت واضح ہیں، محتاجِ تفصیل نہیں، یا اکثر و بیشتر پوچھے جاتے رہتے ہیں، ان میں یجوز، لا یجوز یا نا مناسب جیسے مختصر جواب بھی دیئے جاسکتے ہیں۔

مفتی کی معلومات کے مطابق جواب:

☆مفتی کو اگر صورتِ واقعہ کا علم ہے، اور رسوال میں اصل بات تحریر نہیں کی گئی تو سائل سے اصل صورتحال سوال میں لکھوائے یا خود جواب میں یوں لکھے: ''یہ واقعہ چوں کہ دراصل یوں ہے، لہٰذا اس کا جواب یہ ہے ------''۔

☆جب قرینے سے معلوم ہو کہ جواب مستفتی کی غرض کے خلاف ہے، اور وہ اسے اپنے کاغذ پر لکھا جانا ناپسند کرے گا تو زبانی جواب پر اکتفا کرنا مناسب ہے۔

کسی جانب جھکاؤ شانِ علم کے خلاف ہے:

☆مفتی کو سائل یا اس کے خصم کی طرف رجحان یا جھکاؤ اختیار نہیں کرنا چاہیے، اس رجحان و میلان کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً یہ کہ ''ماله'' کو ذکر کردیا جائے ''ما علیه'' کو چھوڑ دیا جائے، یا فریقِ مخالف کے دعویٰ کا جواب اور اس سے خلاصی کا طریقہ خود سے بیان کرنا شروع کردیا جائے۔

تغلیظ فی الجواب:

☆بعض مسائل میں تغلیظ فی الجواب کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے موقع پر مفتی کو موقع کی مناسبت سے تاکیدی الفاظ لکھنے چاہیے، مثلاً: ''یہ قرآن و حدیث کی واضح نصوص اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں'' یا ''فوری علیحدگی فرض ہے، اکٹھے رہنا حرام کاری کا ارتکاب ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

شرعی فتویٰ یا انتظامی مشورہ:

☆بعض اوقات کسی مسئلے کا ٹھیٹھ فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے: مثلاً: ایک چیز فی نفسہ مباح ہے لیکن اس کی کھلی چھوٹ دیدینے سے اندیشہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی، اور لوگ شرعی حدود پر قائم نہیں رہیں گے، پس ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مدِنظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو، اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا، اس موقع پر فقہ و فتاویٰ کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت احتیاط، باریک بینی، موقع و مردم شناسی اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ہر جواب ''صورتِ مسئولہ'' کے لفظ سے شروع نہ کریں۔

☆جواب کے شروع میں ''صورتِ مسئولہ'' کا لفظ صرف اس وقت لکھا جاتا ہے، جب سوال کسی خاص صورت اور حادثہ مخصوصہ کے متعلق ہو، اجتماعی نوعیت کے مسائل میں جو کسی فردِ مخصوص یا انفرادی واقعہ سے متعلق نہ ہوں، صورتِ مسئولہ کا لفظ نہیں لکھا جاتا۔

تزویر کا سدِ باب:

☆ اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل کی طرف سے غلط بیانی کا احتمال ہے، اور حقائق کی تبدیلی سے جواب تبدیل ہو گا تو سوال میں درج امور کی صحت کی ذمہ داری سائل پر ڈالنے کے لیے، اور تزویر کے سدِ باب کے لیے جواب کے شروع میں یوں لکھا جاتا تھا: ''بر تقدیرِ صدق (یا صحت) صورتِ مسئولہ ــــــ'' تاکہ مفتی عند اللہ و عند الناس بری ہو جائے۔

☆ لیکن اب یہ الفاظ عامی لوگ نہیں سمجھتے، لہٰذا یوں لکھنا چاہیے:

☆ ''اگر سوال میں درج کیے گئے امور واقعہ کے مطابق ہیں تو ــــــ''

☆ زیادہ اہم مسئلہ یا متنازع فیہ واقعہ کے آخر میں احتیاطاً اس جیسے الفاظ کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں:

☆ ''یہ جواب سوال کے درج کیے گئے واقعہ/فراہم کی گئی معلومات کے مطابق لکھا گیا ہے، مفتی کو غیب کا علم نہیں ہوتا، اگر حقیقتِ حال اس کے برخلاف ہو تو اوپر لکھا گیا حکم اس پر لاگو نہ ہو گا''۔

مناسخہ کا سوال:

☆ مناسخہ کے سوال میں جب میتیں زیادہ ہوں، اور تصحیح بہت بڑھ جائے تو جواب کو مختصر کرنے کا ایک طریقہ ہے، اس کو اپنانے پر غور کرنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ آخر میں سو روپے ترکہ فرض کر کے المبلغ پر تقسیم کریں، پھر ہر وارث کو جو کچھ ملے گا، وہ اس کا فیصدی حصہ ہو گا، آج کل ہر چیز میں اعشاریہ نظام رائج ہونے کی وجہ سے فیصدی حصہ آسانی سے لوگوں کو سمجھ میں آجاتا ہے، اس لیے میراث سے متعلق سوالوں میں ورثاء کے نام اور حصص کی تکمیل عبارت میں لکھنے کے ساتھ مناسب یہ ہے کہ چار کالم بنائیں، پہلے میں نمبر شمار، دوسرے میں وارث کا نام، تیسرے میں ہر ایک کو ملنے والا حصہ، اور چوتھے میں فیصدی حصہ لکھیں، اور اگر سائل نے ترکہ بتا دیا ہو تو پانچویں کالم کا اضافہ کر کے اس میں ہر وارث کو ملنے والی رقم بھی لکھ دیں، پھر ہر کالم کے نیچے تمام اعداد کو جمع کر کے لکھ دیں۔

عبارات کا اندراج:

☆ فتویٰ نویسی میں دلیل لکھنی چاہیے یا نہیں؟ اس میں اختلاف چلا آیا ہے، راجح یہ کہ (بعض استثنائی سوالات کے علاوہ) دلیلِ مسئلہ لکھنی چاہیے، اس میں کئی فوائد ہیں، منجملہ ان کے یہ کہ اس سے مستفتی کو فہم و بصیرت، اطمینان و ایقان نصیب ہوتا ہے، عمل کرنے پر تحریک ملتی ہے، وساوس و اوہام اور حیل و مکر زائل ہو جاتے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ مفتی اپنے فتویٰ کو دلیل سے مزین کرے، آیت یا حدیث ہو تو فبہا و نعمت، ورنہ تحقیقاتِ مجتہدین یا عباراتِ فقہا ــــــ خصوصاً جب کہ مستفتی کے ذہن میں اشکال ہو، اور بغیر دلیل و تعلیل کے وہ مطمئن ہوتا نظر نہ آتا ہو تو دلیل لکھنی چاہیے۔

عبارت لکھنے کے دو طریقے:

☆ جواب میں عبارت درج کرنے کے دو طریقے ہیں: پہلا کم استعمال ہوتا ہے، دوسرا زیادہ۔

(ا) کبھی عبارت پہلے لکھی جاتی ہے اور جواب بعد میں، ان الفاظ کے ساتھ: ''درج بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے ــــــ''۔

(۲) کبھی جواب پہلے لکھا جاتا ہے اور دلیل بعد میں، ان الفاظ کے ساتھ: ''مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے ______''۔

☆ یہ دونوں طریقے قرآن شریف سے ثابت ہیں، اللہ کا فرمان ہے: {یسألونک عن المحیض قل ھو أذی، فاعتزلوا النساء في المحیض} یہاں علتِ اذی کو حکمِ اعتزال سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، ایک دوسری جگہ حکم کو علت پر مقدم رکھا گیا ہے، ارشادِ باری ہے: {فطلقوھن لعدتھن وأحصوا العدة} اس کی علت آگے ذکر کی گئی ہے: {لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا}

دعوی اور دلیل میں مطابقت:

☆ عبارات سے مطلوب کا ثبوت جس درجے کا ہو، اسی درجے کے الفاظ لکھنے چاہئے، یہ الفاظ ضعف وقوت میں بالترتیب یوں ہیں: ''یوں معلوم ہوتا ہے، معلوم ہوا، ثابت ہوتا ہے، ثابت ہوا''۔

عقائد سے متعلق مسائل کا حوالہ:

☆ جب سوال اصولِ دین یا عقائد وقطعیات سے متعلق ہو تو کتاب وسنت سے بھی حوالہ جات دینے چاہئے، نہ کہ فقط کتبِ فقہ سے، اگر فروعی مسائل ہوں تو صرف عباراتِ فقہ لکھنے میں حرج نہیں۔

طلاقِ ثلاثہ کا حوالہ:

☆ طلاقِ ثلاثہ کے مسئلے میں عباراتِ فقہیہ سے پہلے آیتِ بقرہ، اور بخاری شریف کی حدیثِ عسیلہ لکھنی مناسب ہے۔

عبارت کا ترجمہ:

☆ جواب میں آیات واحادیث ہوں تو عامیوں کی رعایت اور فائدہ اس میں ہے کہ ان کا ترجمہ بھی لکھا جائے، یا فقط ترجمہ لکھ کر حوالہ لکھ دیا جائے، عربی عبارات وہ سمجھ نہیں سکتے، لہٰذا ان کے فوائد وتاثیر سے محروم رہ جاتے ہیں، البتہ فقہی عبارات کے ترجمے کی ان کو ضرورت نہیں، ان کے سمجھنے کی استعداد، ان کے لکھنے سے استشہاد مقصود ہوتا ہے جو بغیر ترجمہ بھی حاصل ہے، نیز یہ اہلِ علم کے ملاحظہ کے لیے لکھی جاتی ہیں جن کو ترجمے کی حاجت نہیں۔

مختلف اجزا کا حوالہ:

☆ جواب کے مختلف اجزا حوالہ طلب ہوں، تو ہر جز کی اردو عبارت مکمل ہونے پر اس سے متعلق عبارت نقل کرنی چاہیے، جواب کے مختلف اجزا کو مسلسل لکھنے پھر آخر میں سب حوالہ جات اکٹھے کرنے سے بسا اوقات عبارت کو اس سے ثابت ہونے والے مدعیٰ کے ساتھ تطبیق دینے میں مشکل ہوتی ہے۔

☆ لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ حوالہ جات کے بیچ میں لکھنے جانے سے، اردو عبارت کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، اور مستفتی جو کہ عربی نہیں سمجھتا، اس کو مشکل پیش آتی ہے، اس لیے اگر اردو عبارت مسلسل لکھنا ہی مناسب معلوم ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے، کہ ایک پیراگراف ختم ہونے پر قوسین میں ''للعبارة الأولی الآتیة، للعبارة الثانیة_____'' وغیرہ لکھ دیں، یا ہر پیراگراف کے بعد یوں لکھیں: ''دیکھیے عبارت نمبر ۱، دیکھیے نمبر ۲، وغیرہ'' پھر ہر عبارت پر اعداد ڈال دیں۔

مختلف مراجع سے حوالہ:

☆اگرفتوی ایک حکم پر مشتمل ہو،اس کے اجزا الگ الگ محتاجِ حوالہ نہ ہوں،لیکن مطلوب پر دلالت کرنے والی عبارت مختلف مراجع سے لی جارہی ہوں،تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے پورا جواب لکھ دیں،پھر محولہ عبارت کو یوں لکھیں:

والحجة علی ماقلنا:

(۱)مافي القرآن الكريم:"____________"(سورت___آیت___)

(۲)مافي الحديث النبوی:"____________"(صحیح___ج___ص___)

(۳)مافي جامع أحكام القرآن:"________"(___ج___ص___)

(۴)مافي فتح الباری:"______________"(___ج___ص___)

(۵)مافي عمدة القاری:"_____________"(___ج___ص___)

(۶)مافي التنویر مع الدر المختار:"______"(___ج___ص___)

(۷)مافي الهندية:"_________________"(___ج___ص___)

حوالہ جات میں احتیاط:

☆جس کتاب کا حوالہ دے رہے ہیں،اس کے جلد وصفحات کے ساتھ مطبع بھی لکھیں،اور اگر کتاب کے متعدد نسخے چھپ چکے ہوں تو جلد وصفحہ کے ساتھ باب اور فصل کا بھی اضافہ کریں۔

☆جب تک مطلوبہ عبارت اصل ماخذ میں نہ لکھ لیں،اس کے مصنف کی طرف منسوب کر کے نقل نہ کریں،اگر ماخذِ اصلی دستیاب نہ ہو تو ماخذِ ثانوی کی طرف سے منسوب کر کے حوالہ نقل کریں،مثلاً:فتاوی ابن الصلاح بحوالہ المجموع شرح المهذب۔

نوٹ:-یہ وہ چند آداب ہیں جو حضرت مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور مدظلہ کی مؤلفہ کتاب"آدابِ فتوی نویسی"سے لیے گئے ہیں۔ فجزاهم الله خير الجزاء۔

مطالعہ کی میز پر

عربی فتاوی

رد المحتار علی الدر المختار المعروف بالشامی:محمد أمین الشهیر بابن عابدین الشامی رحمہ اللہ

بدائع الصنائع:علاء الدین الكاسانی رحمہ اللہ

البحر الرائق:إبن نجیم الحنفي المصری رحمہ اللہ

فتاوی هندیه المعروف بعالمگیری:شیخ نظام و جماعة من علماء الهند الاعلام رحمهم الله

فتاوی قاضی خان:امام حسن بن منصور بن محمود داوز جندی رحمہ اللہ

فتاوی بزازیہ (الجامع الوجیز): إمام حافظ الدین محمد بن محمد المعروف بابن البزاز ؒ۔

فتاوی تاتارخانیہ: علامۃ الشیخ عالم بن العلاء الدهلوی الهندی ؒ۔

فتاوی ولولوالجیہ: أبو الفتح ظهیر الدین عبد الرشید الولوالجی ؒ۔

مجمع الأنهر: عبد الرحمن بن محمد المدعو ابشیخی زاده ؒ۔

مبسوط سرخسی: إمام شیخ الإسلام أبو بکر محمد بن أحمد السرخسی ؒ۔

فتح القدیر علی الهدایہ: علامۃ المحقق ابن الهمام الحنفی ؒ۔

المحیط البرهانی: محمود بن احمد بن عبد العزیز بن عمر بن مازه البخاری ؒ۔

غنیۃ المتملی شرح منیۃ المصلی: شیخ ابراهیم حلبی ؒ۔

حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: علامہ احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی الحنفی ؒ۔

النتف فی الفتاوی: أبو الحسن علی بن الحسین السغدی ؒ۔

الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید: عبد الحمید محمود طهماز

الاختیار لتعلیل المختار: ابن مودود الموصلی الحنفی ؒ۔

خلاصۃ الفتاوی: إمام طاهر بن عبد الرشید البخاری ؒ۔

خزانۃ الفقہ: فقیہ ابو اللیث سمرقندی ؒ۔

الجوهرۃ النیرۃ: علامۃ ابو بکر بن علی بن الحداد ؒ۔

کتاب التجنیس والمزید: علامہ برهان الدین مرغینانی ؒ۔

مجمع البحرین: ابن ساعاتی الحنفی ؒ۔

التصحیح والترجیح: علامہ قاسم بن قطلوبغا ؒ۔

القضایا الطبیۃ المعاصرۃ: علی محی الدین القره داغی، وعلی یوسف المحمدی

موسوعۃ الفقہ الإسلامی المعاصر: الدکتور عبد الحلیم عویس

موسوعۃ القضایا الفقهیۃ المعاصرۃ والاقتصاد الإسلامی: الأستاذ الدکتور علی أحمد السالوس

الأحکام الفقهیۃ للتعاملات الإلکترونیۃ: عبد الرحمن بن عبد اللہ السند

فقہ النوازل: محمد بن حسین الجیزانی

فقہ النوازل: بکر بن عبد اللہ أبو زید

فقہ البیع والاستیثاق والتطبیق المعاصر: الأستاذ الدکتور علی أحمد السالوس

فقہ الأسرۃ المسلمۃ فی المهاجر: الدکتور محمد الکدی العمرانی

اردو فتاوی

فتاویٰ رشیدیہ: مفتی رشید صاحب گنگوہیؒ
فتاویٰ دارالعلوم جدید: مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ
کفایت المفتی: مفتی کفایت اللہ صاحبؒ
فتاویٰ شیخ الاسلام: شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ
فتاویٰ محمودیہ: مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ
نظام الفتاویٰ: مفتی نظام الدین اعظمیؒ
احسن الفتاویٰ: مفتی رشید احمد پاکستانیؒ
فتاویٰ حقانیہ: مفتی عبدالحق صاحبؒ
فتاویٰ امارتِ شرعیہ: مفتی ابوالمحاسن سجادؒ
فتاویٰ عزیزی: شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ
فتاویٰ نظامیہ اوندرویہ: مفتی نظام الدینؒ
فتاویٰ مفتی محمود مفتی محمود صاحب پاکستانیؒ
کتاب الفتاویٰ: مولانا خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ

عزیز الفتاویٰ (امداد المفتیین): مفتی محمد شفیع صاحبؒ
امداد الفتاویٰ: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
امداد الاحکام: مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ
فتاویٰ خلیلیہ (فتاویٰ مظاہر علوم): مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
منتخبات نظام الفتاویٰ: مفتی نظام الدین صاحبؒ
فتاویٰ رحیمیہ: مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ
خیر الفتاویٰ: مفتی خیر محمد جالندھریؒ
فتاویٰ عثمانی: مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
فتاویٰ حبیبیہ: مفتی حبیب اللہ صاحبؒ
فتاویٰ عبدالحی لکنوی: علامہ عبدالحی لکھنویؒ
جامع الفتاویٰ: مفتی مہربان علی بڑوتویؒ
فتاویٰ قاضی: قاضی مجاہد الاسلامؒ
اسلام کے عائلی قوانین: قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ

آپ کے مسائل اور ان کا حل: مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ

جدید مسائل پر متفرق رسائل وکتب:

عربی مصادر:

نوازل الفقه

فتاوی معاصرة	یوسف القرضاوی
بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة	مفتي محمد تقي عثماني صاحب
المقالات الفقهية	مفتي رفيع صاحب عثماني
حكم نقل الأعضاء البشرية	محمد نجيب عوضين المغربي
احكام تجميل النساء	ازدهار بنت محمود بن صابر المدني
الفقه الاسلامي وادلته	الدكتور وهبه الزحيلي
مصادر الحق	الدكتور عبد الرزاق السنهوري
الغرر واثره في العقود	الدكتور صديق الضرير
فقه المعاملات الحديثه	الدكتور عبد الوهاب ابراهيم
موسوعة القضايا الفقهيه المعاصره	الدكتور علي احمد السالوس

قضایافقھیہمعاصرہفی المال و الاقتصاد الدکتور نزیہ حماد
عملیات التورق احمدفھدالرشیدی
بحوث فقھیہفی قضایااقتصادیۃمعاصرہ محمدسلیمان الاشقر
مجلہمجمع الفقہ الاسلامی رابطۃالعالم الاسلامی
الاسھم و السندات و احکامھا احمدبن محمدالخلیل
الغش و اثرہفی العقود عبداللہبن ناصر السلمی
التامین الاسلامی علی القرہداغی
فقہ القضایا الطبیۃ المعاصرۃ علی القرہداغی
الکفالات المعاصرۃ عبدالرحمن بن سعود الکبیر
المقاطعۃ علی القرہداغی
قضایاالفقہو الفکر المعاصرہ وھبہالزحیلی
بحاث فقھیۃفی قضایاالزکاۃالمعاصرہ د۔عمر سلیمان الاشقر
احکام صرف النقود و العملات عباس احمدمحمدالباز
فقہ الزکاۃ الدکتوریوسف القرضاوی
الالعاب الریاضیۃ علی حسین امین یونس
احکام المسابقات عبدالصمدبن محمدبلحاجی
الاحکام الطبیہا لمتعلقہبالنساء الدکتور محمد خالدمنصور
الاستثمار احکامہو ضوابطہ الدکتور قطب مصطفےٰ سانو
بیع الذھب و الفضۃ صدام عبدالقادر عبداللہ

اردو مصادر:

جواہرالفقہ: مفتی شفیع صاحبؒ
انعام الباری (شرح بخاری): مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
ایضاح المسائل: مفتی شبیر صاحب مدظلہ
جدید فقہی مسائل: مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہ
انٹرنیٹ اور جدید ذرائع ابلاغ
شرکت و مضاربت عصر حاضر میں مولانا محمد عمران اشرف

کلوننگ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
جدید فقہی مباحث قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
انوارِ رحمت: قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
جدید جنسیات وزیبائش کے شرعی احکام: مفتی عبدالمعبود قاسمی
مباحث فقہیہ: قاضی مجاہد الاسلام صاحب
جدید فقہی تحقیقات: حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلامؒ
مجموعہ قوانینِ اسلام: ڈاکٹر تنزیل الرحمن
زکوۃ کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا: مفتی محمد انعام الحق صاحب قاسمی
اسلامی بینکاری اور غرر: مولانا اعجاز احمد صمدانی
اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ: مولانا اعجاز احمد صمدانی
غرر کی صورتیں: مولانا اعجاز احمد صمدانی
اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ کا طریق کار: مولانا اعجاز احمد صمدانی
مالی معاملات پر غرر کے اثرات: مولانا اعجاز احمد صمدانی
تکافل انشورنس کا اسلامی طریقہ: مولانا اعجاز احمد صمدانی
نیٹ ورک مارکیٹنگ: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا
قتل بہ جذبۂ رحم اور دماغی موت: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا
میڈیکل انشورنس شریعتِ اسلامی کی روشنی میں: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا
ڈی این اے ٹیسٹ اور جینیٹک سائنس سے متعلق شرعی مسائل: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا
بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ کے شرعی احکام: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا
عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اور ان کا حل: مولانا محمد موسیٰ کرماڈی لندن
جدید معاشی نظام میں اسلامی قانونِ اجارہ: مولانا محمد زبیر اشرف عثمانی
سبزی منڈی اور فروٹ منڈی کی آڑھت کے احکام: ڈاکٹر مفتی عبدالواحد
فتاوی بینات: مجلس دعوت وتحقیق اسلامی
روزے کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا: مفتی محمد انعام الحق صاحب
علاج ومعالجہ کے شرعی احکام: مفتی انعام الحق صاحب
مسئلہ سود: مفتی محمد شفیع صاحب
اہم فقہی فیصلے: فقہ اکیڈمی دہلی
قربانی کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا: مفتی محمد انعام الحق صاحب
اسلامی قانون اور تصور ملکیت: مولانا ساجد الرحمن صدیقی
ڈیجیٹل تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام: مفتی احسان اللہ

شائق

سود پر تاریخی فیصلہ: مفتی تقی عثمانی صاحب

اسلام اور جدید معاشی مسائل: مفتی تقی عثمانی صاحب

فقہی مقالات: مفتی تقی عثمانی صاحب

ملکیتِ زمین اور اس کی تحدید: مفتی تقی عثمانی صاحب

مکہ فقہ اکیڈمی کے فقہی فیصلے

اسلامی بینکاری کی بنیادیں: مفتی تقی عثمانی صاحب مترجم: مولانا محمد زاہد

نئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے

خواتین کے لیے جدید مسائل: مفتی احسان اللہ شائق

کھیل کود اور تفریح کی شرعی حیثیت

جدید معاملاتی مسائل: مولانا حشمت اللہ صاحب

آلات جدیدہ کے شرعی احکام: مفتی محمد شفیع صاحب

عصر حاضر کے فقہی مسائل: مولانا بدر الحسن القاسمی

الربا: مولانا عبداللہ الاسعدی

موجودہ زمانہ کے مسائل کا حل (مولانا برہان الدین سنبھلی)

کریڈٹ کارڈ کے شرعی احکام: مولانا محمد اسامہ

عورت کے لیے بناؤ سنگار کے شرعی احکام (مفتی کمال الدین)

نوادر الفقہ (مولانا محمد رفیع عثمانی)

فلم، ٹی وی اور وی سی آر ایک شرعی جائزہ (مولانا عبدالمعز)

سونا چاندی اور ان کے زیورات کے شرعی احکام (مفتی عبدالواحد)

علم الخلاف

قاری انصار صاحب مرواسی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

تمہید:

کسی کے احوال و اقوال اور افکار و نظریات سے الگ راستہ اختیار کرنے کو اختلاف کہتے ہیں۔ جب کسی بات پر اختلاف بڑھتے بڑھتے تنازع کی شکل اختیار کر لے تو اسے مجادلہ کہتے ہیں۔ جب مخالفین کے درمیان اختلاف کی خلیج بہت وسیع ہو جائے اور تبصرہ اور تنقید کی جنگ اتنی تیز ہو جائے کہ اظہارِ حق و صواب کی بجائے ہر فریق ایک دوسرے پر محض غلبہ حاصل کرنا چاہے اور افہام و تفہیم کی گنجائش نہ رہے تو ایسی حالت کو شقاق کہتے ہیں۔ دینِ اسلام نے دو مسلمان بھائیوں میں اختلاف رائے کی گنجائش تو رکھی ہے، مگر مجادلہ اور شقاق کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اختلاف رائے فطری عمل ہے، اور اس کے بہت سے فوائد ہیں۔

اختلاف کے فوائد:

(۱)　ایک مسئلہ کو مختلف نقطۂ نظر سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔
(۲)　ایک مسئلہ کے متعدد حل سامنے آتے ہیں۔
(۳)　کسی بھی مسئلہ کو ہر زاویہ سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔
(۴)　ذہنی ریاضتیں سوچ بچار اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔(باادب بانصیب)

علم خلاف کا آغاز:

جس وقت علمِ فقہ کی نشو نما ہوئی اور وہ ایک مستقل علم کی صورت میں پروان چڑھا اور علم فقہ کے ان علمائے ماہرین ومجتہدین کا ظہور ہوا جن کو امتِ مسلمہ نے مقتدا و پیشوا کی شکل میں دیکھا، اور خلافت ان لوگوں کے پاس پہنچی جو شریعت کے احکام سے ناواقفیت کی بناء پر ان کو ساتھ رکھنے اور فقہا سے مدد لینے پر مجبور تھے۔لیکن کچھ علما حکومت سے دور رہے، اور کچھ ان کی طرف متوجہ ہوئے؛ اور امراء اور بادشاہوں میں سے کچھ ایسے تھے جن کا دل بحث ومباحثہ ومناظرہ کی طرف مائل تھا اور وہ اس پر بحث سننا چاہتے تھے، کہ کون سا مذہب اولیٰ ہے؛ اس لیے لوگ اختلاف ومسائل کی طرف متوجہ ہوئے، تب ہی علم خلاف کے مبادیات کی ابتدا ہوئی؛ اور یہ علم ائمہ فقہا کے مقلدین ومتبعین کے روبرو اس مقصد کے پیشِ نظر متعارف ہوا، کہ ہر مقلد اس کے ذریعہ اپنے امام کا دفاع کر سکے اور ان کی رائے اور نظریہ کو قوت بخشے اور مختلف فیہ مسائل میں اپنے صحتِ استدلال کو اُجاگر کر سکے، اور ہر طرح کے التباس اور پوشیدگی کا ازالہ کر سکے۔

متبعین کا اپنے امام کے دفاع کرنے کی وجہ سے خود متبعین کے بارے میں برا گماں رکھنا، بدخیالی اور سوءِ ظن ہے، کیوں کہ متبعین کا مقصد اپنے امام کے دفاع سے خود حق کا دفاع اور حق کی جستجو، اور حق کی جانب رہنمائی کرنا اور شریعت کے حقائق ودقائق کو واشگاف کرنا اور شریعت کی باریکیوں کا نکالنا ہوتا ہے۔

فضیلتِ علم خلاف

ذرا ابن خلدون کو دیکھو کہ وہ علم خلاف کی فضیلت کس انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ ”وهو لعمري علم جليل الفائدة في معرفة مأخذ الأئمة وأدلتهم ومران المطالعين فيما يرومون الاستدلال عليه “ترجمہ: سچ پوچھو تو یہ علم بڑا ہی فائدہ مند ونفع بخش ہے، کیوں کہ اس سے مجتہد علماء کرام کے دلائل کے مآخذ اور دلائل معلوم ہوتے ہیں اور اس کے مطالعہ سے قوتِ استدلال کی مشق ہوتی ہے۔

علم خلاف کی تعریف:

حاجی خلیفہ علم خلاف کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ”هو علم يعرف به كيفية إيراد الحجج الشرعية ودفع الشبه وقوادح الأدلة الخلافية بإيراد البراهين القطعية“۔

ترجمہ: علم خلاف ایسا علم ہے جس کے ذریعہ شرعی دلائل کو پیش کرنے کا طریقہ معلوم ہو اور قطعی دلائل کو پیش کر کے اختلافی دلائل کو توڑنے اور شکوک وشبہات کو دور کرنے کا طریقہ اور پہچان حاصل ہو۔

سچ پوچھو تو علم خلاف یہ علم منطق اور علم جلال اور علم فقہ کی پیداوار ہے، کیونکہ اس کے مبادیات اور اس کے قواعد وکلیات علم منطق سے ماخوذ ہیں۔ پھر اس سے علم فقہ اور مسائل واحکام کی خدمت لی جانے لگی، اور وہ ائمہ کے قواعد اور ان کے اجتہادی اصول کی وضاحت کا ذریعہ بن گیا، اور اس کے ذریعہ ان شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جانے لگا جو ائمہ کے مذاہب پر وارد کئے جاتے ہیں۔

علم خلاف کا سبب ایجاد:

علم خلاف کے ایجاد کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جب دو بڑے مکاتیبِ فکر" مکتبۂ فکرِ حدیث، اور مکتبۂ فکرِ رائے'' کے حاملین کا ظہور اور ان کے باہمی اختلاف کا سلسلہ شروع ہوا، اور یہ اختلاف پہلی صدی کے آخر سے شروع ہوا اور دوسری صدی کی مکمل مدت میں عروج پر رہا۔

مکتبۂ فکرِ حدیث: یہ وہ لوگ کہلاتے ہیں جن کی نگاہ حدیث کے ظاہری الفاظ پر ہوتی ہے۔

مکتبۂ فکرِ رائے: یہ وہ لوگ کہلاتے ہیں جو حدیث کے غواص تھے اور احکام شرعیہ میں شریعت کے مصالح اور لوگوں کے احوال کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اصحاب حدیث کا مرکز مدینہ اور اصحاب رائے کا مرکز عراق تھا)۔

تو ہر مکتبۂ فکر نے اپنی رائے اور دلائل کا مکمل دفاع کرنے کی کوشش کی، اور ہر مکتبۂ فکر کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ معترضین کے اعتراض کا جواب دے کر ان کو بحث ومباحثہ میں خاموش کیا جائے؛ یہی مجبوریاں اور حاجات اس علم کے مبادیات اور مقدمات کے ایجاد کا سبب بنیں۔

لیکن دونوں مکتبۂ فکر کے حاملین کے اختلاف کی شدت اس وقت ہلکی ہوگئی جب امام شافعیؒ کی کتاب ''الرسالة في الأصول'' منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب بڑی جامع ومدلل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فقہی اختلافِ رائے کی حیثیت پر بڑی اچھی گفتگو فرمائی ہے۔ اسی کتاب نے ''اہل الرائے اور اہل الحدیث'' کو قریب کرنے اور ان کے درمیانی مسافت کو پاٹنے اور ان کی دوری کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں ائمۂ مجتہدین وفاقہین کے ہاتھوں دبستانِ فقہ کو تقویت ملی اور اس کو انہوں نے اپنا وسیع علمی میدان بنالیا اور ان کو ایسے لائق شاگرد میسّر ہوگئے جنہوں نے ان کے علمی اور فکری آثار کی حفاظت کی اور ان کی آراء وافکار کو نہایت بہتر طور پر مرتب کیا اور ان کا پورا پورا دفاع کیا اور اس طرح مذاہب فقہیہ اربعہ کے لیے بقاء مقدر ہوگئی۔

اور جن فقہاء کو ایسے شاگرد میسّر نہیں ہوئے اور ان کی فقہ باضابطہ طور پر مدوّن نہ ہوسکی تو ان مذاہب کا رشتہ آہستہ آہستہ علمی زندگی سے کٹ گیا، اور وہ ناپید ہوگئے۔

اور ائمہ کے انہیں تلامذہ کے علمی نشاط نے علم فقہ کی طرح علم خلاف کی بھی بنیادوں اور ستونوں کو مضبوط اور ٹھوس کیا، اور اسی کاوش کے نتیجہ میں علم خلاف بھی ایک مستقل علم کی صورت میں وجود میں آیا۔

اس علم پر بہت سی کتابیں اور تالیفات ترتیب دی گئی جن میں اس علم کے قواعد الفقہیہ[۲۳] و الاشباہ وغیرہ لکھے گئے ہیں۔

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ اس فقہ میں (جس کا مسئلہ شرعی دلائل سے اَخذ کیا جاتا ہے) مجتہدین کے درمیان بڑا گہرا اختلاف ہے، کیوں کہ ہر شخص کے دلائل علیحدہ علیحدہ ہوا کرتے ہیں، اور اختلاف کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے، ہمارے مسائل کے توازن میں اختلاف کی بڑی بہتات ہے۔

مقلدین کے لیے روا تھا کہ وہ جس کی چاہیں تقلید کریں، لیکن جب تقلید کا دائرہ چار اماموں میں محدود کر دیا گیا، جن کا کچھ ایسا مقام تھا کہ ان کے ساتھ دنیا حسن ظن رکھتی تھی تو لوگوں نے انہی کی تقلید پر قناعت کی اور دوسرے ائمہ کی تقلید چھوڑ دیں کیوں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا، اس لیے کہ اجتہاد آسان نہیں بڑا مشکل کام ہے۔

اور ان علوم کی جن پر اجتہاد کا دارومدار ہے تسلسلِ زمانہ کی وجہ سے بہت بہتات ہو گئی ہے اور ان چاروں مذاہب کے علاوہ کوئی اور مذہب پایا نہیں جاتا، اس لیے یہ چاروں مذاہب اصول مان لیے گئے۔

اور انہیں ماننے والوں کے باہمی اختلافات کو نصوصِ شرعیہ اور اصولِ فقہ کے اختلافات کی جگہ اُتار دیا گیا۔

الغرض! یہ مقلد اپنے امام کے مذہب کو صحیح منوانے کے لیے دوسرے اماموں کے ماننے والوں سے صحیح اصول وقواعد کے ساتھ سنجیدہ طریقے سے مناظرے کرتا ہے اور اپنے مذہب کے دلائل پیش کرتا ہے، مناظرے شریعت کے تمام مسائل میں اور فقہ کے ہر باب میں جاری رہے۔

بعد ازاں علامہ ابن خلدون علم الخلاف کے فوائد کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ان مناظروں میں ائمہ کے مأخذ، ان کے اختلاف کا منشا اور مواقعِ اجتہاد کی وضاحت کی جاتی ہے؛ اس قسم کے علم کا نام خلافیات ہے۔

اس علم کے عالم کو ان قواعد کا جاننا نہایت ضروری ہے جن کے ذریعے احکام اخذ کئے جاتے ہیں جیسا کہ مجتہد کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔

اسبابِ اختلافِ فقہا:

حکم شرعی میں علما کا اختلاف کرنا عقل میں نہیں آتا کیوں کہ حکم شرعی کی اصل اور جڑ کتاب اللہ اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور سب مجتہدین کا مدار بھی وہی ہے پھر بھی اختلاف کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ کو مستنبط کرنے میں اجتہاد اور غور و فکر کو دخل ہے، جس کے نتیجہ میں اختلافِ رائے کا پایا جانا فطری امر ہے۔ اس لیے بہت سے مسائل میں مجتہدین کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، تو آیئے! ہم اختلافِ فقہا کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں۔

استاذ ڈکتور محمد زحیلی نے فقہا کے مابین اسبابِ اختلاف پر بحث کرتے ہوئے سات اہم اسباب شمار کرائے ہیں:

(۱) فطری امور میں اختلاف:-

ائمہ علما کی طبیعتیں اور ملکات اور عقلیں جدا ہوتی ہیں، کہ کسی امام کی طبیعت پر کسی چیز کا غلبہ ہے، جب کہ

دوسرے امام پر دوسری چیز کا غلبہ ہوتا ہے؛ کسی کے مزاج میں شدت اور کسی کے مزاج میں نرمی؛ اور اس طبعی اختلاف میں علاقائی اثرات اور مقامی افکار بھی بڑا دخل ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات ادلۂ شرعیہ سے مستنبط احکام میں اختلاف ہوجاتا ہے۔

(۲) لغت عربی کا اختلاف:-

قانون شریعت کے اصل مآخذ قرآن وحدیث ہیں، اور یہ دونوں عربی زبان میں ہیں، اس لیے عربی زبان کے قواعدِ طرزِ تعبیر اور اسالیب بیان سے بھی مسائل کے استنباط کا گہرا تعلق ہے۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ خود اہلِ زبان کے نزدیک بعض الفاظ اور افعال کی مراد کے سلسلہ میں اختلاف ہے یا اہل زبان کے نزدیک اس کے ایک سے زیادہ معنی مراد لیے جاسکتے ہیں، اس کی وجہ سے بھی اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے۔

(۳) ماحول، معاشرت اور مصلحتوں کا اختلاف:-

بعض مسائل میں اختلافِ رائے کی بنیاد حالات کی تبدیلی سیاسی ومعاشی نظام میں تغیر اور اخلاقی قدروں میں ارتقاء سے بھی متعلق ہوتا ہے، اس لیے فقہاء کے یہاں ایک متفقہ اصول ہے: ”لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان“ کہ زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے احکام میں تبدیلی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسی کو بعض اہل علم نے یوں بیان کیا ہے یہ اختلاف برہان ”نہیں بلکہ“ اختلاف زمان ہے۔

(۴) نص ظنی کے فہم مراد میں اختلاف:-

اس لیے کہ معنی ومطلب بسا اوقات خفی اور پوشیدہ ہوتے ہیں، یا تاویل کا محتمل ہوتے ہیں؛ تو ائمہ فقہا اپنی اپنی فکر اور علمی معلومات کے اعتبار سے اس کا مطلب ومعنی ومراد متعین کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اختلاف رائے ہوتا ہے۔

(۵) شریعت کے بعض مراجع ومصادر کے حجیت ہونے نہ ہونے میں اختلاف:- کہ ان مصادر کی حیثیت دلیل شرعی کی ہے یا نہیں؟ مثلاً استحسان ومصالح مرسلہ احناف ومالکیہ کے یہاں ان کا اعتبار ہے عرف سے حنفیہ زیادہ کام لیتے ہیں استصحاب کا اعتبار حنابلہ کے یہاں نسبۃً زیادہ ہے، لیکن یہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے، جب کتاب اللہ یا حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نص قطعی کا ثبوت نہ ہو۔

(۶) علم حدیث کی بعض فروع میں اختلاف:-

جیسے حنفیہ کے یہاں قیاس کے مقابلے حدیثِ ضعیف کا اعتبار ہے اور مراسیل کے قبول کرنے میں شرائط کے وضع میں اختلاف، کہ حنفیہ کے یہاں حدیث مرسل حجت ہے، شوافع کے یہاں اس کی حجیت مشروط ہے، اسی طرح خبر

واحد کے قبول میں اختلاف ہوا، پس یہی اختلاف فقہی رائے میں بھی اختلاف کا سبب بنا۔

(۷) قواعد اور اصولی مبادیات میں اختلاف:-

یہ بات حقیقت اور یقینی ہے کہ قواعد، یہ علما کی وضع ہیں اور ان قواعد کی وضع میں ان کے علمی اجتہادات اور اسباب وضع کا دخل تھا۔

اور ہر مجتہد کے علمی اجتہادات اور اسباب وضع کا دوسرے مجتہد سے مختلف ہونا امر طبعی ہے، جس کی وجہ سے وضعِ قواعد میں اختلاف ہوتا ہے، اور چوں کہ مسائل کی بنیاد انہیں قواعدِ فقہیہ پر ہوتی ہے، اور قواعد کا اختلاف مسائل کے اختلاف کو لازم ہے۔

ہر علم سے کچھ نہ کچھ دلچسپ اور انوکھی باتیں متعلق ہوتی ہیں علم خلاف کا ایک دلچسپ واقعہ صدیق بن حسن قنوجی نے اپنے کتاب "ابجد العلوم" میں "مدینۃ العلوم" سے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ابوزید دبوسی نے ایک مرتبہ ایک شخص کے ساتھ مناظرہ کیا تو وہ شخص جواب دینے کے بجائے مسکرانے اور ہنسنے لگا، پس ابوزید نے اپنے دل میں ایک شعر کہا ؎

مالی إذا ألزمتہ حجۃ	قابلنی بالضحک والقہقہۃ
إن کان ضحک المرء من فقہہ	فالضب فی الصحراء ما أفقہہ

علم خلاف کے مصنف اول:

علم خلاف پر سب سے پہلے مکمل قواعد پر مشتمل کتاب لکھنے والے ابوزید الدبوسی متوفی ۴۳۲ھ جن کی عمر ۶۳ سال ہوئی۔

علم خلاف پر لکھی جانے والی کتابیں:

(اختلاف ابی حنیفۃ وابن أبی لیلی)، (کتاب الرد علی سیر الأوزاعی)، (اختلاف الشافعی مع محمد بن الحسن)، (اختلاف الشافعی مع مالک، یہ کتاب خود امام شافعیؒ نے لکھی ہے، اور اس کو اپنی کتاب "الام" کے ساتھ ملحق کردیا ہے)۔ یہ سب مذکورہ کتابیں اولاً علم فقہ کے سائے میں پروان چڑھیں، پھر یہ علم خلاف کے ساتھ ملحق ہوئیں۔

چند اور کتابیں یہ ہیں:

(تأسیس النظر، التعلیقۃ، للإمام الدبوسی الحنفی)، (النکت، و تذکرۃ الخلاف، لأبی إسحاق الشیرازی)، (احیلۃ العلماء فی اختلاف الفقہاء، المستظہری، المعتمد، لأبی بکر الشاشی)، (کتاب التجدید، للقدوری، الحنفی)، (طریقۃ الرضویۃ، للسرسخی الحنفی)، (عیون الادلۃ، لأبی

الحسن بن القصار۔ المالکی)، (التعلیق۔ للقاضی عبد الوهاب المالکی)، (الاشراف علی مذاهب الأشراف، لابن هبیرة الحنبلی) (المأخذ۔ لحجة الإسلام الغزالی)، (مغیث الخلق فی إختیار الأحق، الکافیة فی الجدل۔ لإمام الحرمین الجوینی)، (الإنصاف فی بیان سبب الإختلاف۔ الشاہ ولی اللہ) ۔اور ماضی قریب میں بھی اس سلسلہ میں بعض اہم خدمات انجام پائی ہیں۔جن میں شیخ محمد عوامہ کی (أثر الحدیث الشریف فی إختلاف الأئمة الفقهاء) اور ڈاکٹر مصطفی سعید الحسن کی (أثر الإختلاف فی قواعد الأصولیة) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔(اردو میں: اختلاف ائمہ شیخ زکریا)

مصادر و مراجع:

حدود اختلاف	مولانا محمود حسن گنگوہی
اختلاف الائمہ فی مسائل المہمۃ	عبد الغفور اسنبھلی
اختلافات، اسباب، آداب	
اسلام میں اختلاف کے اصول و آداب	مترجم: ایم اختر
اسلام میں اختلاف کے اصول و آداب اور حدود	مولانا محمد فاروق صاحب

قرآن کریم کی معجزانہ شان

قیامت آجائے گی مگر قرآن کریم کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے بل کہ برابر چلتے رہیں گے نکلتے رہیں گے اور آج بھی علماء ہزاروں تصنیفات کرتے جارہے ہیں اور استدلال آیات سے یا احادیث سے ہی ہوتا ہے مسلمانوں نے یہ صرف تصانیف کی ہیں بل کہ کئی فنون کی بنیاد ڈالی جیسیوں فنون وعلوم ہر ہر فن کے اندر ایجاد کئے پھر لاکھوں کتابیں ہوئیں تو یہ معجزہ کی شان نہیں تو اور کیا ہے۔

علمِ سیرت

مولانا عبد المتین اشاعتی، کاٹز گاؤں
جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم {لقد کان لکم في رسول اللہ أسوة حسنة}۔{وإنک لعلی خلق عظیم}۔صدق اللہ العظیم۔

حدثنا شریک عن قیس بن وهب عن رجل من بني سواءة قال: قلت لعائشة: أخبریني عن خلق النبي صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: أو ما تقرأ القرآن؟{وإنک لعلی خلق عظیم} الخ۔ (المصنف لابن أبی

سیرت کی تعریف اور اس کا اطلاق:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے واقعات و معمولات اور لمحاتِ ذی مرتبت کو سیرت و مغازی سے تعبیر کیا جاتا ہے، سیرت کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و اطوار، اخلاق و کردار اور آپ کی ترسیٹھ سالہ زندگی کے نوع بنوع گوشوں اور بوقلموں پہلوؤں پر پھیلے ہوئے لیل و نہار کے دلآویز اور جاذبِ قلب و نظر شعبوں سے ہے، اس میں مکی زندگی بھی شامل ہے اور مدنی زندگی بھی۔

مغازی کا اطلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات اور جنگ و تازِ جہاد پر ہوتا ہے، جس کا تعلق مدنی زندگی سے ہے، غزوات کا ذکر قرآنِ مجید کی بعض مدنی سورتوں میں اچھی خاصی تفصیل سے ہوا ہے، اور کتبِ حدیث میں تو مستقل ابواب و عنوانات کے ساتھ نہایت شرح و بسط سے اس کا تذکرہ فرمایا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام کرشمہائے دلنواز اور اداہائے نظر افروز کے مجموعے کا نام سیرت و مغازی ہے۔

سیرتِ نبوی کا شمار جزوی طور پر تو علم تاریخ ہی میں ہوتا ہے، لیکن اب اس کو ایک خاص انداز میں علیحدہ طور پر مرتب کیا جانے لگا جس میں سیرت کے موضوع، غرض و غایت، طرز اور کتبِ سیرت کو آشکارہ کیا گیا، اور اب شدہ شدہ علمِ سیر و مغازی مستقل ایک فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اس سے قبل علمِ سیرت چند مخصوص مضامین پر محدود تھا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ، نسب، شخصیت، صفاتِ خلقیہ و خُلقیہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص تصرفات کا تذکرہ تھا، مثلاً:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بحیثیتِ رسول وحی کا حاصل کرنا، لوگوں سے ہم کلام ہونا، بحیثیتِ داعی خوش نما اور اچھوتے انداز میں دعوت دینا، بحیثیتِ مربی پوری پوری عنایت و توجہ کے ساتھ صحابہ کرام ؓ کی تربیت کرنا، اسی طرح غزوات و سرایا اور ان قبائل کا تذکرہ جو مشرف با سلام ہوئے، یا جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حلف برداری اٹھائی، یا جن کے ساتھ جنگ لڑی گئی۔ نیز نواحئ عرب میں بسنے والے دیگر قبائل اور بادشاہوں کے متعلق خبروں کا شمار بھی علمِ سیرت ہی کے زمرے میں ہوتا ہے، بلکہ اب تو حیاتِ صحابہ بھی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مستقل جزو بن چکا ہے، کیوں کہ صحابہ کرام ؓ وہ عظیم قدسی صفات شخصیات ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھکانہ دیا، ہر طرح سے آپ کی اعانت و مدد کی، اور دل و جان سے آپ پر من جانب اللہ نازل شدہ احکام کی پیروی کی، یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام ؓ سے حد درجہ تعلق اور محبت تھی۔

آج زمانہ اتنی ترقی کر گیا لیکن پھر بھی سیرتِ مقدسہ کے گوشے زمانہ کی اصلاح و فلاح کے لیے نمایاں ہوتے رہیں (ہو رہے ہیں اور ان شاء اللہ تا قیامت ہوتے رہیں گے)۔ اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ علمِ سیرتِ نبوی کو دیگر علوم و فنون کے مقابلہ اچھی خاصی پوزیشن حاصل ہوئی، اور اپنی گوناگوں خصلتوں کی بناء پر وہ دیگر اقوامِ عالم کی توجہ کا مرکز بن

گیا۔

سیرتِ مقدسہ کی ترقی کے اسباب:

علما نے اس کے چند اسباب بیان کیے ہیں:

(۱) سیرتِ مقدسہ اپنی پنہائیوں اور ممتاز اوصاف کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں، بلکہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی سیرت ہے، جس کو اپنا کر ہر شخص کامیابی کی راہوں پر گامزن ہوسکتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے نمونہ ہیں، اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حیاتِ انسانی کی ترقی کا زینہ ہے۔

(۲) سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن فہمی کا معتبر وسیلہ اور قرآن کی جیتی جاگتی تشریح ہے، بل کہ یوں کہا جائے کہ سیرت کے مؤثر واقعات تربیت وراہنمائی کا سب سے طاقت ور ذریعہ اور انسانی قلب ودماغ کے لیے قرآن کے بعد سب سے زیادہ اثر انگیز اور حیات آفریں سرچشمہ ہے۔

اور اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وہ روایت دلالت کرتی ہے، کہ جب ان سے آیتِ کریمہ {وإنک لعلی خلق عظیم} کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خلقِ عظیم کی سیرت واخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ''کان خلقہ القرآن'' کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق (سیرت) یہ قرآن ہی تو ہے)۔یعنی قرآن اور عملی قرآن (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ) آپس میں لازم ملزوم ہیں، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا وہ قرآن کو دیکھ لیں۔

(۳) سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح انسان اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب کہ وہ سیرت کے ابتدائی زمانہ میں رونما ہونے والے واقعات پر واقف ہو جنہوں نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔سیرتِ مقدسہ ہی کی برکت سے آگے چل کر قیصر وکسریٰ کی حکومتیں تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئیں، اور اسلامی تہذیب ومملکت ابھر کر سامنے آئی جس نے مخلوق کے سامنے علم وحکمت کے سرچشمے بہادیے۔

(۴) سیرتِ مقدسہ کا ناقابلِ فراموش عظیم کردار یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اقوامِ عالم حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر لوائے اسلام کے تحت جمع ہوئیں، بل کہ دنیا میں مختلف رنگ ونسل، مختلف زبانوں اور مختلف مذاق ومزاج کے رہواسیوں کے باوجود پورے عالم میں تاریخ کا ایک عام جزو بن چکی ہے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کا اہتمام:

مذکورہ اسباب ہی کی بناء پر سیرتِ نبویہ کو مسلمانوں کے مابین ایک خاص اہمیت حاصل ہے، کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تمام کلماتِ نوادر کو یکجا کیا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت سے لے کر وفاتِ پر حسرت تک ان تمام حالات کو بیان کیا جو دن بدن، وقتاً فوقتاً رونما ہوتے گئے، اسی پر بس نہیں بل کہ یہ بھی قلم بند کر دیا کہ فلاں قول، فلاں فعل یا تقریر، فلاں دن، فلاں وقت اور فلاں جگہ پر ارشاد فرمایا یا انجام دیا وغیرہ۔

اور یہ سب دیگر کہانیوں اور قصص کی طرح اٹکل پچو نہیں بل کہ انتہائی عرق ریزی، دقیقہ سنجی، منقح اور صاف انداز میں بیان کیا، اور صرف لکھا ہی نہیں بل کہ اس کے لکھنے اور بیان کرنے کو اپنے لیے باعثِ صد افتخار و عزت بھی سمجھتے ہیں۔

جب سلفِ صالحین کا دور آیا تو انہوں نے اپنی اولاد کو قرآن کی طرح سیر و مغازی سیکھنے اور یاد کرنے کی تلقین کی، اسی طرح خلفِ صالحین کے دور میں بھی اس کا اہتمام کیا گیا۔

سیرِ انبیاء علیہم السلام اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین موازنہ:

اگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جائے تو وہ دیگر بانیانِ مذاہب اور عظیم الشان ہستیوں کے مقابلے کئی زیادہ ممتاز نظر آتی ہے، کیوں کہ کسی تاریخی شخصیت کے حالات واقوال اتنے اہتمام اور تفصیل کے ساتھ محفوظ نہیں کیے گئے جتنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، احوال اور کوائف کو محفوظ کیا گیا، نیز سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر انبیا کی سیرت پر بھی فوقیت و برتری حاصل ہے، وہ اس طرح کہ سیرتِ مقدسہ صحیح اور مکمل صورت اور اپنی اصلی خدوخال میں ہم تک پہونچی ہے۔ مثلاً

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اکل و شرب، نوم و قیام، قول و فعل، ظاہر و باطن، طہارت و عبادت، حسیات و کیفیات، صحت و مرض، فقر و غنا اور اقربا و پڑوسیوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک وغیرہ۔

یہ تمام وہ اشیاء ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہر ہر پہلو کو مشتمل ہے۔

عہدِ نبوی کو ایک طویل زمانہ گزر گیا اس کے باوجود اگر کوئی متبعِ سیرت، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بغور مطالعہ کرے تو اسے ایسا محسوس ہوگا گویا کہ سیرتِ مقدسہ کا ہر ہر گوشہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نظروں کے سامنے ہیں، جبکہ دیگر انبیائے سابقین علیہم السلام کی سیرتوں میں تحریف و تبدیلی کر دی گئی۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مغربی مستشرقین کی نظر میں:

یہی وجہ ہے کہ مغربی مستشرقین نقادوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت، عظمت و شرافت اور اعزازیت کو بسر و چشم قبول کیا، اور یہاں تک کہہ دیا کہ ''إن محمداً (علیہ السلام) ھو الوحید الذی ولد علی ضوء الشمس''۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین پر وجود پذیر ہونے والی تنہا ایسی شخصیت ہے جو دنیا جہاں والوں کے لیے اس سورج کی مانند ہیں جو اپنی ضیاء پاش کرنوں سے تمام عالم میں روشنی بکھیرتا ہے، غرضیکہ حیاتِ طیبہ کے تمام پہلو دنیا جہاں والوں کے لیے ظاہر و باہر ہیں۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مآخذ و منابع:

(۱) قرآن کریم　　(۶) کتب اسماء الرجال　　(۲) کتب احادیث
(۷) معاصرانہ شاعری　　(۳) کتب سیر و مغازی　　(۸) کتب دلائل
(۴) کتب تاریخ　　(۹) کتب آثار و اخبار　　(۵) کتب تفاسیر

(۱۰) کتب شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدوین اور اس کا آغاز:

مسلم مؤرخ فؤاد سیزگین کے قول کے مطابق سیرت ومغازیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفصیلات کو محفوظ کرنے اور ضبطِ تحریر میں لانے کا سلسلہ پہلی صدی ہجری یعنی عہدِ صحابہ ہی میں شروع ہوگیا تھا، اور ان کے بعض شاگردوں (تابعین کرام) نے اسے سلکِ کتابت میں پرو دیا تھا، اس ضمن میں جو اولین کتاب معرضِ تصنیف میں آئی، وہ ''مغازیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے، جو حضرت عروہ بن زبیر کی سعی مشکورہ کا عظیم الشان نتیجہ ہے۔اسی طرح خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی زمانہ میں ایک کتابچہ جو حضرت سعید بن عبادہ خزرجیؓ سے منقول تھا شائع ہوا، پھر حضرت سہیل بن ابی حثمہ انصاریؓ نے بھی حیاتِ مقدسہ پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ترتیب دیا، جس کو امام واقدی نے اپنے استاذ حفیدہ سے روایت کیا ہے۔اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، عبیداللہ بن کعب، امام شعبی وغیرہم نے بھی اپنے زمانے کے مشہور تابعین سے روایت کیا اور سیر ومغازی کے باقاعدہ مجموعے تالیف کیے، اگرچہ وہ مجموعے امتدادِ زمانہ کی بناء پر تلف ہوگئے لیکن ان کے حوالے بعد کے مؤلفینِ کتبِ سیرت میں جابجا نظر آتے ہیں۔جیسے حضرت عروہ بن زبیر، ابان بن عثمان بن عفان، شرحبیل بن سعد، وہب بن منبہ، عبداللہ بن ابی بکر، عاصم بن عمر قتادہ، معمر بن راشد، ابو معشر السندھی، موسیٰ بن عقبہ اور ابن شہاب زہری (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) وغیرہ۔

غرضیکہ سیرت پر بہت سی تصانیف لکھی گئیں، ان میں سے کچھ کتابیں فی زماننا متداول اور مطبوعہ ہیں وہ یہ ہیں:

المغازی (امام واقدی)	السیرۃ النبویۃ ''سیرت محمد بن اسحق'' (عبد الملک بن ہشام)
الطبقات الکبری (ابن سعد)	التاریخ الکبیر (امام طبری)
البدایۃ والنہایۃ (امام ابن کثیر)	الکامل فی التاریخ (ابن الاثیر)

برِصغیر میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مدونین (پہلی صدی ہجری)

محمد بن قاسم کی فتح سندھ ۹۴ھ-۷۱۲ء کے بعد سندھ میں اسلامی سلطنت کے قیام اور عربوں کے وہاں مستقل قیام کی بناء پر منصورہ، ملتان، دیبل، سندان، خضدار، اور قندابیل اسلامی علوم کی ترویج واشاعت اور تدوین کے اہم مراکز کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔چنانچہ پہلی صدی ہجری ہی میں اس کے وسیع تر اثرات برصغیر کے خطہ پر رونما ہونے شروع ہوئے۔

سرزمین سندھ وہند میں اسلامی علوم بالخصوص علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، احادیث، مغازی وسیر کی اشاعت میں نمایاں اور قابل ذکر خدمات انجام دینے والوں میں موسیٰ بن عقبہ الثقفی، یزید بن ابی کبشہ الدمشقی، المفضل بن المہلب بن ابی صفرہ، ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ البصری المعروف بہ نزیل ہند کے نام بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔

برِصغیر میں تدوینِ سیرت (دوسری صدی ہجری)

دوسری صدی ہجری کے ائمہ حدیث وسیرت میں برصغیر (سندھ) کے حوالے سے جمادی الاخری ۱۴۳۰ھ اہم شخصیت ابو معشر نجیح السندی کی ہے، جنہیں فن سیر و مغازی میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ابن ندیم نے ''الفہرست'' میں ان کی کتاب ''المغازی'' کا ذکر کیا ہے، جو ناپید ہو چکی ہے، لیکن اس کے اجزاء واقدی کی کتاب ''المغازی'' اور ابن سعد کی ''الطبقات'' میں محفوظ ہیں، یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اور خطوط جمع کرنے کا کام بھی سب سے پہلے سندھ میں ہوا، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں ابوجعفر الدیبلی نے ''مکاتیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' نامی کتاب مدون کی۔

کتبِ سیرتِ نبویہ کی اقسام:

(۱)　پہلی قسم جس میں سیرتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام پہلوؤں کو یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ باجود لے کر تا حینِ وفات، بل کہ اس زمانہ میں پیش آنے والے حوادث وواقعات کو بالترتیب بیان کیا گیا ہو، یہ قسم کتبِ سیرت میں مشہور ہے، جیسے ابن ہشام کی ''السیرۃ النبویۃ''، علی بن ابراہیم کی ''انسان العیون فی سیرۃ الأمین و المامون- المعروف بالسیرۃ الحلبیۃ''، ابن کثیر کی ''السیرۃ النبویۃ''۔

(۲)　دوسری قسم جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ خلقیہ وخُلقیہ (شمائل) کو بیان کیا گیا ہو۔ جیسے

الشمائل المحمدیہ	امام ترمذی
المواھب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ	امام قسطلانی
الأنوار المحمدیہ (مختصر المواھب اللدنیۃ)	شیخ یوسف النبھانی

(۳)　تیسری قسم جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدقِ نبوت پر دلائل وشواہد کو بیان کیا گیا ہو۔ جیسے

دلائل النبوۃ (امام بیہقی)۔ دلائل النبوۃ (ابو نعیم الاصفہانی)۔ دلائل النبوۃ (ماوردی)

(۴)　چوتھی قسم جس میں اخبارِ صحابہؓ تا حینِ وفات بیان کی گئیں ہوں۔
واضح ہو کہ اخبارِ صحابہ کا شمار بھی سیرتِ نبویہ ہی میں ہوتا ہے۔ جیسے

الاصابہ فی تمییز الصحابۃ　(علامہ ابن حجر عسقلانی)

أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن الأثیر)　الطبقات الکبری　(ابن سعد)

(۵)　پانچویں قسم جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی امت پر حقوق اور ان خصائص کا بیان ہے جن کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیگر انبیا علیہم السلام سے فائق وممتاز ہیں۔ جیسے

الشفاء بتعریف حقوق المصطفی (قاضی عیاض مالکیؒ)　الخصائص الکبری (عربی) (امام سیوطیؒ)

سیرتِ نبویہ کی جدید انواع واقسام:

دکتور محمد الزحیلی فرماتے ہیں:

بعض متاخرین نے سیرت نبویہ کو مختلف انداز جدید اسلوب و پیرائے میں الوعی م ۱۲۳ے جیسے

عبقریۃ محمد　(شیخ عقاد)　فقہ السیرۃ　(غزالی)

فقہ السیرۃ　(بوطی)　الرسول العربی　(عماد مصطفی طلاس)

محمد المثل الکامل　(الأستاذ احمد محمد جاد المولی)

الرسول القائد　(لواء الرکن محمود شیث خطاب)

رسالقسیرۃ النبی الأمین إلی إنسان القرن العشرین (عربی) (مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ)

سیرت نبوی پر اردو زبان میں بعض تراجم و تصانیف:

زاد المعاد (اردو) امام ابن قیم جوزیؒ۔ مترجم: مولانا رئیس احمد جعفری

سیرۃ النبویہ لابن ہشام (اردو) (مترجم: سید یٰسین علی حسنی نظامی دہلوی خواہر زادہ حضرت نظام الدین اولیاء)

الخصائص الکبری فی المعجزات خیر الوری (اردو) (امام جلال الدین سیوطیؒ۔ مترجم: مفتی غلام معین الدین نعیمیؒ)

عہد نبوت کے ماہ و سال　(حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ)

سیرۃ المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم　(علامہ ادریس کاندھلویؒ)

سیرۃ المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم　(از امیر المومنین سیدنا علی مرتضی کرم اللہ وجہہ۔ مرتب: ابن عبد الشکور)

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم　(علامہ شبلی نعمانیؒ۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ)

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم　(حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند)

اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم　(ڈاکٹر محمد عبد الحی صاحبؒ)

انوار نبوت　(حضرت مولانا مفتی شبیر احمد قاسمی مدظلہ العالی)

نشر الطیب فی ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم　(حکیم الامت الحاج الحافظ محمد اشرف علی تھانویؒ)

سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم　(منتخب از تصانیف مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

النبوۃ والانبیاء (عربی)　(شیخ محمد علی الصابونی)

صحابۂ کرام کے مثالی اخلاق　(مولانا محمد ہارون معاویہ)

سیرت النبی بعد از وصال النبی صلی اللہ علیہ وسلم　(محمد عبد المجید صدیقی)

سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں کے آئینے میں (اردو) (مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ)

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم　(مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندویؒ)

درسی سیرت، المعروف بہ "اصح السیر"۔ (مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری۔ تلخیص و تسہیل مفتی طارق بشیر)

مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اردو) از عروہ بن زبیر (مترجم محمد سعید الرحمن علوی)

رحمتِ عالم (علامہ سید سلیمان ندویؒ) رحمۃ للعالمین (قاضی سلیمان منصور پوریؒ) ۱۴۳۰ھ
ذکرِ رسول (مولانا عبدالماجد دریا آبادی)

ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں جو ابنائے زمانہ کے لیے جدید طرز میں لکھی گئیں تاکہ تہذیب جدید کے دلدادہ نوجوان سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (جو حیاتِ سرمدی، قربتِ خداوندی، بعدِ شیطانی کا ذریعہ ہے جس میں کوئی نشیب و فراز نہیں ہے) کو اپنے لیے آئیڈیل اور نمونہ بنائیں، اور وہ ان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

سیرت پر چند عربی مراجع:

اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم و آدابہ	(عبداللہ الاصفہانی)
کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفی	(قاضی عیاض)
جوامع السیرۃ	(ابو محمد علی بن احمد ابن حزم الاندلسی)
الروض الانف شرح السیرۃ النبویۃ لابن ھشام	(عبدالرحمن السھیلی)
زاد المعاد فی ھدی خیر العباد	(ابن القیم الجوزیۃ)
نور الیقین فی سیرۃ المرسلین	(محمد الخضری)
محمد رسول اللہ و خاتم النبیین	(محمد الخضر)
سیرۃ خاتم النبیین	(ابو الحسن علی الحسنی الندوی)
صور مقتبسۃ من القرآن الکریم	(محمد عزہ دروزہ)
الرسالۃ المحمدیۃ	(سلیمان الندوی)

فن تاریخ میں مسلمانوں کا کردار

عبدالستار الاعظمی، القاسمی
استاذ: جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

تمہید

کسی بھی فن کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس کے مبادیات اور اصول پر ضرور نظر ہونی چاہیے تاکہ مطالعہ شدہ فن میں اتقان اور گہرا ملکہ حاصل ہو جائے ایسے ہی تاریخ سے شغف رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ علم تاریخ کے اصول و مبادی سے واقف ہوں یعنی تاریخ کی تعریف، موضوع، غرض و غایت، تدوین تاریخ، مصنفین کے احوال، خاص طور

سے ان کے افکار، نظریات وعقائد اور اسلوب تصنیف پر گہری نظر ہوتا کہ اشاالاخری علی اچھے حق میں مصنف کی بیجا طرفداری خواہ مخواہ مخالفت اور اپنے نظریہ وافکار کی آمیزش وملاوٹ سے متنبہ رہا جاسکے۔

☆ مثال کے طور پر علامہ ابن خلدون تاریخ کے میدان میں علمبردار ہیں۔لیکن عدم تقلید کے سلسلہ میں اپنے نظریہ وافکار کا ایسا رنگ چڑھایا کہ وہی حق بجانب نظر آتا ہے‘ جبکہ مسئلہ انکار تقلید، قابل تفصیل ہے،وہ فرماتے ہیں کہ:۔و من فقد العلم و التقليد فيه أو أعرض من حسن استماعه و اتباعه طال عناؤه في التأديب فيجري في غير مالوف و يدركها على غير نسبة فتوجد آدابه و معاملاته سيئة الاحوال بادية الخلل و يفسد حالا في معاشه بين أبناء جنسه ۔(تاریخ ابن خلدون ج/۱:ص/۵۴۹)

جس شخص سے علم مفقود ہوا وراس میں تقلید سرایت کرگئی ہو، یا اس نے علم کی پیروی اور توجہات سے روگردانی کی تو اس کو اس علم کے ذریعہ مہذب وشائستہ ہونے میں کافی تھکاوٹ کا سامنا کرنا پڑے گا چناں چہ بلا انسیت و درک کے علم تو حاصل ہوجائے گا لیکن اس کے ادب میں خلل اور احوال تعامل میں بگاڑ پیدا ہوگا اور ہم عمروں میں اسکی معاشی حالت بدتر ہوگی۔

☆ ایسے ہی ابومخنف نے بھی اپنی مرویات میں اپنے عقائد ونظریات کا رنگ گھول کر صحابہ کرام کے دامن کو داغدار بنانے کی ناپاک کوشش کی ہے اس کی روایت تاریخ الطبری میں بہت ساری ہیں مثال کے لیے ایک روایت کافی سمجھتا ہوں (قال هشام عن أبي مخنف قال عبد الرحمن فأقبل الناس من كل جانب يبايعون أبابكر و كادوا يطئون سعد بن عبادة فقال ناس من أصحاب سعد اتقوا سعدا، فقال عمر: اقتلوه قتله الله ثم قام على رأسه فقال لقد هممت أن أطاك حتى تندر عضدك فأخذ سعد بلحية عمر فقال والله لو حصصت منه شعرة مارجعت في فيك واضحة فقال أبو بكر مهلا يا عمر الرفق هاهنا أبلغ فأعرض عنه عمر و قال سعد أما والله لو أن لي قوة ما أقوي على النهوض لسمعت من أقطارها و سككها زئيرا يحجرك ـ ـ ـ (تاریخ الطبری ج/۲:ص/۴۴۳)

ہشام نے کہا ابومخنف سے مروی ہے کہ عبدالرحمن نے کہا کہ لوگ ہر سمت سے ابوبکر کے ہاتھوں بیعت کرنے لگے قریب تھا کہ سعد بن عبادۃ کو لوگ روند ڈالیں بعض صحاب نے کہا سعد ہیں ذرا ان کا احتیاط رکھئے تو عمر نے فرمایا: انہیں مارڈالو، اللہ ان پر لعنت برسائے‘ پھر ان کے سر پہ آپڑے اور کہا: میں نے تو ارادہ کرلیا کہ تجھے اتنا روند ڈالوں کہ تیرا مونڈھا الگ ہوجائے اتنے میں سعد نے عمر کی ڈاڑھی پکڑلی تو عمر کہنے لگے اگر ایک بال بھی ڈاڑھی سے الگ ہوا تو قسم بخدا تو واپس نہیں لوٹے گا اتنا کہنا تھا کہ ابوبکر بول پڑے اے عمر ٹھہرو یہاں نرمی زیادہ بہتر ہے مزید سعد نے فرمایا سنو قسم بخدا اگر مجھے کھڑے ہونے کی طاقت ہوتی تو اس علاقہ کی گلی کوچوں سے آپ ایسی گرجدار آواز سنتے جو آپ کو ایسی حرکت کرنے پر روک لگادیتی۔

یہاں ردّ و قدح کا موقع نہیں اگر تحقیق مقصود ہو تو ”مرویات ابی مخنف فی تاریخ الطبری دراسۃ ونقداً“ کا

مطالعہ کر سکتے ہیں کیوں کہ اس کے مولف نے روایت و درایت کے اعتبار سے معقول [illegible] بحث کی ہے "العواصم والقواصم" میں بھی صحابہ کے سلسلہ میں صحیح واقعات کی رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

☆ اسی طرح علامہ مودودی تاریخ کے شاہکار ہیں اور تشنگین تاریخ کو خوب خوب سیراب کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی تعبیری برچھیوں سے ان اکابرین واسلاف کو جنھوں نے رسالت ونبوت کے سائے میں علمی سیرابی حاصل کی اس قدر گھائل کیا کہ آج بھی ان کے جاں نثار اور معتقدین کراہ رہے ہیں۔ جب ان کے ہمنواؤں وطرفداروں سے سوال کیا جاتا کہ مولانا مودودی کیا کر بیٹھے تو لاجواب ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ انہوں نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے لیکن یہ بات معقول نہیں کیوں کہ بالفرض اگر کسی شخص کی پاک دامنی اور عفت کا تذکرہ یوں الفاظ میں بیان کیا جائے کہ فلاں شخص نہ تو چور ہیں، اور نہ زنا کاری سے ان کا دامن گندا ہے، اور نہ بدکاری میں ملوث ہیں، تو بلاشبہ یہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس جیسی بھونڈی تعبیر نے اس کے دل کو ٹھیس ضرور پہونچائی۔ مودودی صاحب نے بعض روایتوں کو بلا درایت اور تحقیق وتنقید کے اپنی کتاب میں جگہ دیدی جب کہ دوسری روایتیں جو اسلاف کے ازحد تقوی اور طہارت، پاکیزگی کا اعلان کررہی ہے موصوف نے اس سے صرف نظر کرلیا۔

علم تاریخ:

علم تاریخ کی ایجاد میں صرف مسلمانوں کا حصہ نہیں بل کہ دیگر سابقہ اقوام نے بھی اس فن میں قلم اٹھائی ہے لیکن اس علم میں دوسری اقوام کے بالمقابل مسلمانوں کے علمی کارنامے چند اسباب کی بنا پر فوقیت رکھتے ہیں اس میں سے قابل ذکر اسباب: گہری تلاش، اہتمام شمولیت، نیز اس علم سے متعلق بہت سارے مفاہیم کی تصحیح ہیں، چاہے اس کا تعلق تاریخ کی تعریف موضوع، غرض وغایت سے کیوں نہ ہوں۔

تعریف: نواب صدیق حسن قنوجی اپنی کتاب "ابجد العلوم" میں لکھتے ہیں کہ اقوام نیز ان کے شہروں، رسم ورواج، ان کی عادات وتقالید ان کی اہم شخصیتیں، نسب نامے، متوفین کے احوال کی معرفت کا نام علم تاریخ ہے۔

تعریف: علامہ مقریزی فرماتے ہیں کہ تاریخ نام ہے دنیا میں رونما ہونے والے پچھلے واقعات اور حادثات کی خبر دینا۔ (علم التاریخ عند المسلمین ص/۲۶)

موضوع: ماضی کی شخصیتیں یعنی انبیاء، اولیاء، حکما، ملوک، شعراء، وغیرہ کے احوال۔

غرض وغایت: احوال ماضی سے واقفیت ہونا۔

تاریخ کے فوائد:

تاریخ سے نصیحت وعبرت حاصل کرنا، تبدیلی زمانہ و تغیرات احوال سے واقفیت کے بعد تجربوں کی دسترس کا حصول تا کہ تاریخ میں نقل شدہ نقصانات سے محفوظ رہا جاسکے اور اس میں اس جیسے مذکور کردہ منافع کے حصول کی کوشش کی جاوے۔ (مدینۃ العلوم)

تصنیف تاریخ کا علمی اسلوب:

تصنیف تاریخ کے علمی اسلوب کو لوگوں کے لیے واضح کردینا زیادہ مناسب ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں حقیقت وسچائی لکھی جائے اور مورخین کے لیے بھی یہی ضروری ہے کہ وہ لوگ حقیقت ہی کی جستجو کریں اگر چہ اس سلسلہ میں انہیں جدو جہد کی آستین سمیٹنا پڑے،سب سے اہم اور قابل ذکر مورخ وہی ہے جو تاریخ اور حیات کا عمدہ تجزیہ پیش کرنے میں دوسرے مورخین پر سبقت لے جائے۔عبدالرحمن ابن خلدون اپنی مشہور کتاب ''مقدمۃ ابن خلدون'' جس کا آغاز کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی أیام العرب و العجم و البربر و من عاصروھم من ذوی السلطان الاکبر کے عنوان سے کیا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ:فن تاریخ کا شماران فنون میں سے ہے جس کو اقوام وامم نے ہاتھوں ہاتھ اپنایا ہے اس کو حاصل کرنے لیے رخت سفر باندھا جاتا ہے اس فن کی معلومات سے وابستہ ہونے کے لیے عوام وجہلا بھی گرویدہ ہیں ۔بادشاہ اور نواب بھی اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کافی پیش رو ہوتے ہیں نیز اسے سمجھنے میں علما اور معمولی قسم کے لوگ سب یکساں ہیں کیوں کہ تاریخ میں بظاہر حکومت کے احوال و کوائف اور پچھلی صدی کے گزرے ہوے واقعات کی خبروں کے علاوہ اور کوئی پیچیدگیاں نظر نہیں آتی۔اس میں اقوال وامثال کی بہتات ہے۔جب عظیم اجتماع ہوتا ہے تو محافل ومجالس تاریخ سے آراستہ کی جاتی ہے۔تاریخ ہمیں دنیا کے احول سے واقف کراتی ہے کہ کس طرح لوگ تغیرات زمانہ کا شکار ہوتے ہیں۔اور ملک کے دامن وسعت کس طرح پھیلے اور سمٹے انہوں نے دنیا بسانے میں کیسے کیسے جتن کیے حتی کہ موت نے آواز دی اور انہیں دنیا کو خیر باد کہنا پڑا۔

لیکن اگر گہری نگاہ سے دکھا جائے تو تاریخ میں تحقیقی نظریات اور تجزیہ ہیں اور اس میں کائنات اور مبادی حیات کی لطیف علتیں بھی ہیں اسی طرح کیفیات واقعات اور اس کے اسباب کا گہرا علم ہے۔اسی لیے فلسفہ کی دنیا میں تاریخ جڑ اور بنیادی کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ اس کا شمار علم وحکمت میں کیا جائے۔

اسلام کے بڑے بڑے مورخین نے مفصل تاریخ لکھیں اور غالباً دنیا کے تمام واقعات کا قلمی استعاب کیا لیکن کچھ نا اہل اور نا کاروں نے تاریخ میں جھوٹے اور من گھڑت واقعات کی آمیزش کی۔اوہام واساطیر بھر دیئے کمزور روایات کے خوبصورت حاشیہ چڑھا دیئے،پھر بعد والے لکیر کے فقیر بن کر ان ہی کی روش اپنا لیے انہوں نے اسباب واقعات کو بلا غور وخوض کے من وعن نقل کر دیا نہ تو لچر پوچ اور پھسپھسی باتوں کو ٹھکرایا اور نہ معقول جواب دیا اس میں نہ تو تحقیق کا شائبہ ہے اور نہ تنقیح کا پہلو۔اغلاط واوہام تو خبروں کے ہم نسب اور ہم قدم ہیں۔

لطیفہ:

ابجد العلوم میں ابن خلدون کی تحریر نقل کرنے کے بعد انہیں سے یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اس فن کی عمدہ کتابوں میں سے قاضی عبدالرحمن بن محمد اشبیلی حضرمی مالکی متوفی ٨٠٨ھ کی ایک کتاب ہے جو کبیر النفع

اورکثیر الفوائد ہے اس کو چند سالوں میں مرتب کیا ہے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تیمور لنگ ۸۰۳ھ میں حلب کے قاضی تھے۔تیمور کو ایک قیدی ہاتھ آیا، غالباً وہ ابن خلدون ہی تھے، چناں چہ تیمور نے ان کو اپنی ملازمت پر مجبور کیا، لہذا وہ ان کے ساتھ رہنے لگے، ایک بار انہوں نے تیمور کے ساتھ سمر قند کا سفر کیا تو ابن خلدون نے تیمور سے کہا کہ میرے پاس تاریخ کا بہت بڑا حصہ ہے جس میں تمام واقعات کو میں نے قلمبند کیا ہے اور وہ مصر میں ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ پاگل کہیں اس پر ہاتھ صاف نہ کردے، وہ اس میں برقوق کی طرف اشارہ ہے۔تیمور نے کہا: کیا اس کتاب حاصل کرنا ممکن ہے، بہر حال ابن خلدون نے خود ہی اس مجوعہ کو تاریخ کے لیے "مصر" جانے کی اجازت طلب کی، تو تیمور نے اجازت دیدی۔غالبا یہ وہی کتاب ہے جو آج تاریخ ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے۔

تدوین تاریخ میں اسلامی مورخین کا منہج:

انبیاء ورسل، گزشتہ رعایا، لشکر وممالک، کی خبروں کو نقل کرنے میں اگر اسلامی مورخین کے علمبرداروں کو اسرائیلی کتب اور غیر اسرائیلی خبروں اور مدوّنات قدیمہ کے ماخذ ومراجع کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا تو وہ لوگ تاریخ کی تدوین میں چند طریقہ کا استعمال میں لاتے ہیں جو انکشاف حقیقت میں متعاون ہوتے ہیں اور اس وسیع علم میں ان کے منہج کو واضح کرتے ہیں اور ان کا یہ طرز انداز اس بات پہ مبرہن ہے کہ وہ لوگ محقق وصاحب بصیرت اور امانت دار میں سے تھے۔

ا۔امم سابقہ کے تاریخی واقعات کو کتاب وسنت کی روشنی میں جانچنا اگر اس کا تعلق ان واقعات سے ہو جس کو قرآن وحدیث نے بیان کیا تو لازماً وہ وحی معصوم کے موافق ہوگا ورنہ مورخین اسلام کے نزدیک وہ واقعات مردود ہیں۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ہم اپنی کتابوں میں وہی اسرائیلی روایات لاتے ہیں جس کے نقل کی شریعت نے اجازت دی ہے یا وہ روایات کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو اسلامی مورخوں نے قران وحدیث کو فیصلہ کا معیار اس لیے بنایا کہ مصادر تاریخ میں قران وحدیث سب سے اہم اور صداقت پر مبنی ہیں۔

۲۔ایسے واقعات اور خبریں جو مدون ہو چکے ہیں ان کے حق میں عاقلانہ اور منصفانہ فیصلہ صادر ہوں تا کہ واقعات کی صحت میں قوت آجائے اور وہ دائرہ عقل سے باہر نہ جائے مزید واقعات اور خبروں کا چلن احوال عالم اور طبیعت کائنات کے ساتھ ساتھ رہے۔

علم تاریخ کے لیے بے شمار مآخذ اور مختلف علوم ومعارف، نیز بالغ نظری اور اصابت رائے کی ضرورت ہے تا کہ گہری نظر اور اصابت رائے مطالعہ کرنے والے پر حق کو واضح کردے اور صاحب مطالعہ حق کی روشنی میں لغزشوں اور غلطیوں سے محفوظ رہیں' کیوں کہ اگر خبروں کو صرف نقل پر اعتماد کرلیا جائے اور اصول عادت' قواعد سیاست' مدنیت کی طبیعت اور معاشرے کے حالات کو بنیاد نہ بنایا جائے اور معدوم کا وجود پر اور غائب کا حاضر پر قیاس نہ کیا جائے، تو ان میں بہت سی لغزشوں اور سیدھی راہ سے قدم ڈگمگانے کا خدشہ باقی رہتا ہے پھر اس سلسلہ میں چار مثالیں بیان کی جس میں مورخین

نے غلطیوں کے بچکولے کھائے ہیں۔
۱۔بنواسرائیل کی عسکری تعداد کی تعین۔
۲۔افریقہ اور مغرب کا اہل یمن سے جنگ کرنا۔
۳۔واقعہ قوم عاد اوران کے شہر کی تعین۔
۴۔ہارون رشید کی بہن اور جعفر ابن یحی برمکی کا واقعہ جوان کی ہلاکت کا سبب بنا۔

اس کے علاوہ بہت ساری مثالیں بیان کرنے کے بعد ہر ایک کا علمی، واقعی، عقلی تجزیہ کر کے صحیح فیصلہ فرمانے کی کوشش کی ہے

۳۔بہر حال اسلامی مورخین نے اسلام، مسلمان اور اسلامی ممالک کی تاریخ کا زیادہ ہی اہتمام کیا ہے چاہے اس کا تعلق تفصیلات دقیقہ یا سلسلہ راوی سے کیوں نہ ہو اس اہتمام کو ہم سیرت رسول اور خلفاء راشدین کی تاریخ میں واضح طور پر محسوس کرتے ہیں بل کہ دولت امیہ اور دولت عباسیہ کی تاریخ بھی اس اہتمام سے خالی نہیں ہے مزید انہوں نے اپنی کتب تاریخ کو احادیث رسول سے بھی مزین کر رکھا ہے۔

۴۔مورخین اسلام نے تاریخ میں آنے والے ناموں پر اعراب لگانے کا اہتمام کیا ہے اگر چہ وہ لفظ غیر عربی کیوں نہ ہوں طلبا کے حق میں یہ اہم کام ہے کیوں کہ طلبہ بآسانی ان الفاظ کو استعمال کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں ابن خلدون نے اپنی کتاب "مقدمہ ابن خلدون" میں خاص بات تحریر فرماتے ہیں کہ اثناء تالیف اگر عجمی الفاظ آجایں تو اس حروف کی کیفیت ادائیگی لکھنا ہم پر واجب ہے۔۔۔چناں چہ انہوں نے اس پر مستقل بحث کی۔

تاریخ کی اہم کتابیں:

تاریخ کی وہ کتابیں بے شمار ہیں جو دانشمند اور تجربہ کار لوگوں کی کاوش ہے کشف الظنون میں حاجی خلیفہ اپنی قلم سیال سے رقمطراز ہیں ہم نے تاریخ کی کتابوں کو تیرہ سو تک شمار کیا ہے ہر ایک کا طرز الگ الگ ہے۔بعض تو تاریخی حیثیت سے مخصوص زمانہ کو شامل ہے اور ان میں سے بعض سارے عالم کی تاریخ کو سمیٹے ہوئے ہے اور کچھ تاریخی کتابوں کا تعلق متعین شہر سے ہے تاریخ کی کتابوں میں سے ایک قابل ذکر کتاب

وہ ہے جس کے مؤلف نے اپنی کتاب کے آغاز میں اہم مقدمہ تحریر فرمایا جس کا لگاؤ تاریخ 'مدنیت' اور امم مختلفہ سے ہے ۔تاریخ کے باب میں کچھ کتابیں اہم شخصیات کے احوال سے مربوط ہے اس کے علاوہ بہت ساری کتابیں لکھی جا چکی جس کا احاطہ مکمل طور پر ممکن نہیں لیکن چند کتابیں بطور مثال پیش کی جاتی۔

المصادر والمراجع:

۱۔البدایہ والنہایہ ابن کثیر
۲۔تاریخ طبری ابو جعفر الطبری
۳۔الکامل ابن الاثیر الجزری
۴۔مراۃ الزمان سبط ابن الجوزی

۵_تاریخ بغداد   خطیب البغدادی   ۶_اسد الغابہ   ابن اثیر
۷_تایخ الکبیر   علامہ ذہبی   ۸_تاریخ دمشق   ابن عساکر
۹_المغازی   الواقدی   ۱۰_طبقات الشافعیۃ   امام السبکی
۱۱_طبقات الحنابلۃ   ۱۲_طبقات الحنفیۃ
۱۳_المنتظم فی تاریخ الملوک والامم   ابو الفرج عبد الرحمن ابن الجوزی
۱۴_تاریخ خلیفہ   خلیفہ بن خیاط اللیثی   ۱۵_تاریخ عجائب الآثار عبد الرحمن حسن الجبروتی
۱۶_مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان فی معرفۃ التراجم والاخبار   الیافعی
۱۷_شفاء الغرام باخبار البلد الحرام   امام الفارسی
۱۸_الدرر الکامنہ فی اعیان المأیۃ الثامنہ   ابن حجر
۱۹_الدرر فی اختصار المغازی والسیر   ابن عبد البر
۲۰_الدارس فی تاریخ المدارس   النعیمی
۲۱_تاریخ خلیفۃ بن خیاط   خلیفہ ابن خیاط العصفری
۲۲_تاریخ البدء والتاریخ   طاہر المقدسی
۲۳_تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام / حافظ محمد بن احمد الذہبی
۲۴_مروج الذہب ومعادن الجوہر   ابو الحسن علی المسعودی
۲۵_سمط النجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی   عبدالملک بن حسین بن عبد الملک العصامی المکی
۲۶_محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ   محمد عفیفی الخضری
۲۷_تاریخ الاسلام السیاسی والدینی والثقافی والاجتماعی   حسن ابراہیم حسن
۲۸_التاریخ الاسلامی والحضارۃ الاسلامیۃ   احمد شلبی
۲۹_تاریخ التمدن الاسلامی   جرجی زیدان
۳۰_الحرکۃ الصلیبیۃ صفحۃ مشرقۃ فی تایخ الجہاد العربی   سعید عبد الفتاح
۳۱_تاریخ خلفاء راشدین   عبد الرحمن بن ابو بکر السیوطی
۳۲_العواصم والقواصم   محمد بن عبد اللہ المعافری
۳۳_العواصم والقواصم   قاضی ابو بکر ابن العربی
۳۴_کتاب المعرفۃ والتاریخ   ابو یوسف یعقوب البسوی
۳۵_انساب الاشراف   احمد بن یحیٰ البلاذری

۳۶۔وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان — احمد ابن محمد ابن خلکان
۳۷۔سیر اعلام النبلاء — امام الذہبی — ۳۸۔الاعلام — خیر الدین الزرکلی
۳۹۔معجم المؤلفین — عمر رضا کحالة — ۴۰۔کشف الظنون/مصطفی بن عبد اللہ حاجی خلیفه
۴۱۔معجم قبائل العرب والقدیمة والحدیثة — عمر رضا کحالة

اردو مصادر و مراجع:

تاریخ اسلام — مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی — تاریخ افکار اسلامی — راغب الطباخ
مختصر تاریخ اسلام — مولانا غلام رسول مہر — فتوح الہند — مفتی شفیع صاحبؒ
تاریخ اسلام — معین الدین ندوی — تاریخ فرشتہ — مورخ فرشتہ
ارض القرآن — سید سلیمان ندوی — تدوین حدیث — مولانا مناظر حسن گیلانی
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر — مولانا علی میاں ندویؒ
تاریخ اخلاق یورپ — (لیکی) ترجمہ مولانا عبد الماجد دریا آبادی
علمائے ہند شاندار ماضی — مولانا محمد میاں — داستان تاریخ اردو — سید حامد حسین قادری
تاریخ آزادی میں علما کا کردار — مولانا فیصل احمد ندوی — تاریخ دعوت وعزیمت — مولانا علی میاں ندویؒ
یادِ ایام (تاریخِ گجرات) — عبد الحی حسنی — تاریخ تدوین حدیث — مولانا عبد الرشید نعمانی
تاریخ ملت — زین العابدین سجاد میرٹھی — آئینہ تاریخ — مختار احمد صاحب
تاریخ ہند جدید — پروفیسر ظفر احمد نظامی
اسلام سے دنیا کو کس کس طرح روکا گیا — مولانا اعجاز علیؒ
دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا — مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ
محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک

علم تصوف

مولانا افتخار احمد صاحب قاسمی بستی پوری
استاذ فقہ وتفسیر جامعہ اکل کوا

تصوف کا علم بڑے فضل وشرف اور بڑی عظمت واہمیت کا حامل ہے، بل کہ تصوف کے علما اور اس سے شغف

رکھنے والے عوام وخواص کے نزدیک اس کا شمار اعلیٰ ترین علوم اور اشرف ترین الاخریٰ ۱۴۳۰ھ ہے۔ علوم ومعارف میں علم تصوف جہاں انتہائی بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہیں یہ بڑا دقیق اور گہرا بھی ہے، اس کا حصول انتھک جد وجہد اور خاص اہتمام کے بغیر ممکن نہیں۔

تصوف کی تعریف:

افاضل علما سے تصوف کی بہت ساری تعریفیں منقول ہیں۔ چناں چہ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے لیے قلب کو خالی کر لینے اور اس کے ماسوا کو نظر سے گرا دینے کا نام ''تصوف'' ہے۔

''کشف الظنون'' میں حاجی خلیفہؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایسا علم ہے، جس کے ذریعے اہلِ کمال کے نوع انسانی سے مدارج سعادت میں اور امور عارضہ سے بلندیٔ درجات میں بشری طاقت کے بقدر ترقی کرنے کی کیفیت جانی جاتی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت زکریا انصاریؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایسا علم ہے، جس کے ذریعے تزکیۂ نفس، تصفیۂ اخلاق اور تعمیر ظاہر وباطن کے احوال کی معرفت حاصل ہوتی ہے، تاکہ ابدی سعادت کا حصول ممکن ہو۔ اور شیخ زروقؒ اپنی کتاب ''قواعد التصوف'' میں فرماتے ہیں کہ تصوف کی اتنی تعریف کی گئی ہے اور اس کی اس قدر تفسیر بیان کی گئی ہے کہ اس کا شمار دو ہزار کی تعداد کو پہونچ جاتا ہے، جس کی بنیاد خالص توجہ الی اللہ پر ہے اور یہ سب تعریفیں وتفسیریں توجہ الی اللہ ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔

تصوف کی ساخت اور اس کا ارتقا:

علامہ ابن خلدونؒ اپنے ''مقدمہ'' میں فرماتے ہیں کہ ''یہ علم یعنی علم تصوف ان علوم شرعیہ میں سے ہے، جو ملت میں نو پید ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان صوفیا کا طریقہ امت کے اسلاف واکابر یعنی صحابہ وتابعین اور ان کے بعد والوں کے یہاں حق وہدایت کے طریقے سے الگ نہیں ہے۔ جس کی بنیادی اصل یہ ہے کہ عبادت پر جماؤ ہو ہر ایک سے کٹ کر اللہ کی طرف توجہ ہو، دنیا اور دنیا کی زینت سے اعراض ہو، مادی لذت اور مال ومنصب سے بے رغبتی ہو، مخلوق سے کنارہ کشی اور خالق کی عبادت کے لیے یکسوئی ہو، اور یہ ساری باتیں صحابہ وسلف صالحین میں بالعموم پائی جاتی تھیں۔ پھر جب دوسری صدی اور اس کے بعد کے زمانے میں دنیا کی طرف لوگوں کی توجہ عام ہونے لگی اور لوگ دنیا سے دل بستگی کی طرف مائل ہونے لگے تو عبادت کی رغبت رکھنے والے لوگ تصوف کے نام سے بالخصوص ممتاز ہوئے''۔

تصوف قرونِ اولیٰ میں:

اگرچہ سلف صالحین کے شروع دور میں تصوف اپنے خاص نام یعنی ''علم تصوف'' کی حیثیت سے مشہور نہیں تھا، تاہم معرفت ومحبت، مراقبہ وتوجہ، ذکر وشغل، تحلیہ وتخلیہ اور سلوک ووصول جیسے اپنے مدارج ومقامات کے اعتبار سے یہ بالکل غیر معروف بھی نہیں تھا۔ چناں چہ تصوف کے امام اور شیخ عبد الکریم بن ہوازن قشیری قدس سرہٗ اپنے مشہور رسالہ''

رسالہ قشیریہ" میں ان لوگوں پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جو لوگ علم تصوف کا محض اس وجہ سے انکار کر دیتے ہیں کہ یہ نام دین اسلام کے مآخذ میں صراحتاً موجود نہیں۔

"جان لو! کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے صاحب فضل وکمال لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے سوا کسی علم کی نسبت سے موسوم نہیں ہوئے، کیوں کہ صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی افضلیت نہیں۔ لہٰذا وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے صحابہؓ ہوئے اور ان کے بعد والے ان صحابہؓ کی صحبت سے تابعین ہوئے۔ پھر لوگوں کے احوال ومراتب میں فرق آیا، چناں چہ وہ خاص قسم کے لوگ جنہیں دینی امور سے کچھ خاص لگاؤ رہا، انہیں "زہاد وعباد" کہا گیا۔ پھر بدعتوں کا ظہور رہا اور مختلف فرقوں میں دعوی بازی ہونے لگی، ہر فرقہ اپنے افراد ہی میں "زہاد وعباد" کے ہونے کا دعویٰ کیا۔ ایسی حالت میں اہل سنت کے وہ خاص لوگ جو اپنے قلوب کو غفلت اور اسباب غفلت سے محفوظ فرما کر اپنی ذات کو اللہ سبحانہ وتعالی سے وابستہ کرنے کے خیال میں رہتے ہیں، "تصوف" کے نام سے منسوب ہوئے اور دو صدی ہجری قبل یہ نام ان برگزیدہ ہستیوں کے لیے مشہور ہو گیا"۔

سب سے پہلے "صوفی" کے نام سے موسوم ہونے والے بزرگ "شیخ ابو ہاشم صوفی" ہیں، جن کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ پھر بعد میں یہ نام ایسے عظیم لوگوں کے لیے شہرت پا تا گیا، جو نفس کی اصلاح وتزکیہ کر کے زھد وعبادت کے جام سے سرشار رہوئے اور مخلوق سے تجرد اختیار کر کے خالق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے، جیسے شیخ ابو حازم سلمہ بن دینار مخزومیؒ، شیخ معافی بن عمرانؒ، شیخ فضیل بن عیاضؒ، شیخ معروف کرخیؒ، شیخ بشر بن حارث حافیؒ، شیخ حارث بن اسد محاسبیؒ، شیخ ابو یزید بسطامیؒ، شیخ ابو بکر وراقؒ، شیخ سہیل بن عبداللہ تستریؒ اور شیخ ابو قاسم جنید بن محمد بغدادیؒ۔

تاریخ اسلامی میں تصوف کا روشن دور:

تصوف اور اس کے میدان کار کے تعلق سے تاریخ اسلامی کے صفحات بھرے پڑے ہیں، جن سے اسلامی تاریخ میں تصوف او رصوفیا کی عظمتِ شان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد زحیلی اپنی کتاب "تعریف عام بالعلوم الشرعیۃ" میں فرماتے ہیں کہ: "یقیناً تصوف، صوفیا اور طریقت کی اسلامی تاریخ میں ایک بڑی شان ہے۔ جیسا کہ بعض دیہی اور شہری علاقوں میں دعوتِ اسلامی اور اسلام کے نشر واشاعت میں اس کا ایک شاندار دور رہا ہے، جیسے "طریقۃ سنوسیہ" افریقہ میں اور دوسرے مختلف طریقے جنوبی سوڈان اور مغربی افریقہ میں۔ بل کہ بعض مستشرقین اور یورپی علما کے یہاں بھی تصوف اور اس کے نظریات واصول کی خاص اہمیت رہی ہے"۔

نیز ڈاکٹر زحیلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ: "اکثر بلاد اسلامیہ میں تصوف کا ایک واضح اثر رہا ہے، بل کہ بعض یورپی ممالک میں بھی کچھ لوگ اس راستے سے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ کیوں کہ افراد کی زندگی میں یہ حساس اور اہم گوشوں کا احاطہ کرتا ہے اور اس روحانی ونفسیاتی بھوک میں آسودگی پیدا کرتا ہے، جسے مغربی لوگ فکری حیات اور مادی تہذیب میں زندگی کا جزو بناتے ہیں"۔

تصوف کے اصول ومسائل :

دیگرعلوم کی طرح اس اہم علم کے بھی کچھ اصول ومسائل ہیں، جنہیں بہت سارے علمانے تصوف کی کتابوں میں بیان فرمایا ہے۔چناں چہ شیخ محمدامین کردیؒ اپنی کتاب "تنویرالقلوب" میں فرماتے ہیں کہ تصوف کے اصول پانچ ہیں:

(۱) خلوت وجلوت میں اللہ کا تقوی اختیار کرنا جس کا تحقق ورع واستقامت کے ذریعے ہوگا۔

(۲)اقوال وافعال میں سنت کی اتباع کرنا، جس کا تحقق استحضاروحسن خلق کے ذریعے ہوگا۔

(۳)حضوروغیبت میں مخلوق سے اعراض کرنا، جس کا تحقق صبروتوکل کے ذریعے ہوگا۔

(۴)قلیل وکثیر میں اللہ سے راضی رہنا جس کا تحقق قناعت وتفویض کے ذریعے ہوگا۔

(۵) خوشی وغم میں اللہ سے رجوع کرنا، جس کا تحقق حالت خوشی میں شکر کے ذریعےاورحالت غم میں التجا کے ذریعے ہوگا۔

تصوف کے مسائل، قلوب کی حالات وصفات کی تفتیش ہے۔جیسے مقامات، احوال، ذکر، محبت، فناء، خوف، ورع، توکل، توبہ، رجاء، کرامت اورتحلیہ وتخلیہ۔اوریہ سب چیزیں تصوف کی وہ اصطلاحیں ہیں، جوآیتِ قرآنیہ، کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم اورامت کے طبقۂ خواص سے منقول اقوال واحوال سے مستفادہوتی ہیں۔

تصوف کے ان صاف ستھرے قواعداورمسلم اصول وضوابط کے باوجوداس بات سے انکاربھی نہیں کیا جاسکتا کہ چوتھی صدی ہجری کے بعداہلِ ہوئی وہوس کی طرف سے تصوف میں کچھ باطل افکاراورفاسدخیالات بھی درآئے، جس کی وجہ سے تصوف کی عظمت یقینا مجروح ہوئی۔مگرہرعقل وشعوروالا جانتا ہے کہ اصل تصوف کے ساتھ ان خرافات کا قطعاً کوئی رشتہ نہیں، اورہرآنکھ والا دیکھتا ہے کہ ان خرافات کی دھند سے تصوف کا روشن چہرہ ہرگز متاثرنہیں۔بل کہ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے، جیسے موسم گرما میں روشن سورج کے سامنے بدلیوں کے ٹکڑوں کی۔

تصوف کے بنیادی مراجع :

علمائے اسلام نے علم تصوف میں بہت ساری کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جس کا آغازدوسری صدی ہجری کے نصف سے ہوگیا تھا۔جیسے عبداللہ بن مبارکؒ کی "کتاب الزھد" اوراسی نام کی دوسری "کتاب الزھد" امام احمد بن حنبلؒ کی۔علاوہ ازیں تصوف کی دوسری مشہورکتابیں ان کے مصنفین کے ساتھ درج ذیل ہیں:

(۱)حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء — محدث ابونعیم اصبھانی رحمۃ اللہ علیہ

(۲)الرسالۃ القشیریۃ — ابوالقاسم عبدالکریم بن ھوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ

(۳)التعرف لمذھب اھل التصوف — ابوبکرمحمدبن اسحاق کلاباذی رحمۃ اللہ علیہ

(۴) احیاء علوم الدین	امام ابو حامد غزالی طوسیؒ
(۵) قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب	ابو طالب محمد بن علی مکیؒ
(۶) عوارف المعارف	عبدالقادر بن عبداللہ سہروردیؒ
(۷) المنقذ من الضلال	امام ابو حامد غزالی طوسیؒ
(۸) کتب الحکیم الترمذی	ابو عبداللہ محمد بن علیؒ
(۹) وصف طریق المرید الی مقام التوحید	ابو طالب محمد بن علی مکیؒ
(۱۰) کتاب حقائق عن التصوف	شیخ عبدالقادر عیسی حلبیؒ
(۱۱) الاربعین فی اصول الدین	امام ابو حامد غزالی طوسیؒ
(۱۲) کتاب تنویر القلوب فی معاملۃ علام الغیوب	شیخ محمد امین کردیؒ
(۱۳) کتاب تربیتنا الروحیۃ	شیخ سعید حویؒ
(۱۴) الحکم العطائیۃ	ابن عطاء اللہ احمد بن محمد سکندریؒ
(۱۵) مدارج السالکین شرح منازل السائرین	علامہ ابن قیمؒ
(۱۶) معراج التشوف الی التصوف	علامہ ابن عجیبہؒ

تصوف پر لکھی گئیں مذکورہ کتابیں عربی زبان میں ہیں، جن کے علاوہ اردو زبان میں بھی اس موضوع پر بہت ساری کتابیں پائی جاتی ہیں، جن میں کچھ مشہور اور مستند کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) تربیت السالک	حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ
(۲) اسلام کا اخلاقی نظام	حکیم الاسلام حضرت قاری طیبؒ
(۳) تصوف کیا ہے؟	حضرت مولانا منظور نعمانیؒ
(۴) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
(۵) تسہیل قصد السبیل	حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ
(۶) دل کی دنیا	حضرت مفتی محمد شفیعؒ
(۷) مشائخ چشت	پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ
(۸) تجدید تصوف وسلوک	مولانا عبدالباری ندویؒ
(۹) تصوف وسلوک کی حقیقت	شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ
(۱۰) تصوف ونسبت صوفیہ	مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہؒ
(۱۱) ارشاد الملوک ترجمہ امداد السلوک	حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھیؒ
(۱۲) مکاشفۃ القلوب اردو	حجۃ الاسلام امام غزالیؒ

(۱۳) کشف المجوب اردو　　　　حضرت شیخ علی ہجویریؒ
(۱۴) غنیۃ الطالبین اردو　　　　شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
(۱۵) معارف صوفیہ　　　　حضرت مولانا محمد قمرالزماں زید مجدہٗ
(۱۶) تصوف وسلوک　　　　پیر ذوالفقار احمد نقشبندی زید مجدہٗ
(۱۷) کشکول معرفت　　　　حضرت مولانا حکیم محمد اختر زید مجدہٗ
(۱۸) طہارت قلب　　　　حضرت مولانا محمد قمرالزماں زید مجدہٗ
(۱۹) رہے سلامت تمہاری نسبت　　　　پیر ذوالفقار احمد نقشبندی زید مجدہٗ
(۲۰) مراقبہ　　　　خواجہ شمس الدین عظیمی

آخری بات:

تصوف کے سلسلے میں آخری اور انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ علم فقہا محدثین اور اہل فتوی کے علم شریعت کی تکمیل کرتا ہے، اس سے معارض اور متصادم نہیں ہوتا، کیوں کہ ''شریعت'' اسلامی قانون کا نام ہے اور اس پر چلنا ''طریقت'' کہلاتا ہے اور دونوں کی جامعیت ''تصوف'' میں پائی جاتی ہے۔ لہذا کامل صوفی وہ ہے جو شرع ظاہر کا مخالف نہیں اور کامل عالم وہ ہے جو احوال باطن کا منکر نہیں۔ علامہ ابن خلدونؒ اپنے ''مقدمہ'' میں فرماتے ہیں:

''علم شریعت دو قسم پر ہے۔ ایک تو وہ ہے جو فقہا اور اہل فتوی کے ساتھ خاص ہے، اور یہ عبادات، عادات اور معاملات کے بارے میں عام احکام کا علم ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو صوفیا کے ساتھ خاص ہے، اور یہ نفس کے مجاہدہ، اس کے محاسبہ اور اس راستہ میں پیش آنے والے ذوق ووجدان اور اس میں ترقی کرنے سے متعلق خاص احوال کا علم ہے۔

حاصل یہ کہ تصوف شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں، بل کہ اس کی جڑ شریعت ہی کی تہہ میں پیوست ہے۔ حضرت شیخ زکریا قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ تصوف کی ابتدا تصحیح نیت سے ہے جس کی شہادت ''انما الاعمال بالنیات'' سے ملتی ہے۔ اور اس کی انتہا ''مقام احسان'' کی یافت پر ہے، جس کا ثبوت ''ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک'' سے ملتا ہے، لہذا تصوف یا طریقت عین شریعت کا دوسرا نام ہے۔

الغزوالفکری: تعارف وتجزیہ

یعنی　''اسلام اور مسلمانوں کے خلاف باطل کی فکری یلغار کا تاریخی جائزہ''
''فکری سازشوں سے پردہ اٹھانے والی ایک العیلی تحریر''

الاخری ۱۴۳۰ھ مولانا) حذیفہ وستانوی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کو

اللہ رب العزت نے انسان کی ہدایت کے لیے ہر زمانہ اور ہر علاقہ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام کو مبعوث فرمایا، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ و السلام کی بعثت کا اصل مقصد، انسان کو اس کے بھولے ہوئے سبق یعنی توحید کی یاد دہانی تھی، کیوں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور اپنی ہی پھونک سے اس میں روح بخشی، اور اسے علم سے مالا مال کیا، اسے مسجود ملائکہ بنا کر اشرف المخلوقات کے مرتبہ اور خلیفۃ اللہ کے منصب پر فائز کیا، اور تخلیق کے بعد جنت میں اپنے جوار میں ٹھہرایا، البتہ شیطان جو انسان کے اشرف الخلائق کا انکار کر بیٹھا تھا، اسے راندۂ دربار کیا گیا، تو اس نے انتقام کی غرض سے بہلا پھسلا کر، آدم کو جنت سے نکلوا دیا، البتہ آدم علیہ السلام کے اعتراف ذنب اور طلب مغفرت اور تواضع کی وجہ سے، ہمیشہ کی لعنت سے وہ بچ گئے، ان کے لیے اور ان کی ذریت کے لیے جنت کے دروازوں کو کھلا رکھا گیا، البتہ اس دنیا میں اسے ابتلاء و آزمائش میں ڈال کر کامیابی کی صورت میں ہی دخول جنت کا وعدہ کیا گیا، اور ناکامی کی صورت میں دوزخ کی وعید سنائی گئی۔

جب سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے تکبر اور عناد کی بنیاد پر شیطان نے روگردانی کی تب ہی سے حق اور باطل کے درمیان معرکہ آرائی کا آغاز ہوگیا، اس معرکہ کا آغاز ''فکر انسانی'' میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش ہی سے ہوا، کیوں کہ شیطان کوئی تلوار، تیر، کمان لے کر آمادۂ معرکہ نہیں ہوا تھا، بل کہ ''فکر انسانی'' کو دھوکہ دے کر برباد کرنے کی کوشش کی، اسی کو ''الغزو الفکری'' کہا جاتا ہے، معاصر عرب علما کی تحقیق کے مطابق ''الغزو الفکری'' کی اصطلاح، تو جدید ہے، ۱۴ رویں صدی ہجری اور بیسوی صدی عیسوی میں وضع کی گئی، مگر اس کی تاریخ بہت قدیم ہے، جیسا کہ مذکورہ تحریر سے معلوم ہوتا ہے، البتہ ''سقوط خلافت اسلامیہ'' کے بعد جب اعداء اسلام کو تخریب کاری کے لیے کھلا میدان ہاتھ لگ گیا، تو انہوں نے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں، بل کہ ان شیطانی چیلوں چپاٹوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو، ''الحاد و بے دینی'' کے دلدل میں پھنسانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا، اور روۓ دنیا کو جہنم کدہ بنا چکے ہیں، مگر ان کا خاص ہدف ''مسلمان'' ہی ہیں، کیوں کہ وہی ان کا مضبوط اور طاقتور مدِ مقابل ہے۔ تو آیئے ہم ''الغزو الفکری'' کی تعریف، تاریخ، اسباب، اہداف، اسالیب اور وسائل یلغار، اثرات، اور اس سے بچنے کے لیے نجات کے طریقوں کو معلوم کریں، تا کہ اپنے ایمان کو بچا کر شیطان اور اس کے ہم نواؤں کو ناکام بنا کر اللہ کے سامنے جواب دہی کی تیاری کریں، اور اس کی رضا و خوشنودی حاصل کر کے، دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے بہرہ ور ہو جائیں۔

الغزو الفکری کی تعریف:

''الغزو الفکری'' اس غیر عسکری طریقۂ کار کو کہا جاتا ہے، جس کے ذریعہ دشمن اپنے دشمن پر حملہ آور ہو، اور مختلف

خداعی طریقوں سے اس کے افکار اور معتقدات کو یا تو مشکوک کر دے، یا اسے کلی یا جزوی طور پر اپنے عقائد سے منحرف کر دے، اور اپنے مذہب اور دین کے بارے متنفر کر دے، غیر ضروری، یا کم ضروری امور میں مشغول کر کے، دین سے بیزار کر دے، جس کے نتیجہ میں نہ تو وہ اپنی دین کی بنیادی معلومات حاصل کر سکے، اور نہ دین کے تقاضوں پر عمل درآمد کر سکے، اور اگر معلومات حاصل بھی کرے تو ایسے مصنفین کی کتابوں سے جو تعصب اور عناد کی بنیاد پر اس کی بالکل تحریف شدہ تفسیر و توضیح کرتے ہوں۔

یہ تو ''الغزو الفکری'' کی تعریف عام تھی، اب ''الغزو الفکری'' کی تعریف خاص کرتے ہیں، یعنی اسلام کے خلاف ''الغزو الفکری'' کس کو کہتے ہیں، کیوں کہ ''الغزو الفکری'' کو سب سے زیادہ اسلام ہی کے خلاف استعمال کیا گیا، لہٰذا اس نقطۂ نظر سے بھی اس کی وضاحت ضروری ہے۔

اسلام کے خلاف ''الغزو الفکری'' کی تعریف:

وہ غیر عسکری طریقہ کار جس کو اعداء اسلام خاص طور پر یہود و نصاریٰ اسلام کے خلاف استعمال کرتے چلے آئے ہیں، جس میں تعلیم، تحقیق آزادی کے نام پر اسلامی مصادر و مراجع، کلیات و جزئیات علوم و معارف، عقائد و افکار کو یا تو تعصب اور عناد کی بنیاد پر زبردستی شک کے دائرے میں ڈال دیا جائے، اور مسلمانوں کو ان کے اپنے عقائد اور اسلامی تعلیمات سے یا تو دور رکھا جائے یا یا اسلام کی شکل بگاڑ کر متنفر کر دیا جائے، اور روحانیت کا جنازہ نکال کر، مادیت کو ان پر مسلط کر دیا جائے۔

اس تعریف سے آپ بھانپ گئے ہوں گے کہ ''الغزو الفکری'' اسلام کے خلاف کتنا منظم، مربوط اور زبردست محاذ ہے، اس نے اسلام کے کسی ایک گوشہ کو ہی ہدف نہیں بنایا، بل کہ تمام شعبہائے اسلام کو اپنے سازشوں کے شکنجہ میں لے لیا ہے، چاہے وہ گوشۂ عقائد ہو، معیشت ہو، سیاست ہو، تعلیم ہو، تاریخ ہو، عقلیات و فلسفہ ہو، معاشرت ہو، نفسات ہو، ذرائع ابلاغ ہو، خواہ نظام تربیت ہو۔

امید ہے کہ دیگر جامعات و مدارس اسلامیہ بھی اس جانب توجہ دیں گے۔

الغزو الفکری کے محرکات:

ویسے تو الغزو الفکری کو ہوا دینے والے بے شمار محرکات ہیں جو ہر زمانہ میں اسلام کی بیخ کنی کی کوششیں کرتے رہتے ہیں، مگر تین محرکات اہم ہیں، بقیہ اس کے تابع ہیں، وہ:

(۱) یہودیت (۲) نصرانیت (۳) لادینیت

بظاہر تو یہ الگ الگ ہیں، مگر اسلام کے خلاف ہمیشہ متحد ہو جاتے ہیں، کیوں کہ الحمد للہ! اسلام ہی حق ہے بقیہ سب باطل ہیں، لہٰذا ان کو سب سے زیادہ خطرہ اسلام ہی سے ہے کہ کہیں اسلام اور اہل اسلام روحانی اور جسمانی، ظاہری و باطنی اعتبار سے مضبوط ہو کر ہمارے لیے دردِ سر نہ بن جائے، لہٰذا حفظ ما تقدم کے طور پر پہلے ہی سے انہیں قابو میں رکھا

جائے۔قرآن نے اسی باطل اتحاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”والذین کفروا بعضهم اولیاء بعض“ کفار آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔(سورۃ الانفال: ۷۳)

یہودیت:

یہود، یہ ایک قدیم سامی مذہب ہے، ان کو یہود کہنے کی مختلف وجوہات ہیں، یا تو یہودہ بن یعقوب کی طرف نسبت کرتے ہوئے، یا هدنا الیک یعنی ان کی توبہ کرنے کی وجہ سے، یا هاد کے معنی حرکت کرنا۔اور یہ لوگ تورات کی تلاوت کے وقت بہت زیادہ حرکت کرتے ہیں؛ اسی لیے یہود کہا جاتا ہے۔(الموسوعۃ المیسر ج۲ص ۵۶۵)

یہود کی مذہبی زبان عبرانی ہے، یہ دراصل حضرت یعقوبؑ کی ذریت میں سے ہے، جو بنواسرائیل سے مشہور ہوئی، گویا اسی کی شاخ ہے، مگر ان کی تعلیمات محرف ہوچکی ہے، ان کا اصل مسکن کنعان، پھر وہاں سے مصر اور پھر فلسطین، پھر مدینہ، اور اس کے اطراف میں آباد ہوئے، مگر ان کی اپنی شرارتوں کی وجہ سے وہاں قرن اول ہجری کے آغاز ہی میں جلاوطن کردیے گئے، پھر یہ لوگ یورپ کے مختلف خطوں میں آباد ہوئے اور وہاں سے ایک مکمل سازش کے تحت بیسویں صدی میں دوبارہ غاصبانہ طور پر فلسطین میں ایک عبرانی سامی یہودی صیہونی مملکت بنانے میں کامیاب ہوگئے، اور اس قیام مملکت اسرائیل کے لیے انہوں نے ملعون کمال اتاترک جیسے کے سہارے خلافت اسلامیہ کو سقوط سے دوچار کیا، جس کا خمیازہ آج تک امت محمدیہ بھگت رہی ہے۔

بعثت کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو ایمان کی دعوت دی، ان کے تمام اعتراضات وسوالات کے صحیح اور مدلل جوابات دیے، مگر ان کی اکثریت اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئی، بل کہ اسلام کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے ہر میدان میں انتھک کوشش پر کمربستہ ہوگئی، یہاں تک کہ بت پرست اہل مکہ کے ساتھ اتحاد و تعاون کے لیے یہ کہنے سے بھی گریزاں نہیں ہوئی کہ ”هؤلاء اهدی من الذین امنوا سبیلا“ کہ اہل مکہ بت پرست، ایمان والے کے مقابلہ میں، زیادہ سیدھے راستے پر ہے۔”مکائد یهودیة عبر التاریخ“ میں عبدالرحمن حبنکہ میدانی نے اور ”الیهود والیهودیة فی عصر الرسول“ کے مصنف نے اپنی کتاب میں اس کی مکمل تفصیلات بیان کی ہے۔

صرف عصر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہی وہ مقابلہ آرائی پر اکتفا نہیں کرتے، بل کہ ہر زمانہ میں اسلام کو مٹانے کی ہر ممکن جدوجہد کرتے رہے، قرآن کریم نے ”لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا“ (یعنی تم یہود کو مومن کے لیے سب سے زیادہ عداوت والا پاؤگے) والی آیت کریمہ میں مسلمانوں کو پہلے ہی متنبہ کردیا تھا، قرآن کا یہ انتباہ بالکل حرف بہ حرف صادق، ثابت ہوا، کیوں کہ ہر زمانہ میں وہ اسلام کے خلاف فکری وعسکری محاذ پر خفیہ طریقے سے کارفرما رہے ہیں، اس کی پوری تفصیلات عبدالوہاب المسیری مرحوم کی کتاب ”موسوعة الیهود والیهودیة“ اور ”الاعلام الیهودی المعاصر واثره فی الامة الاسلامیة“ (یوسف محی الدین ابو ہلالہ) میں آپ تفصیل کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔

نصرانیت:

یہ بھی ایک سامی مذہب ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماء کے بعد یہودی کی کوششوں سے انحراف کا شکار ہوا، جس کی تفصیلات آپ شیخ الاسلام حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی مایہ ناز تصنیف ''بائبل سے قرآن تک'' میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کو نصرانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مدد کی تھی، اور دوسرا قول یہ ہے کہ ناصریہ بستی کی طرف نسبت کرتے ہوئے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن تھا، ان کو نصاریٰ کہا جاتا ہے۔

نصاریٰ بھی دراصل بنو اسرائیل ہی کی ایک شاخ ہے، کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ ان میں مبعوث ہوئے تو بنو اسرائیل میں سے جو ان پر ایمان لائے ان کو نصاریٰ کہا گیا، ان کا اصل وطن بھی کنعان ہے، پھر فلسطین اور پھر نجران اور اسلام کے ابتدائی دور میں جب ان کے بادشاہ ہرقل نے اسلام قبول نہ کیا، یہاں تک کہ جنگ کی نوبت آئی تو یہ بھی شکست کھا کر یورپ کی طرف آ نکلے، ایک عرصہ تک مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار رہے، مگر شکست پر شکست سے دوچار ہوتے رہے، یہاں تک کہ غرناطہ اور اندلس میں مسلمان حکمرانوں کی بزدلی اور نفس پرستی کی وجہ سے کامیاب ہوگئے، اس کے بعد یورپ میں ان کے قدم مستحکم ہوگئے، یہ بھی اول یوم ہی سے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مبتلا چلے آرہے ہیں، انہوں نے بھی ہر میدان میں مسلمانوں کو ناکام بنانے کی کوشش کی، مگر جب ناکام ہوئے مکار اور فریبی یہودیوں کے ساتھ اتحاد کر کے اسلام کے خلاف کمر بستہ ہوگئے، اور اولاً علم تحقیق کے نام پر دونوں نے مل کر استشراق پھر عولمہ یعنی گلوبلائزیشن اور آخر میں استعمار یعنی بلاشرکت غیر حاکمیت کا پلان بنایا، اور اب تو سویت یونین کی شکست کے بعد موساد ملٹی نیشنل ورلڈ بینک (F.I.C. W.H.O.) جیسی تنظیموں کے سہارے ہندتو، بودھ ازم، بل کہ غیر اسلامی اور منافقین کے سہارے پوری دنیا پر نیو ورڈ آڈر کے نفاذ کا اعلان ہو چکا ہے، اور امریکن و یورپین صیہونیت زدہ نصرانیت کو آلہ کار بنا کر یہود و نصاریٰ اور تمام باطل طاقتیں اسلام کی بیخ کنی کے لیے برسر پیکار ہے۔ جذور البلاء، واقعنا المعاصر، مخططات التبشیر الاستشراق میں آپ اس کی تفصیلات کو جان سکتے ہیں۔

لادینیت

لادینیت دو طرح کی ہے، ایک وہ لادینی گروہ جو اللہ کے ساتھ شرک میں مبتلا ہے۔ اور دوسرا کلی طور پر اللہ کا انکار کرنے والا۔ دونوں ہی ملحد کہے جاتے ہیں، کیوں کہ شرکیہ مذاہب دراصل نام ہے، ورنہ تو حقیقت میں حق کا انکار ہے، گویا یہودیت اور نصرانیت کے علاوہ جتنی باطل اسلام مخالف طاقتیں ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں۔ ہمیشہ یہ باطل طاقتیں یا تو یہودیت و نصرانیت کی معاون رہی یا نہیں تو اسلام مخالف تو ہے ہی۔ کیوں کہ ان کو اسلام ہی سے خطرہ محسوس ہوتا ہے، اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی ریاستیں ان کے زیر اثر ہیں، چاہے ہندوستان ہو، چاہے چین ہو، چاہے روس ہو، چاہے کوریا ہو، بل کہ اسلامی ممالک پر خلافت کے سقوط کے بعد اپنے آلہ کار منافق' فاسق' فاجر' مغربیت زدہ حاکموں کو مسلط کر دیا ہے، جو ان کے اشارے پر ہی سب کچھ کرتے ہیں، ان کے مفاد کے لیے نہ مسلمانی نہ اسلام، ان کے لیے رکاوٹ ہوتا ہے۔ اس لیے باوجودیکہ تقریباً ۶۰ اسلامی ریاستیں ہیں، لیکن کہیں بھی قانون الٰہی اور

قوانین اسلامی کا نفاذ نہیں۔ اگر کہیں ہے تو وہ بھی برائے نام اور ریاست کے پیش نظر

اللہ ان کی ایمان سوز سازشوں سے ہماری حفاظت فرمائے، اور ایمان کے ڈاکوؤں اور ان کے معاونین کو یا ہدایت دے یا غارت کردے، اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

الغزو الفکری کے اہداف:

سنۃ اللہ یہ رہی ہے کہ حق اور باطل کی کش مکش، تخلیق آدم کے کچھ ہی بعد سے شروع ہوگئی، ''اھبطا منھا جمیعا بعضکم لبعض عدو'' ''تم دونوں یعنی آدم اور شیطان اتر جاؤ، آپس میں ایک دوسرے کی عداوت کو لے کر بس زمین پر اترنے کے بعد ایسا ہی ہوا، ایک طرف ''ولاغوینھم'' کا چیلنج کرنے والا شیطان اس انسانی وجناتی ہم نوا اور دوسری طرف ''وان لم تغفرلی وترحمنی اکن من الخاسرین'' کہہ کر اپنی تقصیر کا اعتراف کرنے والے آدم اور اس کی صحیح وارث ذریت شیطان اور اس کے ہم نوا آدم کی حقیقی ذریت صالح سے ایمان ویقین باللہ کو سلب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہدف اصلی ہے ''الغزو الفکری'' کا۔

اور کچھ نہیں تو کم از کم ایمان میں ضعف اور مقصد تخلیق سے بُعد تو حاصل ہو ہی جائے اس لیے قادیانیت، بہائیت، بابیت، شیوعیت، سرمایہ داریت، عقلیت، مغربیت، مادیت، ماسونیت، داروئیت، فرائڈیت، وجودیت، تجربیت، وغیرہ کو مسلمانوں میں عام کرنے کی کوشش کی جارہی ہی جس کی تفصیلات آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے۔

الغزو الفکری کے وسائل:

ان وسائط اور طریقوں کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ فکر انسانی واسلامی کو متاثر کیا جائے، ان میں سے بعض مباشر یعنی ڈائریکٹ ہوتے ہیں، بعض غیر مباشر یعنی انڈائریکٹ ہوتے ہیں، بعض عمومی ہوتے ہیں اور بعض خصوصی، بعض مسلسل ہوتے ہیں اور بعض وقتی ہوتے ہیں، یہ سب ملا کر کل تین ہیں:

(۱) تعلیم وتعلم (۲) ذرائع ابلاغ (۳) رفاہی ادارے

تعلیم وتعلم:

مسلمانوں کا مزاج علمی ہے، کیوں کہ ایک تو انسان کی فطرت ہی علمی ہے اور دوسرا اسلام کی بنیاد علم پر رکھی ہے۔ ''اقرأ باسم ربک'' ''پڑھ اپنے رب کے نام پر۔ اب ''علم آدم الاسماء'' اور ''اقرأ'' کا اثر سب سے زیادہ مسلمانوں پر ہوا، کیوں کہ فطرت کو صحیح معنی میں اختیار کرنے کا ڈھنگ مسلمان نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے سیکھا، جس کے نتیجے میں اس کے رگ وریشے میں علم سرایت کرگیا، یہود ونصاریٰ کیوں کہ آغاز اسلام ہی سے مسلمانوں کے بہت قریب رہے ہیں، لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کی علم پروری اور علم دوستی کو بھانپ لیا، لہٰذا صلیبی جنگوں میں ناکامی کے بعد سراَۃ ثانیہ کا اعلان کرکے، نئی صلیبی جنگ کی تیاری شروع کردی، جس کا نام ''استشراق'' دیا، محض دھوکہ دینے کے لیے، کیوں کہ استشراق کے اصل معنی تو مشرقی تہذیب وتمدن، ثقافت وکلچر، ادیان وتاریخ کا مطالعہ کرنا، مگر اس کے

پس پردہ اسلام کے خلاف ایک نئی فکری جنگ اور یلغار کے آغاز کی تیاری تھی۔

مغربی افراد نے استعمار کے تعاون سے اسلام کو مسلمانوں میں ضعیف کرنے کے لیے، قرآن وحدیث، تاریخ، فقہ، اصول فقہ، لغت، نحو وصرف، عقائد، افکار، تمام چیزوں کا مطالعہ شروع کردیا، اورغرض ہدایت یا حق شناشی نہ تھا بلکہ مادیت اور استعمار کی خدمت تھی، لہٰذا غیر اہم مراجع سے باتوں کو لے کر اسلام پر نقطہ چینی کی مہم چھیڑ دی، جاحظ کی کتاب ''الحیوان'' اصفہانی کی ''الاغانی'' دمیری کی ''الحیوان'' وغیرہ سے غیر معتبر باتوں کو لے کر، اس پر تصنیف و تالیف کا آغاز کردیا، استشراق کی مکمل تفصیل آگے آرہی ہے۔

مسلمانوں سے ہنرمندی سیکھ کر، اس میں مہارت حاصل کی، اور کلیسا سے تنگ آکر الحاد کو ہوا دی، اور پھر سرکاری سطح پر مسلمانوں سے اخذ کئے ہوئے علوم پر تجربہ کرنا شروع کردیا، اور مسلمانوں کی ایجادات کو فروغ دے کر اپنی طرف سے کچھ اضافے کیے اور اسے اپنی ہی طرف منسوب کردیا، اس طرح ''صنعتی انقلاب'' برپا ہوا، اب اپنی بنی ہوئی چیزوں کو فروخت کرنے کے لیے منڈیاں تلاش کرنا شروع کردیا، تجارت و معیشت کے نام پر عالم اسلام میں قدم رنجہ ہوئے، آہستہ آہستہ منڈیوں پر چھاگئے، جب کچھ قوت محسوس ہوئی تو فوجی چھاؤنیاں بنائی، بادشاہوں کے دربار میں داخل ہوکر دخل اندازی شروع کی، اور مادیت کے دلدادہ وں کو اپنا ہم نوا بنالیا، یہاں تک کہ پورے پورے ملک پر قابض ہوگئے، ہندوستان، انڈونیشا، مصر، افریقہ، سب جگہ ایسا ہی ہوا، یہاں تک کہ ملک کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر ''اسلامی عدالتوں'' کو کالعدم قرار دے کر ''انگریزی یا فرانسی قوانین'' نافذ کردیئے، مذہبی تعلیم پر پابندی لگادی اور حکومتی سطح پر نصاب تیار کرکے مغربی افکار کو جو سراسر الحاد پر مبنی تھے، کتابوں میں شامل کردیا۔ اسی طرح مشرقی دماغ میں مغربی فکر کو جگہ دے دی، پھر کچھ مادہ پرستوں کو اپنے ممالک کی طرف بھیج کر اپنا دلدادہ بنالیا، جنھوں نے مغربی کلچر اور افکار کو کامیابی کی شاہ کلی تصور کرلیا اور مغربی طرز پر مغربی تعلیم کے ادارے قائم کردیئے، اس طرح لوگوں میں مادیت غالب آگئی، اور روحانیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی، ایک مدت تک حکومت کرنے کے بعد اگرچہ مغربی طاقتیں مشرق سے بے دخل ہونے پر مجبور ہوئی، مگر لوگوں کو تعلیم کے راستے ذہنی غلام کا شکار بنا کر گئی۔

اپنی بے دخلی کے بعد عالمی جنگ اول اور ثانی کے بعد اقوام متحدہ کی بنیا ڈال دی گئی، جس میں پوری دنیا کو جکڑ کر رکھ دیا گیا، اور تعلیمی، سیاسی تمام شعبوں کو اسی سے سیراب کیا جانے لگا، اسی طرح ہر ملک کا نصاب مغربیت زدہ تیار کیا گیا، جس میں مذہب کو صرف پرائیوٹ معاملہ بتایا گیا، معیشت اور دین میں تفریق کی گئی، سیاست کو دین کی ضد تصور کرائی گئی، کھیل کود کو تعلیم کا اہم جز بنادیا گیا، آزادی اور مساوات کا راگ اُلاپا گیا، اور اب تو سیکس ایجوکیشن بھی نصاب میں داخل کردیا گیا۔ اس طرح بچہ کے ذہن کو بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے آگے تک، ایسا درس دیا گیا کہ اللہ، رسول، دین، جنت، جہنم، عذاب، جزاء وسزا، حساب اور قیامت کوئی چیز نہیں، محض افسانے اور خیالی پلاؤ ہے، اصل یہی ہے کہ اپنے مفاد کے لیے کماؤ، اپنی مرضی کے مطابق کھاؤ پیو اور خوب عیش اڑاؤ، اس کے علاوہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

مغرب نے سب کچھ کرنے کے بعد اپنے یہاں پر بڑی بڑی کالجز قائم کی اور غیر مغربیوں کو تعلیم کے لیے وہاں

بلایا اوران کی برین واشنگ کی مغربیت کوان کے دماغوں پر مسلط کردیا اورانہیں اللہ کی آخری کتاب سے بالکل ہٹ کے تیار کیا کہ وہ قومیت اور جمہوریت کے نام پر اپنے ملکوں میں حکومت حاصل کرے اور مغربی طور وطریق کو اپنائے، اس کے لیے ان کا ہر ممکن تعاون کیا جائے گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک منظم پلاننگ کے ذریعہ لادینی اور سیکولر تعلیم کو عالم اسلام پر خاص طور پر اور پورے عالم پر عام طور پر، پوری مکاری کے ساتھ مسلط کردیا گیا، ابنائے قوم کو اس تعلیم میں اتنا مشغول کردیا گیا کہ اس کے پاس اس کے علاوہ دینی ومذہبی تعلیم کے لیے وقت ہی نہ بچا اور رہے بیچارے چار ونا چار دینی تعلیم سے ناواقف ہوتے رہے۔ اور آج بھی ایسا ہورہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ملک کے کچھ دین دار، سمجھ دار لوگ یہ بیڑا لے کر کھڑے ہوں اور وہ نصاب میں داخل اسلام متصادم نظریات اور غیر ضروری امور کو خارج کردیں۔ اگر یہ طاقت نہیں تو کم از کم یہ کریں کہ ان اموراور اشیاء سے مسلمان طلبہ کو متنبہ کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کریں کہ جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں علماء سے مکمل تعاون حاصل کرکے ایسے کتابچہ تیار کریں جس میں مسلمان طلبہ کو ان چیزوں سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہو اور ساتھ ساتھ دین کی بنیادی اور ضروری باتوں کو آسان اور سہل انداز میں بیان کردیا گیا ہو، تاکہ ہمارے معصوم بچے برین واشنگ سے محفوظ ہوجائے۔ امید کہ توجہ دی جائے گی۔ ہم اپنے بچوں کو پہلے مسلمان بنائیں پھر ڈاکٹر، پہلے مسلمان بنائیں پھر انجینئر، پہلے مسلمان بنائیں پھر تاجر، پہلے مسلمان بنائیں پھر سائنس داں۔ قرآن کا اعلان ہے: "قوا انفسکم واھلیکم نارا" اپنے آپ کو، اپنے اہل وعیال کو جہنم سے بچاؤ۔

نوٹ: تعلیم وتربیت اور ماحول سے اعداء اسلام نے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا، ویسے بھی نفس برائی کو جلدی ہی قبول کرتا ہے، مثلاً مصر میں رفاعہ رافع طہطاوی جس نے رقص اور مخلوط ناچ گانے کو صحیح قرار دیا، اور فرعونیت کے احیاء کی کوشش کی، اسی طرح طٰہٰ حسین، قاسم امین، وغیرہ نے عورت کی آزادی اور اسلام مخالف نظریات کی تائید کے لیے کتابیں لکھ ماری۔ الجزائر میں محمد ارکون نے قرآن پر اعتراضات کیے۔ سرسید نے قرآن وحدیث کو مغربی افکار اور آزادانہ تشریح وتوضیح کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی، یہ سب انہوں نے برطانیہ کے سفر کے بعد ہی کیا، اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، مصر کے حسنی مبارک، اردن کے شاہ عبداللہ، امارات کویت، سعودی، ترکی، پاکستان، وغیرہ تمام حکمران اور ان کی اولاد مغرب ہی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، و یا للاسف۔ آزادی، تجدید، مساوات، سیکولرزم، موڈرزم، قومیت، جمہوریت، اشتراکیت، وغیرہ کے فروغ میں بھی یہی لوگ کوشاں ہیں۔

ذرائع ابلاغ:

ذرائع ابلاغ کو عربی میں اعلام کہا جاتا ہے، "الاعلام نشاته و سائله مايز ثر فيه" کے مصنف دکتور یوسف محی الدین اس کی تعریف کی ہے: "هو نشر الحقائق و الاخبار و الافكار و الآراء في وسائل الاعلام المختلفة" یعنی میڈیا کہا جاتا ہے، حقائق، اخبار، افکار، آراء کو مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے لوگوں تک پہنچانا۔

ذرائع ابلاغ کی تاریخ بہت قدیم ہے،ہر زمانہ میں لوگ مختلف طریقوں سے معلومات اور اخبار کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہے،کبھی پرندوں کو استعمال کر کے،کبھی پمفلیٹوں کو دیواروں پر چسپاں کر،کبھی بآواز بلند لوگوں کو خبر دے کر،یہاں تک کہ صنعتی انقلاب کے بعد ذرائع ابلاغ میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں،یہاں تک کہ پچھلی صدی کو"ذرائع ابلاغ کے انقلاب" کی صدی کہا گیا،محی الدین عبدالحلیم نے عجیب بات کہی کہ ذرائع ابلاغ کے انقلاب کے بعد اب کوئی لمحہ چاہے رات کا ہو،چاہے دن کا،اس سے خالی نہیں ہوتا اور انسان بیدار ہونے کے فوراً بعد سے لے کر سونے تک ذرائع ابلاغ سے برابر ربط میں رہتا ہے،چاہے وہ سمعی ہو،چاہے مرئی ہو،چاہے مقروئی ہو،جس کی وجہ سے اس کی فکر اور نظریہ پر بڑا اثر مرتب ہوتا ہے۔(الدعوۃ الاسلامیۃ والاعلام الدولی،ص ۱۴)

ذرائع ابلاغ کے انواع واقسام:

اتصال شخصی جیسے موبائل،ای میل،جی میل،فیکس،ٹیلی فون،وغیرہ۔پرنٹ میڈیا جیسے اخبارات،رسائل،جرائد،کتابیں۔الیکٹرانک میڈیا پھر اس کی دو قسمیں ہیں:ذرائع ابلاغ سمعی جیسے ریڈیو،ٹیپ وغیرہ،ذرائع ابلاغ مرئی جیسے ٹیلی ویژن،ڈش،وغیرہ۔

ذرائع ابلاغ کی تاریخ:

ریڈیو کی ایجاد امریکہ میں ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔

ٹیلی ویژن پر تجربات کا آغاز ۱۸۲۸ء سے شروع ہوا،پہلے صرف تصاویر،پھر آواز،پھر نقل وحرکت،اس طرح ہوتے ہواتے ۱۹۸۹ء میں ڈائرکٹ ٹیلی کاست تک پہنچا۔

پرنٹ میڈیا کی تاریخ تو بہت قدیم ہے،البتہ ۱۶۶۵ء میں باقاعدہ مشینی پرنٹ میڈیا کا آغاز ہوا۔

انٹرنیٹ ۱۹۶۹ء میں ایجاد کا آغاز ہوا،۱۹۸۳ء تک کمال کو پہنچا۔

ٹیلی فون: فیکس:

ولسن کاسن ایک موقع پر کہتا ہے کہ صحافت اور ذرائع ابلاغ صرف اخبار اور آراء کو لوگوں تک پہنچانے کی لیے نہیں ہے،بلکہ اس کے ذریعہ لوگوں کی قوتِ فکر کو بدلا جاسکتا ہے،اور لوگوں کے ذہنوں پر تسلط حاصل کیا جاسکتا ہی۔
(اباطیل واسمار،ص ۲۵۵)

اسی لیے ایک مشہور زمانہ مستشرق اُ۔ر۔جب کہتا ہے کہ لوگوں کے افکار کو بدلنے کے لیے صرف مغربی انداز کی تعلیم اور مغربی نظریات کا پڑھا دینا کافی نہیں ہے،بلکہ تعلیم تو صرف پہلا زینہ ہے۔اصل تو ذرائع ابلاغ ہی ہے،کیوں کہ اس سے ہر کس وناکس،عالم وجاہل،پڑھا لکھا وان پڑھ،سب مستفید ہوتے ہیں،لہٰذا سب سے زیادہ محنت ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہی کی جانی چاہئے،تاکہ لوگ مغرب کے دلدادہ ہوجائے۔(وجہۃ الاسلام للمستشرق جب)

”الاعلام والتیارات الفکریۃ المعاصرۃ“ کے مصنف سعید عبداللہ الحارثی نے ۱۴۲۰ھ ذرائع ابلاغ پر کونسی کتنی مقدار میں نشر ہوتی ہے، کا ایک جائزہ لی اور بڑا ہی ہلاکت خیز رپورٹ پیش کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ یومیہ ۳۵ ؍رفیصد وقت صرف ناچ گانا نشر کیا جاتا ہے، اس کے تئیں ڈرامے، موسیقی اور کھیل کو وہ ۲۵ ؍رفیصد کا وقت اس کے لیے مختص ہے۔ ۲۱ ؍رفیصد وقت نیوز اور اخبار کے مختص ہے۔ اور یہ رپورٹ تقریباً ۱۹۸۷ء کا ہے۔ اس کے بعد تو مزید اس میں اضافہ ہوا ہے، گویا ریڈیو، ٹیلی وژن وغیرہ پر تقریباً ستر فیصد وقت محض حرام، لغو اور فضول امور کے لیے مختص ہے۔

عورتوں　　　　میں

بے راہ روی کو عام کرنے کے لیے مقابلۂ حسن، بچوں کے ذہنوں کو متاثر کرنے کے لیے کارٹونی کتابیں، فلمیں اور گیمس۔ برائیوں کو مزید فروغ دینے کے لیے فلمی استاروں کو آشکارا اور بہترین اداکاری کے ایوارڈ۔ اسی طرح کھیل عام کرنے کے لیے بڑی بڑی انعامی رقمیں وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ ذرائع ابلاغ فکرِ اسلامی ہی نہیں بلکہ انسان کو ہلاک و برباد کرنے لیے، اس وقت بہترین آلہ ہے اور ہر طرح کے ذرائع ابلاغ پر مکمل رسوخ یہود و نصاری کو حاصل ہے۔ دنیا میں جتنی بڑی بڑی اخباری اجنسیاں ہیں، مثلاً: B.B.C، C.N.N وغیرہ، سب یہود و نصاریٰ ہی کے کنٹرول میں ہے۔ وہ اخبار کو توڑ مروڑ کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے جا الزام تراشی ان کا وطیرہ بن چکی ہے، کبھی اسلام کے خلاف، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، کبھی قرآن کے خلاف، کبھی جہاد اسلامی کے خلاف، کبھی اسلامی طریقہ حدود و تعزیرات کے خلاف، کبھی خلافتِ اسلامیہ کے خلاف، کسی نہ کسی طرح زہر افشانی ہوتی رہتی ہے۔ ’مغربی میڈیا اور اس کے اثرات۔ نذر الحفیظ ندوی‘ میں مزید تفصیلات جانی جاسکتی ہے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ دنیا میں فحاشی اور عریانی کو عام کرنے کے لیے ہالی ووڈ، بالی ووڈ، ٹالی ووڈ کے نام سے بڑی بڑی فلم انڈسٹریاں قائم کردی گئی ہیں، یہ جس میں عریانی قتل و غارت گیری، چوری، ڈکیتی، اغوا، ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے دیکھائے جاتے ہیں، عقائد کو بگاڑنے کے لیے آواگون، باطل معبودوں کی فرضی طاقت، جادوگری وغیرہ کے مناظر دیکھائے جاتے ہیں، انٹرنیٹ پر لاکھوں ایسی ویب سائٹس لانچ کی گئی جو جنسی انارکی کو پھیلانے میں لگی ہوئی ہے اور اب تو رہی سہی کسر موبائل نے پوری کردی، سیڈی CD، اور ڈی وی ڈی DVD کے ذریعہ بھی خرابیوں کو فروغ دیا جارہا ہے۔

غرض کہ ذرائع ابلاغ، گویا ذرائع ابلاغ جہنم بن چکے ہیں، خدارا، اے میرے مسلمان بھائیو! کچھ تو عبرت حاصل کرو اور بے جا لذت میں مبتلا ہو کر اپنی عاقبت اور آخرت برباد ہونے سے بچاؤ۔

اللہم سب کو توفیق خیر عطا فرمائے، اور ہر طرح کے فتنے سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

رفاہی اداروں کے آڑ میں

خلافت اسلامیہ کو یہود ونصاریٰ کے اتحاد نے جب ساقط کردیا، تو عالم الاسلام کو پارہ پارہ کیا۔ اس کے پاس تمام قیمتی معدنی وسائل ہیں، مثلاً پیٹرول، ڈیزل، سونا، جواہرات وغیرہ، اسے غربت کا شکار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، اولاً اشتراکیت اور کمیونزم کے ذریعہ اور اس کے بعد سرمایہ داریت اور کیپٹل ازم کے ذریعہ، کہ عالم اسلام کو یا تو مقروض کردیا جائے یا غربت سے دوچار کردیا جائے۔ اولاً افریقی اور ایشائی ممالک پر قابض ہوکر، اس کی تمام دولت لوٹ کر، یورپ کے جانب لے گئے، اسے افلاس سے دوچار کردیا، یہاں تک کہ فاقہ کشی اور غربت عام ہوگئی، پھر وہاں اسکولوں، کالجز، ہاسپیتالوں، ڈسپنسریوں، مالی تعاون کے بہانے لوگوں کی غربت سے فائدہ اٹھایا گیا، مال کی لالچ دے کر، عیسائیت اور لادینیت کو فروغ دیا گیا، پھر جب دیکھا کہ عالم اسلام کے عرب ممالک ان کا تعاون کر رہے ہیں، تو صدام حسین، انور سادات، جمال عبدالناصر، محمود عباس حسنی مبارک وغیرہ مفاد پرستوں کو آلہ کار بنا کر استعمال کیا، صدام کو کویت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور پھر نصرت وتعاون کے بہانے کویت سعودی دبئی وغیرہ میں اپنی فوجوں کو لا بیٹھایا، فلسطین پر قبضہ کرکے اسرائیلی ریاست قائم کردی اور انور سادات جیسوں نے ان سے صلح ومعاہدہ کرلیا اور فلسطینیوں کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا، بل کہ ان کا تعاون کرنے والوں کو بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ اسی طرح عالم اسلام کو مالی بحران کی زد میں لاکھڑا کردیا اور اس کا فائدہ اٹھا کر رفاہی، طبی، غذائی، تعلیمی کاموں کی آڑ میں آکر نصرانیت کی دعوت دی جارہی ہے، سال گذشتہ المجتمع میں مصر، الجزائر وغیرہ اسلامی ممالک میں پیسے دے کر نصرانیت قبول کرنے کی تفصیلی رپورٹ پیش کی گئی؛ اسی طرح انڈونیشیا، بنگلا دیش، افریقی ممالک میں بھی عمدہ عمدہ لیبل لگا کر نصرانیت کو عام کیا جارہا ہے۔

غرضیکہ کسی نہ کسی طرح سے مسلمانوں کو ایمان سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ قرآن نے اسی کو کہا: "وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا" (البقرہ:۱۰۹) ایک جگہ ارشاد: "لَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا" (البقرہ:۲۱۷) ایک اور جگہ ارشاد خداوندی: "وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ" (البقرہ:۱۲۰)۔ پہلی آیت میں ہے، اہل کتاب کی اکثریت اس بات کی خواہشمند ہیں کہ تم ایمان کے بعد کفر کو اختیار کرلو۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے، وہ برابر تم سے قتال کرتے رہیں گے یہاں تک تم کو تمہارے دین سے پھیر دے اگر ان کا بس چل جائے۔ اور اخیری آیت میں ارشاد ہے، یہود ونصاریٰ تم سے ہرگز اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان (باطل) کی ملت کی پیروی کرنے نہ لگ جاؤ۔

اللہ ہم سب کو فتنوں سے بچنے کے اسباب اختیار کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اسلام وایمان کے ساتھ اس دار فانی سے رخصت کرے۔ آمین یارب العالمین!

تاریخ الغزو الفکری:

اوپر یہ معلوم ہوچکا کہ "الغزو الفکری" کی اصطلاح تو جدید ہے، مگر "تصادم فکری" تخلیق آدم ہی سے شروع ہوچکی تھی، پھر زمین پر نزول آدم کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، کیوں کہ شیطان نے کہا تھا "و لاغوینھم من بین

ایدیھم و عن ایمانھم و عن شمائلھم و لا تجد اکثرھم شاکرین" کہ میں انسان کو ضلالت اور گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا، لہٰذا اس نے اس پر عمل درآمد زمین پر آتے ہی شروع کر دیا تھا، البتہ اسے کامیابی شروع شروع میں زیادہ نہ مل سکی، مگر آدم علیہ السلام کے انتقال کے بعد جب ایک عرصہ دراز گذر گیا تو لوگوں کو ورغلا کر اس نے بڑے بزرگوں کی تصویریں بنوائی، پھر اس کی تعظیم کروائی، یہاں تک اس کی پرستش میں مبتلا کر دیا، جب صنم پرستی عروج پر پہنچی تو ایک روایت کے مطابق حضرت ادریس اور دوسری روایت کے مطابق سب سے پہلے حضرت نوح علیہما الصلوٰۃ والسلام کو رسول بنا کر اللہ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا، اس کے بعد وقفہ وقفہ سے جہاں ضرورت محسوس ہوئی، اللہ نے فکرِ انسانی کو صحیح رَوِش پر لانے کے لیے بے شمار انبیاء مبعوث کیے، یہاں تک کہ آخر میں خاتم الانبیاء والمرسلین کو مبعوث کیا، اور آپ کو مکمل شریعت دے کر بھیجا، آپ پر آخری کتاب اور "خاتم الکتب السماویۃ" بھی نازل کی گئی، اور ساتھ ہی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن کی اور اس کے علاوہ دیگر ضروری امور کی مکمل وضاحت کردی گئی، تمام اصول اور ضروری فروع کو بھی بیان کر دیا گیا، لہٰذا اب قیامت تک نہ کوئی نبی آسکتا ہے، نہ کوئی نئی شریعت آسکتی ہے، نہ کوئی دستورِ حیات آسکتا ہے، قرآن اور حدیث ہی کے مضامین کی اصول میں رہ کر تشریح و توضیح تو ہوسکتی ہے، مگر وہ تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا جو پہلی شریعتوں میں رونما ہوا۔

الغزو الفکری کا منظم آغاز:

"الغزو الفکری" ہر زمانہ میں حق و باطل کی "غیر عسکری" معرکہ آرائی کی صورت میں ہوتی رہی، خاص طور پر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، جتنے انبیاء کا تذکرہ قرآن میں ہے سب کے زمانہ میں پائی جاتی رہی، البتہ حضرت نوح موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے زمانہ میں باطل نے اس کا زیادہ ہی استعمال کیا، مگر ہر محاذ پر اسے شکست سے دوچار ہونا ہی پڑا، کیوں کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے درمیان کوئی مسلح باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی، بل کہ یہی کہ قوم نوح حضرت نوح علیہ السلام کے طرزِ عمل پر شدت سے نقطہ چینی کرتی رہی، سورۂ نوح میں قرآن کریم نے "مکالمہ" کے انداز میں اسے بیان بھی کیا، صرف سورہ نوح ہی نہیں، بل کہ اس کے علاوہ بھی بہت سی سورتوں میں اس کی تفصیلات ملتی ہے، اسی طرح موسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا، کہ فرعون سے کوئی منظم جنگ نہیں ہوئی، حالاں کہ بنو اسرائیل بہت بڑی تعداد میں تھے، مگر یہی "فکری جنگ" ہوتی رہی، اور فرعون، قوم فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے بھی بہت سے مکالمات اور محادثات کو قرآن نے بیان کیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ہوا۔ غالباً قرآن کریم میں ان کے واقعات کو بیان کرنے کی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ جیسے ان مذکورہ انبیاء کے زمانہ میں "فکری جنگیں" ہوتی رہی، امت محمدیہ بھی اس سے دوچار ہوگی مگر یہ امت قرآن کی وجہ سے وہ ہمیشہ ان کا مقابلہ کرتی رہے گی، اور بھی الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔

خلاصہ:

ان واقعات نے ''الغزو الفکری'' کے لیے کافی ووافی مواد فراہم کردیا، [illegible] میں جوابات تیار کرنا ہے اور ضعیف الایمان مسلمانوں اور دشمنوں کو یا تو خاموش کرتا ہے، یا حق پر لے آتا ہے، پھر جو تھوڑی بہت کمی رہ گئی تھی، اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اہل کتاب اور مشرکین کے ساتھ ہونے والے مکالمات کی صورت میں بیان کردیا گیا، مگر امت محمدیہ کا زمانہ دیگر امت کے مقابلہ میں طویل المدت ہے، اس لیے اس کو صرف ''الغزو الفکری'' ہی سے سابقہ نہیں پڑنے والا تھا، بل کہ ''الغزو العسکری'' سے بھی سابقہ لازمی تھا، لہٰذا اس کے بھی احکام بیان کیے گئے، تا کہ قیامت تک فکری وعسکری دونوں یلغاروں پر معرکۂ آرائی میں اسے سہولت رہے، اور ''علم وحی'' کی روشنی میں وہ اپنے دونوں میدانوں میں کامیابی سے ہم کنار ہو سکے۔

قرون اولیٰ میں جب اہل باطل کو ''عسکری'' میدان میں ہر موقعہ پر ''ہزیمت'' سے دو چار ہونا پڑا، تو انہوں نے ''نفاق کے لبادے'' میں اسلام کے خلاف ایک ''فکری محاذ'' برپا کردیا، جس نے اولاً تو دورِ نبوی ہی میں اختلاف و انتشار کی کوشش کی، اور پھر جب کچھ نہ بن پڑا تو خاص طور پر اہلِ کتاب نے، عام طور پر اہلِ باطل نے اعتراضات اور اشکالات کی گرم بازاری کا آغاز کیا، کبھی تحویل قبلہ پر اعتراض، کبھی ناسخ ومنسوخ پر اور کبھی آمدِ جبریل پر اعتراض، کبھی نبوت سلمانی پر اعتراض اس کے علاوہ اسلام کے دیگر امور پر بھی اعتراض کی بوچھار ہوتی رہی۔

دورِ نبوی کے بعد دورِ صدیقی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد اہل کتاب اور چند رؤساء عرب نے ارتداد کو شہ دی، مختلف پروپیگنڈے کیے، کسی نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا، تو کسی نے دعویٔ نبوت کرکے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی، جس میں مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلیحہ ابن خویلد، سجاح بنت الحارث، ذوالتاج لقیط ابن شمرہ کا خاص شمار ہوتا ہے، مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہمت واستقلال، اور جرأت وشجاعت نیز حکمت عملی نے صرف ایک سال کے عرصہ میں اس پر قابو پالیا، اور دین کو ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رکھا، اسی لیے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے تھے ''ردۃ ولا ابابکر لھا''۔

حضرت عمر ابن الخطابؓ کے دور میں جب ان کی شرارتوں کو بھانپ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق انہیں جزیرۃ العرب سے باہر کردیا گیا، تو ایک عرصہ تک ظاہری طور پر فتنۂ ''الغزو الفکری'' تھم گیا، کیوں کہ حضرت عمرؓ بڑے ہی دور بیں اور جرأت مند تھے، پوری جرأت اور حکمت عملی اور دور بینی کے ساتھ جاندار اور شاندار فیصلہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے تمام فتنہ پرور رعایا ہو چکے تھے، اسی لیے باقاعدہ مجوسی فیروز اور ہرمزان اور دیگر یہودی ونصرانی طاقتوں نے حضرت عمر ابن الخطاب کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا، جس کی پوری مکمل محققانہ مصر کے نامور مورخ الاستاذ جمال نے اپنی کتاب ''اثر اھل الکتاب فی الحروب والفتن الداخلیۃ فی القرن الاول'' میں کی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فتنوں کے آغاز کی نشاندہی مقتل عمر ہی سے کی تھی، جیسا کہ حضرت حذیفہؓ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے، آپ نے فرمایا کہ ایک دروازہ جو توڑ دیا جائے گا اور فتنوں کا آغاز ہو جائے گا اگرچہ فتنوں سے دونوں فتنہ قتال بین المسلمین بھی اور فتنۂ الغزو الفکری مراد ہے، مگر اس سے بھی اسی عظیم فتنہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جو عبداللہ ابن

سباء نے شروع کیا تھا، جس کے نتیجے میں خوارج، رافضہ، قدریہ، معتزلہ، مرجئہ، جسدیہ جیسے مختلف فرقے قرن اول ہی میں وجود میں آگئے۔

حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی اور خلیفہ ثالث ہیں، جن کے بے شمار مناقب احادیث میں وارد ہوئے ہیں، بے شک آپ ہی حضرت عمر کے بعد خلافت کے حقدار تھے، اور آپ نے دورِ خلافت میں کوئی بھی خلافِ شرع اور نفسانیت پر مبنی کام نہیں کیا، مگر "فتنہ پروروں" نے آپ کی نرم دلی اور عفوو درگذر سے غلط فائدہ اٹھایا، اور آپ پر بے بنیاد اقرباء پروری کا الزام عائد کیا، جس کے محقق و مدلل جوابات ہمارے مؤرخین اور علما نے شواہد کی روشنی میں دیے ہیں، آپ کو علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کے رسالہ "برأت عثمان" کا ایک بار مطالعہ کر لینے سے اندازہ ہو جائے گا، کہ حقائق کیا ہیں، اور الزامات کی حقیقت کیا ہے؟

مردود عبداللہ ابن سباء (جو ابن سودہ کے نام سے جانا جاتا تھا) نے پہلے بصرہ میں، پھر مصر میں چند لوگوں کو حضرت عثمان اور آپ کے عمال کے خلاف بھڑکایا، اور انہیں مدینہ کی طرف روانہ کیا، حضرت عثمان اگر صحابہ کو جنگ کی اجازت دیدیتے تو ان تمام بلوائیوں کی تکہ بوٹی ہو سکتی تھی، مگر آپ کے نزدیک حرمتِ خونِ مسلم یہ انتہائی مقدس تھا، آپ نے کسی کو بھی قتال کی اجازت نہ دی، البتہ آپ حق پر تھے، لہٰذا کسی بھی صورت میں خلافت سے دست برداری کے لیے آمادہ نہ ہوئے جس کے نتیجہ میں ان محروم القسمت بلوائیوں نے ایک دن موقعہ پا کر، آپ کو شہید کر دیا، رضی اللہ عنہ وارضاہ، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مگر حضرت عثمان ذوالنورین نے یہ تو ثابت کر دیا کہ "اہل حق" کو ثبات قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے، حتی المقدور مسلمانوں کے خون کی حفاظت کرنی چاہیے، اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے، آپ کے بعد حضرت عبداللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ نے "واقعہ حرہ" کے موقع پر حضرت حسین نے "واقعہ کربلا" میں اور حضرت عبداللہ ابن زبیر اور اس کے بعد النفس الزکیہ نے اسی کو اسوہ بنایا، اور ثبات علی الحق کی بے مثال تاریخیں رقم کروائی، رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین!

حضرت علیؓ کا دور تو داخلی خلفشار کا شکار ہو گیا، جس میں بھی عبداللہ ابن سباء کے پروردہ لوگوں نے اہم رول ادا کیا، اور خلفشار سے نکلنے کی ہزاروں کوششوں کے باوجود کامیابی حاصل نہیں ہونے دی، اور پھر مسلمانوں کے باہمی انتشار سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف ایک جماعت کو صحابہ کی تکفیر پر آمادہ کیا، جو "خوارج" سے یاد کیے گئے، اور دوسری جانب ایک جماعت کو ان کے علم کی کمی کی وجہ سے حضرت علی کی "خلافت بالوصل" اور "وصی" اور آگے چل کر "الہ" پر آمادہ کیا، جو روافض شیعہ کہے گئے، اور اس طرح انتشار کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو آج بھی جاری و ساری ہے۔

خلفائے راشدین کے دور کے بعد تو وہ کھلے بندھوں آزاد ہو گئے، یہاں تک کہ قرنِ ثانی کے اوائل اور قرن اول کے اختتام پر چند لوگوں نے نبوت کے دعوے بھی کر دیئے، اور فتنہ دعویٰ نبوت آج تک رواں دواں ہے۔

خلافت عباسیہ میں "الغزو الفکری" نے شدت اختیار کی، کیوں کہ دورِ بنو امیہ سے علوم یونان اور فلسفہ ہندو غیرہ

کے جو عربی تراجم شروع ہوئے تھے، اس میں تیزی آئی اور لوگ ''شرعیات'' ''علوم شرعیہ'' کے مقابلہ ''علوم عقلیہ'' کی طرف زیادہ متوجہ ہونے لگے۔ ''مامون الرشید'' نے تو اس میں ضرورت سے زیادہ ہی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، اور با قاعدہ ''یونان'' کے بادشاہ سے کتابیں منگوا کر اس کے عربی میں تراجم کروائے، ترجمہ کرنے والوں کو معاوضات دیے، یہاں تک کہ مامون خود ہی ''عقلیات'' سے متاثر ہو کر ''اعتزال'' کی طرف مائل ہوگیا، اور معتزلہ کو گویا سرکاری سپوٹ اور تعاون حاصل ہوگیا، طاقت کے زور پر بعض خلفائے عباسیہ نے اعتزال کو فروغ دینا چاہا، مگر حضرت امام احمد بن حنبل جیسے علماء نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا، جس کی وجہ سے عوام الناس اس جیسے نظریہ زیادہ متاثر نہ ہو سکی۔

''الغزو الفکری'' میں شدت:

جب اندلس میں موسیٰ ابن نصیر اور طارق بن زیاد کے ہاتھوں اسلام پہنچا، اور اہل یورپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کو علوم کے ساتھ والہانہ تعلق ہے، جس کے نتیجہ میں وہ ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں، ان کی آنکھیں چندھیا گئیں، کیوں کہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ کلیساؤں، پادریوں، اور کاہنوں اور اپنے بادشاہوں کی جانب سے ہونے والے جبر و تشدد کے زیر نگیں زندگیاں گذار رہے تھے، اسی وجہ سے مؤرخین یورپ نے خود اسے ''تاریخ یورپ کا سیاہ باب'' (Dark ages) سے تعبیر کیا، مسلمانوں کے دیکھا دیکھی انہیں بھی ترقی کی سوجھی، لہٰذا مسلمانوں کی درسگاہوں میں فن و ہنر سیکھنے کی اجازت طلب کی، تو مسلمانوں نے وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا، اور انہیں اجازت دیدی، انہوں نے علم حاصل کیا، مگر بغرض ہدایت نہیں بل کہ ''بغرض مادیت'' لہٰذا ایمان جیسی عظیم دولت سے تو وہ محروم رہے، البتہ مادی ترقی کی راہیں کھل گئیں۔

اہلِ مغرب نے اب جب کچھ سیکھ لیا تو دنیا پر قیادت و سیادت کے خواب دیکھنے لگے، اور اس نے اسلام کے خلاف ایک زبردست ''صلیبی'' محاذ کھڑا کیا، گیارھویں صدی کے نصف سے لے کر تیرھویں صدی تک تقریباً دو سو سال میں ''مشرقِ اسلامی'' پر ہلاکت خیز آٹھ حملے کیے، پہلا حملہ ۱۰۹۵ء میں ''پوپ اوربان'' نے ''قدس'' کو حاصل کرنے کے لیے ''مقدس صلیبی جنگ'' کا نام دے کر اس کو مذہبی رنگ دے کر لوگوں کو جنگ پر آمادہ کیا، اور پندرہ ہزار کا لشکر لے کر برطس نکلا، مگر سلاجقہ نے ان کا مقابلہ کیا اور وہ لوگ ''قدس'' پہنچنے سے پہلے ہی شکست کھا کر بھاگے۔

۱۰۹۶ء سے ۱۰۹۹ء تک تیاری کر کے ''غورفری'' اور ''پلودین'' کی قیادت میں ۱۰۹۹ء میں فلسطین پر ایک زبردست حملہ کیا، اور وہ لوگ بیت المقدس پر قابض ہوگئے، جہاں انہوں ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا، خود ان کے مورخ ''لویی ریمونڈ داجیل'' نے اس کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''ہماری قوم یعنی صلیبیوں نے عرب کے ساتھ بڑا ظلم کیا اور ان کا قتل عام کیا صرف ''مسجد عمر'' میں دس ہزار مسلمانوں کو قتل کیا، اور اس حملہ میں تقریباً ستر ہزار بے گناہ مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا، یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مسلمان انتشار کا شکار تھے اور چھوٹی چھوٹی مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو گئے تھے، کہیں فاطمیوں کی حکمرانی تھی تو کہیں عباسیوں کی وغیرہ وغیرہ، البتہ عماد الدین زنگی

نے صلیبیوں کا خوب جم کر مقابلہ کیا، اوران کو شام کی جانب آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ۱۱۲۸ء میں زنگی نے حلب کو صلیبیوں سے بچایا، اور ۱۱۴۴ء میں شہر "رھا" پر قبضہ کرلیا، مگر ۱۱۴۶ء میں عماد الدین زنگی کی وفات ہوگئی اور صاحبزادہ نورالدین زنگی اس کا جانشین ہوا۔

نورالدین زنگی میں شجاعت اس کے والد سے بھی زیادہ تھی، اس نے صلیبیوں کے ناک میں دم کردیا، اور "انطاکیہ"، "طرابلس" اور کمانڈر "شیرکوہ" کی قیادت میں دمشق کو بھی فتح کرلیا، جس پر چند سال قبل صلیبیوں نے قبضہ کرلیا تھا، اس کے بعد "اسدالدین شیرکوہ" کی قیادت میں ایک لشکر مصر کی جانب فاطمیوں کے خلاف ارسال کیا، جس میں فاتح فلسطین صلاح الدین ایوبی بھی تھے، جو پہلی مرتبہ کسی جنگ میں حصہ لے رہے تھے۔ ۱۱۶۹ء میں مصر پر زنگی کا قبضہ ہوگیا اور "اسدالدین شیرکوہ" کو وزیر بنا دیا گیا، مگر دو ماہ کے بعد ہی اسدالدین کا انتقال ہوگیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اسدالدین نے صلاح الدین کو اپنا جانشین ٹھہرایا، اور صلاح الدین ایوبی نے "بیت المقدس" کی آزادی کی تیاریاں شروع کردی، یہاں تک کہ ۱۱۸۷ء میں صلیبیوں اور مسلمانوں کے درمیان "معرکہ حطین" پیش آیا۔

صلاح الدین ایوبی اور اسلامی لشکر نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا اور صلیبیوں کو شکست سے دوچار کردیا، اور اس طرح "بیت المقدس" کے قریب پہنچ گئے، اور آہستہ آہستہ "فلسطین" کے اردگرد کی بستیوں پر قبضہ شروع کردیا، اور "شہر عکا" اور "ناصرہ، قیساریہ، حیف صیدا، بیروت" پر قبضہ ہوگیا، یہاں تک کہ مجبور ہوکر جب وہ گھیرے میں آگئے اور نا امید ہوگئے، تو مسلمانوں کے ساتھ صلح پر آمادہ ہوگئے، اور الحمد للہ! عرصہ دراز کے بعد پھر دوبارہ تکبیر کی صداؤں اور اذان کی نداؤں سے فضاء گونجنے لگی، مگر مسلمانوں نے ان ظالموں کی طرح ظلم نہیں کیا، ماضی میں مسلمان امن پسند رہا ہے، اور یہی لوگ "دہشت گرد" رہے ہیں، اور حال میں بھی یہی صورتِ حال ہے، یہ واقعہ اس پر شاہد عدل ہے۔

۱۱۸۹ء میں صلیبیوں نے جمع ہوکر پھر بیت المقدس کو قبضہ میں لینے کی کوشش کی، مگر چار سال کی محنت کے بعد ۱۱۹۲ء میں صلح پر مجبور ہوگئے، اور ۱۱۹۳ء میں صلاح الدین وفات پاگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

۱۲۰۲ء میں صلیبیوں نے چوتھا حملہ کیا، مگر یہ حملہ مصر پر قبضہ کرنے کے لیے تھا، لیکن ایطالین تاجروں نے جس حاکم مصر "ملک عادل" کے ساتھ معاہدہ تھا، انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

۱۲۱۷ء میں مصر پر قبضہ کرنے کے لیے پانچواں حملہ کیا، مگر ملک عادل کے انتقال کے بعد اس کے جانشین ملک کامل نے انہیں نامراد واپس یورپ کی طرف جانے پر مجبور کیا۔

۱۲۲۸ء میں پھر چھٹا حملہ کیا، ملک کامل نے اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر صلح کرلی، ۱۲۳۰ء میں صلیبیوں کو تسلط دے دیا، البتہ ۱۲۴۴ء میں پندرہ سال بعد دوبارہ تیاری کرکے حملہ کیا اور حاصل کرلیا۔

۱۲۴۸ء میں پھر ساتواں حملہ صلیبیوں کی جانب سے ہوا، ۱۲۴۹ء میں صلیبی لشکر "مصر" تک پہنچ گیا، اور "دمیاط" پر قبضہ کرلیا، البتہ "قاہرہ" میں نجم الدین ایوب نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، مگر اسی دوران نجم

الدین اچانک انتقال کر گئے، مگر ان کی ذہین بیوی ''شجرۃ الدُرّ'' نے ان کے وفات کی خبر کو راز میں رکھا، تا کہ لشکر ہمت نہ ہارے، اور ''توران شاہ'' کو ان کا جانشین بنا دیا، اور الحمد للہ اس کے ہاتھوں مسلمانوں کی فتح بھی ہوئی، لویس (Luves) التاسع گرفتار کر لیا گیا۔

اس کے بعد عالم اسلام دوہری مصیبت میں گرفتار ہو گیا، کیوں کہ ایک طرف تا تاریوں نے ۶۵۶ھ/ ۱۲۸۵ء میں بغداد کا محاصرہ کر لیا اور دولتِ عباسیہ کا سقوط ہو گیا، مگر جب وہ آگے بڑھے تو ''ممالیک'' نے ان کو ملک شام پر ہی رکنے پر مجبور کر دیا، اور اسلام کے مشہور بہادر ''ظاہر بیبرس'' کی قیادت میں ۱۲۶۰ء میں تا تاریوں کی ''معرکۂ عین جالوت'' میں شکست سے دو چار کیا، دوسری جانب صلیبیوں نے بھی انطاکیہ کی جانب سے حملہ کیا، مگر ''ظاہر بیبرس'' نے انہیں ہزیمت پر مجبور کیا، ظاہر بیبرس کے انتقال کے بعد سلطان قلاوون نے بھی صلیبیوں سے بہت سے علاقے چھین لیے۔ ۱۲۹۱ء میں سلطان کے انتقال کے بعد ان کے ہونہار صاحبزادے جانشین ہوئے اور انہوں نے بیروت وغیرہ جو کچھ علاقے صلیبیوں کے پاس رہ گیا تھا، اسے بھی واپس لے لیا۔

ان جنگوں کے بعد اب صلیبی ہمت ہار گئے، اور انہوں نے دوبارہ یورپ کی جانب رخ کرنے ہی میں عافیت سمجھی، لہٰذا وہ یورپ لوٹ گئے، البتہ قلیل مقدار میں مسلمانوں کے درمیان سکونت اختیار کرنے پر راضی ہو گئے اور اسلام کے سایۂ عدل و مصالحت ہی میں انہوں نے اپنے آپ کو محفوظ پایا، تمام صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کی کامیابی کا اصل راز مسلمانوں کی مسلسل جد و جہد، ان کا جہاد، ان کا جذبہ ایمانی، اور ان کے نیک و صالح سلاطین اور ان کی اسلام کے ساتھ بے پناہ محبت اور اس پر عمل درآمد، انہیں جنگوں کے طفیل صلاح الدین ایوبی، ظاہر بیبرس، نور الدین زنگی، عماد الدین زنگی، اسد الدین شیرکوہ، ملک عادل، ملک کامل، نجم الدین ایوب، توران شاہ، سلطان قلاوون، خلیل ابن قلاوون، محمد بن قلاوون، سلطان برسبائی جیسے مشہور کامیاب جنرل ظاہر ہوئے، جنہوں نے اسلام کی عظمت کے لیے سب کچھ قربان کر دیا، اور فتح و کامرانی کی عظیم مثالیں قائم کر دیں، آج ہمارے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان بے مثال مجاہدین کے نام تک نہیں جانتے۔

دو سو سال تک ان پے در پے شکستوں کے بعد ''لویس'' جو فرانس کا بادشاہ تھا، اور آخری صلیبی جنگ میں صلیبیوں کی قیادت کر رہا تھا، ''المنصورہ'' میں صلیبیوں کی شکست کے بعد گرفتار ہو گیا، مگر مسلمانوں نے فدیہ لے کر اسے چھوڑ دیا تھا، جب وہ فرانس پہنچا تو اس نے برملا یہ کہا کہ ''یہ تلوار اور ہتھیار کی طاقت سے مسلمانوں کو کبھی زیر نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ ان کا عقیدہ ایمانی انتہائی مضبوط ہے، جو انہیں ہمیشہ جہاد پر آمادہ کرتا ہے، اور دین کے خاطر ہر طرح کی قربانی کے لیے وہ تیار ہو جاتے ہیں، چاہے کتنی قیمتی چیز کیوں نہ قربان کرنی پڑے، یہاں تک کہ جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ اب ہم اپنے اس طریقہ کو بدلیں، اور کوئی ایسا طریقہ اپنانے کی کوشش کریں جس سے ان کے عقیدہ راسخہ پر زد آئے، ان کا ایمان کمزور اور متذبذب ہو جائے، پھر اس نے چند تجاویز پیش کیں، جو

یہ ہیں:

(۱) سب سے پہلے ہمیں صحیح اسلامی فکر اور عقیدہ کو ضرب کاری لگانے کی ضرورت ہے، جس کے لیے ہمیں سب سے پہلے اسلام کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

(۲) اسلام کے مطالعہ کی غرض صرف یہ ہو کہ اس میں تحقیق اور ریسرچ کے نام پر اعتراضات کیے جائیں اور مسلمانوں کو اپنے عقیدے کے سلسلے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا جائے۔

اس طرح صلیبی جنگ نے پانسا پلٹا، اور نئی کروٹ لی اور "عسکری میدان" سے "فکری میدان" کی طرف جنگ کا رخ کر دیا گیا، اس کے لیے انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور پھر قرآن، احادیث مبارکہ اور دیگر اسلامی علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا، اور پھر "استشراق" کے نام پر مستقل ایک تحریک وجود میں آئی، جس نے شرقی لسانیات، مذاہب وعلوم پر تحقیق کے لبادے میں اسلام پر زوردار حملے کا آغاز کر دیا۔

استشراق ایک تعارف:

استشراق (Oriantalism) اس فکری تحریک کو کہا جاتا ہے، جس کا ظاہری مقصد مشرق اوسط کے مختلف ادیان، آداب، زبانوں، اور ثقافتوں کا مطالعہ کر کے حقیقی مقصد "اسلام" کو مزعومہ علمی انداز میں مجروح کرنا ہے۔

استشراق کے سلسلے میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی بہت عمدہ تجزیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

مغرب میں کلچر، خصوصاً اسلامی کلچر کا جو مطالعہ کیا گیا وہ اس تصور کے پیش نظر ہوا کہ ابتدا میں علوم طبعی مدون ہوگئے اور ان کے نظام ہائے علم بن گئے۔ اس کے بعد کے دو چیزیں سامنے آئیں: ایک انفرادی نفس اور دوسرے اجتماعی نفس۔ انفرادی نفس کا مطالعہ نفسیات کے سپرد ہوا اور وہ ایک نظام علم بنا، اور اجتماعی نفس کا مطالعہ عمرانیات یا Sociology کے سپرد ہوا۔ قدیم تہذیبوں کا مطالعہ اس نظر سے کیا گیا کہ جو آثار قدیم تہذیبوں کے موجود ہیں ان کے حوالے سے اجتماعی نفس کو سمجھنے کی سعی کی جائے۔ چناں چہ تمام تہذیبوں کی ابتداء مشرق ہی میں ہوئی تھی، اس لیے ان کا مطالعہ کرنے والے افراد مستشرقین کے نام سے یاد کیے گئے۔ مستشرقین میں چند گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جن کا نقطہ نظر خالص علمی تھا وہ تہذیب وثقافت کو یا کلچر کو بحیثیت مظہر نفس اجتماعی سمجھنا چاہتے تھے لیکن ان کا ذہن یہ تھا کہ اسلام بھی نینوا، بابل، مصر اور ہند کی قدیم تہذیبوں کی طرح ایک مٹی ہوئی تہذیب ہے جس کے متعلق سوال یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے اسباب عروج وزوال کیا ہیں؟ ان کے نزدیک اس کا جو جواب مسلم تھا اور جو مفروضہ انہوں نے اسلامی تہذیب کے عروج کی توجیہ کے لیے اختیار کیا وہ میکانی اصول علیت یعنی Causation Hypothesis of Mechanical کا مفروضہ تھا۔ اسلام کی توجیہ کو انہوں نے یہ صورت دی کہ اسلام سے پہلے کی جو تہذیبیں ہیں، ان کا اثر اسلامی تہذیب پر پڑا اور اسلامی تہذیب نتیجہ میں آئی، لہٰذا قبل اسلام قدیم تہذیبوں Pre-Islanic Cultures کا۔ اس نقطہ نگاہ کے پیش نظر انہوں نے معاشرت کو اور ادب کو جاہلیت کا نسلی ورثہ قرار دیا۔ فلسفہ اور

حکمت کو یونانی افکار سے ماخوذ قرار دیا، فقہ یعنی قانون شریعت کو رومن لا (Roman Law) یا یہودیت سے ماخوذ قرار دیا اور اخلاق و تصوف اور مذہب کو مسیحیت سے ماخوذ جانا۔ اس طرح نقطہ نظر یہ قرار پایا کہ اسلام کے تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں میں کوئی پہلو اسلام کا اپنا نہیں ہے ہر چیز دوسرے نظامہائے کلچر افکار اور دوسری تہذیبوں سے مستعار لی ہوئی ہے۔ جن مستشرقین نے اسلامی کلچر پر غور کیا، ان میں دوسرا گروہ ان مسیحی مبلغین کا تھا جنہوں نے تہذیب کے میدان میں اسلام کے خلاف محاذ کھول دیا۔ خود ولیم میور کے بقول جب مسیحیوں کو صلیبی محاربات میں شکست ہوگئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام، مسیحیت کی مقبول ہونے کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے اور اسلام کو نا قابل قبول ثابت کرنے کی جب تک کامیاب کوشش نہیں کی جائے گی، مسیحیت مقبول نہیں ہوگی۔ چناں چہ مسیحی مبلغین نے اسلام کا مطالعہ اس نظر سے شروع کیا کہ اس کے خلاف نفرت پھیلائی جائے اور اس کے تمام ثقافتی اور تہذیبی فضائل کا سرچشمہ ماقبل اسلام تہذیبوں کو قرار دے کر یہ بتایا جائے کہ اسلام کا اپنا کچھ نہیں ہے، یہ سب انہوں نے ہم سے لیا ہے۔

اس کے بعد مستشرقین کا ایک اور گروہ آیا جو یہودیوں پر مشتمل تھا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ یہودیت کی تجدید کے لیے عبرانی کا مطالعہ کریں اور عبرانی زبان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر یہ بات کھلی کہ مسلمانوں نے عبرانی ادب میں بھی بے اندازہ کام کیا ہے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے کے لیے عربی علم و ادب کے مطالعے کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ اسلام کا مطالعہ اس کے اصلی ماخذ سے کیا جائے۔ چناں چہ انہوں نے عربی پڑھی اور عربی پڑھنے کے بعد انہوں نے اس عناد کے ساتھ، جو یہودیت ہی کا خاصہ ہوسکتا ہے، اسلامی عقائد، اسلامی تصورات، اسلامی شخصیات، اسلامی قانون، اسلامی ادارات، اسلامی روایات، اسلامی تحریکات، اسلامی مقامات اور اسلامی تاریخ میں جو واقعات تھے ان سب کا مطالعہ اس انداز میں پیش کیا کہ اس میں اسلام کی تنقیص پائی جائے اور جہاں کہیں ان میں سے کسی مستشرق میں فراخدلی نظر آتی ہے، اس کا بھی سبب یہ ہے کہ جب اسے منظور ہو آنحضرت کی تنقیص کرے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تعریف کرتا ہے یا وہ جب بھی آنحضرت کی تنقیص کرنا چاہتا ہے تو امام غزالی کی عظمت بیان کر کے اپنے لیے یہ موقع پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ مستشرق کا ایک اور گروہ ہے جس نے اسلامی تہذیب کا اور اسلامی کلچر کا مطالعہ کیا۔ یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو استعمار پرستی کے نمائندے ہیں اور ان کا مفاد یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے مختلف حصے اور مسلم اقوام جو ان کے استعماری عزائم کی راہ میں رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہیں، انہیں دور کیا جائے، مسلمانوں کی قوت اور ان کے ضعف و قوت کے اسباب کو سمجھنے کے لیے انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنی تصانیف کے ذریعہ یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا ماضی چاہے جتنا تابناک ہو مگر ان کا مستقبل بغیر مغربی اقوام کا سہارا لیے تاریک رہے گا۔

مستشرقین کا ایک اور گروہ تھا جس کے پیش نظر یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کے جو فضائل اور جو آثار باقی رہ گئے ہیں، انہیں اس انداز میں پیش کیا جاوے کہ یہودیوں اور مسیحیوں کا عناد مسلمانوں کے خلاف پھر ایک بار مشتعل ہو اور وہ انہیں مٹانے کے لیے پوری شدت سے کام لیں۔

مستشرقین کا ایک اور گروہ وہ ہے جو اس وقت مینک گل، پرنسٹن، کیمبرج [illegible] اور واشنگٹن وغیرہ میں کام کررہا ہے، یعنی اسلامی کلچر پر ریسرچ میں مصروف ہے۔ ان لوگوں کا مدعا یہ ہے کہ قیادت تو مسیحیت کے ہاتھ سے نہ نکلے مگر اشتراکیت کے محاذ پر مسلمانوں کو اپنی موافقت میں کٹوانے کی تدبیر دریافت ہوسکے۔ وہ تمام مختلف محرکات، جن کی بنا پر اسلامی کلچر کا مطالعہ مستشرقین نے پیش کیا ہے، اس مطالعے کو ایک بہت ہی متعصّبانہ رنگ دے دیتے ہیں۔ یہ مطالعہ اسلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ نہیں اور رہماری بد نصیبی یہ ہے کہ ہمارے ہر جدید تعلیم یافتہ کی رسائی صرف انہی مآخذ تک ہے جو مستشرقین نے پیش کیے ہیں۔ (قرآن اور مسلمان اور کے زندہ مسائل: ص ۱۰۷ تا ۱۰۹)

بعض حضرات مستشرقین کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: ''منصف مستشرقین اور متعصب مستشرقین''۔ مگر فاروقی صاحب کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم غلط ہے، اور میری ناقص رائے بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کچھ مستشرقین زیادہ زہر افشانی کرتے ہیں، اور کچھ کم، ورنہ ان میں کوئی سراپا منصف ہمیں دکھائی نہیں دیتا، اور دکھائی بھی کیسے دے؟ کیوں کہ اس تحریک کا مقصد ہی ''اسلام دشمنی'' ہے، اگر کبھی کوئی اچھی بات کرتا بھی ہے تو وہ ''و لا تلبسوا الحق بالباطل'' یعنی حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو، مگر اسی لیے ایسا کرتے ہیں، تاکہ حق ملتبس ہو جائے، یہی طریقہ یہود بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں اپناتے تھے کہ کچھ چیزوں کی تصدیق کرتے اور بعد میں کچھ کی تکذیب۔ اور مستشرقین انہیں کی اولاد ہیں۔

مستشرقین کی فریب کاری

یہ حقیقت ہے کہ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے قرآن مجید، سیرت، تاریخ، تمدن اسلام اور اسلامی معاشرہ کی تاریخ اور پھر اس کے بعد اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا اور مطالعہ میں ان کی دوربیں نگاہیں وہ چیزیں تلاش کرتی رہیں، جن کو جمع کرکے قرآن، شریعت اسلامی، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، قانون اسلامی، تمدن اسلامی اور اسلامی حکومتوں کی ایک ایسی تصویر پیش کرسکیں، جسے دیکھ کر لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، مستشرقین نے اپنی آنکھوں پر خوردبین لگا کر تاریخ اسلام اور تمدن اسلامی اور یہ کہ آگے بڑھ کر (خاکم بدہن) قرآن مجید اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ ذرے وہ ریزے تلاش کرنے شروع کئے جن سے کوئی انسانی جماعت، کوئی انسانی شخصیت خالی نہیں ہوسکتی ہے اور ان کو جمع کرکے ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہا جو ایک نہایت تاریک تصور ہی نہیں بل کہ تاریک تاثر اور تاریک جذبہ پیش کرتا ہے اور انہوں نے اس کام کو انجام دیا جو ایک بلدیہ کا ایک انسپکٹر انجام دیتا ہے کہ وہ شہر کے گندے علاقوں کی رپورٹ پیش کرے۔ (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

استشراق کے مقاصد

(۱) استشراق کے دینی مقاصد:

☆استشراق کے پروان چڑھنے میں درپردہ دینی مقصد ہی کارفرما تھا الاخریٰ ۱۴۳۲ھ کے اس طویل سفر میں مندرجہ ذیل امور اس کے ساتھ تھے:

☆نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے صحیح ہونے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، نیز یہ باور کرانا کہ احادیث نبویہ کو مسلمانوں نے قرون ثلاثہ میں ایجاد کیا ہے۔

☆قرآن کریم کے صحیح ہونے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، نیز قرآن کریم میں طعن وتشنیع کرنا۔

☆اسلامی فقہ کی وقعت کو کم کرنا اور اسے رومن فقہ باور کرانا۔

☆عربی زبان کو ختم کرنا، نیز یہ باور کرانا کہ عربی زبان زمانے کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتی ہے۔

☆اسلام کی اصل یہودیت اور نصرانیت کو قرار دینا۔

☆تبلیغ کرنا اور مسلمانوں کو عیسائی بنانا۔

☆اپنے افکار ونظریات کی تقویت کے لیے موضوع احادیث کا سہارا لینا۔

۲۔تجارتی مقاصد:

☆اسلامی ممالک کے متعلق معلومات فراہم کرنے والوں اور ان معلومات پر نوٹ لکھنے والوں کو بادشاہ وقت بے پناہ مال ودولت سے نواز کرتا تھا۔

☆عالم اسلام پر مغربی قبضے سے قبل انیسویں، اور بیسویں صدی میں تجارتی مقصد زیادہ نمایاں تھا۔

سیاسی مقاصد:

☆مسلمانوں میں بھائی بندی کی فضا کو ختم کر کے ان میں تفرقہ ڈال کر ان پر غلبہ حاصل کرنا۔

☆عامی لہجے کو اہمیت دینا اور مروّجہ عادات کا مطالعہ کرنا۔

☆استعماری قوتیں اپنے وظیفہ خوروں کو نوآبادیاتی ممالک میں ان کی زبان، آداب اور ادیان کی تحقیق پر مامور کرتے تھے کہ یہ معلوم کرسکیں کہ ان ممالک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر وہاں کس طرح حکومت کی جاسکتی ہے۔

ڈیڑھ سو سالوں کے دوران یعنی انیسویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی کے وسط تک مستشرقین کی تالیف کردہ کتابوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

کانفرنسیں وجمعیات:

☆مستشرقین کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس ۱۸۷۳ء میں پیرس میں منعقد ہوئی۔

☆اس کانفرنس کے بعد مسلسل عالمی سطح کی کانفرنس منعقد ہوتی رہیں چنانچہ اب تک صرف بین الاقوامی کانفرنسوں کی تعداد تیس ہوگئی ہے؛ یہ ان بین الاقوامی مجالس واجتماعات کے علاوہ ہیں، جو ہر ملک کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً ۱۸۴۹ء میں جرمن مستشرقین کی کانفرنس، ورسدن، جرمنی میں منعقد ہوئی؛ اس طرح کی کانفرنسیں آج تک مسلسل

منعقد ہو رہی ہیں۔

☆مذکورہ کانفرنسوں میں ہر دفعہ سینکڑوں مستشرق علما حاضر ہوئے تھے، مثال کے طور پر آکسفورڈ کانفرنس کولےلیں جس میں ۲۵ ممالک کی یونیورسٹیوں اور ۶۹ علمی اداروں سے ۹۰۰ سو علما شریک ہوئے تھے۔

☆متعدد استشراقی جمعیتیں بھی ہیں۔مثلاً ''ایشائی جمعیت'' جس کی بنیاد ۱۸۲۲ء میں پیرس میں رکھی گئی تھی، اور''ایشیائی شاہی جمعیت'' جس کی بنیاد ۱۸۲۳ء میں برطانیہ وآئرلینڈ میں رکھی گئی تھی، اسی طرح''مشرقی جمعیت امریکہ'' کی بنیاد ۱۸۴۲ء میں اور ''مشرقی جمعیت جرمنی'' کی بنیاد ۱۸۴۵ء میں رکھی گئی تھی۔

استشراق استعمار کی خدمت میں:

☆کارل ھینرس بیکر(KARL HEINRICH BEEKER)(وفات ۱۹۳۳ء)''جریدہ اسلام جرمنی'' کے بانی اس شخص نے ایسی تحقیقات کیں جو افریقہ میں استعماری مقاصد کی خدمت کرتی ہیں۔

☆بارتھولڈ(BARTHOLD)(وفات ۱۹۳۰ء) رسالہ''روس اسلامی دنیا'' کے بانی۔انہوں نے بھی ایسی تحقیقات سرانجام دیں جو وسط ایشیا میں روسی قیادت کے مفادات کی خدمت کرتی ہیں۔

☆ہالینڈ کا باشندہ سنوک ھرگرونج(SNOUCK HURGRONJE)(۱۸۵۷ء۔۱۹۳۶ء)۔ یہ شخص ۱۸۸۴ء میں عبدالغفار کے جعلی نام سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔نصف سال تک مکہ میں قیام کرنے کے بعد واپس چلا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ شرق اسلامی میں استعماری مقاصد کی خدمت میں تحقیقاتی رپورٹ لکھے۔

☆پیرس میں ۱۸۸۵ء ''مشرقی زبانوں کا ادارہ'' کی بنیاد رکھی گئی۔اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرقی ممالک اور مشرق بعید کے ملکوں میں استعمار کی راہ ہموار کرنے کے لیے ان ممالک کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔

استشراق کے خطرناک افکار:

☆جارج سیل G.SALE نے اپنی کتاب معانی قرآن کا ترجمہ(اشاعت ۱۷۳۶ء) کے مقدمے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے: ''قرآن محمد(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی ایجاد و تالیف ہے، اور ایسا معاملہ ہے کہ اس میں جدل کی کوئی گنجائش نہیں''۔(گویا اس شخص کے خیال میں یہ بات بالکل یقینی ہے)۔

☆ریچرڈ بل(RICHARD BELL) کے اپنے زعم کے مطابق نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو یہود کی کتابوں، خاص طور پر''عہد قدیم'' اور نصاریٰ کی کتابوں سے اخذ کیا ہے۔

☆دوزی(وفات ۱۸۸۳ء) کے زعم میں قرآن انتہائی بدذوق کتاب ہے۔اس میں بعض خاص چیزوں کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں، نیز اس کا زعم ہے کہ قرآن بہت طویل اور ایک حد تک اکتا دینے والی کتاب ہے۔

☆برطانوی نوآبادیات کے وزیر''اومی غو'' نے اپنی حکومت کے رئیس کے نام ۹ رجنوری ۱۹۳۸ء میں ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ''جنگ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ اسلامی اتحاد ہی سب سے بڑا خطرہ ہے لہٰذا سلطنت برطانیہ کو اس

سے ڈرنا چاہیے اور اس کے خلاف جنگ کرنا چاہئے۔ یہ خطرہ صرف سلطنت برطانیہ کے لیے ہی نہیں فرانس کے لیے بھی ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ خلافت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ وہ دوبارہ واپس نہ آئے"۔

☆ شیلدون آموس لکھتا ہے کہ: شریعت محمد دراصل عرب ممالک کے سیاسی احوال کے موافق، مشرقی شہنشائیت کے رومن قوانین کا نام ہے"۔ یہ شخص مزید لکھتا ہے کہ "قانون محمدی تو صرف عربی رنگ میں رنگے ہوئے قوانین ہیں"۔

☆ رینان فرانسیسی لکھتا ہے کہ "عربی فلسفہ دراصل عربی حروف میں مکتوب یونانی فلسفہ ہے"

☆ رہا۔ لویس ماسینیون تو یہ شخص عربی زبان کو بازاری لہجے میں بولنے اور لاطینی حروف میں لکھنے کی تحریک کا قائد وشہسوار تھا۔

بنیادی عقائد وافکار:

☆ استشراق دراصل صلیبیوں کے عہد میں شرق اسلامی اور غرب نصرانی کے درمیان موجود تناؤ کی پیداوار ہے نیز سفارتوں اور سفیروں کے ذریعے بھی اس نے پرورش پائی۔

☆ استشراق کی بنیادی وجہ فلسفیانہ نصرانیت ہے، جس کا مقصد اسلام میں دخل اندازی کرکے، مسلمانوں کو فریب دے کر اور اسلام میں شکوک وشبہات داخل کرکے اسے اپنے اندر سے تباہ کرنا ہے، لیکن آخر میں استشراق نے ان قیود سے آزاد ہونا شروع کردیا ہے تاکہ خود کو صرف علمی روح کے قریب ترین کرسکے۔

مشہور اسلام دشمن مستشرقین:

گولڈزیہر (Goldizher)(۱۸۵۰ء — ۱۹۲۰ء) ہنگری کا یہودی تھا۔ اس کی کتابوں میں سے ایک کتاب (تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی) ہے۔ گولڈزیہر بلا اختلاف یورپ میں اسلامیات کا سربراہ مانا گیا (حالاں کہ تدوین حدیث، امام زہری پر سب سے پہلے اعتراض کرنے والا، یہی ہے)۔

☆ جان مارینارڈ (J-Marynard) امریکی، بڑا متعصب تھا۔ رسالہ "اسلامی علوم" کے لکھاڑوں میں سے ہیں۔

☆ ایس۔ ایم زویمر (S.M-Zweimer) یہ مستشرق عیسائی، امریکی رسالے "اسلامی دنیا" کا موسس تھا، ان کی کتاب "اسلام، عقیدے کو چیلنج کرتا ہے" ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کی ایک اور کتاب کا نام "اسلام" ہے۔ یہ کتاب متعدد مقالوں کا مجموعہ ہے، جسے عیسائی تبلیغی کانفرس دوئم ۱۹۱۱ء لکھنو ہندوستان میں پڑھا گیا تھا۔

☆ جی وون غرونباوم (G. VON GRUN BAUN) جرمن یہودی، امریکی یونیورسٹیوں کا استاذ رہا ہے۔ اس کی کتابوں میں "محمدی عیدیں ۱۹۵۱" اور "اسلامی ثقافتی تاریخ کا مطالعہ" ۱۹۵۴ء قابل ذکر ہیں۔

☆ آئی۔ جے۔ وینسنک (I.J.WENSINK) یہ اسلام کا بڑا دشمن تھا، اس کی ایک کتاب کا نام "اسلامی

عقیدہ۔۱۹۳۲ء" ہے۔

☆کینیت کراج(K-GRAGG)متعصب امریکی اس کی ایک کتاب کا نام "دعوت اذان گاہ" ۱۹۵۶ء ہے۔

☆لوی ماسیئون(L.MASSIGON)فرانسیسی مبلغ۔فرانسیسی وزارت خارجہ کے شعبۂ امور نو آبادیات شمالی افریقہ کے مشیر تھے،ان کی ایک کتاب کا نام 'صوفی حلاج شہید اسلام میں' ہے جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔

☆ڈی۔بی۔ب میکڈونالڈ(D.B.MACDONALD)امریکی متعصب مبلغ۔اس کی ایک کتاب "علم کلام فقہ اور دستوری نظریے کی ترقی" ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔نیز اس کی ایک کتاب "اسلام دینی موقف اور حیات" ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔

☆مائلز گرین(M.GREEN)سیکریٹری تحریر۔رسالہ "الشرق الاوسط"۔

☆ڈی۔ایس۔مارگولیوث(۱۸۰۵D.S.MARGOLIOTH-۱۹۴۰ء)متعصب انگریز۔طہ حسین اور احمد امین کا ہم خیال تھا۔اس کی ایک کتاب 'اسلام میں نئی ترقی" ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔اس کی ایک اور کتاب "محمد اور طلوع اسلام" ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی،نیز اس کی ایک کتاب "الجامعۃ الاسلامیۃ" ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔

☆اے۔جے۔آربری(A.J.ARBERRY)متعصب انگریز۔اس کی کتابوں میں سے ایک کتاب "اسلام آج" ۱۹۴۳ء میں اور ایک کتاب "تصوف" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔

☆بارون کارادی فو(BARON CARRADE VOUX)فرانسیسی متعصب۔دائرہ معارف اسلامیہ کے بڑے محررین میں سے تھے۔

☆ایچ۔اے۔آر۔جب(H.A.R)۔۱۹۶۵ء انگریز۔اس کی کتابوں میں ایک کتاب "محمدی مذہب" ۱۹۴۷ء میں اور "اسلام میں نئی جہتیں" ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔

☆آر۔اے۔نیکلسن(R.A.NICKLSON)انگریز۔یہ شخص اس بات کا انکار کرتا ہے کہ اسلام ایک روحانی مذہب ہے بلکہ وہ اسلام کو مادیت اور انسانی ترقی کے مخالف مذہب سے تعبیر کرتا ہے اس کی کتاب "صوفیاء اسلام" ۱۹۱۰ء میں اور ایک کتاب "عربوں کی ادبی تاریخ" ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔

☆ہنری لامنس مسیحی ۱۸۷۲۔۱۹۳۷ء(H.LAMMANS)متعصب فرانسیسی۔اس کی ایک کتاب کا نام "اسلام" اور ایک دوسری کتاب کا نام "الطائف" ہے۔نیز یہ دائرہ معارف اسلامیہ کے محررین میں سے تھا۔

☆جوزیف شاخت(J-SCHACHT)متعصب جرمن۔اس کی ایک کتاب "اسلامی فقہ' کے اصول" ہے۔

☆بلاشیر: ان کو فرانسیسی وزارت خارجہ میں عربوں اور مسلمانوں کے امور کا ماہر سمجھا جاتا تھا، وہ اسی شعبہ میں اپنے فرائض منصبی انجام دیتا تھا۔

☆الفرڈ جیوم (A.JEOM) متعصب انگریز۔ اس کی ایک کتاب کا نام "اسلام" ہے۔

پھیلاؤ اور اثر ورسوخ کے مقامات:

☆مغرب ہی وہ مناسب سرزمین ہے جس پر مستشرقین سرگرم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین زیادہ تر جرمنی، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور ہنگری کے باشندے ہیں۔ بعض مستشرقین اٹلی اور اسپین میں بھی نمودار ہوئے۔

☆حقیقت یہ ہے کہ استشراق کا سورج امریکہ میں زیادہ چمکا، چنانچہ امریکہ میں استشراق کے بہت سے مراکز ہیں۔

☆مغربی حکومتوں، کمپنیوں، کمیٹیوں، اداروں اور کلیساؤں نے استشراقی تحریک کی امداد وتائید کرنے اور یونیورسٹیوں میں انہیں کھلا چھوڑنے میں بالکل بخل سے کام نہیں لیا، یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔

☆دراصل استشراقی تحریک، استعمار و نصرانیت کی خدمت کے لیے مسخر تھی اور آخر میں یہودیت اور صہیونیت کی بھی خادمہ بن گئی۔ ان تمام قوتوں کا ہدف مشرقِ اسلامی کو کمزور کر کے براہ راست یا بالواسطہ اس پر تسلط جمانا ہے۔ (مذاہب عالم کا انسائکلو پیڈیا)

گلوبلائزیشن استشراق کا نیا ایڈیشن:

عالم اسلام کے نامور محققین "ڈاکٹر اڈورڈ سعید" اور "ڈاکٹر انور عبدالملک" کے مطابق ۱۹۷۳ء فرانس کے شہر "پیرس" میں، مستشرقین کی انیسویں عالمی کانفرنس منعقدہ ہوئی، جس میں امریکہ کے یہودی مستشرق "برنارڈ لویس" نے کہا کہ:

"اب ہمیں مستشرق کی اصطلاح کو تاریخ کے حوالے کر دینا چاہیے، چناں چہ اتفاق رائے سے اس اصطلاح کا استعمال ترک کر دیا گیا اور ایک نئی اصطلاح استعمال کرنے پر اتفاق کیا گیا اور استشراق کے نئے نقشِ راہ کی قیادت امریکہ کو سونپ دی گئی، یہ اصطلاح "گلوبلائزیشن" کے نام سے عالمی حلقوں میں مشہور ہوئی (ایضاً)۔ بس فرق اتنا تھا کہ پہلے استشراق کا نشانہ صرف اور صرف اسلام تھا، اس کو دیگر مذاہب سے کوئی سروکار نہ تھا، اس مرتبہ گلوبلائزیشن کا نشانہ دنیا کے تمام مذاہب ہیں، البتہ اسلام عالم گیریت کے لیے اس حیثیت سے سب سے بڑا خطرہ ہے کیوں کہ اس میں گلوبلائزیشن کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے، جب کہ دوسرے مذاہب اس طاقت سے محروم ہیں پہلے استشراق کا میدان کار صرف مذہب اور اس کے متعلقات تھے، اس مرتبہ گلوبلائزیشن کا میدان کار مذہب اور اس کے متعلقات کے ساتھ ساتھ اقتصاد و سیاست بھی ہیں، گویا گلوبلائزیشن کی اصطلاح نے استشراق اور استعمار (سامراجیت) کو باہم متحد کر دیا،

ماضی میں دونوں کی منزل اگرچہ ایک تھی، مگر راہیں الگ الگ تھیں، لیکن آج منزل عالمی ایک ہے اور اس منزل تک پہنچنے کی راہ بھی ایک ہے۔

گلوبلائزیشن کی تعریف:

(۱) ڈاکٹر ''ترکی الحمد'' کہتے ہیں کہ:

''گلوبلائزیشن سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کا طریقہ کار ہی نہیں، بل کہ اس طریقہ کار کو اپنانے کی ہمہ گیر دعوت کا نام ہے، یہ پوری دنیا پر تسلط کے ارادے کو بلاواسطہ طور پر وجود بخشنے کا ایک ذریعہ ہے، مختصراً عالم گیریت، اقتدار و بالا دستی کی طرف پیش قدمی کرنے اور ہر نافع چیز کو معدوم کرنے کا نام ہے۔ (روزنامہ الخلیج: ۵/۲/۲۰۰۰)

(۲) ڈاکٹر ترکی نے ثقافتی عالم گیریت کو الگ سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

جہاں تک ثقافتی عالم گیریت کا تعلق ہے، تو اس کی تعریف میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کو غصب کر کے ان پر مغربی تہذیب مسلط کرتا ہے''۔ (۱۲ ایضاً)

(۳) ڈاکٹر مصطفی النشار'' کہتے ہیں کہ:

''عالم گیرت کا مطلب ہرگز مختلف تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنا نہیں ہے، بل کہ اس کا مطلب تمام مقامی اور قومی تہذیبوں کو مٹا کر پوری دنیا کو مغربی رنگ میں رنگ دینا ہے''۔ (رسالہ المنتدی، عدد ۱۹۳، اگست ۱۹۹۹ء)

(۴) ڈاکٹر ''عبدالوہاب المسیری'' کہتے ہیں کہ:

''عالم گیریت مغربی روشن خیالی کی دعوت وتحریک کا نام ہے، جس کا مقصد تہذیبی اور انسانی خصوصیات کا خاتمہ کرنا ہے۔'' (ماہنامہ المستقبل عدد ۱۳، صفر ۱۴۲۳ھ مئی ۲۰۰۲ء)

(۵) ڈاکٹر ''مصطفی محمود'' کہتے ہیں کہ:

''گلوبلائزیشن وطن کی وطنیت اور قوم کی قومیت کا خاتمہ کرنے کے لیے معرضِ وجود میں آیا ہے، یہ کسی بھی قوم کے دینی، معاشرتی اور سیاسی انتساب کو ختم کرنے کا داعی ہے، تا کہ اس قوم کی حیثیت بڑی طاقتوں کے سامنے ادنی خادم کی سی رہ جائے۔ (رسالہ الاسلام وطن عدد ۱۳۸ ص ۱۲، ۱۹۹۸ء)

گلوبلائزیشن سیاسی واقتصادی اصولوں، معاشرتی وثقافتی اقتدار اور زندگی کے طرز اور طریق کے ڈھانچے کا نام ہے، جو پوری دنیا پر زبردستی مسلط کیا جائے گا اور لوگوں کو اسی کے کھینچے ہوئے دائرے میں زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائیگا۔ (العرب والعولمۃ از محمد عابد الجابری: ص ۱۳۷)

(۷) گلوبلائزیشن امریکی تہذیب اور رہن سہن کے طرز زندگی کو پوری دنیا پر تھوپنے کی کوشش کا نام ہے، یہ ایک ایسا نظریہ ہے، جو سارے عالم پر بلاواسطہ اقتدار و بالادستی کا عکاس ہے۔ (ایضاً)

(۸) عالم گیریت سیکولر اور مادیت پر فلسفے اور اس سے متعلق اقدار وقوانین اور اصول تصورات کو باشندگانِ عالم پر مسلط

کرنے کی کوشش کا نام ہے (۱) الاسلام و العولمة، از محمد ابراہیم المبروک ص ۱۰، طبع ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء)

(۹) گلوبلائزیشن ایک ایسی تحریک ہے، جس کا مقصد مختلف اقتصادی، ثقافتی اور معاشرتی نظاموں، رسوم و رواج اور دینی، قومی اور وطنی امتیازات کو ختم کرکے، پوری دنیا کو امریکی نظریے کے مطابق جدید سرمایہ دارانہ نظام کے دائرے میں لانا ہے۔ (العولمة، از صالح الرقب: ۶)

(۱۰) ڈاکٹر "صادق جلال العظم" گلوبلائزیشن کی تعریف کرتے ہیں کہ: "یہ تمام ممالک کو ایک مرکزی ملک (امریکہ) کے رنگ میں رنگنے کا نام ہے"۔ (ما العولمة؟ از حسن حنفی و صادق جلال ص: ۱۳۶، طبع دار الفکر بیروت)

(۱۱) بہت سے مفکرین نے نہایت مختصر انداز میں عالم گیریت کی یہ تعریف کی ہے کہ: "گلوبلائیزیشن کے معنی "حدود کا اختتام" یہ جامع تعریف بڑی طاقتوں کے منصوبے کی ترجمانی کرتی ہے کہ مستقبل میں ہر قسم کی حد بندی، خواہ اس کا تعلق اقتصاد سے سیاست سے، تہذیب یا ثقافت سے، علم و دانش سے ہو یا طرزِ زندگی سے، ختم کردی جائے گی اور دنیا مختلف رنگوں کے بجائے ایک ہی رنگ کی ہوگی"۔

گلوبلائزیشن کی راہ کس نے ہموار کی؟

عالم گیریت کے پالیسی ساز اداروں نے جدید عالمی نظام، کو قابلِ عمل بنانے کے لیے، جن وسائل کے ذریعے راہ ہموار کی، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) آزاد عالمی تجارت:

اس طرزِ تجارت کا مقصد یہ ہے کہ ایک عالمی منڈی میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک تجارت کے میدان میں طبع آزمائی کریں، اس منڈی کے دروازے تمام عالمی اقتصادی طاقتوں کے لیے کھلے ہوئے ہوں، اور وہ آزاد مقابلہ آرائی کے اصول کے تابع ہوں۔ (العولمة، از صالح الرقب: ص ۸) ایسی صورت میں ترقی یافتہ ممالک کی کمپنیوں کا غالب آجانا یقینی ہے، جن کے پاس اپنی مصنوعات کی تشہیر اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے اتنا سرمایہ ہے، جو بعض ملکوں کے سالانہ بجٹ سے بھی متجاوز ہے، ایسی مغربی کمپنیوں کے سامنے ترقی پذیر ممالک کی کمپنیاں باقی نہیں رہ پائے گی، جن کے پاس نہ تشہیر کے بھرپور وسائل ہیں اور نہ اپنی مصنوعات کو اعلیٰ معیار کا حامل بنانے کے لیے مطلوب سرمایہ ،اس لیے یہ کھلا بازار اقتصادی میدان میں ایک نظریے کی حامل کمپنیوں کی اجارہ داری اور عالم گیریت کے نفاذ کی راہ میں زینے کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) براہ راست غیر ملکی سرمایہ داری:

کسی ملک میں باہر کی کمپنیوں کا تجارت کرنا، اپنی کمپنیاں کھول لینا اور سرمایہ لگانا، "براہ راست غیر ملکی سرمایہ داری" کہلاتا ہے، اس کو اقتصادیات کی اصطلاح میں Foreign Direct Investment (فارن ڈائرکٹ انوسٹمنٹ) کہا جاتا ہے۔ (ایضا)

عالمی طاقتوں نے ترقی پذیر ممالک سے معاہدے کرکے اور کانفرنسوں (الفجر ۲۳ منشور) جاری کرکے، دوسرے ممالک میں سرمایہ کاری کو قانونی حیثیت دے دی ہے، اب کوئی بھی کمپنی کسی بھی ملک میں تجارت کرسکتی ہے، اسی سنہرے موقع کے ہاتھ آجانے کے بعد، مغربی کمپنیاں ترقی پذیر ممالک میں لنگر انداز ہوگئیں اور وہاں کی اقتصادیات کو نگلنا شروع کردیا، یہ کمپنیاں اپنی مصنوعات کے ساتھ ساتھ مغربی اقدار، ثقافت اور تہذیب لاتی ہیں، مزید برآں ان کمپنیوں کی ترقی ممالک میں آمد اتنی کثیر المقاصد ہے کہ جہاں ان کو سرمایہ کاری کے نتیجے میں خود فائدہ پہنچتا ہے، وہیں چند عالمی بنکوں کو بھی درست نفع ہوتا ہے، جو یہودی لابی کے زیر اثر ہیں، کیوں کہ عالمی کمپنیاں جو بھی سرمایہ لگاتی ہیں، وہ انہی عالمی بنکوں کے واسطوں سے لگایا جاتا ہے، اس لیے یہ عالمی بنک اس سرمایے سے بھاری نفع حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تجارتی لین دین پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اپنے ملک کی معیشت کو بھی تقویت پہنچاتے ہیں۔

(۳) ٹکنالوجی کے میدان میں انقلاب:

ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی اس دور کا اہم ترین امتیاز ہے، جو ملک بھی اس میدان میں آگے ہے وہ اقتصادیات کے دروبست پر بھی حاوی ہے، اس ترقی کے نتیجے میں پوری دنیا ایک دوسرے کے قریب ہوگئی، مشرق ومغرب کی دریاں سمٹ گئیں اور لفظ "مسافت" کی اب کوئی حقیقت نہیں رہی، اس ترقی کی وجہ سے مال، سامان اور سروسز (خدمات) کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا کچھ مشکل نہیں رہ گیا ہے، انٹرنیٹ کے ذریعے ایک بٹن دبا کر مطلوبہ چیز حاصل کرنا ایک حقیقت بن چکا ہے؛ لیکن ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی بھی صنعتی ممالک کے حصے میں آئی ہے، جو اس ٹکنالوجی کی مدد سے اپنی صنعت کو مضبوط کررہے ہیں اور مصنوعات کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچا رہے ہیں، ٹکنالوجی بالخصوص انفارمیشن ٹکنالوجی نے عالم گیریت کی راہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کردیا ہے۔ (ایضاً، ص ۹)

(۴) کثیر الملکی کمپنیوں کا پھیلاؤ:

موجودہ دور کو جہاں عالم گیریت کا دور کہا جاتا ہے، وہیں اس کو کثیر الملکی (ملٹی نیشنل) کمپنیوں کے دور سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں، اس لیے کہ یہ کمپنیاں گلوبلائزیشن کی اہم ترین آلہ کار ہیں، اور عالمی اُفق پر ان کی بڑی حیثیت ہے، کیوں کہ جغرافیائی حدود کی پابندی نہ ہونے کی بنا پر یہ کمپنیاں کئی ممالک میں سرمایہ کاری کرتی ہیں، اور ان کی اقتصادیات پر سانپ بن کر بیٹھ جاتی ہیں، اور پھر وہی ہوتا ہے جو ان کمپنیوں کو منظور ہوتا ہے، ترقی پذیر ممالک ان کے سامنے بے بس ہوجاتے ہیں، اور ان کے مالکان کے سامنے دست بستہ نظر آتے ہیں، کم از کم اقتصادی میدان میں ان کی خواہشات کے مطابق قوانین بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔

(العولمة ص: ۹ بہ حوالہ: العولمة والعالم الإسلامي: أرقام وحقائق، از عبد اسماعیل، الاندلس الخضراء ۲۰۰۱ء)

عالم گیریت کی تمہیدات:

اس گفتگو سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ گلوبلائزیشن کا مقصد مختصر الفاظ میں امریکنائزیشن

(Americanization) یا دوسرے الفاظ میں، پوری دنیا پر امریکی بالادستی کا نام ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عالم گیریت اچانک رونما نہیں ہوئی، بل کہ سرمایہ دار طاقتوں کی طرف سے اس کے لیے منصوبہ بند اور موثر کوششیں ہوئیں، میدان صاف کیا گیا، اور راہیں ہموار کی گئیں، اگر ہم گذشتہ نصف صدی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں، جن کو عالم گیریت کی تمہید یا مقدمے کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

چناں چہ لیگ آف نیشنز اور پھر اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا، جس کے ذیلی اداروں میں "عالمی بنک" اور "انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ" قابل ذکر ہیں، جن کی سرپرستی میں عالم گیریت نے اقتصادی میدان میں فتح حاصل کی ہے، پھر ۱۹۴۷ء کو "جنیوا" میں ۲۳ صنعتی ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جو "گاٹ" معاہدے (تجارت اور کسٹم ڈیوٹی پر ہونے والا معاہدہ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے کا مقصد یہ تھا کہ آزاد تجارت کو فروغ دیا جائے اور معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک، اپنی منڈیوں کے دروازے ایک دوسرے کے لیے کھول دیں، اس معاہدے نے ۱۹۴۷ء میں صرف ۲۳ ممالک کی سرپرستی میں اپنا سفر شروع کیا، ۱۹۹۳ء تک اس میں ۱۱۷ ممالک شریک ہوچکے تھے، اسی طرح کا ایک اور معاہدہ "ماسٹریکٹ" کے نام سے مشہور ہوا، جو ۱۵ صنعتی ممالک کے درمیان عمل میں آیا۔

بہت سے سیاسی واقعات بھی عالم گیریت کے لیے "مقدمۃ الجیش" ثابت ہوئے، چناں چہ سرد جنگ کا اختتام ہوا، اس سے پہلے پوری دنیا دو طاقتوں کے درمیان منقسم تھی، روس کی شکست کے بعد اس کے زیر اثر ممالک پر بھی امریکی اجارہ داری کا آغاز ہوگیا، سابق روسی صدر "میخائیل گورباچیوف" نے امریکی اشارے پر ۱۹۸۵ء میں کمیونزم کے اقتصادی نظام کی اصلاح کا اعلان کیا، جس کو اس وقت "پیروسٹویکا" کا نام دیا گیا، یہ اعلان درحقیقت "کمیونزم" کی ناکامی اور "سوویت یونین" کے سقوط کا اعلان تھا، افغانستان کے بلند و بالا پہاڑوں سے ٹکرانے کے بعد، کمیونزم اسی سرزمین میں دفن ہوگیا، اور اس طرح دنیا کی دوسری بڑی طاقت، جو "سوویت یونین" کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی، تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی ۱۹۸۹ء میں "دیوار برلن" کے انہدام اور مشرقی و مغربی جرمنی کے اتحاد کے بعد، "کمیونزم" کا مشرقی یورپ سے بھی جنازہ نکل گیا، پھر ۱۹۹۱ء میں خلیجی جنگ کا آغاز ہوا جس کے بہانے امریکہ کو خلیج کے علاقے میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنے کا موقع مل گیا، ان تمام واقعات نے امریکہ کو عالمی اقتدار کے عرش پر بیٹھنے اور جدید عالمی نظام کی قیادت کرنے کا موقع فراہم کردیا۔

اپریل ۱۹۹۵ء میں مراکش کی راجدھانی "رباط" میں عالمی تجارت تنظیم (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) کا قیام عمل میں آیا، جو در صل "گاٹ" معاہدے کی تجدید کی ایک کامیاب کوشش تھی، یہ تنظیم گلوبلائزیشن کو نافذ کرنے کے سلسلے میں "عالمی بینک" اور "انٹرنیشنل مانٹری فنڈ" کی مددگار کی حیثیت رکھتی ہے، عالم گیریت کی عمارت میں اس وقت آخری اینٹ رکھ دی گئی، جب سوئٹزرلینڈ کے شہر "جنیوا" میں فروری ۱۹۹۷ء کو عالمی تجارتی تنظیم کے بینر تلے، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے آزادانہ استعمال سے متعلق عالمی معاہدہ ہوا، جس سے اس ٹکنالوجی کیا آزادانہ استعمال سے متعلق عالمی معاہدہ ہوا جس سے اس ٹکنالوجی پر کنٹرول رکھنے والے ترقی یافتہ ممالک، خصوصاً امریکہ کو ترقی پذیر ممالک میں اپنے

اقدار ونظریات اور اپنی تہذیب وثقافت کو رواج دینے کا موقع مل گیا۔ مشرقی یورپ [illegible] شمولیت اور بہت سے عرب ممالک کے عالمی تجارت تنظیم'' کا ممبر بن جانے کی وجہ سے بھی گلوبلائزیشن کو نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے میں مدد ملی ہے، پھر اسرائیل کے اقتصادی ایجنڈا بھی عالم گیریت کے لیے مددگار ثابت ہوئے، جن کا مقصد ''عظیم تر اسرائیل کا خواب دیکھنے والے صہیونیوں کے مفادات کے مطابق مشرق وسطی کی عالم کاری کرنا ہے، اپنے خواب کی تعبیر تلاش کرنے کے لیے انھوں نے عرب ممالک کے ساتھ امن معاہدوں اور اس ضمن میں اقتصادی معاہدوں کا سہارا لیا، جن کی سرپرستی کیلیے امریکہ ہمیشہ حاضر باش رہا، ان معاہدوں سے امریکہ کا سب سے بڑا حلیف اور عالم گیروں کا اصل وطن ''اسرائیل'' جہاں سیاسی اعتبار سے مضبوط ہوا، وہیں اقتصادی اعتبار سے بھی طاقت ور بن گیا۔

پھر مختلف ممالک میں قائم عالمی ''اسٹاک ایکسچینج'' نے بھی عالم گیریت کو ابھرنے میں بڑا تعاون دیا ہے، کیوں کہ ان اسٹاک مارکیٹوں کی وجہ سے جو شخص جہاں بھی اور جتنا بھی سرمایہ تجارت میں لگا رہا ہے، اس کا سرمایہ عالمی سطح پر لگ رہا ہے اور عالم گیریت کا مقصد بھی یہی ہے کہ سرمایہ کاری کسی ملک میں محدود نہ رہے بل کہ عالمی سطح پر ہو، تا کہ آزادانہ عالمی تجارت کو فروغ مل سکے۔

یہ چند سیاسی اور اقتصادی حالات ہیں جنھوں نے ''عالم گیریت کو رواج دینے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور اس کو اس نظریے سے حقیقت اور فکر وخیال سے واقعے کا روپ دے دیا ہے، ان واقعات کے جائزے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ''عالم گیریت،، اچانک پیدا نہیں ہوئی، جدید عالمی نظام بیٹھے بیٹھے نہیں بن گیا، بل کہ یہودی دماغوں نے سالہا سال کی کوششوں اور سازشوں سے گلوبلائزیشن کے لیے راہ ہموار کی اور ایسے حالات پیدا کیے کہ مذکورہ واقعات ''نئے عالمی نظام'' کی تمہید بن گئے۔

جدید عالمی نظام کے مرکزی عناصر:

عالم گیریت چند مرکزی عناصر سے مل کر وجود پذیر ہوئی، جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سرمایہ دارانہ نظام کا فروغ:

اشتراکی نظام کے شکست خوردہ ہو جانے کی وجہ سے، سرمایہ دارانہ نظام کو تمام معاشروں پر ایسی اقتدار مسلط کرنے کا موقع مل گیا، جنہیں امریکہ پروان چڑھا رہا ہے اقوام متحدہ کی تابع عالمی تنظیمیں جیسے،، عالمی بنک انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ،، اس کی مدد کر رہے ہیں جبکہ ان تنظیموں کی سرپرستی میں ہونے والے عالمی معاہدے، امریکہ کے لیے راستہ صاف کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

(۲) ایک مرکز:

سوویت یونین کے سقوط اور اس کے عالمی ڈھانچے ''وارسو'' کے خاتمے کے بعد، امریکہ تنہا عالمی قائد کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ طاقت میں توازن ختم ہو چکا ہے اور امریکہ

عسکری اور اقتصادی میدانوں میں اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ کوئی ملک کبھی بھی اتنا مضبوط نہیں رہا، طاقت میں عدم توازن کی وجہ سے آج امریکہ نے ایک مرکز ثقل کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جب کہ دیگر تمام ممالک اس کا طواف کرتے نظر آتے ہیں، مرکزیت کے اس مقام پر پہنچنے کے بعد ہی امریکہ کو یہ ہمت ہوئی کہ وہ جدید عالمی نظام،، دنیا کے ملکوں پر مسلط کر سکے، خواہ وہ اس کے لیے راضی ہوں یا نہ ہوں۔

(۳) مواصلات کے میدان میں انقلاب:

یوں تو انسانی تاریخ میں بہت سے انقلابات آئے ہیں، ان میں سے کچھ بے انتہا اہمیت کے حامل ہیں اور کچھ وقتی طور پر مؤثر رہے اور بعد میں تاریخ کے اوراق میں گم ہو گئے ٹکنالوجی کے میدان میں آنے والا انقلاب نہایت اہم اور نا قابل فراموش انقلابات میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ اس انقلاب نے دنیا کو حیرت واستعجاب کے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے کمپیوٹر اسی انقلاب کی دین ہے، جو موجودہ دور میں ایک سکینڈ کے اندر دنیا کے دوارب مختلف کاموں کو پورا کر رہا ہے، اگر کمپیوٹر کے بغیر وہ کام کیے جائیں، تو ان کی تکمیل میں ایک ہزار سال کا عرصہ لگ سکتا ہے، اس انقلاب کی دوسری دین مواصلاتی ترقی ہے، جس کی وجہ سے مختلف افراد، معاشرے اور ممالک ایک دوسرے سے جڑ چکے ہیں اور مواصلاتی وسائل جیسے ٹیلیفون، فیکس، ٹیلی ویژن ریڈیو، ای میل اور انٹرنیٹ وغیرہ کی مدد سے چوبیس گھنٹے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں یا یوں کہیے کہ مغرب سے مشرق میں تہذیب وثقافت کی منتقلی ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے عالم گیریت برق رفتاری سے عالم کے افق پر پھیلتی نظر آ رہی ہے۔

(http//:www.ummah.com:مقالہ:العولمۃ الحقیقۃ والأبعاد)

پس پردہ ادارے اور تنظیمیں:

اتنا تو ’’جدید عالمی نظام‘‘ کے بانیوں کو بھی معلوم تھا کہ دنیا کو اس نظام کے تابع کرنا کوئی آسان کھیل نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے جہاں اقتصادی راہ داریوں کا استعمال کرنا ضروری ہے، وہیں سیاست، ثقافت اور ذرائع ابلاغ کے شعبوں میں اہم منصوبے بنا کر ان کو نافذ کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، اس لیے صہیونی سازشی دماغوں نے گلو بلائزیشن کی طرف جانے والے راستوں کو ہموار کرنے کے لیے، مختلف تنظیمیں اور ادارے قائم کیے، جنھوں نے اپنی ذمے داریوں کو کبھی پس پردہ اور کبھی کھولے بندھوں انجام دیا، ذیل میں ایسے اداروں اور تنظیموں کا مختصر تعارف دیا جا رہا ہے، جنھوں نے پردے کے پیچھے سے عالم گیریت کے نشوونما کے لیے اہم کردار کیا ہے۔

بلڈر برج BILDERBERG:

یہ دنیا کی انتہائی طاقت ور اور خفیہ عالمی تنظیم ہے، جس کو ۱۹۵۴ء میں سوئڈن‘‘ سے تعلق رکھنے والے ایک سرمایہ دار ’’جوزف رٹنگر‘‘ (JOSEPH H. RETINGE) نے قائم کیا تھا، اس تنظیم کا سب سے پہلا اجلاس مئی

۱۹۵۴ء کو ہالینڈ کے شہر اوسٹر بیک (OOSTERBEEN) میں بلڈر برج نامی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت ہالینڈ کے شہزادے ''برنہارڈ'' نے کی تھی، اسی اجلاس میں اس خفیہ عالمی تنظیم کا نام ہوٹل کے نام پر ''بلڈر برج'' تجویز کیا گیا، عام طور پر ۱۱۵ افراد اس کے ممبر رہتے ہیں، جن میں کچھ بین الاقوامی سیاسی شخصیات ہوتی ہے، جن کی تعداد کل ممبروں کی ایک تہائی ہوتی ہے، جب کہ باقی دو تہائی لوگ بین الاقوامی سطح پر اقتصادی، تعلیمی اور صنعتی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے ارکان بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، مستقل رکنیت رکھنے والے، جیسے بدنام زمانہ امریکن یہودی وزیر خارجہ، ہنری کیسنجر، جب کہ غیر مستقل رکنیت رکھنے والوں کو اس کے اجلاس میں دعوت نامے جاری کرکے مدعو کیا جاتا ہے، ۲۰۰۰ء میں اس تنظیم کے سربراہ، ناٹو، کے سابق سکریٹری جنرل، لارڈ گیر نگٹن، تھے اس تنظیم کے جلسوں کے لیے عام لوگوں کی نظروں سے دور عالی شان ہوٹل بک کرلیا جاتا ہے، جس میں یہ جلسے تین روز تک جاری رہتے ہیں، اس دوران کوئی رکن ہوٹل سے باہر نہیں آسکتا، سکیورٹی کے انتظامات امریکی خفیہ سی آئی اے، کے علاوہ یورپی ممالک کی خفیہ تنظیمیں بھی کرتی ہیں۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ گزشتہ بیس سالوں کے دوران امریکہ اور برطانیہ میں، سیاسی طور پر کامیابی کے لیے اس خفیہ تنظیم سے وابستگی لازم ہوچکی ہے، امریکہ کے بہت سے صدر اس تنظیم کی رکنیت کے بعد ہی کرسی صدارت تک پہونچ سکے ہیں، جن میں رونالڈ ریگن، جمی کارٹر، جارج بش اور بل کلنٹن قابل ذکر ہیں، برطانیہ کی سابقہ وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے ۱۹۷۵ء میں اس تنظیم کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی تھی، ٹھیک چند سالوں بعد وہ برطانیہ کی وزارت عظمی کے عہدے پر فائز ہوگئیں، اسی طرح اشتراکی خیالات کا حامل ایک برطانوی نوجوان سیاست داں ''ٹونی بلیر'' گم نامی کے انتہائی نچلے درجے میں پڑا ہوا تھا، برطانیہ جیسے سرمایہ دار ملک میں اشتراکی نظریات کا اخذ کرنا اپنے آپ کو سیاسی موت سے ہم کنار کرنے کے مرادف ہے، مگر جلدی ہی یہ نوجوان اپنی فکر سے تائب ہوکر ''بلڈر برج'' کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرتا ہے اور یکا یک شہرت کی بلندی پر پہنچ کر، چار سال کے بعد برطانیہ کا وزیر اعظم بن جاتا ہے۔

۱۹۹۸ء میں اس کا اجلاس اسکاٹ لینڈ کے ''ٹو نبری ہوٹل'' میں منعقد ہوا جس میں چند مغربی صحافیوں نے داخل ہونے کی کوشش کی، مگر انھیں اس سلسلے میں مکمل طور پر کامیابی حاصل نہ ہوسکی، مگر پھر بھی جس حد تک انھیں اس اجلاس کا ''ایجنڈا'' سمجھ میں آسکا، اسے انھوں نے New World Order Intelligence Update (نیو ورلڈ آرڈر انٹیلی جنس اَپ ڈیٹ) کے نام سے شائع کیا ''میٹرکس'' (Matrix) کے مینیجنگ ایڈیٹر ''چارلس اوربیک'' نے لکھا ہے کہ:

''اس اجلاس میں دنیا کے اہم اور حساس علاقوں کے بارے میں فیصلے لیے گئے ہیں، اس سلسلے میں ''سی آئی اے'' کے سابق ڈائریکٹر ''جان ڈوئیچ'' اور امریکی ریاست ''نیوجرسی'' کے گورنر ''کریسٹن ٹیڈوائٹ'' کو یہ ذمے داری سونپی گئی ہے کہ وہ اندازہ لگائیں کہ ''جدید عالمی نظام'' کے زیر سایہ کس طرح دنیا میں مغرب کی سیادت قائم ہوسکتی ہے۔''

"اوربیک" آگے لکھتے ہیں کہ:

"اس میں شرکت کرنے والے بہت سے ارکان کی قومیت تک کا پتا نہیں چلتا مگر اس کے اجلاس میں منظور کردہ قراردادوں کا اطلاق دنیا کی بہت سی حکومتوں، سیاسی نظاموں، عالمی تجارت اور دنیا میں پھیلے ہوئے دولت کے ذخائر پر ہوتا ہے"۔ (مدینے سے وائٹ ہاؤس تک: از محمد انیس الرحمن ص: ۱۶۸ تا ۱۶۷ مطبوعہ لاہور)

راکفلر فاؤنڈیشن:

عالمی نظام کے قیام میں روز اول ہی سے جن اداروں نے مالی مدد کا بیڑا اٹھایا ہے، ان میں راکفلر فاؤنڈیشن کا نام سب سے پہلے آتا ہے، یہ ادارہ خیراتی ادارے کا لیبل لگا کر ٹیکس سے چھٹکارا پا چکا ہے، امریکی سینٹ نے ۱۹۵۲ء میں قرارداد ۱۶۵ کے ذریعے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی، جس کا مقصد یہ جائزہ لینا تھا کہ اس ادارے کی رقمیں کہیں امریکہ کے خلاف تو استعمال نہیں ہو رہی ہیں (جائزے سے پتہ چلا کہ یہ ادارہ یورپ و امریکہ میں یہودی مفادات کے لیے سرگرم عمل ہے) اس ادارے کی بے شمار ذیلی تنظیمیں بھی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق نظر آتی ہیں لیکن ہر ایک کے مقاصد اور میدان عمل متعین ہیں۔ "بلڈر برج" تنظیم کے سالانہ جلسوں کے بے پناہ اخراجات بھی یہی ادارہ (جو دراصل امریکہ کی سب سے بڑی تجارت کمپنی ہے) برداشت کرتا ہے۔ (مدینے سے وائٹ ہاؤس تک، ص: ۱۷۳)۔

امریکی کلیسا کی تنظیم:

۱۹۰۸ء میں "ہنری فواڈ" اور "روننگس" نے اس ادارے کو قائم کیا، راکفلر فاؤنڈیشن نے مالی امداد فراہم کی، ۱۹۴۲ء میں اس ارادے نے ایسی تجاویز پیش کی تھیں، جن میں ایک ایسی عالمی حکومت کے قیام کا خاکہ تھا، جس کی فوجیں تمام ملکوں پر حکمرانی کریں اور یہ عالمی حکومت ایسا مالیاتی نظام وضع کرے، جو عالمی بنک کے ماتحت ہو، ۲۳/اگست ۱۹۴۸ء کو اس تنظیم کا نام عالمی کلیسا کر دیا گیا۔ (مغربی میڈیا ص: ۹۷)

تعلقات خارجہ کمیٹی C.F.R.:

۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیانی عرصے میں "رہوڈس سیشل" (یہودی) کے دوستوں نے اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی، اس وقت اس کے مقاصد بہت خفیہ رکھے گئے تھے، ۱۹۲۱ء میں "روتھشیلڈ بنک" کے نمائندے برائے امریکہ مسٹر "جی آر مورگن" نے "جان راکفلر" "برنارڈ باروخ" (متعدد امریکی صدور کے یہودی مشیر خصوصی) "پال واربرگ" "جیکب شیف" اور "آٹو کہن" نے اس ادارے کی مالی۔ C.F.R. کے بانی ارکان میں کرنل "ایڈورڈ مانڈیل ہاؤس" (امریکی صدر ولسن کے معاون) "والٹر لیپ مین" (امریکی صحافی) "جان فاسٹر ڈلس" (امریکی صدر آئزن کے وزیر خارجہ) "ایلن ڈلس" (سی آئی اے کے ڈائریکٹر) اور "کریسچن ہرٹر" (امریکی وزیر خارجہ) شامل تھے

c.f.r۔ کی نگرانی میں ''فارن افیرز'' نامی رسالہ شائع ہوتا ہے، اس رسالے کے ایک شمارے میں ''تحقیقات'' کے تحت ایک مقالہ لکھا گیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

''جدید عالمی نظام کی طرف ہماری نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔''

اس تنظیم کی طاقت کا اندازا اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی وزیر دفاع کے معاون ''جان میکلولے'' کا کہنا ہے کہ:

''امریکی حکومت کے دفاتر میں جب بھی ملازمین کی ضرورت ہوتی ہے، تو ہم سب سے پہلے C.F.R. کے کارکنوں کی فہرست دیکھتے ہیں اور فوراً نیویارک میں واقع اس کے مرکزی دفتر سے رابطہ قائم کرتے ہیں''۔

امریکی نظام حکومت کو چلانے والی تمام اہم شخصیتوں کا تعلق اسی ادارے سے ہوتا ہے، جو یہودی مقاصد کو بہ روے کار لانے کے لیے سرگرم عمل رہتی ہیں، اس کا اندازا چند مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے:

(۱) اقوام متحدہ کی تشکیل میں مدد دینے کے لیے، امریکی حکومت نے ۴۷ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی تھی، اس کمیٹی میں ''جان فاسٹر ڈلس''، ''نیلسن راکفلر'' اور ''ایڈلائی اسٹیونسن'' بھی تھے، یہ تمام ۴۷ ارکان C.F.R. کے ممبران تھے۔

(۲) امریکی صدر ''رونالڈ ریگن'' کے دفاتر میں کام کرنے والے تین سو تیرہ ذمے دار اسی ادارے کے رکن تھے، یہی صورت جارج بش کے دفتر میں بھی تھی، جہاں تین سو ستاسی افسران اسی ادارے سے منتخب ہو کر آئے تھے، ۱۹۳۱ء سے اب تک ۱۸ وزرائے مالیات میں سے ۱۲ کا تعلق R. F. C. سے تھا، سولہ وزرائے خارجہ میں سے بارہ، جب کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک پندرہ وزراے دفاع میں سے نو، اسی ادارے سے لیے گئے۔

(۳) ۱۹۵۲ء سے اب تک (بجز ۱۹۶۴ء) دونوں سیاسی پارٹیوں سے جتنے امیدواروں کو صدارتی میدان میں اتارا گیا ہے، ان کا تعلق اسی ادارے سے تھا۔(۱) مغربی میڈیا ص:۵۷ تا ۹۹ اضافہ شدہ ایڈیشن۔

عالم گیریت کیا چاہتی ہے؟

گلوبلائزیشن کے مغربی داعی اور ان کے مشرقی کارندے، اس فکر کے حوالے سے بڑے بلند و بانگ دعوے کرتے پھرتے ہیں، مثلاً: عالم گیریت اقتصادی ترقی اور معاشی فروغ کی ضامن ہے، ہر قوم اس کے سایے میں اپنا مستقبل سنوار سکتی ہے، ہر انسان اس کے ذریعے شاندار زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ جدید ٹکنالوجی کے پھیلاؤ کا ذریعہ ہے، جس کے نتیجے میں انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے معلومات کا حصول نہایت آسان ہو جاتا ہے، عالم گیریت بیرونی بازاروں میں قسمت آزمائی کا موقع فراہم کرتی ہے، اس سے غیر ملکی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوتا ہے اور قومی اقتصادیات ترقی کے زینے طے کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن حقیقت یہ کہ عالم گیریوں کے یہ دعوے کھوکھلے ہیں، ان دعوؤں کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے،

ڈاکٹر محمد حسن رسمی (قاہرہ یونیورسٹی میں شعبہ کمپیوٹر کے ڈائریکٹر) کے بقول:

گلوبلائزیشن ایک اندھا طوفان ہے، جو اپنی راہ میں آنے والی کسی بھی چیز کو برداشت نہیں کرتا، اس کا نظام طاقت وروں کے لیے مددگار ہے اور کمزوروں کے لیے مہلک، یہ نظام اپنے بانیوں کو اجارہ داری اور بالا دستی عطا کرتا ہے اور آسمانی معجزات کا انتظار کرنے والوں کے مستقبل کی باگ ڈور اپنے پالیسی سازوں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے"۔(مع العولمۃ اخبار الھرام ۲۰۰۱/۹/۱۶)

چند ایسے ممالک بھی ہیں جو گلوبلائزیشن کے خطرات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس نظام سے غریب ممالک کی غربت ہیں، اضافہ ہوگا اور وہ سب مغربی سرمایہ دارانہ پالیسیوں کے تابع ہو جائیں گے، اس جیسے ملکوں میں "ملیشیا" کا نام سرفہرست ہے وہاں کے وزیر اعظم مآثر محمد ہر میدان میں اسلامی بیداری کے قائل ہیں اور مغربی بالا دستی کو مسترد کرتے ہیں آج ان کے خیالات اور کوششوں کی وجہ سے مغربی سرمایہ داروں کی نیندیں حرام ہیں، "مآثر محمد "ملیشیا کی دارالحکومت "کوالالمپور" میں منعقدہ "اسلامک کانفرنس" کے اجلاس میں عالم اسلام کے وزرائے خارجہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"عالمی تجارتی تنظیم عالم گیریت کی آلہ کار ہے جو ترقی یافتہ ممالک کو اجازت دیتی ہے کہ وہ ترقی پذیر ممالک کو پوری طرح نگل لیں"۔(مع العولمۃ از صالح الرقب :ص ۱۴)

فرانسیسی صدر "جاک شیراک" نے فرانس کے قومی دن (۱۴ جولائی ۲۰۰۰ء) کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"گلوبلائزیشن پر روک لگانے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ معاشرتی انتشار کا باعث ہے عالم گیریت سے اگر چہ ترقی کی راہ ہموار ہوتی ہیں لیکن اس کے خطرات زیادہ ہیں جن میں پہلا خطرہ یہ نظام معاشرت پر براہ راست حملہ کرتا ہے دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے عالمی جرائم میں اضافہ ہوتا ہے اور تیسرا خطرہ یہ ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے سوا ہر اقتصادی نظام کے مخالف ہے۔"

(رسالہ :الحوادث، مستقبل الصحافۃ العربیۃ فی ظل العولمۃ ،از محمد سماک، عدد ۱۰ ۲۳ ،ص: ۶۳)

مشہور امریکی مصنف "ولیم گریڈر" ۱۹۷۷ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب one world Ready Or No ? میں عالم گریت کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

یہ ایک عجیب وغریب طریقہ کار ہے، جو عالمی صنعتی وتجارتی انقلاب کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوا ہے، یہ جہاں ترقی کا ذریعہ ہے، وہیں تباہی کا بھی سبب ہے، یہ نظام عالمی حدود سے لاپرواہ آگے بڑھتا ہے"۔

(العولمۃ، از صالح الرقیب :ص ۵)

درحقیقت عالم گیریت ایک ذہین وطاقت ور انسان اور ایک غبی وکمزور شخص کے درمیان ہونے والا معاملہ ہے، جن میں ایک فریق تو ہر چیز کا مالک ہے۔ اور دوسرا حق ملکیت سے بھی محروم ہے۔ جہاں ایک فریق کو آقا کی حیثیت

حاصل ہے اور دوسرے کو غلام کی ایک اپنی تہذیب پر فخر کرنے والا اور اس کو اپنے الاخری نام یہ جملے والا ہے۔تو دوسرا اپنی تہذیب سے ناطہ توڑنے پر مجبور ہے۔ایک اپنے عقیدے پر مضبوطی سے جما ہوا ہے۔تو دوسرے سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو پس پشت ڈال دے۔غرض یہ کہ اس نظام میں ایک فریق سب کچھ ہے اور دوسرا فریق کچھ نہیں۔

عالم گیریت کے مختلف میدان ہائے عمل:

گلوبلائزیشن کے پالیسی سازاداروں نے،چوں کہ اس تحریک کو ایک مکمل نظام حیات بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے،تاکہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا باقی نہ بچے،جو اس صہیونی تحریک سے متاثر نہ ہو،اس لیے جدید عالمی نظام کے پسِ پردہ کارفرما دماغوں نے،اس نظام کو مختلف حصوں میں تقسیم کردیا اور ہر میدان کے لیے کھلاڑیوں کی الگ الگ ٹیمیں بھی تیار کردیں،تاکہ تمام میدانوں میں عالم گیریت قابل عمل بن جائے،بنیادی طور پر جدید عالمی نظام کو مندرجہ ذیل میدانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱)سیاست(۲)اقتصاد(۳)تہذیب وثقافت(۴)معاشرہ واخلاق(۵)زبان وادب

ان سبھی میدانوں کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا ربط ہے،کیوں کہ عالم گیریت کا حقیقی مقصد پوری دنیا کو امریکی،بلکہ صہیونی رنگ میں رنگ دینا اور سارے عالم پر امریکہ کے ذریعے یہودی اقتدار قائم کرنا ہے،لہٰذا جہاں سیاسی میدان میں دنیا کے نقشے پر تبدیلیاں لانا ضروری ہے،اور سیاسی طور پر ترقی پذیر ممالک کو بے دست وپا بنانا ناگزیر ہے،وہیں اس مقصد کے حصول کے لیے اقتصادی میدان میں بھی ترقی پذیر دنیا کو مغلوب کرنا اور اس راہ سے غریب ممالک پر اجارہ داری قائم کرنا بھی ضروری ہے۔اسی طرح اپنی اجارہ داری کو دوام بخشنے کے لیے ترقی پذیر دنیا پر مغربی بالخصوص امریکہ تہذیب وثقافت اور اقدار کا تسلط بھی ضروری ہے۔تاکہ اس دنیا کے عوام جب مغربی تہذیب وثقافت کو اپنالیں تو مغرب سے آنے والی ہواؤں کے جھونکوں میں ہی راحت محسوس کریں وہاں کی طرز زندگی کو ہی معیار سمجھیں اور وہاں کی سکونت ورہائش کو ہی اپنی تمناؤں کا محور قرار دیں،مغرب سے آنے والی ہر چیز کو سینے سے لگائیں اور استعمال کو ہی فیشن اور اعلی طرز زندگی کی علامت سمجھیں،تہذیب وثقافت کی راہ داری ہی سے،اقتصادیات کے میدان میں ترقی یافتہ ممالک اور خاص طور پر امریکہ کا تسلط نہایت آسان ہوسکتا ہے۔

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کا ایک تنقیدی جائزہ:

"ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن" کی بنیاد جن اصولوں پر قائم ہے،ان کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی بھی باشعور انسان یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرے گا،کہ یہ تنظیم ایک جانب دارادارہ ہے،جس سے مغربی مفادات وابستہ ہیں،یہ تنظیم غیر ترقی یافتہ ممالک کو اقتصادی اعتبار سے مستحکم ہونے میں کوئی مدد نہیں دے سکتی اور نہ یہ اس کے مقاصد میں شامل ہے۔

W.T.O. کا دعوی ہے کہ اس کا مقصد آزاد تجارت کو فروغ دینا ہے اور ہر تاجر کے لیے،تمام ممالک کے تجارتی دروازوں کو کھول دینا ہے،حالاں کہ یہ تجارتی تنظیم درحقیقت غیر ترقی یافتہ ممالک سے تو اپنے دروازے کھولنے کا

مطالبہ کرتی ہے، لیکن لیڈروں نے مغربی ممالک کے تجارتی دروازوں پر تیسری دنیا کی کمپنیوں کے لیے پہرا بیٹھا رکھا ہے ،اور ایسے قوانین وضع کر رکھے ہیں کہ تیسری دنیا کی کمپنیوں کے لیے مغربی ممالک اور امریکہ میں داخلہ نہایت مشکل ہو جائے ۔آزادانہ تجارت میں ہر شخص کو کہیں بھی ملازمت اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، لیکن ممالک مشرق کے ذہین وفطین نوجوانوں کو تو لالچ دے کر اپنے ملکوں میں کھینچ لیتے ہیں ،حال آں کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی تعمیر وترقی میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دے سکتے ہیں، جب کہ بقیہ افراد کو ان ممالک میں داخلے کی اجازت نہیں ہوتی، ہندوستان کے سابق وزیر خزانہ اور موجودہ وزیر خارجہ ''یشونت سنہا'' نے ۲۵/جنوری ۲۰۰۱ء میں ورلڈ اکنامک فورم، کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: گلوبلائزیشن ہمارے لیے ایک شکست اور غیر منصفانہ عمل ہے۔ جس کا مقصد ترقی یافتہ ممالک کا اپنے بازاروں کی حفاظت کرنا ہے، جس انداز سے ان کے بازاروں کی حفاظت ہو رہی ہے، اس سے لگتا ہے کہ وہ گلوبلائزیشن کو اپنا ہتھیار بنا کر استعمال کر رہے ہیں، وہ اپنی ایمیگریشن (ترک وطن) پالیسی کو بھی اس انداز سے تیار کر رہے ہیں، جس ترقی پذیر ممالک کے ترقی کے منصوبوں پر کاری ضرب لگ رہی ہے، وہ ترقی پذیر ممالک کے ذہین وفطین اشخاص کو لالچ دے کر اپنے ملکوں میں بھر رہے ہیں، آنے والے چند سالوں میں شمالی دنیا نوجوانوں اور فعال عملے کی سخت کمی محسوس کرے گی''۔

(۱) اخبار ۲۶ Times of India/جنوری ۲۰۰۱ء، ص ۱، بہ حوالہ: مقالہ Globlization From The Perspective of Islam and modemity از عاطف سہیل دیوبندی۔ (یہ مقالہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملیشیا میں پی ایچ ڈی کے لیے ترتیب دیا جا رہا ہے)۔

''باب سٹکلف'' (Bob Sutkliff) اس الزام کو مبنی بر حقیقت دیتے ہوئے اپنی کتاب (Globalization Fleedom to Man in the Age of) میں لکھتا ہے کہ:

غریب اور ترقی پذیر ممالک اپنے معیار کو بلند کرنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی ایمگریشن پالیشن پر منحصر ہوگے،ان کے یہاں کا فعال اور متحرک طبقہ دولت مند ممالک کا رخ کرتا ہے اور وہاں معاش کے آسان ذرائع تلاش کرتا ہے''۔(ایضاً)

عالمی تجارتی تنظیم کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد تاجروں کے درمیان مبنی برانصاف مقابلہ آرائی کو بڑھاوا دینا ہے، لیکن درحقیقت دس بازار میں یہ مقابلہ آرائی ہوتی ہے، وہاں ایک فریق نہایت مضبوط اور دوسرا فریق نہایت کمزور ہے، کیا ایسی مقابلہ آرائی کو مبنی برانصاف کہا جا سکتا ہے؟؟؟

اس تنظیم کا دعوی ہے کہ اس کا مقصد تجارتی میدان میں یکساں عالمی اصول ،قوانین اور اقدار کو رائج کرنا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ ان قوانین کو وضع کرنے والا کون ہے؟ ان اصول واقدار کو حیثیت دینے والا کون ہے؟ مغربی ترقی یافتہ ممالک کے علاوہ اور کوئی نہیں، ترقی پذیر مملک کے ذمے تو بس اتنا ہے کہ وہ ان قوانین اور اصولوں کے سامنے سر جھکا دیں اور خاموشی سے ان کو تسلیم کرلیں۔

تنظیم کے لیڈران کا کہنا ہے کہ یہ "اورگنائزیشن" دراصل تمام ممالک کے درمیان باہمی گفتگو اور مذاکرات کے لیے ایک انجمن کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر کمپنیوں کے درمیان مذاکرات کیسے ممکن ہیں؟ جب کہ دونوں فریقوں کے درمیان مادّی اعتبار سے اتنی ہی دوری ہے، جتنی کہ زمین و آسمان کے درمیان، ان کمپنیوں کے درمیان اتنی گہری مادی خلیج ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے گفتگو اور مذاکرات کا تصور بھی محال ہے کیوں کہ بعض امریکی کمپنیوں کا بجٹ بہت سے ترقی پذیر ممالک کے قومی بجٹ سے بھی زائد ہے۔

اس ادارے کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ تجارتی تنازعوں کو سلجھانے کے لیے ایک عدالت کے مانند ہے لیکن اس تنظیم اور اس کے ججوں کی غیر جانب داری کی ذمے داری کون لے سکتا ہے؟ کو اس بات کا ضامن ہے کہ آرگنائزیشن کے قائدین، جو سب کے سب مغربی ہیں جانب دار نہیں ہیں؟ (رسالہ: البیان: عدد ۱۷۰/ص ۵۶)

ان سب سوالات کی موجودگی میں یہ ادارہ، جو کہ اقتصادی عالم گیرت کا سب سے بڑا نقیب اور داعی ہے اور اس ادارہ میں مغربی طاقتوں کا سب سے زیادہ مدد و معاون ہے، کسی بھی طرح انصاف پر وراور اپنے دعووں میں کھرا نہیں اتر سکتا، بلکہ اس کے بنیادی چارٹر میں اتنی ترمیم ناگزیر ہے کہ اس کا مقصد ایک ہی منڈی میں امیر اور غریب ممالک کے درمیان مقابلہ آرائی کرنا ہے، تا کہ یہ مقابلہ برابری کا نہ ہو، نتیجۃً مالدار ممالک کی مال داری میں اضافہ ہو اور غریب ممالک کی غربت میں، ترقی پذیر ممالک ہمیشہ ترقی کا خواب دیکھتے رہیں اور ترقی یافتہ ممالک برق رفتاری سے ترقی کے منازل طے کرتے رہیں، تیسری دنیا کا سفر پیچھے کی طرف ہو، اور مغربی دنیا آگے کی طرف بڑھتی رہے اور اس سفر میں غریب ممالک کے باشندوں کی روزی روٹی کے ساتھ ساتھ ان کے خون پسینے کا بھی استحصال کیا جاتا رہے۔

ملٹی نیشنل کمپنیاں عالمی دولت کی اصل مالک:

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ گزشتہ نصف صدی سے اقتصادی گلوبلائزیشن کو رواج دینے کی خاطر، مغرب اور امریکہ نے آزادانہ تجارت اور اقتصادی کھلے پن کا نعرہ بلند کیا ہے، اس مقصد کے لیے جہاں مختلف ممالک کے درمیان معاہدے کرائے گئے، وہیں آزادانہ تجارت کو پوری دنیا میں فروغ دینے کے لیے مختلف تنظیموں کا قیام عمل میں آیا (جن پر تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے) اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا ادارے اور معاہدے اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہے؟ آزادانہ عالمی تجارت کو کہاں تک فروغ حاصل ہوا؟ آزادانہ تجارت کے نتیجہ میں کس کو فائدہ ہوا اور کس کو نقصان؟

مغرب نے نصف صدی قبل آزادانہ تجارت کا نعرہ بلند کیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ملک کی کمپنیاں دوسرے کسی بھی ملک میں سرمایہ کاری کریں، کارخانے قائم کریں، مصنوعات تیار کریں اور وہاں فروخت کریں، اس غیر ملکی اور براہِ راست سرمایہ کاری کو (Foregn Direct Investement) (فارن ڈائریکٹ انوسمنٹ) کہا جاتا ہے، آسانی کے لیے (FDI) بھی بولا جاتا ہے۔

گلوبلائزیشن اسلام مخالف:

عالم گیریت محض سیاسی یا اقتصادی تحریک ہی کا نام نہیں ہے؛ بل کہ یہ براہ راست اسلام پر بھی حملہ ہے، اس لیے کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے، جو اپنی صفت عالمیت کی وجہ سے گلوبلائزیشن کے فتنے کا مقابلہ کرسکتا ہے، ورنہ آج کے دور میں کوئی مذہب اور کوئی تحریک ایسی نظر نہیں آتی، جو اس کے سامنے سدِّ سکندری ثابت ہوسکے، لہٰذا عالم گیریت کے پالیسی ساز اداروں کے منصوبوں میں، جہاں سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور معاشرتی میدانوں میں اپنے مقاصد اور مفادات کا حصول شامل ہے، وہیں اسلام کو کمزور کرنا اور اس پر یورش کرنا بھی ان کی اوّلین ترجیحات میں داخل ہے، گلوبلائزیشن اسلام کے خلاف علی الاعلان، جو سازش کررہا ہے، آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

(۱) عالم گیریت کی وہ کوشش ہے کہ مسلمانوں کے دینی عقائد میں شکوک وشبہات پیدا کردیے جائیں، تاکہ مسلمان اپنے مذہب کا سہارا نہ لے سکیں، جو دراصل ان کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

(۲) مغربی مادّیت پرست اور ملحدانہ افکار وخیالات کو زیادہ سے زیادہ رواج دینے کے مقصد سے، مسلمانوں کے مقامات مقدّسہ کو مغربی طاقتوں کے زیر اثر کردیا جائے، تاکہ مسلمانوں کے پاس کوئی مرکز نہ رہے۔

(۳) ہر ملک میں اسلامی عقیدے کی جگہ مادّی فلسفے کو مسلط کردیا جائے، تاکہ مسلمان اسلامی عقیدے سے کوئی روشنی نہ پاسکیں۔

(۴) اسلام کو حکومت اور سیاست سے بے دخل کردیا جائے اور مغربی اقدار پر مبنی "سیکولر" فلسفے کی بنیاد پر، حکومتوں کی تشکیل کی جائے۔

(العولمة امام عاصفة الشريعة الإسلامية: از ڈاکٹر عمر الحاجی طبع اول، دار المکتبی دمشق: ص ۱۵)

آج ہر مسلم ملک میں ایسی تنظیمیں اور ادارے قائم ہیں، جو آزادی، جمہوریت اور حقوق انسانی کے نام پر، اسلامی شریعت کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہیں، ان اداروں کو فکری اور مادی طور پر مغرب کی حمایت حاصل ہے، ان کا مقصد اسلامی تہذیب وثقافت کی مخالفت کرنا، اسلامی قوانین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، مرد وعورت کے درمیان تعلق اور مسلم عورت کے مسائل کے حوالے سے، اسلام پر نکتہ چینی کرنا ہے، بعض مسلم ممالک میں تو اس قسم کے اداروں نے حکومتوں سے علی الاعلان یہ اپیل بھی کی ہے کہ انسانی حقوق کے سلسلے میں، اقوام متحدہ کی پاس کردہ قرار دادوں کی روشنی میں قوانین بنائے جائیں اور اسلامی شریعت کو اس طرح کے قوانین سے دور رکھا جائے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک امر یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کے قائدین براہ راست اسلامی اصولوں پر حملہ کررہے ہیں، ان کی تمام تر کوششیں اس بات پر صرف ہورہی ہیں کہ کسی طرح اسلام کے مسلمہ عقائد کا وجود ہی ختم کردیا جائے، حتی کہ روئے زمین ان کے ماننے والوں اور ان پر عمل پیرا ہونے والوں سے خالی ہوجائے، اسی لیے ایسے حساس موضوع پر جو بھی منفی انداز میں قلم اٹھاتا ہے، اس کو مغرب کی مکمل حمایت حاصل ہوتی ہے۔ حال ہی میں عالم عرب سے تعلق رکھنے والے تین ملحد قلم کار ابھرے ہیں، ان میں سے ایک "محمد شحرور" "سوریا (شام)" سے، "محمد سعید العشماوی" "مصر" سے، اور "محمد ارکون

"الجزائر سے تعلق رکھتے ہیں ان تینوں نے اسلامی اصولوں اور قوانین میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے اسلامی عقائد، حدود، میراث اور خاندانی قوانین کو، زمانہ جاہلیت کا ردعلم ثابت کرنے کی مذموم سعی کی ہے، ان کا مقصد لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانا ہے، کہ یہ قوانین جدید دور سے ہم آہنگ نہیں ہیں، ان تینوں مصنفین کی کتابوں کے منظر عام پر آجانے کے بعد، انہیں مغرب کی پناہ حاصل ہوگئی، حتی کہ سابق امریکی انتظامیہ کی وزارت خارجہ کے ترجمان 'بیلفرو' نے تینوں کی خوب مدح سرائی کی اور انہیں روشن خیالی کا تمغہ عطا کیا۔ (ایضاً)۔ دراصل عالم گیریت کے قائدین کو یہ معلوم ہے اسلام میں، چوں کہ اس کا نعم البدل بننے اور ہر سطح پر اس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے، اس لیے اسلام کو محض ایسا مذہب بنا دیا جائے، جو چند ارکان کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہو، عملی زندگی میں اس کا کوئی کردار نہ ہو۔

اسلام ابتدائے آفرینش سے عالمی مذہب:

اسلام کی تعلیمات پر اگر غور کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق صرف ان ہی لوگوں سے نہیں ہے، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، بل کہ جب سے دنیا قائم ہے اس وقت سے ان تعلیمات کا وجود ہے، ہر نبی اور ہر رسول، اللہ کی جانب سے وہی پیغام لے کر آیا ہے، جس کی تجدید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے لے کر خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک، ہر نبی نے اسلام کی دعوت دی ہے، تو غلط نہ ہوگا، بل کہ قرآن وسنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ، وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا۔ (البقرۃ: ۲۱۳)

ترجمہ: سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، جو کہ خوش خبری سناتے تھے اور ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ آسمانی کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں، اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ میں فیصلہ فرمادیں۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ارشاد ملتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت نوح اور آدم علیہما السلام کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، اس عرصے میں سبھی لوگ ایک ہی مذہب پر عمل پیرا تھے"۔ (تفسیر ابن کثیر: ج ۱/ص ۲۵۱)

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد، انبیائے بنو اسرائیل نے بھی اسی اسلام کی دعوت دی، جس کی دعوت ان سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت نوح سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام دے چکے تھے۔

ارشاد ربانی ہے: وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔ (الاسراء: ۲۳)

ترجمہ: اور تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اس کے، کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ الاخری ۱۴۴۳ھ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی دعوت کی تجدید فرمائی اور اسی اسلام کی طرف لوگوں کو بلایا جس کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام انبیا پوری انسانیت کو بلا چکے تھے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وماأرسلنامن قبلك من رسول إلانوحي إليه أنه لا إله إلاأنافاعبدون۔ (الأنبياء: ۲۵)

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا، جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو، کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری (ہی) عبادت کیا کرو۔

ان آیات قرآنیہ کی روشنی میں یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی دعوت کوئی نئی دعوت نہیں، بل کہ روئے زمین پر آنے والے ہر نبی نے، اسی اسلام کی دعوت دی ہے، جس کی تجدید کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور یہ اسلام چوں کہ ایک آفاقی اور عالمی مذہب ہے، اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ اسلام اسی روز سے عالمی ہے، جب سے یہ عالم قائم ہے اور یہ اسی وقت سے ہمہ گیر ہے، جب سے یہ کون ومکان سجایا گیا ہے۔ (گلوبلائزیشن اور اسلام)

یہ تفصیلات مولانا یاسر ندیم صاحب کی اس موضوع پر لکھی گئی عمدہ ترین کتاب "گلوبلائزیشن اور اسلام" سے ماخوذ ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ اور پڑھے لکھے کے لیے خاص طور پر علماء، طلبہ کے لیے از حد ضروری اور مفید ترین ہے۔

اب اسی سے ملتی جلتی چند مزید معلومات محمد افضل احمد صاحب کی کتاب "نظام عالم اور امتِ مسلمہ" سے نقل کی جارہی ہیں۔

مجلس اقوام متحدہ (Uno)

۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل (basel) میں یہودی دانش وروں کی کانفرس ہوئی تھی جس میں انیس ابواب پر مشتمل دستاویزات تیار کی گئی تھیں۔ اس کے گیارہویں اور انیسویں دستاویزوں میں عالمی حکومت کا خاکہ پیش کیا گیا تھا، بارہویں باب میں پریس اور دیگر ذرائع ابلاغ کو قابو میں لانے کی بات کہی گئی تھی اور سولہویں باب میں تعلیم کے ذریعے ذہنی تطہیر کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ہی ان دستاویزات کے مطابق عملی کوششیں شروع ہوگئیں۔ ان ہی کوششوں کا نتیجہ دو عالمی جنگیں ہیں۔ یہ جنگیں برپا ہی اس لیے کی گئی تھیں کہ اس کے نتیجے میں ایک نئے عالمی نظام کا ایک مرکز قائم کیا جاسکے۔ چنانچہ پہلی ہی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران امریکی صدر ولسن کے سیاسی مشیر کرنل مانڈیل ہاوس نے اپنے رفقاء کی مدد سے لیگ آف نیشنز (leangue of natins) کے خد خال متعین کئے اس خد خال کے مطابق ۱۹۱۷ء میں امریکی صدر ولسن نے امریکی قوم کے سامنے لیگ آف نیشنز کی تجویز پیش کی اور باضابطہ طور پر جنوری ۱۹۲۰ء میں معاہد

طاقتوں نے اسے قائم کر دیا۔

اس طرح لیگ آف نیشنز کے منصوبہ سازوں نے امریکہ کو مزید ہموار کرنے کے لیے امریکی حکومت کے دروبست جاری ہونے کا منصوبہ بھی بنا ڈالا۔چنانچہ حکومت کے تمام اجزاء عملیہ، مقننہ اور عدلیہ (Executive, Legislative & Judiciary) کے ساتھ ساتھ ان تمام مراکز پر بھی اپنے اثر و رسوخ قائم کرنے اور باضابطہ ان میں نافذ کرنے کی منصوبہ بندی کر لی جن کا کسی نہ کسی طور پر ان کے منصوبے سے تعلق تھا۔اس مقصد کے حصول کے لیے کرنل ایڈورڈ مانڈیل ہاوس نے خفیہ طور پر اپنے گروپ کے ساتھ امریکہ کے بجائے اپنے پرانے مرکز لندن میں مشاورتی اجلاس منعقد کیا اور فیصلہ کیا کہ امریکہ میں ''امریکی ادارہ برائے عالمی امور'' (American Association for World Affairs) نام کا ادارہ قائم کیا جائے۔پھر ۱۹۲۱ء میں اسے ترمیم کر کے ''کونسل برائے روابط خارجہ'' (Council of Foreign Relations) کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس کے ماتحت مختلف ذیلی ادارے بنائے گئے۔ان میں سے ہر ایک ادارے کے مقاصد متعین کر کے انہیں اپنے ہی ماتحت رکھا گیا، مثلاً تجارتی کونسل (Business Council) ایشین انسٹی ٹیوٹ (Asain Institute) اٹلانٹک کمیٹی (Atlantic Committee) متحدہ عالمی وفاق (Unitet World Federalist) وطنی کمیشن (Territotial Commission) وغیرہ۔

C.F.R.

کونسل برائے رابطہ خارجہ (C.F.R.) نے وجود میں آتے ہی خارجہ امور (Foreign Affairs) کے نام سے اپنا ترجمان نکالنا شروع کر دیا اس ادارے کے ارکان نے جو سب کے سب یہودی تھے امریکی حکومت کے ٹیکس مستثنیٰ (Tax Exempted) بڑے بڑے ادارے میڈیا اور بینکوں کے علاوہ ڈیموکریٹک اور ریپبلکن پارٹیوں اور اثر و نفوذ کے دوسرے مراکز پر قبضہ کر لیا۔اور پھر ڈیلی کارنیگی، فورڈ فاؤنڈیشن، راک فیلر فاؤنڈیشن اور نیویارک ٹائمز یہاں تک کہ تمام امریکی ٹی وی اسٹیشنوں پر قبضہ جما لیا۔اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جو قوم مہاجر بن کر بے سروسامانی کے عالم میں ۱۷۴۸ء میں امریکہ آئی تھی، برٹش استعماروں کے ہاتھوں ۱۷۷۶ء میں تیرہ ریاستوں کے اشتراک سے اپنی حکومت کا باضابطہ اعلان کیا تھا اور پھر جلد وہ تیرہ ریاستیں پچاس ریاستوں میں منقسم ہو گئیں اور ان کا وفاق بنا تھا۔اس طرح یہود امریکہ پر پوری حاوی ہو چکے ہیں اور امریکہ کے تمام دروبست پر طرح کنٹرول ہے۔

امریکی صدر ''روزویلٹ'' سے لے کر صدر ''رونالڈ ریگن'' تک نو امریکی صدور کے خارجہ امور کے مشیر مسٹر جان میکالے کا کہنا ہے کہ ہمیں جب بھی امریکی حکومت کے لیے کل پرزوں کی ضرورت ہوتی ہے، تو ہم سب سے پہلے C.F.R. کے مرکزی دفتر نیویارک سے رابطہ قائم کرتے ہیں، C.F.R. کے غیر معمولی اثر و نفوذ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔۱۹۵۲ء سے لے کر اب تک امریکی دونوں سیاسی پارٹیوں کریٹک (Democratic) اور ری

ریپبلکن (Repulican) نے امریکی صدارت کے لیے جتنے لوگوں کو نامزد کیا [illegible] رونالڈ ریگن کے سوا سبھوں کا تعلق C.F.R. سے تھا۔

اور رونالڈ ریگن کے C.F.R. سے تعلق نہ ہونے کا تدارک بھی اس طرح کرلیا گیا کہ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا نائب جارج بش کو بنائے جو C.F.R. کا ممتاز رکن تھا۔ ریگن کی حکومت جو تین سو تیرہ ارکان پر مشتمل تھی وہ سب کے سب C.F.R. کے ارکان تھے۔ اسی طرح بل کلنٹن نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی C.F.R. کے صدر وان کرسٹوفر کو اپنی حکومت چلانے کے لیے مطلوبہ اشخاص کی پوری آزادی دے دی۔ چنانچہ اس کی حکومت کے بیشتر ارکان F.C.R کے ممبر تھے۔

۱۴ راگست ۱۹۱۴ء کو امریکی صدر روزویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم چرچل نے ایک عالمی نظام اور دائمی قیام امن کے معاہدے پر دستخط کئے اور جنوری ۱۹۴۲ء میں چھبیس حلیف ملکوں نے ''مجلس اقوام متحدہ'' (United Nations Organisatin U.N.O.) کے چارٹر پر دستخط کئے اور اس معاہدے کی تصدیق کی۔ پھر جنوری ۱۹۴۳ء میں وزیر خارجہ کارڈویل ہیل نے اپنی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے تمام ممبر C.F.R. سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کمیٹی نے اقوام متحدہ کے قیام کی تجویز کا مکمل خاکہ بنا کر امریکی صدر کو پیش کردیا جس نے ۱۵ رجون ۱۹۴۴ء کو امریکی عوام کی سامنے اس ادارے کے قیام کا اعلان کردیا پھر ۲۶ رجون ۱۹۴۵ء کو سان فرانسسکو میں اقوام متحدہ کے چارٹر کا عمومی اعلان کیا گیا، جس پر دنیا کے پچاس ممالک نے دستخط کئے۔ اس اعلامیے میں فوجی کونسل کے قیام اور استعمال کو بھی ان ممالک نے منظور کرلیا۔ اسی طرح دستور ساز کمیٹی میں چوں کے C.F.R. کے ارکان کی غالب اکثریت تھی اس لیے تمام دفعات بلا کسی پس وپیش کے اکثریت سے منظور کرلیے گئے؛ اس طرح یہودی عالمی حکومت کی بنیاد مستحکم ہوگئی، یہاں تک کہ جون ۱۹۹۲ء میں ملکوں کے اندرونی معاملات میں باقاعدہ مداخلت کو قانونی حیثیت بھی دے دی گئی۔

پوری دنیا پر اقتدار قائم کرنے کے لیے تھوڑے ہی دنوں میں کئی ذیلی ادارے قائم کردئے گئے اور ان اداروں کو ساری دنیا میں متحرک کردیا گیا جو ظاہر ہے کہ تمام نظامت زندگی پر اپنا تسلط قائم کرنے کے موثر حربے ہیں۔ ان میں سے چند اہم اداروں کا ذکر کیا جاتا ہے:

I C A O (International Civil Aviation Organisation) 1944

I B R D (International Bank for Reconstruction and Development) 1944

F A O (Food and Agriculture Organisation) 1945

U N I C E F (United Nation Children's Education Fund) 1946

U N E S C O (United Nations Education, Scientific and Cultural Organisation) 1946

W B (World Bandk) 1946

W M O (World Meteorological Organisation) 1947

G A T T (General Agreement on Tariffs and Trades) 1947

I M O (The International Maritime Organisation) 1948

I F C (International Finance Corporation) 1956

I D O (International Development Organisation) 1960

U N C T A D (United Nations Conference on Trade and Development) 1964

U N D P (United Nations Development Programme) 1965

I L O (International Labour Organisation) 1969

U N I D O (United Nations Industrial Development Organisation) 1985

W T O (World Trade Organisation) 1995 (GATT کی جگہ)

U N G A (United Nations General Assembly)

U N S C (United Nations Security Council)

I C J (International court of Justice)

I M F (International Monetary Fund)

W H O (World Health Organisation)

I R C (International Red Cross)

N P T (Nuclear Non-Proliferation Treaty)

I A E A (International Atomic Energy Agency)

U N C S T D (United Nations Conference on Science and Technology fro Development)

U N E P (United Nations Environment Programme)

N I D O (United Nations Industrial Development Organisations)

I C P D (International Conference on Population and Development) etc

مذکورہ بالا ادارے براہ راست اقوام متحدہ کے ماتحت یہودی عالمی حکمرانی کے لیے کام کرتے ہیں۔ان کے علاوہ ساری دنیا پر اقتدار کے قیام اور استحکام کے لیے مختلف قسم کے این جی اوز (Non Governmental Organisations) (N.G.O.s) کا پوری دنیا میں ایک زبردست، ہمہ جہت اور ہمہ گیر جال پھیلایا ہوا ہے۔

مثلاً:

ہیومن رائٹس کمیشن H.R.C (Human Rights Commission)

ہیومن رائٹس واچ H.R.W. (Human Rithts Watch)

ایمنسٹی انٹرنیشنل	Amnesty International
ریڈ کراس	Red Cross
ریڈ کریسنٹ	Red Crescent
ایکشن ایڈ	Action Aid
پاپولیشن کونسل	Population Council
پریزنرز آف وار	P.O.W. (Prisoners of War)
ارلی چائلڈ ہوڈ کیئر اینڈ ڈیولپمنٹ	E.C.C.D. (Early Child Hood Care and Development)
ورلڈ فوڈ پروگرام	W.F.P. (World Food Programme)
چائلڈ ریلف اینڈ یو	C.R.Y. (Child Relief and you)
سیو دی چلڈرن	Save the Children
یونائیٹڈ اسٹیٹس ایجنسی برائے صنعتی ترقی	U.S.A.I.D. (United States, Agency for Industrial Development)
ڈپارٹمنٹ فار انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ	D.F.I.D. (Deptt for International Development)

وغیرہ این جی اوز کی شاخیں دنیا کے ہر ایک خطے اور علاقے میں پھیلا دی گئی ہیں، حتی کہ انسانی معاشروں کی تمام اکائیوں تک پہنچا دی گئی ہیں۔

اس قسم کے تمام ادارے دراصل دو قسم کے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ایک یہ کہ یہ ساری دنیا سے ہر قسم کی خبریں یہودوران کے مختلف مراکز کو پہنچانے کے بہت بڑے ذرائع ہیں، گو کہ ان اداروں کے قیام وعمل کے مقاصد کچھ اور ہی بتائے جاتے ہیں، اور اس تعلق سے ان کی کچھ کارکردگیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔اور دوسرا یہ کہ اقوام متحدہ کی وضع کردہ پالیسیوں کی تبلیغ واشاعت اور ترویج وتشہیر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔پھر یہ کہ کسی بھی کسی بھی سماج، معاشی، رفاہی، اصلاحی، تعلیمی اور مذہبی مقاصد کے تحت وجود میں آنے والے اداروں، جماعتوں، تنظیموں اور فورموں میں ان کے افراد باضابطہ شامل ہوتے ہیں، جو ان اداروں، جماعتوں تنظیموں اور فورموں کی پالیسیوں، منصوبوں اور کارکردگیوں سے انہیں آگاہ کرتے رہتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ بالواسطہ اقوام متحدہ کے منشورات کی ترویج وتشہیر اور ان پر عمل آوری کی مثالیں بھی قائم کرتے رہتے ہیں۔مثلاً حقوق نسواں حقوق انسانی اشتراک ومذاہب مابین تفاہم انسداد دہشت گردی وغیرہ۔

یہ تمام تر کوششیں دراصل ساری دنیا کو عقائد واعمال دونوں طرح سے ایک طرف اقوام متحدہ کے زیر اثر لانے کی زبردست کوششیں ہیں اور دوسری طرف ہر قوم بالخصوص مسلمانوں کو ان کے اپنے دین ومذہب اور تمدن وثقافت سے

بے گانہ اور منقطع کرڈالنے کی مذموم چالوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی ہر لحاظ سے نہایت ہی پسماندہ بنا کر رکھ دینے اور بیش از بیش جانی اور مالی تباہی و بربادی کی نذر کر دینے کی منصوبہ بند کوششیں ہیں۔

صدیوں کی محنت و کاوش کے نتیجے میں ترتیب دیئے ہوئے یہودی عالمی نظام کی پالیسی اور منصوبے کے مطابق جب امریکہ نے لیگ آف نیشنز (Leage of Naitons) اور مجلس اقوام متحدہ (United Natios Organisation) کے راستے پوری دنیا پر اپنا اقتدار قائم کر لیا، تمام ممالک پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور دنیا کی تمام حکومتیں اپنے اختیارات مکمل طور پر کھو دیے اور اقوام متحدہ کے آگے سرنگوں ہوگئے تو جنگ خلیج ۱۹۹۱ء کے بعد امریکہ نے اس عالمی نظام کا کھل کر ''نیو ورلڈ آرڈر'' (نیا عالمی New World Order) کے نام سے اعلان کر دیا، جس کے لیے بعد میں پھر گلوبلائزیشن (Globalisation) کی اصطلاح بھی استعمال کی جانے لگی۔ یہ اعلان اس بات کی علامت تھی کہ اب اس بحیثیت قوم یہودی حکومت اور بحیثیت ملک امریکہ کے اقتدار کو چیلنج کرنے والا یا اس کے مدمقابل کوئی بھی ملک باقی نہ رہا اور نہ ہی کوئی طاقت سد راہ رہ گئی، بلکہ ساری دنیا ہر لحاظ سے مکمل طور پر اس کے قبضہ میں آگئی اور دنیا کی ساری قوموں کو اپنا غلام و محکوم بنا لینے کا وہ پورا پورا مجاز ہو گیا۔

چوں کہ یہودی عالمی حکومت کا اصل ہدف اسلام کو مٹا ڈالنا، مسلمانوں کو زیر تسلط لانا، انہیں محکوم بنا لینا اور مسلمانوں کی نام نہاد حکومتوں کو براہ راست اپنی تحویل میں لے لینا ہے، اس لیے یہودی عالمی حکومت امریکہ کی علم برداری میں ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا بڑے پیمانے پر سلسلہ جنگ خلیج سے شروع کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اپریل ۱۹۹۱ء میں قرارداد پاس کر کے عراق کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق عراق کو تباہ و برباد کرنے کے ساتھ ساتھ غذائی اشیاء کی درآمد اور برآمد پر پابندی عائد کر دی گئی یہاں تک کہ پیٹرول کی قیمت پر بھی پہرے بٹھا دیئے۔ اور پھر تمام ملکوں میں اس طرح کی مداخلت کا دروازہ چوپٹ کھول دیا گیا۔ لہٰذا، بوسنیا، ہیتی اور صومالیہ میں یہی کھیل پوری طرح کھیلا گیا اور جزوی طور پر لیبیا، کمبوڈیا، لائبیریا، نائجیریا، سوڈان اور انگولا میں یہی کھیل ہوتا رہا، اور کوسووا میں تو مسلمانوں کی نسل کشی کا نیا مذموم ظالمانہ طریقہ ناٹو (Norh Atlantic Treay Organisarion-N.A.T.O.) افواج کی سرپرستی میں اختیار کیا گیا۔ افغانستان میں اس قدر بم برسائے گئے کہ آبادی تو آبادی پہاڑوں تک کی خیریت نہ رہی۔ اور ایک بار پھر عراق کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا۔ یہاں کہ عراقیوں کی جان و مال کی تباہی و بربادی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ سلسلہ عراق تک محدود نہیں ہے بل کہ اس کے بعد ایران نشان زد ہو چکا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو چار سالوں کے وقفے وقفے سے ایک ایک کر کے تمام مسلم ممالک کو تباہ و برباد کر دینے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔

موجودہ عالمی نظام جو قوم یہود کی ساختہ پرداختہ ہے، جس کے تمام تانے بانے یہودیوں کی اسلام اور مسلم دشمنی کے ناپاک عزائم اور منصوبہ کا نتیجہ ہیں اور عالمی نظام کی وضع کردہ تہذیب و ثقافت جسے مغربی تہذیب و ثقافت کہا جاتا ہے کی سربراہی بحیثیت قوم مکمل طور پر قوم یہود کے ہاتھوں میں ہے، اور بحیثیت ملک امریکہ کے ہاتھوں میں یہودی

بنیادی طور پر شیطان کے جارحہ کی حیثیت سے کام کر رہے ہے۔ظاہر ہے کہ ان کا مشن [illegible]، دین حق اور فطرت انسانی کو منہدم کر کے ان کی جگہ شیطانی نظام فکر وعقیدہ اور اعمال و اشغال کو جاری اور نافذ کرنا ہے۔چناں چہ نظام حق کی ہر طرح سے اور ہر حال میں مخالفت کرنا اور دین فطرت وانسانیت کے بالکل برعکس نظام زندگی اور تہذیب وثقافت کو جاری اور نافذ کرنے کی کوشش کرنا ان کا نصب العین ہے۔چناں چہ دین اللہ کی بخشی ہوئی بیشتر حلال اور جائز امور و معاملات کو اس تہذیب وثقافت نے حرام ناجائز اور ناحق قرار دے دیا ہے اور دین اللہ کے تمام ممنوعہ، حرام، ناجائز اور ناحق چیزوں کو حلال، جائز اور لازم تسلیم کر لیا ہے اور ساری دنیا پر اسے غالب کرنے کے وہ تمام ذرائع و وسائل استعمال کر رہیں جو کچھ بھی ان کے بس میں ہے۔

☆ MNCs

مخصوص تہذیب وثقافت کو سارے عالم میں برپا کرنے کے لیے کثیر الاقوامی ادارہ جات (multi National corporations) کے نام سے ایک زبردست مالی فوج کو میدان میں اتارا گیا ہے۔بین الاقوامی کمپنیوں نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ان کے ہاتھوں میں ساری دنیا کی دولت سمٹ کر آ گئی ہے اور اقوام کی قسمت ان کے ہاتھوں میں بند ہو گئی ہے۔ان میں سے تقریبا تمام ہی ادارے یہودی کی ملکیت ہیں۔

یہ کثیر الاقوامی ادارہ جات اقوام متحدہ کے ذریعہ ذیل طریقوں سے شیطانی نظام کے قیام واستحکام اور ان کی بالادستی کی کوششیں کر رہے ہیں:

☆ تہذیب وثقافت کے نام پر بے ہنگمی، بدنمائی، بے غیرتی، بے حیائی، بے وفائی، بداخلاقی، بدکرداری، بدچلنی، بدزبانی، بدنظمی اور تمام مخرب اخلاق کردار واعمال کا ہر چہار اطراف دور دورہ ہے۔

فیشن کے نام پر بیوٹی پارلر، مساج سنٹر، کاسمیٹک کلچر، ٹو روم وغیرہ جیسی چیزوں کو مشتہر کر کے اور انہیں ضروریاتِ زندگی قرار دے کر ان کے ذریعہ فحاشی اور عریانیت کی زبردست وبا پھیلا دی گئی ہے۔پھر ان کی تقویت اور کشش کے لیے فیشن کے نام پر آئے دن عجیب عجیب قسم کے بے ہنگم لباس اور ان کی تراش خراش کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، اور کاسمیٹک آئیٹمز کی نئی نئی قسمیں اختراع کی جاتی ہیں۔

آزادیٔ نسواں اور حقوق نسواں کا زور دار راگ الاپ کر عورتوں کو بازاروں، کلبوں اور ہر طرح کی مجلسوں میں لا کر، انہیں بے حیائی، بدکرداری اور بے وفائی کے راستے پر ڈال دیا جاتا ہے۔

اس تہذیب وثقافت کا پرچار کرنے اور اس کو رواج دینے کے لیے جنسی تعلیم، پورنوگرافی، منعِ حمل ادویات، فیشن شو، کلچرل پروگرام، مقابلہ حسن، پب کلچر وغیرہ جیسی گندی، مخرب اخلاق اور فحش چیزیں عام کی جا رہی ہیں جن کی بنا پر عریانیت اور عفت وعصمت، تہذیب وشائستگی، جنسی بے راہ روی اور آوارگی پروان چڑھ رہی ہیں اور عفت وعصمت، تہذیب وشائستگی، اخلاق وانسانیت اور شرافت ومدنیت کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

☆ میک ڈونلڈ، کے ایف سی، پیزا ہٹ، پیزا ان قسم کے امریکی فاسٹ فوڈ کے علاوہ چینی، جاپانی، میکسیکی، اطالوی وغیرہ کے مختلف قسم کے کھانوں کا مسلم ممالک میں خصوصیت کے ساتھ استعمال ہورہا ہے جن کھانوں میں حرام وحلال کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ اس طرح کے کھانے مخرب ایمان واخلاق کے ساتھ مضر صحت بھی ہیں۔

☆ ان کے علاوہ اس تہذیب وثقافت میں اسپورٹس کے نام سے لہو ولعب کو ایک کامیاب حربے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کے ذریعہ ہر آنے والی نئی نسلوں کے دل ودماغ پر فٹ بال، والی بال، ٹینس، ٹیبل ٹینس، کرکٹ وغیرہ کو اس قدر مسلط کردیا جاتا ہے کہ ان کے سامنے نہ تو دوسرے مسائل ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کھیلوں کے علاوہ انہیں کچھ اور سوچنے سمجھنے اور ان پر وقت لگانے کی فرصت ہوتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جب بھی کوئی کھیل شروع ہوتا ہے تو اسکولوں، کالجوں، دفتروں، دکانوں، بسوں، ٹرینوں، بازاروں اور گھروں میں غرض کہ ہر جگہ سبھوں کی زبانوں پر بس کھیل ہی کے چرچے ہوتے ہیں، چلتے پھرتے، سوتے بیٹھتے، کھاتے پیتے ہر حال میں بس اسی پر تبصرے اسی کے تذکرے اسی کی گتھیوں میں وہ الجھے اور انہیں سلجھاتے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس ''تہذیب وثقافت'' کی ترویج واشاعت کے لیے اور اسے رواج دینے کے لیے سیٹیلائٹ اور جدید مواصلاتی ٹکنیک کے تحت ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، موبائل فون وغیرہ جیسے ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے جو عام لوگوں تک جلد پہنچانے کے آسان ذرائع ہیں۔ پھر ادب وثقافت کے نام پر اخبارات رسائل اور جرائد میں مخرب اخلاق، عریاں اور فحش تصاویر کی بھر مار اس تہذیب وثقافت کو تمام گھروں سے لے کر دفتروں، دکانوں اور کارخانوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں، اس طرح کہ کوئی بھی نظر ان سے بچ کر نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی دوسری قوموں کے شانہ بشانہ مسلمان بھی ان میں رچے بسے اور گھلے ملے ہوتے ہیں، دوسری قوموں اور مسلمانوں میں کوئی فرق وامتیاز باقی نہیں ہے، بلکہ مسلم ملکوں میں یہ وبائیں بہت سارے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے پھیلتی جارہی ہے۔

شروع میں جب عام مسلمانوں کا نصب العین خوف خدا، آخرت طلبی، شرافت ودیانت اور حق وانصاف کی علم برداری تھی، وہ نظام حق کے متبع اور اسلام کے چلتے پھرتے نمونے تھے، اور شریعت کو اور اس کی بندی کو عزیز رکھتے تھے، تو جہاں کہیں بھی گئے اور جس جگہ بھی رہے، وہاں نہ صرف انہوں نے اپنی اخلاقی اور شرعی اثرات لوگوں پر مرتسم کئے بلکہ بیش از بیش لوگ ان کے ہاتھوں اسلام قبول کرتے چلے گئے، اس حقیقت کے باوجود کہ دونوں ہی جانب کے لوگ بالعموم ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہوتے تھے۔ اور کہاں اب حال یہ کہ یہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں، زندگی کے جملہ امور ومعاملات میں خواہ وہ تہذیبی ہو کہ ثقافتی، سیاسی ہو کہ معاشی، خانگی ہو کہ معاشرتی، دوسرے کے شیطانی اثرات قبول کرتے چلے جاتے ہیں اور شریعت اور دین حق کی قطعی پرواہ نہیں کرتے ہیں اور انہیں بالائے طاق رکھدیتے ہیں۔

جب مسلمان دین حق سے منحرف ہوگئے، اللہ تعالی کی نازل کردہ روشن ہدایات وتعلیمات سے چشم پوشی اختیار کرلی، احکام خداوندی کو یکسر بدل ڈالا، دنیا پرستی، عیش پسندی، جھوٹی شان وشوکت اور ظلم وزیادتی کے دلدادہ ہو

گئے، مختلف قسم کے آپسی اختلافات میں مبتلا ہوگئے، ایک دوسرے کی خون کو حلال الاخری یہود وملحدی اور دوسری قوموں نقالی شروع کردی، انہیں دوست بنانے اور ان کی حمایت کے حصول کے لیے ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے شروع کردیئے اور یہود ونصاری اور دوسری قوموں کی ان تمام خرابیوں اور برائیوں میں مبتلا ہوگئے، جن سے انتہائی سخت تاکید کے ساتھ باز رہنے کو کہا گیا تھا۔ایسی صورت میں وہی دشمن عناصر اور وہ قومیں جنہیں مغضوب اور ضالین کے خطابات سے نوازا گیا تھا، نظام عالم پر بڑی ہی آسانی اور سرعت کے ساتھ قابض اور متصرف ہونے لگیں۔یہ تمام اسلام دشمن عناصر تو موقع ہی کی تلاش میں تھے۔اور پھر وہ قابض ومتصرف ہی نہیں ہوگئے بل کہ مغلوب اور محکوم مسلمانوں پر ہر طرح کا ظلم وتشدد روا رکھا، ان کا عرصہ حیات تنگ کرکے رکھ دیا، ان کو صحیح دین سے اکھاڑ پھینکنے کی انتہائی کوشش کر ڈالیں، ان کی عزت و آبروں کو خاک میں ملا دیا، انہیں محکومی وغلامی کی ذلت آمیز زنجیرں میں جکڑ دیا اور ذلیل وخوار بنا کر رکھ چھوڑنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمانے لگے، حتی کہ وہ سب کچھ کرنے لگے جو شیطان، اس کی ذریت اور اس کے شاگرد کر سکتے تھے۔

یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا اور ایمان کا جھوٹا دعوی کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں بھلا دیا اور ان پر ظالموں اور سفاکوں کو مسلط کردیا۔جب مسلمانوں نے دوسروں کی بندگی واطاعت شروع کردی تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا اور ان ہی کے حوالے کردیا جن کی بندگی واطاعت کا وہ دم بھرنے لگے کہ جیسا وہ چاہیں ان کے ساتھ سلوک کریں:

وما اصابکم من سیئۃ فمن نفسک (النساء: ۷۹)

”اور جو بھی مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرا اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے“۔

ان اللہ لا یظلم الناس شیئا ولکن الناس انفسھم یظلمون (یونس: ۴۴)

”حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں“۔

اور ان کی یہ حالت اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک کہ اس کے بدلنے کے لیے خود کو نہ بدلا جائے: ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (الرعد: ۱۱) ”بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی“۔(نظام عالم اور امت مسلمہ)

عالمِ اسلام کے خلاف مغرب کی حکمت عملیاں

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد سے مغرب اسلام کو بہت سنجیدگی کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور مغربی مفکرین اسلام کے خلاف زبردست محاذ تیار کرکے اسلام کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی کوشش کررہے ہیں، اسی منصوبے کی ایک کڑی ”شیریل بنارڈ (Cheryal Benard)“ کا ایک مقالہ سول ڈیموکریٹک اسلام (Cevil Democratic Islam) ہے جس میں اس نے اسلام کو دنیا میں پڑھا اور بڑے غور سے پڑھ کر مسلمانوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور پھر حکومت

امریکہ کو مشورہ دیا کہ اب ان میں کون کون سی قسم کے مسلمان امریکہ اور مغرب کے لیے نقصان دہ اور کون اس کے لیے فائدہ مند ہے۔وہ اپنے مقالہ (مضمون) کا آغاز اس سوال سے کرتی ہے کہ مسلمان آخر امریکہ کے خلاف کیوں برسرِ پیکار ہیں، اس کی کیا وجوہ ہیں؟ اور اس کے جواب پر پورے مقالہ اور مضمون کا دارومدار ہے۔وہ تحریر کرتی ہے کہ مسلمان کو چوں کہ بہت عرصے سے سیاست سے دور رکھا گیا، اس لیے اب اس میں بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے، لہٰذا مسلمان اپنے غلبے کے لیے مختلف طریقہ کار اپنا رہا ہے اور وہ مختلف گروہوں میں بٹا ہوا ہے اور وہ گروہ چار طرح کے ہیں:

(۱) بنیاد پرست (Fundamentalist) (۲) قدامت پسند (Traditionalism)

(۳) سیکولرسٹ (Secularist) (۴) موڈرسٹ (Mederist)

اب ان چاروں گروہ کی نشاندہی کرنے کے بعد ان کے افکار نظریات کا مطالعہ کرے گی اور اس مطالعہ کی روشنی میں دیکھیں گی کہ کون گروہ اسلامی نظریات کا مکمل علم بردار ہے اور کون گروہ مغربی افکار کو پسند کرتا ہے۔

بنیاد پرست (Fundamentalist)

یہ وہ گروہ ہے جو جہاد کو اور قتال کو اسلام کے غلبہ کی حکمت عملی کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں یہ گروہ جمہوریت اور تمام مغربی افکار کا منکر ہے اور جہاد اور انقلاب کی تمام نظاموں پر ترجیح دیتا ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اسپریچول بنیاد پرست (Scriptural Fundementalist) یہ گروہ اسی طریقہ کو اختیار کرتا ہے جو اسلامی مآخذ کے مطابق ہے اور جو خودکش حملہ کو صحیح نہیں قرار دیتا۔ اور دوسرا گروہ ریڈیکل بنیاد پرست (Redical Fundamentalist) یہ گروہ سب سے خطرناک گروہ ہے جو خودکش حملوں کو جائز سمجھتا ہے اس گروہ میں اس نے طالبان، القاعدۃ، حماس کو شامل کیا۔

قدامت پسند (Traditionalist)

یہ گروہ اسلامی ثقافت رسم و رواج کی بڑی شدومد سے پاسداری کرتا ہے یہ گروہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد اور بڑا گروہ ہے۔یہ علماء، مدارس اور دیندار لوگوں پر مشتمل ہے۔یہ جہادیوں کی مدد کرتا ہے بقول اس کے۔

سیکولرسٹ (Secularist)

یہ نجی طور پر اسلام پر عمل پیرا ہوتا ہے، مگر معاملہ میں قوم پرستی کو ترجیح دیتا ہے۔

موڈرسٹ

یہ گروہ اسلام کی جدید تعمیر پیش کرتا ہے اور اسلام کو ایک لبرل مذہب تصور کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ اسلام چودہ سو سال پہلے کی تہذیب ہے لہٰذا اب زمانہ سے ہم آہنگ ہو، ایسا جدید اسلام پیش کرنا ہوگا۔

پھر اخیر میں تحریر کرتی ہے کہ ہمیں یہ محنت کرنی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کا طبقہ ماڈریٹ ہو جائے یا وہ نہیں تو کم سے کم سیکولرسٹ ہو ہی جائے تو ہی ہماری حکومت کے بغیر کسی مدمقابل اور خطرے کے لمبی مدت تک باقی رہ سکتی ہے، ورنہ پہلے دو گروہ تو ایسے ہیں کہ یہ کبھی بھی ہمارے ہم خیال نہیں ہو سکتے۔

امریکی حکومت کے لیے مسلمانوں کے خلاف تجویز کردہ لائحہ عمل

امریکی حکومت کو اپنے وسائل کے ذریعہ مثلاً ٹی وی چینلیں، انٹرنیٹ، سیڈیس، ویڈیو، وسی آر وغیرہ کو موڈریسٹ گروہ کے ابھارنے میں لگانے چاہیے، ان ہی کے اسلام کو صحیح تصور کرنا چاہیے اور موڈریسٹ کو قدامت پسندوں کی جگہ بٹھانا ہوگا اس کے لیے علما کی علمی حیثیت کو ختم کرنا ہوگا تب ہی مغربیت کا فروغ ممکن ہے، اور اس کام میں تھوڑا بہت سہارا سیکولرسٹ حضرات سے بھی لینا چاہیے۔

انقلاب کے لیے ایلومینائیز کے منصوبے

ٹمپلروں کی میسنز میں تبدیلی کے عمل نے کئی چھوٹی تنظیموں کو جنم دیا۔ روز کروسینز بھی انہی میں سے ایک تھے۔ دوسری ایسوسی ایشن ایلومیناٹی تھی۔ ان تنظیموں کا جادوئی اور طلسماتی دنیا کی تاریخ میں بہت زیادہ تذکرہ آیا تھا۔ ایلومینائی کا قیام جنوبی جرمنی میں بویریا کے مقام پر عمل میں لایا گیا۔ اسے بویریا ایلومینائی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس تنظیم کا بانی قانون کا پروفیسر ایڈم وائیشوٹ تھا۔ چرچ اور حکومتوں کی شدید مخالفت کرتے ہوئے، اس نے معاشرے کے لیے مندرجہ ذیل مقاصد تشکیل دیئے:

(۱) تمام سلطنتوں اور منظم حکومتوں کا خاتمہ۔

(۲) ذاتی جائیداد اور وراثت کا خاتمہ۔

(۳) حب الوطنی اور قوم پرستی کا خاتمہ۔

(۴) خاندانی زندگی، شادی کے طریقہ کار کا خاتمہ اور بچوں کے لیے طبقاتی تعلیم کا قیام۔

(۵) تمام مذاہب کا خاتمہ۔

دورِ جاہلیت اور دورِ علم و روشن خیالی جس طرح مغرب نے متصور کروائی، اسلام چھٹی صدی عیسوی میں اپنے نظریہ علم کو متصور کروا چکا تھا، اسلام کے نزدیک جاہلیت اور علم کی تقسیم کا معیار یہ ہے کہ ''وحی'' اور شریعت یہ روشن خیالی اور علم حقیقی ہے، اور وحی کا انکار یا اس کی ثانویت جہل اور تاریکی ہے، جب کہ مغرب نے اس کے برعکس وحی کے انکار عقلیت پسندی جو حقیقت میں شہوت پرستی اور مادیت ہے، کو روشن خیالی اور نور تصور کر لیا، یہ سب اٹھارویں صدی عیسوی کے فرانسی انقلاب کے بعد ہوا، کیوں کہ فرانسی مادہ پرست قاموسیوں (Encyclopaedians) نے وحی کے بغیر ہیومینزم کی بنیاد ڈالی، ''لامتری'' نے انسان کے قلبی و ذہنی تمام اعمال کو میکانکی قرار دیا، اور اسے دیگر حیوانوں کی صف میں کھڑا کر دیا، بس پھر تو کیا دیکھنا، مادی کی بارش شروع ہوگئی، اور مغرب میں بے حساب ''گمراہ نظریات'' ظاہر

ہوتے رہے،ان میں سے مشہور یہ ہیں:

۱) انسان پرستی(Humanism)اور موجودیت(Existenntialism)۔

۲) سیکولرزم یا دنیویت(Seularism)۔

۳) مادہ پرستی(Materialism)۔

۴) اشتراکیت(Socialism)۔

۵) نظریہ ارتقاء(Darvinism)۔

۶) جمہوریت(Democrisy)۔

۷) سرمایہ داریت(Capatilism)و نظریہ جنسیت(Fraindism)

۸) تجربیت (Empiricism)۔جس کی شاخیں ایجابیت (Positvism) اور جتائجیت (Pragmatisim)اور افادیت پسندی(Utilitarianism)ہے،وغیرہ۔

مذکورہ نظریات کو نصاب تعلیم اور طاقت کے زور پر عام کیا گیا، اور سائنسی نقطہ نظر سے ان تمام نظریات کی تغلیط کے بعد بھی اسے عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں کو پڑھایا جارہا ہے،اسلامی نقطہ نظر سے تو تمام نظریات سراسر بے بنیاد اور غلط ہیں،تجربہ اور مشاہدہ نے بھی اس کی ناکامی کو ثابت کردیا ہے،یہ بھی ’’الغزو الفکری‘‘ ہی کا ایک طریقہ ہے،تاکہ دانستہ طور پر لوگوں کو وحی،قرآن،حدیث،اللہ،رسول،اسلام،مذہب،فقہ وغیرہ سے دور رکھا جائے،جو ہمارے لیے بڑے خطرے کی بات ہے،صرف اتنا ہی نہیں بل کہ مجلہ ’’الرابطۃ‘‘ کی تحقیق کے مطابق راند (Rand)،ایک بہت بڑا ادارہ ہے اس میں کروڑوں ڈالر کی لاگت،صرف اس لیے خرچ کی جاتی ہے کہ پوری دنیا میں الحاد اور بے دینی کو کیسے فروغ دیا جائے،اور لوگوں پر ذہنی اعتبار سے سروے کر کے کس طرح محنت کی جائے،تاکہ لوگوں کی فکریں مغرب کے تابع ہو،اور دین سے بیزار رہے۔خاص طور پر عالم اسلام کو ٹارگیٹ بنایا جاتا ہے۔اور ایسا ’’نصاب تعلیم‘‘ تجویز کیا جاتا ہے کہ جس سے بچہ بچپن ہی سے مغربی تہذیب وثقافت سے متاثر ہوجاتا ہے،اور زندگی کے ہر موڑ پر وہ مغرب کو اپنا آئیڈیل بناتا ہے،حالاں کہ ہماری تہذیب وثقافت کے بعد ہمیں کسی بھی تہذیب وثقافت کی ضرورت نہیں۔مفتی ابولبابہ شاہ منصور عصر حاضر کے ان مشہور ومعروف علما میں سے ہیں جو علمی قابلیت اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ اور اسلام کے خلاف ہونے والی فکری سازشوں سے باخبر رہتے ہیں۔ان کا ایک حیرت انگیز مضمون شامل کیا جارہا ہے جس میں فکرِ اسلامی وفکرِ انسانی کو برائیوں کا دلدادہ بنانے کے لیے جو سازشیں رچی گئی ہیں اس کی وضاحت موجود ہے۔

شیطان کے پھندے

بیک ٹریکنگ کی چند مثالیں:

(۱) مائیکل جیکسن پاپ میوزک کی دنیا کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔۱۴۳۰ھ آخر نے دنیا میں ریکارڈ بزنس کیا۔ یہ فری میسنز سے منسلک تھا۔اس کے کئی شواہد ہیں ۔اس کے ایک البم "Dangerous" یعنی ''خطرناک'' کے کور پر بدنام زمانہ فری میسونک علامت ایک آنکھ بنی ہوئی ہے۔اس کے ساتھ ایک جھیل کی تصویر ہے جس میں جلتے ہوئے شعلے ہیں ۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جو بھی اس پانی میں داخل ہوگا دراصل آگ میں کودے گا۔شیطان آگ سے بنا ہے اور یہ جھیل شیطانی مرکز برمودا کی طرف اشارہ ہے ۔کور پر ایک آدمی ایئر شٹل گردے کی تصویر ہے جو ایک فرمیسن تھا ۔یہ وہ بدبخت شخص ہے جس نے شیطان کا پجاری بن کر ایک کتاب لکھی "The New Law of Man" یعنی ''انسان کا نیا قانون'' ۔اس کے مطابق نعوذ باللہ قرآن کو ایک دن انسان کے قانون سے بدل دیا جائے گا۔شیطان اور اس کے چیلوں کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ قرآنی آوازیں اور قرآن کا دستور ہے ۔اس کے مقابلے میں وہ ہر قیمت پر شیطانی آوازیں اور شیطانی نظام کو غالب کرنا چاہتے ہیں ۔انہیں مدارس اور مکاتب میں چٹائی پر بیٹھے معصوم بچوں کی روح پرور آوازیں تو بری لگتی ہیں لیکن جہنم کی وادیوں کی طرف ہنکانے والی شیطانی صداؤں کو وہ روح کی غذا ظہر کرتے ہیں ۔

(۲) بیک ٹریکنگ کے ذریعے شیطان کی عبادت دنیا میں پھیلانے کی ایک اور مثال گلوکارہ میڈونا کی ہے اس کے ایک البم کا مشہور گانا "Like aprayer" جس کو سنا جائے تو اس کے بول ہیں ۔ When you call my name It's like a little prayer i'm down on my knees Iwanne take you there in the midnight hour

''جب تم میرا نام پکارتے ہو تو یہ مجھے ایک دعا کی طرح لگتا ہے ۔میں اپنے گھٹنوں کے بل جھک جاتی ہوں اور تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں'' ۔یہ الفاظ دراصل خدا سے مخاطب ہو کر نہیں ،شیطان سے مخاطب کر کے کہے جا رہے ہیں ۔جب ان الفاظ کو Back ward چلایا جائے تو بآسانی یہ الفاظ سنے جا سکتے ہیں'' O "hear us salan" (اے شیطان! ہمیں سنو!)

(۳) بیک ٹریکنگ کی ایک اور مثال ایگل گروپ The Eagles سے سامنے آتی ہے ۔ان کے ایک گانے کا نام ہے ہوٹل کیلی فورنیا The Meal is aon the ceiling ۔اس گانے میں Ycah Satan بآسانی Back ward کر کے سنا جا سکتا ہے ۔اس گانے کے پیچھے بھی ایک انتہائی پراسرار شیطانی کہانی چھپی ہوئی ہے ۔گانا آگے کی طرف چلایا جائے تو یہ مصرعے یوں ہیں :

I fell on the Felling she put Shamane on ice she said we are all just prisoners here of our owndevice in the masters champer gathered

for bigfeast gathered with the feeling but they just can't feel

گانے کو الٹا چلایا جائے ہو یہ الفاظ واضح سنائی دیتے ہیں YEH SATAN: یے شیطان۔
اس پیغام کے ساتھ گانا بذات خود ایک داستان ہے۔ گانے کا نام کیلی فورنیا کوئی ہوٹل نہیں، دراصل امریکا میں موجود ایک سڑک ہے۔ اس سڑک پر ایک چرچ کا ہیڈ کوارٹر ہے لیکن یہ وہ چرچ نہیں جس میں عیسائی حضرات جمع ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ تو شیطانی کا چرچ ہے۔ اس میں شیطان کی پوجا ہوتی ہے۔ اس کے بانی کا نام انیٹیٹی سیز ڈیلیتی ہے جو ''شیطانی بائبل'' کا لکھنے والا ہے۔ امریکا کے چوٹی کے مشہور اداکار ٹی وی اور فلم کے ذریعے اسی چرچ کے تعلیمات کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ لوگ فلم اور موسیقی کے ذریعے شیطان کے مبلغ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ''رولنگ اسٹون'' نامی گروپ کے لیڈ سنگر میکجا نے ایک گانا لکھا: ''for the devil Sympothy'' (شیطان سے ہمدردی) جب ''برادری'' کے زیر انتظام یہ چرچ شروع ہوا تو دکھاوے کے لیے عیسائیت کی تعلیمات کو فروغ دے رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اصل روپ دکھایا اور مذہب سے مکمل بغاوت کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ آج اس میں شطانی عناصر جمع ہیں۔ یہ امریکا میں شیطان کی پوجا کا مرکز اور اس کا سب سے بڑا داعی ہے۔ جو والدین اپنے بچوں کو مغربی موسیقی سننے کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں، وہ سوچ لیں کہ اپنے معصوم جگر گوشوں کو کن لوگوں کا معمول بنا رہے ہیں۔

(۴) اس حوالے سے ایک میوزک گروپ "Cheap Trick" کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ اس میوزک گروپ کے ایک البم کے تعارف میں اسکا "Lead Singer" انا ؤنسمنٹ کرتا ہے: This song is the first from our album ''یہ گانا ہمارے البم کا پہلا گانا ہے۔ اس انا ؤنسمنٹ کو Anti Clockwis چلایا جائے اور مختلف تکنیک سے Backtrack کیا جائے تو یہ الفاظ سنے جا سکتے ہیں: "MY scrvant is a Musician" (میوزیشن میرا غلام ہے) سچ ہے موسیقی کا کام کرنے والے شیطان کا غلام ہے۔

(۵) ایک اور مثال ایک دوسرے گروپ ''Styx'' کی ہے۔ گریک میتھ (Greek Myth) کے مطابق یہ نام ''جہنم کے ایک دریا'' کا ہے۔ ان کا ایک البم کا نام "Paradise Threatre" ہے۔ اس البم کا ایک گانا ہے جس کے بول Snowblind ہیں۔ اس گانے کو سنیں۔ اس کے بول کچھ یوں ہیں: I try so hard to make it so (یعنی میں اس کام کے لیے کس قدر محنت کرتا ہوں) انہی بولوں کو اسی ترتیب اور اسی پوزیشن میں Backword چلایا گیا تو یہ بول کچھ یوں تھے O Shatan move in our Voives (او شیطان! ہماری آوازوں میں گردش کرو)

اسی گروپ "Slyx" کی ایک دوسرے البم کے ایک گانے کے بول ہیں "I am Ok" (میں ٹھیک

ہوں) جب گانا آگے سنیں تو اگلے بول ہیں: I I had finally found person, i have been searching for میں نے بالآخر اس شخص کو پالیا جس کی مجھے تلاش تھی'' آپ ان معنی خیز بولوں کو ملاحظہ کیجیے گلوکار کس کی تلاش میں ہے کہ جس کو اس نے پالیا اور اب وہ اس کی خوشی منانا چاہتا ہے؟ جب ان الفاظ کی Back Tracking کی گئی تو اس سوال کا جواب بھی مل گیا: I am your servent wo shall stick by the serpent of alpha ''میں تمہارا غلام ہوں۔ ہم شیطان کی غلامی پر جمے رہیں گے۔ لفظ "Serpent" (سانپ) دراصل عیسائیت کے اس تصور کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب شیطان نے حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے دل میں وسوسہ ڈالا تو اس موقع پر وہ سانپ بہروپ میں تھا۔ اس نے سانپ کا بھیس بدلا ہوا تھا۔ آج وہ آدم کی اولاد کو ورغلانے کے لیے پھر سانپ کی شکل میں آ رہا ہے۔ آپ اپنے اردگرد غور کریں بہت سی چیزوں پر بلاوجہ سانپ کی شبیہ رسیاں یا لہریں بنی ہوئی دکھائی دیں گی۔ یہ شعوری یا لاشعوری طور پر شیطان کی موجودگی اور اس سے مدد مانگنے، اس کی توجہ کھینچنے کے لیے بنائی گئی ہوتی ہیں۔

(6) اوپر گانوں میں جن "Hidden Messages" (پوشیدہ پیغامات) کا ذکر کیا گیا ہے ان شیطانی پیغامات کی ترسیل کا یہ کام دنیا کی ہر زبان کی موسیقی میں ہو رہا ہے۔ کیا پاکستان میں بھی کسی نے ویسی اسٹائل میں ایسا کچھ کرنے کی کوشش کی؟ تحقیق کی جائے تو جواب اثبات میں ملتا ہے اور کیوں نہ ملے کہ پاکستان تو ''برادری'' کا خصوصی ہدف ہے۔ 21 مارچ 1999ء کو ایک انگریزی اخبار کے آرٹیکل سے معلوم ہوتا ہے کہ 1995 کے آغاز میں لاہور کے ایک صحافی نے گانوں کی کچھ کیسٹوں کی 500 کا پیان خود تیار کروا کے لوگوں میں مفت تقسیم کیں۔ لوگوں نے ان کیسٹس کی آوازیں سن کر محسوس کیا کہ ان Tapes میں کچھ پراسرار آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ان لوگوں کی تصدیق کچھ اخباروں کے آرٹیکلز سے ہوئی۔ ان گانوں کو غور سے سننے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پکار رہا ہو ''ابلیس ابلیس'' کسی کیسٹ میں "Jewcola" کے الفاظ سنائی دیتے ان گانوں کے کیسٹ کے فرضی نام ''آتشی راج'' کے نام سے تیار کیے گئے اور بینڈ کا نام ''عذاب'' تھا۔ (ابلیس کا مادہ آگ سے بنا ہے اور آگ جہنم کا اصل عذاب ہے) جب کیسٹ تیار کرنے والے کی ملاقات ایک صحافی سے ہوئی اور اس نے ان کیسٹوں کی پراسرار آوازوں کی حقیقت پوچھی تو اس نے یہ کہہ کر مذاق میں ٹال دیا کہ دراصل اس نے یہ پیغامات معاشرے کے اوپر ایک طنز اور ایک انتقامی ردعمل کے طور پر ریکارڈ کروائے۔ یہ شخص جلد مزید Tapes مارکیٹ میں لانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

خبر کے آخری جملے کا مطلب ہے جلد ہی ایسی اور بھی کیسٹیں مارکیٹ میں آئیں اور انہوں نے ''ابلیس ابلیس'' پکار کر جہنم کی آگ اور عذاب کو دنیا میں ہی ہمارے اردگرد بھڑکا دیا۔ حال ہی میں ہمارے ہاں کے

مشہور ترین ٹی وی چینل نے اپنا میوزک چینل "آگ" کے نام سے شروع کیا۔الاخیری اس ۳۰ کی بھڑکائی ہوئی آگ کی لپٹیں نئی نسل کی ایمان، حب الوطنی اور مثبت صلاحیتوں کو چاٹ رہی ہیں۔ان میں مٹکنے اور ٹھمکنے کے منفی جذبات پیدا کر رہی ہیں۔سوچا جانا چاہئے کہ موسیقی جیسی لطیف چیز کا آگ جیسی بھڑکتی بھڑکاتی چیز سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ یقینی بات ہے کچھ لوگ ہم سے کھیل رہے ہیں اور اس وقت کھیلتے رہیں گے جب تک ہم دین کی طرف لوٹ نہیں آتے۔جب تک ہم اللہ کی پناہ میں نہیں آجاتے۔اور ایسا اس وقت تک نہیں ہوگا۔جب تک ہم شیطان کے چنگل سے نکلنے کا عزم کرکے شیطانی کام چھوڑنے کا تہیہ نہیں کر لیتے۔

موسیقی پر کیا موقوف ہے؟ ساری انٹرنیٹ کی دنیا فری میسن کی نشانیوں اور کارستانیوں سے بھری پڑی ہے امریکی فلم انڈسٹری میں یہ بات مکمل طور پر نمایاں ہے مگر ٹی وی بھی اس سے پیچھے نہیں۔عام پروگراموں کو تو رہنے دیجئے فری میسنز نے بچوں کے کارٹون تک کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔بچوں کی کہانیاں اور ناول تک اس سے محفوظ نہیں۔بطور نمونہ سب کی ایک ایک مثال دی جارہی ہے۔

ٹی وی اور فلم:

ٹی وی کے ذریعے ایک بہت بڑی تعداد میں ناظرین کو ایک نئی خیال سے متعارف کرایا جارہا ہے، اور وہ وقت شاید بہت زیادہ دور نہیں جب وہ خیال حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آجائے گا، بس دنیا کے ذہنوں میں اس خیال کے جاگزیں ہونے کا انتظار ہے وہ خیال ہے"ایک گلوبل لیڈر کا خیال جو دنیا کو مسائل سے نجات دلا سکے آپ آج کل گلوبل کا لفظ بہت سنتے ہوگے، گلوبل ویلج گلوبل یونین گلوبل یہ سب کیا ہے؟ عالمی دجالی ریاست کے "عالمی لیڈر" دجال کے لیے ذہن سازی ہے، "ریڈیارڈ کپلنگ" ایک فری میسن مصنف ہے اس کی کتاب (The jungle Book) پر بالی ووڈ کی فلم بنائی گئی، جس میں شان کوڑے، ماویکل کین اور سعید جعفر جیسے میسونک اداکاروں نے نمایاں کردار ادا کیا کتاب دو سپاہیوں کی کہانی ہے، جو انڈیا کے قریب ایک ملک میں جاتے ہیں ملک کا نام "کافرستان" ہے، پہونچتے ہی وہاں کے لوگ جنہیں کافر کہا جاتا ہے، انہیں گرفتار کر لیتے ہیں، جب انہیں قتل کیا جانے لگتا ہے تو ان میں سے ایک سپاہی کی گردن کے گرد ہار ڈالتا ہے جس پر میسونک آنکھ کا سمبل کھدا ہوتا ہے۔کافر اس کو خدا سمجھنے لگتے ہیں اور بعد میں سپاہی بھی اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا ہے، قیدی سپاہی کو خدا کے درجہ تک پہونچانے کا کیا مطلب ہے؟ یہ دجال کے خروج کی ریہرسل ہے، گلوبل لیڈر کون ہے؟ مسلمانوں کے نظریے کے مطابق دجال ہے۔حدیث میں آتا ہے "کافروں میں سے ایک شخص اٹھے گا جو اپنی ایک آنکھ سے پہچانا جائے گا، وہ دنیا کا لیڈر ہونے کا اعلان کرے گا، اور بعد میں خدائی کا دعویٰ۔

کارٹون:

میٹ گراوننگ ایک مصدقہ فری میسن ہے، یہ ''مسٹر سمپسن Mr.Simpsons'' نامی کارٹون سیریز کا خالق ہے، وہ کھلے عام اقرار کرتا ہے، وہ ایسے طریقے سے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچا رہے ہیں کہ وہ بآسانی انہیں ہضم کر سکے یہ کارٹون ہمارے بچوں کو دراصل کیا سکھا رہے ہیں؟ ان تک با آسانی ہضم ہونے والے کون سے پیغامات پہنچا رہے ہیں؟ کارٹونوں کے ذریعے بہت سے شیطانی سبق ہمارے بچوں کے معصوم ذہنوں میں انڈیلے جا رہے ہیں۔جیسا کہ ماں باپ سے بغاوت،حکومت کی جانب سے لگائی گئی جائز پابندیوں کو توڑنا، برے اخلاق اور نافرمانی وغیرہ، اخلاقیات کی یہ پامالی معمولی چیز ہے۔''برادری'' تو انسانیت کو اس سے کہیں آگے لے جانا چاہتی ہے۔اس مقام پر جہاں شیطان حکم الٰہی کا انکار کر کے پہنچ گیا تھا۔فرعون اور شداد نے تو بادشاہی کے بعد خدائی کا دعوی کیا تھا،فری میسری بیماری سے شفایاب ہونے والے مریض کو خدائی کا دعوے دار بنا رہی ہے، آیئے! دیکھتے ہیں کیسے؟امریکا جیسے ملک میں کھلے عام یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے؟

اس کارٹون سیریز کی ایک قسط میں انتہائی پریشان کن صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے، اس قسط میں سمپسن فیملی کا سربراہ ''ہومر سمپسن'' ایک گروہ کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے یہ گروہ درحقیقت دجال کی راہ ہموار کرنے والی عالمی یہودی تنظیم ''فری میسری'' ہے،گروہ کے ممبران ہومر سمپسن کے جسم پر پیدائشی نشان دیکھتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ تم اللہ کے چنے ہوئے ہو جس پر نبوت اترتی ہے، یہ نیا رتبہ ہومر سمپسن کو اپنے آپ کو خدا سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے جس کا اقرار وہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔''میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ کیا کوئی خدا ہے؟اب مجھے پتا چلا کہ وہ کون ہے؟ وہ تو میں خود ہوں۔'' کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ صرف ایک مذاق ہے مگر اللہ کی قسم! یہ مذاق نہیں یہ بیہودہ مہم ہے۔یہ ایک بہت بڑا پروپیگنڈا ہے جس کے ذریعے غیر محسوس طریقوں سے لوگوں کی سوچ بدلی جا رہی ہے۔

کہانی:

ہیملین کی ''PipePiper'' انگریزی ادب کی مشہور زمانہ لوک کہانی ہے ریڈرز ڈائجسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق یہ لوک کہانی فرضی نہیں بلکہ حقیقی کہانی تھی جو کالے جادو اور شیطانیت کے پوشیدہ اسرار پر مبنی تھی۔شیطان کی بیماری ''برادری'' نے جادو کی تاثیر اور شیطان کی طاقت لوگوں کے دلوں میں بیٹھانے کے لیے یہ کہانی تحریر کروائی اور اسے انگریزی خواں طبقے کے گھر گھر تک، بچے بچے تک پہنچا دیا۔یہ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک بستی میں چوہوں نے فصلیں تباہ کر دیں،لوگوں کے گھروں میں چوہوں نے چیزیں کتر ڈالیں،بستی کے لوگ اس آفت سے بہت تنگ آ گئے اور ان کی کوئی تدبیر چوہوں کو مارنے کی ثابت نہ ہوئی۔ایسے وقت میں ایک اجنبی اس بستی میں داخل ہوا۔اس کو اس مسئلے کا علم ہوا تو اس نے بستی والوں کو اپنی خدمات پیش کیں کہ وہ اس فتنے سے

ان کو نجات دلا سکتا ہے۔ اگر بستی والے اس کو مقررہ مقدار میں سونا (سکے) بستی والے اس کی اس شرط پر راضی ہو گئے۔ اس شخص نے شرط طے کرنے کے بعد پائپ (بانسری) منہ کو لگایا اور ایک دھن نکالی۔ اس دھن کا سننا تھا کہ بستی کے ہر کونے سے چوہوں نے نکلنا شروع کر دیا۔ وہ شخص دھن بجاتا ہوا بستی کے باہر نکلا اور تمام چوہے بھی اس دھن کے پیچھے چلتے گئے۔ حتی کہ وہ اجنبی تمام چوہوں کو دریا کے کنارے لے گیا اور تمام چوہے دریا میں گر کر ہلاک ہو گئے۔ یوں بستی والوں کو چوہوں سے نجات ملی لیکن اس شخص کو وعدے کے مطابق سونا (رقم) کی ادائیگی نہیں کی۔ بستی والوں کی اس وعدہ خلافی کا اس شخص نے اس طرح بدلہ لیا کہ اس نے پھر اپنا پائپ منہ کو لگایا اور ایک دوسری دھن نکالی۔ اس کا سننا تھا کہ تمام بستی کے بچے اس دھن کے پیچھے چل پڑے اور وہ شخص دھن بجاتا ہوا بچوں کو اپنے ساتھ لے کر ایسا غائب ہوا کہ پھر نہ وہ شخص ملا اور نہ بچے۔ موسیقی، کالا جادو، اور شیطانی کرتوت تینوں چیزوں کو اس کہانی میں ایسی چابک دستی سے سمو کر پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا غیر شعوری طور پر ان کالی شیطانی چیزوں کے رعب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یوں انگریزی ادب کے مطالعے کا فیشن اسے جو روگ لگاتا ہے، مرتے دم تک اس کی تلافی نہیں ہو پاتی۔

ناول:

ہیری پوٹر کے ناولوں نے مثالی شہرت حاصل کی اور ریکارڈ بزنس کیا۔ ہمارے ہاں کچھ والدین ایسے تھے جو یورپ کے والدین کی تقلید کرتے ہوئے اپنے بچوں کو یہ ناول پڑھتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ ان کے بچے دنیا کے ساتھ چلنا سیکھ رہے ہیں۔ ایسے حضرات مدرسے کے بچوں پر ترس کھاتے تھے ـــــ جن کا ذہن ان شیطانی اثرات سے آلودہ نہ ہوا تھا ـــــ کہ وہ کیا جانیں دنیا کا اسٹائل، آرٹ اور ادب لطیف کیا ہوتا ہے؟ ان ناولوں میں کیا تھا؟ جادو، شیطانی طاقتیں، بدروحوں اور ماورائی جادوئی طاقتوں کی محیر العقول کارستانیاں ـــــ ان ناولوں کو پڑھ کر ہمارے بچوں نے کیا حاصل کیا؟ جادو کی ہیبت، اس کے کمالات، اس کے ذریعے مشکل کشائی ـــــ یہ سب کچھ غیر محسوس طریقے سے ان کے معصوم ذہنوں میں فیڈ کر کے انہیں ان ناپاک چیزوں سے مانوس کر دیا گیا تاکہ کل وہ آسانی سے "عالمی دجالی ریاست" کے وفادار شہری بن سکیں۔ گویا ہم نے اپنے ہاتھوں اپنے بچوں کو شیطان کے پجاریوں کا وہ فرسودہ مواد خرید کر دیا جو انہیں رحمان سے بغاوت سکھا سکے۔ جو انہیں شیطان کی عبادت کے قریب لے جائے۔

الغرض شیطان کی محنت جاری ہے۔ وہ اور اس کے چیلے ہر رُخ سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ وہ انسانیت کو گناہ میں مبتلا کر کے جہنم کا ایندھن بنانا چاہتے ہیں جو بے سر و سامان ہیں۔ بے وسائل اور بے آسرا ہیں لیکن خدا کی محبت کی آس میں اس کی نصرت کے آسرے پر انسانیت کو جہنم سے بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ

دین کی طرف رجوع کی دعوت ہر حالت میں دے رہے ہیں ۔وہ شریعت کے نفاذ کی جدوجہد میں ہر لمحے لگے ہوئے ہیں ۔سعادت مند ہے وہ شخص جوان مبارک کوششوں میں اپنا حصہ ڈالے اور خود کو اپنے بچوں کو اور تمام مسلمانوں کو شیطان کے چنگل سے چھڑا کر رحمن کی آغوش میں لانے کی جدوجہد میں شامل ہو جائے ۔ان تمام گناہوں کو چھوڑنے اور چھڑانے کی جدوجہد کرے جو مغربی تہذیب کے جلو میں ہمارے معاشرے میں پھیلتے چلے جارہے ہیں ۔موسیقی ،فلم ،ناول ،کارٹون جیسے شیطانی پھندوں سے انسانیت کو چھڑا کر دین خالص کر ابدی نعمتوں کا شوق دلانے والا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا امتی اور اس فتنہ زدہ دور کا نجات یافتہ خوش قسمت ہے ۔

(http://zarbpk.blogspot.com)

ہمیں امید ہے کہ اسلام اور مذہب کے خلاف ان بے بنیاد سازشوں سے پردہ اٹھنے کے بعد مسلمان اپنی اولاد کو دین کی بنیادی تعلیم دینے کی فکر کریں گے ،ان کو اسلامی کلچر اور تہذیب سے واقف کرا کے اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کریں گے ۔

عربی مصادر و مراجع :

۱) اجنحة المکر الثلاث (عبدالرحمن حنکه المیدانی)

۲) کواشف و زیوف (عبدالرحمن حنکه المیدانی)

۳) مکائد یهودیة عبر التاریخ (عبدالرحمن حنکه المیدانی)

۴) غزو فی الصمیم (عبدالرحمن حنکه المیدانی)

۵) الغزو الفکری و التیارات المعادیة للاسلام من البحوث المتقدمة لمؤتمر الفقه الاسلامی

۶) الثغرات التی یتسلل منها الغزو الفکری و سبل تلافیها (الدکتور عبدالقادر بن عطا صوفی)

۷) مقدمات فی العلوم و المناهج (أنور الجندی)

۸) الحضارة الاسلامیة مقارنة بالحضارة الغربیة (یوسف الواعی)

۹) الصراع بین الفکرة الغربیة و الفکرة الاسلامیة (ابوالحسن الندوی رحمه الله)

۱۰) العالم الاسلامی الیوم

۱۱) الاستشراق و المستشرقون (أبوالحسن الندوی)

۱۲) إلی نظام عالمی جدید (واضح الندوی)

۱۳) أزمة الاستشراق الحدیث المعاصر (محمد خلیفه حسن)

۱۴) موقف المستشرقین من الصحوة الاسلامیة (مجدی محمد)

۱۵) الاستشراق المعاصر (دکتور مازن بن صلاح المطبقانی)

۱۶) افتراآت المستشرقین (دکتور یحیی مراد)

۱۷)الاسلام و الحضارة العربية (کرد علی)

۱۸)حاضر العالم الاسلامی (جمیل مصری)

۱۹)التبشیر و الاستعمار فی البلاد العربیة (مصطفی خالدی/عمر فروخ)

۲۰)الفکر الاسلامی الحدیث و صلته بالاستعمار الغربی (محمد البھی)

۲۱)کفاح المسلمین فی تحریر الھند (عبدالمنعم النمیر)

۲۲)العالم الاسلامی و محاولة السیطرة علیه (محمود شاکر علی)

۲۳)مذاهب فکریة معاصرة (سید محمد قطب)

۲۴)الاستشراق (ایڈورڈ سعید۔ترجمہ کمال ابودیب۔مؤسسة الابحاث العربیه۔بیروت ۱۹۸۱ء)

۲۵)المستشرقون (نجیب العقیقی۔دار المعارف۔قاھرہ۔۱۹۸۱ء)

۲۶)الاستشراق و المستشرقون (ڈاکٹر مصطفی سباعی۔ طبع دوم۔المکتب الاسلامی۔۱۹۷۹ء)

۲۷)السنة و مکانتها فی التشریع الاسلامی (ڈاکٹر مصطفی سباعی۔بیروت ۱۹۷۸ء)

۲۸)انتاج المستشرقین (مالک بن نبی)

۲۹)اوروبا و الاسلام (ھشام جعید۔ترجمہ: طلال عتریسی، دار الحقیة۔بیروت ۱۹۸۰ء)

۳۰)الثقافة العربیة فی رعایة الشرق الاوسط (مکتبة المعارف، بیروت ۱۹۵۴ء)

۳۱)الاستشراق و الخلفیة الفکریة (ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق۔ طبع اول۔ کتاب الامۃ۔ الصراع ۱۴۰۴ھ)

۳۲)الفکر الاسلامی الحدیث و صلته بالاستشراق (محمد البھی۔ دار الفکر، بیروت ۱۹۰۳ء۔ بالاستعمار الغربی)

۳۳)المدخل لدراسة الشریعة الاسلامیة (ڈاکٹر عبدالکریم زیدان۔مؤسسة الرسالة۔بیروت ۱۹۹۱ء)

۳۴)الاسلام فی الفکر الغربی (محمود حمدی زقزوق۔دار القلم۔کویت ۱۹۸۱ء)

۳۵)الدراسات الاسلامیة بالعربیة (روڈی بارٹ، ترجمہ: ڈاکٹر مصطفی ماھر، قاھرہ ۱۹۶۷ء)

۳۶)اضواء علی الاستشراق (ڈاکٹر محمد عبدالفتاح علیان۔طبع اول، دار البحوث العلمیة۔کویت ۱۹۸۰ء)

(۳۷)احذروا الاسالیب الحدیثة فی مواجهة الاسلام (سعد الدین سید صالح)

(۳۸)اخطار الغزو الفکری علی العالم الاسلامی (صابر طعیمه)

(۳۹)اسالیب الغزو الفکری للعالم الاسلامی (علی محمد جریشه)

(۴۰)اضواء علی افلام الفیدیو (محمود دیو مصطفی عبده)

(۴۱)البث المباشر حقائق و ارقام (ناصر سلیمان العمر)

(۴۲)بث وافد علی شاشات التلفزیون

(۴۳)الغزو الثقافی للامة الاسلامیة (منصور عبدالعزیز)

(۴۴)الغزو الفکری والتیارات المعادیة للاسلامیة (عبدالستار فتح اللہ الخیاط)

(۴۵)الغزو الفکری والتیارات المعادیة للاسلامیة (علی عبدالحلیم محمود)

(۴۶)جذور البلاء (عبداللہ التل)

(۴۷)الاسلام والتحدیات الجدیدة (محمد عمارہ)

دیگر زبانوں میں دیکھیے:

1-Rudi para: Der Koran uebersetzug stuttgart 1990.

2-C.E. bosworth: Orientalism and Orientlists (In Arab Islamic Biblography) 1977 Great Britain.

3- H.A. Flacher-Bernicol: Die Islamische Revolution Stuttgart 1981.

4- Johan Fueck: Die Arabschon Studien In Europa Leipzing 1995.

5- Custar pfonn Mueller: Handbuch Der Islamic Leteratur Berlin 1933.

6- M. Rodinson: Mohammed: Frankfurt 1975.

اردو میں:

۱)سازشیں بے نقاب (یاسر محمد خان)

۲)اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش (ندوی)

۳)اقصیٰ کے آنسو (مفتی ابولبابہ شاہ منصور)

۴)عالم اسلام پر امریکی یلغار کیوں؟

۵)پردہ اٹھتا ہے (یاسر محمد خان)

۶)نظام عالم اور امت مسلمہ (محمد افضل احمد)

۷)صلیبی جنگجو (ہارون یحییٰ)

۸)نظریہ ارتقاء ایک فریب (ہارون یحییٰ)

۹)مذہب اور سائنس (عبدالباری ندوی)

۱۰)اسلام اور مغرب کا تصادم (اسرار الحق)

۱۱)اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش (محمد امین)

۱۲)ہوئے تم دوست جس کے (حقی حق)

۱۳)اسلام اور گلوبلائزیشن (یاسر ندیم)

۱۴)اسلام اور عقلیات (عبدالباری ندویؒ)

۱۵)انسانی زندگی میں جمود وارتقاء (محمد قطب)

۱۶)اسلام اور مستشرقین (دارالمصنفین، اعظم گڈھ)

۱۷)عربی اسلامی علوم اور مستشرقین (ثناء اللہ ندوی)

۱۸)اسلام اور جدت پسندی (مولانا تقی عثمانی صاحب)

۱۹)اقصیٰ کی پکار (فلسطین کا عاشق معروف بہ: مفتی ابولبابہ)

۲۰)استشراق اور مستشرقین اور اس کی نقاب کشائی (مصطفی السباعی)

۲۱)اسلام پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر (ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی)

۲۲)الانتباھات المفیدة فی الاشتباھات الجدیدة (حضرت تھانویؒ)

۲۳)اسلامی مجلات، مثلاً تعمیر حیات، دارالعلوم مظاہر علوم، ندائے شاہی، الرشاد، نقوش، اسلام ------

وغیرہ۔

نوٹ: بعض ان اصحاب قلم کے نام دیئے جاتے ہیں جن کی تحریریں الغزو الفکری کے عنوان کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے:

اردو میں لکھنے والے اصحاب قلم کے نام:

مولانا علی میاں ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سعید الرحمن اعظمی، مولانا تقی عثمانی، مولانا ظفر عثمانی، علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ یوسف بنوری، حضرت حکیم الامت، حضرت حکیم الاسلام، پیر ذوالفقار نقشبندی، اکبرالہ آبادی، عبدالماجد دریا آبادی، علامہ اقبال، ہارون یحیٰ، مولانا اسرار الحق، ارسلان بن اختر، انور بن اختر، یاسر محمد خان، اوریا مقبول جان، انور غازی، مفتی ابولبابہ شاہ منصور، علامہ یوسف لدھیانوی، یاسر ندیم۔

عربی زبان میں لکھنے والے:

الاستاذ انور الجندی، الشیخ عبدالرحمن حبنکه المیدانی، الشیخ یوسف القرضاوی، الشیخ محمد قطب، الشیخ سید قطب شهید، الشیخ عبدالقادر عوده شهید، الشیخ توفیق الواعی، الشیخ قرة الداغی، الشیخ یوسف الواعی۔

الغزو الفکری پر عربی، اردو اور انگریزی میں معلومات ذیل میں دی جا رہی ویب سائٹوں سے حاصل ہوسکتی ہیں:

www.deeneislam.com
www.dailyislam.pk
www.alqalamonline.com
www.ibin-e-umar.edu.pk
www.harunyahya.com
www.khelafat-e-rashida.com
www.alhafeez.org
www.hadaaya.com
www.binoria.org
www.ashrafia.edu.pk
www.kr_chy.com
www.defendersofislam.com
www.albalagh.net
www.alsharia.org
www.darsequran.com
www.onlinefatwa.com
www.ludhianvi-shaheed.com
www.thedefendersottruth.com
www.alabrar.org
www.farooqia.com
www.jamiyaakklkuwa.com
http://zarbpk.blogspot.com

Arabic Websites:

www.almeshkat.net
www.islamonline.net
www.islamweb.net
www.isalmselect.com
www.islamway.com
www.aslein.net
www.emanway.com
www.islamtoday.net

غفلت اور لا پرواہی سے قرآن بھول جانے کا حکم

غفلت اور لا پرواہی کی بناء پر قرآن شریف کا بھلا دینا اکثر علماء کی رائے پر گناہِ کبیرہ ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ احادیث میں نسیانِ قرآن پر سخت وعید اور عذاب وارد ہوا ہے، علامہ سیوطیؒ نے ''اتقان'' میں، اور علامہ نوویؒ نے ''روضہ'' میں اس کی تصریح کی ہے، البتہ اگر بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے قرآن کریم بھول جائے تو یہ اس حکم میں داخل نہیں ہے۔ (تلاوت القرآن المجید، ص ۳۲)

علم تعبیر

مولانا عبدالستار الاعظمی
استاذ/ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

تمہید:

یہ ایسا لطیف علم ہے، جسے کافی لوگ مادیت اور نیچریت کی بنیاد پر انکار کر بیٹھے اور عصر حاضر کی زندگی بھی اپنے پورے احوال وکوائف کے ساتھ اس رویہ کی تائید میں برسر پیکار ہے، بعض لوگ اسے اوہام واساطیر کی ایک قسم اور دجل وفریب کا ایک حصہ گردانتے ہیں۔

حالاں کہ علم تعبیر اور فن رؤیا، نہ تو وہمی ہے اور نہ دجل وفریب کا مجموعہ بل کہ وہ ایک مسلّم حقیقت ہے جس کو اسلامی طبقہ کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ خواب اور ان کی تعبیریں آج کی طرح سلف میں بھی پائی جاتی تھیں بلکہ اسلام سے پہلے مختلف اقوام اور بادشاہ بھی اس فن سے مربوط تھے، اگر چہ اس فن میں ان کا طرز عمل ہم تک نہیں پہونچ سکا۔

علم تعبیر کی تعریف: علم تعبیر وہ علم ہے جس میں خوابوں کی تعبیر کے اصول وقواعد بیان کئے جاتے ہیں۔

علم تعبیر کی غرض: خواب کی تعبیر صحیح دی جاسکے، غلط تعبیر سے انسان محفوظ رہے۔

علم تعبیر کا موضوع: خواب اور اس کے متعلق احوال۔

علم تعبیر کی اسلام میں حیثیت:

ڈاکٹر عبدالستار ابو غدہ فرماتے ہیں کہ: علم تعبیر اور فن رؤیا، کے سلسلہ میں [illegible] نے ۲۳ بار بحث کی ہے مثال کے طور پر یوسف علیہ السلام کا خواب اور ابراہیم مع اسماعیل علیہما السلام کا خواب قرآن نے بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں احادیث نبویہ بھی کثرت سے وارد ہیں اور اس فن سے علما کا لگاؤ بھی کافی ہے جس کی وجہ سے علم تعبیر اور فن رؤیا، کا شمار ان علوم میں سے ہوتا ہے جن کا اسلام میں کافی اہتمام کیا گیا۔

علم تعبیر کی تعریف:

حاجی خلیفہ کشف الظنون میں لکھتے ہیں کہ: فن رویا ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ عالم غیب میں بحالت نوم مشاہدات نفس سے استدلال کا طریقہ معلوم ہوجائے چنانچہ خواب کو قوت متخیلہ ایک مثالی شکل میں پیش کرتی ہے جو عالم مشاہدات میں صاحب خواب کی رہبری کرتی ہے۔

تعبیر رویا کی حقیقت:

ابن خلدون تحریر فرماتے ہیں جب روح عاقل کسی بات کا ادراک کر کے اسے خیال کے حوالہ کرتی ہے تو خیال اسے کسی صورت میں ڈھال دیتا ہے لیکن وہ ایسی صورت میں ڈھالتا ہے، جو اس معنی سے کسی قدر مناسبت رکھتی ہو، مثلاً روح سلطان اعظم کا معنی ادراک کرتی ہے خیال اسے سمندر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

اس فن کے علما سے چند تعریفیں منقول ہیں تقریباً سب ہی اس بات کے قائل ہیں کہ: خواب ایسی چیز ہے جس کو سونے والا دیکھتا ہے اور محض اشارات و رموز کا مجموعہ ہوتا ہے، صاحب خواب اس کو سمجھنے کے لیے معبر کا محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ ان رموز و اشارات کو صاحبِ خواب کے لیے خوب واضح کردے۔

خواب کی حقیقت:

شیخ عبدالغنی نابلسی فرماتے ہیں کہ: علمائے تعبیر نے کہا کہ انسان خوابوں کو روح کے ذریعہ دیکھتا ہے، اور عقل سے سمجھتا ہے، روح کا مستقر وسط قلب اور قلب کا تعلق دماغ سے ہے، روح نفس کے ساتھ معلق ہے، چناں چہ انسان جب خواب میں ہوتا ہے تو روح چراغ یا آفتاب کی طرح ممتد ہوتی ہے، اللہ کے نور اور ضیاء کی مدد سے فرشتے کے ذریعہ دکھلائے جانے والے خواب کو دیکھتی ہے، اور اس کا اپنے نفس کی طرف واپس آنا ایسا ہے جیسے بادل سورج سے چھٹ جائے اور بیداری کی صورت میں خواب والے کو واقعہ یاد آتا ہے۔

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ حس روحانی، حس جسمانی سے اعلیٰ اور اشرف ہے، اس لیے انسان کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کو حس روحانی حس جسمانی سے پہلے ادراک کر لیتی ہے۔

قرآن میں فن رویا کی مثالیں:

یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی بابت قول خداوندی سے کوئی ناواقف نہیں ہے اس سلسلہ میں اللہ فرماتے ہیں

وقال الملک إني أری سبع بقرات سمان یا کلهن سبع عجاف و سبع سنبلات خضر و اخر یابسات ۔

شاہ مصر نے کہا کہ مجھے خواب نظر آیا ہے کہ سات موٹی گایوں کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات سبز اور باقی خشک بالیں دکھائی دی ہیں، اس خواب کی تعبیر بقول یوسف شاہ مصر کو پہونچی جو قرآن میں مذکور ہے "قال تزرعون سبع سنین دأبا فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ الا قلیلا مما تاکلون ثم یاتی من بعد ذلک سبع شداد یا کلن ما قدمتم لهن إلا قلیلا مما تحصنون"۔

یوسف علیہ السلام نے (تعبیراً) کہا کہ تم سات اپنی عادت کے مطابق کھیتی بوؤ گے اور جس قدر کھیتی تم کاٹو گے اس کو بالیوں میں (بطور ذخیرہ) رہنے دو گے لیکن تھوڑی سی اپنے کھانے کے لیے (استعمال میں لاؤ گے پھر سات سال سخت (قحط سالی) کے آئیں گے جس میں گذشتہ جمع کیا ہوا اناج سب کا سب کھا ڈالو گے۔

قرآن میں اور بھی آیات ہیں جو اس فن کے تعلق سے یوسف علیہ السلام کے خواب کو بیان کرتی ہیں جیسے، وہ خواب جو سورہ یوسف کی ابتداء میں وارد ہوا۔ "انی رأیت احد عشر کوکباً" اور ان دو آدمیوں کا خواب جن کی تعبیر بیان کی، ان میں سے ایک تو اپنے آقا (عزیز مصر) کا ساقی شراب ہوگا اور دوسرے کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا اور پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ یہ بات بھی کسی پر مخفی نہیں مل کہ واضح ہے کہ فن تعبیر اللہ تعالی کی طرف سے ایک بہت بڑا فضل اور عطیہ ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اس لیے یوسف علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کیا اور ان کے فضل کا اعتراف کیا "رب قد آیتني من الملک و علمتني من تاویل الاحادیث" اے پروردگار تو نے مجھے سلطنت عطا فرمائی اور علم تعبیر خواب بھی عطا فرمایا۔

انبیاء اور سچے خواب:

شیخ عبدالغنی نابلسی تحریر فرماتے ہیں کہ احکام شریعت میں انبیاء کرام اچھے خوابوں کو وحی الہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے حدیث میں وارد ہے کہ نبوت کے بعد بشارت دینے والا صرف سچا خواب باقی رہ گیا۔ جسے نیک شخص دیکھتا ہے یا وہ اسے دکھلایا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرماتی ہیں کہ: وحی کی ابتدا اچھے خوابوں سے ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو خواب دیکھتے وہ صبح صادق کی طرح روشن ہو کر سامنے آجاتا۔

بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو صحابہ کرام سے پوچھتے تھے کہ آج رات تم میں سے کسی نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے پوچھا کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے غلبہ اعزاز کی بشارت دیں بلا شبہ اس خواب کی قبیل سے ایک خواب ایسا ہوتا ہے جو اضغاث واحلام یعنی بے معنی خواب کے زمرے میں آتا ہے۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ: اگر یہ صورتیں روح عاقل سے حاصل ہو کر حواس میں اتر آئیں تو خواب سچا ہے اور اگر قوت حافظہ سے ماخوذ ہو جہاں خیال نے بیداری کی حالت میں انہیں جمع کرا دیا ہے تو

وہ پریشان کن اور بے معنی خواب ہیں۔

خواب کی علامتیں

علامت خواب سے متعارف ہونا ضروری ہے، تا کہ رویاء صادقہ اور اصغاث واحلام کی تمیز کی جا سکے۔ لہٰذا علمائے کرام نے سچے خواب کی کچھ علامتیں بیان کی ہیں۔ جس سے رویاء صادقہ کی پہچان کی جاتی ہے۔

(۱) خواب کے وقت خواب والا ثقالت کی وجہ سے فوراً متنبہ اور بیدار ہو جائے اور عالم حس میں جلد واپس آجائے، اگرچہ وہ مستغرق نوم ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ خواب تفصیلی طور پر یاد ہو اور وہ قوت حافظہ میں دیر تک قائم ودائم رہے۔

خواب کے آداب

خواب دو طرح کے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک تو مومن کے لیے باعث مسرت اور خوش کن ثابت ہوتا ہے اور دوسرا اس کے بالمقابل مومن کو رنج والم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن ہر قسم کے خواب کے لیے الگ الگ آداب بیان کئے جاتے ہیں اچھے خواب کا ادب یہ ہے کہ: صاحب خواب الحمدللہ کہے اور اس سے نیک فال نکالے اور اس کا تذکرہ ایسے شخص سے کرے، جو اس کے نزدیک زیادہ محبوب اور قابل اطمینان ہو۔ برے خواب کا ادب یہ ہے کہ خواب والا شیطان اور خواب کے شر کی پناہ مانگے بائیں سمت تھتکارے اور اپنی جہت کروٹ بدل لے۔ اس خواب کو کسی سے ذکر نہ کرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث وارد ہے۔ (اذا اقترب الزمان لم تكد رؤيا وآربعين جزأمن النبوة والرؤيا ثلاثة ــــــ) کتاب رویا مسلم شریف۔

جب زمانہ (قیامت کے) قریب ہو جائے تو کسی مسلمان کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا، جو شخص زیادہ سچا ہوگا، اس کا خواب بھی زیادہ سچا ہوگا، مسلمانوں کا خواب نبوت کے اجزاء میں سے پینتالیسواں حصہ ہے خواب کی تین قسمیں ہیں۔ ایک صالح خواب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہے، دوسرا غمگین کرنے والا خواب ہے، جو شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ تیسرا وہ خواب ہے جو انسان کے خیالات اور خواہشات کا عکس ہوتا ہے۔ اگر تم میں کا کوئی شخص ناپسندیدہ خواب دیکھے تو وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے اور لوگوں کو وہ خواب بیان نہ کرے۔

معبر کے قوانین

علامہ عبدالرحمن ابن خلدون رقمطراز ہیں کہ: علم تعبیر ان کلی قوانین کا علم ہے جن پر معبر خواب کے واقعہ اور اس کی تعبیری عمارت اٹھاتا ہے۔ اور موقع کے لحاظ سے تعبیر بتاتا ہے اسی سے خواب کے ایک ہونے کے باوجود تعبیریں مختلف ہوتی ہے جیسے سمندر کی تعبیر بادشاہ سے بھی غیظ وغضب سے بھی اور رنج وغم سے بھی ہو سکتی ہے لہٰذا معبران کلی

قوانین کی رعایت کرتا ہے اور ہر جگہ وہی تعبیر دیتا ہے جسکا قرآن تقاضا کرتا ہے کہ **کونسی تعبیر اس خواب** کے لائق ہے۔

فن تعبیر کے امام اور ان کی صفتیں

اس علم میں محمد بن سرین بڑے مشہور عالم گزرے ہیں لوگوں نے آپ ہی سے اس فن کے قوانین لکھے ہیں اور آج تک وہی قوانین نقل ہوتے چلے آتے ہیں۔آپ کے بعد علامہ کرمانی نے بھی اس پر قلم اٹھایا ہے۔متکلمین میں سے متاخرین نے بھی کتابیں لکھیں پھر علامہ ابن سرین جو اس فن کے امام ہیں اور علمبر دار ہیں۔علم تعبیر کے سلسلہ میں ان سے بہت سی باتیں منقول ہیں اسی میں ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن سرین رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں نے نماز کی اذان کہی، ابن سیرین نے فرمایا تو اسلامی حج پورا کرے گا، اسی وقت ایک شخص اور آیا، اس نے بھی یہ سوال کیا کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو اذان نماز کہتا ہوا دیکھا، علامہ ابن سیرین نے تھوڑا سا جائزہ لیا اور اپنے حلقہ اطراف سے کہا پکڑو اسے یہ تو چور ہے، لوگوں نے اس تعبیر پر تعجب کیا، اور ان کے تعجب میں اس وقت اضافہ اور بڑھ گیا جب اس نے چوری کا اعتراف کر لیا، علامہ ابن سیرین نے اختلاف تعبیر کی وجہ بتلاتے ہوئے آیت قرآنیہ کی تلاوت فرمائی، اور کہا کہ پہلا (واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر) کے مناسب تھا، اور دوسرے کا خواب (فاذن مؤذن ایتھا العیر إنکم لسارقون) کا مصداق تھا۔

علامہ شیخ عبدالغنی نابلیسی معبر کی صفات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: معبر کے سامنے جب خواب بیان کیا جائے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ یہ جملہ کہے، اچھا خواب دیکھا، ہم اس میں خیر ہی پاتے ہیں اور اس کی برائی سے بچتے رہیں گے، یہ خواب ہمارے لیے بہتر اور مفید ہے، اور ہمارے دشمنوں کے لیے مضر ہے، الحمد للہ اپنے خواب کو بیان کرو، اور معبر کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے عیب پر پردہ ڈالے۔

معبر کے لیے ضروری ہے کہ مکمل سوال سن لے، اچھے و برے کے مابین تمیز کر لے، تعبیر کے بتانے میں جلدی نہ کرے بل کہ ذرا مہلت دے، خواب کی تعبیر اس وقت تک نہ بتائے جب تک خواب دیکھنے والی چیز کی تعین نہ کر لے اور خواب کی ہر نوعیت پر غور کرے کہ کونسی تعبیر اس خواب کے لائق ہے۔

معبر کی صفات

اس کی صفات یہ ہیں کہ ذکاوت وذہانت اور فطانت سے متصف ہو کتاب وسنت سے خوب واقف ہو، عربی زبان، امثال وحکم، اور زبان دارجہ کا واقف ہو۔

اضطراری وقت میں خواب کی تعبیر نہیں بتائی جاتی اور یہ تین ہیں بطلوع شمس، غروب شمس، زوال شمس۔

فن تعبیر کے مشہور ائمہ

کو علم تعبیر میں اکثر اولیاء وعلمائے ربانیؒ کو کافی دسترس ہوتی ہے۔لیکن مندرجہ ذیل چھ بزرگ اس علم میں

خاص طور پر ماہر مشہور اور یکتائے زمانہ ہو کر گزرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس علم میں ان چھ اماموں کے اقوال بطور سند پیش کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) حضرت دانیال علیہ السلام
(۲) حضرت امام جعفر صادقؒ
(۳) حضرت امام سیرینؒ
(۴) امام جابر مغربیؒ
(۵) حضرت امام ابراہیم کرمانیؒ
(۶) حضرت امام اسماعیل اشعثؒ

نوٹ۔ اگرچہ یہ چھیوں امام علم تعبیر میں خود یگانہ روزگار تھے لیکن حضرت امام محمد بن سیرینؒ کا نام نامی اس علم میں خاص طور پر زبان زد خلائق ہے۔ گویا یوں کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن سیرین بلحاظ شہرت علم تعبیر کے آسمان کے آفتاب ہیں۔

فن تعبیر میں مشہور کتابیں۔

ویسے تو علم تعبیر کی ہر زبان میں بے شمار کتابیں ہیں مگر مندرجۂ ذیل کتابیں اس فن میں زیادہ مشہور و مقبول اور مستند ہیں کیوں کہ ان کتابوں کے مصنفین اس علم میں ماہر و کامل ہو کر گزرے ہیں۔ وہ کتب یہ ہیں:

(۱) کتاب التقسیم حضرت امام جعفر صادق
(۲) کتاب جامع حضرت امام ابن سیرین
(۳) کتاب دستور حضرت امام ابراہیم کرمانیؒ
(۴) کتاب امام جابالارشاد مغربی
(۵) کتاب التعبیر امام اسماعیل بن اشعث
(۶) کتاب کنز الرؤیا امام ماموثؒ
(۷) کتاب بیان التعبیر حافظ ابن اسحاقؒ
(۸) کتاب التعبیر حافظ ابن اسحاقؒ
(۹) کتاب کافی الرؤیا حافظ ابن اسحاقؒ
(۱۰) کتاب جمل الدلائل والمنامات
(۱۱) کتاب مبادی التعبیر حافظ ابن اسحاقؒ
(۱۲) کتاب ایضاح التعبیر امام فخرؒ
(۱۳) کتاب التعبیر بطاوس
(۱۴) کتاب مفرح الرؤیا بطاوس
(۱۵) کتاب تحفۃ الملوک بطاوس
(۱۶) کتاب منہاج التعبیر امام خالد اصفہانیؒ
(۱۷) کتاب مقدمۃ التعبیر امام خالد اصفہانی
(۱۸) کتاب وجیین امام محمد بن شاہویہؒ
(۱۹) کتاب حقائق الرؤیا امام محمد بن شاہویہؒ
(۲۰) تعطیر الانام فی تعبیر المنام عبدالغنی نابلسی
(۲۱) کتاب الوصول حضرت دانیال علیہ السلام
(۲۲) تعبیر ابن المقری ابن المقری
(۲۳) کتاب ابن ابی طالب القیروانی
(۲۴) کتاب الاشارات الخلیل ابن شاہین
(۲۵) کتاب التعبیر ابوسعید الواعظ

(۲۶)التعبیر المنیف والتاویل الشریف محمد بن قطب الدین الرومی

اردو مراجع

تعبیر الرؤیا مترجم: مولانا ابوالقاسم دلاوری

تعبیر نامہ خواب مترجم: حبیب احمد قاسمی

خوابوں کی تعبیر کا انسائیکلوپیڈیا ترجمہ: مولانا خالد محمود

خواب اور تعبیر ترجمہ: محمد انیس حیتر امی

علم نحو

(مولانا) عبدالعظیم امراؤتی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، جامعہ اکل کوا

علم نحو، مبادیات نحو، کتب نحو، اور متعلقاتِ نحو کے بارے میں جاننے سے پہلے ہمارے لیے سب سے پہلے یہ مناسب ہے کہ ہم عربی زبان کے علوم سے آشنا اور آگاہ ہوجائیں، اس لیے کہ ان علوم کا تعلق کتاب اللہ اور احادیث شریفہ کے فہم سے ہے۔

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ کی فصل نمبر ۵۴ رمیں عربی زبان کے علوم پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں، کہ عربی زبان کے چار ارکان (علوم) ہیں:

(۱)علم لغت (۲)علم نحو (۳)علم بیان (۴)علم ادب

اہل شریعت کے لیے ان چاروں علوم میں مہارت حاصل کرنا لازم اور ضروری ہے، اس لیے کہ تمام احکام شرعیہ کا منبع و ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے، اور یہ دونوں عربی زبان میں ہیں؛ اسی طرح ان کے ناقلین صحابہؓ اور تابعین بھی عرب ہی ہیں، پھر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشکل مقامات بھی عربی زبان میں حل کئے گئے ہیں، اس لیے جو لوگ شریعت کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس زبان کے متعلقہ علوم میں مہارت حاصل کریں۔

یہ تمہید باندھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ علوم اسلامیہ دینیہ اور علوم عربیہ کے مابین مضبوط اور گہرے ربط کی وضاحت ہوجائے؛ نیز اسی طرح ان لوگوں کا وہم بھی دور ہوجائے، جو یہ باور کرتے ہیں کہ بلا علم لغت کے بھی دین کا فہم ممکن ہوسکتا ہے۔ اسی کو شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

حفظ اللغات علینا فرض کفرض الصلاۃ

فلیس یحفظ دین الا بحفظ اللغات

ان چاروں علوم میں بھی سب سے زیادہ اہم اور مقدم علم نحو ہے، کیوں کہ مقاصد پر دلالت اور رہنمائی قواعد نحو ہی سے معلوم ہوتی ہے نحو ہی سے فاعل اور مفعول مبتدا و خبر کا علم ہوتا ہے۔

تو آیئے! ہم آپ کو علم نحو کی تعریف، غرض، علم نحو کی ایجاد، اعرابی غلطیاں واقع ہونے کے اسباب، قواعد نحو کی وضع کیسے ہوئی، واضعین نحو، مسائل نحو، اور کتب نحو کی سیر کراتے ہیں۔

علم نحو کی تعریف: علم نحو چند ایسے قواعد کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعہ تینوں کلموں (اسم، فعل، حرف) کی آخری حالت باعتبار معرب اور مبنی کے جاننا۔ اور علم نحو نام ہے بعض کلموں کو دوسرے بعض کے ساتھ مرکب کرنے کی کیفیت جاننے کا۔

علم نحو کی غرض: کلام عرب میں ذہن کو لفظی غلطی سے بچانا۔

علم نحو کی تدوین: حقیقی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہی کچھ لوگ اعرابی غلطیوں کا شکار ہونے لگے تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کسی آدمی نے کوئی اعرابی غلطی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا: اَرْشِدُوْا اَخَاکُمْ فَقَدْ ضَلَّ تم اپنے بھائی کی رہنمائی کرو، کیوں کہ اس نے غلطی کی۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص سے اعرابی غلطی سنی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَنَا مِنْ قُرَیْشٍ وَ نَشَأْتُ فِیْ بَنِیْ سَعْدٍ فَاَنّٰی لِیَ اللَّحْنُ، میرا تعلق قریش سے ہے، اور میں بنی سعد میں پروان چڑھا ہوں، تو مجھ سے غلطی کا امکان نہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں، اہلِ عرب کے اندر، دورانِ گفتگو اعرابی غلطیوں کا ظہور ہو چکا تھا، البتہ کس حدیث میں ان اغلاط کی صراحت نہیں آئی، جن کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی: اَرْشِدُوْا اَخَاکُمْ فَقَدْ ضَلَّ، اَنَا مِنْ قُرَیْشٍ وَ نَشَأْتُ فِیْ بَنِیْ سَعْدٍ فانی لی اللحن۔

البتہ تاریخ علم نحو کے مراجع، بنظر غائر مطالعہ سے دوسری اعرابی غلطیوں کی نشاندہی ہوتی ہے، مثلاً: حضرت عمرؓ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو صحیح طور پر تیر اندازی کرنا نہیں جانتے تھے، تو حضرت عمر نے ان کو ڈانٹا، تو انہوں نے جواب دیا: ''اِنَّا قَوْمٌ مُتَعَلِّمِیْنَ'' تو حضرت عمرؓ نے غصہ کی حالت میں اعراض کرتے ہوئے کہا: ''وَاللّٰہِ خَطَأُکُمْ فِیْ لِسَانِکُمْ اَشَدُّ عَلَیَّ مِنْ خَطَئِکُمْ'' قسم بخدا، تمہاری زبان کی غلطی میرے نزدیک تمہاری غلط تیر اندازی سے زیادہ خطرناک ہے، کیوں کہ میں نے رسول اللہ کو کہتے ہوئے سنا: ''رَحِمَ اللّٰہُ اِمْرَأً اَصْلَحَ مِنْ لِسَانِہٖ''، اللہ ایسے شخص پر رحم کرے، جس نے اپنی زبان کو درست کرلیا، (ان کو ''انا قوم متعلمون'' کہنا چاہیے تھا، اس لیے

کہ "متعلمون" "إنّ" کے خبر کی صفت واقع ہورہی ہے)۔

دوسری مثال: ابوموسیٰ اشعری کے کہنے پر ان کے ایک کاتب نے حضرت عمرؓ کے نام ایک خط لکھا، جس میں تھا "مِن ابوموسي الاشعري"۔ حضرت عمرؓ نے اس غلطی کو دیکھنے کے بعد، حضرت ابوموسیٰ اشعری کے نام خط لکھا: سَلامٌ عَلَیک، اما بعد! فَاضرِبْ کَاتِبَکَ سَوطاً، وَ اَخِّرْ عَطَائَهُ سَنَةً۔ اپنے کاتب کو ایک کوڑا لگاؤ، اور اس کی تنخواہ کو ایک سال تک مؤخر کردو۔ (صحیح یہ تھا: مِن ابی موسي الاشعري)۔

تیسری مثال:

ایک آدمی زیاد ابن اُمیہ کے پاس آکر کہتا ہے: "إنَّ اَبونَا مَاتَ، وَ إنَّ أخینا وَثَبَ علی مالِ اَبانَا، فقال زِیاد: لِلَّذِي أضَعْتَهُ مِن کَلامِکَ أضَرّ عَلَیکَ مِمَّا أضَعْتَهُ فِي مالِکَ"۔

صحیح یہ تھا: "إنَّ أبانا مَاتَ، وَإنَّ أخانا وَثَبَ علی مالِ أبِینا"۔

چوتھی مثال:

اسی طرح ایک دیہاتی کی لاٹھی گرگئی تو اس نے کہا "سَقَطَتْ عَصَایِي" (حالاں کہ اس کو کہنا چاہیے تھا: عصای) ان مثالوں کے علاوہ بھی کئی ایک مثالیں ملتی ہیں، مزید تفصیل کے لیے دیکھیے (رؤیة جدیدة فی نشأة النحو العربي)۔

رہی بات تدوین نحو کی، کہ کونسا واقعہ قواعد نحو کے وضع کرنے کا سبب بنا، اس سلسلے میں بھی مختلف واقعات مختلف لوگوں سے ملتے ہیں، اختصار کے خاطر پیش نظر دو پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

تدوین نحو کا سب سے مشہور واقعہ ہے جو تاریخ نحو میں موجود ہے، جس کو امام الاصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں نقل کیا ہے، کہ ایک مرتبہ ابوالاسود دؤلی بصرہ کے اندر انتہائی شدید گرمی کی حالت میں اپنی بیٹی کی ملاقات کے لیے گئے، تو بیٹی نے کہا: "یَا أبتِ مَا أشَدُّ الحَرِ" تو ابوالاسود دؤلی سمجھے کہ بیٹی سوال کررہی ہے، اور پوچھ رہی ہے کہ گرمی کا کونسا زمانہ سخت ہوتا ہے۔

تو ابوالاسود دؤلی نے جواب دیا کہ شَهْرَ نَاجِرٍ، (زمانہ جاہلیت میں ماہِ رجب اور ماہِ صفر کو ناجر کہا جاتا تھا، کیوں کہ ان دونوں مہینوں میں سخت گرمی ہوتی تھی)، اس کے بعد بیٹی نے کہا کہ ابا جان میں آپ کو بتلارہی ہوں، آپ سے پوچھ نہیں رہی ہوں۔ ابوالاسود دؤلی نے کہا کہ بیٹی تب تو "مَا أشَدَّ الحَرَّ!" کہو۔ یہ واقعہ ان کے لیے علم نحو کی تدوین کا سبب بنا۔

اسی طرح نحو کی ایجاد کا واقعہ امام عاصمؒ نقل کرتے ہیں، جو اسی جیسا ہے، الفاظ مختلف ہیں، کہ ایک دن ان کی بیٹی نے ان سے کہا "مَا أحْسَنُ السَّمَاءِ؟" (کس چیز نے آسمان کو خوبصورت کیا)، تو والد نے کہا، ستاروں نے، بیٹی نے کہا، میں تو یہ نہیں پوچھ رہی ہوں، کہ کس چیز نے آسمان کو خوبصورت کیا، بل کہ میں تو اس کی خوبصورتی پر تعجب کررہی

ہوں، تو والد نے کہا، پھر یہ کہا کرو: "مَا أَحْسَنَ السَّمَاءَ!" (یعنی آسمان کیا ہی خوبصورت ہے) اس غلطی کو محسوس کرتے ہوئے، ابوالاسود نے باب تعجب، باب استفہام قلمبند کیا۔ اس واقعہ کے بعد ابوالاسود دؤلی نے تدوین نحو کی طرف بھرپور توجہ دی۔

اعرابی غلطیوں کے اسباب:

اعرابی غلطیوں کے واقع ہونے کے اسباب یہ ہوئے کہ، جوں جوں اسلام کا نور چہار دانگ عالم میں پھیلنے لگا، اور عربوں نے دنیا کی قوموں کو مسخر کرنے اور اسلام کی تبلیغ نشر واشاعت کے لیے حجاز کو چھوڑا، اور عجمیوں سے گہرے تعلقات پیدا کئے، تو ان کے پیدائشی ملکہ میں فتور پیدا ہونے لگا، کیوں کہ ان کے کانوں میں نو آموز عربوں سے غلط عربی پڑنے لگی، اور سنتے سنتے وہ بھی غلط عربی بولنے لگے۔

نحو کے قواعد کی وضع کیسے ہوئی؟

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ جب خالص اہلِ عرب بھی غلط الفاظ ومحاورے استعمال کرنے لگے، تو علماء عرب کو ڈر ہوا کہ، زبان میں فساد پورے طور سے واقع نہ ہوجائے، اور اس بگاڑ پر ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد قرآن وحدیث کا سمجھنا مشکل ہوجائے، چناں چہ اس دور کے اہلِ علم حضرات نے کلامِ عرب کو سامنے رکھ کر ان کے عربی محاورات سے کلی قوانین وضع کئے، جن پر قسم قسم کے کلام کو قیاس کیا جاتا ہے اور نظائر کو نظائر سے ملا دیا جاتا ہے۔

مثلاً: - فاعل پر پیش آتا ہے، مفعول بہ پر زبر آتا ہے، اور مبتدا پر پیش آتا ہے۔

پھر علماء نے دیکھا کہ کلمات کی حرکات سے معنی بدل جاتے ہیں۔

تو انہوں نے اصطلاح میں حرکات کا نام اعراب رکھا، اور حرکت بدلنے والے کو عامل کہا۔ غرضیکہ اس علم نحو کی مخصوص اصطلاحیں وضع کرلیں۔

واضعین نحو کون؟:

علما کا اس سلسلے میں شدید اختلاف ہے کہ علم نحو کی بنیاد کس نے رکھی اور کون قواعد نحو کے موجد ہیں؟

سب سے پہلا قول یہ ہے کہ علم نحو کے واضع ابوالاسود دؤلی ہیں، یہی وہ شخص ہیں جنہوں نے حرکات معروفہ ،ضمہ، فتحہ، کسرہ کی ایجاد کی، اس وقت جبکہ انہوں نے ایک کاتب کا انتخاب کیا، اور اس کو حکم دیا کہ ایک کتاب اور ایسا رنگ لو، جو روشنائی کے رنگ سے جدا ہو جب تم مجھ کو دیکھو کہ میں نے حرف کے ساتھ منھ کھولا ہے تو حرف کے اوپر ایک نقطہ لگا دینا، اور اگر میں ہونٹوں کو ملا دوں تو حرف کے سامنے ایک نقطہ لگا دینا، اور اگر میں ہونٹوں کو جھکا کر کھوں تو حرف کے نیچے ایک نقطہ لگا دینا، اور اگر میں ان میں سے کسی ایک کو بطور غنہ کے ملا دوں تو نقطہ کی جگہ دو نقطے لگا دینا۔

دوسرا قول: "نزهة الالباء في طبقات الادباء" میں مذکور ہے کہ علم العربیہ کے واضع اول اور قواعد کی بنیاد رکھنے والے اور اس کے حدود کی حد بندی کرنے والے حضرت علیؓ ہیں اور حضرت علیؓ نے ابوالاسود کو اس کی طرف توجہ

ولائی اوران کوحکم دیا کہ "انح ھذا النحو "،اس طریقہ پر چلو۔

تیسرا قول: واضع اول عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج۔

چوتھا قول: بعض علمانے نصر بن عاصم کوواضع اول مانا ہے۔

ان چاروں اقوال میں ،راجح قول یہ ہے کہ علم النحو کے واضع اول حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ ہے۔

استادسعید الافغانی ،اپنی کتاب (تاریخ النحو) میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابوالاسود سے یحی بن یعمر نے عنبسہ الفیل نے ،میمون الاقرن نے ،مضر بن عاصم نے ،عطاء بن ابی الاسود نے ،اور ابونوفل بن ابی عقرب نے علم نحو سیکھا، پھر ان علمائے کرام سے علمائے بصرہ نے نسلاً بعد نسل علم نحو سیکھا،تقریباً سوسال کے بعد ان کے تلامذہ سے علم نحو پروان چڑھا اورانہیں میں سے کچھ کوفہ گئے ،جنہوں نے وہاں علم نحو کی تعلیم دی،وہیں سے علم نحو کا کوفی مکتبہ فکر قائم ہوا۔

ہارون رشید کے دور میں خلیل ابن احمد الفراہیدی کا زمانہ آیا ،اس وقت لوگ علم نحو کے پہلے سے زیادہ محتاج تھے ،کیوں کہ اختلاط سے عرب اپناملکہ لسانی کھو چکے تھے ،لہذا خلیل نے نحو کی اصلاح ودرستی کرتے ہوئے ،اس کے تمام ابواب کوتکمیل تک پہنچایا پھر سیبویہ نے ان کی شاگردی میں نحو پر چار چاند لگا دیے،اس کے فروع درفروع نکالے اور ہر مسئلے پر دلائل وشواہد پیش کئے ،اوراس علم میں انہوں نے ایک ایسی مشہور کتاب لکھی ،جو بعد کے علمائے نحو کے لیے ہمیشہ مثال اورنمونہ بنی رہی ۔ان کے بعد ابوعلی الفارسی اور ابوالقاسم الذجاج کا زمانہ آیا ،انہوں نے مختصر رسائل طلباءنحو کے لیے لکھے، لیکن ان سب میں سیبویہ کے نقش قدم پر چلے۔

مسائل علم نحو:

اگرہم نحو کے تمام مضامین کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں،توہم کوایک ایسی کتاب کی ورق گردانی کرنا پڑے گی ،جوعلم نحو میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے ،مثال کے طور پر علامہ ابن ہشام کی شہرۂ آفاق کتاب ،مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب ہے ،جن میں صاحب کتاب نے نحو کے تمام مسائل کوشرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ،ہم آپ کے سامنے اس کتاب کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں ،علامہ ابن ہشام نے اس کتاب کوآٹھ ابواب میں منقسم کیا ہے:

پہلا باب: مفردات کی تفسیر اوران کے احکام کے بیان میں ،مفردات سے ان کی مراد ،اسماءظروف اوران کے علاوہ وہ اسماء ہیں جومعنی حرف کو متضمن ہوتے ہیں جیسے من استفہامیہ اور ما استفہامیہ وغیرہ مگراسی باب میں انہوں نے ضرورت شدیدہ کے پیش نظران اسماء کا بھی ذکر کیا ہے ،جومعنی حرف کو متضمن نہیں ہوتے جیسے: کلا، کلتا۔اسی طرح بعض افعال بھی اسی باب میں انہوں نے ذکر کئے ہیں۔ جیسے حاشا، خلا اور عدا۔نیز باب اول میں انہوں نے تسہیل کے پیش نظر مفردات کوحروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا ہے ،مگراس ترتیب میں انہوں نے صرف پہلے حرف کا اعتبار کیا ہے۔

دوسرا باب: جملہ کی تفسیر اوراس کے اقسام اوراحکام کے بیان میں ہے۔

اس باب میں انہوں نے اولاً جملے کوتین اقسام ،جملہ اسمیہ ،فعلیہ اورظرفیہ میں منقسم کیا ہے بعد ازاں انہوں

نے جملہ کی ایک اور تقسیم بیان کی ہے کہ جملہ دو قسم پر ہے: صغری، کبری۔ اس کے بعد آگے چل کر انہوں نے وہ جملے بیان کئے ہیں، جن کے لیے محل اعراب نہیں ہوتا، چناں چہ ایسے جملے سات ہیں:

(۱) جملہ ابتدائیہ یا مستانفہ۔　　(۲) جملہ معترضہ۔

(۳) جملہ تفسیریہ۔　　(۴) وہ جملہ جو جواب قسم واقع ہو۔

(۵) وہ جملہ جو شرط غیر جازم کا جواب واقع ہو مگر فا۔ اور۔ إذا فجائیہ کے ساتھ مقترن نہ ہو۔

(۶) وہ جملہ جو صلہ واقع ہو۔　　(۷) وہ جملہ جو ان چھ جملوں میں سے کسی کا تابع ہو۔

اس کے بعد انہوں نے وہ جملے بیان کئے جنکے لیے محل اعراب ہوتا ہے چناں چہ ایسے جملے بھی سات ہیں:

(۱) وہ جملہ جو خبر واقع ہو۔　　(۲) وہ جملہ جو حال واقع ہو۔

(۳) وہ جملہ جو مفعول واقع ہو۔　　(۴) وہ جملہ جو مضاف الیہ واقع ہو۔

(۵) وہ جملہ جو شرط جازم کا جواب واقع ہو اور فا۔ یا۔ إذا فجائیہ کے ساتھ مقترن ہو۔

(۶) وہ جملہ جو مفرد کا تابع ہو یعنی جو مفرد کی صفت ہو، مفرد پر معطوف ہو یا مفرد سے بدل ہو۔

(۷) وہ جملہ جو ان چھ چیزوں میں سے کسی ایک کا تابع ہو۔

بعد ازاں انہوں نے اسی باب میں معرفہ اور نکرہ کے بعد آنے والے جملوں کے احکام تفصیل سے بیان کئے۔

تیسرا باب: شبہ جملہ یعنی ظرف اور جار مجرور اور ان کے فعل، شبہ فعل، اور معنی فعل سے متعلق ہونے کے احکام کے بیان میں ہے۔

اسی باب میں انہوں نے ظرف اور جار مجرور کے فعل ناقص، فعل جامد اور حروف معانی سے متعلق ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں مفصل بحث کی ہے۔ اور وہ حروف جارہ بھی بیان کئے ہیں، جو فعل اور شبہ فعل وغیرہ سے متعلق نہیں ہوتے، اس کے علاوہ اور بھی کئی مفید مباحث اس باب میں مذکور ہیں۔

چوتھا باب: ان کلمات کے احکام اور مسائل کے بیان میں ہے، جو نحو کے طالب علم کو اکثر پیش آتے رہتے ہیں، اس باب میں انہوں نے کئی مفید مباحث ذکر کئے ہیں۔

مثلاً: مبتدا اور خبر کے احکام، اور ان کے درمیان فروق، فاعل و مفعول کے احکام، اور ان کے درمیان فروق، عطف بیان، اور بدل کے احکام، اور ان کے درمیان فروق، اسم فاعل، صفت مشبہ کے احکام، اور ان کے درمیان فروق، حال اور تمیز کے احکام، اور ان کے درمیان فروق، حال کے اقسام، اسماء شرطیہ، اور اسماء استفہام کا اعراب اور ان کی ترکیبیں، مبتدا کو کہاں نکرہ لایا جاسکتا ہے، عطف کے اقسام، عطف الخبر علي الانشاء، اور اس کے عکس کا بیان، عطف الاسمية علي الفعلية، اور اس کے عکس کا بیان؛ دو مختلف عاملوں کے معمولوں پر عطف کا بیان، وغیرہ وغیرہ۔

پانچواں باب: ان دس وجوہ کے بیان میں ہے، جن کے باعث ترکیب کرنے والے پر اعتراض وارد ہوتا ہے، اور وہ غلطی کر بیٹھتا ہے، ان دس وجوہ کا جاننا نحو کے طالب علم کے لیے ناگزیر ہے، ان وجوہ عشرہ کے بعد انہوں نے

خاتمہ کے عنوان کے تحت کئی مفید مباحث ذکر کیے ہیں، جن سے واقف ہونا نحو کے طالب کے لیے ازحد ضروری ہے۔

چھٹا باب: ان امور کے بیان میں ہے، جو عام طور سے طلبا اور علما کے درمیان میں مشہور ہیں، مگر غلط ہیں۔ اس باب میں انہوں نے ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی اصلاح بھی کی ہے، بعد ازاں خاتمہ کے عنوان کی تحت ترکیب کے لیے مزید کچھ ہدایات بیان کی ہیں۔

ساتواں باب: ترکیب کے طریقہ کے بیان میں ہے، اس باب میں انہوں نے ترکیب کرتے وقت الفاظ کی تعبیر کا طریقہ بیان کیا ہے اور ترکیب کے لیے لازم امور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

آٹھواں باب: قواعد کلیہ کے بیان میں ہے۔ اس باب میں انہوں نے گیارہ قواعد کلیہ بیان کئے ہیں، جن سے آگاہی حاصل کرنا نحو کے طالب علم کے لیے بہت ضروری ہے۔

لطائف نحویہ: اس مضمون کے تحت ہم چند واقعات کا ذکر کر رہے ہیں، تاکہ نحو کی اہمیت وضرورت مزید واضح ہوجائے، نیز اس علم کے سلسلہ میں طلبہ کی رغبت میں اضافہ ہو۔

(۱) ایک ناسمجھ نے آیت "فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ" میں، لفظ "بیوت" کو رفع کے ساتھ پڑھا، ایک شخص نے اس سے کہا: بھائی! لفظ "بیوت" میں قرأت جر کے ساتھ ہے؛ تو ناسمجھ بولا: او بے وقوف! جب خدا نے "فِیْ بُیُوْتٍ اِذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ" فرمایا ہے، تو، تو کیوں جر دیتا ہے؟ (آیت میں "ان ترفع" کے معنی، پیش دینا نہیں، اور "بیوت" سے مراد، لفظ "بیوت" نہیں، بل کہ اس سے مراد "مساجد" ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ یہاں رفع کے معنی پیش دینا، اور بیوت سے مراد لفظ بیوت ہے، جس میں رفع کی اجازت دی جارہی ہے۔

(۲) امام عسکری نے کتاب التصحیف میں ذکر کیا ہے، کہ ایک آدمی سے کہا گیا "مَافَعَلَ اَبُوْکَ بِحِمَارِہٖ" (تیرے باپ نے اپنے گدھے کا کیا کیا؟) اس نے کہا "بَاعِہٖ" (کسرہ کے ساتھ) باعہ (عین پر فتح) کے بجائے کسی نے پوچھا، کیوں کہتے ہو؟ "بَاعِہٖ" (کسرہ کے ساتھ)، اس نے کہا تم نے کیوں کہا: بحمارہ۔ اس نے کہا، جب تیری "با" جر دیتی ہے، تو میری "با" کیوں جر نہیں دیتی؟ (گویا اس بے وقوف نے "باعہ" میں حرف اصلی کو بھی حرف جر سمجھا)۔

(۳) خطیب بغدادابوبکر بن علی بن ثابت المتوفی ۴۶۳ھ نے "اخبار النحویین" میں حکایت بیان کی ہے، کہ ایک شخص نے بصرہ میں ایک ماہی فروش سے کہا "بِکَمْ هٰذِهِ السَّمَكَةُ؟" (یہ مچھلی کتنے کی ہے) ماہی فروش نے، کہا "بِدِرْهَمَانِ" (دو درہم کی)۔ اس کو "بِدِرْهَمَيْنِ" کہنا چاہیے تھا۔ کیوں کہ "ب" حرف جر ہے۔ اس کے جواب پر سائل ہنس پڑا۔ ماہی فروش نے کہا، تو بے وقوف ہے، جو اس جملہ پر ہنستا ہے، میں نے خود سیبویہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے "ثَمَنُهَا دِرْهَمَانِ"۔

(۴) ایک روز میں نے کہا کہ جملہ اسمیہ حالیہ (و) کے بغیر بھی فصیح کلام میں آتا ہے "خِلَافًا لِلزَّمَخْشَرِیْ" "کَقَوْلِهٖ تَعَالٰى وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ"، اس پر کسی نے کہا "وُجُوْهُهُمْ" کے شروع میں تو واؤ موجود ہے، حالاں کہ وہ نفس کلمہ کا واؤ ہے۔

(۵)　حضرت عمر بن عبدالعزیز ولید بن عبدالملک کے پاس بیٹھے ہوئے تھے الاثناء دوران گفتگو غلطی بہت کرتا تھا، چناں چہ اس نے کہا "اُدْعُ لِیْ صَالِحٌ" (حالاں کہ "صَالِحاً" کہنا چاہیے تھا) لڑکے نے آواز دے دی "یَاصَالِحاً" ولید نے کہا: اس سے الف گرادے (کیوں کہ "یَاصَالِحاً" منادی مفرد معرفہ ہے جو مبنی بر ضمہ ہوتا ہے)۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا، اے امیر المومنین! اور آپ الف کا اضافہ کیجیے، کیوں کہ "اُدْعُ لِیْ صَالِحًا" میں، صالحاً مفعول بہ۔

(۶)　ایک مرتبہ ولید کے پاس اشراف قریش میں سے ایک شخص آیا، ولید نے اس سے کہا "مَنْ خَتَنَکَ؟" (جس کے معنی ہے تیرا ختنہ کس نے کیا ہے؟) حالاں کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ تیرا داماد کون ہے؟ اس نے کہا: فلاں یہودی نے، ولید نے کہا: تیرا برا ہو، کیا کہہ رہا ہے، اس نے کہا، شاید آپ میرے داماد کا پوچھ رہے ہو، میرا داماد فلاں بن فلاں ہے یعنی "مَنْ خَتَنُکَ؟" کہنا چاہیے تھا۔

(۷)　ایک واقعہ اس طرح بھی نقل ہوا ہے، خلیفہ عبدالملک کے پاس ایک شخص آیا، جس نے اپنے داماد کی شکایت کی، اس کو پوچھا تو "مَاشَانُکَ؟" تھا (ضمہ کے ساتھ)، تیرا کیا معاملہ ہے؟ لیکن کہہ دیا "مَاشَانَکَ؟" (نون پر فتحہ) تجھے کس نے عیب دار بنا دیا؟ اور اس طرح پوچھا تھا "مَنْ خَتَنُکَ؟" (ضمہ کے ساتھ)، یعنی تیرا داماد کون ہے؟ لیکن کہہ دیا "مَنْ خَتَنَکَ" (فتحہ کے ساتھ)، تیرا ختنہ کس نے کیا؟

(۸)　حضرت علیؓ ایک جنازے کے پیچھے جا رہے تھے، کسی نے پوچھا "مَنِ الْمُتَوَفِّي؟" (بصیغۂ اسم فاعل)، حضرت علیؓ نے جواب دیا "هُوَ اللّٰهُ" "موت دینے والا اللہ ہے۔ حالاں کہ اسے پوچھنا تھا "مَنِ الْمُتَوَفّٰی؟" (بصیغۂ اسم مفعول) کون فوت ہو گیا ہے؟

آخری بات:　صرف ونحو اور جملہ علوم عربیہ کے سیکھنے اور پڑھنے کا اصل مقصد قرآن وسنت کو سمجھ کر اس کے تقاضوں کو پورا کر کے رب العالمین کو راضی کرنا ہے، اگر صرف ونحو پڑھنے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے، تو (فَبِهَا وَنِعْمَتْ) ورنہ

در صرف صرف کردی عمر عزیز را
در نحو محو گشتی نہ شناختی خدا را

کا مصداق بن کر سعی اور دوڑ دھوپ عبث ہو کر "هَبَاءً مَّنْثُوْرًا" ہو جائے گا، اعاذنا اللہ من ذلک۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علم دین ہمارے لیے اتحاد امت اور اقامت دین کا ذریعہ بنا دے اور علم غیر نافع سے اپنی پناہ میں رکھے۔ (ماخوذ از معارف النحو)

نحو کی مشہور کتابیں:

الکتاب (امام سیبویہ)　　　التصریف الملوکی (ابن جنی)
المنصف (ابن جنی)　　　المفصل (امام زمخشری)

لُمعُ الأدِلّة (کمال الدین انباری)　　شرح شذور الذهب (علامہ ابن ھشام)

ھدایۃ النحو (اخی سراج)　　الکافیہ (ابن حاجب)

اصول النحو (سعید الافغانی)　　شرح الجامی (عبد الرحمن الجامی)

المُقرّب و معہ مُثُلُ المُقرّب (ابن عصفور)　　سر صناعۃ الاعراب (۱-۲) (ابن جنی)

قطر الندی و بل الصدی (علامہ ابن ھشام)　　شرح قطر الندی و بل الصدی (علامہ ابن ھشام)

جامع الدروس العربیۃ (استاذ الغلایینی)　　النحو الوافی (۱-۲-۳-۴) (عباس حسن)

الانصاف فی مسائل الخلاف (کمال الدین انباری)

المقتضب (۱-۲-۳-۴) (ابو العباس محمد بن یزید المبرد)

الکواکب الدریۃ (۱-۲)　　(الشیخ محمد بن أحمد بن عبد الباری الأھدل)

النحو القرآنی قواعد و شواھد　　(الدکتور جمیل أحمد ظفر)

الفیۃ ابن مالک کی شرح، اوضح المسالک الی الفیۃ ابن مالک　　(علامہ ابن ھشام)

شواھد التوضیح و التصحیح لمشکلات الجامع الصحیح　　علامہ ابن ھشام

مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب　　(عبد اللّٰہ بن یوسف بن احمد ابن ھشام الانصاری)

کشف المشکل فی النحو　　(ابو الحسن علی بن سلیمان بن اسعد الیکیلی الملقب بحیدرۃ الیمنی)

فوح الشذا بتیسیر شرح قطر الندی (أبو محمد عبد الرحمن بن إسماعیل استاذ النحو و الصرف بجامعۃ أم القری بمکۃ المکرمۃ و جامعۃ الأزھر سابقاً)

بعض وہ کتابیں جس میں نحات، لغویوں اور ادباء کے تراجم پائے جاتے ہیں:

طبقات النحویین و اللغوین　　ابو بکر محمد بن الحسن الزبیدی

إنباء الرواۃ علی أنباء النحاۃ　　جمال الدین علی ابن یوسف القفطی

بغیۃ الوعاۃ فی طباقات اللغویین و النحات　　عبد الرحمن السیوطی

معجم الأدباء　　(یاقوت الحموی)　　معجم الشعراء　　(ابو عبد اللّٰہ المرزبانی)

یتیم الدھر فی محاسن أھل العصر　　ابو منصور الثعلبی

مصادر التراث العربی فی اللغۃ و المعاجم و الأدب و التراجم　　دکتور عمر دقاق

المکتبۃ العربیۃ دراسۃ لأمھات الکتب فی الثقافۃ العربیۃ　　دکتور عزہ حسن

تاریخ آداب العرب (مصطفی صادق الرافعی)　　مراتب النحویین　　(ابو طیب اللغوی)

أخبار النحویین البصریین　　(قاضی ابو سعید الحسن بن عبد اللّٰہ السیرافی)

رویۃ جدیدۃ فی نشأۃ النحو العربی　　(الدکتور قصباح عبد اللّٰہ محمد بافضل)

ابتدائی طلبہ کے لیے نحو کی چند ضروری کتابیں:

النحو الواضح ابتدائیہ (۱-۲-۳)　　علی الجارم * مصطفی امین

النحو الواضح الثانویہ (۱-۲-۳)　　علی الجارم * مصطفی امین

تدریب النحو　　(سید ظفر احمد جمیل حسامی)

عربی کا معلم (۱-۲-۳-۴)　　(مولانا عبدالستار خان صاحب)

مرجع الطلاب فی قواعد النحو　　(ابراہیم شمس الدین)

مفتاح القرآن (۱-۲-۳-۴)　　(مولانا محفوظ الرحمن نامی)

تمرین النحو　　(مولانا مصطفی ندوی)

فن صرف

تعارف وتدوین، اہمیت وضرورت، طریقہ تدریس

مولانا: مرشد قاسمی صاحب

علم صرف کی ایجاد اور اس کا پس منظر

اللہ تعالی نے انسانوں کو گویائی اور زبان سکھائی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وَعَلَّمَ آدم الآسماء کلھا" یعنی اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھائے، اس لئے لغت کا حقیقی واضع اللہ تعالی ہے۔

پھر تمام لغتوں میں سب سے افضل اور اشرف عربی کو قرار دیا، جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی زبان بھی عربی تھی، لیکن جب جنت سے اتارے گئے تو جہاں اور نعمتیں لے لی گئی وہیں یہ نعمت بھی سلب ہوگئی اور سریانی زبان دی گئی، توبہ کے بعد اللہ نے یہ نعمت واپس کی، پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا دینی اعتبار سے تنزلی شروع ہوئی۔ کفر وشرک عام ہوا تو اللہ نے یہ زبان بالکل اٹھالی، نوح علیہ السلام کے زمانے میں اس کا وجود بالکل نہیں رہا، کافی مدت کے بعد جب حضرت اسماعیل کی ولادت ہوئی تو اللہ نے بطور الہام کے یہ زبان ان کو سکھائی۔

مورخین کا قول ہے "اول من تکلم بالعربیۃ سیدنا اسماعیل" یعنی اس کے بعد عربی زبان میں سب سے پہلے تکلم کرنے والے سیدنا اسماعیل علیہ السلام ہیں بعض نے عربی کا موجد یعرب بن قحطان کو قرار دیا۔

عربی زبان انسان کی عقل میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ انسان کی شرافت کو بڑھاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا ارشاد ہے: "علیکم بالعربیۃ فانھا تثبت العقل وتزید فی المروءۃ"۔

اس لئے اہل جنت کی زبان بھی یہی رہے گی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان بھی یہی تھی اور اللہ نے تمام

آسمانی کتاب کو اسی زبان میں نازل کیا، حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے: ’’ما انزل اللہ کتابا الا بالعربیة ثم ترجم لکل نبی علی لسان امته ‘‘یعنی تمام کتابیں عربی زبان ہی میں نازل کی گئی، پھر ہر پیغمبر کے لئے اللہ قوم کی زبان میں منتقل کیا سب سے آخری اور عظیم کتاب ہدایت کو بھی اللہ تعالیٰ نے عربی میں نازل کیا ’’اِنَّا انزلنہ قرآنا عربیا‘‘۔

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے جو صرف عربوں ہی کی ہدایت کے لئے نہیں، بلکہ پوری نسل انسانی کے لئے ہے۔خواہ امت دعوت یعنی مشرکین اور اہل کتاب ہوں، یا امت اجابت یعنی مؤمنین ہوں، اللہ نے اس دین اسلام کو ہر ایک کے لئے دین ہدایت اور دین رحمت قرار دیا، چنانچہ اس دین کو جہاں عربوں نے قبول کیا۔ وہیں عجمیوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی اپنے سینے سے لگایا۔ آپؐ کے زمانہ میں اسلام گرچہ کچھ ہی عجمی علاقوں میں پہونچا تھا، لیکن حضرات خلفاء راشدینؓ کے دور خلافت میں اسلام بہت سے عجمی ممالک پر چھا گیا ،اور بہت سے باشندگان عجم حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ،ان عجمیوں کو قبول اسلام کی وجہ سے اسلامی زبان (عربیت) سے وابستہ ہونا پڑا،اور چونکہ دونوں مصدر شرعی یعنی کتاب وسنت عربی زبان میں ہیں،اور عربی ان کی زبان نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تلاوت وقرأت اور افہام وتفہیم میں انہیں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا،اس لیے کچھ قواعد وضوابط کی ضرورت پیش آئی جن کی روشنی میں عجمی حضرات بھی قرآن وحدیث پڑھ اور سمجھ سکیں، چوں کہ عربی کی ایک زبان ہونے کے لحاظ سے سیکھنا سمجھنا تو آسان ہے ،لیکن قرآن اور حدیث فہمی کے لیے یہ دشوار، محنت طلب اور قواعد کا محتاج ہے ۔اسی ضرورت اور تقاضے کے پیش نظر پہلی صدی ہجری میں صرف ونحو کی تدوین عمل میں آئی، اور ایک زمانہ تک یہ دونوں فن ایک ہی ساتھ استعمال ہوتے رہے، ایک کا نام علم الاعراب اور دوسرے کا نام علم التصریف رہا، بعد میں معاذ بن مسلم ہرّا متوفی ۱۸۷ھ نے صرف ونحو سے جدا کیا اور اس کے لئے مستقل کتاب ،ابواب اور گردانیں تیار کیں، اسی لئے یہ فن صرف کے موجد اول اور بانی کہلائے۔

علم صرف کی اہمیت اور ضرورت:

الصرف والنحو فی العلم کالروح فی الجسم

الصرف فی العلوم کالضوء فی النجوم

مشہور مقولہ: الصرف ام العلوم والنحو ابوها (صرف تمام علوم کی ماں اور نحو علوم کا باپ ہے)

عوام وخواص کے زبان زد ہے یعنی ماں جس طرح بچہ جنتی ہے، اسی طرح صرف کے اندر ایک کلمہ سے دوسرے کلمہ بنائے جاتے ہیں،اور ایک صیغہ کو مختلف شکلوں کی طرف پھیرا جاتا ہے،اور چونکہ تمام علوم کے لئے کلمہ اور کلام کی احتیاج مسلم ہے، کہ بغیر کلمہ اور کلام کے کوئی علم وجود میں نہیں آسکتا، اس لئے صرف ام العلوم کہے جانے کا مستحق قرار پایا۔

اور باپ جس طرح اولاد کی اصلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے،اسی طرح نحو سے اصلا کلمہ اور کلام کی اصلاح ہوتی ہے، اور ضمنا تمام علوم کی۔

اس مقولہ سے صرف کی اہمیت پر ایک دوسرے انداز سے بھی روشنی پڑتی ہے، کہ جس طرح بچہ باپ کی بہ نسبت ماں کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، اسی طرح تمام علوم کے لئے صرف کی احتیاج زیادہ پڑتی ہے۔ یا اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے ساتھ تین مرتبہ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے یہ فن بھی زیادہ توجہ کے مستحق ہے۔

قرآن کی تفسیر کے لئے علماء نے پندرہ علوم کی شرط لگائی: (۱) نحو، (۲) صرف، (۳) بیان، (۴) معانی، (۵) بدیع، (۶) لغت، (۷) فقہ واصول فقہ، (۸) حدیث واصول حدیث، (۹) قرأۃ، (۱۰) کلام وعقائد، (۱۱) علم تاریخ وقصص، (۱۲) سببِ نزول کا علم، (۱۳) ناسخ ومنسوخ کا علم، (۱۴) علم الموہبۃ، (۱۵) علم الاشتقاق۔

ان علوم میں سب زیادہ اہمیت صرف کو حاصل ہے، کیونکہ صرف سے ناواقفیت کی بنیاد پر قرآن کے ترجمہ اور مطالب کے سمجھنے میں خطاء کا واقع ہونا یقینی امر ہے۔

اور بعض علماء نے صرف کی اہمیت اس انداز سے بھی بیان فرمائی ہے، کہ جس طرح کلام اللہ کے الفاظ کے حق ہونے کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے، اسی طرح قرآنی مراد پر بھی جو عربی قواعد یعنی نحو وصرف سے سمجھ میں آئے اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ صاحب فتح البیان اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

ان ما دل هو عليه بطريق القواعد العربية مما هو مراد الله تعالى حق لا ريب فيه۔ (فتح البیان مصری ج ۱/ص ۸)	یعنی قرآن کریم قواعد عربیہ کے موافق اللہ کے جس معنی مرادی پر دلالت کرے وہ حق ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

اور یہ فن صرف فہم قرآن ہی کے لئے ضروری نہیں بلکہ تمام علوم شرعیہ کے سمجھنے میں بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے کیوں کہ علوم شرعیہ کی امہات الکتب عربی ہی میں ہیں، اور عربی کا سمجھنا کے بغیر ناممکن ہے، اسی لئے علماء نے اس کے حصول کو فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ امام فخر الدین رازیؒ سے نقل کرتے ہیں:

اعلم ان معرفة اللغة والنحو والتصريف فرض كفاية لان معرفة الاحكام واجبة بالاجماع و معرفة الاحكام بدون معرفة ادلتها مستحيل فلابد به من معرفة ادلتها و ادلتها راجعة الى الكتاب و السنة و هما واردان بلغة العرب و نحوهم و تصريفهم فاذاتوقف العلم بالاحكام على الادلة	جاننا چاہئے کہ لغت نحو وصرف کا جاننا فرض کفایہ ہے اس لئے کہ احکام شریعت کی معرفت بالاتفاق واجب ہے اور احکام کی معرفت بغیر دلائل کے جانے محال ہے، پس دلائل کا جاننا ضروری ہے، اور دلائل کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف راجع ہیں، اور یہ دونوں عربی لغت میں واقع ہوئے ہیں، پس جب احکام کا علم دلائل پر موقوف ہے،

و معرفة الادلة تتوقف علی معرفة اللغة و ما يتوقف علی الواجب المطلق و هو مقدور للمکلف فهو واجب فاذن معرفة اللغة والنحو والتصريف واجبا (الاقتراح ص ۳۳/بحوالہ المفتاح الصرف)	اور دلائل لغت پر الاولوی کیونکہ جو واجب مطلق کے لئے موقوف علیہ ہے، اور وہ بندے کے اختیار میں ہوتو وہ بھی واجب ہوتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ لغت اور نحو وصرف کا جاننا واجب ہے۔

علم صرف کی تعریف وتدوین، غرض وغایت

اس علم کے بہت سے نام ہیں، علم الصرف، علم التصریف، علم المیزان، علم الصیغہ، بعض حضرات نے علم الاشتقاق بھی نام بتایا ہے۔

صرف کے لغوی معنی: پھرنا پھلنا، پریشان ہونا، زیور، سونا چاندی، گردش زمانہ۔

اصلاحی تعریف: ''الصرف علم باحث عن احوال المفردات من حیث الھیئة ''یعنی وہ علم ہے جس میں مفردات کے احوال سے بحث کی جائے شکل وصورت کے لحاظ سے۔

(۲)''الصرف علم باحوال یعرف بہ احوال ابنیة الکلم الثلث من حیث الصورة کالادغام والا علال''

یعنی ایسے اصول وقواعد کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعے کلمہ ثلاثہ کے اوزان کو شکل وصورت کے لحاظ سے جانا جائے مثلاً ادغام تعلیل تصریف وغیرہ۔

موضوع: ''مفردات کلام العرب من حیث الصورة والھیئة ''یعنی کلام عرب کے مفردات کو جاننا شکل وصورت کے اعتبار سے۔

غرض: ''صیانة الذھن عن الخطا فی الصیغة ''صیغے میں غلطیوں سے ذہن کو بچانا۔

وضع: اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض نے (۱) معاذ بن مسلم ہراء متوفی ۱۷۷ھ کو قرار دیا، کسی شاعر کا قول ہے

واضع الصرف معاذ بن مسلم ھروی

وکان لنحو علیا حیدرا

(۲) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۳) ابوعثمان مازنی متوفی ۲۴۸ھ، لیکن راجح قول یہ ہے کہ اس کے واضع اول حضرت امام ابوحنیفہ متوفی ۱۵۰ھ ہیں، انہوں اس فن پر ''المقصود'' نامی ایک کتاب بھی لکھی۔

اور علم اشتقاق:

صحیح قول کے مطابق یہ ایک ہی فن کے دو نام ہیں، لیکن بعض علماء نے [illegible] اور علم اشتقاق کی تعریف اس طرح کی ہے:

"ھو علم بتحویل الأصل الواحد الی امثلة مختلفة لحصول المعانی المعتورة" یعنی علم اشتقاق وہ علم ہے جس کے ذریعے ایک اصل کو مختلف مثالوں کی طرف پھرنے کا علم ہوتا کہ پے در پے وارد ہونے والے معانی کو جان لیا جائے۔

موضوع: "مفردات کلام العرب من حیث الاصالة والفرعیة" عرب کے مفردات اصل اور فرع کے اعتبار سے۔

غرض: "تحصیل ملکة تعرف بها الانتساب علی وجه الصواب" ایسے ملکہ کا حاصل کرنا جس کے ذریعے صحیح طریقے پر اصل اور فرع کی نسبت معلوم ہو جائے۔

علم صرف سے طلبہ اور اساتذہ کی بے اعتنائی:

اوپر کی عبارتوں سے صرف کی اہمیت کا اندازہ ہوا، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں نحو کو تو کچھ اہمیت دی جاتی ہے، لیکن فن صرف کو بالکل اہمیت نہیں دیتے، جب کہ عربیت کے لئے صرف کی جس قدر ضرورت پڑتی ہے اس قدر نحو کی نہیں پڑتی، نحو کی ضرورت عوامل کی شناخت، صحیح اعراب، فاعل و مفعول وغیرہ کی شناخت میں پڑتی ہے، جبکہ صرف تمام افعال کی گردانوں، صیغوں اور تمام اسمائے مشتقہ کی گردانوں میں بے حد اہمیت رکھتا ہے، اس کے علاوہ ابواب اور اس کی خاصیت کے لئے صرف بے حد ضروری ہے، افعال کی شناخت نہ ہو اور ابواب کی خاصیات کا علم نہ ہو تو طالب علم کو جملے کے معانی ٹھیک معلوم نہ ہوں گے۔

بعض اساتذہ بھی اس فن کو اہمیت نہیں دیتے، طلباء کو محض تحفیظ کا پابند بنا دیتے ہیں، تفہیم کا عادی نہیں بناتے، جبکہ بغیر سمجھے صرف رٹنا طالب علم کے لئے نہایت مضر ہے، اس سے قوت ادراک اور فہم متاثر ہوتی ہے، اور بعض مرتبہ بغیر سمجھے پڑھنے سے اس فن سے نفرت ہو جاتی ہے۔

صاحب تحفہ شاہجہانیؒ فرماتے ہیں:

اياک وان تحفظ من غير ان تفهم المعاني المرادة منها فانها تورث البلادة واعوجاج الطبيعة بل انها تسلب قابلية الادراک، و اياک ان تنظر بنظر اجمالي، من غير ان تعقبه دقة النظر و الاستبصار، فان ذلک من سوالب الادراکات و مورثات البلادات والاعوجاج في الطبائع (تحفه شاه جهاني ﷫ ص ۳/بحواله مفتاح الصرف)

بغیر مراد سمجھے لفظ کو یاالاخری ۱۴۳۲ھ سے بچو کیونکہ یہ بات کند ذہنی اور طبیعت میں کجی پیدا کرتی ہے، بلکہ یہ بات ادارک کی قابلیت سلب کرلیتی ہے،اوراس بات سے بھی گریز کرکہ تو کتاب میں اجمالی نظر دوڑائے باریک بینی اور بصیرت کے بغیر کیونکہ یہ چیز بھی ادارک کو سلب کرلیتی ہے، کند ذہنی اور طبیعت میں کجی پیدا کرتی ہے۔

لہٰذا اساتذہ کو چاہئے کہ تحفیظ کے ساتھ تفہیم پر بھی زور دیں، اور زیادہ سے زیادہ تمرین اور اجراء کا سلسلہ جاری رکھیں، اس لئے کہ کسی بھی زبان کے قواعد پڑھانے میں تفہیم کے ساتھ تمرین واجراء پر جتنی زیادہ توجہ دی جائے گی، اتنی ہی اس فن پر گرفت مضبوط ہوگی۔ اوراس کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ کو اول دن سے تین باتوں کا عادی بنایا جائے، ایک تو یہ کہ اگلا سبق اپنی اپنی استعداد کے مطابق حل کرکے لائیں، (۲) استاذ کی تقریر غور سے سنیں، (۳) اور بعد میں اس کا مذاکرہ کرلیں۔

جو طالب علم ان تین باتوں کا عادی ہوگا ضرور اس کی استعداد اور صلاحیت میں پختگی پیدا ہوگی، اور بقول حضرت تھانویؒ جو طالب علم یہ تین کام کرلے اور پھر اس کی استعداد نہ بنے تو قیامت کے دن میرا دامن پکڑ لے۔

اشارات:

(۱) طلبہ کے سامنے صرف کی اہمیت بتائی جائے۔ (۲) تحفیظ کے ساتھ تفہیم اور اجراء پر زور دیا جائے۔
(۳) اور مذکورہ تین باتوں کا طلبہ کو عادی بنایا جائے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ صرف کے اہم مباحث تین ہیں:

تصریفات　　تعلیلات　　خاصیاتِ ابواب

ہدایات برائے تصریفات:

صرفی اصطلاحات مثلاً: ماضی، مضارع، امر ونہی، مثبت ومنفی، معروف ومجہول کی تعریفیں اچھی طرح یاد کرا دینے اور سمجھا دینے کے بعد تصریفات کی بحث شروع کی جائے، اور ہر ہر بحث کی گردان اچھی طرح یاد کرائی جائے، ہر ہر بحث اور صیغہ کی پہچان بتائی جائے، مثلاً ماضی کے تثنیہ مذکر غائب کے اخیر میں الف جیسے فعلا، اور تثنیہ مونث غائب کے اخیر میں تا اور الف جیسے فعلتا، اسی طرح جمع مذکر غائب کے اخیر میں واؤ۔ جیسے فعلوا یہ علامتیں بتائی جائیں، تاکہ لفظ سنتے ہی صیغہ ذہن میں آجائے، بعض مرتبہ علامت یاد نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ صیغے گنتے ہیں، اور یہ دیکھتے ہیں

کہ یہ صیغہ کتنے نمبر پر ہے، پھر ترجمہ بتاتے ہیں۔

اسی طرح ماضی مجہول کی علامت بتائی جائے، کہ اس کے شروع میں پیش اور اخیر سے پہلے والے حرف پر زیر ہوتا ہے، اور ماضی منفی کی پہچان بتائی جائے کہ اس کے شروع میں عموماً "ما" آتا ہے۔

اور جب گردان معنی کے ساتھ اچھی طرح یاد ہو جائے، تو امتحاناً کبھی گردان الٹی بھی گردانوائی جائے، تاکہ اندازہ ہو کہ صیغے میں روانی آئی یا نہیں، اور صیغوں کی شناخت پیدا ہوئی یا نہیں۔

اور جب کوئی ایک بحث مکمل یاد ہو جائے، تو اس کی گردان دوسرے مادوں سے بھی کرائی جائے، لیکن مبتدی طلبہ کو صرف صحیح کے مادوں سے ہی گردان کرائی جائے، بلکہ انہیں الفاظ سے کرائیں جو اردو میں کثرت سے مستعمل ہیں، مثلاً: حکم، صبر، حفظ، دخل، خرج، کتب وغیرہ سے۔

اسی طرح مضارع کی علامت اچھی طرح سمجھا دی جائے، اور نون اعرابی کے صیغے اور نون جمع مؤنث کے صیغے اچھی طرح علامتوں سے سمجھا دی جائے، غرضیکہ ہر بحث اور ہر بحث کا صیغہ علامتوں کے ساتھ یاد کرانے کی کوشش کی جائے۔

اور جب کوئی ایک بحث مکمل یاد ہو جائے تو قرآن میں اس کے مختلف صیغے تلاش کروائیں، اور ان صیغوں کو کاپی میں معنی کے ساتھ لکھ کر طلبہ لائیں، اگر قرآنی لفظ مشکل ہو تو استاذ معنی مصدری بتا دے، باقی بحث کے مطابق ترجمہ طلبہ سے کرائیں۔

جب تک ایک بحث کی گردان اچھی طرح یاد نہ ہو جائے، دوسری بحث ہرگز نہ شروع کی جائے، ورنہ ایک بحث کا کچی ہونے کا اثر ساری بحثوں پر پڑے گا۔

اسمائے مشتقہ یعنی اسم فاعل، اسم مفعول، اسم تفضیل، صفت مشبہ وغیرہ کی گردانوں میں منتہی طلبہ کے لئے حالت نصبی اور جری کا اضافہ کیا جائے۔ نیز منتہی طلبہ سے مہموز و مضاعف اور معتل وغیرہ سے بھی صرف کبیر کی گردانوں کی مشق کرائی جائے۔

اشارات:

(۱)　اولاً صرفی اصطلاحات یاد کرانا۔
(۲)　پھر تمام بحثوں کی گردانیں علامتوں کے ساتھ یاد کرانا۔
(۳)　فَعَلَ کے علاوہ دوسرے مادوں سے بھی گردان سننا۔
(۴)　کوئی بحث مکمل ہونے پر قرآن میں اس کے صیغہ تلاش کروانا۔
(۵)　جب تک پہلی بحث پکی یاد نہ ہو جائے اگلا سبق شروع نہ کرنا۔
(۶)　گردانیں کبھی کبھی الٹی بھی سننا تاکہ پختگی کا اندازہ ہو۔

(۷)　اسمائے مشتقہ کی گردانوں میں حالت نصبی وجری بھی منتہی طلبہ کو یاد کرانا۔

ہدایات برائے ابواب :

ابواب یاد کرانے سے پہلے ثلاثی، رباعی، مجرد، مزید فیہ، حرف اصلی اور حرف زائد کی تعریفات سمجھا کی یاد کرادی جائے، پھر تمام ابواب علامتوں کے ساتھ یاد کرائی جائے۔ مثلاً: ثلاثی مجرد کا پہلا نصر ینصر اس کو اس طرح یاد کرایا جائے۔

پہلا باب فعل یفعل ماضی میں عین کے فتح کے ساتھ اور مضارع میں عین کے ضمہ کے ساتھ جیسے نصر ینصر اسی طرح دوسرا تیسرا چوتھا پانچواں چھٹا باب یاد کرایا جائے۔

پھر جب ثلاثی مزید فیہ کے ابواب شروع ہوں تو ان کی علامت بتا کر یاد کرائی جائے، مثلاً ثلاثی مزید فیہ با ہمزہ وصل کا پہلا باب افتعالٌ ہے جیسے اجتنابٌ اس کی علامت شروع میں ہمزہ کی زیادتی اور فاء کے بعد تاء کی زیادتی۔

اسی طرح بقیہ ابواب کی علامتیں اساتذہ کرام سوچ کر طلبہ کو بتادیں۔ اس سے ابواب کی شناخت میں طلبہ کو بہت آسانی ہوگی۔

ابواب کے سلسلہ میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ ان ابواب کی گردان فعَلَ کے مادہ سے بھی کرائی جائے، مثلاً ثلاثی مجرد کا پہلا باب فعل یفعل فعلاً فھو فاعل وغیرہ اسی طرح پوری گردان سنی جائے نیز باب افتعال میں افتعل یفتعل افتعالاً فھو مفتعلٌ

اس مادہ سے گردان کرانے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طلبہ کسی بھی فعل کا وزن بآسانی نکال لیں گے۔ اور حروف اصلی اور زائد کے پہچاننے میں بھی سہولت ہوگی۔ مثلاً: اجتنب کے بارے میں طالب علم سے کہا جائے کہ کس وزن پر ہے وہ بآسانی افتعل نکالے گا۔ اس مثال میں ف کے مقابلہ میں ج اور ع کے مقابلہ میں ن اور ل کے مقابلہ میں ب، تو حرف اصلی جنب ہوا۔

اسی طرح استنصر بروزن استفعل، احمرّ بروزن افعلّ، یا مُقبِلٌ بروزن مُفعِلٌ ہے۔ اس مثال میں میم اور دوسری باء زائد ہے۔

حروف اصلی اور زائد کے شناخت میں طلبہ کو یہ بات بتادی جائے کہ زائد حروف عموماً "الیوم تنساہ" کے حروف میں سے ہونگے۔

تمام ابواب کو علامتوں کے ساتھ یاد کرانے کے بعد ان ہی ابواب میں ثلاثی، رباعی، مجرد، مزید فیہ کی اچھی طرح پہچان کرائی جائے۔

پھر قرآنی الفاظ میں ان ابواب کی شناخت کرائی جائے، بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ جس دن جو باب پڑھایا جائے،

اس کی دو چار مثالیں قرآن سے یا کسی ادب کی کتاب سے ڈھونڈ کرانے کا طلبہ کو پابند بنایا جائے۔ ٢٠١٢ھ

اشارات:

(۱) ابواب یاد کرانے سے پہلے ثلاثی، رباعی، مجرد، مزید فیہ، حرف اصلی اور زائد کی تعریفات یاد کرادی جائے۔

(۲) تمام ابواب علامتوں کے ساتھ یاد کرایا جائے۔

(۳) تمام ابواب کی گردان فعل کے مادہ سے بھی کرائی جائے۔

(۴) ان ابواب میں حروف اصلی اور زائد کی خوب مشق کرائی جائے اور وزن نکالنے کا طریقہ بتایا جائے۔

(۵) قرآنی عبارتوں میں ابواب کی شناخت کرائی جائے۔

ہدایات برائے تعلیلات:

تعلیلات شروع کرنے سے پہلے صحیح، مہموز، مضاعف، اور معتل کی پانچوں قسموں کی تعریفات سمجھا کر یاد کرادی جائے، پھر تعلیلات کے قواعد مع شرائط اچھی طرح یاد کرائی جائے، اس سلسلے میں صاحب علم الصیغہ کا طرز بہت عمدہ ہے۔

تعلیلات کے قواعد میں استاذ کتابی مثالوں کے علاوہ اپنی طرف سے چند مثالیں دیکر طلبہ کو تعلیلات کا مکلف بنائیں۔ مثلاً: یہ قاعدہ کہ جو واؤ اور یا متحرک ماقبل مفتوح ہو، اس کو الف سے بدل دیں گے۔ جیسے قال اصل میں قول تھا۔ اس قاعدہ کے ساتھ دعا، رمیٰ، خاف، نال، بکیٰ، وغیرہ کی اصل نکال تعلیل کروائی جائے۔

اسی طرح ایک قاعدہ یہ ہے کہ جو واؤ اور یاء اسم فاعل کے عین کلمہ کی جگہ پر ہو اس کو ہمزہ سے بدل دیں گے بشرطیکہ اس کے فعل میں تعلیل ہوئی ہو۔ جیسے قائل، بائع اصل میں قاول اور بایع تھا، یہ قاعدہ خائف، نائل، ضائع، صائم میں اصل نکال کر جاری کرایا جائے۔

اسی طرح معتل کا ایک دوسرا قاعدہ ہے جو واؤ اور یاء ایک جگہ جمع ہوں، اور ان میں سے پہلا ساکن ہو تو واؤ کو یاء سے بدل کر یاء کا یاء میں ادغام کردیں گے۔ جیسے مرمیٌ اصل میں مرمویٌ تھا۔ یہ قاعدہ مطوی، سید، مبکی، مسلمی وغیرہ میں جاری کرایا جائے۔

علاوہ ازیں قرآنی کلمات میں بھی غور کرنے کا عادی بنایا جائے، کہ چلتے پھرتے حفاظ طلبہ غور وفکر کریں کہ کس قاعدہ سے تعلیل ہورہی ہے۔

تعلیلات کے سلسلہ میں ایک اور بات کا خیال رکھا جائے، کہ عموماً صرف کی کتابوں میں پہلے صیغہ کی تعلیلات لکھ دی جاتی ہیں، وہ تعلیلات دوسرے صیغوں میں بھی جاری کرائی جائے۔ مثلاً: قال والی تعلیل قالوا میں بھی جاری کرائی جائے۔ اسی طرح قلن میں بھی تھوڑے اضافہ کے ساتھ، اس کا خاص دھیان دیا جائے۔

اور بچوں سے بھی صرف پہلے صیغہ کی تعلیل دریافت نہ کی جائے، بلکہ کسی بھی صیغہ کے بارے میں پوچھا

جائے ۔مثلاً رمی ؑ کے بجائے مرمیون کی تعلیل پوچھی جائے ۔
نیز مہموز و معتل و مضاعف وغیرہ کی صرف کبیر یاد کرا کے مختلف تعلیلات سکھائی جائے ۔

اشارات:

(۱) تعلیلات سے قبل صحیح ،مہموز، مضاعف، معتل کی تعریفات سمجھا کر یاد کرائی جائیں ۔
(۲) پھر تعلیلات کے قواعد مع شرائط یاد کرائیں ۔
(۳) کتابی مثالوں کے علاوہ دوسری مثالوں میں بھی قاعدہ جاری کرائیں ۔
(۴) تعلیل صرف پہلے ہی صیغہ میں نہ کرائی جائے ۔
(۵) قرآن میں تعلیلات کے اجراء کا پابند بنایا جائے ۔

ہدایات برائے خاصیات

ہمارے مدارس میں صرف پر اگر کچھ محنت ہوتی بھی ہے تو تعریفات اور ابواب کی حد تک، خاصیات ابواب اخیر سال میں سرسری طور پر پڑھا دی جاتی ہیں ۔حالانکہ ضرورت ہے کہ اس کو مستقل نصاب کا ایک حصہ سمجھا جائے ۔اور بہتر یہ ہوگا کہ ہر باب کی گردان کے ساتھ اس کی خاصیات مبتدی طلبہ کو یاد کرادی جائیں ۔مثلاً: اگر باب نصر کو یاد کرایا تو اس کے ساتھ اس کی خاصیت بھی یاد کرادی جائے ۔

ابواب کی خاصیات اس قدر اہم ہے کہ اگر وہ معلوم نہ ہوں تو مفسرین اور مترجمین کی زائد عبارت لانے کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا ۔مثلاً: اقترب للناس حسابھم کا ترجمہ کیا گیا، قیامت نہایت قریب آگئی ۔بجائے قرب کے اقترب استعمال کیا گیا مبالغہ فی القرب کو بتانے کے لئے، چونکہ افتعال کی ایک خاصیت مبالغہ بھی ہے، اسی طرح ’’ثم تتفکروا ما بصاحبکم من جنۃ‘‘ کا ترجمہ کیا گیا، خوب اچھی طرح سوچو کیا تمہارے ساتھی کو جنون ہے، چونکہ تفعل کی خاصیت بھی مبالغہ فی الفعل ہے ۔

بعض خاصیات پر مسائل کی تفریع ہوتی ہے ۔مثلاً یہ کہ وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض نہیں، لیکن غسل میں یہ دونوں چیزیں فرض ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’وان کنتم جنبا فاطھروا‘‘، اطھروا باب تفعل سے امر ہے اصل میں تطھروا تھا اس کی خاصیت بھی مبالغہ ہے تو معنی ہوگا خوب خوب پاکی حاصل کرو، یعنی جہاں جہاں پانی بآسانی پہونچا سکتے ہو پہونچاؤ ۔اور ناک و منہ میں پانی بآسانی پہونچایا جاسکتا ہے، اس لئے یہ دونوں چیزیں غسل میں فرض ہوگئیں ۔

اسی طرح او جاء احد منکم من الغائط او لمستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا ۔
اس آیت سے معلوم ہوا کہ تیمم حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں میں جائز ہے ۔من الغائط سے حدث اصغر کی طرف اشارہ ہے، اور لمستم سے حدث اکبر یعنی جماع کی طرف چونکہ یہ باب مفاعلت سے ہے جس کی خاصیت

مشارکت ہے، یعنی جانبین سے چھونا، اور یہ عموما جماع کی حالت میں ہوتا ہے۔

اسی طرح ”وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين“ یعنی ان لوگوں پر جن سے روزہ کی طاقت سلب کرلی گئی، ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ کے واجب ہے۔ اطاق یطیق اطاقۃ باب افعال سے ہے جس کی خاصیت سلب مأخذ ہے، یعنی طاقت سلب کرلینا، اس توجیہ اعتبارے لائے محذوف ماننے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اور نہ نسخ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اسی طرح ”و اشفقن منها“ جس کا ترجمہ مفسرین نے کیا ہے اور وہ پہاڑ ڈر گئے امانت اٹھانے سے۔ جب کہ اشفقن کا مادہ شفقت ہے یہاں پر بھی سلب مأخذ کی خاصیت پائی جارہی ہے۔

اوپر پیش کئے گئے قرآنی امثال ونظائر سے خاصیات کی اہمیت کا اندازہ ہورہا ہے، اس لئے خاصیات ابواب کو مستقل نصاب کا حصہ سمجھا جائے۔ اور اس کی تدریس کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اولا خاصیات کی اصطلاحات یاد کرادی جائیں۔ مثلا مبالغہ، مشارکت، مطاوعت، سلب مأخذ، ابتداء، وغیرہ ان سب کی تعریفات اچھی طرح سمجھادی جائے، پھر خاصیات یاد کرائی جائے۔

اشارات:

(۱) خاصیات کی اہمیت طلبہ کے ذہنوں میں بٹھائی جائے۔

(۲) اولا خاصیات کی اصطلاحات یاد کرائی جائے، پھر خاصیات۔

(۳) مناسب سمجھیں تو ہر باب کی خاصیت ابواب کی صرف صغیر کے ساتھ یاد کرادیں۔

واللہ ہو الموفق وہو یہدی السبیل

صرف کی اہم کتابیں

الممتع الكبير فی التصرف	ابن عصفور
الحنفیۃ	
مذکرات فی النحو والصرف	
فصول اکبری	علی اکبر
المعجم المفصل فی علم الصرف	راجی الاستاذ الاشمر
علم الصیغۃ (فارسی)	مولانا مفتی عنایت اللہ صاحب
موسوعۃ النحو والصرف والاعراض	الدکتور امیر بدیع یعقوب
مراح الارواح	احمد بن علی بن مسعود
مرجع الطلاب فی تصریف الافعال	ابراہیم شمس الدین
معجم تصریف الافعال العربیۃ	انطوان الدحداح

المقصود	امام ابوحنیفہؒ
تصریف المطلوب شرح المقصود	ابوعثمان مازنی
نزہۃ الطرف فی فن الصرف	ابوالفضل بن محمد میدانی
شافیہ	علامہ ابن حاجب
لامیۃ الافعال	محمد بن مالک صاحب الفیہ
اساس التصریف	شیخ اسماعیل بمبئی
عقود والزواہر	شیخ علاء الدین المعروف قوشچی
املاء الصرف	(مفتی غلام) مفتی عطاء الرحمن صاحب
تدریب الصرف	مولانا ظفر جمیل احمد حسامی
انوار الصرف	محمد راشد احمد قاسمی بلند شہری
تعلیل الصرف	مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی
قواعد الصرف وخاصیۃ ابواب	مولانا حسین احمد ہریدواری
تبویب الصرف	مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی
امداد الصرف	مولانا مفتی یوسف صاحب تاؤلی
علم التصریف	مولانا سعید الرحمن الاعظمی الندوی
کتاب الصرف	حافظ عبدالرحمن صاحب امرتسری
تسہیل الصرف ۱-۲-۳	حضرت مولانا قاری سید صدیق صاحب
نکات الصرف	مولانا مرشد صاحب قاسمی استاذ جامعہ اکل کوا
ارشاد الطلاب الی خاصیات ابواب	عبداللہ بن احمد
علم الصرف ۱-۲-۳	مولانا مشتاق چرتھاولی
اشاعت الصرف	مولانا عبدالمنان بستوی

علم اللغہ کی اہمیت

مفتی محمد اشفاق خان عادل آبادی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق فرما کر مختلف خطوں میں آباد فرماں کر طرح طرح کی زبانیں اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے عطا فرمائی یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جس علاقہ میں جو آباد ہوا، اسی علاقہ کی مستقل زبان اس کو سکھلائی عرب کے علاقہ میں عربی، فارسی کے علاقہ میں فارسی اور اسی طریقے سے عبرانی اور سریانی زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں بولی اور سمجھی اور لکھی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری کلام کو خالص عربی زبان میں اُتار کر اس کی الوحی وتنزیلات بیان کردی اور اہل عرب خالص عربی زبان بول کر اسلام کو سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔

لیکن جب اسلام نے آگے بڑھ کر عرب کے خطہ کو چھوڑ کر عجم میں بھی قدم بڑھایا تو عربی زبان عجمی زبان سے ملی تو اس کی بنیاد پر غیر زبان والوں کو عربی زبان بولنے میں بہت ساری غلطیوں اور تکلفات کا سامنا کرنا پڑا جس کی بنیاد پر عربی زبان کی تصحیح، الفاظ کے لغوی معنی، استعمالات، معنی حقیقی و معنی مجازی ان ساری چیزوں کو جاننے کی ضرورت پڑی، اس کے لیے مستقل ''علم اللغۃ'' کا ایجاد ہوا، جس میں الفاظ کے معنی، الفاظ پر اعراب کی تصحیح، قرآن میں اس کے استعمالات اور ترکیب الفاظ کی وضاحت ہے۔ جسے یکجا کیا گیا تو بڑی بڑی لغات کی کتابیں معجم اور قاموس وجود میں آئی۔

علم اللغۃ کی تعریف:

علامہ صدیق بن حسن القنوجی نے ''ابجد العلوم'' نامی کتاب میں علم اللغۃ کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے کہ علم اللغۃ ایسا علم ہے جس میں مختلف مفرد الفاظ کے معنی ان کے صیغوں کی شناخت اور ان کے مدلولات سے بحث کے ساتھ ساتھ ہر لفظ کے دوسرے سے مل جانے پر حاصل ہونے والے معانی اور جزئی معانی سے بحث ہو۔

غرض وغایت علم اللغۃ:

علم اللغۃ کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والا موضوع اور مقرر کردہ معانی کے سمجھنے میں غلطی نہ کرے اور عربی الفاظ کے صحیح مفہوم تک اس کی رسائی ہوجاوے، مثلاً عربی کا ایک لفظ ''حکمت'' ہے، اس کے معنی لغت میں دیکھنے سے متعین ہوجائیں گے کہ اگر ہم لغات مثلاً القاموس المحیط کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے معنی افضل ترین علوم کے ذریعے افضل ترین چیزوں کی معلومات کو حکمت کہتے ہیں۔ اسی طرح دو لفظ جوڑ کر اختضر الشجر کے کیا معنی ہے اسی کو ہی لغت میں تلاش کریں، تو قاموس رہنمائی کرے گی کہ اس کے معنی کسی درخت کو تازہ تازہ ہی کاٹ لینا یہ اختضر الشجر کہلاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علم اللغۃ ہی ایسا فن ہے جس میں عربی زبان کے وجود اس کے الفاظ و معانی کا بھرم رکھا ہے بایں طور کہ ایک لمبا زمانہ گزر جانے کے باوجود علم اللغۃ کے واسطے سے ہم ایک عربی لفظ کے صحیح معنی طے کرسکتے ہیں جسے آج سے سینکڑوں، ہزاروں سال پیشتر خالص عربی زبان بولنے والوں کے لیے استعمال کیا گیا تھا جس کی فصیح و بلیغ زبان میں چودہ سو سال پہلے قرآن نازل ہوا تھا جس میں عجمی زبان کی قطعاً آمیزش نہیں تھی۔

مزید برآں علم اللغۃ ہی ایک ایسا فن ہے جس کی مدد سے عربی زبان میں عبارت آرائی اور فصاحت و بلاغت کی مختلف شاخیں لکھی اور سمجھی جاسکتی ہے۔ عربوں سے نقل کردہ کتنے الفاظ تعبیرات ایسے ہیں جو اسی فن کی مدد سے سمجھ میں آتے ہیں عربوں کے اشعار اور نثر ایسے ہے جنھیں استشہاد میں پیش کیا جاتا ہے۔ آیات و احادیث کو استدلال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اسی فن کی مرہون منت ہے۔

علامہ خلیل نحوی اور علم اللغہ:

علامہ خلیل ابن احمد الفراہیدی نحوی متوفی ۱۷۵ھ نے علم اللغہ کے سلسلہ میں بڑی خدمات پیش کی جنکی محنتوں کو شش اور کتابوں کی مدد سے اس علم کوجلا ملا اور مختلف پہلوؤں سے علم اللغہ کی آبیاری ہوئی ورنہ دوسرے لوگوں نے اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا ہے۔

پروفیسر سید احمد الھاشمی اپنی کتاب جواھر الادب میں علم اللغہ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہے کہ شروع میں ائمہ لغت نے اس سلسلے میں چھوٹے چھوٹے رسالے کتابچہ اور پمفلیٹ گوناگوں موضوعات پر لکھتے گئے لیکن خلیل نحوی پیدا ہوئے تو انہوں نے لغت کے الفاظ کا پہلے حساب لگایا پھر حروف تہجی کے اعتبار سے نئی ترکیب دیکر ایک مستقل فن بنا دیا اب ہمارے لیے اور رہر علم لغت کے پیاسوں کے لیے استفادہ آسان سے آسان تر ہوگیا۔

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں خلیل نحوی کے جذبات اسلوب اور لغت کے سلسلے کی کوششوں میں انکا انہماک ان تمام باتوں پر گفتگو کرتے ہوے لکھتے ہیں، کہ علامہ خلیل نحوی نے تمام ثلاثی رباعی خماسی حرفوں کے مرکبات کو شمار کیا ہے اور اس طریقہ سے انہوں نے ایک سے لے کر ستائیس حروف تک کی ترتیب سے لغات لکھنے کا فن ایجاد کیا علامہ ابن خلدون علامہ خلیل نحوی کے کلمات کی شرح کرتے ہوے مزید لکھتے ہیں۔ کہ آج کل لغات میں ترتیب دینے کا جونہج اردو، ہندی، انگلش، عربی اور دیگر زبانوں میں رائج ہے وہ علامہ خلیل کی دین ہے۔

علمائے لغات اور طریقہ کار:

بعد ازاں لوگ آتے گئے اور علم اللغہ کو نئی میں نئی جہتیں دیتے گئے اور اس علم کو اپنے اپنے انداز و اسلوب کے ذریعے پروان چڑھاتے گئے اور جدید و قدیم اسلوب میں علم اللغہ کا ذخیرہ قاموس معجم کی شکل میں لابریریوں کو فراہم کرتے رہے۔

ابجد العلوم کے مصنف کہتے ہیں کہ علم اللغہ کا مقصد دو طریقہ کار پر منحصر ہے (۱) تو یہ ہے کہ الفاظ کی مدد سے معانی تک رسائی ہو (۲) یہ کہ معانی کے ذریعے الفاظ تک رسائی ہو، مثلاً یا تو اردو زبان کے ذریعے عربی تک یا انگلش زبان کے ذریعے عربی تک رسائی ہو یا عربی زبان کے ذریعے اردو اور انگلش تک رسائی ہو دونوں طریقہ کار کا الفاظ لغت لکھنے میں علماء فن کے مدِنظر رہے ہیں۔

اس لیے دونوں طرح سے استفادہ کرنے والوں کی ضرورت رہی چناں چہ جن لوگوں نے الفاظ کے بعد عربی کلمات کے معانی تک قاری کو پہونچانے کا طریقہ استعمال اختیار کیا تو اس کی لغت جمع کرنے میں اسی زبان کے حروف تہجی کا اعتبار اس کے مدنظر رہا جس زبان تک پہونچانے کا قصد رہا۔

مختلف موضوعات پر الفاظ:

ایک طریقہ کار لوگوں میں یہ بھی رائج ہے کہ علم اللغہ کی اس طرح خدمت کی جائے کہ مختلف عناوین طے کر لیے

جائے جو اس عناوین کے تحت جتنے بھی الفاظ، تراکیب جملے اور استعمالات آسکے انہیں الاخرہی علی درج کیا جائے ،اسی طرح مختلف عنوانات پر عربی زبان میں گفتگو کرنے والوں کو الفاظ و عبارات کا ذخیرہ بوقتِ ضرورت وافر مقدار میں بآسانی چلتے پھرتے ہر موقع کے لیے بلا سوچے سمجھے میسر آسکتا ہے۔

لغات کی مختلف کتابیں:

اس وقت لابریریوں میں لغات کی مختلف کتابیں فراہم ہے چناں چہ آپ ابوبکر بن درید کی تالیف شدہ کتاب الجمہرۃ: علامہ الجوہری کی الصحاح: ابن سیدہ الاندلسی کی ،المحکم: الصاحب بن عباد کی ،المحیط: ابن فارس کی ،المجمل: کسی بھی قابل ذکر کتب خانہ میں پا سکتے ہیں۔نیز متاخرین علماء لغت نے ابن الاثیر کی ''النہایہ'' ابن مکرم کی ''لسان العرب'' علامہ فیومی کی ''المصباح'' اور علامہ فیروز آبادی کی ''القاموس'' بھی کتب خانوں کی زینت ہے۔

اور ماضی قریب کے علما میں مولانا عبدالحفیظ صاحب کی ''مصباح اللغات'' اور مولانا وحیدالزماں کیرانوی کی ''القاموس الوحید'' ''القاموس الاصطلاحی'' اور ''القاموس الجدید'' اردو سے عربی اور عربی سے اردو، کتب خانوں اور لابریریوں میں علم اللغۃ کے فن میں ایک قابل ذکر اضافہ ہے۔

لغت کی معرکۃ الآراء کتابوں کا تعارف

التھذیب: اس کے مولف مشہور لغوی ابو منصور محمد ابن احمد الازہری الہروی ہیں۔

وہ الازہری کے نام سے معروف ہے لیکن یہ نسبت جدامجد ازہر کی طرف ہے۔

جامع ازہر کی طرف نہیں ۲۸۲ھ ۵۹۸ء میں بمقام ہرات پیدا ہوے۔

اور ۳۷۰ھ، ۹۸۰ء میں اس مقام پر وفات پائی ،الازہری اس درجہ کے ثقہ علماء میں سے تھے۔جو ہر دور میں معدود وچند ہی ہوتے ہیں محقق ماہر لغت ہونے کے علاوہ ایک متقی و پرہیز گار فقیہ بھی تھے انہوں نے فقہ شافعی پڑھی اور اس میں نمایاں مقام حاصل کیا بحیثیت لغوی ایسی شہرت ہوئی کہ آپ کی دیگر علمی حیثیتیں دب کر رہ گیں ایسا لگتا ہے کہ قرامطہ کی قید میں رہنے کا ان کی اس حیثیت کو نمایاں کرنے میں بڑا رول تھا۔

جن لوگوں نے انہیں قید کیا تھا وہ فصحاء عرب میں سے تھیں آپس میں گفتگو دوران انتہائی فصیح عربی بولتے تھیں اس لیے عربی کے سلسلہ میں ان سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ان کو مذکور کتابوں میں ''تہذیب اللغۃ'' کو سب سے زیادہ شہرت ہوئی۔وہ لغت کے بکھرے ہوئے مفردات کے جامع اور ان کے اسرار و دقائق پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔

(۱) تہذیب اللغہ یا التہذیب کی ترتیب میں جس باریک بینی اور حسن انتخاب سے کام لیا گیا ہے وہ اس کی خصوصیت ہے اس میں صحیح کلام مدون ہے اگر چہ غیر صحیح کلام بھی ہے لیکن وہ نسبۃً بہت کم ہے۔

(۲) اس معجم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کے مؤلف کے پیش نظر زبان کو غیر صحیح الفاظ سے پاک وصاف

کرتا تھا اسی کام تہذیب اللغۃ رکھنے کی وجہ بھی یہی تھی الازہری تہذیب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ۔میں نے کتاب کو ایسی چیزوں سے بھر کر لمبا کرنے کی کوشش نہیں کی جن کی اصل کا مجھے پتہ نہیں چل پایا جن کو ثقہ راویوں نے عربوں کی طرف منسوب نہیں کیا"تہذیب اللغۃ" کا مقدمہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فصحاء عرب کے کلام کو مدون کرنے خاص طور پر اہتمام کیا قرامطہ کی قید میں رہنے کے دوران ان کو اس کا خوب موقع ملا اس لیے کہ ان کی اکثر قبیلہ ہوازن کے لوگوں پر مشتمل تھی اور قبیلہ تمیم اور قبیلہ اسد کے لوگ بھی ان سے آملے تھے۔

اسی کے ساتھ انہوں نے کتب لغت میں پائی جانے والی تصحیفات وتحریفات اور عام اغلاط کی نشاندہی کی اور ان کی تصحیح کا کارنامہ انجام دیا۔ حالاں کہ الازہری نے کتاب العین کی بعض سخت تنقید کا ہدف بنایا ہے تاہم انہوں نے تہذیب الغۃ علی الخلیل ہی کے نہج کو اپناتے ہوئے ترتیب میں حروف کے مخارج کا لحاظ کیا۔اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ نہج کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر انہوں نے العین سے ہی بغیر کسی تبدیلی وتصرف کے نقل کے انداز میں استفادہ کیا ہے (۳)ان کے نہج کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

کلمات کو صوتی ابجدی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے اور الخلیل کے طریقہ کے مطابق عین سے آغاز کیا گیا (۲)تقلیبات کے نظام کی پیروی کی گئی حروف کے مجموعہ سے بننے والے کلمات کو جمع کر کے ان کو بعید ترین مخرج والے حروف کے تحت رکھا گیا۔مثلاًق ل و سے بننے والے کلمات کو باب القاف میں رکھا گیا۔اس لیے کہ ان تینوں میں ق کا مخرج بعید ترین ہے۔

(۳)مہمل الفاظ کے ذکر کے ساتھ ان کے مہمل ہونے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو مستعمل الفاظ العین اور الجمہرہ وغیرہ دوسری لغات میں چھوٹ گئے تھے ان کا بھی اضافہ کیا گیا ہے (۴)ہر قول کو اس کے قائل اور ہر روایت کو اس کے راوی کی طرف منسوب کرنے کا اہتمام نمایاں ہے یہ وہ امور ہے جن کو الازھری کی تھذ یب اللغۃ میں بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔

البارع: اس کے مؤلف اک جلیل القدر ماہر لغت ابوعلی اسماعیل بن قاسم بن عبدون بن ھارون بن عیسی بن محمد القالی البغدادی ہیں وہ جمادی الاخری ۲۸۸ھ مئی جون ۹۰۱ء(بقول بعض دیگر کے ۲۸۰ء) میں آرمینیا کے ایک چھوٹے سے شہر منازجرد میں پیدا ہوئے، آرمینیا اس وقت دیار بکر کے ملحقات میں سے تھا۔انھونے یکم جمادی الاولی ۳۶۶ھ/ ۱۴/اپریل ۹۶۷ءکو بعض کے نزدیک ربیع الاخر یا جمادی الاخر ۳۵۶ھ اور بقول ابن مذاری ۳۶۶ھ میں وفات پائی کتاب البارع فی غریب الحدیث یہی کتاب ہمارا موضوع بحث ہے،البارع کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اس میں ضبط الفاظ کا بہت اہتمام ہے۔بیان کردہ معنی کی تائید میں اشعار سے شواہد پیش کئے گئے ہے،نوادر واخبار بھی بکثرت موجود ہے،عربوں کے مختلف لغات کا ذکر کا بھی اہتمام ہے ان اہل کلاب کے لغات کا خاص طور سے ذکر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ابوزید الانصاری سے بہت کچھ نقل کرتے ہے پھر و مختلف لغات میں ترجیح کا عمل بھی کرتے ہے اس

کے ساتھ ذکر کردہ مختلف اقوال کو ان کے قائلین کی طرف منسوب کرتے ہے یہ کتاب الاخری ۵۰۰ ۵۲۲ اوراق پر مشتمل ہے، لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کا کوئی بھی نسخہ آج تک مکمل شکل میں دستیاب نہیں ہوا ہے، اس کے صرف دو قطعہ موجود ہے، جن میں سے ایک برٹش میوزیم میں اور دوسرا پیرس کی لائبریری ہے اور ان کی فوٹو کاپیاں دار الکتب المصریہ ۸۳۱۰۸۲۶ لغہ کے تحت موجود ہے۔

المحکم : اس کے مؤلف مشہور لغوی ادیب اور منطقی ابوالحسن علی بن اسماعیل ہیں ابن سیدہ کے نام سے ان کی شہرت ہے وہ اندلس میں مرسیہ (Murcia) میں پیدا ہوئے اور دانیہ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ربیع الثانی ۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء انتقال کر گئے۔ابن سیدہ نابینا تھے، اللہ نے ان کو بے پناہ قوت حافظہ اور ذہانت ذکاوت سے نواز تھا۔انہوں نے اپنے والد سے جو خود ایک ممتاز لغت داں تھے نیز ابوالعلاء ساعد البغدادی ابوعمر بن محمد الطلمنکی صالح بن الحسن البغدادی اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی التہذیب کے انداز میں اس معجم میں بھی قرآن وحدیث سے لغت کا ربط قائم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

المحکم میں عروض، لغات عرب اور اعلام کے ذکر کا اہتمام بعض دوسری لغات ومعاجم کے مقابلے کم سہی لیکن موجود ہے۔

ابن سیدۃ کی المحکم کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اس میں نحو صرف کے قواعد سے متعلق کافی مباحث ہے قرآن کریم کی مختلف قراءتوں اور ان کی توجیہات پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک اور قابل ذکر خصوصیت نباتات کی تفصیلات اور تشریحات کا اہتمام ہے اس سلسلہ میں سابقہ معاجم کے متعلقہ مشمولات پر اکتفانہ کرتے ہوئے صاحب معجم نے اس موضوع سے متعلق دوسری اہم کتب سے بھی استفادہ کیا ہے مواد کی تشریح میں عام طور پر انتہائی باریک بینی اور دقیقہ سنجی سے کام لیا گیا ہے مختلف تشریحات کی تائید میں قرآن وحدیث اور ماثور کلام عرب سے استدلال کا اہتمام تو کیا گیا ہے لیکن پیش کردہ اشعار کو ان کے کہنے والوں کی طرف منسوب کرنے پر توجہ نہیں دی گئی ہے اس معجم میں متعدد رسائل و کتب میں بکھرے ہوئے مواد لغت کو اس طریقہ پر جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی ضرورت باقی نہ رہے۔

الجمہرہ : اس کے مؤلف ابوبکر محمد بن الحسن بن درید الازدی (۲۲۳-۳۲۱ھ) ہیں ابن درید کے نام سے شہرت ہے خود اپنے بیان کے مطابق وہ قبیلہ قحطان سے تعلق رکھتے تھے۔معتصم کے عہد حکومت میں (۲۲۳ھ ۸۳۷ء) میں بصرہ میں پیدا ہوئے اسی شہرت میں انہوں نے ابو حاتم السجستانی ابو الفضل الریاشی ابو عثمان الاشاندانی اور الاصمعی کے بھتیجے جیسے عظیم اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔شعبان (۳۲۱ھ) اور ایک روایت کے مطابق (۳۲۵ء) میں وفات پائی۔ابن درید حیرت انگیز قوت حافظہ کے مالک تھے ان کو "اعلم الشعرا" اور "اشعر العلماء" بھی کہا گیا ہے، وہ عربی زبان کے سلسلہ میں حجت تھے مقدمہ الصحاح میں عبدالغفور عطار مقدمۃ التہذیب کی مذکورہ بالا عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں ابن درید کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہا گیا ہو اس سے قطع

نظر وہ بلاشبہ ان ائمہ لغت میں سے ایک ہیں جنہوں نے عربی زبان میں پیش الاخری ۱۴۳۲ تا انجام دیں؛ اسی طرح الجمہرۃ کے خلاف چاہے کچھ بھی کہا گیا ہو وہ ایک عظیم معجم ہے۔

اور انصاف کا تقاضا ہے کہ ابن درید کو اس الہتام سے بری قرار دیا جائے جو ان پر لگایا گایا کیوں کہ حقیقۃً وہ روایت میں تحری کا اہتمام کرتے تھے اور وہی چیز نقل کرتے تھے جس پر ان کو اطمینان ہوتا تھا، اس کے باوجود اگر ان کی معجم میں کسی نوع کے وہم وخلل یا فروگذاشت کی جاتی ہے تو امر واقع یہ ہیکہ بڑی سے بڑی کتابیں عیوب اور قابل گرفت چیزوں سے خالی نہیں ہیں انکے بارے میں ازہری کی رائے سراسر انصاف پر مبنی ہے ابن درید کے بہت سی مؤلفات ہیں ان میں سب سے اہم اور بیش قیمت ان کی معجم الجمهرة ہی ہے، الجمهرة میں ابن درید نے تقلیبات ہجائی کے نظام کو اپنایا ہے یہ وہی نظام جس کی طرح الخلیل نے اپنی العین میں ڈالی تھی۔ البتہ الجمهرة کی ترتیب میں دوسرا انداز اختیار کیا گیا ہے مثلاً ایک مجموعہ حروف سے تقلیبات کے ذریعہ بننے والے تمام الفاظ کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے لیکن ترتیب میں مخارج کے صوتی نظام کو ملحوظ رکھنے کے بجائے حروف کو بجائے حروف کے ابجدی نظام کا لحاظ کیا گیا ہے، چناں چہ ر-ب سے بننے والے کلمات ربک رکب کرب کبر برک بکر کو با سے شروع ہونیوالے کلمہ بکر یا برک تلاش کیا جائے گا کہ حروف میں ترتیب کے لحاظ سے۔ با پہلا حروف ہے۔

ابن درید الجمهرة میں الفاظ کی تشریح کا بڑا اہتمام کرتے ہیں قرآن وحدیث اور خالص عربوں کے کلام سے استشہاد کرتے ہیں قرآن کی مختلف قراءتوں کا ذکر مختلف عرب قبائل کے لغات کی تصریح وتوضیح بھی ان کے دائرہ اہتمام میں شامل ہے جس کے تحت وہ اس بات کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ کونسا لغت کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے کتاب کی ورق گردانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لغت یمن کے حق میں خاصے متعصب ہیں اس کے علاوہ معرب ودخیل کلمات کی نشاندہی کا بھی اہتمام کرتے ہیں دخیل کلمات کی وضاحت میں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ رومی حبشی عبرانی سریانی زبانوں میں سے کس سے ان کا تعلق ہے۔

تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ:

اس معجم کے مؤلف کا پورا نام ابونصر اسماعیل بن حماد الجوہری الفارابی ہے، وہ ترکی النسل تھے فاراب کے صوبے (یا شہر) میں پیدا ہوئے جو سیر دریا (سیحون) کے مشرق میں تھا جسے ابو الفدا اور یاقوت کے عہد میں اترایا اطرار کہتے ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ووفات دونوں میں اختلاف ہے تاریخ والادت کا ذکر بہت کم ملتا ہے دستیاب معلومات کے مطابق وہ سن ۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں وفات پائی ایک روایت کے مطابق سن ۳۹۳ھ میں دوسری روایت کے مطابق سن ۳۹۸ھ میں اور ایک روایت کے مطابق سن ۴۰۰ھ میں الفاظ کی تدوین ان کی مناسبت تشریح اور اس کی تائید میں قرآن وحدیث اور ثقہ شعرائے عرب کے کلام سے استشہاد تقریباً سبھی لغت نویسوں کا وتیرہ رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ لغت کی تالیف میں ایک خاص مقصد بھی ہر لغت نویس کے پیش نظر ہوتا ہے

الجوہری کا نصب العین اپنی معجم کی ترتیب وتالیف میں طالبان لغت کے لیے استفادۃ الاخری کو آسان بنانا تھا الخلیل اگر لغت نویسی کے موجد تھے تو الجوہری نے معجم کی ترتیب میں آسان طریقہ اپنانے کی طرح ڈالی۔اس کے علاوہ بھی تاج اللغۃ و صحاح العربیۃ کی بہت سی خصوصیات ہیں مثلاً اس میں زیادہ تر ایسے ہی الفاظ جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جو روایۃً اور درایۃً صحیح ہوں اور یہی اس کی وجہ تسمیہ بھی ہے اس سلسلے میں مصنف نے کتب لغت کے مطالعے کے علاوہ فصحاء حجاز خاص طور پر ربیعۃ ومضر کے فصحاء سے گفتگو اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ استفادہ کیا تھا۔غیر صحیح الفاظ اگر کہیں لائے بھی ہیں، تو ان کی وضاحت کردی ہے، بکلمہ کے مرادی معنی کی توضیح کے لیے وہ شواہد پیش کرتے ہیں لیکن بسا اوقات ان کے قائلین کے ناموں کی وضاحت نہیں کرتے ،اسماوافعال کے ضبط وغیرہ کا بہت زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، تا کہ ان میں تصحیف واقع نہ ہو، جس مظاہر بعض دیگر معاجم میں بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں، اعلام اور خاص طور پر قبائل کے ناموں کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کے علاوہ بہت سی لغوی بحثیں بھی ہیں، جو معجم میں مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی ہیں، نیز معرب ومولد الفاظ بھی ذکر کئے گئے ہیں، جن کی تشریح میں بعض اوقات مصنف عربی کے بجائے فارسی کا بھی استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، صحاح میں جوہری کے پیش نظر ترتیب ہیں ایسی قدرت پیدا کرنا اصل مقصد تھا جس سے مراجعین لغت کے لیے آسان پیدا ہوجائے، یہ کام انہوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔

دوسری سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے صرف ایسے ہی الفاظ کو جمع کرنے پر اکتفا کیا جو ان کے نزدیک روایۃ صحیح تھے لیکن ان کی کتاب ابھی کاتبوں ہی کے ہاتھوں میں تھی کہ ان کی موت واقع ہوگئی۔

لسان العرب:

اس معجم کے مؤلف ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم الافریقی المصری الانصاری الخزرجی الرویفعی (۶۳۰/۱۱۷ھ/۱۳۱۱ء) ہیں وہ عام طور پر ابن منظور کے نام سے جانے جاتے ہیں۔حضرت رویفعی ابن ثابت صحابیؓ کے خاندان سے تھے وہ مصر کے بڑے معزز اور علم دوست گھرانے کے چشم وچراغ جلیل القدر ادیب اور ماہر لغت عربی تھے، (۲۲ محرم ۶۳۰ھ کو قاہر میں ان کی پیدائش ہوئی تھی) ابن المقبر مرتضی بن حاتم یوسف الخیلی۔

لسان العرب کی مندرجہ ذیل خصوصیات، سہولت ترتیب، وسعت مواد، بڑی تعداد میں شعراء اور اشعار کی شمولیت اکثر وبیشتر اشعار کی شعر کی طرف صحیح نسبت، الفاظ کی تشریح توضیح میں قرآن وحدیث اور ثقہ شعراءعرب کے کلام استدلال، آیت وقرآنی کی قراءتوں کی توجیہ واخبار کا بکثرت ذکر، صرف ونحو اور فقہ وادیب کی نادر ومفید معلومات کی یک جائی۔

تاج العروس:

اس معجم تشریحی کے مولف محب الدین ابوالفیض اسید محمد مرتضی الحسینی الواسطی الزبیدی ہیں، ۱۱۴۵ھ میں یمن کے ایک شہر زبید میں پیدا ہوئے انہوں نے قاہرہ ہی میں شعبان ۱۲۰۵ھ میں بعارضۂ طاعون وفات پائی، تاج العروس

ضخیم ترین مطبوعہ عربی معجم ہے، جو ایک لاکھ بیس ہزار مادوں پر مشتمل ہے، لیکن چوں کہ یہ کوئی مستقل بالذات معجم نہیں ہے بل کہ ایک شرح ہے جس کو تشریحی معجم کہا جاتا ہے جس میں القاموس المحیط کو متن کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے اس معجم تشریحی کی ترتیب بھی متن ہی کی ترتیب کے مطابق ہے، انہوں نے اس میں بیش قیمت تشریحی اضافہ کئے ان کی کچھ تفصیل اور خصوصیات حسب ذیل ہے "خصوصیات" علامہ فیروزآبادی نے القاموس المحیط میں جن شواہد کو ترک کردیا تھا صاحب تاج العروس نے دوسری لغات و معاجم سے تلاش انتخاب کر کے ان کو اپنی اس تشریحی معجم میں شامل کیا؛ اسی طرح صاحب متن نے جن لغویین سے نقل روایت کی ان کے ناموں کو بھی ان کے ماخذ کے حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا جو مادے یا بعض ضروری مشتقات متن میں رہ گئے تھے وہ مما یستدرک علیہ یا و المستدرک کے تحت ان کا بھی ذکر کیا ایسے ہی جو بعض اہم اعلام و اماکن چھوٹ گئے تھے، ان پر بھی متنبہ کیا تاج العروس میں مجاز معانی کے ذکر کا بہت زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، جس سے نہ صرف القاموس المحیط کی ایک کمی کا ازالہ ہوا ہے بل کہ بعض دوسرے معاجم کے مقابلہ میں بھی تاج کا یہ ایک امتیازی پہلو ہے، اسی معجم کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں لہجات عامیۃ بالخصوص مصری لہجہ عامیۃ کے الفاظ کی بھی صراحت کی گئی ہے، تاج العروس کا مقدمہ انتہائی قیمتی معلومات پر مشتمل ہے، اس میں دس مقاصد کے تحت جو مباحث احاطہ تحریر میں آئے ہیں وہ کسی بھی محقق کے لیے لغت سے متعلق خزینۂ بحث و تحقیق کی کنجی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

المصباح المنیر:

اس کے مؤلف شیخ ابو العباس احمد بن علی الفیومی ثم الحموی متوفی ۷۷۰ھ ۱۳۶۸ء ہیں، شیخ فیومی نے اپنی معجم میں مطول مختصر ستر تصنیفات کو مراجع و مآخذ کے طور پر پیش نظر رکھا ہے، اس مختصر معجم کی خصوصیت میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت استشہاد کیا گیا ہے، اور عام لغوی معنی کے ساتھ فقہی معانی بھی وضاحت کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

مؤلف نے مبتدئین اور طلبہ علم کی سہولت کے پیش نظر نہایت اختصار سے کام لیا ہے، الفاظ کی تشریح اختصار سے کرنے کے ساتھ اعلام اور الفاظ سے متعلق واقعات کو حذف کر دیا گیا ہے، شواہد کو بھی عام طور پر حذف کیا گیا ہے، لیکن جب ان کا ذکر ہوتا ہے تو ان کا انتساب بھی کیا جاتا ہے، کبھی کبھی مؤلف اپنے مآخذ کی وضاحت کرتے ہیں مثلاً مادہ حبر میں "ففیل کعب الحبر حکاہ الزهری عن الفراء" ضبط الفاظ پر توجہ دی گئی ہیں، اور اس لیے اسماء میں مشہور ہم وزن کلمات کا ذکر کا طریقہ اپنایا گیا ہے، افعال میں مثال کے ساتھ مصدر کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ نہایت اختصار کے ساتھ صرفی و اشتقاقی پہلوؤں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

اساس البلاغۃ:

اس کے مؤلف مشہور ایرانی الاصل عالم تفسیر فقہ کلام ولسانیات ابو القاسم محمود بن عمر بن احمد الزمخشری ہیں، وہ

۲۷ رجب ۴۶۷ھ/۸ مارچ ۱۰۷۵ء میں خوارزم میں پیدا ہوئے انھوں نے طالب علمی کی زندگی سے مختلف مقامات کا سفر کیا اور یوم عرفہ ۹ ذی الحجہ ۵۳۸ھ/ ۱۴ جون ۱۱۴۴ کو خوارزم کے شہر جرجانیہ میں وفات پائی۔

اساس البلاغہ کی خصوصیات کے ذیل میں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کلمات کی تشریح میں اختصار کے ساتھ انتہائی باریک بینی سے کام لیا گیا ہے الفاظ کے حقیقی معنی پہلے اور مجازی معنی بعد میں بیان کئے گئے ہیں تشریح کے سلسلہ میں عمدہ اسالیب اور منفعبارتوں کا انتخاب کیا گیا ہے، معجم میں جابجا مجاز کے لیے مختلف تعبیریں استعمال کی گئی ہیں مثلاً: و من المجاز یا و من المستعار یا و من الکنایۃ کی تعبیرات استعمال کی جاتی ہے، تو مقصد مجازی قسم بیان کرنا نہیں ہوتا بل کہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ متعلقہ لفظ جس معنی کے لیے وضع ہوا ہے اس کے علاوہ بھی اس کا استعمال ہے جسے مؤلف کہتے ہے۔

و من المجاز بنی علی اھلی دخل علیھا یہ بنی میں استعارہ تبعیہ ہے، لیکن انہوں نے و من المجاز کہہ کر عمومیت کے ساتھ ہی تعبیر پر اکتفا کیا، الفاظ کی تشریح میں عام طور پر دوسروں کی عبارتوں کا سہارا نہیں لیا گیا ہے بل کہ مؤلف علام نے زیادہ سے زیادہ اپنی عبارتیں استعمال کرنے کا اہتمام کیا، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر پوری معجم پر ان کی شخصیت چھائی ہوئی لگتی ہے۔

القاموس المحیط:

اس کے مؤلف مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب بن ابراہیم الفیروزآبادی ہیں، ربیع الثانی یا جمادی الآخر ۷۲۹ھ/فروری یا اپریل ۱۳۲۹ء میں شیراز کے قریب کارزین میں پیدا ہوئے، ۸۱۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

القاموس المحیط میں جن امور کا التزام کیا گیا ہے، ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔ فعل معتل واوی کو معتل یائی سے الگ کر کے بیان کیا گیا ہے، مثلاً أتو (سیدھا چلنے کے معنی میں) اور اتی (آنے کے معنی میں) کو دو الگ الگ مادوں میں دیکھا جائے گا جن میں سے ایک واوی ہی اور دوسری یائی۔ معتل العین اسم فاعل کی جو جمع فعلة (بفتح الفاء و العین) کے وزن پر ہو جیسے جولة اور خولہ اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ اختصار مقصود ہے اور یہ ایک معروف سی چیز ہے۔ اسم مذکر لکھنے کے بعد اس کے مؤنث کی وضاحت کے لیے عام طور پر "وھی بھاء" کہنے پر اکتفاء کیا گیا، لیکن کبھی کبھی صیغہ مؤنث کا ذکر صراحتہً بھی کیا گیا ہے، جیسے ثعلب کی مؤنث ثعلبة۔

مصدر کا ذکر جب مطلقاً ہو یا فعل کا ذکر ہو، لیکن اس کا مضارع مذکور نہ ہو، تو یہ فعل باب نصر سے ہوگا، اور اگر اس کی مضارع کا ذکر ہو اور عین کلمہ کی حرکت کی وضاحت نہ ہو تو یہ فعل باب ضرب سے ہوگا وغیرہ۔ اسماء میں ضبط اعراب کے لیے حرکات سے ان کی تجرید اس صورت میں کی گئی ہے، جب کہ وہ مفتوح الالف اور ساکن العین ہو۔" محرکة" اس وقت کہا گیا ہے جب اسم کا عین کلمہ مفتوح اور اس کا مفتوح العین ہونا مشہور ہو۔ عمومی طور پر ضبط حرکات میں دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں، یا تو جس لفظ کا ضبط حرکات مقصود ہوتا ہے، اس کو ہم وزن کلمہ لکھ دیا جاتا ہے۔ جس

سے بلا احتمال خطا تحدید حرکات ہوجاتی ہے اور اسی پر زیادہ تر عمل ہے۔اس کے الاخری رموز کا بھی وضاحت وصراحت کے ذریعہ بھی یہ کام لیا گیا ہے۔بعض امور کی طرف اشارہ کے لیے کچھ رموز کا استعمال کیا گیا ہے،مثلا:معروف کے لیے (م)،موضع کے لیے (ع)،جمع کے لیے (ج)،قریہ کے لیے (ۃ)،بلد کے لیے (د)،جمع الجمع کے لیے (جج)،بخاری کے لیے (خ):مذکورہ التزامات کے علاوہ القاموس کی خصوصیت کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور بھی قابل لحاظ ہیں۔

مواد کی ترتیب میں دقت نظر سے کام لیا گیا ہے،ہر مادہ کی تسلسل کے ساتھ تشریح کی گئی ہے،جس سے تکرار اور پراگندہ خیالی کا ازالہ ہوگیا ہے،اس ترتیب کی ایک قابلِ ذکر چیز یہ بھی ہے کہ اعلام کا ذکر عام طور پر تشریح معانی کے بعد آخر میں کیا گیا ہے۔طالبان علم کی آسانی کے لیےضرورت اختصار کے مدنظر بہت سےشواہد واستطرادات (خارج از بحث مضامین) کوحذف کرکے پوری بالغ نظری ساتھ مواد لغت کی تدوین میں استقصاوشمولیت میں بھی صرف نظر نہیں کیا گیا ہے۔

اس میں انہوں نے محکمی اور العباب جیسے مراجع سے مدد لی ہے۔جن کو اس قاموس کی لیے اساس کا درجہ حاصل ہے۔اعلام صحابہ رضوان اللہ علیہم محدثین عظام اور علما کا اکرام کا ذکر بھی مؤلف کے دائرۂ اہتمام میں شامل ہے،چناں چہ حسب موقع ان کے شایان شان وہ کچھ لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔مؤلف علام نے طبی پہلوؤں کو بھی خاص اہمیت دی ہے چناں چہ نباتات کی ذیل میں وہ ان کے خاص منافع بھی بیان کرتے ہیں۔مختلف علوم اور بالخصوص علم عروض کی اصطلاحات کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

علامہ فیروزآبادی کی القاموس المحیط کو بہت سے ناقدین نے ہدف تنقید بنایا ہے۔ان میں اہمیت کے اعتبار سے احمد فارس الشدیاق سرفہرست ہیں۔انہوں نے اس موضوع پر باقاعدہ ایک کتاب "الجاسوس علی القاموس" کےعنوان سے لکھی ہے،نیز اپنی دوسری کتاب "سر اللیال فی القلب و الابدال" میں بھی اس پر تنقید کی ہے،اسی طرح علامہ محمد سعد اللہ نے اپنی کتاب "القول المانوس" میں اس پر نقد کیا ہے۔

آخری کوشش:

علم اللغہ کے سلسلہ میں مذکورہ بالا معروضات وگزارشات کی روشنی میں آج بھی اس نوعیت کی خدمت کی جاسکتی ہے۔نئے نئے الفاظ نئی ایجادات نئے نئے اصطلاحیں ایجاد ہونے کے ناطے عربی زبان وادب میں ایک خاص مفید قسم کے اضافے کے لیے اور علم اللغہ کی خدمت کے لیے یہ فن ہر علمی ذہن رکھنے والے کو دعوت دیتا ہے،کہ اسی طرف قدم بڑھائیں اور اسی طرح کا اس فن کے سلسلہ میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیں چناں چہ قاہرہ کی مشہور زمانہ کی یونیورسٹی کے پروفسران کی ایک ماہر ٹیم نے یہ کام انجام دیا جو "المعجم الوسیط" کی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔

فقه اللغه پر لکھی گئی چند مشہور عربی کتابیں:

الخصائص (ابو الفتح عثمان ابن عمر ابن جنی) فقه اللغۃ و سر العربیۃ (ابو منصور الثعالبی)

الصاحبی فی فقہ اللغۃ و سنن العرب فی کلامھا　　　　(احمد بن فارس القزوینی)

المزھر فی علوم اللغۃ و انواعھا (عبد الرحمن السیوطی) فقہ اللغۃ (علی عبد الواحد وافی)

کتاب الاشتقاق و التعریب (عبد القادر مصطفی المغربی) الاشتقاق (عبد اللہ امین)

مناھج البحث فی اللغۃ (تمام حسان)　　　　الأصوات اللغویۃ (ابراھیم انیس)

فقہ اللغون خصائص العربیۃ (محمد المبارک) دراسات فی فقہ اللغۃ (صبحی الصالح)

دلالۃ الألفاظ العربیۃ و تطورھا (دکتور مراد کامل)

الفروق اللغویہ پر لکھی گئی کتابیں:

الفروق اللغویۃ (ہلال عسکری)　　　　مآرب الطلبہ اردو (مولانا شبیر احمد)

مترادفات القرآن اردو (عبد الرحمن کیلانی)　　　　الفاظ مترادفہ کے درمیان فرق فروق اللغویۃ اردو

عربی لغت پر اردو میں کتابیں:

قاموس الوحید (مولانا وحید الزماں کیرانوی)　　　　مصباح اللغۃ　　(مولانا عبد الحفیظ صاحب)

المنجد (سعد حسن خان یوسفی)　　　　القاموس الاصطلاحی (مولانا وحید الزماں کیرانویؒ)

القاموس الجدید اردو عربی اور عربی اردو (مولانا وحید الزماں کیرانویؒ)

اردو سے اردو لغات:

فیروز اللغات (مولوی فیروز الدین صاحب)　　　　جامع اللغات (محمد ایوب ہرسولوی)

سنگم (حکیم عزیز الرحمن اعظمی)

عربی زبان و ادب اپنے جامع و مانع تعارف کے آئینہ میں

بقلم: محمد زاہد بن عبد الخالق الندوی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

آج دنیا میں جتنی بھی زبانیں اور بولیاں رائج ہیں، اور اظہار مافی الضمیر کا واحد وسیلہ اور ذریعہ بنی ہوئی

ہیں، ان تمام لغات مروجہ کا خالق بھی اللہ رب العالمین ہی ہے، اور واضع بھی، اسی نے ناطقین جمیع لغات کو اپنی اپنی بولیوں میں اپنے اپنے خیالات وافکار اور احساسات وانطباعات کا اسلوب وڈھنگ بھی تعلیم فرمایا ہے، اور ان لغات اور زبانوں کے الفاظ وکلمات بھی انہیں الہام فرمائے اور ان کے قلوب میں ڈال دیئے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''الرحمن علم القرآن O خلق الانسان O علمه البيان O واضع لغات ابتداءً اللہ رب العزت ہے'' وعلم آدم الاسماء كلها'' پھر بعد میں کمی بیشی حذف واضافہ اور تغیر وتبدل ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسان کی طرف سے ہوتا رہا ہے، احسن واشرف لغت کونسی ہے؟ تمام لغات میں احسن واشرف لغت لغۂ عربیہ ہی ہے۔ ''قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم احبوا العرب لثلاث لانی عربیٌ و القرآن عربیٌ و لسانُ اهلِ الجنة عربیٌ'' تم عربوں سے محبت کرو کیوں کہ اللہ پاک نے ان کو تین ایسی فضیلتوں سے بہرہ مند فرمایا ہے، جو کہ ان کا ہی حصہ ومقدر بنی ہے اور بنی چاہیے، اولاً تو یہ کہ میں ان عربوں میں ہی ہوں۔ ثانیاً یہ کہ اللہ پاک نے اپنی کتاب قرآن مجید کا نزول بزبان عربی فرمایا ہے، ثالثاً یہ کہ اہل جنت یعنی جنتیوں کی زبان بھی عربی ہوگی، چناں چہ اللہ ربّ العزت نے قرآن مجید کی صفت بیان فرمائی ہے: ''قرآناً عربياً بلسانٍ عربيٍ مبين'' نیز حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے: ''ما انزل الله كتاباً إلاّ بالعربية ثم ترجم لكل نبي على لسان امته'' یعنی خداوند کریم نے جو کتاب بھی نازل فرمائی ہے تو عربی زبان ہی میں نازل فرمائی ہے، پھر بعد میں اس کتاب کو ہر نبی کے لیے اس کی اپنی قوم کی مادری زبان میں منتقل کروادیا، یعنی ان کے اپنے افہام وتفہیم کے لیے اس زبان میں Translation کروادیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے: ''عليكم بالعربية فانها تثبت العقل وتزيد في المروءة'' تم عربی زبان کو لازم پکڑے رہو کیونکہ وہ عقل انسانی کو پختہ کار بناتی ہے۔فہم میں نکھار لاتی ہے اور مروت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

و قال بعض السلف: ''عليكم بالعربية فانها المروءة الظاهرة وهي كلام الله تعالى و الانبياء و الملائكة أجمعين'' کچھ سلف صالحین نے فرمایا ہے: تم عربی زبان کو لازم پکڑے رہو، کیوں کہ وہی مروت ظاہرہ ہے، اور اللہ پاک کا اور تمام انبیاء اور ملائکہ کا کلام ہے۔

انسان کی سب سے پہلی زبان کونسی ہے؟ چوں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اور اشرف الخلائق تھا، اس لیے اللہ ربّ العزت نے تمام لغات میں سے احسن لغات عربی عطاء فرمائی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں ہے کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی زبان عربی تھی لیکن پھر شجر ممنوعہ کے کھانے سے اللہ ربُّ العزت نے جہاں اور نعمتیں واپس لے لیں وہاں یہ نعمت (عربی زبان) بھی واپس لے لی، پھر آپ سریانی بولتے رہے، اور جس طرح آپ کو دوسری نعمتوں کے فقدان پر رنج وغم ہوا ایسے ہی اس نعمت کے سلب ہوجانے پر بھی شدید قلق اور افسوس ہوا''ثم اجتبه ربه فتاب عليه وهدى'' (القرآن) کا زمانہ آیا تو اور نعمتوں کے ساتھ ساتھ یہ نعمت بھی مرحمت فرمائی جس پر آپ کو بہت خوشی ہوئے۔

عربی زبان میں تغیر وتبدل اور عود کیسے ہوا؟

حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ دور دراز تک عربی استعمال ہوتی رہی، پھر جوں جوں زمانہ گذرتا چلا گیا دین میں تنزلی شروع ہوگئی، یہاں تک کہ کفر وشرک عام ہوگیا تو کفران نعمت کی وجہ سے لغت عربیہ تدریجاً "تدریجاً" اٹھنی شروع ہوگئی چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے وقت لغت عربیہ بالکل ختم ہوگئی، دوسری لغات مروج ہوگئیں ،پھر سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ کو بذریعہ وحی یا بذریعہ الہام خالص عربی زبان سکھائی گئی "کما فی روایۃ اول من تکلم باللغۃ العربیۃ سیدنا اسماعیل علیہ السلام" جوکہ آپ کے اور قریش کے جدّ امجد ہیں ،اور اسی لغت قریش پر قرآن نازل ہوا، اسلام اور عربی کا ایسا لازوال رشتہ ہے کہ وہ کسی عہد اور کسی ملک میں منقطع نہیں ہوسکتا، عربی زبان دنیا کی ان وسیع ترین، شریں سلیس، پاکیزہ اور خوبصورت زبانوں میں سے ہے، جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے، اس کے الفاظ کے مخارج بڑے سامعہ نواز، پیرایہ بیان بڑا بلیغ، تراکیب بڑی دل آویز اور صوتی اثرات بڑے وقیع اور موثر ہوتے ہیں، پھر اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک ہی مادہ سے (اکثر تین حرف سے) مختلف قسم کے الفاظ نکلتے ہیں، جن میں بسا اوقات سات حروف تک ہوتے ہیں، اور جن کے معنی بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس کے علاوہ، صلات کے بدلنے سے بھی معنی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں، بات کو پر اثر بنانے کے لیے مجاز وکنایہ اور تشبیہ واستعارہ وغیرہ کا اور معانی میں وسعت اور گہرائی وگیرائی پیدا کرنے کے لیے مرادفات کا استعمال ہوتا ہے، الفاظ کی آخری آواز (اعراب) کو حروف ہی کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے، انہیں لکھا نہیں جاتا چناں چہ زبر زیر پیش کو علامت کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے، حروف سے نہیں جیسا کہ آریائی زبانوں میں ہوتا ہے، اس کی علاوہ آریائی زبانوں کے مقابلے میں اس کے حروف تہجی بھی زیادہ ہیں، جن کی وجہ سے ہر قسم کے الفاظ لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

عربی زبان کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے قالب میں ڈھال لینے (معرب کرنے میں) اور بدل کر خوبصورت شکل دیدینے میں یہ زبان اپنا ثانی نہیں رکھتی عام طور سے دنیا کی ہر زبان میں کم الفاظ کے ذریعہ بہت معانی پیدا کرنے کا طریقہ رائج ہے، جسے اصطلاح میں حد اعجازی کہا جاتا ہے عربی زبان اعجاز کے معاملہ میں منفرد ترین زبان ہے، اس میں بکثرت ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی تشریح کے لیے ایک دفتر چاہیے، مثلاً "الحمد" کو لے لیجیے جس سے قرآن کی سورہ فاتحہ شروع ہوتی ہے، جس کے معانی علما یہ بتلاتے ہیں کہ انعامات واحسانات کے اعتراف کے جذبہ کے ساتھ انسان نے شکر ادا کرنے کے جتنے طریقے ایجاد کئے ہیں یا ایجاد کرے گا، یا سوچا ہے یا سوچ سکتا ہے، وہ سب اس خدائے محسن ومنعم کے لیے مخصوص ہیں، اس ایک لفظ میں ایسی جامعیت اور شمولیت ہے کہ دفتر کے دفتر اس معنی کو ادا کرنے کے ناکافی ہیں، اور الفاظ کی یہ صفت وجامعیت عربی زبان میں بہت عام ہے، بات کو اشاروں کے ذریعہ پر لطف بنانے کے لیے کنایہ مجاز اور اسلوب کو دلنشیں اور موثر بنانے کے لیے معانی وبدیع کا استعمال عربی زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے، دنیا کی تمام لغات اور زبانوں میں ایک معنی

ادا کرنے کے لیے کئی الفاظ استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے، ان الفاظ کو مترادفات الاخریٰ یا محرم ۱۴۳۲ھ الفاظ کہا جاتا ہے، عربی زبان کا دامن مترادفات کے معاملہ میں بڑا وسیع ہے، چناں چہ علمائے لغت نے صرف سال کے لیے ۲۴/ نام اور روشنی کے لیے ۲۱/ اور تاریکی کے لیے ۵۲/ کنویں کے لیے ۸۸/ پانی کے لیے ۱۷۰/ شیر کے لیے ۳۵۰/ اور اونٹنی کے لیے ۲۵۵/ نام لکھے ہیں؛ اسی طرح انسانی حلیہ اور اوصاف کے لیے بیشمار الفاظ آتے ہیں چناں چہ عربی زبان میں درازیٔ قد کے لیے ۹۱/ الفاظ پستہ قد کے لیے ۱۲۰/ الفاظ آئے ہیں، اوصاف میں بخل، سخاوت، رذالت وغیرہ معانی کے لیے بھی مختلف الفاظ آئے ہیں، الفاظ کے معانی کے اظہار کے سلسلہ میں عربی زبان کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو متضاد معنی دیتے ہیں جیسے ''دون'' کا لفظ ہے کہ اس کا معنی کم زیادہ قریب دور آگے پیچھے کے بھی آتے ہیں۔

ایک لفظ سے کئی معانی کا نکالنا:

غالباً عربی زبان دنیا کی زبانوں میں اس حیثیت سے بالکل منفرد زبان ہے کہ ایک ہی لفظ بسا اُوقات کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے چناں چہ علمائے لغت نے دوسو سے زائد الفاظ ایسے جمع کئے ہیں جو تین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اور ایک سو سے زائد الفاظ جو چار اور پانچ معنی دیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض الفاظ ۲۵/ معنی والے بھی ہیں، اور ایک سو سے زائد الفاظ جو چار یا پانچ معنی دیتے ہیں، یہاں تک کہ بعض الفاظ ۲۵/ معنی دینے والے ہیں، چناں چہ ''قال'' کا لفظ ۲۷/ معنی کو ظاہر کرتا ہے، اور ''عین'' کا لفظ ۳۵/ معنی کو، اور ''عجوز'' کا لفظ ۶۰/ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

امثال وحکم کا وجود:

کم سے کم الفاظ میں زیادہ معانی کو دل نشین انداز میں ظاہر کرنے کا طریقہ کم وبیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے، جسے مثل یا کہاوت کہا جاتا ہے، مگر عربی زبان میں اس کی بہت کثرت اور بڑا شیوع ہے عربوں کو اپنے مخصوص طرز زندگی کی وجہ سے عناصر فطرت سے براہ راست مقابلہ کرنا پڑتا تھا، اس طرز زندگی کے تجربات سے عربوں نے براہ راست نتائج اخذ کئے، ان نتائج کو حکمت وفلسفہ، دانشمندی وجزرسی کی آمیزش سے الفاظ کے ایسے خوبصورت خوبصورت قالب میں ڈھالا گیا، جو صوتی اثرات کے حسن وجمال کے علاوہ معنویت میں بھی ایک بحر بیکراں تھے، اور وہی قالب ضرب الامثال یا کہاوتیں کہلائیں۔

ان اہم اور امتیازی خصوصیات کے علاوہ عربی زبان میں ورمسجع ومقفیٰ ومرصع نثر کا طریقہ بھی رائج تھا، جسے عام طور پر اسلام سے پہلے پروہت کاہن اور مقررین استعمال کرتے تھے، الفاظ کی صوتی اثرات کے ذریعہ منظر کشی کرنے میں عربی زبان کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے، چناں چہ اس زبان میں بعض ادبا ایسے گذرے ہیں جنہوں نے الفاظ کے ذریعہ کسی چیز کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس کی تصویر آنکھوں کی سامنے پھر گئی، اس کی یہی امتیازی خصوصیات تھیں جن کی

بنا پر خدا نے اپنے کلام کے لیے اس زبان کو منتخب فرمایا، اور قرآن کریم جیسی معجز نما کتاب اہل زبان میں اتاری، جو بلا اختلاف عربی زبان وادب کی واحد کتاب ہے جن کی ایک آیت کی مثال بھی عربی کا بڑے سے بڑا شاعر اور ادیب اب تک نہ لاسکا قرآن کریم کے بعد اسی زبان میں خدا کے پیغمبر و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باتیں ارشاد فرمائیں : جو عربی ادب میں بلا اختلاف اپنی فصاحت وبلاغت اور معنوی جامعیت میں شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کسی بھی زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا پیمانہ صرف یہ نہیں کہ کہ اس کا دائرۂ عمل کتنے لمبے اور چوڑے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے، یا اسے دنیا کی آبادی میں سے کتنی بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے، بل کہ اس کے ساتھ اس کی کسوٹی کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اس کا دامن کتنا وسیع ہے اور اس میں کتنی گہرائی اور کتنی گہرائی ہے اس کے نحوی قواعد اور گرامر کے اصولوں میں کتنا استحکام، پختگی ہے، اور اسی کے ساتھ اس میں کتنی وضاحت ہے، اس کے الفاظ کتنے شیریں، اس کا پیرایہ بیان کتنا دل کش، اور اس کا طریق تلفظ اور صوتی اثرات کتنے موثر اور اس کے سیکھنے سکھانے کے امکانات اور طریقہ کتنے اور آسان ہیں، جس زبان میں دائرۂ عمل کی وسعت اور کثرت استعمال کے ساتھ ساتھ نحوی قاعدے جتنے سائنٹفک، واضح اور مستحکم ہوں گے، جس کے الفاظ جتنے شیریں اور طرز ادا جتنا دل کش او راسلوب بیان جتنا موثر اور جس کے معانی جتنے عمیق اور گہرے ہوں گے، اسی اعتبار سے زبان کی اہمیت مقبولیت اور کارفرمائی کا فیصلہ کیا جائے گا، اس نقطۂ نظر سے اگر ہم عربی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں یہ تمام خوبیاں پوری طرح موجود ہیں، اور اسی وجہ سے اسے دنیا کی مروجہ زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، عربی زبان کی یہی بے مثال خوبیاں اور امتیازی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے سرداران قریش باہر سے آنے والوں عربوں کے کانوں میں قرآن کی بھنک بھی نہ پڑنا دینا چاہتے، کہ مبادا! اس کی سحر طرازی کی وجہ سے اسلام لے آئیں، اس زبان کی یہی خوبیاں اور امتیازی خصوصیات ہیں جنہوں نے ڈیڑھ ہزار سال سے نہ صرف ایک بول چال کی ایک کثیر الاستعمال زبان کے حیثیت سے قائم رکھا ہے، بل کہ ایک ترقی پذیر، وسیع اور دل کش ادبی وفنی زبان کے قالب میں زندہ رکھا ہے، اور اُس کو بدلنے یا کمزور کرنے کی کوششوں کے باوجود اُس کے اثر و رسوخ اور ہمہ گیری میں کوئی فرق نہیں آیا، کیوں کہ اس میں زندہ رہنے، ترقی کرنے اور زمانے کے ساتھ چلنے اور پھلنے پھولنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں، جو ایک زبان کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔

اوپر ہم نے اختصاراً عربی زبان کا تعارف پیش کیا ہے، لیکن عربی زبان سے متعلق جس پہلو کی طرف ہم آپ کے ذہن و دماغ کو منعطف کرتے جارہے ہیں وہ بہت ہی زیادہ قابل اعتنا و قابل لحاظ وتوجہ ہے، جو حضرات کسی بھی لغت اور زبان کے ساتھ کسی قدر بھی دلچسپی رکھتے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ "ان لکل لغة آدابها" کہ تمام ہی لغات وبولیاں اپنے اپنے مخصوص آداب اپنے تئیں رکھتی ہیں، اور اس کے اندر ادبیت کی یہی طاقت وجولانی، حلاوت وغدوبت، شیرینی، اور مٹھاس، جودت، عمدگی، طلاقت، سلاست، فصاحت و بلاغت تو وہ ہوتی ہے، جو کہ مخاطبین و سامعین پر اپنا ایک خاص اثر ڈالتی ہے، اور وہ اس کی سحر انگیزی سے مسحور ہو کر اس زبان کی لطافتوں، نزاکتوں، دقائق و حقائق سے پوری طرح بہرہ مند ہوتے ہیں، اور اس سے استفادہ کا جوش ولولہ اور جذبہ وداعیہ ان کے اندر انگڑائی

لیتا ہے، نتیجۃً اُس سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں، اور اسی کے دلدادہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہی وابستگی انہیں منزل مقصود کی طرف رواں دواں رکھتے ہوئے انہیں اپنے مقصد میں کامیابیوں سے ہمکنار کرتی ہیں اور فلاح و بہبود ان کے قدم بوس ہوجاتی ہے، ہر لغت اور زبان کے ادبی شہ پاروں کو خوف طوالت کی بناء پر بطور نموذج و نمونہ پیش نہیں کیا جاسکتا ہے، جہاں تک سوال ہے عربی زبان کے ادب کا تو وہ اپنی مثال آپ ہے، عربی زبان کے ادب وادبیت کے سامنے تمام ہی زبانوں کے آداب نے سر تسلیم خم کردیئے، یہ زبان ایک الہامی زبان ہے، اس پر خالق کائنات کی بے پایاں عنایتیں ہیں، دست قدرت ہی نے غیب سے اس کی ہمہ گیر دست گیری فرمائی ہے، عربی زبان علی وجہ الاتم پر از ادبیت ہے، سراسر ادب ہی ادب ہے، کما کقال: ''إن العربية هي لغة الأدب، و لا تعد لها اية لغة من اللغات مهما، کوئی زبان اس کے ادب میں اس کی مساوی و معادل و متوازی نہیں ہے، چلیے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ''ماهو الأدب'' ادب کیا شئی ہے، عربی ادب کی تاریخ کے مختلف مراحل میں ادب کی مختلف تعریفیں کی جاتی رہی ہیں، کبھی اس میں اتنی وسعت دی گئی کہ سارے علوم وفنون کو اس میں جمع کردیا گیا، اور کبھی اس کا دامن اتنا تنگ کردیا گیا تو صرف نظم ونثر کی ایک مخصوص قسم کے اندر ادب سمٹ کر رہ گیا، چناں چہ تاریخ ادب کے ابتدائی مرحلوں میں ادب سے مراد وہ علوم لیے جاتے تھے جن کے ذریعہ تہذیب نفس کا کام لیا جائے، جن کے نتیجہ میں آدمی کے اندر اچھے اخلاق، بلند کردار بے داغ سیرت اور معاملہ و برتاؤ میں صفائی اور ستھرائی پیدا ہوتی ہے ''وغاية علم الأدب الإجادة في النظم النثر، إضافة إلي تهذيب العقل، وتزكية الجنان، وتلك ولاشك فوائد عظيمة يكتسبها المشتغل بعلم الادب، فيعصم نفسه من زلة الجمل، ويروض اخلاقه، وتلين طبائعه، وينهض بالفهم ليطلب المعالي والأمور الشريفة ـ

مگر جب عربی معاشرہ میں وسعت اور عربی فکرونظر میں جلاء اور گہرائی پیدا ہونے لگی تو ادب کے مذکورہ دائرہ میں تعلیم کو بھی شامل کرلیا گیا، چنان چہ ''مؤدب'' یا ''معلم'' اس شخص کو کہا جانے لگا جو تعلیم کو بطور پیشہ اختیار کرکے اس سے اپنی روزی کماتا ہو اور ادب میں علوم دینیہ مثلاً قرآن وحدیث اور ان کی شرح وتفسیر چھوڑ کر وہ سارے علوم شامل کئے جانے لگے جو یہ ''مؤدب'' یا ''معلم'' اپنے شاگردوں کو سکھاتا تھا، خواں وہ قصے کہانیاں ہوں، شعروشاعری ہو یا تاریخی واقعات یا انساب وغیرہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ نحن بنو أب واحد و نراک تکلّم وفود العرب بما لا نفهم أكثره'' یعنی اے رسول اللہ ہم سب ہی ایک ماں باپ کی اولادیں ہیں، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ عربوں کے وفود سے ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جس کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، تو آپ نے فرمایا کہ ''أدبني ربي فاحسن تأديبي و ربيت في بني سعد'' مجھے میرے رب نے تعلیم دی ہے، اور بہترین تعلیم دی ہے، پھر میں نے قبیلہ بنوسعد میں تربیت پائی ہے (حلیمہ سعدیہ کا خاندان جو اس زمانے میں فصاحت وبلاغت میں قبائل عرب میں ممتاز تھا، یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''أدبني'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے ''ادب'' کا لفظ پہلی دفعہ عربی زبان میں آپ ہی کی زبان مبارک سے نکلا ہے، اس سے پہلے غالباً لفظ ادب استعمال نہیں ہوا، جن کے معنی بہرحال ادب تہذیب سکھانے ہی

کے ہیں، کیوں کہ خود قرآن کا فیصلہ ہے ''انک لعلی خلق عظیم '' (آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑھے اخلاق کے مالک ہیں) یہاں ''أدبنی'' سے مراد ''علمنی'' ہے یعنی مجھے تعلیم دی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صدر الاسلام ادیب میں بمعنی تعلیم لیے جاتے تھے، چناں چہ مؤدب بمعنی ''معلم'' بولا جاتا تھا اور عہد اموی میں بھی ممتاز اساتذہ کی جماعت کو ''مؤدبین'' کہا جاتا تھا، یہ لوگ اس زمانہ کے دستور کے مطابق نظم ونثر اور اخبار ووقائع کی تعلیم روایت کے طریقہ سے دیتے تھے، ادب کا مذکور بالا مفہوم صدر الاسلام اور پہلی صدی ہجری تک قائم رہا، بعد میں جب اسلامی معاشرہ میں اور وسعت پیدا ہوئی، مختلف قوموں کے اس میں داخل ہونے سے علم وفن کی ترقی کے ساتھ انہیں مختلف شاخوں میں متعین اصطلاحوں کے ساتھ تقسیم کیا جانے لگا، تو زبان سے متعلق علوم بھی علیحدہ تقسیم کئے گئے، چناں چہ نحو وصرف، بلاغت، معانی، علم بیان، بدیع وغیرہ کے فنون پیدا ہوئے اور ان فنون کو بھی ادب میں شامل کرکے گیا جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''ادب'' مجموعہ فنون ہو گیا، جن میں زبان سے متعلق علوم وفنون کے علاوہ تاریخ، سیرت، قصہ، کہانیاں، انساب۔ غرضیکہ اس زمانہ تک کے تمام علوم مروجہ وفنون کے سارے ذخیرہ کو ''ادب'' کے دائرہ میں کر دیا گیا۔ اب مشکل یہ تھی کہ اگر ادب علوم وفنون کے اس تمام مجموعہ کا نام ہے تو اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت کیا رہی ہے، اس موقع پر اس زمانہ کا مایہ ناز ادیب اور ممتاز عالم جاحظ اٹھا اور اس نے اعلان کیا ''الادب ھو الاخذ من کل فن بطرف '' تمام مروجہ فنون سے میں سے تھوڑے تھوڑے کو بقدر ضرورت استعمال کرنے کو ''ادب'' کہتے ہیں، تھوڑے کی قید لگا کر ان علوم وفنون کے فرق کو واضح کر دیا ہے، کسی بھی زبان میں جتنے علوم مروجہ وفنون ہوتے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی موضوع ہوتا ہے، مثلاً فن تاریخ ہے کہ اس کا موضوع اقوام وافراد کے واقعات کی تحقیق وجستجو اور ان کے عروج وزوال کے اسباب وعلل معلوم کرکے نتیجہ اخذ کرنا ہے، اس طرح ادب کا موضوع ''انسان'' ہے، جب ادب کا موضوع انسان ٹھہرا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ چیزیں اور علوم جو انسان سے متعلق ہوں گے وہ سب اس کے دائرہ میں آجائیں گے، انسان ایک سماجی مخلوق ہے، یہ ایک جگہ رہتا ہے، لوگوں سے تعلقات رکھتا ہے، کھاتا پیتا ہے، حکومت وجہانبانی کرتا ہے، اس کے جسم میں ایک دماغ ودل ہے، جو جذبات واحساسات اور مشاعر کے مرکز اور سرچشمہ ہیں۔

چناں چہ ادب کا انسان کے ناطے سے ان چیزوں اور ان سب علوم سے تعلق پیدا ہو گیا، اور اس طرح بالواسطہ ادب میں، تاریخ، اقتصادیات، نظم ونثر، فنون جمیلہ اور آرٹ اور فن سب ہی آگئے، ان مرقعوں سے زندگی تشکیل پاتی ہے، اس طرح دوسرے لفظوں میں ادب کا موضوع درحقیقت انسان کی زندگی ہے، اور ادیب زندگی کے ان سب مظاہر سے بحث کرتا ہے، مگر بحیثیت فن نہیں بل کہ ضمنی طور پر ایک خاص حد تک، اب سوال یہ ہے کہ وہ خاص حد کیا ہے؟ وہ خاص حد یہ ہے کہ ان علوم وفنون کو اس قدر اور انداز سے استعمال کیا جائے، جس سے پڑھنے والے یا سننے والے کے جذبات میں تغیر آجائیں، یعنی جن ذہنی یا وجدانی کیفیت میں آپ نے اس چیز کو پڑھنا، یا سننا شروع کیا ہے، اس کو ختم کرنے کے بعد وہ جذبات یا کیفیات بدل کر دوسری کیفیت اور دوسرے جذبات طاری ہو گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے، کہ اگر قاری یا سامع کے جذبات میں ہیجان یا تغیر پیدا ہو گیا تو وہ چیز ادب پارہ، بن گئی ورنہ فن رہ گئی،

اور جذبات کا یہ تغیر اور ذہنی کیفیت کا یہ انقلاب پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک بیان کرالاخری ۱۴۳۷ھ بیان، رفعت، تخیل اور دقت معانی اور جاذبیت و کشش کی ایسی کیفیت نہ ہو جو انسان کو مسحور کر دے، اور معانی میں پوری نزاکت، خیال میں رفعت، اور بیان میں ندرت و جاذبیت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی ہے جب تک اسے حسین طریقہ سے بیان کرنے کے لیے منتخب، حسین چیدہ اور خوبصورت و موثر الفاظ اختیار نہ کئے جائیں، جب معانی کو ان چیدہ اور منتخب الفاظ کے ذریعہ حسین پیرایہ بیان اور دل کش انداز کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جائے گا تو اس میں جذب کشش اور اثر اندازی کی وہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ جس کی طرف انسان کا دل خود بخود کھینچنے لگے گا، جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو اعجاز و فن کاری کی وہ حالت پیدا ہو جائے گی جو اس تحریر یا تقریر کو ادب کا شہ پارہ بنا دے گی، اسی لیے کسی تحریر کو یا تقریر کو خواہ نثر میں ہو یا نظم میں ہو، ادب پارہ ہونے کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں ایسے معانی اور مطالب کا ذکر ہو جو انسان کے جذبات و احساسات کو جگا دیں۔ دوسرے یہ کہ ان معانی و مطالب کو خوبصورت، موزوں اور منتخب الفاظ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، یہیں سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر نحو کے قواعد کو نظم کر دیا جائے تو اس سے پڑھنے والے کے جذبات یا کیفیات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ بیان انسان کی عقل یا ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوگا جو اس کے جذبات و احساسات کو نہیں بل کہ صرف عقل کو اپیل کرے گا۔ اسی طرح دوسرے فنون کا حال بھی ہے، کہ ان کو پڑھ کر یا سن کر انسانی جذبات و احساسات میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا، بل کہ صرف عقل کی آبیاری ہوتی ہے، اس لیے یہ ادب میں شامل نہیں، کیوں کہ ان میں جذبات و احساسات میں ہیجان پیدا کرنے کی شرط مفقود ہے، ہمارے کلام کا وہی حصہ ادب پارہ ہے جس میں جذبات و احساسات کو جگا دینے کی صفت ہو، اور یہ خوبصورت اور چیدہ الفاظ کے ذریعہ دلکش اور حسین پیرائیہ بیان میں ادا کیا گیا ہو۔ اسی کو "الجید من المنثور والمنظوم" یعنی نظم و نثر کا اعلیٰ مثالی نمونہ کہتے ہیں، نظم و نثر کا یہی اعلیٰ نمونہ ہے جسے ہم الادب العالی کہہ سکتے ہیں یہ نظم کی وہ قسم ہے جس کو سن کر یا پڑھکر آدمی کے احساسات و جذبات میں ارتعاش و ہیجان پیدا ہو جائے اور فرط لذت سے جھوم جائے یا شدت کرب والم سے دل گیر ہو جائے یعنی ادب عالی وہ تحریر یا تقریر ہے، جس میں اثر اندازی کی وہ شان ہو جو انسان کو اس کے موجودہ عالم سے نکال کر اس عالم میں پہنچا دیں جہاں ادیب اس کو لے جانا چاہتا ہے، جب ہم کوئی بہترین غزل یا قصیدہ یا بہترین تقریر یا موثر کہانی سنتے یا پڑھتے ہیں، تو ہمارے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور ہم اس کیفیت میں نہیں کر رہے جن میں اس کے سننے یا پڑھنے سے پہلے تھے، اس کیفیت کو ہم لذت اندوزی، طرب انگریزی، تاثر پذیری یا جھومنے سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کیفیت ہم پر بالکل اسی طرح طاری ہوتی ہے، جس طرح کے اچھے گانے کو یا موسیقی کے سحر طراز نغمہ کو سن کر یا کسی خوبصورت تصویر یا دل آویز مجسمہ کو دیکھ کر طاری ہوتی ہے، یہ کیفیت ہم پر اس لیے طاری ہوتی ہے کہ یہ فن پارے میں ہمارے احساسات، جذبات اور خیالات اور اس سے بڑھ کر ذوق جمال کی آبیاری کرتے ہیں، یا غم واندوہ کا موقعہ ہے تو آنکھوں سے مئے عشرت شبانہ بہانے لگتے ہیں، ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ادیب جب کوئی منظر یا کوئی چیز دیکھتا ہے تو اس کے اثرات کو اپنے دل و دماغ میں اتار لیتا ہے پھر ان سے اپنے تجربات کی

روشنی میں حسین الفاظ اور خوبصورت ترین پیرایہ بیان سے ایک مرقع بنا دیتا ہے، اوراس کی اثرانگیزی دوبالا کرنے کی غرض سے تخیل کی چاشنی، یا مبالغہ کی آمیزش سے کام لے کر اسے تحریر یا تقریر یا تصویر کے پیکر میں ڈھال دیتا ہے، جب ڈھلا، ڈھالا یا ترشا الفاظ کا یہ پیکر سامع یا قاری کے سامنے آتا ہے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس میں گم ہو جاتا ہے، اور اسی کو "الجید من المنظوم و المنثور" یعنی نظم اور نثر میں سب سے پسندیدہ ترین حصہ کہا جاتا ہے، جس کا نام و دوسرا نام ادب خاص و فنی ادب" یا ادب عالیہ ہے جو در حقیقت جان آدب ہے، لذت اندوزی اور اثر انگیزی کا یہی وہ بلند مقام ہے، جہاں ادب صرف جادو ہی نہیں بن جاتا "ان من البیان لسحرا" کہ خود زندگی بن جاتا ہے، یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ادب زندگی میں ڈوب کر اس کے تلخ و شیریں مزہ کو چکھ کر اس کی اتھاہ گہرائیوں سے حقیقت کے موتی نکالتا ہے، الغرض ادب شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے خیالات کا نام ہے۔ و فنون الأدب عند العرب عظیمة و عدیدة" اہل عرب کے یہاں بہت سی اشیاء ادب کے فن میں شامل ہیں، حتیٰ "أن الأدب و الخلاف فی کل عصر کانا قرینین" حتیٰ کہ ادب اور خلافت دونوں کا اتنا گہرا رابطہ و تعلق رہا ہے کہ ہر عہد اور زمانہ میں ایک دوسرے کے قرین رہے ہیں، اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا کہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ہر عہد خلافت میں، چناں چہ جس کسی بھی حکومت مملکت و سلطنت کا بھی ظہور ہوتا، اور جس کسی بھی خلیفہ کا ستارہ خلافت طلوع ہوتا تو ہمیں اس کے ہاں دربار میں ادباء و شعراء کا ایک جم غفیر نظر آتا ہے، ادباء اور شعراء کے لیے خصوصی مجالس و نشستوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ جن میں خلیفہ وقت بنفس نفیس شریک ہوتا ہے۔ اور ان کے کمالات علمیہ و ادبیہ اور علمی موشگافیوں اور دقیقہ سنجیوں کو سن کر خوش ہو کر داد و دہش بھی کیا کرتا تھا۔ اور ان کو بیش قیمت ہدایا اور تحائف سے اور خلعتوں سے مالا مال کرتا تھا۔ اسی پر بس نہیں بل کہ خلیفہ خود بھی ان فنون کثیرہ کے اندر ملکۂ راسخہ رکھتا تھا، وہ خود بھی صاحب رائے ہوا کرتا تھا، جید وردی صحیح اور سقیم کے درمیان فرق کرتا ان کے کمال علمی اور ذوق ادبی کی واضح و بین دلیل ہے، عبدالحمید الکاتب، جو خلافت بنی امیہ میں امیر الکتاب تھا جماعت ادباء کو مخاطب بنا کر کہتا ہے۔ "بکم تنتظم للخلافة محاسنها" تمہارے ہی ذریعہ امور خلافت منتظم و مرتب ہوتے ہیں۔ اور امور خلافت درست نیز محکم و مضبوط ہوتے ہیں، "و بنصائحکم یصلح اللہ للخلق سلطانهم"، اور تمہاری پند و نصائح ہی کے ذریعہ اللہ مخلوق و رعایا اور عوام کے خاطر ان کی سلطنت کو صلاحیت و صالحیت عطا فرماتا ہے، اور ان کی آبادیوں کی آبادکاریاں فرما دیتا ہے، اور تمہاری ہی ذریعہ ان کو تقویت بہم پہونچاتا ہے، "و لا تستغنی الملک عنکم"، اور حاکم وقت کبھی بھی کسی وقت تم سے بے نیاز مستغنی نہیں ہو سکتا ہے۔

ارکان ادب کیا کریں، اور کتب ادب کونسی؟

اما ارکان علم الادب، یعنی علم ادب کے وہ ارکان و دعائم جن پر مدار علم ادب ہے، وہ چار ہیں:

(۱) الأول قوی العقل العزیزیة و هی خمسة: "الذکاء و الخیال و الحافظة او محس و الذوق"، پہلا رکن

عقل کی فطری وطبعی وعزیزی قوتیں ہیں اور وہ پانچ ہیں: (۱)ذکاوت وفطانت(۲)فکرو خیال (۳)قوت حافظہ(۴)حس وشعور(۵)ذوق۔

مطلب یہ ہے کہ علم ادب میں ادبیت کی شیرنی وچاشنی اور مٹھاس اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے، جب کہ انسان اپنے اندر عقل کی ان عزیزی صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔

(۲)معرفة الأصول وهي مجموعة قوانين الكتاب، وفيهابيان طريق حسن التأليف وضروب الديشاء وفنون الخطابة: دوسرا بنیادی رکن اصول وقواعد کی معرفت ہے، اصول سے مراد ہے قوانین کتابت کا مجموعہ، یعنی علم ادب میں براعت ومہارت کے حصول کے لیے مضمون نگاری اور انشاء پردازی کے مقررہ اصول کا جاننا بھی ضروری ہے، قوانین کتابت میں حسن تالیف وتصنیف کے طریقوں انشاء کی اقسام، اور خطابت کے فنون وغیرہ کو بھی بیان کیا جاتا ہے، تاکہ ان اصول وضوابط کے حدود میں رہ کر ادیب بننے والا آدمی اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر اپنے آپ کو مثالی ادباء میں شامل کروائے۔

الثالث: مطالعة تصانيف البلغاء بالتاني والتبصر فيها ليدخر الكاتب كل لفظ من شريف، وكل معنى بديع بحيث يتصرف بهمامنه الفريدة۔

تیسرا بنیادی اساسی ومرکزی رکن ہے، بلغاء وفصحاء کی تصانیف کا دقت نظر اور گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا جائے، تاکہ کاتب اور امراء کے پاس عمدہ عمدہ اور حسین وچیدہ الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہو، اور نرالے اور انوکھے اور دل کو موہ لینے والے معانی کا بھی ایک وافر اور معتدبہ مقدار میں سرمایہ جمع ہوجائے، تاکہ وہ بوقت ضرورت ان میں رد وبدل کر کے ان کو موقع ومحل کے لحاظ سے استعمال کرے۔

الرابع: الإرتباض –وهو التدريب– بوجوه الإنشاء۔

چوتھا بنیادی رکن علم ادب کا تدریب وتمرین ہے کہ تمام ہی اقسام انشاء کو بکثرت بروئے کار لاکر خوب خوب مشق کی جائے، یہی مزاولت اور ممارست انسان ادیب کے لیے اہم رول اور کردار ادا کرتی ہے، اس کی ادیبانہ شخصیت سازی میں، اور اس کے ذوق وجدان کو جلاء عطا کرتی ہے۔

أشهر كتب الأدب (عربی ادب کی مشہور ترین کتابیں):

(۱) ادب الكاتب لابن قتيبة   (۲) كتاب الكامل للمبرد

(۳) البيان والتبيين للجاحظ   (۴) وكتاب النوادر لأبي علي الغالي

(۵) القرأة الواضحة (علامہ کیرانوی)   (۶) الأمالي لأبي علي الأندلسي

(۶) ادب الكتاب (الصولي)   (۷) صبح الأعشى في صناعة الانشاء لابي العباس القلقشندي

(۵) ادب الكاتب (ابن قتيبه)   (۸) نهاية الارب في فنون العرب لشهاب الدين النويري

(۲۴)جواہر الادب(۲-۱)(الہاشمی) (۹)زہر الآداب وثمر الالباب لابراہیم القیروانی

(۲۳)دیوان ذی الرّمّة(مجید طراد) (۱۰)کتاب الاغانی لابی الفرج علی بن حسین

(۲۲)دیوان ابن الرومی (۳-۲-۱) (۱۱)سلسلة کامل الکیلانی للأطفال (کامل کیلانی)

(۲۰)مقامات حریری (علامہ حریری)(۱۲)سلسلة محمد عطیه الابراشی (محمد عطیه)

(۱۳)سلسلة جودة السحار (جودة السحار)

(۱۴)سلسلة عبد العزیز الرفاعی (عبد العزیز الرفاعی)

(۱۵)القرأة الرشیدة (عبد الفتاح صبری وعلی عمر)

(۱۶)القرأة الراشدة (مولانا علی میاں ندوی)

(۱۷)العقد الفرید لابی عمر احمد محمد الأندلسی

(۱۸)مفتاح العربیة (مولانا نور عالم خلیل امینی)

(۱۹)مختارات من الأدب العربی (مولانا علی میاں ندوی)

(۲۱)مقامات بدیع الزمان (بدیع الزمان ہمدانی)

اردو ادب کے مصادر و مراجع:

انشاء ماجدی	(مولانا عبدالماجد دریا آبادی)
غبار خاطر	(مولانا ابوالکلام آزاد)
نقوش سلیمانی	(سید سلیمان ندوی)
مقالات سلیمانی (۱ تا ۳)	(سید سلیمان ندوی)
گلِ رعنا	(سید عبدالحی حسنی)
مضامین عبدالماجد	(مولانا عبدالماجد دریا آبادی)
مضامین آزاد	(مولانا ابوالکلام آزاد)
الفاروق	(علامہ شبلی نعمانی)

زبان وادب اور اردو
منظر وپس منظر

مولانا افتخار احمد قاسمی بستی پوری

[illegible] حدیث وتفسیر، جامعہ اکل کوا

انسان اپنی ظاہری شکل وساخت اور باطنی کیفیات وصفات کے اعتبار سے کائنات کے تمام جانداروں پر فضیلت وفوقیت کا ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔اس کے اس تفوق و برتری کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اس کی زبان اور اس کا ادب ہے۔مشہور ہے کہ انسان ''حیوان ناطق'' ہے۔یعنی وہ اپنی زبان سے بامعنی الفاظ وکلمات کو مناسب صوت وآہنگ کا دلکش رنگ دیتا ہے اور اپنے مافی الضمیر کو معقول تعبیر کا حسین جامہ پہناتا ہے۔

یہ انسان ہی کے امتیازات میں سے ہے کہ وہ نہ صرف زبان وادب کو اپنے ذہن وفکر کی ترسیل وابلاغ کا ذریعہ بناتا ہے،بل کہ اس سے اپنے فکر وخیال کی نشوونما اور اس کی تخلیق وترقی کا بھی کام لیتا ہے۔قسم قسم کے سوالات، بھانت بھانت کی عقلی گتھیوں کا حل،نوع بہ نوع کی علمی موشگافیوں کی سلیقہ مندی اور طرح طرح کے دلائل کی کرشمہ سازی؛سب انسانی زبان وادب ہی کی مرہونِ منت ہے۔انسان اگر اپنے اقدار کے شعور اور تہذیب وتمدن کے قیام میں دیگر حیوانات سے ممتاز ہے تو یقیناً ان سب کا انحصار زبان وادب ہی کی صلاحیت پر موقوف ہے۔انسان کی یہی وہ فطری سلیقہ ہے جو روزِ اول سے کی جانے والی اس کی دماغی کاوشوں،علمی تخلیقات،مادی ایجادات اور ان سب کی تاریخ کا محض ریکارڈ ہی نہیں رکھتا؛بل کہ انہیں ہر زمانہ کے ہر فرد کے لیے قابلِ فہم، قابلِ عمل، قابلِ قدر اور قابلِ اعتبار بناتا ہے۔

تاریخ انسانی میں جتنے بھی انقلاب آئے،خواہ وہ انفرادی انقلاب ہو یا اجتماعی،خانگی انقلاب ہو یا معاشرتی، مذہبی انقلاب ہو یا سیاسی؛ان ساری تحریکات کا خمیر زبان وادب ہی کی خاک سے اٹھا تھا۔چناں چہ تاریخ شاہد ہے کہ تمام پیغمبروں،مصلحوں،سیاسی لیڈروں اور انقلابیوں نے ہمیشہ زبان وادب کے سہارے اپنی تحریک کو آگے بڑھایا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔یہی وجہ ہے کہ مذہب وانقلاب پر مشتمل آج تک جتنی بھی معتبر کتابیں پائی جاتی ہیں، وہ زبان وادب کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔

فرد یا قوم کی زندگی میں اصلاح وانقلاب اور اس کی روحانیت کے احیا وبقا کے لیے زبان وادب اتنا ہی ناگزیر ہے،جتنا کہ مادی زندگی کے لیے آب ودانہ۔یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم میں دعوت واصلاح کا مشن سونپا گیا تو انہوں نے رب پاک سے دعا فرمائی:

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي • (طٰہٰ:۲۵-۲۸)

اے رب!میرے سینہ کو کھول دے اور میرے کام کو آسان بنادے اور میری زبان کی گرہ کھول دے
تاکہ لوگ میری بات کو سمجھیں۔

اور اپنی لسانی معذوری کے سبب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے فصیح اللسان بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو دعوت واصلاح کے انبیائی کام میں مددگار اور شریک کار بنانے کی اللہ کے حضور درخواست کی،جو قبول ہوئی؛فرمایا:

وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا • (القصص: ۳۴)

اور میرا بھائی ہارونؑ، اس کی زبان مجھ سے زیادہ وہ فصیح ہے؛ سو آپ اسے میرے ساتھ مدد کو بھیجئے۔

آج پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کا سہارا لے کر ادب اور ثقافت کے نام پر انسان نما شیطانوں کی طرف سے جس قدر اخلاق سوز بے ادبی اور بے حیائی کی تبلیغ واشاعت کی جارہی ہے، وہ ہر کس وناکس پر عیاں ہو چکی ہے۔ لہٰذا اصلاح وانقلاب کے داعیوں کو زبان وادب کی تاثیر اور اس کی قدر وقیمت کو اچھی طرح سمجھ کر اس میں مہارت پیدا کرنے اور اس سے ہر ممکن کام لے کر دم توڑتی ہوئی انسانیت کو بچانے اور صالح انقلاب کے لیے ہر طرف فضا سازگار بنانے کی حتی المقدور جد وجہد اشد ضروری ہے۔

زبان وادب کی حقیقت اور اس کی تسخیری قوت:

زبان افکار وخیالات کی تفہیم وافہام اور مافی الضمیر کے اظہار وابلاغ کا ایک بلا واسطہ انسانی ذریعہ ہے۔ اور ادب لغت میں خوش طبعی، تہذیب وشائستگی کا معنی رکھتا ہے اور اصطلاح میں زبان کا وہ علم ہے، جو انسان کو بول چال اور تحریر کی غلطیوں سے محفوظ رکھتا ہے اور کسی قوم کے اجتماعی احساسات، جذبات اس کی زندگی اور جد وجہد کی داخلی تاریخ کا پتہ دیتا ہے۔ مگر ادبا کے یہاں ادب کی امتیازی علامت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی عظمت، الفاظ کی خوب صورت بندش، جملوں کی عمدہ ترکیب اور اسلوبِ نگارش میں جمالیاتی اظہار کا ایسا وافر سامان پایا جاتا ہو، جو قاری کو محض مسرت وبصیرت ہی فراہم نہ کرتا ہو؛ بل کہ اسے اپنے فسوں کے جال میں لے کر اس پر اثر پذیری کی گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہو۔ بالفاظ دیگر ادب معیارِ حسن پر الفاظ وتعبیرات کا وہ استعمال ہے جو انسانی عقل، تخیل، وجدان اور محسوسات کو اس طرح برانگیختہ کرتا ہے یا انہیں آپس میں ایسا مربوط کر دیتا ہے، جس سے قاری پر عین تقاضے کے مطابق ایک خاص قسم کا مسرت انگیز اثر مرتب ہو جاتا ہے۔

فن ادب کا ماہر فن کار اپنی تخلیق میں خونِ جگر کی آمیزش سے ایسا رنگ بھر دیتا ہے اور سادہ ومعمولی باتوں میں تاثیر کا ایسا جادو جگا دیتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والا اس کی ندرت وبداعت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چوں کہ ادب کا خمیر فکری قوت اور جمالیاتی لطافت سے تشکیل پاتا ہے، لہٰذا یہ دیگر فنون کے مقابلے میں دوہری قوتِ تسخیر کا حامل ہے۔ اور ادب کی یہی تسخیری قوت ہے کہ بعض اوقات کسی فکر کو ادبی پیرایۂ بیان میں اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس کا مخالف بھی غیر شعوری طور پر اس فکر کا بتدریج قائل اور گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اول دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے صوفیائے کرام ادب کی اس تسخیری قوت سے اچھی طرح واقف تھے، لہٰذا انہوں نے ہندوستان کی مقامی زبان ریختہ اردو نیز یہاں دیگر بولی جانے والی زبانوں کے ادبی اسلوب اپنا کر اپنی دعوتِ حق کو نظم ونثر کے پیرایہ میں اس طرح پیش کیا کہ یہاں کے باشندوں کے قلوب قبولِ حق پر یک لخت آمادہ ہو گئے۔ اور آج کی باطل طاقتیں بھی زبان وادب کی اس قوتِ تاثیر سے بھرپور کام لے رہی ہیں، چناں چہ

ادب اور لٹریچر (Literature) کے نام پر اپنے باطل افکار کے لیے مختلف قسم الاخری تحریکات کے ذریعے نوخیز نسل کے جدید ذہنوں کو مسخر اور ماؤف کیا جارہا ہے۔اور غیر محسوس طور پر ان کے دماغوں میں فکری الحاد اور نظری ارتداد کا زہر گھولا جارہا ہے۔

زبان وادب کے حوالے سے "لفظ" اور "تعبیر" کی طاقت ہر دور میں اپنا جادوئی اثر دکھاتی رہی ہے۔کبھی لفظ اور تعبیر سے پھول اور شبنم کا کام لیا گیا تو کبھی زنجیر اور شمشیر کا۔اس سے کبھی کاری زخم لگایا گیا تو کبھی رِستے زخموں پر مرہم اور پھاہا رکھا گیا۔لفظ سے نبیوں اور ولیوں نے بھی کام لیا اور وقت کے ابلیسوں نے بھی۔معروف محقق اور نقاد پروفیسر احمد سجاد کیا خوب کہتے ہیں کہ: "یہی الفاظ کبھی کرشن جی کی بانسری میں گیت بن کر ڈھلے ہیں، تو کبھی مہاتما بدھ کے لبوں پر شانتی کا اُپدیش بنے ہیں، یہ کبھی حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے پہاڑی وعظ میں ڈھلے ہیں تو کبھی سینٹ فرانسیس، نانک اور چشتی کی اثر آفریں دعاؤں میں ابھرے ہیں اور یہی الفاظ مسخ ہو کر مسولینی، اسٹالن اور ہٹلر کی زبانوں سے موت، نفرت، ظلم و ستم کے زہر اُگلنے والے سانپ بھی بنے ہیں۔کسی شاعر نے سچ کہا ہے کہ ؎

لفظ ہی پھول بھی ہے ، لفظ ہی زنجیر بھی ہے
لفظ ہی زخم بھی ہے ، لفظ ہی شمشیر بھی ہے
لفظ ہی خواب بھی ہے ، خواب کی تعبیر بھی ہے
لفظ میں نور سمو دیں تو ستارہ بن جائے
دل جو رکھ دیں تو لب ناز کا بوسہ بن جائے
اور بارود جو بھر دیں تو دھماکہ بن جائے
لفظ کو پھر بھی نہ مجرم نہ خطا کار کہو
لفظ سے کھیلنے والوں کو گنہگار کہو

تعمیری ادب اور تخریبی ادب:

زبان وادب الفاظ و تعبیرات کے استعمال کا ایک دوطرفہ کھیل ہے۔جس میں زندگی سے متعلق دو تعبیروں میں سے کسی ایک کا مثبت یا منفی مظاہرہ ہوتا ہے۔ایک تعبیر روحانی ہے اور دوسری مادی۔

مادی تعبیر کے لحاظ سے ادب الفاظ و تعبیرات کی ایک ٹریجڈی (Tragedy) ہے، جو "ادبی فیشن" کے مترادف اور بے ادبی کا شاخسانہ ہے۔یہی ادب تخریبی ادب کا مصداق ہے۔جس میں ادیب کا دامن ذاتی فاسد افکار اور بے ہودہ فلسفہ طرازی سے الجھا رہتا ہے اور ادب کی زمین پر بے بصیرتی و بے ضمیری کا ایسا سیلاب امڈ آتا ہے جو تمام اعلیٰ اخلاقی قدروں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔اور پھر ادب کی معنویت تحلیل ہو کر بے مقصدیت و بے سمتی تک اور اس کی روح مسخ ہو کر بے ہودگی و خرافات گوئی تک پہونچ جاتی ہے۔

ایسے ہی مادہ پرستانہ ادب کی بے معنویت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ایک بڑا دانش ور اور فن کار ”ٹی، ایس ایلیٹ“ کہتا ہے کہ ہوش مندی کے انقطاع کا ایسا سلسلہ شروع ہوگیا، جس کی ہم کبھی اصلاح نہ کرسکے۔ اور ”روژموں“ کا مشہور قول ہے کہ وحشت و بربریت کامیاب ہوگئی ہے اور ہماری فطرت کے درندہ صفت عناصر نے اپنا نقطۂ نظر ہم سے منوالیا ہے۔ اور ایسے ہی لایعنی و مادی تعبیر کے دلدادہ یاوہ گو ادیبوں پر صدیوں پہلے قرآن کی نازل شدہ یہ آیت چسپاں ہوتی ہے، جس میں وعید ہی وعید اور تنبیہ ہی تنبیہ ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ
وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (لقمن:۶)

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بے ہودہ بات خرید لاتے ہیں تا کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بغیر علم کے اور اسے مذاق بنالیں؛ یہی ہیں جن کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔

مادی ادب یا تخریبی ادب دراصل الفاظ کے توڑ پھوڑ کی ”ادبی دہشت گردی“ ہے، جس میں خود غرضی و خود پرستی، نمائش و خود نمائی، منافقت و دورخی، مرعوبیت و مصلحت پسندی جیسی لعنتوں کا جال پھیلا ہوتا ہے۔ اور ادیب اخلاص و اخلاق، وسعت ظرفی و وسیع النظری، راست بازی، انکساری، ایمانداری اور دیانت داری جیسی اعلیٰ اقدار سے یکسر محروم نظر آتا ہے۔

زندگی کی دوسری تعبیر روحانی تعبیر ہے، جو مادی تعبیر کے برعکس اخلاقی بلندی اور روحانی عروج کا عکاس ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ادیب جو ادیب بعد میں اور انسان پہلے ہے، وہ انسانیت کے ناطے اپنے صالح جذبات اور جمالیاتی عناصر سے معمور ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ الفاظ و تعبیرات کو جذباتی حسن، اخلاقی صداقت اور شعور و آگہی کے خیر کا مظہر بنا کر ادب کے توسط سے انسانی ہمدردی کے آفاق کو وسیع سے وسیع تر کرتا ہے اور اپنے بابصیرت مخلوق ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایسے ہی صاحب بصیرت ادیب کا پیش کردہ ادب تعمیری ادب، اخلاقی ادب یا صالح ادب کہلاتا ہے؛ جو آفاقی اور مثبت قدروں کا امین ہوتا ہے اور جس کی اساس اس راست تصور پر قائم ہوتی ہے کہ حیات و کائنات کا یہ پورا کارخانہ کسی قادر مطلق خالق کی انتہائی منظم اور ٹھوس اسکیم کے تحت معرض وجود میں آیا ہے اور ہمیں اپنی تعمیری کدو کاوش یا تخریبی کارناموں کے لیے اس کے آگے ایک دن جواب دہ ہونا پڑے گا۔ مشہور مغربی دانشور ”اربن“ (Urban) اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ”زبان اور حقیقت“ (Language and Reality) میں اس نتیجہ تک پہونچتا ہے کہ تمام کائنات میں انسان کی وجہ امتیاز یہ ہے کہ وہ اقدار کا نہ صرف شعور رکھتا ہے، بل کہ انہیں قائم و دائم رکھنے کا بھی اسے بھرپور سلیقہ ہے۔

تعمیری ادب درحقیقت اسلامی ادب ہے، جس میں اسلامی تعلیمات سے عطر کشید کرکے فکر و خیال کو معطر کیا جاتا ہے اور احساس و شعور پر بصیرت کے دریچے وا کرکے انسانیت کو حیات تازہ اور آفاقیت سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔ چوں کہ تعمیری ادب کی غایت و مقصدیت صحیح اور صالح اقدار کی افزائش ہوتی ہے، لہٰذا ادیب کی فکر و نظر کا پیمانہ ذہنی

ارتفاع، روحانی عظمت اور باطنی بصیرت سے لبریز ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ کم ظرفی کے جراثیم سے محفوظ رہ کر روحانی پاکیزگی، فکری بالیدگی، انسانی بھلائی وترقی، ایثار و بہی خواہی کا آئیڈیل اور محبت واخوت، آزادی وامن وآشتی کا پیامبر ہو۔ اور اس کا ادب معنویت کی نئی تہوں کو کھولنے والا، نیا حوصلہ وولولہ عطا کرنے والا، ایمان ویقین سے سرفراز کرنے والا، جذبات کی تطہیر، اقدار کی تشکیل اور اعلی اخلاق کے فروغ کا باعث بن کر مایوسی میں امید کی کرن ثابت ہو۔

اردو زبان اور اس کا تدریجی ارتقا:

"اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ قدرت کا تخلیقی کرشمہ ہے کہ مختلف اضداد واجناس کے ملاپ سے کسی نئی شئی کا وجود ہوتا ہے، اسی طرح اردو مختلف زبانوں اور بولیوں سے مل کر وجود میں آنے والی ایک نئی زبان ہے؛ گویا یہ مختلف زبانوں اور بولیوں کا لشکر ہے۔ یا چوں کہ اس کی آفرینش وافزائش لشکر کے درمیان ہوئی ہے، اس لیے یہ زبان "اردو" بمعنی لشکر کے نام سے جانی جاتی ہے۔

کائنات میں جیسے جیسے حیات کا ارتقا ہوتا رہا، ویسے ویسے انسانی ارتقا کی تاریخ بنتی رہی۔ زبان کا ارتقا بھی ایک تہذیب کی تاریخ کا زریں باب ہے۔ انسانی تہذیب میں اس کی بولتی ہوئی زبان حیوان کی گنگ زبان سے اس کو امتیاز دیتی ہے اور اس کے شعور کی واضح علامت ہوتی ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے دکھ درد، خوشی وغم، خیال، احساس، جذبہ اور فکر وتجربہ کا اظہار چاہتا ہے، جس سے اس کی زندگی میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے ہیں اور اسے زندگی کے بامقصد و بامعنی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت اور اس کا یہ احساس زبان کا مرہونِ احسان ہے۔ انسانی معاشرت شروع ہو کر جیسے جیسے ترقی کی راہیں طے کرتی جاتی ہے، ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی انسانی تہذیب کا مستقل ادارہ بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

"انسانی شعور اسے نکھارتا ہے، خیالات وفکر کا نظام اسے روشنی دیتا ہے، زندگی کے مختلف عوامل اور تجربے اسے بناتے سنوارتے ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی، اعلی اور ادنی چیز یا تصور، تجربہ یا احساس، زبان کا لباس پہن کر "فہم" کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان نہ کوئی فرد ایجاد کر سکتا ہے اور نہ اسے فنا کیا جاسکتا ہے۔ مختلف تہذیبی عوامل، رنگا رنگ قدرتی عناصر، مسلسل میل جول اور رسوم معاشرت گھل مل کر رفتہ رفتہ صدیوں میں جا کر کسی زبان کے خدوخال اجاگر کرتے ہیں۔ اسی لیے دنیا کی ہر زبان میں لسانی عمل اور ادب کی تخلیق کے درمیان وقت کا ایک طویل فاصلہ ہوتا ہے۔ بولی صدیوں میں جا کر زبان بنتی، اپنی شکل بناتی اور خدوخال اُجاگر کرتی ہے۔ لسانی ارتقا کی تاریخ جب ایک ایسی منزل پر پہونچ جاتی ہے جہاں محسوس کرنے والا انسان، سوچنے والا ذہن اور اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہونچانے والے افراد اس زبان میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کی سہولت پاتے ہیں تو ادب کی تخلیق اپنا سر نکالتی ہے۔

اردو زبان وادب کے ساتھ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح یہی عمل ہوا۔ صدیوں یہ زبان سر جھاڑ منہ پھاڑ گلی کوچوں میں آوارہ اور بازار ہاٹ میں پریشاں حال ماری ماری پھرتی رہی۔ کبھی اقتدار کی قوت نے اسے دبایا، کبھی

اہلِ نظر نے حقیر جان کر اسے منہ نے لگایا اور کبھی تہذیبی دھاروں نے اسے مغلوب الآخریا؛ یہ عوام الناس کی زبان تھی، عوام کے پاس رہی۔ مسلمان جب برِّ عظیم پاک و ہند میں داخل ہوئے تو عربی، فارسی اور ترکی بولتے آئے اور جب ان کا اقتدار قائم ہوا تو فارسی سرکاری زبان ٹھہری۔ تاریخ شاہد ہے کہ حاکم قومیں اپنی زبان اور اپنا کلچر ساتھ لاتی ہیں اور محکوم قومیں، جن کی تہذیبی و تخلیقی قوتیں مردہ ہو جاتی ہیں؛ اس زبان اور کلچر سے اپنی زندگی میں نئے معنی پیدا کر کے نئے شعور اور احساس کو جنم دیتی ہیں۔

مسلمانوں کا کلچر ایک فاتح قوم کا کلچر تھا، جس میں زندگی کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی پوری قوت اور لچک موجود تھی۔ اس کلچر نے جب ہندوستان کے کلچر کو نئے انداز سکھائے اور یہاں کی بولیوں پر اثر ڈالا تو ان بولیوں میں سے ایک نے، جو پہلے سے اپنے اندر جذب و قبول کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھی اور مختلف بولیوں کے مزاج کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی؛ بڑھ کر اس نئے کلچر کو سینے سے لگایا اور تیزی سے ایک مشترک بولی بن کر نمایاں ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بولی نے اس کلچر کے ذخیرۂ الفاظ کو اپنا لیا اور اس کے طرزِ احساس اور نظامِ خیال سے ایک نیا رنگ روپ حاصل کر لیا اور اس طرح وقت کے تہذیبی، معاشرتی و لسانی تقاضوں کے سہارے مسلمانوں اور برِ عظیم کے باشندوں کے درمیان مشترک اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بن گئی ---------- زبان کا بیج جاندار تھا، زمین زرخیز تھی؛ نئے کلچر کی کھاد نے ایسا اثر کیا کہ تیزی سے کونپلیں پھوٹنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک تناور درخت بن گیا"۔

اردو زبان کی نشوونما، ایک تاریخی جائزہ:

اردو زبان کی نشوونما ایک طویل تاریخ رکھتی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ اوراق میں بتایا گیا کہ اس زبان کا رشتہ مسلمانوں کے کلچر سے جڑا ہوا ہے۔ چناں چہ مسلمان جہاں جہاں گئے، یہ زبان وہاں وہاں پہونچی اور علاقائی اثرات کو جذب کر کے اپنی شکل بناتی گئی۔ اس میں نئے نئے الفاظ اور نئے نئے خیالات سماتے گئے اور اس کے خدوخال کو نکھار اور احساس و شعور کو سلیقہ ملتا گیا۔ گویا یہ زبان مختلف تدریجی مراحل سے گذر کر نشوونما پائی اور لسانی و تہذیبی امتزاج کے فطری عمل سے پروان چڑھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کی نشوونما کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس کا ایک ہیولیٰ سندھ و ملتان میں تیار ہوا، پھر یہ لسانی عمل سرحد و پنجاب میں ہوا؛ جہاں سے تقریباً دو صدی بعد یہ دہلی پہونچا اور وہاں کی زبانوں کو جذب کر کے اور ان میں جذب ہو کر سارے برِّ عظیم میں پھیل گیا۔ گجرات میں یہ زبان "گجری" کہلائی، دکن میں اسے "دکنی" کے نام سے پکارا گیا۔ کسی نے اسے "زبانِ ہندوستاں" کہا کہ یہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ کسی نے اسے "ہندی" یا "ہندوی" کہا۔ کسی نے اسے "لاہوری" یا "دہلوی" کے نام سے موسوم کیا۔ اسی حساب سے کسی نے اس کا رشتہ ناتا برج بھاشا سے جوڑا، کسی نے اسے کھڑی بولی سے ملایا۔ کسی نے اسے "زبانِ پنجاب" کہا، کسی نے سندھی سرائیکی کے علاقے کو اس کا مولد بتایا ——— مختلف زبانوں سے اس کا یہ تعلق اور مختلف زبانوں کے علاقوں کا اس زبان پر دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے سب سے فیض اٹھا کر اپنے وجود کو

انفرادیت بخشی ہے۔ اسی لیے یہ زبان برِّعظیم کی سب زبانوں کی زبان ہے"۔

اردو زبان کی تاریخی کہانی یہ ہے کہ ہندوستان میں آریہ قوم تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح سے آنا شروع ہوئی اور ۱۰۰۰ قبل مسیح تک شمالی ہندوستان میں پنجاب سے بنگال تک پھیل گئی۔ ہندوستان میں پہلے سے مختلف علاقوں میں مختلف مقامی بولیاں رائج تھیں۔ آریہ قوم جب تک محدود علاقے میں رہی، ان کی زبان اپنی جگہ قائم رہی؛ مگر جیسے جیسے وہ پھیلنے لگی، ان کی زبان میں فرق آتا گیا اور دوسری زبانوں کے میل جول سے تلفظ و الفاظ میں رد و بدل ہوتا گیا؛ یہاں تک کہ ان کی زبان کی مرکزی حیثیت بہت حد تک ختم ہوگئی۔ پھر ۵۰۰ قبل مسیح میں مختلف زبان سے ہر جگہ استعمال کیے جانے والے الفاظ کا انتخاب کرکے ایک منظم زبان کی تشکیل کی گئی، جو بعد میں بن سنور کر نکھر کر "سنسکرت زبان" کہلائی۔ شروع میں یہ زبان ترقی کی اور اس کو بڑا عروج حاصل ہوا، مگر رفتہ رفتہ اس میں اتنی زیادہ ادبیت آتی گئی کہ یہ عوام سے جدا ہوکر خواص کی زبان بن کر رہ گئی۔

ہندوستانی عوام کی زبان شروع ہی سے ایک مخلوط زبان تھی۔ اگرچہ مختلف خطوں میں مختلف مقامی بولیاں بولی جاتی تھیں، تاہم ان میں بہت معمولی فرق ہوتا تھا۔ ان زبانوں اور بولیوں کو "پراکرت" کہا جاتا تھا اور اس پراکرت کی ادبی شکل کا نام "پالی" تھا، جسے بدھ مذہب کے ہاتھوں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ مگر اس میں بھی سنسکرت کی طرح رفتہ رفتہ ادبی پہلو غالب آتا گیا اور عوام اس کے استعمال سے بھی گریز کرنے لگی۔ اور پھر عوامی ضرورت و صلاحیت کے تحت ملی جلی زبان کو ایک خاص رنگ دے کر ایک نئی اور آسان زبان کا استعمال شروع ہوا، جسے اہلِ زبان و ادب نے حقارت سے "اپ بھرنش" کا نام رکھ دیا؛ جس کے معنی بگڑی زبان کے ہیں۔ مگر چوں کہ اس زبان میں انسانی زندگی اور تہذیب و تمدن کے آثار پائے جاتے تھے، لہٰذا دھیرے دھیرے مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف مائل ہونا شروع ہوا اور راجپوتوں کے سیاسی زمانۂ اقتدار میں یہ زبان اس قدر ترقی کر گئی کہ ۸۰۰ء سے لے کر ۱۰۰۰ء تک تمام شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی ——— اور آج کی موجودہ اردو زبان اسی "اپ بھرنش" زبان کی کوکھ سے جنم لی ہے۔

۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ و ملتان کو فتح کیا، اس وقت وہاں کئی زبانوں سے ملی جلی ایک کھچڑی زبان بولی جاتی تھی۔ محمد بن قاسم کے لشکر میں عربی و فارسی زبان بولنے والے لوگ شامل تھے، لہٰذا وہاں عربی و فارسی کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ محمد بن قاسم کے حملے کے تقریباً تین سو سال بعد ۱۰۰۱ء میں ہندوستان پر محمود غزنوی کا حملہ ہوا اور اس سے تقریباً پانچ سو سال بعد بابر کا حملہ ہوا۔ اور اس طرح ہندوستانی تہذیب میں اسلامی تہذیب کی شمولیت ہونے لگی اور مختلف تہذیبوں کے ملاپ سے ہندوستانی زبان کے ساتھ بیرونی زبان کے الفاظ کی رد و بدل ہونا شروع ہوئی۔ عربی و فارسی کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں اور ہندوستانی زبانوں کے الفاظ عربی و فارسی زبان میں بڑی تیزی سے شامل ہونے لگے۔ اور چوں کہ مشترک کلچر کے لیے رابطے کی ایک مشترک زبان بنیادی شرط ہوتی ہے اور اردو زبان میں اس کی پوری صلاحیت موجود تھی، لہٰذا جب اس کا وجود ہوا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا اور اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے؛ جس سے اس نئی زبان کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

"اور جب اس پر "عربی ایرانی" تہذیب اور زبانوں نے اپنا سایہ ڈالا خصوصاً ۱۲۳۰ھ سے ۱۲۴۳ھ اور تلفظ اس میں شامل ہوئے، نئی آوازوں نے اس زبان کے سوتے ہوئے تاروں کو چھیڑا تو اس کے اندر ایک ایسا عمل امتزاج شروع ہوا جس نے اس میں سڈول پن پیدا کر کے نرمی، شائستگی اور قوتِ اظہار کو بڑھا دیا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان نئے لفظوں کی مدد سے اپنا رنگ روپ اور چولا بدلنے لگی۔ بے ڈول، اَن گھڑ، ثقیل اور قدیم آوازوں والے الفاظ خود بخود خارج ہوتے گئے اور نئی تہذیبی و معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے والے الفاظ داخل ہوتے گئے"۔

۱۲۹۷ء میں علاؤالدین خلجی نے گجرات فتح کیا، جو تقریباً سو سال تک دہلی کی سلطنت میں شامل رہا۔ اس کے بعد ۱۳۱۰ء میں دکن اور مالوہ پر فوج کشی کرا کر انہیں بھی فتح کر لیا اور پھر ان مفتوحہ علاقوں کے انتظام و انصرام کو بہتر و مؤثر بنانے کے لیے گجرات سے لے کر دکن تک مختلف انتظامی حلقے بنا دیے اور ہر حلقہ پر ایک ترک افسر مقرر کر دیا، جس کے نتیجے میں بے شمار ترک خاندان اپنے متوسلین کے ساتھ گجرات، دکن اور مالوہ کے طول و عرض میں آباد ہو گئے؛ جنہوں نے معاملاتِ زندگی طے کرتے ہوئے سیاسی و معاشرتی تقاضوں کے تحت اپنے ساتھ لائی ہوئی زبان میں ان علاقوں کی مقامی زبانوں اور عربی، فارسی و ترکی کے الفاظ شامل کر کے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنا شروع کیا اور اس طرح نئے ماحول میں اس زبان کو قابلِ قبول بنا دیا۔

اردو زبان عوام کی آغوش میں آنکھیں کھولیں، عوام کے ہاتھوں پروان چڑھی اور ہندوستان کی مختلف مروجہ زبانوں کو سمیٹ کر اپنے لیے ایک نیا خاکہ تیار کرتی رہی اور اپنی خصوصیت و انفرادیت کی وجہ سے برابر ترقی کی طرف بڑھتی رہی؛ یہاں تک کہ جب بابر ہندوستان آیا تو یہ اپنی ایک خاص امتیازی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اسی طرح یہ اپنے امتیاز و انفرادیت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی اور شاہ جہاں کے دورِ اقتدار میں اس کا عروج اتنا ہوا اور اس کا زور اتنا بڑھا کہ شاہ جہاں کی نسبت سے اس کی ایک پہچان بن گئی اور اسے "شاہ جہانی اردو" کہا جانے لگا۔ اور سب سے زیادہ اورنگ زیب کے زمانے میں اس زبان کو اس کے شایانِ شان اہمیت دی گئی اور اسے شاہی دربار میں ایک مقام حاصل ہوا، جس کی وجہ سے اس کو "اردوئے شاہی" کے نام سے بھی یاد کیا جانے لگا۔

ہندوستان کی سرزمین پر مسلم بادشاہوں کی آمد اور مسلم اقوام کے پھیلاؤ سے یہاں زندگی کی گہما گہمی اور تہذیب کی ہماہمی کا آغاز ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی تشکیل و ترویج کا لسانی عمل شروع ہوتا ہے، جس کی ابتدا سندھ و ملتان سے ہوتی ہے اور پھر یہ پھیل کر سرحد، پنجاب، دہلی اور دکن تک پہونچ جاتا ہے۔ اور قطب الدین ایبک سے ابراہیم لودھی کے زمانے تک اس کے اثرات اتنے واضح ہو جاتے ہیں کہ یہ زبان ایک نئے سانچے میں ڈھل کر اپنا ایک مستقل رنگ روپ دھار لیتی ہے اور ایک مشترک بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ اردو زبان و ادب کے تاریخ نویس شمس اللہ قادری کہتے ہیں:

"سلطان محمد تغلق کے زمانے میں یہ جدید زبان عام طور پر بولی جاتی تھی اور وہ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے یا جنہوں نے عرصۂ دراز سے یہاں بود و باش اختیار کر لی تھی، اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے"۔

گیارھویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک ہماری اردو زبان مسلمانوں کے ساتھ ساتھ برِّعظیم کے دور دراز گوشوں تک پہونچ کر سارے علاقوں کے لیے ایک واحد مشترک بین الاقوامی زبان بن چکی تھی۔

حافظ محمود شیرانی فرماتے ہیں:

"مسلمان اقوام نے ہندوستان میں اپنے لیے ایک زبان مخصوص کر لی ہے اور جوں جوں ان کے مقبوضات فتوحات کے ذریعے سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں، یہ زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلتی جاتی ہے"۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں لشکروں اور فوجیوں کا بھی بہت کچھ حصہ رہا ہے۔ کیوں کہ شاہی لشکر اپنے مہم کے لیے جن جن علاقوں میں جاتے رہے، ان کے ساتھ وہاں کے گوشے گوشے میں یہ زبان پہونچتی اور پھیلتی رہی اور اس طرح اس کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔

بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے تعاون سے بھی اس زبان کو بڑا فروغ ملا۔ کیوں کہ ان بزرگوں نے دین واخلاق کی تبلیغ کے لیے اس زبان کو خوب خوب استعمال فرمایا۔ قوالی، سماع، شاعری، درسِ اخلاق اور خیالات کی اشاعت میں اس زبان سے خوب خوب کام لیا؛ جس سے اس زبان کو سندِ اعتبار حاصل ہوئی اور اس کی عظمت و رفعت کو چار چاند لگ گئے۔

مذکورہ بالا تاریخی واقعات و عوامل نے مل کر اردو زبان کے لیے ایسی سازگار فضا اور موافق ماحول پیدا کر دی، جس میں یہ زبان پلی بڑھی، پھولی پھلی، نشو و نما پائی اور تیزی سے ترقی کے زینے طے کرتی ہوئی شہرت کے بامِ عروج کو پہونچ گئی۔ عام معاملاتِ زندگی اور شاہی دربار کے مختلف طبقوں کے درمیان وسیلۂ اظہار بنی اور شمال سے لے کر دکن و گجرات تک اور کوہِ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک بولی اور سمجھی جانے لگی اور آج ہمارے درمیان یہ زبان "عربی ایرانی ہندی" ان تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت کے طور پر سکۂ رائج الوقت بنی ہوئی ہے۔

اردو زبان کی لسانی انفرادیت:

اردو زبان اگرچہ مختلف زبانوں کا سنگم ہے، تاہم یہ اپنی لسانی خصوصیات کے اعتبار سے باستثناءِ عربی تمام زبانوں میں اپنا ایک انفرادی مقام رکھتی ہے۔ چوں کہ اس زبان میں مختلف زبانوں کا رنگ و بو سمایا ہوا ہے، لہٰذا یہ ان زبانوں کے گلہائے رنگا رنگ سے تیار شدہ ایک خوبصورت اور جاذبِ نظر گلدستہ ہے؛ جس میں بیک وقت مختلف قسم کی بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ گویا یہ زبان "کثرت میں وحدت" کا مظہر اور "مجمع البرکات" کا مصداق ہے۔

اردو زبان تعبیر کی دل کشی، اسلوب کے حسن و جمال، لب ولہجہ کی شیرینی، جذبات کی تحریک اور اثر آفرینی میں کمال رکھنے کی وجہ سے بڑی دل فریب اور بڑی ہر دل عزیز زبان ہے۔ جو سنتا ہے، بھلے وہ کچھ نہ سمجھے؛ مگر اس کے حسن کا گرویدہ اور اس کی زلفوں کا اسیر ضرور ہو جاتا ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یہی وجہ ہے کہ غیر اردو داں طبقہ بھی اردو شعر و نظم، اردو حمد و نعت کو پسند فرماتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے؛ یہاں تک کہ اپنی مجلسوں اور اپنے دوستوں میں اردو فلمی ڈائیلاگ بولتا اور اردو فلمی گانوں سے مگن و محظوظ ہوتا ہے۔

کسی بھی زبان کی زندگی اور بلند معیاری اس بات پر موقوف ہوتی ہے کہ اس میں کتنی وسعت و گہرائی، کتنی لطافت و شگفتگی، کتنی صفائی و شستگی، کتنی روانی و زور بیانی، کتنی تحریک اور برانگیختگی پائی جاتی ہے؛ اس لحاظ سے اردو زبان ایک زندہ اور معیاری زبان ہے۔ کیوں کہ اس میں قوتِ اظہار بھی ہے، صفائی اور نکھار بھی، جان دار لہجہ بھی ہے اور اثر آفرینی کا جادو بھی۔ یہ اپنے مواد، اپنی ہیئت اور اپنی اصنافِ سخن کے اعتبار سے کسی بھی زندہ زبان سے پیچھے نہیں؛ بل کہ یہ ایک زندہ قوم مسلمانوں کی حکومت و اقتدار کا آئینہ دار اور اس کی تہذیب و ثقافت کا پاسبان، اس کی مذہبی و دینی روایت کی امین اور اس کے شان دار علمی و ادبی سرمائے کی محافظ ہے۔

اردو زبان اپنی وسعتِ دامانی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اپنے اندر جذب و قبول کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔ چناں چہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور انگریزی زبان کے الفاظ اس زبان میں داخل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں جذب ہوگئے اور اس طرح مختلف رنگوں کی خاک سے اس کا پرکشش پیکر تیار ہوا؛ جس کا انوکھا رنگ و روپ اور نرالا خد و خال ہر اہلِ نظر کے لیے تسکین کا سامان اور ہر اہلِ ذوق کے لیے طمانیت کا باعث ہے اور اسی وجہ سے آج سارے جہاں میں اس زبان کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ بقولِ داغؔ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اردو زبان میں اصنافِ سخن:

اردو زبان میں اصنافِ سخن کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے: ایک حصہ شعری سخن کا اور دوسرا حصہ نثری سخن کا۔ ذیل میں پہلے شعری سخن کا تعارف دیا جارہا ہے اور پھر نثری سخن کا۔

شعر: عربی زبان کا لفظ ہے، بہ معنی جاننا، دریافت کرنا اور کسی باریک چیز سے واقف ہونا۔ اور اصطلاح میں وہ موزوں و مقفّٰی کلام ہے جسے بالقصد کہا گیا ہو اور جس میں تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ جہانِ معنی کی وسعت پائی جاتی ہو۔

بقولِ غالبؔ:

”شاعری قافیہ پیمائی کا نہیں، بل کہ معنی آفرینی کا نام ہے“

اور ”بودیلیئر“ (Baudelaire) کے الفاظ میں:

''شاعری کا منبع وہ عالمگیر مماثلت ہے جو آسمانی و زمینی، حقیقی و مجازی، بالاخری ۱۴۴۳ھ کو مربوط کرتی ہے اور شاعر علامت کے ذریعے ان کے ربطِ باہمی کو بے نقاب کرتا ہے۔لیکن اس کا مقصد نہ نصیحت کرنا ہوتا ہے اور نہ تبلیغ، بل کہ شاعری اپنا مقصود آپ ہے؛ جو ہماری روح پر قبضہ کر لیتی ہے اور یہ قبضہ اسی وقت سچا ہوتا ہے جب شاعری ہر قسم کی کھوٹ سے پاک ہو''۔

حمد: عربی زبان کا لفظ ہے، بہ معنی خدا کی تعریف۔اور اصطلاح میں وہ صنفِ شعر ہے جس میں خدائے پاک کی ذات و صفات کے تعلق سے تعریف و توصیف بیان جاتی ہے۔

نعت: عربی زبان کا لفظ ہے، بہ معنی مدح و ثنا، تعریف و توصیف۔اور اشعار کی زبان میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف بیان کرنا ''نعت'' کہلاتا ہے۔

نظم: عربی زبان کا لفظ ہے،لغوی معنی سلک اور لڑی کے ہیں۔اور اصطلاح میں شعری کلام کی وہ قسم ہے جس میں کسی ایک موضوع یا مضمون پر مسلسل اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔

نظم معرّیٰ: ''معرّیٰ'' کے لغوی معنی سادہ اور خالی کے ہیں۔اور اصطلاح میں ایسی نظم کو ''نظم معرّیٰ'' کہا جاتا ہے جو قافیوں سے خالی ہو۔

آزاد نظم: نظم کی وہ جدید قسم ہے، جس میں قافیہ اور وزن کی کوئی رعایت نہیں ہوتی؛ بل کہ شاعر قدیم اصنافِ سخن یا ہیئت اور پرانی شاعری کے رموز و تلمیحات، اشارات و کنایات سے آزاد ہو کر اپنے جذبات کا اظہار اور اپنے تجربات کی ترجمانی کرتا ہے۔

نثری نظم: وہ جدید نظم ہے، جو وزن اور آہنگ سے عاری ہوتی ہے؛ اور غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی یا پابند نظم کی دوسری اصناف نیز آزاد نظم کی طرح اظہار و ابلاغ کو قبول نہیں کرتی؛ بل کہ اس میں شاعر امیجز (Images) کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔

ہائیکو: جاپانی زبان کا لفظ ہے۔اور اصطلاح میں شاعری کی ایک جدید قسم ہے، جو ملک جاپان سے درآمد ہوئی ہے؛ جس کی حقیقت تین مصرعوں کی مختصر نظم ہے۔جیسے

جس نے لکھی زمین کی تاریخ
جس نے اوڑھی مسافروں کی تھکن
اسی برگد کو تم نے کاٹ دیا　　　　(جمیل ملک)

سانٹ: یہ اطالوی زبان کے لفظ ''سانیٹو'' (Sonetto) سے مشتق ہے، جس کے معنی مختصر آواز یا راگ کے ہیں۔ اور اصطلاح میں اس کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف کیفی فرماتے ہیں:

"سانیٹ تمثالی شاعری کی چودہ مصرعوں پر مشتمل ایک ایسی صنف ہے ایک مخصوص بحر ہوتی ہے، جس کے مصرعوں میں قوافی کی ترتیب مقررہ اصولوں کے ماتحت ایک خاص انداز میں ہوتی ہے اور جس میں صرف ایک خیال، جذبے یا احساس کی ترجمانی ہوتی ہے۔ یہ خیال یا جذبہ اکثر نقطۂ عروج تک پہونچ جاتا ہے۔ وحدتِ خیال اور شدتِ احساس سانیٹ کے لازمی عناصر ہیں"۔

غزل: عربی زبان کا لفظ ہے، بہ معنی عورتوں سے بات چیت کرنا، حسن و جمال اور عشق و محبت کا ذکر کرنا۔ اور اصطلاح میں نظم کی وہ قسم ہے جس میں حسن و جمال، فراق و وصال، عشق و فریفتگی، شراب و کباب، فنا و معرفت وغیرہ سے متعلق عاشقانہ مضامین کا ذکر ہوتا ہے یا شاعر کسی بھی مضمون سے متعلق اپنے وسیع خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ بقولِ آل احمد سرور ہے

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے

غزل کے اشعار کم سے کم پانچ ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اکیس۔ پہلے دور میں غزل کا مضمون مسلسل ہوتا تھا اور اب اس کا ہر شعر جداگانہ مضمون کا حامل ہونے لگا۔ غزل کے پہلے شعر کو "مطلع" اور آخری شعر کو "مقطع" کہا جاتا ہے۔

مثنوی: عربی زبان کا لفظ ہے، بہ معنی دو دو والا۔ اور اصطلاح میں متفق الوزن اشعار کے مجموعے پر مشتمل وہ طویل نظم ہے جس کے ہر شعر کا قافیہ جدا جدا اور ہر دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، جس میں کسی مضمون کو مسلسل اور کسی واقعہ یا قصہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں زندگی اور معاشرت کے تمام تر پہلو آجاتے ہیں؛ مثنوی کے اشعار کی تعداد محدود نہیں ہوتی۔

مرثیہ: عربی لفظ "رثا" یا "رثاء" سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی کسی کی موت پر کرب و ملال اور رنج و غم کا اظہار کرنا ہے۔ اور اصطلاح میں وہ نظم ہے جس میں مرنے والوں کے اوصاف و کمالات بیان کیے جاتے ہیں یا شہید ہونے والوں کے مصائب و آلام اور شہادت کا ذکر ہوتا ہے۔

قصیدہ: لغت میں قصد سے مشتق ہے، جس کے معنی ٹھوس، بھرا ہوا اور پرمغز کے ہیں۔ اور اصطلاح میں وہ نظم ہے جس میں کسی کی بالقصد تعریف، شان و شوکت اور عظمت بیان کی جاتی ہے۔ اس کے پہلے دونوں مصرعوں اور ہر شعر کے آخری مصرع میں قافیہ کا التزام ہوتا ہے۔ قصیدہ کم از کم پندرہ اشعار پر مشتمل ہوتا ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

ہجو: عربی زبان کا لفظ ہے، بہ معنی مذمت و برائی۔ اور اصطلاح میں قصیدہ کی ضد وہ نظم ہے جس میں کسی کے عیوب و نقائص بیان کیے جاتے ہیں۔

قطعہ: عربی زبان کا لفظ ہے، ٹکڑا اور حصہ کے معنی میں ہے۔ اور اصطلاح میں دو یا زیادہ اشعار کی وہ نظم ہے جس میں

کسی مسلسل مضمون کو غزل کی بحر میں ادا کیا گیا ہو۔اس کے پہلے شعر کا ہم قافیہ ہونا لازمی نہیں، مگر باقی تمام اشعار کے دوسرے مصرعے کا متحد القوافی ہونا ضروری ہے۔قطعہ میں اخلاقی اصول، آفاقی حقیقتیں، ہنگامی واقعات، مدح وہجو اور طنز ومزاح وغیرہ کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔

رباعی: عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی چار چار کے ہیں۔اور اصطلاح میں شاعری کی وہ صنف ہے جس میں مخصوص اوزان کے چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون کو ادا کیا جاتا ہے۔اس میں پہلے اور چوتھے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔

مخمس: خمس سے مشتق عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی پانچ پانچ کے ہیں۔اور اصطلاح میں وہ نظم ہے جس کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

مسدس: سدس سے مشتق عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی چھ چھ کے ہیں۔اور اصطلاح میں وہ نظم ہے جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔اور ہر اول چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

کلیات: عربی زبان کا لفظ ہے اور کلی کی جمع ہے، بہ معنی ایک ہی شخص کی منظومات یا تصنیفات کا مجموعہ۔

دیوان: فارسی زبان کا لفظ ہے اور اصطلاح میں کسی شاعر کی شعری تخلیق کا مجموعہ "دیوان" کہلاتا ہے۔

نثر: عربی زبان کا لفظ ہے، بہ معنی تتر بتر، پراگندہ اور بکھرا ہوا۔اور اصطلاح میں شعر ونظم کی ضد ایسی عبارت کو کہتے ہیں جو منظوم نہ ہو۔

ناول: انگریزی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہے وہ طویل افسانہ، مسلسل داستان اور لمبا قصہ؛ جس میں متعدد افراد کی کردار نگاری کی گئی ہو۔انگریزی کی نامور ناول نگار "جین آسٹن" ناول کا تعارف یوں کراتی ہیں:

"اس میں فطرتِ انسانی سے متعلق سب مفصل معلومات ہوتی ہیں، اس کی متنوع کیفیات کا تجزیہ ہوتا ہے؛ ذکاوت اور ظرافت کے حسین ترین مظاہرے ہوتے ہیں۔اور یہ سب کچھ بہترین اور پسندیدہ زبان میں دنیا تک پہونچایا جاتا ہے"۔

افسانہ: فارسی زبان کا لفظ ہے اور حقیقت کی ضد ہے۔زبان وادب میں اس سے مراد وہ قصہ، کہانی یا سرگذشت ہے جو ادیب کا محض ذہنی اختراع ہو؛ حقیقت وواقعیت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔اس کے بنیادی اجزا تین ہیں: (۱) خیال (۲) ہیئت (۳) اسلوب

مضمون یا مقالہ: نثری تحریر کا وہ مجموعہ جس میں مضمون نگار یا مقالہ نگار اپنی علمی وادبی، تمدنی ومعاشرتی، مذہبی وتاریخی اور ہر قسم کی معلومات کو سادگی ودل کشی، پُرکاری وجدت طرازی کے ساتھ اپنے خاص اسلوب تحریر اور موثر طرزِ بیان میں دوسروں تک پہونچاتا ہے، جسے پڑھ کر وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

انشائیہ: عربی زبان کا لفظ ہے اور "انشا" کی طرف منسوب ہے، جس کے معنی عبارت لکھنا اور بات پیدا کرنا ہے۔ اور اصطلاح میں وہ نثری تخلیق ہے جس میں اختصار، بے تکلفی، اظہارِ شخصیت اور انبساطی مقصد کی خصوصیات کے ساتھ مصنف اپنے زاویۂ خیال سے معاشرے کی ایسی عکاسی کرتا ہے کہ اس کے تحریری مواد سے اس کا ذہن و کردار ظاہر ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر بشیر سیفی کے الفاظ میں:

"انشائیہ وہ صنفِ نثر ہے کہ جس میں مصنف اپنے ذاتی تاثرات اور انفرادی تجربات، بے تکلفی اور اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔اس صنف میں لکھنے والا موضوع کے حوالے سے ذہن میں آنے والی دیگر باتوں کا ذکر بھی کر سکتا ہے، تاہم موضوع سے انحراف نہیں کرتا؛ نیز انشائیہ نگار موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی ڈال کر قاری کو پُر تحیر مسرت بہم پہونچاتا ہے"۔

خاکہ: فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ڈھانچہ اور چربہ کے ہیں۔اور اصطلاح میں وہ نثری فن پارہ ہے جس میں خاکہ نگار اپنے مخصوص مشاہدے کی ایسی منظر نگاری کرتا ہے، جس سے محسوس ہوجاتا ہے کہ اس نے پسِ پردہ وہ چیز اور وہ بات دیکھ لی ہے جس تک عام شخص کی نگاہ نہیں جاسکتی۔

ڈرامہ: یونانی لفظ "ڈراء" سے مشتق ہے، یہ معنی کرنا یا کرکے دکھانا۔اور اصطلاح میں فنِ ادب کی وہ صنف ہے جس میں انسانی زندگی کے واقعات و مشاہدات کو افراد اور ان کی گفتگو کے حوالے سے عملی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

صحافت: عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی اخبار نویسی اور جرنلزم (Journalism) کے ہیں۔اور اصطلاح میں اس کی مختلف تعریف کی گئی ہے۔ایک انگریز ادیب کہتا ہے کہ: "صحافت عجلت میں لکھا گیا ایک ادب ہے"۔لیکن اس کی سب سے جامع اور مستند تعریف یوں کی جاتی ہے کہ: "صحافت جدید ذرائعِ ابلاغ کو بروئے کار لاتے ہوئے عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے"۔اور مفتی اعجاز ارشد قاسمی کے لفظوں میں: "معاصر دنیا کی ترجمانی، ماحول کی عکاسی، رائے عامہ کی نباضی اور مختلف اندازِ فکر کا تجزیہ: صحافت کی اصل روح ہے"۔

طنز و مزاح: یہ ایک شگفتہ تحریر ہوتی ہے، جس میں سنجیدگی کے ساتھ دل کو گدگدی لگائی جاتی ہے اور رمز و کنایہ کے ساتھ کسی عیب، کھوٹ اور خامی کی ذمہ دارانہ نشان دہی کی جاتی ہے؛ جس سے برا لگے بغیر عیب پر تنبہ اور اس کی اصلاح کی فکر ہونے لگتی ہے۔یہ کوئی بے ہودہ اور غیر سنجیدہ طرزِ تحریر نہیں۔مظفر بخاری کہتے ہیں:

"جس طرح نیکی اپنا انعام خود ہوتی ہے، اسی طرح مزاح بھی اپنا ثبوت خود ہی ہوتا ہے۔جو تحریر آپ کے دل کو گدگدائے، آپ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ لائے اور گاہے گاہے قہقہہ لگانے پر مجبور کرے؛ وہی اچھی مزاحیہ تحریر ہے"۔

آپ بیتی: مصنف کی "اپنی کہانی اپنی زبانی" کا نام آپ بیتی ہے۔جس میں مصنف اپنی زندگی سے متعلق بیتے لمحات

کو احاطۂ تحریر میں لاتا ہے اور مختلف مخفی گوشوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔یہ تحریر جگ بیتی یا تاریخی تحریر سے بالکل اچھوتی اور انفرادی لذت کا حامل ہوتی ہے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق کہتے ہیں:

”آپ بیتی میں جو مزہ ہے،وہ جگ بیتی یا تاریخ میں کہاں؟ مورخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق وتلاش میں سر مارے،آپ بیتی لکھنے والوں کو نہیں پہونچ سکتا؛ بعض اوقات اس کے ایک بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہوجاتے ہیں جو مدتوں تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے“۔

سوانح عمری: ”سوانح“ عربی زبان کا لفظ ہے اور ”سانحہ“ کی جمع ہے۔جس کے معنی واقعات، حادثات، روئے داد اور حالات کے ہیں۔اور اصطلاح میں کسی شخص کی زندگی کے حالات کا تذکرہ ”سوانح عمری“ کہلاتا ہے۔زندگی ایک مہماتی سفر ہے،جس میں مختلف قسم کے آسان اور دشوار مراحل پیش آتے رہتے ہیں؛ سوانح عمری کے ذریعہ انسانی زندگی کی مہمات ومراحل کا سچا نقشہ کھینچ کر انہیں محفوظ کرلیا جاتا ہے اور اس طرح سوانح عمری انسان کی موت کے بعد بھی اس کی حیات بن جاتی ہے۔

سپاس نامہ: فارسی زبان کا لفظ ہے،جس کا مطلب وہ تحریری اظہارِ شکر ہے جس میں کسی معزز مہمان کی آمد کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں اس میں اور دیگر مختلف باتیں بھی درج ہوتی ہیں،جن کی جانب مہمان کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔

سفرنامہ: ملکوں اور قوموں کے مشاہداتی حالات پر مشتمل مسافر کے ذاتی جذبات واحساسات سے ہم آہنگ ایک سنجیدہ اور معلوماتی تحریر ہے۔جس میں مصنف محض اپنے سفر کی سرگذشت ہی بیان نہیں کرتا،بل کہ جن احوال وکوائف کو دیکھ کر وہ متاثر ہوتا ہے؛ انہیں قاری کے سامنے سبق آموز بنا کر بھی پیش کرتا ہے۔

انسا ئیکلو پیڈیا: یونانی زبان کا لفظ ہے،جو اصل میں تین لفظوں سے مرکب ہے:

(۱) ”اِن“ بہ معنی میں،اندر (۲) ”سائیکلو“ بہ معنی چکر یعنی دنیا (۳) ”پیڈیا“ بہ معنی علم

اور اصطلاح میں ایسی تصنیف وکتاب ”انسا ئیکلو پیڈیا“ کہلاتی ہے جس میں دنیا بھر کے علوم وفنون سے متعلق معلومات درج ہوں۔گویا وہ تصنیف ”قاموس العلوم مخزن العلوم“ کا مصداق ہو اور وہ کتاب ”دائرۃ المعارف“ کا درجہ رکھتی ہو۔

اردو زبان وادب کی اولیات:

اردو زبان میں تصنیف وتالیف کا آغاز فیروز شاہ بہمنی کے دور سے ہوتا ہے۔چناں چہ سب سے پہلے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے تصوف پر اردو زبان میں ”معراج العاشقین“ نامی کتاب تصنیف فرمائی اور پھر اس زبان و ادب میں تخلیق کا سلسلہ چل پڑا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سب سے پہلا ترجمۂ قرآن	:	ترجمۂ قرآن	:	حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی
سب سے پہلا منظوم ترجمۂ قرآن	:	وحی منظور	:	علامہ سیماب اکبرآبادی

سب سے پہلا شعر : مسعود سعد سلمان نے کہا

سب سے پہلا ناول : مراۃ العروس : ڈپٹی نذیر احمد

سب سے پہلا مزاحیہ ناول : فسانۂ آزاد : پنڈت رتن ناتھ سرشار

سب سے پہلا جاسوسی ناول : نیلی چھتری : ظفر عمر

سب سے پہلا افسانہ : سوزِ وطن : منشی پریم چند

سب سے پہلا افسانوی مجموعہ : خیالستان : سجاد حیدر یلدرم

سب سے پہلا خاکہ : مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا

سب سے پہلا مجموعۂ مکاتیب : اردوئے معلّیٰ : مرزا غالب دہلوی

سب سے پہلا انشائیہ : سر سید احمد خان نے لکھا

سب سے پہلا ہفت روزہ : اردو مورچہ : نئی دہلی ۱۹۸۸ء

سب سے پہلا اردو شاعروں کا انسائیکلوپیڈیا: خمخانہ جاوید

سب سے پہلا ماہنامہ : خیر خواہ ہند

سب سے پہلا اخبار : جام جہاں نما : منشی سدا سکھ کی ادارت میں ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا

سب سے پہلا روزنامہ : اردو گائیڈ : ۱۸۵۸ء میں کلکتہ سے جاری ہوا

سب سے پہلا ڈرامہ : رادھا کنہیا : واجد علی شاہ

سب سے پہلا سفرنامہ : عجائباتِ فرنگ

سب سے پہلا ترجمہ : سراۃ العشق : عبداللہ حسینی (حضرت خواجہ گیسودراز کے پوتے)

سب سے پہلا اردو مزاحیہ شعر : جعفر زٹلی نے کہا

سب سے پہلا اردو شاعری کا تذکرہ: گلشنِ ہند : مرزا علی لطف

سب سے پہلا ریختہ : مسعود بن سعد نے گیارھویں صدی عیسوی میں کہا

سب سے پہلا تنقیدی مضامین کا مجموعہ: مقدمۂ شعر و شاعری : خواجہ الطاف حسین حالی

سب سے پہلا قصیدہ : نظامی بیدری نے سلطان علاؤالدین بہمنی کی مدح میں کہا

سب سے پہلا مسدس : مسدس مرزا محمد رفیع سودا

سب سے پہلا مرثیہ : ملا وجہی نے کہا

سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب : سب رس : ملا وجہی، ۱۶۳۵ء میں ترجمہ ہوا

سب سے پہلی سیرت کی کتاب	خطبات احمد	سر سید احمد خاں
سب سے پہلی مطبوعہ کتاب	انجیل اردو	۱۷۴۳ء میں بنجمن شلز نے جرمنی سے شائع کیا
سب سے پہلی اردو تاریخ صحافت کی کتاب	اختر شہنشاہی	حاجی سید محمد اشرف: ۱۸۸۸ء میں طبع ہوئی
سب سے پہلی اردو نثر کی کتاب	کربل کتھا عہد محمد شاہ	فضلی
سب سے پہلی ناول نگار خاتون	رشیدۃ النساء بیگم	"اصلاح النساء" نامی ناول ۱۸۸۱ء میں لکھی
سب سے پہلی کلیات	کلیات محمد قلی قطب شاہ	
سب سے پہلی رباعی	رباعی کا پہلا شاعر ملا وجہی نے کہی	
سب سے پہلی اردو لغت	مصنفہ ایم ٹی ٹیٹ ۱۷۰۴ء	
سب سے پہلی غزل	غزل کا پہلا شاعر ولی دکنی نے کہی	
سب سے پہلی آزاد نظم	سمندر	عبدالحلیم شرر
سب سے پہلی بچوں کی نظم	اسماعیل میرٹھی نے لکھی	
سب سے پہلی نثری نظم	اپنے اور دوستوں کے لیے نظمیں	عبدالرشید
سب سے پہلی معرّیٰ نظم	تاروں بھری رات	اسماعیل میرٹھی
سب سے پہلی قومی نظم	مسدس حالی	خواجہ الطاف حسین حالی
سب سے پہلی مثنوی	رتن پدم کدم راؤ	نظامی
سب سے پہلی سوانح عمری	حیات سعدی	
سب سے پہلی داستان	نوطرز مرصع	محمد عطا حسین خان تحسین

اردو زبان وادب پر معیاری تصنیفات:

اردو زبان وادب پر آج تک بہت ساری اہم تصنیفات وجود میں آچکی ہیں، جن میں سے کچھ مشہور اور مستند تصنیفیں ان کے مصنفین کے ساتھ درج ذیل ہیں:

تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ (ترجمہ مرزا محمد عسکری)
جدید اردو شاعری	پروفیسر عبدالقادر سروری
تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین

تعمیری ادبی تحریک، افکار و مسائل	:	پروفیسر احمد سجاد
تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات	:	ڈاکٹر تاراچند
اردوئے قدیم	:	شمس اللہ قادری
مقالاتِ حافظ محمود شیرانی	:	پروفیسر حافظ محمود شیرانی
تاریخِ ادب اردو	:	ڈاکٹر جمیل جالبی
عالمی ادبی معلومات	:	زاہد حسین انجم
وہ جو شاعری کا سبب ہوا ۔۔۔۔۔	:	ڈاکٹر کلیم عاجز
متاعِ قلم	:	ریاض حسین چودھری
اصنافِ ادب	:	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
انشائے ماجدی	:	مولانا عبدالماجد دریابادی
ادبی شہ پارے	:	محمد سمیع الدین
اردو زبان، مسائل اور امکانات	:	سید شوکت علی شاہ
غبارِ خاطر	:	مولانا ابوالکلام آزاد
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	:	سید احتشام حسین
اردو مرثیے کی سرگذشت	:	ڈاکٹر اسد اریب
نگارشاتِ آزاد	:	مولانا ابوالکلام آزاد
انشائیہ اردو ادب میں	:	ڈاکٹر انور سدید
اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	:	ڈاکٹر سلیم اختر
مختصر تاریخِ ادبِ اردو	:	پروفیسر محمود بریلوی

حوالہ جات:

تاریخِ زبان اردو (ڈاکٹر مسعود حسین)
تاریخِ ادب اردو (ڈاکٹر سید اعجاز حسین)
تعمیری ادبی تحریک افکار و مسائل (پروفیسر احمد سجاد)
اردوئے قدیم (شمس اللہ قادری)
مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (پروفیسر حافظ محمود شیرانی)
تاریخِ ادب اردو (ڈاکٹر جمیل جالبی)

من شاہ جہانم	(مفتی اعجاز ارشد قاسمی)
دنیائے معلومات	(زاہد حسین انجم)
فرہنگ آصفیہ	(مولوی سید احمد دہلوی)
عالمی ادبی معلومات	(زاہد حسین انجم)

شعروشاعری اسلام کی نظر میں

(شاعرِ اسلام وزائرِ حرم مولانا) ولی اللہ ولی قاسمی بستوی
استاذ: جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ اصلی علومِ اسلامیہ میں تفسیر حدیث اور فقہ کا ہی شمار ہوتا ہے جیسا کہ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

علمِ دیں فقہ است وتفسیر وحدیث
ہر کہ خواند جز ازیں گردد خبیث

یعنی حقیقت میں علومِ دین میں تفسیر حدیث اور فقہ ہی داخل ہیں، اور ان علوم کے علاوہ کے طالبین شرعی علوم کے طالب نہیں ہیں، لیکن علمائے اعلام نے مذکورہ تینوں علوم کو مقاصدِ اصلیہ اور علومِ عالیہ قرار دے کر ان کی تحصیل کے لیے ممد ومعاون علوم کو بھی علومِ اسلامیہ میں شامل فرمایا ہے، جن میں صرف، نحو، بیان، معانی، بدیع، لغت، علم العقائد، اصول فقہ، علم القراءۃ، حتی کے منطق وفلسفہ وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔

بشرطیکہ خدا بیزار مستدلات پر مشتمل نہ ہوں، اور اسی ضمن میں صاف ستھری اور پاکیزہ شاعری کا بھی شمار ہوتا ہے، چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ''وان من الشعر لحکمۃ'' اور ''وان من البیان لسحرا'' ارشاد فرما کر سندِ تحسین عطا فرمائی ہے۔ ہم نے صاف ستھری اور پاکیزہ شاعری کی قید اس لیے لگائی ہے، کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شعر کا تذکرہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ: ''ھو کلام فحسنہ حسن وقبیحہ قبیح''۔
(دار قطنی: ج۴/ص۱۵۵)

یعنی شعر بھی ایک قسم کا کلام ہی ہے، لہٰذا اس میں جو اچھا ہوگا اس کو اچھا اور جو خراب ہوگا اس کو خراب ہی کہا جائے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ شاعری مطلقاً پسندیدہ نہیں ہے، بل کہ اس کے پسندیدہ ہونے کے لیے صاف ستھرا اور

پاکیزہ ہونا شرط ہے۔

متعدد صحیح روایت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سنجیدہ اور پاکیزہ اشعار سننا، دادِ تحسین سے نوازنا اور انعام بھی عطا فرمانا ثابت ہے۔

چناں چہ صحیح مسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شرید ؓ سے ایک سفر کے دوران امیہ بن الصلت کے یکے بعد دیگرا یک سو اشعار سنے، اور پسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا۔ (مسلم: ج ا/ص ۲۶۷، کتاب الشعر)

حضرت مکحول سے مروی ہے کہ ابوامامہ ؓ کہتے تھے کہ اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اشعار آپس میں ایک دوسرے کو پڑھ کر سناتے تھے اور ہنستے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بیٹھے ہوتے اور مسکراتے تھے۔ (معجم کبیر: ج ۸/ ۱۲۷، حدیث ۷۸۱۵)

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ ؓ نے ابوبکر ہذلی کے دو شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

(احیاء العلوم: ج ۳/ص ۱۲۷، بیہقی دلائل النبوۃ)

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت ؓ کو حکم دیا کہ مشرکین شعراء کے کلام کا جواب دیں، اور جبریل کے ذریعہ تائید کی دعا فرمائی۔ (احیاء العلوم: ج ا/ص ۱۲۷)

انہیں پسندیدہ اور پاکیزہ اشعار میں بنونجار کی لڑکیوں کے وہ ترانے بھی شامل ہیں، جو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے وقت فرطِ مسرت میں گنگنائے تھے۔ جو تاریخ وسیرت کی بے شمار کتابوں میں آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔

یوں تو مہاجرین وانصار میں تمام ہی اکابر صحابہ شاعری کرتے تھے جن میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ، حضرت عمر فاروق ؓ، حضرت علی ؓ، حضرت کعب بن مالک ؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت حسان بن ثابت ؓ کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔

اور ان میں بھی حضرت حسان بن ثابت ؓ کو امتیاز حاصل ہے کہ انہیں تو شاعرِ دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل تھا، اور انہیں ''ان المؤمن یجاھد بسیفہ ولسانہ'' (مسندِ احمد: ج ۳/ص ۴۵۶) کا سب سے زیادہ مصداق ٹھہرایا جاسکتا ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ کے کفار شعراء کے ہجویانہ کلام کا جواب دینے پر مامور فرمایا تھا اور ''اللھم ایدہ بروح القدس'' (معجم کبیر: ج ا/ص ۳۷) کے سنہرے الفاظ کے ذریعہ مستجاب دعا بھی دیتے تھے۔

اور تاریخ وسیرت اور حدیث کی متعدد کتابوں کے مطابق حضرت کعب بن زہیر ؓ کے مدحیہ قصیدے کو سن کر بارگاہِ رسالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاں بخشی اور چادر بطور انعام مرحمت فرمانے کا تذکرہ ملتا ہے جس کی بنا پر اس قصیدہ کو قصیدہ بردہ کہا جانے لگا۔ (معجم الصحابہ: لابن القانع: ۵/ص ۴۲۳، فی ذکر کعب بن زہیر) اس پر مستزاد یہ کہ کئی

پاکیزہ اشعار خود زبان مبارک پر بھی آئے ہیں، چناں چہ صحیح مسلم کی ایک نقل کردہ روایت سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت لبید کے اس شعر کی بڑی تحسین فرمائی ہے

الا کل شیٔ ما خلا اللّٰہ باطل

و کل نعیم لا محالۃ زائل

خبردار، ذاتِ الٰہی کے علاوہ ہر چیز فانی ہے، اور ہر نعمت یقیناً زوال پذیر ہے، اس طرح کی اور بھی کئی روایتیں حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ:

شعر و شاعری کے سلسلے میں کچھ لوگوں کے ذہنوں میں چند غلط فہمیاں در آئی ہیں، جن کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے، اس لیے ان کے مستدلات کا جائزہ اور پھر ان کا دفعیہ کیا جاتا ہے، سو جاننا چاہیے کہ معترضین کے تین مستدلات ہیں جو ترتیب وار پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) سورۂ شعراء کی ذیل کی تین آیتیں:

"والشعراء یتبعھم الغاوٗن ○ الم تر انھم فی کل واد یھیمون ○ وانھم یقولون ما لا یفعلون ○"

شعراء کی پیروی صرف بے راہ لوگ ہی کرتے ہیں، کیا تم نے غور نہیں کیا؟ یہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور یہ لوگ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔

(۲) سورۂ یٰسٓ کی یہ آیت:

"وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر وقرآن مبین ○" اور نہ ہم نے انہیں شعر گوئی سکھائی اور نہ وہ آپ کے مناسب ہے، یہ تو واضح اور خالص قرآن ہے۔

(۳) اور یہ حدیث:

"لان یمتلی جوف رجل قیحا یریہ خیر من ان یمتلی شعرا" کسی شخص کا پیٹ پیپ سے بھر کر اسے فاسد کر دینا اس سے بہتر ہے کہ وہ اشعار سے بھرا ہو۔ (صحیح مسلم: ج ۴/ص ۱۷۶۹، حدیث ۲۲۵۷)

اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو ان مستدلات کا تجزیہ اور حل بالکل آسان ہے۔

چناں چہ مستدل ا ر کا حل تو خود انہی آیتوں کے بعد موجود ہے، "الا الذین امنوا وعملوا الصلحت وذکروا اللّٰہ کثیرا ○ وانتصروا من بعد ما ظلموا" "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور اللہ کا بہت ذکر کیا اور اپنے اوپر کیے گئے ظلم کا بدلہ لیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے، کہ جن شعراء اور ان کے متبعین کو گمراہ کہا گیا ہے، وہ ایسے شعراء ہیں جو گمراہ کن اشعار کے ذریعہ اپنے غلط احساسات و خیالات کو لوگوں تک پہنچا کر انہیں راہِ راست سے دور کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ حسن و عشق

کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور شراب و کباب ہی ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔
لیکن جو شعراء اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ تذکرے کرتے ہیں اور اچھے احساسات وخیالات لوگوں کی طرف منتقل کر کے ان کی اچھی ذہن سازی کرتے ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

مستدل (۲) کا حل اس سے بھی آسان اور واضح ہے کہ: اللہ پاک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تو شعر کوئی سکھلائی اور نہ ہی کتابت'' جیسا کہ ارشاد باری ہے: ''و ما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب و لا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون'' اور نہ آپ اس سے پہلے کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے تھے تب تو یہ لوگ شبہ میں پڑ جاتے۔

اور یہ دونوں چیزیں اس لیے نہیں سکھلائیں تا کہ لوگوں کو شبہ نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اپنی طرف سے اشعار کی مدد سے قرآنی آیات میں اضافہ کرلیا ہو۔ یا کوئی پرانا نوشتہ ہاتھ لگنے کی وجہ سے اس میں کچھ لکھ کر اضافہ کرلیا ہو، لیکن چوں کہ امت کے دوسرے افراد نہ تو صاحبِ قرآن ہیں اور نہ صاحبِ شریعت۔ اس لیے ان کی شعر وشاعری اور کتابت کے فن سے کوئی حرج نہیں، کیوں کہ ان سے آیاتِ قرآنیہ اور احکامِ شرعیہ میں کمی یا بیشی کا کوئی شبہ اور امکان ہی نہیں۔ اور مستدل (۳) کی تو بنیاد ہی کمزور ہے، جیسا کہ جب حضرت عائشہؓ کو اس روایت کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ: ''ان ابا ھریرۃ لم یحفظ و انما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من ان یمتلی شعرا ھجیت بہ'' یعنی حضرت ابوہریرہؓ کو ٹھیک یاد ہی نہیں ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان اشعار کے بارے میں فرمایا تھا، جن میں آپ کی ہجو کی گئی ہو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ، اگر حدودِ شرعیہ کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے پاکیزہ اسلامی شاعری کی جائے تو وہ سعادت وعبادت بھی ہے، اور اسلامی علوم میں داخل بھی ہے۔

اگر احساس اچھا ہو، تو پھر ہے شاعری اچھی
برا۔ احساس ہو، تو شاعری، مذموم ہوتی ہے
جو حمد و نعت پر ہو مشتمل، تو پھر عبادت ہے
جو حسن و عشق کی ہو، شاعری، مذموم ہوتی ہے
(ولی بستوی)

مصادر ومراجع:

دیوان الحماسۃ (ابو تمام الطائی)

الحماسۃ (ضیاء الدین علی البغدادی)

الحماسة البصرية (ابو الحسن علی ابن ابی الفرج البصری)

الاصمعیات (سعید عبد الملک بن قریب الاصمعی)

دیوان حسان ابن ثابت (حسان بن ثابت)

دیوان متنبی (ابو الطیب)

دیوان علی (حضرت علی)

دیوان الامام الشافعی (امام شافعی)

اردو مصادر و مراجع:

بال جبریل، ضرب کلیم، بانگ درا (علامہ اقبال)

کلیات اقبال (علامہ اقبال) کلیات اکبر (اکبر الہ آبادی)

شاہنامہ اسلام (حفیظ جالندھری) کلام مجذوب (خواجہ مجذوب حسن)

کلیات مومن (مومن خاں مومن) دیوان مولانا ظفر علی (مولانا ظفر علی صاحب)

کلیات محسن کاکوروی (محمد نور الحسن) مقدمہ شعر و شاعری (الطاف حسین حالی)

مسدس حالی (الطاف حسین حالی)

اب کچھ اسلامی شاعری پر مشتمل آخذ و مراجع ملاحظہ فرمائیں:

-:عربی کتابیں:-

دیوان حسان، دیوان فرزدق، دیوان جریر، دیوان الاحطل، قصیدہ البردہ للبوصیری، دیوان کعب بن زہیر، الدیوان للشافعی، دیوان الفیض، دیوان احمد، دیوان الشعر للشبراوی (مولانا الحن السہارنفوری) مولانا احمد حسین اثر سولفوری۔

قرۃ لعین، للشیخ عبد الرزاق، قصیدۃ العنبریۃ، للشیخ صدیق حسن خان البوقالی، قصیدۃ وحیدیۃ، للشیخ محمد و حید الدین عالمی الحیدر آبادی، دیوان الفارض، للمفارض

الجواہر المضیئۃ: للشیخ محمد و حید الدین عالمی الحیدر آبادی

الجواہر الزاہرۃ: للشیخ محمد و حید الدین عالمی الحیدر آبادی

لامیۃ الدکن، للشیخ السید ابراہیم الحیدر آبادی

لامیۃ الہند: للقاضی المقتد الدہلوی

اطیب النعم: للشیخ الشاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی

قصیدۃ عربیۃ: للشیخ اصغر علی روحی

قصیدۃ فی مدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم: للشیخ الشاہ رفیع الدین الدھلوی

القصیدۃ الھمزیۃ: للشیخ عبدالرزاق الکوباموی

تحفۃ الثقلین: للشیخ غلام علی آزاد البلجرامی

قصیدۃ نعتیۃ: للشیخ ابو طاہر سیف الدین

زمرات الشوق: للشیخ عبدالقدیر محمد الصدیقی الحیدر آبادی

قصیدۃ اخلاقیۃ: للشیخ حبیب الرحمان العمانی الدیوبندی

مدح الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لولی اللہ ولی القاسمی البستوی استاذ بالجامعۃ الاسلامیۃ اشاعۃ العلوم اکل کوا

-:فارسی کتابیں:-

اسلامی شاعری سے فارسی زبان وادب کا بھی دامن بھرپور ہے۔ اگرچہ کہ اس وقت کچھ ایسی کتابوں کی نشاندہی مشکل ہے، اسلامی شاعری پر مشتمل ہوں، تاہم کچھ ایسی کتابوں کو بطور حوالہ ضرور پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً: ''مثنوی رومی'' مثنوی مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، کلیات اقبال، دیوان ظفر۔ بوستان سعدی، دیوان حافظ و حافظ شیراز ہیں) قصائد قاسمی (مولانا محمد قاسم نانوتوی) نعت محمود، (مفتی اعظم محمود حسین گنگوہی) ماہنامہ ندائے شاہی کا نعت النبی نمبر، ماہنام الرشید لاہور کا نعت النبی نمبر، ماہنامہ نقوش پاکستان کا نقوش رسول نمبر کشکول مجذوب۔

-:اردو کتابیں:-

ندائے شاہی کا نعت النبی نمبر۔ الرشید لاہور کا نعت النبی نمبر۔ ماہنامہ نقوش نعت نمبر۔ ماہنامہ قرطاس ناگپوری کا نعت النبی نمبر۔ نسیم سحر (مفتی نسیم احمد زیدی)۔ فیضان حرم (نسیم غازی مظاہری)۔ خلق عظیم (ظفر جنکپوری)۔ نغمۂ سحر (مولانا ریاست علی ظفر بجنوری)۔ نقوش زندگی (مولانا صادق علی صادق بستوی)۔ تابانیاں (مولانا مجیب بستوی)۔ فیضان محبت (مولانا حکیم محمد اختر پاکستانی)۔ عرفان محبت (مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی)۔ کلام ثاقب (مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی)۔ گلہائے نفیس (سید شاہ نفیس الحسینی پاکستانی)۔ خوشبوئے حرم (مولانا امام علی دانش)۔ نور ہدایت (مفتی جمیل احمد نذیری)۔ کوثر و زمزم (قاری عبداللہ انور صابری دیوبندی)۔ صدق مقال (محمد زکی کیفی پاکستانی) سلام علیک (علامہ انور صابری دیوبندی)۔ آمنہ کا دلارا، (ولی اللہ ولی قاسمی بستوی، استاذ جامعہ اکل کوا)

ہمارا نبی، انمول موتی، شمع رسالت، مسافر مدینہ (ولی اللہ ولی قاسمی بستوی، استاذ جامعہ اکل کوا)

گذشتہ صفحات ہی جو کچھ بھی پیش کیا گیا ہے وہ بطور نمونہ از خروارے ہے۔ ہمہ دانی یا احاطۂ کل کا دعویٰ بالکل نہیں بس یہ کہہ کر اعتراف عجز کرتا ہوئے قلم کو روکتا ہوں کہ

بہت سے شاعروں کے جلوہ گر مآثر ہیں

کہ علم وفن سے بھرے ان گنت دفاتر ہیں
"ولی" نے پیش کیا جو بھی، ایک نمونہ ہے
ادب کے اور کئی بے کراں ذخائر ہیں

علمِ بلاغت

رشید الدین المعروفی الاعظمی
معلم جامعہ اکل کوا

فنِ بلاغت زبانِ عربی جو درحقیقت "اسلام کی قلم وزبان ہے"، کا وسیع وعظیم فن ہے، یہ علم علمائے فن کے زبان عربی کے مزاج ومذاق اوراس کے ان فصیح وبلیغ محاورات وامثال کے تتبع واستقصاء کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوا جو اہل زبان عربوں کی طبیعت سے ہم آہنگی اور عمدہ معانی کی جامعیت کا "حسین سنگم وامتزاج لیے ہوئے ہیں"۔

بلاغت کا اطلاق ابتدائً بقول صاحب المعجم الوسیط "حسن بیان اور قوت تاثیر" پر ہوتا تھا۔ علمائے بلاغت نے اس کی تعریف یوں کی ہے، کہ: علم بلاغت: وہ علم ہے جس میں حسن بیانی کے طرق سے واقفیت دی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے علوم بلاغت کا تاریخِ عرب میں بڑا واضح اور نمایاں کردار رہا ہے کہ اس کے ظل ہمایوں سے ہمیشہ ایسے بلغاء وفصحاء پھیلتے رہے جنہیں لوگ "ضرب المثل" کے طور پر یاد کرتے اوران کی اتباع کرتے، نیز جس خطیب ومتکلم کو فن بلاغت سے جس قدر وابستگی اور پختگی ہوتی وہ اتناہی رفیع المنزلت اور عظیم الرتبہ سمجھا جاتا تھا۔

صدیق حسن قنوجی اپنی کتاب "ابجد العلوم" میں رقمطراز ہیں: علم بلاغت نام ہے علم بیان، بدیع اور معانی کا، اوران علوم سے مقصود، خواہ وہ بلاغت، کلام کے تعلق سے ہو یا متکلم کے تعیین ہو، دو چیزوں میں منحصر ہے۔

اول: معنی مرادی کی ادائیگی میں خطاء سے احتراز۔ دوم: فصیح کا غیر فصیح سے امتیاز۔

بلاغت، بیان، بدیع:

یہ بات نا قابل تردد ہے کہ علم بلاغت کا لغت اور نحو وصرف کے علوم سے گہرا تعلق ہے۔ مذکورہ علوم بھی عربیت اور وضوح وبیان سے متصف ہیں، مگر علم بلاغت کو علاوہ اس کے ایک خصوصی امتیاز حاصل ہے، اور وہ ہے معنی مرادی میں خطاء سے اجتناب، جس کے لیے "علم معانی" وجود میں آیا ہے۔ اسی طرح تعقید معنوی سے احتراز جس سے "علم بیان" وجود پذیر ہوا، نیز محسنات لفظیہ کا ذخیرہ جس سے "علم بدیع" ترتیب میں آیا۔

ہم ان تینوں علوم پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالتے ہیں۔

علم معانی:

کلام کی تراکیب کے خواص کو جاننا اور تفاوتِ مقامات سے واقف ہونا تاکہ متکلم ایک کو دوسرے پر تطبیق دینے میں غلطی کا شکار نہ ہو۔

اس کی تشریح بقول صاحب ابجد العلوم کے یہ ہے کہ: تراکیب کلام کے کچھ خواص وامتیازات ہوتے ہیں جسے ادباء اپنے ادبی ذوق یا فن بلاغت کے ساتھ ممارست ومزاولت کے نتیجہ میں ادراک کر لیتے ہیں، جن میں سے بعض محض ذوق پر مبنی ہوتے ہیں تو بعض استحسانی صفت کے حامل ہوتے ہیں، اور بعض صناعات ایسی ہوتی ہیں جو معانی اصلیہ سے لزوم وتبعیت کا رشتہ رکھتی ہیں جسے اربابِ فن اپنے فنی ذوق کے آئینہ میں مستحسن سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اس کا ادراک فطرتِ سلیمہ والوں پر منحصر ہوتا ہے، اسی طرح کلام کے مقامات باہم متفاوت اور قدرے فرق کے حامل ہوتے ہیں جیسے مقام شکر وشکایت، مقام تہنیت وتعزیت وغیرہ غرضیکہ کلام کے خواص کو ان کے مقامات کے موافق رکھنے کا طریقہ علم معانی سکھاتا ہے۔ اور اس کا مدار استحسانات عرفیہ پر ہے۔

علم معانی کی ایک مثال:

منقول ہے کہ ایک اعرابی نے ایک قاری قرآن کو ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَیْدِیَھُمَا جَزَاءً بِمَا کَسَبَا نَکَالاً مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ'' پڑھتے ہوئے سنا تو صفت رحمت ومغفرت پر آیت کا اختتام سن کر چونکا یہاں تک کہ قاری کو اپنی خطا پر تنبہ ہوگیا، پھر اس نے صحیح تلاوت کی: ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا ---------- وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ'' تب اس اعرابی نے کہا، اب معنی صحیح ہوا، کیوں کہ یہ مقام، مقام عقوبت ہے، جہاں سارق کو قطع ید کی دھمکی دی گئی ہے، بل کہ قطعِ ید کا امر کیا گیا ہے، صفت رحمت ومغفرت کا ذکر مقام کے مناسب نہیں ہے، بل کہ مقام کا مقتضی یہ ہے کہ کہا جائے، واللہ عزیز حکیم اللہ کی صفت ''عزت'' کا تذکرہ کیا جائے جو غماز ہو اس پر کہ وہ اپنے نافرمان بندوں کے بارے میں جو حکم دینا چاہے دے سکتا ہے، پھر صفت حکمت کو لایا جائے، جو اس حقیقت کی طرف مشیر ہو کہ عقوبت اپنی مقدار معین سے نہ کم ہو نہ زیادہ، بل کہ گناہ کے موافق اور متقارب ہو۔

اسی علم کا ضابطہ اور قانون ہے کہ متکلم مقام سوال میں فخر نہ کرے اور جس کی شکایت اپنے بڑے سے کر رہا ہو، اس کی ثناخوانی نہ کرے اور مقام تعزیت میں نہ ہنسے اور مقام تہنیت میں خواہ وہ نثر میں ہو یا شعر میں ترش روئی کا مظاہرہ نہ کرے۔

علم بیان:

صاحب ''کشاف اصطلاحات الفنون'' نے اس کی تعریف یوں کی ہے: یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ ایک ہی معنی کو ایسے متعدد طرق سے ذکر کیا جاتا ہے جو دلالت علی المعنی میں باہم مختلف ومتفاوت ہوں۔

ابن خلدون اسی حقیقت کو سمجھاتے ہوئے، اپنے مقدمہ میں فرماتے ہیں: غور کرو: ''زید جاءنی''، یہ قول

"جاءنی زید" کے متغایر ہے بایں وجہ کہ اس میں جو مقدم ہے متکلم کے یہاں الاھم فی الحیثیت کا حامل ہے۔لہٰذا جس نے "جاءنی زید" کہا اس کے یہاں مجیئت اہم ہے، زید مسند الیہ ہے اور جس نے "زید جاءنی" کہا، اس کے یہاں شخص زید مہتم ہے مجی کے بمقابل۔اجزاء جمل کو ان کے مقام کے مناسب موصول ومبہم اور معرفہ وغیرہ کی شکل میں ذکر کرنا اسی قبیل سے ہے۔

بیان قرآنی کی مثالیں:

اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے"ولا تقتلوا أولادکم خشیة إملاق نحن نرزقهم وإیاکم "(الاسراء/۳۱) جب کہ دوسری جگہ انداز بیان یوں ہے:"ولا تقتلوا أولادکم من إملاق نحن نرزقکم وإیاهم "(الانعام/۱۵۱) کہ خشیت املاق میں چوں کہ مستقبل میں اندیشۂ فقر سے خوف کا ذکر ہے، حال میں وقوع فقر کا ذکر نہیں، تو اولاد کے رزق کو آباء کے رزق پر مقدم کیا، کیوں کہ آبا ء تو فی الحال مرزوق ہو ہی رہے ہیں، ان کا خوف تو مستقبل میں کثرت اولاد پر تھا۔او دوسری آیت میں"من املاق " سے ذکر کیا، جس میں قتل اولاد سے باز رہنے کی دعوت دی، اور رزق آباء کو رزق اولاد پر مقدم کیا، کیوں کہ وہاں یہ وجہ پیش نظر تھی کہ آباء اور والیان جو قتل اولاد کا ارتکاب کر رہے ہیں، وہ اپنی موجودہ رزق کی بدحالی کی وجہ سے کر رہے ہیں؛ اس طرح کی مثالیں محاورات عرب میں بلاغت وبیان کی عظیم وبدیع صنعت شمار کی جاتی ہے، جو قرآن کا امتیاز واعجاز ہے، اسی قبیل سے ہے استعارہ، کنایہ، تشبیہ وتمثیل وغیرہ کا استعمال۔

علم بدیع:

بلاغت عربیہ کے بشمول یہ فن ہر اس صنعت سے میل کھاتا ہے جس کو لوگ چیزوں کی تجمیل وتحسین کی لیے استعمال کرتے ہیں جو نظروں کو لبھاتی، افکار کو مہمیز دیتی، اور عقل وسرور کو جلا بخشتی ہے یعنی اشیاء کی حسن طرازی اور خوشنمائی کلام وبیان کی حدود میں منحصر نہیں ہے بلکہ ارباب ذوق اپنی ہر مملوک ومتعلق شئی کو فنون تحسین سے آراستہ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

علم بدیع کی تعریف:

یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ کلام کے مقتضائے حال کے موافق ہونے کے بعد اس میں تحسین وتجمیل کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔یا یوں کہہ لیجئے یہ دائرہ فصاحت وبلاغت کی تکمیل وتتمیم کے بعد تحسین وتزئین عرضی سے متعلق فن کا نام ہے۔

اس علم کی مصطلحات میں"طباق" و"جناس" ہیں جیسے کہا جاتا ہے:"تألف المو تلف وتخالف المختلف وتشابه المتشابه وتعارض المتعارض "۔

کشاف اصطلاحات الفنون میں تھانوی رقمطراز ہیں :اس علم کا فائدہ کلام کی رعنائی ونکہت کا اظہار ہے، تاکہ

مضمون کلام سمع گیر اور دلنشین ہو جائے۔ اس لیے کہ اصل چیز کو "حسن ذاتی" ہے اور الاخباری و بیانی اس تک رسائی نا کافی ہے، اس لیے علمائے کرام نے حسن عرضی کو بھی اپنی عنایت و محنت کا نقطۂ قرار دیا، کیوں کہ نازنین مہ مثال اگر اسباب زینت سے عاری ہو تو ممکن ہے کہ بعض کوتاہ نظروں پر ان کی خوبیاں پوشیدہ رہ جائیں، اور وہ اسے لائق استمتاع نہ سمجھیں۔

یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ بلاغت کے علوم ثلاثہ کو محض ان کے اسماء اور مبادی کے مطالعہ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا بل کہ اس کے لیے پیہم مطالعہ اور کامل استماع کی ضرورت ہے، نیز ادبی خزانوں کی چھان بین اور ان سے موانست و مزاولت کافی حد تک درکار ہے۔

قرآن کریم اصل بلاغت کی کتاب ہے:

علوم بلاغت بل کہ جملہ علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل کے لیے قرآن پر لغوی بلاغتی مطالعہ سے بہتر کوئی سرمایہ نہیں، پھر قرآن کریم کے شان ہدایت و ارشاد کا کیا کہنا جو کہ قرآن کا مقصد اولین ہے اللہ رب العزت کے اس قول کی ادب ریزی و بلاغت بیانی پر سر دھنئے "وقیل یا أرض ابلعي مائک ویا سماء أقلعي وغیض الماء وقضي الأمر و استوت علی الجودي وقیل بعدا للقوم الظالمین" آیت میں ذرا غور کیجیے کہ اپنے اندر دو امر، دو نہی اور بشارت و دعاء کا کیسا حسین امتزاج لیے ہوئے ہے، اور ذرا نظرِ عمیق ذیل کے فرمان باری تعالی میں تدبر کیجیے: "ان اللہ یأمر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربی و ینھی عن الفحشاء و المنکر و البغي یعظکم لعلکم تذکرون" (النحل/۹۰) کہ اللہ کا یہ امر کس طرح دنیا و آخرت کے خیر کو خواہ وہ فردی سطح پر ہو یا جماعتی سطح پر شامل ہے، اور دینی و دنیوی شر سے نہی پر مشتمل ہے، اور بضابطۂ تذکیر و موعظت، ترغیب و ترہیب پر آیت کا اختتام ہوا ہے۔

فن بلاغت پر کتابیں:

سید احمد الہاشمی اپنی کتاب "جواہر الأدب" میں فرماتے ہیں، علم بیان میں سب سے پہلے جو کتاب ترتیب دی گئی، وہ "مجاز القرآن" ہے، جس کے مصنف ابو عبیدہ ہیں، جو خلیل نحوی کے تلمیذ رشید رہے ہیں؛ پھر اس کے بعد علما نے اس فن پر دیگر کتابیں تصنیف کیں، یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچ سکی کہ علم معانی کو باقاعدہ تالیف و جمع کرنے کا کام سب سے پہلے کس نے کیا۔

البتہ اس سلسلے میں چند بلغاء کے کلام نقل کئے گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور جاحظ ہیں، جنہوں نے "اعجاز القرآن" ترتیب دے کر اس فن کی خدمت کی۔

علم بدیع میں تالیف کرنے والے اولین مؤلفین میں ابن المعتز اور قدامۃ ابن جعفر سر فہرست ہیں؛ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ علم بڑھتا اور پروان چڑھتا رہا علمائے کرام اس میں اضافہ و تنقیح کا کام انجام دیتے رہے یہاں تک شہسوار بلاغت عبدالقاہر الجرجانی کا زمانہ آیا آپ نے معانی میں "اعجاز القرآن" نامی کتاب ترتیب دی اور بیان میں "اسرار البلاغۃ" نام سے کتاب لکھی، اس کے بعد سکاکی آئے، جنہوں نے اپنی معروف و مستند کتاب "مفتاح العلوم"

ترتیب دی۔

اللہ تعالیٰ ان مصنفین ومؤلفین کی کاوشوں کو قبول ومشکور فرمائے۔آمین!

مصادر ومراجع:

کتاب الصناعتین　　(ابو ھلال حسن العسکری)

دلائل الاعجاز　　ابو بکر عبدالقاھر الجرجانی

اسرار البلاغة　　ابو بکر عبدالقاھر الجرجانی

مفتاح العلوم　　ابو یعقوب السکاکی

التلخیص　　محمد ابن عبدالرحمن القزوینی

الایضاح　　محمد ابن عبدالرحمن القزوینی

تهذیب الایضاح　　عز الدین التنوخی

المنهاج الواضح فی البلاغة　　حامد عونی

البلاغة تطور و تاریخ　　شوکی ضیف

البلاغة العربیة فی دور نشأتها　　سید نوفل

الموجز فی تاریخ البلاغة　　مازن المبارک

اردو مراجع:

مصباح الفتاح

مفتاح البلاغة　　مولانا محمد موسیٰ آدم

تسہیل البلاغة　　محمد عبیداللہ الاسعدی

دروس البلاغة　　مولانا سالم وحید

تحفۃ الطلباء　　مرغوب احمد، مولانا ثمیر الدین

حسن معانی　　　افضال الحق جوہر
عنایۃ الصلحاء　　　عنایت اللہ کھریاسنی
دبستان بلاغت　　　مولانا افتخار احمد سمستی پوری

علم منطق

ابوخدیجہ اشاعتی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

یہ ایسا علم ہے جس کے متعلق علماء کے درمیان زمانہ قدیم سے شدید اختلاف چلا آرہا ہے، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں ان کے اقوال اور آرا میں جو اختلاف ہے وہ بالکل متضاد ہے۔

علم منطق کے سلسلہ میں دو متضاد رائے

علم منطق کے متعلق علما کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ یہ کافرانہ علم ہے، اس فن کا واضع اور موسس یونانی فلسفی ارسطاطالیس ہے، اور اس فن کو عربی میں ایک بدعقیدہ شخص نے منتقل کیا ہے، اور جس نے بدنیتی سے اسلام کو اس کی حقانیت وصداقت کو گھٹانے کے لیے اپنی سازشوں کا نشانہ بنایا، اس جماعت کے ہم خیال علامہ سیوطیؒ بھی ہیں، چناں چہ آپ اپنی کتاب "حاوی" میں رقمطراز ہیں، کہ منطق انتہائی برا اور خبیث فن ہے، اس میں اپنے آپ کو مشغول رکھنا حرام ہے۔

اس جماعت کے بعض افراد کی رائے مبنی ہے قول ہیولی پر، جو کفر ہے، اور جو آدمی کو عقل پرستی اور نقل بیزاری پر آمادہ کرتا ہے، جس کا نہ کوئی دینی فائدہ ہے نہ ہی دنیاوی، پھر چند علما نے بھی یہی بات کہی ہے، اور پوری مخلوق کو اس علم کو خیرآباد کہنے اور پس پشت ڈالنے کی دعوت دی ہے۔ (یہ ایک رائے ہوئی)

دیگر علما کا رجحان

بعض علمائے علم منطق کو علم میزان سے موسوم کرتے ہیں اس لیے کہ اس کے ذریعہ دلائل وبراہین قائم کئے جاتے ہیں، نیز یہ علمائے منطق کو "خادم العلوم" سے تعبیر کرتے ہیں، اس لیے کہ منطق ہی دیگر علوم تک رسائی کا ذریعہ ہے ، اور اسی لیے ان علما کے نزدیک ابن سینا کا یہ قول تعجب خیز نہیں ہے کہ منطق تمام علوم میں درک حاصل کرنے کے لیے بہترین مددگار ہے، اور اس علم کا ترک اور اس کی منفعت کا انکار اسی نے کیا جس نے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور اس کے حقائق سے شناسائی نہیں رکھی، جس کی بنیاد "عداوت بربنائے جہالت" کے سوا کچھ بھی نہیں، اور امام غزالیؒ نے تو یہاں

تک فرمادیا: کہ جو منطق سے ناواقف ہو اس کے علوم میں پختگی ہو ہی نہیں سکتی۔

لیکن سچ یہ ہے کہ علم منطق کی نشونما یونان میں ہوئی ہے، اسی لیے اس کے چند اصول ایسے ہیں، جو عالم کو اولیت دیتے ہیں، اور اس کے قدیم ہونے کا قائل بناتے ہیں، حالاں کہ اس کو اولیت نہیں ہے اور یہ بالکل واضح چیز ہے کہ یہ عقیدہ عقیدۂ اسلامیہ کے بالکل معارض ومخالف ہے، اس لیے کہ عقیدۂ اسلام لوگوں کو ایمان باللہ کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ جل جلالہ وعم نوالہ یکتا ہے وہی اول ہے اس سے قبل کوئی شئ نہیں ہے، اور اس کے علاوہ تمام اشیاء اسی کے امر سے وجود میں آئی ہیں، اور اسی کی قدرت سے پیدا ہوئی ہیں۔

اور اسی بناء پر پہلا پہل یونانی منطقی فکر جب عربی زبان میں منتقل ہوئی تو امت اسلامیہ کے درمیان بہت ہی زیادہ بے چینی اور اضطراب پایا گیا، اور یہ سب مامون عباسی کے زمانہ میں ہوا، اسی زمانہ میں زنادقہ اور ملحدین کی ایک جماعت وجود میں آئی، جو عقیدۂ اسلامیہ کا انکار کرتے تھے، ان کا جہاں تک بس چلتا کھلم کھلا انکار کرتے، اور جہاں بس نہ چلتا یا خطرہ محسوس ہوتا تو چھپ چھپا کر انکار کرتے ان سب باتوں کے پیش نظر ابن تیمیہ کی وہ بات سمجھ میں آتی ہے، جو انہوں نے منطق کے خلاف گفتگو فرماتے ہوئے کہی ہے کہ مجھے یقین کامل حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ مامون عباسی سے بے خبر نہیں ہے، اور اللہ جل مجدہ ضرور انہیں سزا دے گا، اس فساد کی وجہ سے جو انہوں نے اس امت میں داخل کیا ہے۔

اعتزال منطق کی پیداوار ہے

جب اس امت میں علم منطق وفلسفہ داخل ہوا، تو اعتزال نے اپنی آنکھیں کھولی جس نے فہم دین کے لیے عقل ہی کو اساس وبنیاد بنایا، یہ ایسی بات ہے جو ابتداءً اتنی بڑی نہ تھی، مگر معتزلہ اس میں بہت زیادہ غلو کر بیٹھے اور اس کے سمجھنے میں عقلی تفسیرات اور فلسفی موشگافیوں کے پیچھے پڑ گئے، لہٰذا اس چیز نے انہیں اس امت کے گمراہ لوگوں میں شامل کر دیا، یہاں تک کہ اللہ نے اس دین کی حفاظت کے لیے ابو الحسن اشعری کو منتخب فرمالیا اور ان کے بعد باقلانی کو پھر جوینی کو، اس وقت ان لوگوں نے منطق اور حجت کے ذریعہ فتنۂ اعتزال اور فکر اعتزال کے ٹھاٹھے مارتے ہوئے سمندر کو روک دیا، بعد ازاں امام غزالیؒ میدان میں آئے جو فلسفۂ منطق اور فکر میں "آیۃ من آیات اللہ" تھے، چناں چہ وہ فلسفہ کی چوٹی تک پہنچ گئے اور اس کی لگام کو تھام لیا، یہاں تک اپنی کتاب اور مقاصد وفلاسفہ میں ان ہی لوگوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، پھر دوبارہ اسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے سخت توڑ پیش کئے، اور اپنی کتاب "تہافت الفلاسفہ" میں اس پر ایسی ضرب کاری لگائی کہ اس کے بعد وہ سر نہ اٹھا سکے، یہ شخص ایسا مرد مجاہد ثابت ہوا جس نے یونانی کافرانہ منطق کی آگ کو اسلامی منطق کے پانی سے بجھا دیا۔

تعریف علم منطق

اب مشہور مقدمہ کے بعد ہم بحث کرتے ہیں، کہ منطق کیا ہے؟ علما نے اس کی تعریف وموضوع پر کس طرح روشنی ڈالی ہے؟

صدیق بن حسن قنوجی ''ابجد العلوم'' میں منطق کی تعریف کرتے ہیں کہ منطق ایسا علم ہے، جس کے ذریعہ نا معلوم تصور اور نا معلوم تصدیق حاصل کرنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

غرض: اقوال میں صدق و کذب کے درمیان، نیز افعال میں خیر و شر کے درمیان اور اعتقادات میں حق و باطل کے درمیان تمیز حاصل کرنا۔

حاجی خلیفہ فرماتے ہیں کہ مشہور قول کے مطابق اصول منطق کے نو باب ہیں:

(۱) باب الکلیات	(۲) باب التعریفات	(۳) باب التصدیقات
(۴) باب القیاس	(۵) البرهان	(۶) الخطابة
(۷) الجدل	(۸) المغالطة	(۹) الشعر

یہ سب خلاصہ ہے ''العلمی'' حاشیہ شرح ''هداية الحكمة المبزية'' اور ''حكم شرح العين'' وغیرہ کا۔

اگر چہ فلسفۂ اسلام جس کو بعض نے یونانی منطق کے طرز پر ہونے کی وجہ سے ناپسند کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اہل اللہ نے منطق کو ثوب اسلام سے مزین کیا، جس کی بنیاد کافرین اور ملحدین نے رکھی تھی، تا کہ منطق، علمِ توحید سے پیوست ہو کر توحید کی سواری بن جائے، جسے علم کلام کہا جانے لگا، ابن سینا نے فلسفہ کی مفصل تعریف کی ہے، کہ علم منطق صناعت نظریہ کا نام ہے، جس کے ذریعہ انسان اس چیز کے حصول سے مستفید ہوتا ہے، جس پر سب کا وجود معلق ہے، جس کا کرنا اس پر واجب ہے، تا کہ اس کے ذریعہ اس کا نفس معزز ہو اور مکمل ہو اور وہ معقول کو جاننے والا ہو جائے، موجود کو جاننے کے مقابلہ میں، اور آخرت میں ابدی سعادت کے لیے تیار ہو جائے اور یہ انسانی طاقت کے مطابق ہے۔

مثلاً ابن سینا نے وجود الٰہی کے اثبات پر ایک نقطہ بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اشیاء کا وجود دو حال سے خالی نہیں، یا تو واجب بذاتہ ہوگا یعنی جس کے عدم کا تصور ممکن ہی نہ ہو، اور اگر ہم اس کے عدم کا تصور بھی کر لیں تو ہم اختلاف اور مشقت میں پڑ جائیں گے، یا اشیاء کا وجود جائز الوجود یا ممکن الوجود ہوگا۔ بہر حال واجب الوجود تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات گرامی ہے، اور ممکن الوجود تو وہ اللہ رب العزت کی مخلوقات ہیں جس کے معدوم ہونے پر عدم و محال مرتب نہیں ہوتا۔

ابن رشد فلسفی نے وجود الٰہی کے اثبات کو ترجیح دی ہے اس طریق سے جو قرآن سے ماخوذ ہے، چناں چہ دو دلیلوں کا استخراج کیا:

(۱) دلیل اختراع: یعنی اشیاء کا پیدا کرنا اور اس کو وجود بخشنا۔

(۲) دلیل عنایۃ: یعنی زمین کی تمام اشیاء کا حیات انسانی کے لیے اور زندگی گذارنے کے لیے موافق ہونا چاہیے۔

منطق اور علوم اسلامیہ

ہم اس بات سے چشم پوشی نہیں کرسکتے، کہ علمائے اسلام نے منطق کو خوب استعمال کیا ہے، اس علم کی طرح جو عقل کے بنیادی اصول اور اس کے ضبط پر محاکمہ کرتے ہیں ۔علمائے اسلام نے علوم اسلامیہ سے مختلف علوم میں منطق کے خدمت لی ہے ۔مثلاً: علوم القرآن ،علوم الحدیث : علوم الفقہ ،اور خصوصاً اصول فقہ اور نحو میں، نیز تصوف اور عقائد میں، یہاں تک کہ ان علوم کا سہارا ہی منطق بن گئی، اور ان علوم کی رسی منطق ہی سے بندھ گئی ،لہٰذا جو منطق کا مطالعہ نہ کرے، اس میں مہارت حاصل نہ کرے، منطق اور قواعد منطق کو یاد نہ کرے وہ دیگر علوم کما حقہٗ حاصل نہیں کرسکتا۔

صاحب ابجد العلوم علم منطق کے گوشوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ متاخرین علمائے اسلام خصوصاً ائمۂ اصول وبیان اور ائمۂ نحو خواہ اہلِ بیت میں سے ہو، یا ان کے علاوہ انہوں نے اپنی کتابوں میں قواعد منطقیہ کا بہ کثرت استعمال کیا ہے مذکورہ فنون میں بھی اور دیگر فنون میں بھی اور فرمایا منطق کی وہ کتابیں جس کو ہمارے زمانہ میں طلباء عظام پڑھتے ہیں ۔علمائے اسلام نے ان کومزین کیا اور متقدمین کے اقوال میں جو کجیاں تھیں اس کو دور کرادیا گیا، لہٰذا آپ کو اس میں صرف عمدہ بحثیں اور اچھی اچھی مثالیں ملیں گی ،اس کے ذریعہ علوم کی گہرائی میں مدد لے سکتے ہیں اس کے ذریعہ عبارات کے پیچیدگی اور اختصار کو حل کیا جاسکتا ہے ۔چناں چہ اگر کوئی اپنے آپ کو منطق کو حاصل کرنے سے محروم رکھے تو سمجھ لیجئے کہ محققین کے درمیان رہنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں، اگر آپ بہت جلد علوم میں پختگی حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو عمدہ نحو اور منطق کو لازم پکڑلو، کیوں کہ یہ منطق عقل کی استعدادِ فکری کو تقویت دیتی ہے اور نحو عبارات بیانی کی زبان کو درست کرتا ہے۔

اور وہ حقیقت جہاں تک علوم منطق کو نظرِ انصاف سے دیکھنے والے شخص کی رسائی ہوئی ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض اکابر علما نے فرمایا ہے کہ علم منطق اس تلوار کی طرح ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے اور کوئی دوسرا ڈاکہ زنی کرتا ہے ۔اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارا یہ کلام جو علم منطق کے بارے میں ہے اس موجود صورت کو شامل نہیں ہے جسے مغربیت کے قائم ہونے کے بعد لکھا گیا جس میں جدید فلسفی نظریات پیش کئے گئے ان میں سے اکثر نظریات مادیت، وجودیت، اور لوہمیت کے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔

منطق کی مشہور قدیم کتابیں :

(۱) الردعلی المنطقین (ابن تیمیہ) (۲) کتاب النجاۃ (ابن سینا)

(۳) مقالات الاسلامیین (اشعری) (۴) التمہید للباقلانی

(۵) الإرشاد إلی قواطع الأدلۃ فی أصول الاعتقاد (جوینی)

(۶) الاقتصاد فی الاعتماد (غزالی) فیصل التفریقۃ بین الاسلامی الزندقۃ (غزالی)

(۷) فصل المقال فیما بین الحکمۃ و الشریعۃ من الاتصال (ابن رشد)

(مشہور کتابیں جنہیں علوم شرعیہ کے طلبا پڑھتے ہیں)

(۱) رسالۃ ایساغوجی (ابہری)　(۲) التہذیب للسعدی
(۳) الرسالۃ الشمسیۃ　(۴) نخبۃ الفکر
(۵) جامع الدقائق　(۶) عزۃ النجاق
(۷) تیسیر الفکر　(۸) بحر الفوائد
(۹) القواعد الجلیۃ　(۱۰) ناظر العین
(۱۱) المطالع　(۱۲) شرح تہذیب
(۱۳) ضیاء النجوم شرح سلم العلوم (علامہ ابراہیم بلیاوی)

اردو مصادر و مرجع:

تیسیر المنطق
التسہیل الترتیب فی حل شرح التہذیب　(قاری صدیق صاحب باندویؒ)
التحقیق المرضی علی الشرح المیبذی　(مولانا اسلام الحق)
میزان العلوم شرح سلم العلوم　(مولانا شکیل احمد صاحب)
مفتاح التہذیب　(مولانا سعید احمد پالنپوری)
نظرات شرح مرقات　(مولانا ابوالکلام وسیم عمری)
معین منطق　(مولانا محمود حسن اجمیری)
یسریٰ　(مولانا افضل الحق قاسمی)

عظمتِ قرآن

قرآن کریم مومنین کے لئے بہت بڑی نعمت ہے، اور یہ سب کتابوں سے افضل اور اشرف ہے، اس کی شرافت کے لئے یہی ایک خصوصیت کافی ہے کہ یہ اللہ کا مقدس کلام ہے، حدیث میں ہے "خَیْرُ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ"۔ **(مسلم شریف) یعنی اللہ کی کتاب (قرآن کریم) سب سے بہتر کلام ہے، اور رحمۃ للعالمین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، اور اس کی تعلیم آپ کے سپرد فرمایا گیا، ایک حدیث میں ہے** "فَضْلُ الْقُرْآنِ عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰہِ عَلٰی سَائِرِ خَلْقِہٖ"۔ **(ترمذی شریف) یعنی قرآن مجید**

کو دوسری کتابوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے خدا تعالیٰ کی فضیلت ساری مخلوق پر ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے "اَلْقُرْآنُ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ"۔ قرآن اللہ کے نزدیک آسمان اور زمین (اور جو کچھ ان میں ہے) سب سے زیادہ محبوب ہے۔

علم حساب، علم فرائض: ایک مطالعہ اور ایک جائزہ

مولانا رفیق احمد صاحب
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم حساب ظہورِ اسلام سے قبل موجود تھا، بل کہ یہ کہنا مناسب ہے کہ یہ بہت قدیم علم ہے، جیسا کہ بعض نقوش سے انکشاف ہوا، کہ کس طرح قدیم اہل مصر ۲۰۰۰ ق م حساب کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اہل بابل ویونان اور اہل ہند کی علم حساب سے واقفیت اور لگاؤ معروف ومشہور ہے۔

عہد اسلام میں اول ترین علمائے حساب:

دور اسلامی کی تاریخ کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی پہلے وہ عالم ہیں جنھوں نے تقریباً ۸۲۵ء میں حساب ہندی میں کتاب تالیف فرمائی اور اپنی کتاب میں جوڑ اور تقسیم کے قوانین وضع کیے۔ بعد ازاں ابو منصور عبد القاہر بن طاہر البغدادیؒ متوفی ۱۰۳۷ء نے اپنی کتاب "التکملہ" حساب میں ترتیب دی۔

حساب کے سلسلے میں:

شاید مذکور کتاب میں سے ہمارے لیے ایک کتاب کا تذکرہ رہ گیا (جس کی مصنفین اور علم حساب میں کام کرنے والوں کو ضرورت ہے) وہ دسویں صدی کے عالم ابو الوفا البوزجانیؒ کی کتاب ہے جسے مؤلف موصوف نے وطن کے ملازم پیشہ حضرات کو اجرائے حساب کے لیے صحیح قواعد سکھانے کی غرض سے تالیف فرمایا ہے۔

نیز ابو بکر بن حسن کرجیؒ متوفی ۱۰۱۹ء کی حساب کے موضوع پر کتاب "الکافی فی الحساب" بھی لائق ذکر ہے جس کی شرح محمد بن علی بن احمد شہر زوریؒ نے "الشرح الشافی لکتاب الکافی" میں فرمائی ہے۔ اسی طرح "احمد بن علی بن عمر بن صالح اربلیؒ" کی کتاب "الکافیۃ" کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

اہل عرب کے نزدیک حساب کے دو اقسام:

ڈاکٹر احمد سعید سلیمان اپنے مقالہ ''علم الحساب عند العرب'' جو مجلہ عالم الفکر جلد ثانی عدد اول ۱۹۷۱ء'' میں شائع شدہ ہے، تحریر فرماتے ہیں: نیز علم حساب کی وراثت، جو مسلمان کو اپنے آباء و اجداد سے حاصل ہوئی اس کی دو قسمیں تھیں نہ کہ ایک۔

۱۔عرب پہلی قسم کو حساب المنجمین ''نجومیوں کا حساب'' کہتے تھے، کیوں کہ اس کا استعمال فلکیات سے متعلق تھا اور اسے حساب الزیج، حساب الدرج والدقائق بھی کہتے تھے۔

۲۔رہی دوسری قسم تو اس کا نام بلا امتیاز علم الحساب تھا، لیکن جہاں امتیاز واقع ہوتا، اسے یا تو حساب الید یا ہوائی حساب یا حساب العقود یا حساب الروم والعرب کہتے تھے۔

قرآن کریم اور حساب:

بیشک ہم علم حساب کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، اور ہمیں معلوم ہے کہ قرآن کریم کا علم حساب کی معرفت اور اس میں وسعت پیدا کرنے میں کتنا اہم کردار رہا ہے۔ اللہ سبحانہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے: (وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا۔ (الاسراء: ۱۲)

ترجمہ: اور ہم نے رات اور دن دو نشانیاں بنایا، تو ہم نے رات کی نشانی کو تو دھندلا بنایا، اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن بنایا تا کہ دن کو تم اپنے رب کی روزی تلاش کرو اور تا کہ برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرلو، اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالی نے قرآن کریم میں حساب کی ایک اور مثال ذکر فرمائی ہے چناں چہ فرمایا کہ وہ شخص جس پر زمانہ حج میں دم واجب ہو اور وہ دم نہ دے سکے تو ''فمن لم يجد فصيام ثلاثة أيام في الحج و سبعة اذا رجعتم تلك عشرة كاملة ''۔(البقرہ۔۱۹۶)

ترجمہ: پھر جس شخص کو (قربانی کا جانور) میسر نہ تو (اس کے) ذمے تین دن کے روزے ہیں (ایام) حج میں اور سات ہیں جب کہ (حج سے) تمہارے لوٹنے کا وقت آجائے، یہ پورے دس ہوئے۔

علم حساب کی تعریف:

علمائے حساب کے مطابق ذیل میں حساب کی تعریف ذکر کی جاتی ہے:

بقول صدیق حسن قنوجی علم حساب کی تعریف ان کی کتاب ''ابجد العلوم'' میں یہ ہے کہ علم حساب وہ علم ہے، جس سے مخصوص معلوم اعداد کہ مدد سے نامعلوم اعداد نکالا جاتا ہے مثلا: جوڑ' گھٹانا' ضرب اور تقسیم کے ذریعہ نامعلوم

عدد معلوم ہوجاتا ہے۔

غرض و غایت:

علم حساب کی غرض وغایت معاملات کو محفوظ کرنا، اموال کی حفاظت قرض کی ادائیگی، میراث اور ترکہ کی تقسیم اور ٹیکس وغیرہ کے معاملات کا اندراج ہے، اور یہ علم علوم فلکیہ، سیاحت اور طب میں کارآمد ہے، بل کہ من جملہ تمام علوم میں محتاج الیہ ہے، نہ تو اس سے کوئی بادشاہ بے نیاز ہے، نہ ہی عالم اور نہ ہی عوام الناس اور اس علم کی بزرگی اور شرافت اللہ سبحانہ وتعالی کے درج ذیل اقوال سے دوچند ہوجاتی ہے فرمایا: "وکفی بنا حاسبین" (الانبیاء:۴۷) (اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں)۔ اور فرمایا: "ولتعلموا عدد السنین والحساب" (الاسراء:۱۲) (اور تاکہ برسوں کا حساب اور شمار معلوم کرلو)۔ اور فرمایا: "فاسئل العادین" (المومنون:۱۲) (تو پوچھ لے گنتی والوں سے)۔

اسی لیے اس فن میں لوگوں کی بہت سی تالیفات پائی جاتی ہیں، اور بچوں کو اس کی تعلیم کا سلسلہ عرصہ سے جاری وساری ہے۔

حکما کے نزدیک تعلیم میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس سے ابتدا کی جائے کیوں کہ یہ علم واضح اور اس کے دلائل منظم ہیں تو عام طور پر اس سے ایسی روشن عقل وجود میں آتی ہے، جو راست اور صواب کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور یہ مشہور ہے کہ جس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو حساب سیکھنے میں لگایا، اس پر سچائی غالب رہتی ہے، کیوں کہ حساب میں الفاظ و اعداد کی صحت کا خاص خیال رکھتے رکھتے وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے، اور وہ سچائی کا عادی بن کر اسے اپنا مسلک لازم شمار کرتا ہے۔

مسائل علم حساب:

ابن خلدونؒ اپنے "مقدمہ ابن خلدون" میں شرح فرماتے ہیں کہ اجرائے حساب کے لیے قواعد کلیہ جوڑ ضرب گھٹانا اور تقسیم ہیں، چناں چہ علم حساب کے متعلق فرماتے ہیں کہ اعداد کے حساب وکتاب میں جوڑ گھٹا کر اجراء حساب کا Prastical اظہار ہوتا ہے۔

جوڑ مفرد اعداد کے جمع کرنے کو کہتے ہیں، پھر ابن خلدون نے عروج کرتے ہوئے کسر کی تعریف فرمائی ہے کہ کسر کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک عدد کی نسبت دوسری طرف ہوتی ہے اور اس نسبت کا نام کسر کہلاتا ہے، ان کے کلام کی توضیح یہ ہے کہ ایک یہ نسبت دو کے نصف ہے چناں چہ نصف کو کسر کہا جائے گا۔

مسلمان قدیم زمانہ سے ہی تمام حسابات میں صحیح اعداد کی طرح کسر کے حساب کے ساتھ تعامل کو جانتے پہنچانتے آئے ہیں، ابن خلدونؒ فرماتے ہیں کہ صحیح عدد یا کسر میں جوڑ گھٹانا، ضرب تقسیم برابر حیثیت رکھتے ہیں۔

علمِ حساب کے مسائل طول طویل ہیں جو بہت سی خوبیوں اور چیستاؤں سے پر ہیں، جنہیں ان کے مقام میں

دیکھا جاسکتا ہے۔

علم حساب میں دورِ اسلامی کی سبقت:

علم حساب میں پہلے مسلمانوں نے ایک ایسے علم کی طرف سبقت کرکے درجۂ امتیاز حاصل کیا اور جس کا انکشاف میدانِ ترقی میں ایک عظیم فتح شمار کیا گیا وہ علم، علم الجبر اور علم المقابلہ ہے۔

علامہ قنوجیؒ نے اس کی یوں تعریف فرمائی ہے کہ وہ علم حساب کی فروعات میں سے ہے، کیوں کہ وہ ایسا علم ہے کہ مخصوص طریقے سے مخصوص معلومات کو ترتیب دے کر، نامعلوم اعداد کے استخراج کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

الجبر کا مطلب یہ ہے کہ جملہ معادلہ میں واقع کمی کو دوسرے جملہ میں استثناء کے ذریعہ زیادہ کردیا جائے تاکہ دونوں برابر ہوجائیں۔ اور مقابلہ کا مطلب یہ ہے کہ برابری قائم کرنے کے لیے دو جملوں میں سے ایک سے زائد کو ساقط کردیا جائے۔

ابن خلدونؒ نے فرمایا کہ اس فن میں سب سے پہلے ابوعبداللہ خوارزمی نے قلم اٹھایا، پھر ابوکامل شجاع بن اسلم، اور دیگر لوگوں نے ان کے نقش قدم کی پیروی کی اور ان کی کتاب ''مسائل الست'' اس موضوع پر بہترین کتاب ہے اور اہل اندلس نے اس کی متعدد عمدہ شروحات لکھی ہیں، اس کی عمدہ شروحات میں سے کتاب ''القرشی'' ہے اور مدینۃ العلوم میں فرمایا کہ اس فن میں مختصر کتابیں ابن خلوس ماردینی کی ''نصاب الجبر'' اور ابن المحلی الموصلی کی ''المفید'' ہے اور متوسط کتابوں میں طوسی کی کتاب ''الظفر'' اور مبسوط کتابوں میں ابن المحلی کی ''جامع الاصول'' ہے۔

علم میراث اور فرائض:

جب حقوق ومعاملات کی حفاظت اور قرض کی ادائیگی علم حساب کے چند فوائد میں سے ہے، تو بلا شرکت غیر مسلمانوں کا اس علم کے ساتھ ایسا دینی تعلق قائم ہوا کہ انہوں نے علم فرائض اور علم میراث حاصل کیا، تاکہ قواعد کے مطابق ورثائے میت میں میراث کو صحت کے ساتھ تقسیم کیا جاسکے، علم میراث وفرائض: کتاب وسنت، اجماع وقیاس سے مستنبط فقہی احکام سے ہم آہنگ ہے۔

بطورِ مثال غور کیجئے کہ کس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ورثاء کے حصے کون آیات میں تقسم فرمایا ہے ''یوصیکم اللہ فی أولادکم للذکر مثل حظ الانثیین، فإن کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ماترک، وإن کانت واحدۃ فلھا النصف، ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک ان کان لہ ولد، فإن لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث، فإن کان لہ اخوۃ فلامہ السدس۔۔۔ إلی آخر الآیۃ''۔ (سورۃ النساء:۱۱)۔۔۔ (اللہ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں، لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصہ کے برابر، اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زائد ہوں تو ان لڑکوں کو دو تہائی ملے گا، اس مال کا جو مورث چھوڑ کر مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا)۔

اور ماں باپ کے لیے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لیے میت کے ترکے سے چھٹا چھٹا حصہ ہے، اگر میت کے کچھ اولاد ہوں اور اگر میت کے کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے۔ اگر میت کے ایک سے زائد بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔۔۔ الخ۔

نفس موضوع کی دوسری آیت قرآن کریم میں مختلف مقامات پر موجود ہیں جن کا وراثت اور ترکۂ میت کی تقسیم سے واضح اور خصوصی تعلق ہے۔ اور جن کی وجہ سے مسلمان مجبور ہوئے کہ اس کے لیے کوئی خاص علم وضع کریں۔

ابن خلدون علم فرائض کے متعلق فرماتے ہے کہ یہ ایسا فن ہے جس سے میت کے ترکہ کو وارثین کے درمیان ان کے حصہ کے بقدر تقسیم کر دیا جاتا ہے جب کہ ورثہ چند ایک ہوں اور بعض کے فوت ہونے کی صورت میں ان کا حصہ موجودہ ورثہ کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے، یا فروض جمع ہو کر دو چند ہو جائیں اور پوری جائداد میں اختلاف واقع ہو یا بعض ورثہ کی طرف سے اقرار یا انکار کی صورت ہو تو ان تمام شکلوں میں ترکہ کے حصے متعین کرنے ہوں گے، تاکہ کسر کا عدد صحیح عدد میں بدل جائے اور ورثہ کے حصے ہر طرح سے درست ہو جائیں۔ اور یہ کہ ورثا کے حصے تمام ترکہ کے حصوں سے (جائداد میں) ان کے حصہ کے مطابق مل جائیں تو علم فرائض میں حساب کا ایک بہت بڑا حصہ صحیح اعداد، کسر اعداد، معلوم اعداد اور مجہول اعداد کا ہے چناں چہ یہ گراں قدر علم ہے۔

علم میراث کی کتابیں:

باب الفرائض والمواریث میں کتب فقہ کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے، جس میں علم فرائض کے قواعد کلیہ کی طرف اشارہ نہ ملتا ہو اور بعض فقہا نے تو اس کی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع پر علحدہ کتابیں تالیف فرماتی ہیں۔

علامہ قنوجی فرماتے ہیں کہ اس فن میں علما کی بہت سی تالیفات ہیں، جن میں مالکیہ کے نزدیک مشہور ترین کتابیں اندلس کے متاخرین علما میں سے کتاب ابن کثیر مختصر القاضی ابی القاسم الحوفی ثم الجعدی ہیں اور افریقا کے متاخرین علما میں سے جنھوں نے اس فن پر قلم اٹھایا، ابن المر الطرابلسی وغیرہ ہیں۔ رہے شوافع، احنافؒ اور حنابلہؒ تو ان کی تو اس موضع پر بے شمار کتابیں اور عظیم کارنامے ہیں، جن سے علم فقہ اور حساب میں ان کے علم کی گہرائی و گیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ سرتاجِ مدینہ، سرکارِ دو عالم پیغمبر اسلام، ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علم فرائض کے حفظ اور تعلیم و تعلم پر اپنے اس فرمانِ مبارک سے ابھارا اور حوصلہ افزائی فرمائی ہے: "تعلّموا الفرائض، و علموها الناس، فانها أول علم ينسى، و قال: و هي نصف العلم"۔ (رواہ الحاکم و ابن ماجہ عن ابی ہریرۃ)۔۔۔ (علم فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیوں کہ وہ سب سے پہلا علم ہے جو بھلا دیا جائے گا اور فرمایا کہ علم فرائض نصف علم ہے)۔

مصادرومراجع:

فہم الریاضی

علم جغرافیہ

توصیف خان غازی پوری
متعلم دورۂ حدیث جامعہ اکل کوا

فن جغرافیہ ایک فطری فن ہے ہر باشعور انسان کو کسی نہ کسی درجہ میں جغرافیہ کا علم ہوتا ہے، مثلاً ہر شخص کو اتنا علم تو ہوتا ہی ہے کہ وہ کس جگہ پیدا ہوا، اُس جگہ کا نام کیا ہے؟ وہاں آب وہوا کیسی ہے؟ وہاں ماحول کیسا ہے؟ لوگوں کا مزاج و مذاق کیا ہے؟ وہاں کی زمین کا رقبہ کیا ہے؟ زمین کیسی ہے؟ وہاں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں لوگوں کی معاشرتی زندگی کیا ہے وہاں ندی، نالے، پہاڑ وغیرہ کی تعداد کیا ہے بس یہی علم جغرافیہ کی حقیقت ہے اور اسی زاویہ سے پورے عالم کو جاننے کا نام جغرافیہ ہے۔

قدیم زمانہ میں جب یونانیوں مین علمی بیداری آئی اور وہ مختلف علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے علم جغرافیہ کو بھی اپنا مشغلہ بنایا۔

اہلِ یونان میں سب سے پہلے اس فکر کو لے کر اٹھنے والا مُجسطی ہے، بعد از اں بطلیموس قلوزی نے اس موضوع پر اپنی مشہور کتاب جغرافیہ تصنیف کی اور بالتفصیل اس زمانہ کے احوال بیان کئے، اس نے لکھا ہے کہ اس کے زمانے میں شہروں کی تعداد چار ہزار سے متجاوز تھی، اور ہر ہر شہر کا نام بھی بیان کیا ہے۔

پہاڑوں کی تعداد، ان میں پائے جانے والے قدرتی ذخائر، سمندروں، سمندری جانوروں، ان کے خواص اوران میں پائے جانے والے جزائر وغیرہ پر شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے؛ اسی طرح دنیا کے ممالک، ان کے باشندگان ان کے رنگ ونسل، اخلاق وعادات، اشیاءِ خوردونوش حتی کہ روزمرہ میں برتی جانے والی چیزوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

الغرض بطلیموس اس فن کا بانی ومبانی ہوا اور بعد کے مصنفین اس کے خوشہ چیں ہیں۔

علم جغرافیہ کی تجدید: عیسائیوں کی خود ساختہ طویل رہبانیت نے جب لوگوں کو جنگلوں صحراؤں اور پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا تو یکا یک ساری دنیا انجماد کا شکار ہوگئی اور ساری انسانیت مفلوج ہو کر رہ گئی۔

علوم وفنون کتابوں کی شکل میں یا تو کتب خانوں کی زینت بنے یا پھر سینوں میں دفن ہو کر رہ گئے تعلیم وتعلم

ممنوع قرار دیا گیا لیکن جب مسلمانوں کا دور آیا تو جہالت کی تاریکی چھٹ گئی، لوگ بالاخر بارعلم وادب کی طرف تعلیم وتعلم کی طرف متوجہ ہوئے، مامون کی دورِ حکومت میں علمائے عرب نے ان یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور از سرِ نو ان علوم پر محنت شروع کی اور تمام علوم کو زندہ کیا۔

مسلمان اور علم جغرافیہ: مسلمانوں نے علم جغرافیہ پر خاص توجہ کی اور جس واقعیت پسندی اور محققانہ بصیرت کے ساتھ اس علم پر محنت کی شاید بطلیموس قلوزی نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کو اس علم کی طرف ان آیات نے راغب کیا جن میں احوالِ عالم اور کوائف دنیا پر غور وفکر کرنے کی بار بار دعوت دی گئی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ تم روئے زمین پر چل پھر کر دیکھ لو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ (الانعام:۱۱)

اور ایک دوسری آیت میں اس مضمون کو انتہائی موکد انداز میں یوں بیان کیا: یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے کیوں نہیں (جس کا نتیجہ یہ ہوتا) کہ ان کے پاس دل ہے جس کے ذریعہ وہ سمجھتے یا کان سے ہی سن لیتے حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ ان دل اندھے ہوگئے ہیں جو ان کے سینوں میں ہیں۔ (الحج:۴۶)

اس جیسی سینکڑوں آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے احوالِ عالم پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔

علم جغرافیہ کے متقدمین مولفین

مشہور جغرافیہ دان یاقوت حموی نے علم جغرافیہ پر لکھی گئی کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں آباد شہروں اور مشہور ممالک کے احوال وکوائف سے بحث کی گئی ہے۔

(۲) بعض کتابیں وہ ہیں جن میں دیہاتوں اور صحراؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جغرافیہ دانوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے، جنہوں نے دنیا کے احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن اور معاشرے پر بھی کلام کیا ہے۔ ان میں ایک طبقہ یونانیوں کا ہے جن میں سرفہرست، افلاطون، فیثاغورس، بطلیموس وغیرہم ہیں جنہوں نے اس فن پر اپنی کتابوں کا نام جغرافیہ رکھا۔

اور دوسرا طبقہ اہل اسلام کا ہے جن میں سرفہرست: ابن خرداذبہ، احمد بن واضح الیعقوبی، ابن الفقیہ، ابوزید بلخی، ابواسحاق اصطخری، ابن حوقل، ابوعبداللہ بشاری، حسین بن محمد مہلبی، ابن ابی عون البغدادی، ابوعبید البکری۔

مسلمان جغرافیہ دانوں کی خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ: مسلمان جغرافیہ دانوں نے فن جغرافیہ پر متعدد کتابیں لکھیں ہیں، ان میں سے بعض کتابیں اس قدر بصیرت افروز ہیں کہ رہتی دنیا تک ان سے بے نیازی ممکن نہیں اور نہ ہی ان کی محنتوں اور کاوشوں کو کبھی فراموش کیا جاسکتا ہے، بطور مثال کے ہم دو کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

معجم البلدان: مسلمان مورخین میں یاقوت حموی کا نام نمایاں ہے، تاریخ کے باب میں ان کی مشہور تصنیف "معجم

البلدان" ہے۔ اس کتاب میں جہاں انہوں نے تاریخ اسلام پر روشنی ڈالی ہے، وہیں جغرافیہ سے متعلق بھی سیر حاصل بحث کی ہے، مذکورہ کتاب میں انہوں نے جغرافیہ سے متعلق پانچ ابواب قائم کئے ہیں۔

باب اول: اس باب میں ہیئت زمین کے متعلق متقدمین ومتاخرین کے اقوال کی تفصیلات کا بیان ہے، اسی طرح زمین کے طول وعرض، ضخامت وتعداد کی وضاحت نیز سمندروں، پہاڑوں اور ندیوں وغیرہ کی تفصیلات ہیں۔

باب ثانی: اس باب میں اقلیم کی لغوی واصطلاحی تعریف، اقلیم کی تحدید میں اہل جغرافیہ کے اختلافات اور ہفت اقلیم کی تفصیلات ہیں۔

باب ثالث: اس باب میں ان الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے، جن کا تعلق جغرافیہ سے ہے اور جغرافیہ دانی کے لئے ان الفاظ کا جاننا نہایت ضروری ہے۔

باب رابع: اس باب میں ان مفتوحہ علاقوں کی تفصیلات ہیں جن کو مسلمانوں نے بزور شمشیر یا بطور صلح کے فتح کیا تھا۔

باب خامس: اس باب میں ان شہروں کے وقائع کا بیان ہے جن کا ذکر کتاب میں بار بار آئے گا بعض مفید واقعات اور تاریخی لطائف کو بھی ذکر کیا گیا ہے، نیز لوگوں کے طبقات اور ممالک کے مراتب سے بھی بحث کی گئی ہے۔

مقدمہ ابن خلدون: مقدمہ ابن خلدون فن جغرافیہ پر لکھی گئی کتابوں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل کتاب ہے، علامہ ابن خلدون نے اپنی اس شہرآفاق کتاب میں فن جغرافیہ سے متعلق جن جن پہلوؤں سے بحث کی ہے، انہیں پڑھ کر عقلیں حیران رہ جاتی ہیں، علامہ موصوف کی اس تصنیف کے بعد سے اب تک ماحولیات، نفسیات اور علاقوں کی خصوصیات کے موضوع پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں، علامہ ابن خلدون نے اقالیم سبعہ کی تقسیم اور ان کے باشندوں کے رنگ ونسل، زبان وبیان، عادات وخصائل، مزاج ومذاق پر نہایت تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے، ساتھ ہی وہاں کے ماحول اور وہاں کے باشندوں پر اس کے اثرات کو واضح کیا ہے، اسی طرح پہاڑوں، ندیوں، اور زمین کی زرخیزی وشادابی اور پیداوار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

نیز تہذیب وتمدن، اخلاق وعادات اور علاقہ کی خصوصی امتیازات کو بھی واضح کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ حوادثِ زمانہ کے ساتھ شہروں کے نام بدل گئے آبادیاں بڑھ گئیں، تہذیب وتمدن میں تغیر ہوگیا، زبان بدل گئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری تبدیلیاں ایک عارضہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ممکن ہے کہ ہم مستقبل قریب میں اور بھی تبدیلیوں اور تغیرات سے دو چار ہوں، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم ان اسلاف کے کارناموں کے منکر ہوجائیں دیانت وامانت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر صاحب فضل کا فضل اس کی طرف لوٹایا جائے۔

مصادر و مراجع:

اسلامی جغرافیا (الیاس بھٹکلی)		جغرافیہ عالم (ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی)
جغرافیہ عالم اسلام (پروفیسر ماجد حسین)

الفلسفة
(فیہ مافیہ)

از حکیم فخر الاسلام الہ آبادی

حکمت یونانیاں اور حکمت ایمانیاں
حکمت ایمانیاں راہم بخواں

فلسفہ جسے حکمت بھی کہتے ہیں۔اس کی تعریف یہ ہے:

''موجودات واقعیہ کے احوال واقعیہ کا حسب طاقت بشری جاننا''

حکمت قرآن اور حکمت یونان:

حکمت کے بارے میں حکماء نے تو بیان کیا ہے'' العلم بحقائق الاشیاء علی ماھی علیہ بقدر الطاقة البشریة ''لیکن اس حکمت میں اور قرآن میں جس حکمت کا بیان ہے ان دونوں میں مصداق کے اعتبار سے فرق ہے'' قرآن میں تو اصالۃً ان اشیاء کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے، جن کو نجات وقرب میں دخل ہے، اور اس حکمت (وفلسفہ) میں مطلق اعیان خارجیہ سے بدوں قید مذکور بحث کی گئی ہے، تو اب حکمتیں دو ہوگئیں ایک وہ جس میں امور تشریعیہ سے بحث کی جاوے اور ایک وہ جس میں امور تکوینیہ سے بحث کی جاوے مثلاً فلسفہ، ریاضی، منطق، اقلیدس وغیرہ کہ سب حکمۃ تکوینیہ ہیں اور گو فلاسفہ بھی اپنی حکمت میں الٰہیات سے بحث کرتے ہیں اور اس کو علم اعلیٰ کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عقول وواجب کے ساتھ جس حکمت کا تعلق ہے وہ سب سے افضل ہے۔مگر ان کی بحث کی حیثیت وہ نہیں جو شریعت کی بحث کی ہے بل کہ دلائل صحیحہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ ان کے بعض مباحث خلاف حق بھی ہیں۔مثلاً عقول کا قائل ہونا، گو بعض نادانوں نے ان کی حمایت کی ہے کہ عقول کی تفسیر ملائکہ سے لے کر ان مباحث کو شریعت پر منطبق کیا

ہے، مگر واقع میں عقول کا ترجمہ ملائکہ سے کرنا خود بھی صحیح نہیں کیوں کہ شریعت نے ملائکہ کے لیے اجسام ہیں ان میں حرکت بھی ہے اور حکماء عقول کو مجرد اور منزہ عن الحرکۃ مانتے ہیں تو دونوں کی حقیقت متحد کیسے ہوئی۔ البتہ عقول کی نفی سے مطلق مجردات کے استحالہ کا حکم صحیح نہیں جیسا بعض نے کہا ہے کیوں کہ بکثرت صوفیہ نے بھی روح اور قلب اور لطائف کو مانا ہے اور ان کے نزدیک عالم امر عالم مجرد کو کہتے ہیں گو بعض متکلمین نے اس شخص کی تکفیر کی ہے جو ان کے تجرد کا قائل ہے کیوں کہ ان کے نزدیک یہ مقدمہ مسلمہ ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے اور ظاہر ہے کہ اخص صفات باری میں کسی کو شریک ماننا محض کفر ہے۔ مگر صوفیہ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے بل کہ اخص صفات حکماء کے نزدیک تو صرف وجوب بالذات ہے اور اہل حق کے نزدیک وجوب بالذات کی طرح قدم بھی اخص صفات میں سے ہے بل کہ وجوب بالذات اور قدم دونوں متلازم ہیں اور یہ جو فلاسفہ کہتے ہیں کہ قدم کی دو قسمیں ہیں، قدم بالذات اور قدم بالزمان اور قدم بالزمان کو واجب کے ساتھ خاص نہیں کہتے تو میں کہتا ہوں کہ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ قدم بالزمان ممکن کے لیے کوئی چیز نہیں اسی لیے تو کہتا ہوں ممکن چیز قدیم بالزمان بھی نہیں۔ بہر حال حکماء بھی اس کے قائل ہیں کہ جس حکمت کا تعلق واجب کی ذات وصفات واحکام سے ہے وہ سب سے افضل ہے، مگر واقع میں وہ حقائق صحیحہ تک نہیں پہنچے، اس لیے ان کی حکمت کو حکمت الٰہیہ کہنا بھی صحیح نہیں۔ اسی طرح گو انہوں نے اپنے یہاں اخلاق سے بھی بحث کی ہے مگر شریعت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ شریعت مصطفویہ نے علم اخلاق کی حاجت کو پورا کر دیا اور اس کی بحث سے ہم کو مستغنی کر دیا۔ بہر حال انہوں نے تکوین کے احکام وآثار بیان کیے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر مادیات کے متعلق اور اس میں بھی بہت غلطیاں کی ہیں اور تشریعیات میں تو حکماء بالکل چل ہی نہیں سکے، کیوں کہ اس کا تعلق وحی سے ہے اور وہ اس کے اتباع سے محروم ہیں۔ غرض یہ حاصل تھا حکمت کا جو بقدر ضرورت بیان کیا گیا۔ (حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، اشرف التفاسیر)

فلسفہ: جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ چیزوں کے صحیح حالات کا انسانی کوشش کی حد تک جاننا حکمت کہلاتا ہے، اسی کو فلسفہ بھی کہتے ہیں۔ فلسفہ کے لغوی معنی حب العقل کے ہیں۔ اس طرح فلسفی کے معنی محب العقل (عقل سے محبت رکھنے والا) فلسفی چوں کہ عقلی دلائل سے بحث کرتا ہے، اس لیے اسے فلسفی کہتے ہیں۔ فلسفہ یا حکمت کی اقسام درج ذیل ہیں:

حکمت کی دو قسمیں ہیں: (۱) حکمت عملی (۲) حکمت نظری

(۱) حکمت عملی: ان موجودات کا علم جن کا وجود انسانی قدرت و اختیار میں ہو جیسے انسانی افعال واعمال۔ حکمت عملی کی درج ذیل تین اقسام ہیں:

(۱) تہذیب الاخلاق: ان باتوں کا علم جن کا تعلق ذاتی اور انفرادی اصلاح سے ہو۔

(۲) تدبیر المنزل: ان باتوں کا علم جن کا تعلق گھر کے افراد کی اصلاح اور درستگی سے ہو۔

(۳) سیاستِ مدنیہ: ان باتوں کا علم جن کا تعلق آبادی، گاؤں، شہر یا ملک کی فلاح و بہبود سے ہو۔

(۲) حکمت نظری: ان موجودات کا علم جن کا وجود انسانی قدرت واختیار میں نہ ہو جیسے [illegible] وغیرہ۔

حکمت طبعی: ایسی چیزوں کا علم جو ذہنی اور خارجی دونوں حالتوں میں اپنے پائے جانے کے لیے مادہ کی محتاج ہوں جیسے انسان، حیوان اس کو علم ادنیٰ بھی کہتے ہیں۔

حکمت ریاضی: ایسی چیزوں کا علم جو خارجی وجود میں مادہ کی محتاج ہوں لیکن ذہنی اعتبار سے پائے جانے کے لیے مادہ کی محتاج نہ ہوں اس کو علم اوسط یا حکمت تعلیمی بھی کہتے ہیں جیسے دائرہ، مثلث مربع، وغیرہ۔

حکمتِ الٰہی: ایسی چیزوں کا علم ہے جو ذہنی اور خارجی وجود میں مادہ کی محتاج نہ ہو، اس کو علم اعلیٰ، علم کلی، اور علم مابعد الطبیعۃ بھی کہتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ فرشتے اور قیامت کا علم۔

حکمت طبعیہ کی اقسام: حکمت طبعی کی آٹھ اصولی اور سات فروعی قسمیں ہیں:

(۱) سماع الطبعی وسمع الکیان: اس علم میں جسم طبعی کے عام حالات سے بحث کی جاتی ہے۔

(۲) علم السماء والعالم: اس فن میں اجسام بسیطہ سے بحث کی جاتی ہے۔

(۳) کتاب الکون والفساد: اس کتاب میں اجسام کے کون وفساد، ان کی پیدائش اور زمین پر شعاعوں کا اثر اور ان شعاعوں کی وجہ سے نشوونما اور حیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۴) کتاب الآثار العلویہ: اس فن میں فضا کی کائنات مثلاً دھواں اور رقص مرکبات سے بحث ہے۔

(۵) کتاب المعدنیات: اس کتاب میں جمارات کی معلومات، ان کی بحث وتحقیق شامل ہوتی ہے۔

(۶) علم النباتات:

(۷) علم الحیوانات:

(۸) علم النفس: اس میں مباحث نفس اور اس کے قوی مدرکہ محرکہ شامل ہوتے ہیں۔

حکمت طبعی کی یہ آٹھ قسمیں اصولی ہے۔ فروعی اقسام حکمت طبعی کی درج ذیل ہیں۔

(۱) علم طب

(۲) علم نجوم: اس علم میں ستاروں کی وضع واشکال اور ان کے برجوں میں واقع ہونے کے متعلق تحقیق شامل ہوتی ہے۔

(۳) علم فراست: انسان کی صورت وشکل سے اس کی سیرت واخلاق کا پتہ لگانا یعنی ظاہر سے باطن کا علم حاصل کرنا ”علم فراست“ کہلاتا ہے۔

(۴) علم تعبیر: خواب کی تعبیر متعین کرنا اس طور پر کہ خواب اور عالم واقعہ پر پیش آنے والے امر کے مابین مناسبت خفی دریافت کی جائے۔

(۵) علم الطلسمات: آسمانی قوتوں کا زمین کی بعض قوتوں کے ساتھ امتزاج کی تحقیق کرنا جس کے ذریعہ عالم

میں رونما ہوجانے والے عجیب وغریب واقعہ کا مشاہدہ کیا جاسکے۔

(۶) علم نیرنجات (فن شعبدہ بازی): زمین کی بعض قوتوں کی دوسری بعض قوتوں کے ساتھ اس طرح آمیزش کرتے ہیں کہ عجیب وغریب اشیاء ظہور پذیر ہوسکیں۔

(۷) علم الکیمیاء: معدنیات کے خواص سلب کرنے، دوسرے خواص پیدا کرنے اور ان کا ترتیب وار مطالعہ وتحقیق اس علم کا بنیادی موضوع ہے۔

حکمت کی اقسام اور اس کے مباحث کی وسعتوں کی فہرست طویل ہے، یہ نہایت مجمل فہرست پیش کی گئی لیکن حکمت کے تمام مباحث میں سب سے اہم موضوع خود انسان کی اپنی ذات ہے اور یہ کہ کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی اور اس کا انجام کیا ہے؟ اس اہم ترین موضوع انسان اور کائنات کی ماہیت انجام اور مقصد کی جستجو میں سننے کی بات یہ ہے کہ محض فلسفہ کی مدد سے تو کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، کیوں کہ وحی الٰہی اور آسمانی ہدایت کے بغیر انہوں نے عقدہ کو کھولنا چاہا۔

انسان اور کائنات کی ماہیت، انجام ومقصد کی تلاش میں حکماء کی بے بسی

حکمت عملی خصوصاً تہذیب اخلاق کے باب میں تو حکماء کا خود اعتراف ہے کہ شریعت مصطفویہ نے علم اخلاق کی حاجت کو پورا کردیا، لیکن آسمانی ہدایات سے آزادرہ کر محض عقلی بنیاد پر کائنات کے احکام وآثار اور اسباب وتوجیہات جو انہوں نے بیان کی ہیں ان میں بھی سخت غلطیاں کی ہیں۔ کیوں کہ اپنے یا کائنات کے آغاز وانجام، حقیقت وماہیت کے بارے میں جتنے سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں، خالص عقل واستدلال نے ان کے بارے میں کبھی اذعان واطمینان نہیں بخشا۔

”قدیم فلسفہ کا یونان میں طالیس ملطی (متوفی ۵۵۰ق م) سے آغاز ہوا اور صرف ۵۰ سال کے بعد ہر قلیتوس (۵۰۰ق م) کے زمانہ سے ہی یہ اعتراف کرلیا گیا کہ ”انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے“۔

یہی وجہ تھی کہ اپنے عقل وفلسفہ کی بنیاد پر یہ فلاسفہ حقائق عالم کی دریافت میں جتنا آگے بڑھتے گئے اتنا ہی علم ویقین کی جگہ شک وریب کا سلسلہ بھی بڑھتا گیا، اور دیمقراطیس تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ”کوئی بات سچ نہیں اگر سچ ہے تو ہم کو معلوم نہیں“ اور سوفسطائیہ (۴۴۰ق م) نے تو اپنے فلسفہ کی بنیاد ہی لاعلمی پر رکھی۔

گورجیاس نے سرے سے چیزوں کے موجود ہونے ہی کا انکار کردیا اور کہا کہ اگر موجود بھی ہوں تو معلوم نہیں ہوسکتیں اور معلوم ہوں تو دوسروں کو معلوم نہیں کرائی جاسکتیں“۔

سقراط کے نامور شاگرد فلاطون نے اپنے مکالمات میں ہر طرح کی باہم متعارض ومتناقض باتیں جمع کردی ہیں کہ سوچ کر پڑھنے والے کو ”کچھ نہ ملے علم میں حیرت کے سوا“ اور اس کے بارے میں تو یہ بھی خیال ہے کہ وہ دراصل خود متحیر تھا، کسی علم ویقین تک نہیں پہنچا تھا“۔ ارسطو فلسفی سے زیادہ حکیم (Scien tist) تھا اس کے زمانہ میں تاریخ فلسفہ کے سب سے مشہور ارتیابی ”پرہو“ نے ارتیابیت اور شک کو اپنی اس انتہا پر پہنچا دیا کہ ”ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ نہیں

جانتے" اس کے بعد سچ یہ ہے کہ یونانی میں فلسفہ مابعد الطبیعات (Metaphisics) کا خاتمہ ہو گیا۔

مابعد الطبعیات سے اس مایوسی کے بعد فلسفہ نے یا تو اخلاقیات کی راہ اختیار کی یا پھر اسکندریہ میں نوفلاطونیت تک پہنچ کر مذہب کے زیر اثر وحی والہام کے دامن میں پناہ پکڑی۔ اور صاف اعلان کیا کہ

"ہم کو حصول صداقت سے مایوس ہو جانا چاہیے بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہ راست خود اسی ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے یعنی خدا کی طرف سے"۔

اس طرح قدیم فلسفہ کا تو خیر خاتمہ ہی شک پر ہوا لیکن جدید نے جنم ہی شک کے پیٹ سے لیا اور ڈیکارٹ ہر ہر شئ کو قابل شک قرار دے کر صرف "میں ہوں" کے ایک نقطہ یقین پر ٹھہر سکا اور پھر اس آخری نقطہ یقین کو بھی اتنا گم کرا دیا یا کم از کم اتنا موہوم کرا دیا کہ یہ بھی مفہوم نہ ہو سکے کہ "میں کیا ہوں"۔ اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل بدل کر کھلے یا چھپے طور پر اقرار جہل کی تاریخ بن کر رہ گئی۔ لاکؔ کے ہاں یہ اقرار حسیت کے نقاب میں ہے اور برکلے کے ہاں ادعائے تصوریت کے۔

ساری تاریخ فلسفہ بڑھ جاؤ تو پاؤ گے کہ انسان نے حقیقت جوئی کی راہ میں جو کچھ تھوڑا بہت اپنے نزدیک پایا تھا وہ یہی مادہ یا روح میں سے کوئی ایک یا دونوں ہستی کا وہ راز ہیں جس کی جستجو میں ہم ہزاروں سال سے سرگرداں ہیں۔ ان دو میں بھی ڈیکارٹؔ کے ہمہ گیر بے پناہ شک نے جس ایک کو یقین کی آخری چٹان سمجھا تھا ہومؔ نے اس کو بھی موہوم و متزلزل کر دیا اور پھر یہ باور کرایا گیا کہ مادہ کی طرح نفس، روح، ذات یا انا کا مستقل بالذات وجود بھی محض ہمارے متخیلہ کا ایک افسانہ ہے"۔ (مولانا عبدالباری ندوی "فہم انسانی" ترجمہ "ہیومن انڈر اسٹینڈنگ" از ڈیوڈ ہیوم: ۱۱-۱۲)

تاریخ میں اس طرز فکر کا ایک با قاعدہ فرقہ رہ چکا ہے جسے "لاادریہ" کہتے ہیں۔ لاادریہ وہ گروہ ہے جو نہ حقائق اشیاء کے ثبوت کو مانتا ہے اور نہ لاثبوت کو اسے ہر چیز میں شک ہے، یہاں تک کہ شک میں بھی شک ہے۔

یہ گروہ دراصل سوفسطائیہ کی ایک شاخ ہے۔ سوفسطائی حقائق ثابتہ تک رسائی کو ناممکن کہتے ہیں۔ سوفسطائیہ کی دوسری شاخیں "عنادیہ" اور "عندیہ" ہیں۔

عنادیہ تو سرے سے حقائق اشیاء کے منکر ہیں۔ ان کے خیال میں تمام موجودات خارجیہ نقش بر آب کی طرح اوہام وخیالات ہیں۔ نفس الامر میں ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔

اور عندیہ وہ گروہ ہے جو حقائق اشیاء کو خیال اور اعتقاد کے تابع مانتا ہے۔ یعنی جس چیز کو جیسی سمجھ لیا جائے بس وہ ویسی ہی ہے۔ اگر کسی چیز کو جوہر مان لیا جائے تو وہ جوہر ہے۔ عرض مان لیا جائے تو عرض ہے۔ قدیم مان لیا جائے تو قدیم ہے، حادث مان لیا جائے تو حادث ہے۔

چند مشہور حکماء یونان

یونان میں اسقلی بوس سے لے کر جالینوس تک آٹھ بڑے فلاسفہ پیدا ہوئے یہ اپنے وقت میں مل کہ بعد کے

ادوار میں بھی بڑے حکماء اور اطباء تسلیم کئے گئے۔

(۱) اسقلی بوس　(۲) غورس　(۳) مینس　(۴) برمانیدس

(۵) افلاطن الطبیب　(۶) اسقلی بوس دوم　(۷) بقراط　(۸) جالینوس

لیکن فلاسفہ یونان میں جن فلاسفہ کو خاص طور سے شہرت حاصل ہوئی ان مشہور فلاسفہ کا مختصر تذکرہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱) فیثاغورس (۵۸۲ تا ۳۹۹ قبل مسیح) فلاسفہ کے نزدیک اس کا بڑا مقام ہے وہ اس کو مضبوط رائے اور سنجیدہ ذہن والا قرار دیتے تھے۔یہ زمین کو ساکن نہیں بل کہ متحرک مانتا تھا اور مرکزیت شمس کا قائل تھا۔

(۲) سقراط (۴۶۹ تا ۳۹۹ قبل مسیح) فیثاغورس کا شاگرد تھا۔فلسفہ کی اقسام میں سے الٰہیت واخلاقیات سے بحث کرتا تھا اور زیادہ تر ریاضت میں مشغول رہتا تھا۔ستر سال کی عمر میں اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ یہ یونانی خداؤں کو نہیں مانتا۔نئے خدا کی طرف دعوت دیتا ہے (غالباً توحید کا قائل تھا) چنانچہ جج نے اس کو ہلاک کرنے کا فیصلہ دیا، اور اس زمانہ کے دستور کے مطابق سقراط کو مجرم کی حیثیت سے زہر ہلاہل کا پیالہ پلایا گیا جس سے اس کا انتقال ہوگیا۔

(۳) افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷ قبل مسیح) اس حکیم کو افلاطون الٰہی (اللہ والا افلاطون) بھی کہتے ہیں۔ایتھنز کا باشندہ اور سقراط کا شاگرد تھا۔افلاطون نے ایتھنز میں ایک اکیڈمی قائم کی تھی جس میں ریاضت اور فلسفہ کی تعلیم آخر دم تک دیتا رہا۔افلاطون نے پچاس سال تک اس اکاڈمی (بیت الحکمت) میں حکمت کی تعلیم دی ہے۔

(۴) دیمقراطیس (۴۶۰ تا ۳۷۰ قبل مسیح) یونان کا مشہور حکیم ہے۔اس کا نظریہ یہ تھا کہ اجسام عنصریہ ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہیں جن کی ماہیت ایک ہے۔البتہ ان کا وزن مختلف ہے اور ان کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔

یہ ذرے حواس ظاہرہ سے محسوس نہیں کئے جاسکتے۔نہ ان کو کسی طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے، نابود بھی نہیں کیا جاسکتا۔ہمیشہ متحرک رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے چپکے رہتے ہیں اور ان کے مجموعہ سے اجسام کی ہیئت کذائی وجود میں آتی ہے۔یہی ذرات اجزاء لایجزی ہیں جن کے متکلمین قائل ہیں البتہ متکلمین کے نزدیک یہ اجزاء فناپذیر ہیں۔فلاسفہ ان کو قدیم بتلاتے ہیں اور ایسا جز جس کا مزید تجزیہ نہ ہوسکے، (جزلاتجزی) کو محال بتلاتے ہیں۔

(۵) بقراط (۴۶۰ تا ۳۶۳ قبل مسیح) پہلا شخص ہے جس نے طب کو علم اور فلسفہ سے مربوط کیا طب کو خاندانی حصار سے نکالا اور ہر اہل فرد کے لیے طب کا باب واشگاف کردیا، اس کو ابوالطب (Father of medicine) کہا جاتا ہے۔اوپر جن آٹھ حکماء کا ذکر کیا گیا، بقراط کو ان میں سب سے اہم مقام حاصل ہے نظریہ اخلاط کا بانی یہی شخص ہے۔اس کا کہنا ہے کہ اخلاط کی بے اعتدالی سے مرض پیدا ہوتا ہے اور اخلاط کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے صفراوی مزاج غصہ ور اور بلغمی مزاج غبی ہوتا ہے۔

(۶) ارسطو: (۳۸۴ تا ۳۲۲ قبل مسیح) ارسطو کو ارسطا طالیس بھی کہتے ہیں۔ان کا لقب معلم اول ہے کیوں کہ اس نے حکماء متقدمین کے کلام سے مستنبط کر کے علم منطق مرتب کیا۔ارسطو، افلاطون کا شاگرد اور سکندر اعظم کا استاذ ہے،فلسفہ اور ہیئت کا خاص طور سے ماہر تھا۔

(۷) جالینوس (۱۳۰ تا ۲۰۰ء) جالینوس نے طب کو فلسفہ کی بنیاد پر پروان چڑھایا۔جالینوس کی تشریحی معلومات اہم ہیں اَسّی سے زائد مصنفات پر مشتمل اس کی کتابوں میں کتاب المزاج۔کتاب القوی الطبیعیہ،کتاب فی الحرکۃ المتصلہ جیسی کتب شامل ہیں۔

مسلمان فلاسفہ

ابوالنصر محمد بن فارابی (۲۶۰ تا ۳۳۹): ترکستان کے علاقہ فاراب کا رہنے والا تھا ابتدائی زندگی غربت اور تنگ دستی میں گزری جس کے باعث باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکا، کسی باغ کا ملازم ہوگیا۔مطالعہ کا شائق تھا۔روشنی کے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے کی روشنی میں مطالعہ کیا کرتا تھا۔فلسفہ سے دلچسپی کا سبب یہ ہوا کہ ارسطو کی تصنیف کوئی اس کے پاس رکھ گیا اس نے مطالعہ کیا، دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کی تحصیل میں لگا، بغداد میں ایک عیسائی سے درس لیا، نحو کی تعلیم ابن سراج سے حاصل کی فلسفہ کے علاوہ زبان دانی کا بڑا شوق تھا۔کہا جاتا ہے کہ ستر ۷۰ / زبان کا ماہر تھا۔

مسلمان فلاسفہ کا بادشاہ اور یونانی فلسفہ کے مترجمین کا سرخیل ہے۔ارسطو کی کتب منطقیہ کی شرح کی۔معلم ثانی اس کا لقب ہے،تقریباً ۱۰۰ / کتابوں کا مصنف ہے۔

ابن الہیثم المعروف بہ الحزیں (۳۵۴ھ تا ۴۳۰ھ): طبیعات کا سب سے بڑا ماہر بصریات کا سب سے بڑا ماہر و محقق،"معاش کے لیے ایک جلد اقلیدس اور ایک جلد مجسطی کی لکھتا تھا اور اس کو بیچ کر اس کی آمدنی سے گزر اوقات کیا کرتا تا دم مرگ اس کا یہی طریقہ رہا اور کبھی کسی مدد کا خواہاں نہیں ہوا"۔ریاضی طب اور قدیم فلاسفہ کے علوم پر اسے کامل دسترس حاصل تھی۔علم ہیئت میں اسے بطلیموس ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ہیئت، طبیعات، فلسفہ اور طب پر دو سو سے زیادہ کتابیں ہیں۔

بوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا (۷۳۹ تا ۱۰۰۶ء): بخارا کے کسی گاؤں میں ولادت ہوئی، ہمدان میں وفات پائی، مسلمان فلسفیوں کا ایک عظیم نام، لقب شیخ الرئیس، بڑا صاحب قلم تھا، طب میں "القانون فی الطب"، فلسفہ میں "الشفا" علوم عقلیہ میں "الاشارات" جیسی کتابیں اس کا غیر معمولی کارنامہ ہیں۔

"امام غزالی" "ابو حامد الغزالی" (۴۵۰۔۵۰۵ھ): متکلمین اسلام میں بلند پایہ فلسفی تھے۔فلاسفہ کے ان امور کا جو عقائد اسلام کے خلاف تھے دلائل سے رد کیا۔طوس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور فلسفہ فارابی و بوعلی سینا کی رد و اصلاح میں رسائل تالیف کئے، پھر تصوف اور سلوک کی جانب متوجہ ہوئے۔ریاضت اور مجاہدہ میں ایسے لگے کہ امام

المتصوفین کہلائے۔ "احیاء العلوم"۔ "تہافت الفلاسفہ" اور "مقاصد الفلاسفہ" آپ کی بہترین تصنیفات ہیں۔

ابن رشد (۵۲۰ھ تا ۵۹۵ھ): ابوالولید محمد بن احمد بن رشد اندلس کے شہر قرطبہ کا رہنے والا تھا علم توحید، فقہ، فلسفہ، حکمت و ریاضت میں اسے بے مثل سمجھا جاتا تھا۔ الٰہیات میں آزاد، متفرد رائے تھا، تلخیص کتاب مابعد الطبیعہ، مقالۃ فی العقل، مقالۃ فی حرکۃ الفلک وغیرہ کتابیں اس کی اہم تصنیفات ہیں۔ ابن رشد کا فلسفہ یورپ میں بہت عام ہوا۔ وہاں پر "رشدی" فلسفی کا مترادف تھا۔ عیسائی دنیا کا سب سے بڑا دینی مفکر سینٹ ٹامس اکویناس ابن رشد کا خوشہ چین تھا۔

(جدیدیت کا تنقیدی تناظر از اشتیاق احمد ص ۷۰-۷۱)

امام رازی (۵۴۴ تا ۶۰۶ھ): علامہ فخر الدین محمد بن عمر رازی مشہور مفسر اور متکلم تفسیر کبیر اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ عقلیات، نقلیات اور گذشتہ لوگوں کے علوم میں یگانہ روزگار ہیں۔

علامہ خوشجی: علاؤ الدین علی بن محمد حکمت، منطق، ریاضی میں خاص مقام رکھتے تھے "شرح تجرید" ان کی شاہکار تالیف ہے۔

صدر الدین شیرازی (وفات ۱۰۵۰): ملا صدرا کے نام سے مشہور، نیک، عابد، زاہد، سات مرتبہ پیدل حج کیا، حکمت و فلسفہ میں نہایت بصیرت رکھتے تھے، "صدرا" ان کی فلسفہ کی مشہور کتاب ہے۔

اثیر الدین ابہری (۷۰۰ھ): متن میبذی، ہدایت الحکمت کے مؤلف، معقولات میں ید طولی رکھتے تھے۔ "ہدایت الحکمت" اور "ایساغوجی" ان کی یادگار تصنیف ہیں۔

جلال الدین دوانی: محقق ملا دوانی حکمت و فلسفہ میں یکتائے روزگار، علوم عقلیہ میں ایسی مہارت اور شہرہ حاصل تھا کہ روم خراسان، ماوراء النہر سے طالبین آتے تھے؛ منطق، فلسفہ، ہیئت میں مستقل تالیفات ہونے کے علاوہ کتب معقولات پر حواشی و شروح بکثرت تحریر کئے۔

قطب الدین شیرازی: عابد زاہد صاحب معرفت تھے۔ حکمت، ہیئت پر اہم تالیفات ہیں، شرح حکمت الاشراق ان کی اہم تالیف ہے۔

فلاسفۂ ہند

ملا نظام الدین (وفات ۱۱۶۱ھ): معقولات کے بہترین عالم۔ برصغیر کا اکثر علمی سلسلہ ان تک منتہی ہوتا ہے۔

ملا محب اللہ (وفات ۱۱۹۰ھ): مسلم الثبوت، الجوہر الفرد اور سلم العلوم آپ کی یادگار تصانیف ہیں۔

ملا حسن (وفات ۱۲۰۹ھ): ملا نظام الدین کے شاگرد ہیں۔ شرح سلم المعروف بہ ملا حسن ان کی بہترین یادگار ہے۔

حکیم محمد شریف خاں (۱۱۲۸ تا ۱۲۲۲ھ): ہندوستان میں طب کے طریقہ تعلیم میں دو اہم مکتبہ فکر ہیں: (۱)

خاندان عزیزی لکھنؤ۔ (۲) خاندان شریفی دہلی۔ خاندان عزیزی فکر کے حامل اور الاخریٰ ۱۲۳۲ھ مطابق سے متاثر افراد مطب ونسخہ نویسی میں بذریعہ مفردات علاج کو ترجیح دیتے ہیں جب کہ خاندان شریفی کا طرز مطب مرکبات کے ذریعہ علاج کرنے کا ہے۔ خاندان شریفی آپ ہی کے نام کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے گھر پر ہوئی، علاج ومعالجہ میں مرجع خلائق تھے۔ شاہی طبیب بھی مقرر کئے گئے اور اشرف الحکماء کا لقب بھی دیا گیا۔ ''اپنے عصر میں سرآمد حکماء اور سرحلقہ اطباء تھے۔ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ ازبس بلند ہے، جالینوس اور ارسطو کا فلسفہ ان کے سامنے ایسا ہے جیسے طوطی کی آواز نقار خانہ میں۔ (بحوالہ آثار الصنادید: ۴۰۱، از سر سید احمد خاں)

ملا بحر العلوم (وفات ۱۲۳۵ھ): ملا نظام الدین کے فرزند معقولات پر اہم شروح وحواشی کے مؤلف۔

قاضی مبارک (۱۱۶۲ھ): معقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے، سلم کے مشہور شارح۔

ملا حمد اللہ (۱۱۱۶ھ): ملا نظام الدین کے شاگرد رشید، منطق وفلسفہ پر حواشی وشروح لکھے، معقولات کے ساتھ طب میں بھی درک حاصل تھا۔

ملا مبین (۱۲۲۵ھ): معقولات میں بڑی مہارت حاصل تھی، حاشیہ میر زاہد، حاشیہ ملا جلال اور شرح سلم المعروف بہ ملا مبین بطور خاص قابل ذکر تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔

فضل حق خیر آبادی: اودھ کے نواح خیر آباد کے مشہور علمی خانوادہ کے چشم وچراغ معقولات کی تعلیم اپنے والد فضل امام خیر آبادی سے حاصل کی، معقولات کی اہم کتابوں کی شروح وحواشی تالیف کی ''ہدیہ سعیدیہ'' جیسی تصانیف سے شہر پائی۔

علامہ ابراہیم بلیاوی: ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین معقولات ومنقولات کے جامع، ایک زمانہ تک احادیث اور کتب معقولات کا درس دیا۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان اور مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ سلم العلوم پر حاشیہ ''ضیاء النجوم'' آپ کی یادگار ہے۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب استاذ شاگرد کے آستانہ پر حاضر ہوا۔ صاحب ارشاد، عارف ومصلح بزرگ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے ساتھ اصلاحی تعلق قائم کیا اور بیعت ہوئے، کسر نفس اور فنائیت کا ایسا ثبوت ملنا ہی دشوار ہے۔

علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری (وفات ۱۳۸۹ھ): جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے فاضل اور اسی مادر علمی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ کے درس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ شرح جامی سلم العلوم ملا حسن قاضی مبارک اور میبذی وغیرہ تقریباً زبانی بے تکلف پڑھاتے تھے۔ (یادوں کے چراغ، ص ۸۱)

علامہ صدیق احمد صاحب کشمیری کے لائق تلامذہ کی فہرست طویل ہے ان کے تلامذہ میں دو بطور خاص قابل ذکر ہیں: ا۔ مولانا یامین صاحب جنہوں نے عرصہ ہائے دراز تک مظاہر علوم سہارنپور میں نحو ومعقولات کا درس دیا۔

سادگی، جفاکشی، فلسفہ اور قدیم طرزِ تعلیم سے شغف میں متقدمین کا نمونہ تھے۔

دوسرے مولانا صدیق احمد صاحب باندوی (۱۳۴۱ء ۱۹۲۳ھ تا ۱۹۹۷ء ۱۴۱۷ھ): شرح تہذیب، قطبی، سلم العلوم کا سالہا سال درس دیا۔ راقم الحروف نے شرح تہذیب اور قطبی تصدیقات اور شرح جامی حضرت مولانا سے پڑھی، مولانا کے ہی ایک صدیق ہم سبق عالی مرتبت مفتی عبدالقدوس رومی (۱۳۴۱ء ۱۹۲۳ھ)، مفتی شہر آگرہ مدظلہ ہیں، جن کی کئی درجن کتابیں شائع ہوچکی جو الحاوی فلسفہ، علم کلام، علم اصول، ذات وصفات باری تعالیٰ اور اصلاح افکار وعقائد کے باب میں ہیں۔ یادوں کے چراغ کے حوالہ سے جو مولانا صدیق احمد کشمیری کی معقولات میں مہارت ذکر کی گئی وہ مفتی صاحب کی ہی ''حیات ماضی'' سے ہے جس میں انہوں نے وہی لکھا ہے جو دیکھا ہے، موصوف ''دین واعتقاد کے معاملے میں تو تقلید یا تقلید جامد اور معقولیت میں خود اپنی ذاتی منطق ہی کے مطابق رہے''۔ (یادوں کے چراغ: ص/۸۷)

معقولات سے منقولات کی خدمت لینا اور محاسن شریعت کو مدلل و پر حکمت پیرایہ میں پیش کرنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا حصہ تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ البالغۃ جس کی شرح مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ نے رحمۃ اللہ الواسعۃ کے نام سے کردی۔ بے مثال کتاب ہے، استفادہ ازبس مفید ہے۔

اس آخری دور میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تصفیۃ العقائد کا مطالعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، یہ کتاب سرسید کے افکار اور ان کے اس جزیرہ کا جواب ہے جو انہوں نے اس شعر میں بطور اشارہ ظاہر کیا تھا۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ ودل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ سمجھادے کہ سمجھائیں گے کیا

حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا تھا۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

کتاب میں تقریباً ۲۵/مسائل ہیں جن پر سرسید کے تمام باطل نظریات اور فاسد افکار کی بنا ہے، مولانا نانوتوی امام الاصول ہیں، ان کے علوم کا تعارف بھی ہم جیسوں کے لیے مشکل ہے۔

مولانا نانوتوی کے علاوہ اس باب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تحقیقات وتصنیفات ازبس ضروری ہیں، ان سے مفر نہیں، شاید فلسفہ کی پوری تاریخ میں حکمت وفلسفہ کا اتنا صحیح استعمال کسی نے نہ کیا ہو جتنا حضرت مولانا تھانوی نے کیا، (یہ مولانا عبدالباری ندوی کی تعبیر ہے) اور علامہ ابراہیم بلیاوی حضرت حکیم الامتؒ کے لیے جامع الاصول والفروع کے الفاظ فرماتے تھے، تلخیص ہدایۃ الحکمۃ ودرایۃ العصمۃ، الانتباہات المفیدۃ ظہور العدم بنور القدم، تمہید الفرش فی تحدید العرش، عبور الزراری، تنزیہ علم الرحمن۔ تحقیق احکام روح، القطائف من اللطائف، البصائر فی الدوائر، الخصصۃ فی حکم الوسوسۃ، تصور حق بالکنہ ممتنع، التعرف فی تحقیق التصرف، سے استفادہ کرنا چاہئے۔

اس کے علاوہ مولانا عبدالباری ندوی ۱۸۸۸ء تا ۱۹۷۶ء کی کتاب فہم انسانی (ترجمہ اردو ہیومن انڈر

اسٹینڈنگ، از ڈیوڈ ہیوم) مذہب اور عقلیات۔ اور۔ مذہب اور سائنس، بہت [illegible] الحادی افکار کے لیے ڈھال کا درجہ رکھتی ہیں۔ قاری محمد طیب صاحب کی فلسفہ نماز، سائنس اور اسلام، دین کی بنیاد عقل صحیح پر، وغیرہ کتب ومضامین، مولانا شبیر احمد عثمانی کی العقل والنقل، اور مولانا ادریس صاحب کاندھلوی کی علم کلام پر کتابیں اور اسی طرح مولانا یوسف صاحب بنوریؒ کے مضامین خاص طور سے یتیمۃ البیان دورِ حاضر میں فلسفہ اور علم کلام پر یقیناً نافع ہیں، اور یہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد اور حدیث کے علاوہ فلسفہ اور طب میں بھی آپ سے مستفید ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیری کی فلسفہ میں مہارت مسلم ہے۔

فلاسفہ بنیادی طور پر نظر وفکر پر اعتماد کرتے ہیں اور مسائل عقلیہ کو دلائل سے ثابت کرتے ہیں لیکن پھر نفس وروح کی پاکیزگی، ایمان واعتقاد کے پیش نظر ان کے الگ الگ مکتب فکر ہیں۔

مکاتب فکر: فلاسفہ کے مکتب فکر چار ہیں (۱) مشائیہ (۲) اشراقیہ (۳) متکلمین (۴) صوفیہ۔

مشائیہ (مشائیں): خصوصیت اس طرز فکر کی یہ ہے کہ وہ غور وفکر اور استدلال پر اعتماد کرتے ہیں اور مسائل عقلیہ کو دلائل سے ثابت کرتے ہیں ارسطو اس مکتب فکر کا بانی ہے۔ وہ ایتھنز کے اسٹیڈیم میں چلتے چلتے لیکچر دیا کرتا تھا اسی لئے اس گروہ کو مشائین کہتے ہیں۔ (مشی - چلنا) بعض مسلمان فلاسفہ نے اسی مکتب فکر کی پیروی کی جن میں ابو النصر فارابی ابن سینا، ابن رشد کے نام خاص طور سے مشہور ہیں۔

اشراقیہ (اشراقیین): اس مکتب فکر کے ساتھ یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ روح اور باطن کی صفائی اور اشراق نوری کو عقلی دلائل اور فلسفہ کی روشنی میں ثابت کرتے اور باطن کی صفائی اور رذائل کا قلب سے انجلاء اس کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ بال آخر اس گروہ کا ذریعہ علم جلاء باطن اور کشف ہوتا ہے لیکن اس مکتب فکر کے اکثر افراد کسی آسمانی مذہب کے پیرو کار نہیں ہیں اور نہ ہی اپنے علم وعقل میں وحی الہی اور تعلیمات نبوی کی پابندی ضروری محسوس کرتے ہیں۔ اس فکر کا بانی افلاطون ہے فلاسفہ کا یہ گروہ نسبتاً رہبانی اور تارک الدنیا تھا۔

متکلمین: مسلمانوں میں جب فلسفہ کا رواج ہوا تو جو لوگ اسے ہضم نہ کرسکے وہ گمراہی کے دلدل میں پھنستے چلے گئے معتزلہ سب سے زیادہ اس فتنہ کا شکار ہوئے جب مسلمان علما نے یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے زور وقوت کے ساتھ فلسفیانہ مسائل کی تردید کی، وہ ایک طرف اسلامی علوم کی بصیرت ومہارت رکھتے تھے اور دوسری طرف حکمت وفلسفہ طبعیات فلکیات، مابعد الطبعیات، الٰہیات وغیرہ کے دقائق کو بھی بخوبی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ متکلمین کا طبقہ تھا جس کو اسلامی فرقوں سے سابقہ پڑا جن میں سے ایک طبقہ جس نے خدا کو ایک مجرد ذات مان کر اس کی تمام صفات کا انکار کر دیا اور بندہ کو ایک جمادکی طرح مانا جسے افعال کی کسی بھی طرح قدرت نہیں نہ خلق کی نہ کسب کی جس سے بندوں کے افعال پر مرتب ہونے والے ثواب وعقاب کا بطلان لازم آیا، یہ جبریہ فرقہ تھا جو جہمیہ کے نام سے مشہور ہوا جہم بن صفوان خراسانی

کے ذریعہ اس فرقہ کو فروغ ہوا۔

دوسرا طبقہ قدریہ انسان کو اپنے ارادہ اور عمل میں آزاد و مختار سمجھتا ہے اور اپنے افعال کا محض کاسب نہیں بل کہ خالق سمجھتا ہے کہ جس میں خالق کے ارادہ اور مشیت کو دخل نہیں یہی فرقہ آگے چل کر معتزلہ کے نام سے مشہور ہوا، واصل بن عطا اس فرقہ کا بانی ہے۔

یہ فرقہ:

(۱) صفات خداوندی کا انکار کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس سے تعدد الٰہ اور تعدد قدیم لازم آتا ہے، انکار صفات کی بنا پر ہی انہوں نے کلام اللہ کو کلام لفظی کہا اور کلام نفسی کو بھی حادث مخلوق بتایا۔

(۲) انسان اپنے اچھے برے اعمال کا محض کاسب نہیں بل کہ خالق ہے۔

(۳) مطیع کو ثواب دینا اور عاصی کو عقاب دینا خدا تعالیٰ پر واجب ہے۔

(۴) بھلائی برائی کو پہچاننے اور حسن و قبح کا معیار ان کے نزدیک عقل ہے نہ کہ شریعت۔

ایسے حالات میں متکلمین نے فلاسفہ کے عقائد اور باطل نظریات کی تردید فلسفہ کے مسلم اصولوں اور عقلی قطعی دلیلوں کی روشنی میں کی اور عقائد اسلامیہ کو مبرہن کر کے انکا دفاع کیا جس سے علم کلام جیسا شاندار فن وجود میں آیا۔

صوفیہ:

جن کا ذریعہ علم واردات قلب، وجدانات کشف اور نور باطن ہے۔ آسمانی مذہب کے ماننے والے۔ تعلیمات نبوی کے پابند و پیروکار، ریاضت و مجاہدہ کرنے والے مسلمان صوفیہ کہلاتے ہیں۔ لطائف ستہ کو ذاکر بنانا، روح کو ترقی اور بلندی تک پہنچانا۔ تخلیہ و تحلیہ وغیرہ تدابیر کے ذریعہ نفس کے رذائل کا ازالہ اور قرب الٰہی کی تحصیل ان کے مقاصد ہیں، فلسفہ کی بعض کارآمد چیزوں سے وہ ان مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد لیتے ہیں۔

مشائین، متکلمین اور صوفیاء کا طرز استدلال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے درج ذیل ارشاد میں صفات باری تعالیٰ، مجردات کا حدوث وقدم، لطائف ستہ، کشوف، مکان و حیز، عالم خلق اور عالم امر وغیرہ کی گفتگو نہایت عمدگی سے آگئی ہے، اور اسی کے ساتھ مشائین، متکلمین اور صوفیاء کرام کا طرز استدلال بھی واضح ہوگیا ہے۔

سورہ اعراف کی آیت ''اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ'' کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

اس میں الا تو تنبیہ کے لیے ہے اور لہ کو حصر کے لیے مقدم کیا گیا ہے کیوں کہ تقدیم ما حقہ التاخیر حصر کو مفید ہے اور خلق و امر کی تفسیر لغۃً ظاہر ہے خلق کے معنی پیدا کرنا اور امر کے معنی حکم کرنا حاصل یہ ہوا کہ تکوین و تشریع دونوں قسم کے تصرفات اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں وہی خالق ہیں وہی حاکم ہیں پس ہر قسم کے تصرفات انہی کے لیے مخصوص ہیں یہ تو لغت کے اعتبار سے خلق و امر کی تفسیر ہے جو ظاہر بھی ہے اور صحیح بھی، مگر بعض لوگوں میں یہ مرض ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات

کو قرآن میں ٹھونستے ہیں یہ بڑی جہالت ہے چناں چہ صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے "الا لہ الخلق والامر" ماد یّات کو عالم خلق کہتے ہیں، اور مجردات کو عالم امر۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ تجرد عالم کے بارے میں تین مذاہب ہیں۔ متکلمین کے یہاں تو اشیاء عالم میں مجرد کوئی نہیں سب مادی ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور زیادہ مادی ہیں مگر مجردات کو قدیم مانتے ہیں۔ تیسرا مذہب صوفیہ کا ہے کہ عالم میں بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور مادی بھی مگر سب حادث ہیں کوئی مجرد قدیم نہیں متکلمین نے نفی تجرد پر یہ استدلال کیا ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے حکماء وصوفیہ نے اس مقدمہ کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قول میں خود مصادرہ علی المطلوب ہے، کہ چوں کہ تم کسی شے کو مجرد نہیں مانتے اس لیے تجرد کو اخص صفات سے کہتے ہو ورنہ اس مقدمہ کی کوئی دلیل نہیں۔ صوفیہ وحکماء کہتے ہیں کہ اخص صفات باری سے وجوب بالذات ہے واجب بالذات بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اور مجرد عن المادہ مخلوقات میں بھی ہیں۔ مگر صوفیہ اور فلاسفہ میں فرق یہ ہے کہ صوفیہ مجردات کو حادث مانتے ہیں اور فلاسفہ قدیم کہتے ہیں۔ بہر حال صوفیہ کا مذہب یہ ہے کہ بعض اجزاء عالم مجرد عن المادہ ہیں چناں چہ روح کو وہ مجرد کہتے ہیں اور اس کے علاوہ انسان میں بعض لطیفے ان کو اور مکشوف ہوئے ہیں اور ان کے نزدیک حقیقت انسان ان مجردات اور جسد مادی سے مرکب ہے ان لطائف کو بھی صوفیہ نے مجرد کہا ہے اور یہ ان کو کشف صحیح سے معلوم ہوا ہے بجز کشف کے اس کی کوئی دلیل نہیں۔ مگر ان میں نفس مادی ہے بمعنی حال فی المادی اس کو لطائف میں تغلیبا شمار کرلیا ہے، نیز صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ان کا مقام فوق العرش ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ فوق العرش ان کا حیز ہے تا کہ مجرد کے لیے مکان وحیز لازم آئے بل کہ فوق العرش سے مراد یہ ہے کہ ان کا کوئی مکان نہیں توجیہ اس ارادہ کی یہ ہے کہ عرش منتہی ہے امکنہ کا اور فوق کے لیے خارج ہونا لازم ہے پس فوق العرش کے معنی یہ ہوئے خارج عن الامکنہ ۔باقی رہی یہ تحقیق کہ وراء العرش مکان تو نہیں لیکن پھر کیا ہے آیا خلاء ہے یا خلاء بھی نہیں۔ تو دونوں امر ممکن ہیں لیکن حکماء نے بلا دلیل دعویٰ کیا ہے کہ محدود جہات کے ادھر نہ خلاء ہے نہ ملا خلا تو اس لیے نہیں کہ محال ہے اور یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے اور ملا اس لیے نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت نہیں یہ عجیب دلیل ہے کہ جس شے کی آپ کو ضرورت نہ ہو وہ معدوم محض ہے۔ یہ حال ہے ان کے دلائل کا جو مضحکہ خیز ہیں غرض صوفیہ نے عالم کی تقسیم مجردات و مادیات کی طرف کر کے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ مجردات کو عالم امر سے تعبیر کرتے ہیں اور مادیات کو عالم خلق کہتے ہیں سو اول تو یہ ایک اصطلاح ہے ولا مشاحۃ فی الاصطلاح لیکن اس تسمیہ میں ایک مناسبت بھی ہے، وہ یہ کہ خلق کے معنی لغت میں مادہ میں صورت پیدا کرنا اور اس کے مقابل ہے ابداع یعنی خود مادہ کو پیدا کرنا جس کا ذکر اس آیت میں ہے "بدیع السموٰت والارض" چناں چہ اس کے متصل ہی "واذا قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون" اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ قضاء محض کن سے ہے اس میں مادہ کا توسط نہیں اور اللہ تعالیٰ تو مادہ کے بھی خالق ہیں اور صورت وہیئت کے بھی باقی مادہ میں صورت بنانا یہ ایک درجہ میں بندہ سے بھی ممکن ہے، چناں چہ رات دن ایجادات میں یہی ہوتا ہے کہ مادہ کے اندر نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں، مگر مادہ کا خالق سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ اسی واسطے قرآن میں "فتبارک اللہ احسن الخالقین" فرمایا ہے احسن المبدعین نہیں فرمایا کیوں کہ مبدع بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں بہر حال مادیات کو عالم خلق اس لیے کہا کہ

ان کا وجود مادہ اور صوت کے ملانے سے ہوا ہے ان میں مادہ اور صورت کی ترکیب ہے اور مجردات کو عالم امر اس لیے کہا کہ وہاں مادہ وصورت کی ترکیب نہیں ان کا وجود صرف کلمۂ امر اور خلق کو متقابل ٹھہر یا گیا ہے یہ قرینہ ہے اس کا کہ امر سے مراد امر تکوین نہیں بل کہ تشریعی ہے، یہاں تک "الحمد للہ الا لہ الخلق و الامر" کی تفسیر تو واضح ہوگئی۔

علمی اشکال

اب میں تتمیم فائدہ کے لیے اس کے بعد کی آیات کی بھی تفسیر کرتا ہوں کیوں کہ ان کو اس مضمون کی تتمیم میں دخل ہے اور اس سے پہلے ایک شبہ کو جو کلام سابق کے متعلق ہے رفع کرتا ہوں جو کہ خلق پر وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جو معدوم کو موجود کرتے ہیں تو اس کی صورت دوسری آیات میں یہ وارد ہے کہ کن کہہ دیا اور موجود ہوگیا تو "کن" میں خطاب کس کو ہے کیا معدوم کو امر ہے؟ میرے پاس ابھی ایک خط آیا تھا جس میں یہ سوال تھا کہ "کن" کس کو کہا جاتا ہے میں نے اس کو تو یہ جواب لکھ دیا کہ ؎

آرزوی خواہ لیک اندازہ خواہ
بر نیاید کوہ رایک برگ کاہ

یعنی سوال اپنی حیثیت کے موافق کرنا چاہیے یہ سوال تمہاری قابلیت سے زیادہ ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سوال لاجواب ہے لاجواب نہیں بل کہ اگر آپ اپنی قابلیت کے بعد ہم سے کہیں کہ لاجواب۔ لا امر صیغہ یعنی پیش کر اس میں صنعت کی رعایت ہے) تو ہم اس کا جواب دیں گے کہ موجود علمی کو یہ خطاب کیا گیا ہے کہ موجود خارجی ہو جا۔ یعنی جو شئی خارج میں معدوم ہے وہ معدوم محض نہیں ہے بل کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہے پس ایجاد ثانی یعنی قیامت کے بعث ونشر میں تو خطاب ایسی شئے کو ہے جو موجود خارجی بھی ہے اور علمی بھی کیونکہ قیامت میں جو عالم معدوم ہوگا تو وہ عدم محض نہ ہوگا بل کہ عدم خاص ہوگا۔ کہ صورت عالم فنا ہوجائے گی مادہ باقی رہے گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ عدم محض محال عقلی ہے ہرگز نہیں عدم محض بھی حق تعالیٰ کی قدرت سے خارج نہیں وہ اس پر بھی قادر ہیں کہ صورت ومادہ دونوں کو فنا کردیں پھر ایجاد کردیں، جیسا ایجاد اول میں ہوا مگر عادۃ اللہ یوں ہی واقع ہے کہ ایجاد اول کے بعد وہ موجود کو معدوم محض نہیں کرتے یہ عادت نصوص سے معلوم ہوئی کہ قیامت میں جو عالم فنا ہوگا وہ فنائے صوت ہے فناء محض نہیں، چناں چہ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ہے "ان الانسان یفنی ولا یبقی منه شئ الا عجب الذنب" (او کما قال) انسان کے کل اجزاء فنا ہوجائیں گے مگر ریڑھ کی ہڈی فنا نہ ہوگی قیامت میں اسی ہڈی سے انسان کا تمام جسم بن جائے گا، جیسا کہ گٹھلی سے درخت پیدا ہوجاتا ہے گویا یہ جزو بمنزلہ تخم کے ہے، شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب انسان کو جلا دیا جاوے گا جیسا کہ بعض اقوام مردہ کو جلاتے ہیں تو اس وقت تو ہڈی بھی راکھ ہوجاتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مسلم نہیں کہ سب ہڈیاں راکھ ہوجاتی ہیں کیونکہ مرگھٹوں میں ہڈیاں دستیاب ہوتی ہیں، اور مان بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ ہڈیوں کی راکھ میں جو جزو ریڑھ کی ہڈی کا ہے وہ قیامت تک محفوظ رہے گا، اور ممکن ہے کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ محسوس بھی نہ

ہوتا ہو جیسا جزولا تتجزی۔ سو حدیث تو یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت یا قیامت الاخری کے فنا نہ ہو گا۔
(اشرف التفاسیر جلد ۲/ص ۱۷۰ تا ۱۷۲ از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی)

فلسفہ قدیم-فلاسفہ کے دعاوی جن پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے:

(۱)"جزء لایتجزی باطل ہے" (۲) "ہر جسم دو جز سے مرکب ہوتا ہے" "ایک حلول کرنے والا حال جس کو ہیولیٰ کہتے ہیں، دوسرا جس میں حلول کرتا ہے محل اس کو صورت جسمیہ کہتے ہیں" ان دونوں باتوں پر کوئی دلیل نہیں ہے پھر وہ کہتے ہیں۔ (۳) "صورت جسمیہ ہیولیٰ سے خالی نہیں ہوتی اور (۴) ہیولیٰ صورت جسمیہ سے خالی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہیولیٰ اپنے وجود میں صورت جسمیہ کا محتاج ہے، اور صورت جسمیہ اپنے متشکل ہونے میں ہیولیٰ کی محتاج ہے" یہ دونوں باتیں بھی بناء الفاسد علی الفاسد کے قبیل سے ہیں۔ کیوں کہ عقل اور شرع سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ان چیزوں میں آثار پیدا کرنے والی ذات فاعل مختار قادر وقہار باری تعالیٰ ہے۔"

(۵) "خلا محال ہے۔" لیکن فلاسفہ کے پاس امتناع خلا پر کوئی دلیل نہیں۔

(۶) فلاسفہ-"زمانہ کے متعلق کہتے ہیں وہ مقدار حرکت کا نام ہے" لیکن دلیل منقی ہے" نیز وہ کہتے ہیں کہ زمانہ کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہاء (الزمان لا بدایۃ لہ ولا نہایۃ لہ) یہ بات بے دلیل ہے بل کہ اسکے خلاف پر دلیل قائم ہے۔

(۷) "فلک کو مستدیر کہتے ہیں اور بسیط کہتے ہیں" لیکن بے دلیل (۸) "فلک میں کون وفساد، خرق والتیام نہیں ہو سکتا" یہ بات بالدلیل باطل ہے۔ (۹) "فلک غیر متناہی طریقہ سے، دواماً متحرک ہے" دوام کی قید دلیل کے ساتھ باطل ہے۔ (۱۰) "فلک متحرک بالارادہ ہے" اس پر کوئی دلیل نہیں۔ (۱۱) "فلک کے لیے قوت متحرکہ مجرد عن المادہ ہے۔" اس پر بھی کوئی دلیل نہیں۔ (۱۲) "فلک کے لیے محرک قریب قوت جسمانیہ ہے" اس پر کوئی دلیل نہیں۔ (۱۳) "قدیم بالزمان باعتبار زمانہ کے جس کی کوئی ابتداء نہ ہو جیسے فلک" ممکنات کے ساتھ فلاسفہ کا قدیم بالزمان کا قول باطل ہے۔

(۱۴) "ہر حادث مادہ کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے" مادہ کے ساتھ وابستگی فلاسفہ کے نزدیک ضروری ہے یہ "ضرورت" کی قید باطل ہے۔ (۱۵) "علت فاعلہ اگر بسیط ہو تو اس سے ایک سے زائد کا صدور محال ہے" اس معنی کر کے بسیط کا وجود نہیں ہے اور جو بسیط موجود ہے اس سے ایک سے زائد کا صدور محال نہیں ہے بل کہ دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ اس لیے فلاسفہ کا اعتقاد باطل ہے۔

علت و معلول:

جو اپنی ذات سے (بذات خود) موجود ہو پھر اس سے دوسری چیزیں وجود میں آئیں۔ وجود پذیر کرنے کا جو باعث ہو اسے علت اور جو چیز وجود پذیر ہو اسے معلول کہتے ہیں۔ اوپر اصطلاحات کے باب میں فلاسفہ کے عقائد ذکر کر دیئے گئے کہ اصطلاحات میں تو کوئی مناقشہ نہیں۔ مثلاً: علت فاعلی کی اصطلاح کو لیجیے اس سے بہت سی باتیں سمجھنا آسان ہے۔ چناں چہ علت کے باب میں صراحت کی گئی ہے کہ یہ چار طرح کی ہوتی

ہیں، مادی، صوری، فاعلی، غائی۔ مثلا کمہار ایک گھڑا بناتا ہے اس کی علت مادی مٹی پانی اور جو ہے ایک خاص شکل متعین کرتا ہے یہ اس کی علت صوری ہے گھڑا بنانے والا کمہار ہے یہ اس کی علت فاعلی ہے۔ گھڑا بنانے کا مقصد پانی رکھنا اور ٹھنڈا کرنا ہے یہ اس کی علت غائی ہے۔ دوسری مثال دیکھئے نبض شریان میں حرکت کرتی ہے اس کا محرک قوت حیوانیہ ہے (جس کا مرکز قلب ہے) تو نبض کی علت مادی جرم شریان، علت صوری حرکت شریان، علت فاعلی قوت حیوانیہ اور علت غائی حاجت تطفیہ (روح کی تعدیل اور اجزا دخانیہ کا اخراج) تو اصطلاحات تو مفید ہوسکتی ہیں اور ہیں، لیکن ان اصطلاحات کے ساتھ چوں کہ فاسد و باطل عقائد وابستہ کردیئے گئے ہیں اور یہ مسئلہ صرف قدیم فلاسفہ کا نہیں ہے جدید فلاسفہ بھی اس باب میں ان کے ہم نوا ہیں اور اہل سائنس کا معاملہ اور بھی تکلیف دہ ہے۔ اہل سائنس کی وہ اصطلاحات جو فلسفہ سے ماخوذ ہیں ان میں وہ فلاسفہ کے عقائد کے ہم نوا ہیں جو اصطلاحات اہل سائنس نے نئی وضع کی ہیں تو مادیت کے باب میں خواہ یہ اہل سائنس کتنی ہی براعت ذہنی رکھتے ہوں لیکن روحانیات میں مسخ شدہ ذہن کی وضع کردہ یہ اصطلاحات ہیں اور ایسے ذہن کی دریافت ہیں جو "صداقت کو سمجھنے کی صلاحیت" بتدریج کھوتا چلا گیا مابعد الطبعیات علم اعلی اور علم الٰہی فلاسفہ کے موضوعات میں شامل ہونے کی وجہ سے فلاسفہ کی تو کچھ توجہ اس طرف ہوتی تھی لیکن اہل سائنس کے یہاں تو سرے سے انکار ہے کو صرف عقل پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے بھی ٹھوکر کھائی۔

فلاسفہ اور حکماء مشائیہ کے باطل نظریات کی بنیادیں:

(۱) شریعت میں عالم کا حادث ہونا وارد ہوا ہے، جزء لاتجزی کا ابطال ہو یا ہیولی کا اثبات، اگر اس سے عالم کا حادث ہونا باقی رہتا ہے، تو ہمیں جواب دینے کی ضرورت نہیں لیکن ایسا نہیں ہے بل کہ ابطال جزء لاتجزی اور اثبات ہیولی سے عالم کو قدیم ثابت کرنے کوشش کی جاتی ہے، چوں کہ یہ غلط ہے اور اسلامی عقیدے کے خلاف ہے اس لیے ہمیں اس کی تردید کی حاجت ہوگی۔

(۲) صورت نوعیہ کے آثار کو مستقل بالذات سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ باطل ہے فاعل مختار قادر وقہار کے ارادہ اور مشیت سے صورت نوعیہ کے لیے آثار ودیعت کئے جاتے ہیں۔

(۳) فلسفہ میں ہیولی اور صورت نوعیہ کے مابین تلازم قائم کرنے والا ایک سبب منفصل مانا جاتا ہے، اور اس سے مراد عقل عاشر لی جاتی ہے یہ خلاف شرع ہے۔ قال الحکماء انہ صدر منہ تعالی عقل اول ثم منہ عقل ثانی ثم و ثم الی العقل العاشر وھو العقل الفعال و علیہ نظام العالم و اھل السنۃ و الجماعۃ قالوا انہ تعالی منزہ عن الجھۃ و الجسمیۃ و نواحی المخلوقات بیدہ تعالی یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید۔

(قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار: ص/۶)

حکماء مشائیہ کے باطل نظریات یہ ہیں:

اجمالی طور پر مشائیہ کے نزدیک واجب الوجود کے علاوہ عالم وجود میں، ۱۰ عقول، ۹ افلاک، ۴ عناصر کل ۲۳ موجودات اور تمام اجسام عنصری اور فلکی کی ایک صورت جسمیہ اور چاروں عناصر کا ایک ہیولیٰ اور ۹ افلاک کے لیے ۹ ہیولے اور ہر فلک کے لیے ایک نفس فلکی کل ۹ نفوس فلکی اور چاروں عناصر کی چار اور ۹ افلاک کی ۹ کل ۱۳ صور نوعیہ مجموعہ ۳۳ اجزائے موجودات اور موجودات اور اجزائے موجودات ملا کر کل ۵۶ چیزیں قدیم بالزمان عالم وجود میں آ گئیں۔ اس طرح سب کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱) مشائیہ ۵۶ قدماء کے قائل ہیں۔

(۲) مشائیہ واحد حقیقی (یعنی اللہ تعالیٰ) کو ایک سے زائد چیزوں کا خالق نہیں مانتے۔

(۳) مشائیہ عقل اول کے سوا باقی ساری کائنات کو اللہ تعالیٰ سے مستغنی اور آپس میں ایک دوسرے کی موجد مانتے ہیں۔

(۴) مشائیہ فلکی ہیولیٰ کو خرق والتیام (پھٹنے جڑنے) سے بالاتر مانتے ہیں۔

(۵) مشائیہ کے نزدیک واجب الوجود (اللہ تعالیٰ) عقل اول کو پیدا کر کے معطل ہو گیا۔

مسائل فلسفہ:

(۱) اسباب طبعیہ کے آثار دائمی ہیں یا ضروری (ضرورت اور دوام)

اہل فلسفہ اور سائنس والوں کا اعتقاد ہے کہ ہر چیز میں ایک تاثیر ہے جس سے تخلف نہیں ہو سکتا (یعنی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔) اور تاثیر رکھ دینے کے بعد نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ کو بھی قدرت نہیں رہی کہ اس کے خلاف ہو سکے۔ مثلاً آگ کے اندر جلانے کی تاثیر رکھ دی ہے، اب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آگ نہ جلائے۔

(ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۳ کمالات اشرفیہ ص ۲۱۷۔ از مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ)

لیکن یہ عقیدہ باطل ہے، ہر چیز پر اللہ کی قدرت ہے کسی چیز میں قدرت مستقلہ یا تاثیر ذاتی نہیں اسی لیے شرک اکبر کے افراد عقلاً ممتنع ہیں۔

پانی بالذات پیاس نہیں بجھاتا وہی بجھاتے ہیں۔ آگ خود فعل نہیں کرتی یہ بھی حق تعالیٰ ہی کا حکم ہے وہ کھانا پکا دیتی ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۰/ص ۲۹۸ جلد ۴/ص ۲۱۱)

نئے خیال والوں کو غلطی یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا مثلاً آگ کا اثر ہے جلانا اس کے دوام سے یہ سمجھا کہ یہ اثر اس کا ذاتی ہے انفکاک متصور نہیں اور یہ سخت غلطی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے قصہ ابراہیم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق آیت "قلنا یا نار کونی برداً وسلاما" میں تاویلات بعیدہ کیں۔ یہ سمجھ کر کہ آگ کیوں کر ٹھنڈی ہو سکتی ہے، اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل والوں کی اصطلاح میں گاڑی روکنے کے لیے سرخ

جھنڈی ہوتی ہے، ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ خود اس جھنڈی میں یہ الاخری ۱۴۳۲ھ سے گاڑی رک جاتی ہے۔ حالاں کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے، باقی یہ جھنڈی محض علامت ہے، اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں۔

ایسے ہی بغیر حکم حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرسکتا، حتی کہ زبان سے جو جو الفاظ نکلتے ہیں، ہر ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے، تو زبان حرکت کرتی ہے، تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہے۔

افسوس! منکرین نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کرلیا اور تصرف حق کے منکر ہوگئے۔

(ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۲۔ مقالات حکمت جلد ۱/ ص ۱۰۳، ۱۰۴ از: مولانا عبدالحق صاحبؒ)

حالاں کہ "ضروری" سلب امکان عن الجانب المخالف کو کہتے ہیں، نفی امکان کے لیے مستقل دلیل درکار ہوتی ہے۔ اور رہی یہ بات کہ ہمیشہ ایسا ہی دیکھا ہے کبھی اس کے خلاف دیکھا نہیں، سنا نہیں تو یہ محض استقرا ہے، استقرا سے امکان کی نفی یا امتناع ثابت نہیں ہوتا۔ (مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ کیجئے الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ کے اصول موضوعہ)

(۲) تصور طبیعت:

(۱) ہر جسم کے لیے حیز طبعی ہے۔ (۲) ہر جسم کے لیے شکل طبعی ہے۔ (۳) ہر جسم متحرک کے لیے محرک غیر جسمیہ ہے اور وہ طبیعت ہے۔ (۴) پانی، ہوا، آگ اور مٹی (عناصر اربعہ) اپنی صورت طبعی میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

نفس حیوانی میں قوت مدرکہ کے تحت حواس خمسہ ظاہرہ یعنی سمع، بصر، شم، ذوق، لمس اور حواس خمسہ باطنہ یعنی حس مشترک، خیال، واہمہ، حافظہ و متصرفہ، اور قوت محرکہ کے تحت باعثہ اور فاعلہ، پھر باعثہ کے تحت قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ کا ذکر فلسفہ کے موضوعات میں شامل ہے۔

یہ سب قوتیں اور ان کی افادیتیں تسلیم لیکن ان کا فواعل حقیقی ہونا باطل ہے۔

حیز طبعی اور شکل طبعی:

کسی چیز کی وہ خاص جگہ جہاں وہ ٹھہر سکے اور جب تک اسے مجبور نہ کردیا جائے (قسری حرکت نہ ہو) وہ وہاں سے نہ نکلے مثلاً ہوا کو کسی چیز میں بند کرنے کے بعد کھولا جائے تو وہ ایک خاص رخ پر نکل جائے گی اور پھر راستہ میں اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو ایک خاص مقام یعنی کرہ ہوا تک پہونچ کر کسی مخصوص جگہ ٹھہر جائے گی یہی اس کا "حیز طبعی" ہے۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ شئ اپنا حیز طبعی اختیار کرنے میں کسی خارجی قوت یعنی خدا تعالی کی محتاج نہیں ہے۔ جب کہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ہر ممکن، ایک خارجی قوت یعنی اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے، لہٰذا اہل اسلام کے نزدیک حیز کا مقتضی طبیعت کو قرار دینا، اور اسے فاعل اور موثر حقیقی سمجھنا غلط ہے۔ بل کہ ہر حیز کی ہر جسم کے ساتھ تخصیص اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حیز طبعی میں جو کلام ہے وہی شکل طبعی میں کلام ہے۔

حرکت طبعی :

فلاسفہ حرکت ذاتیہ کو طبعی کہتے ہیں اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں، "غیر مستفادة من خارج" کہ یہ حرکت طبعی کسی خارجی قوت یعنی باری تعالٰی کی قدرت و ارادہ کی محتاج نہیں ہے، ظاہر ہے کہ یہ قول باطل ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا موجودہ زمانہ کے فلاسفہ جدیدہ اور اہل سائنس کا یہی عقیدہ ہے، ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ طبیعت موثر ہے لیکن موثر حقیقی نہیں بل کہ اللہ تعالٰی نے یہ تاثیر اس کے اندر رکھ دی ہے، اور یہ آثار بطور سبب عادی کے اس کے اندر پائے جاتے ہیں اور جب چاہیں اللہ تعالٰی اس کے آثار اور تاثیرات کو سلب کر لیں، اور طبیعت کے خلاف عمل و اثر ظاہر ہو جائے۔ تو پھر کوئی نزاع نہیں کیونکہ تمام مفاسد کا مبنی یہی تھا کہ طبیعت کی تاثیر ذاتی کو لیکر عمل و اثر کو مستقل بالذات سمجھ کر صانع عالم کا انکار، اس کی قدرت، ارادہ اور اختیار کا انکار عالم کے حادث ہونے کا انکار، معجزات انبیاء اور کرامات اولیاء کے انکار کو اس پر مبنی ٹھہراتے ہیں۔

حرکت کی چار قسمیں ہیں: (۱) حرکت کمی مثلاً نمو (۲) حرکت کیفی۔ مثلاً صورت نوعیہ کے باقی رہنے کے ساتھ پانی کا گرم ہو جانا پانی کا ٹھنڈا ہونا، جسے استحالہ (Metabolism) کہتے ہیں۔ (۳) حرکت اینی، کسی جسم کا ایک جگہ سے دوسری جگہ بتدریج منتقل ہونا (۴) حرکت وضعی۔ جسم کا اپنے مرکز پر قائم رہتے ہوئے اس کے اجزاء کی نسبت سے مکان کا بدلتے رہنا۔

پھر حرکت محرک کے اعتبار سے تین طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) طبیعہ (۲) قسریہ (۳) ارادیہ۔ فلاسفہ حرکت طبیعہ سے جو احکام ثابت کرتے ہیں اس کا مبنی فاسد ہے، یعنی وہ طبیعت کو موثر بالذات سمجھتے ہیں۔ اسی سے حرکت افلاک کا مسئلہ اور اس جیسے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں جس میں طبیعت کو موثر بالذات اور حرکت کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔

حواس خمسہ باطنہ اگر ادراک کے لیے واسطہ ہیں تو تسلیم اور اگر یہ خود ہی مدرک ہیں تو یہ بے ثبوت بات ہے کیوں کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ مدرک قلب ہو اور حواس باطنہ کا درجہ آلات کا ہو۔

☆ چیزوں کے لیے عوارض مفارقہ مبدأ فیاض کی جانب سے وہی لاحق کئے جاتے ہیں جس کے لیے وہ شئ استعداد اور قابلیت رکھتی ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: عوارض کا استحقاق نہ تو شے کی ماہیت کے اعتبار سے ہے اور نہ ہی مادہ اور بدن کے ساتھ اقتران اس کا ضروری ہے بل کہ یہ ممکن ہے کہ تمام نفوس اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے تمام عوارض کی قابلیت رکھتے ہوں لیکن فاعل مختار خداوند قدوس نے بعض عوارض کو بعض اشیاء کے ساتھ مخصوص کر دیا اور بعض دوسرے عوارض کو دوسری اشیاء کے ساتھ۔

نفس ناطقہ کے تحت قوت عاقلہ اور قوت عاملہ پھر قوت عاقلہ کے تحت ۴ مراتب: (۱) عقل ہیولانی (۲) عقل

بالملکہ (۳) عقل بالفعل (۴) عقل مطلق کی تقسیم کے تحت فلاسفہ قوت عاقلہ کو مجرد مانتے ہیں اور یہ کہ "تعقل آلات جسمیہ کے تحت نہیں ہوتا" اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

نباتات: میں نفس نباتی کا ثبوت اور پھر نفس کے ساتھ وابستہ چار قوتیں غادیہ، نامیہ، مولدہ، مصورہ اور پھر ان قوتوں کی خادم قوتیں: جاذبہ ماسکہ، ہاضمہ، دافعہ اور انہیں سب قوتوں کا ثبوت حیوانات میں نفس حیوان کے واسطے سے تو یہ تو اصطلاحات ہیں جو علوم میں مفید ہیں لیکن ان قوتوں کا فواعل حقیقیہ ہونا تسلیم نہیں۔

تکونات طبعیہ، اسباب عادی و اکثری، اسباب انہیں میں منحصر نہیں

ایسا ہو سکتا ہے کہ مثلاً زلزلہ کا سبب کبھی تو دریافت شدہ سبب ظاہری ہو اور کبھی فرشتوں کے عروق ارض کھینچنے کی وجہ سے ہو اسی طرح بادل، بارش، رعد، برق، صاعقہ، ریاح، قوس قزح، شہب، انفجار عیون کے جو اسباب بتائے جاتے ہیں وہ سب اکثری اور عادی اسباب ہیں، انہیں اسباب میں انحصار تسلیم نہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے اسباب سے یہ چیزیں وجود میں نہ آئیں اور یہی بات درج ذیل اشیاء کے تکون اور میکانیہ میں بھی جاری ہوتی ہے: یشب، بلور، زیبق، زرنیخ، رصاص، ملح، زاج، کبریت، نوشادر۔

قوت وفعل:

قوت کے مفہوم میں تو کوئی نزاع نہیں لیکن قوت کے وجود اور اس کی تاثیر کے باب میں فلاسفہ کا جو اعتقاد ہے وہ باطل ہے کہ وہ اس کے اثر کو مستقل بالذات سمجھتے ہیں، باذن ربہا نہیں سمجھتے۔

جوہر وعرض:

جوہر وہ ہے جو بذات خود قائم ہو اور عرض وہ ہے جو موضوع کے اندر پایا جائے یعنی اپنے پائے جانے میں موضوع اور محل کا محتاج ہوتا ہے۔ پھر جوہر اگر محل ہو تو اسے "ہیولیٰ" کہیں گے، اور اگر حال ہو تو اسے "صورت"۔ اگر نہ حال ہو اور نہ محل تو پھر جوہر یا تو حال اور محل دونوں پر مشتمل ہوگا (دونوں سے مرکب ہوگا) تو اسے جسم طبعی کہیں گے۔ اور اگر جوہر حال اور محل دونوں پر مشتمل نہ ہو بلکہ اجسام کے ساتھ وہ اس طور پر متعلق ہو کہ اجسام کی تدبیر وتصرف کا فعل انجام دیتا ہو تو اسے "نفس" کہیں گے، اور اگر اجسام سے بھی متعلق نہ ہو تو وہ "عقل" ہے۔

ہیولیٰ صورت اور عقول عشرہ:

ہیولیٰ اور صورت کے بارے میں فلاسفہ کا یہ گمان کہ یہ دونوں قدیم ہیں یہ گمان باطل ہے۔ اسی طرح باری تعالیٰ اور عالم جسمانی کے مابین وہ عقل کو رابطہ قرار دیتے ہیں، ایسی عقلیں انہوں نے دس تجویز کر رکھی ہیں، جنہیں عقول عشرہ کہتے ہیں ان عقول کے لیے تجرد ثابت کرتے ہیں، اور ان کی ازلیت وابدیت کے قائل ہیں۔

تنبیہ: عقول کا تجرد تو محال نہیں لیکن انکا قدیم ہونا محال ہے، اور نظریہ عقول کی جو بنا تھی کہ باری تعالیٰ واحد ہے،

واحد سے صرف واحد ہی کا صدور ہوسکتا ہے کثیر کا نہیں، الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد۔ یہ مبنی ہی فاسد ہے لہٰذا عقول عشرہ کا نظریہ بناء الفاسد علی الفاسد کے قبیل سے ہے۔

عقول کے ازلی ہونے سے وہ باری تعالیٰ کی مشیت کی نفی کرتے ہیں۔

مشورہ: حق الطلب فی طلب الحق مطالعة الکتب الکلامیة و متابعة الشریعة المصطفویة۔ (طلب حق کے باب میں کتب کلامیہ کا مطالعہ اور شریعت مصطفویہ کی اتباع ازبس ضروری ہے)۔

الٰہیات: فلاسفہ نے واجب الوجود (باری تعالیٰ) کی ذات وصفات میں گفتگو کی ہے، حالاں کہ صفات کے باب میں جب کوئی نص وارد نہ ہو جزم کے ساتھ بات کہنا جائز نہیں۔

فلاسفہ کہتے ہیں واجب لذاتہ اپنی جمیع جہات میں واجب ہے، اس کے لیے کوئی ایسی حالت منتظرہ نہیں جو اس کے لیے حاصل نہ ہو۔ واجب لذاتہ عالم لذاتہ ہے۔ واجب لذاتہ عالم بالکلیات ہے، یہ سب باتیں فلاسفہ کی درست ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ واجب لذاتہ وجہ کلی کے اعتبار سے جزئیات متغیرہ کا عالم ہے۔ فلاسفہ کی یہ بات عقل پر انحصار کرنے اور وحی الٰہی سے انحراف کا نتیجہ ہے، اگر کوئی تاویل نہیں کرتے تو یہ بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔

نیز کہتے ہیں واجب لذاتہ کے وجود میں ممکنات شریک نہیں، حالاں کہ فلاسفہ کو اس بحث میں گھسنا نہیں چاہیے تفکر فی اللہ کے بجائے تفکر فی خلق اللہ کی حد تک ہی رہنا چاہیے، کیونکہ یہ ایسا بحر ناپیدا کنار ہے، جس میں عقول وکشوف غرق ہوگئے۔

فلسفہ جدید: جدید فلاسفہ اور اہل سائنس کے نزدیک

عالم سماوی وارضی تمام کائنات کی اصل دو چیزیں ہیں (۱) مادہ اور اس کی قوت (حرکت) اور یہ دونوں قدیم ہیں۔ ازلی ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں، ایک کا دوسرے سے انفکاک ناممکن ہے۔

مادہ: تو ہیولی ہی ہے جو نہایت درجہ بسیط جتنا زیادہ سے زیادہ بسیط ہونے کا تصور کیا جا سکے (فی البسط ما یمکن تصورھا)۔

(۱) قوۃ دراصل مادہ کی حرکات کا نام ہے اس حرکت کا کوئی سبب نہیں ہے بل کہ یہ اس کی ذاتی حرکت ہے۔ اجرام سماویہ، کواکب، کائنات ارضیہ، جمادات، نباتات، حیوانات، یہ سب مادہ ہی سے اس کی حرکت کے سہارے وجود میں آئے ہیں۔

(۲) مادہ کے قدیم اور علت فاعلی اور موثر حقیقی ہونے کی وجہ سے فلاسفہ جدید کسی معبود اور خالق کائنات کا انکار کرتے ہیں۔

(۳) صانع عالم اور خالق کائنات کے انکار کے نظریہ کی بنا پر ہی اشیا کو اس کی طبیعت اور تاثیر کے ساتھ موثر بالذات سمجھتے ہیں اور کارخانہ عالم کا وجود وظہور از خود محض اتفاقی طور پر مانتے ہیں اور ذات خداوندی کے متعلق ان شبہات میں مبتلا ہیں:

(الف) بلا جسم و مادہ اور صورت جسمیہ اور کم و کیف کے کسی شئ کا تصور عقل کے لیے
(ب) لاشئے سے کسی شئے کے وجود کا تصور عقل کے لے ناممکن ہے۔
(ج) اگر نظام عالم کسی حکمت اور ارادہ کے تحت قائم ہوا ہوتا تو اس قصد وارادہ اور حکمت کی علامت تامہ ہر شئ میں پائی جاتی ۔

لیکن غور کرنا چاہیے کہ اگر کسی چیز کے تصور پر کسی کی عقل قادر نہ ہو تو کیا اس سے اس کا موجود نہ ہونا ثابت ہو جائے گا، کتنے ہی حقائق ایسے ہیں کہ ان کا تصور کما حقہ نہیں ہوتا لیکن ان کے وجود پر چوں کہ دلیل قائم ہے اس لیے ان کا نفس الامری وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔خالق کائنات کی ذات اور اس کی صفات اور اسی طرح اسلام کے دوسرے معتقدات پر دلائل و براہین قائم ہیں۔

جہت فوق میں سبع سماوات کی تخلیق ان آسمانوں کے اوپر جسم کبیر کی تخلیق جس کا نام کرسی ہے اور اس سے بھی اوپر جسم اکبر کی تخلیق جس کا نام عرش ہے۔ہمارے اور ان اجسام کے مابین مسافات عظیم ہے اور ایک دار ہے جس میں انسان کے لیے تمام نعمتیں رکھیں اس کا نام جنت ہے جو بے حد و حساب کشادہ ہے اسی طرح ایک دار عذاب ہے جسے جہنم کہتے ہیں۔

اہل سائنس ایسے خلاء ممتد کے قائل ہیں کہ افکار وعقول جس کی وسعت کا اندازہ کرنے سے عاجز ہیں، اور دماغ و ذہن جس کا تصور کرنے سے بے بس ہیں، تو مذکورہ اشیاء جنت و جہنم، سموات، کرسی، عرش اسی خلاء ممتد اور بعد شاسع میں ہوں، اور ظاہر حواس و دیگر ذرائع و آلات کے ادراک سے بھی زیادہ دور ہوں تو آخر مانع کیا ہے، اور یہ ممکن کیوں نہیں اور ان کے انکار کی دلیل کیا ہے، اور یہی حال بقیہ چھ زمینوں کا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ نظام شمسی کے اسی خلا میں ہوں جس میں تمہاری یہ زمین اور دیگر کواکب ہیں۔اور انکا بعد ہم سے اتنا زیادہ ہو کہ دیکھی نہ جاسکتی ہوں، یا یہ کہ ایسی روشن نہ ہوں، کہ جنھیں دیکھنا اور پہچاننا آسان ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سائنسدانوں نے انھیں دیکھا ہو اور کواکب میں شمار کرلیا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اجسام نورانی پیدا کئے جو ہمارے سامنے ہمارے درمیان موجود رہتے ہیں، آتے جاتے ہیں لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے، یہ فرشتے ہیں اور ایک دوسری مخلوق پیدا کی جو جنات ہیں تو یہ کیونکر ممکن نہیں کہ یہ مخلوق موجود ہوں اور ہمیں دکھائی نہ دیں۔آخر بے دیکھے مادہ کو کائنات کی اصل قرار دیتے ہیں، ہوا کی کرشمہ سازی ہے کہ بڑے بڑے درختوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے تو فرشتوں اور جنات میں اس قسم کے اعمال کی قوت ہو تو کیا تعجب ہے۔روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے مسافت طے کرسکتی ہے، تو فرشتوں اور جنات کی حرکت سریعہ ممتدہ میں کیونکر تعجب ہے۔

معاد کے استحالہ پر اہل سائنس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور مخبر صادق نے خبر دی ہے، لہٰذا اس کا اعتقاد واجب ہے، خود مادہ جو کہ کائنات کی اصل ہے اور اس کی ماہیت و حقیقت کے بیان میں فلاسفہ میں اتفاق ہے اور نہ ہی سائنسداں متفق ہیں بل کہ مادہ کی کما حقہ حقیقت سے ناواقف لیکن بے دیکھے اسے تسلیم کرتے ہیں، یا مثلاً دماغ کے ادراک کی

حقیقت کیا ہے، اس طرح کی کتنی ہی چیزیں ہیں، جنکی حقیقت نہیں جانی جاسکی اور نہ ان پر غور کیا جاسکا، لیکن ان کے موجود ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اسی طرح اللہ کی قدرت اور حکمت کی کتنی ہی نشانیاں ہیں جن کا کوئی حد و حساب نہیں۔

بہر حال انکار خدا پر بنیاد رکھ کر کے ان فلاسفہ جدیدہ نے تکونات عالم اور نظام عالم کے باب میں چند مسائل کا اختراع کیا:

(الف) حدوث تنوعات عالم: سماوی و ارضی تمام کائنات کی انواع و اقسام کی مخلوق بطور انشقاق و ارتقاء کے وجود میں آئی۔

(۱) اس کا مکون اول مادہ زلالی ہے جو بہت سے جامد و سیال عناصر سے ترکیب شدہ ہے۔ اس میں اغتذا انقسام اور توالد کی خصوصیات ہیں جسے بروتوپلاسما (Protoplasm) کہتے ہیں۔ اس مادہ میں ترقی اور توالد ہوتے ہوتے نبات کی نہایت سادہ شکل پھر اس سے دوسرے نباتات: اسی طرح حیوانات اور حیوانات سے انسانوں کا وجود ظہور عمل میں آیا۔

(۲) تباین الافراد: افراد اپنی اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتے، اسی مباینت کا ثمرہ ہے مذکر و مؤنث صنفوں کا ظہور۔

(۳) تنازع للبقابین الافراد: قوی افراد باقی رہتے ہیں۔ ضعیف و غیر متحمل افراد ہلاک ہوجاتے ہیں۔

(۴) انتخاب طبعی: طبیعت اپنے لیے جس چیز کو احسن و اکمل سمجھتی ہے اسی صورت کو اختیار کر لیتی چاہیے۔

(ب) انسان منجملہ حیوانات کے ایک حیوان ہے جو ارتقائی طور پر انتخاب طبعی کے تحت اس مخصوص صورت اور مرحلہ تک پہنچا۔

(ج) انسانی عقل و حیٰوۃ اور انسانی ادراک عناصر کے اجزاء صغیرہ کے باہم فعل و انفعال کا نتیجہ ہے اور انسانی عقل اور دوسرے حیوانات کی عقل میں فرق صرف کیت اور مقدار کا ہے۔

(د) اہل سائنس شریعت محمدیہ کے ان مسائل کا انکار کرتے ہیں:

(۱) بعث بعد الموت (۲) جنت (۳) دوزخ (۴) وجود ملائکہ (۵) جن

(۶) سماوات (۷) عرش (۸) کرسی (۹) لوح (۱۰) قلم (۱۱) افعال ملائکہ عظیم وغیرہ۔

فلسفہ جدیدہ کے شبہات و مسائل کا جواب:

اصولی طور پر یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ مخلوق کی رہنمائی خالق کی معرفت کی طرف کی جائے اور مخلوق کا خالق سے رابطہ بحال کیا جائے، اسی طرح کیفیت عبادات اور وہ احکام جن سے انتظام معاش قائم ہو اور معاد بہتر ہو، ان کا بیان مقصود ہے۔ علوم کونیہ، کیفیت خلق عالم کے مباحث شریعت کا مقصود نہیں ہیں۔ ہاں مقاصد کی تحصیل میں جس قدر ضرورت تھی بطور اجمال کے بقدر ضرورت ان کا ذکر کیا گیا مثلاً آسمان و زمین کا پیدا کرنا ان کا عدم سے وجود میں لانا، نوع بنوع مخلوقات میں اختلاف کی نوعیت اور نظام جس سے لوگوں کے لیے عالم کے معبود و خالق کے وجود پر عقلی دلیل قائم ہو سکے۔

اب سمجھنا چاہیے کہ فلسفہ جدیدہ اور سائنس میں جو چیز قطعی طور پر ثابت ہے دلیل عقلی اس کا انکار نہیں کرتی، کیوں کہ دو قطعی دلیلوں میں ٹکراؤ نہیں ہوسکتا اور جو بات شریعت میں قطعی طور پر مذکور ہے، مثلاً: سات آسمان اور سات زمین کا ہونا، تمام مخلوق کا حادث ہونا، کواکب کا آسمان میں ہونا اور عوالم کی ہر نوع کی تخلیق مستقل طور پر ہونا نہ کہ انشقاق وارتقا کے طریقہ پر، ان چیزوں کی نفی پر کوئی قطعی عقلی دلیل قیامت تک قائم نہیں ہوسکتی اور جو دلیل بیان کی جاتی ہیں مثلاً ارتقا میں وہ محض مفروضات وتخمینے ہیں، بعض میں محض تحکم ہے بعض میں بے بنیا دعوی ہے مثلاً ملائکہ کے انکار کا دعویٰ۔ جہاں تک فروع کا اصول کے صفات میں مبائن ہونے کا مسئلہ ہے تو یہ نباتات وحیوانات ہی میں نہیں اور نہ ہی محض فروع واصول میں بل کہ تمام موجوجات میں یہ چیز جاری وساری ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہے تا کہ تمام انواع کے افراد میں تمیز وتفریق ہوسکے کیوں کہ اگر تمام انواع کے افراد ایک ہی صورت پر ہوتے تو اشتباہ پیدا ہوکر نظام عالم میں اختلال واقع ہوجاتا اور انتخاب طبعی جس کو کہا جارہا ہے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ بطور تخلیق کے یہ بات ہو کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ادنی اور ضعیف مخلوق کو پیدا کیا ہو اس کے بعد اس سے زیادہ قوی اور اعلی مخلوق ادنی اور کمزور مخلوق سے نکالنے کے لیے بجائے مستقلاً پیدا کی ہو جس سے قوی کے لیے ضعیف سے تنازع للبقاء کی نوبت ہی نہ آئی، پھر اس سے زیادہ قوی او راعلی مخلوق مستقلاً پیدا کردی ہو اسی طرح سلسلہ چلتا آرہا ہو یہاں تک کہ موجودہ تمام انواع ظہور پزیر ہوگئی ہوں، ایسی صورت میں ارتقا کا نظریہ ازروئے عقل بھی بے گمان ہوکر مشکوک ہوجاتا ہے، اور ظواہر نصوص کی تائید کے ساتھ نظریہ خلق ہی راجح ہوجاتا ہے، اس طرح جب نظریہ ارتقا بے ثبوت ٹھہرا تو اس نظریہ پر انسان اور بندر کا اصل واحد سے پھوٹ کر (بطور انشقاق) نکلنے کی بنیاد بھی ظاہر ہے کہ نہیں رکھی جاسکی۔

سائنسدانوں کی باقی چیزوں میں جن کا تعلق تحقیقات مشاہدات سے ہے صرف اتنی خطا ہے کہ وہ انکا فاعل حقیقی مادہ کو قرار دیتے ہیں اور یہ باطل ہے بل کہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ہاں انسان کے لیے روح ہے جو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اسے لذت والم کا احساس ہوتا ہے۔ اس عقیدہ کی نفی پر اہل سائنس کے پاس کوئی برہان عقلی قطعی یا ظنی نہیں ہے۔ اسی سے عذاب قبر کے متعلق اشکالات بھی دور ہوگئے۔

اعتقاد معاد: پر نجات حقیقی کا مدار تو ہے ہی، نظام عالم دنیاوی کا دارو مدار اسی پر ہے، کیوں کہ خواہشات، شہوات، لذات کی ہوس کا مقابلہ محض قوانین اور قوانین کا علم نہیں کرسکتے۔ بل کہ نفوس کو مضرتوں سے بچانے اور طریق خیر کی اتباع پر آمادہ کرنے والی چیز ایمان بالمعاد اور مکافاۃ علی الاعمال ہی ہے۔ اگر انکار کیا جائے تو اس سے بڑا کوئی شر نہیں۔ فحصل ان انکار المعاد شر لا یماثله شر۔ (الشطر الثاني: دراية العصمة از: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی: ص ۵۷ تا ۹۱ ملخصاً)

فلسفہ، معقولات اور درس نظامی:

شبہات کے ازالہ کا کیا طریقہ ہو: ”اب نئے نئے شبہات ہونے لگے ہیں۔ ان نئے شبہات کا جواب بدون

اسی طرز جدید (تفسیر قرآن بہ طرز جدید، ف) کے نہیں ہوسکتا"۔ (جناب عبیداللہ سندھی) پرانے طرز کی تفسیروں کو اگر سمجھ کر پڑھ لیا جائے۔ سب شبہات کا جواب ان میں موجود ہے"۔ (حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ)
(ملفوظات حکیم الامت، الافاضات الیومیہ جلد ۱/ص ۲۷۵)

"اگر علم کلام میں، منطق میں مہارت ہو تو قرآن وحدیث اور فقہ کے سمجھنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے، غرض جو یہ چیزیں درس میں داخل ہیں، یہ بڑے کام کی ہیں"۔ (اشرف التفاسیر جلد ۴ ص/ ۷۲)

"خدا کی قسم اگر فکر ہو اور عمل کی نیت سے پڑھے تو یہی کتابیں کافی ہیں بلکہ اس سے تھوڑی، نہیں تو جامع فنون ہو تو بھی کچھ نہیں"۔ (ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۵ ص/۲۶)

یہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ارشادات ذکر کئے گئے آگے اس باب میں جستہ جستہ حضرت کے کچھ اور ارشادات سن لیجئے:

نئے پرانے تمام شبہات کی تفہیم میں درسی کتابوں کی اہمیت:

"ایک سلسلہ میں فرمایا: کہ میں کہا کرتا ہوں کہ درسی کتابیں اگر سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو پھر کسی اشکال کے جواب میں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ان میں سب کچھ ہے یہ ایسا قلعہ ہے کہ اس میں ہر قسم کی رسد جمع ہے، کھانا، پینا، بھی ہتھیار بھی گولا بارود بھی۔ اور درسی کتابیں پڑھ کر اگر کسی کو دوسرے علوم کی ضرورت اور محتاجی ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کتابیں سمجھ کر نہیں پڑھی جاتیں"۔ (ملفوظات حکیم الامت: ج ۲/ص ۳۰۸)

قابلیت دیوبند کے قدیم نصاب سے:

"اگر کتب درسیہ سمجھ کر پڑھیں تو بڑی قابلیت پیدا ہو مگر اکثر طالب علم سمجھ کر نہیں پڑھتے، آہ، پھر فرمایا کہ قابلیت نئے نصاب سے نہیں پیدا ہوتی، دیوبند کے قدیم نصاب سے نصیب ہوتی ہے، چناں چہ جدید نصاب کے جو بڑے بڑے مایہ ناز حضرات ہیں وہ اب اس ناکارہ سے رجوع کر کے اپنے علم کو علم ہی نہیں سمجھتے"۔ (ملفوظات حکیم الامت: ج ۱۰/ ص ۷۳)

درس نظامی کی تعلیم میں فلسفہ مفتی شفیع صاحب کی رائے: مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

فلسفہ اور عقلیات کی حقیقت اور اس کے پائے چوبیں کی ناپائیداری حضرت والد صاحب پر روز روشن کی طرح واضح تھی لیکن جب کبھی آپ کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کو درس نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والد صاحب اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل درس سے نکالا جائے تو اسلاف کی کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کی راہ مسدود ہو جاتی ہے، جو ہمارا گرانقدر سرمایہ ہیں، اس کے علاوہ منطق

وفلسفہ کی تعلیم سے ذہن وفکر کو جلا ملتی ہے اور ذہن مسائل کو مرتب طریقہ سے سوچنے کا عادی بن جاتا ہے، اور اس طرح یہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ، اور اصول فقہ کے مسائل کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

(میرے والد میرے شیخ از مفتی محمد تقی عثمانی ص ۳۹)

فلسفہ کی تعلیم کا مرتبہ: علوم و مسائل کے سمجھنے کا ایک ذریعہ اور آلہ:

حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ ”میں نے بھی فلسفہ کی کتابیں پڑھی ہیں، مگر کبھی ان پر بسم اللہ نہ کہی اعوذ باللہ پڑھ لیا کرتا تھا اور نہ کبھی دل لگا کر فلسفہ کو پڑھا۔ ایک آلی علم سمجھ کر پڑھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں، بڑا مشکل ہے اور کاموں کو چھوڑ کر پڑھا جائے تب آتا ہے میں نے ہمیشہ اسی طرح پڑھا مجھے تو مشکل معلوم نہیں ہوا۔ بہتوں کو پڑھا بھی دیا۔ ایک شخص نے عرض کیا فلسفہ کارآمد چیز تو ضرور ہے فرمایا: ہاں عمق نظر اور دقت فکر اس سے پیدا ہوتی ہے“۔

(کمالات اشرفیہ، ص ۲۵۶ تا ۲۵۷)

فلسفہ کا فائدہ دقت فکر اور عمق نظر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشاد:

آج کل کے بڑے تعلیم یافتہ کو بھی اتنا پتہ نہیں کہ دلیل کس کو کہتے ہیں؟ نظیر کا نام دلیل رکھا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ معراج کی دلیل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ فی نفسہ ممکن ہے اور مخبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے۔ کہا یہ کیا دلیل ہے، میں نے کہا ہے تو یہ دلیل، پھر کہنے لگے کوئی اور بھی آسمان پر گیا ہے؟ یہ ان کے نزدیک دلیل تھی۔ نظیر کو دلیل سمجھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا اس پر بھی یہ اشکال تو ہوگا کہ اس دوسرے کا جانا تب ثابت ہوگا کہ اس سے پہلے کون گیا، پھر اس تیسرے کی بابت بھی یہی سوال ہوگا، تو اس سے تو کچھ بھی ثابت نہ ہوگا“۔

(ملفوظات جلد ۲۶۔ الکلام الحسن ص ۲۴۳)

”یہ فلاسفران زمانہ کی عقلیں ہیں۔ دوسرے کی نہ سمجھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ اپنی ہی کہے جاتے ہیں، اور پھر اپنے ہی آپ کو عقلمند بھی سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ عجیب سوال ہوتا ہے کہ نظیر کی ضرورت ہے، اگر نظیر کی ضرورت ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ وہ بھی ایک واقعہ ہے۔ آیا اس کے لیے نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو وجہ فرق کیا اور اگر ہے تو پھر اس نظیر میں بھی گفتگو ہوگی۔ اگر اس کا کہیں انتہا نہ ہوا تو تسلسل لازم آویگا اور اگر انتہا ہوگیا تو اس نظیر اخیر اور اس واقعہ مبحوث عنہا میں آخر کیا فرق ہے۔

یہ آج کل کا فلسفہ ہے۔ لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ فلسفہ کس چیز کا نام ہے۔ آج کل کا فلسفہ مادیات سفلیہ کے ترکیب وتحلیل یعنی صنائع وبدائع کا نام ہے، حالاں کہ یہ فلسفہ کی ایک شاخ ہے جو تمام شاخوں سے ادنیٰ اور خسیس ہے جس کو طبعیات کہتے ہیں۔ ان کی رسائی مادیات علویہ تک بھی نہیں الٰہیات تو بہت بالاتر ہیں۔

(ملفوظات جلد ۲۹ مجالس الحکمت، جامع ملفوظات حکیم محمد مصطفی بجنوری ص ۷۴ ، ۷۵)

البتہ پرانے فلسفہ میں اس سے کچھ تعرض ہے گو اس میں عقل کو کافی سمجھنے کی وجہ سے انہوں نے غلطیاں کی ہیں۔ تاہم ان کی نظر ان (فلاسفہ جدیدہ) سے بہت دقیق ہے اور اس فلسفہ کے پڑھنے سے دقت فکر اور عمق نظر پیدا

ہوجاتا ہے۔ان کو بات کا سمجھنا سمجھانا سہل ہوتا ہے"۔(ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۶۔ الکلام الحسن ص ۲۳ الاخری ۱۴۲۳ھ جامع ملفوظات مفتی محمد حسن امرتسری)

فلسفہ پر لوگ بہت دلدادہ ہیں: "پرانا فلسفہ کچھ تھا بھی، جہاں تک عقل کی رسائی ہوسکی ہے وہاں تک وہ لوگ پہنچے۔جب عقل کو اپنی حد سے بڑھا دیا تو ٹھوکریں کھائیں۔وہاں ایک رہبر کی ضرورت تھی اس کے ساتھ چلتے تو بہت کچھ حاصل ہوتا وہ رہبر وحی ہے مگر وہ اس دھوکہ میں رہے کہ عقل ہی کافی ہے حالاں کہ الہیات میں عقل کی مثال آنکھ کی سی ہے۔آنکھ میں قوت بصارت بیشک ہے اور دیکھنے کا آلہ یہی ہے، لیکن اندھیرے میں روشنی کا محتاج ہے۔بلا روشنی کے عدم ووجود اس کا برابر ہے،اس سے انکار نہیں کہ آنکھ اچھی چیز ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اس کے لئے دوسری روشنی بھی موقوف علیہ ہے اور آج کل کا فلسفہ تو عجیب چیز ہے۔لوگوں نے اس کا نام ترقی رکھا ہے۔حالاں کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ دل میں خودی اور خودرائی پیدا ہوجاتی ہے اور آپ ہی آپ حقیقت کا دعوی کرنے لگتے ہیں۔آج کل کے فلسفیوں کی سمجھ ایسی موٹی ہوتی ہے کہ ذرا ذرا سی بات نہیں سمجھتے اور خود سمجھتے نہیں اور دوسرے کی سنتے نہیں۔اور اپنے ہی آپ کو عقلمند سمجھتے ہیں۔حالاں کہ جواب ایک بات کا بھی نہیں آتا"۔

"ایک مرتبہ ریل میں مجھ سے فلسفہ کے ایک مسئلہ یعنی حدوث وقدم عالم میں مسٹر حشمت اللہ خاں صاحب جنٹ نے کچھ گفتگو کی۔انہوں نے فلسفہ پڑھا ہے میں نے تقریر کی تو میری تقریر سے بے حد مسرور ہوئے اور کہا کہ ایسی تقریر وتحقیق میں نے کبھی نہیں سنی۔ان کی بحث سے میرا دل بھی نہیں اکتاتا تھا اور جتنا وہ پوچھتے تھے اتنی ہی طبیعت کھلتی تھی۔وجہ یہی ہے کہ وہ فلسفہ جانتے تھے اور قاعدہ کی گفتگو کرتے تھے اور رہے آج کل کے عقلمند سو بس اپنے ہی دل سے عقل مند ہیں،ورنہ ان کو حقیقت شناسی اور فلسفہ سے مس بھی نہیں۔واقعی جب کسی ذی علم سے گفتگو ہوتی ہے،تو مجیب کو کبھی گراں نہیں گزرتی،بل کہ لطف آتا ہے،اور اس گفتگو پر نتیجہ بھی متفرع ہوتا ہے،یعنی کوئی تحقیق حاصل ہوجاتی ہے اور جاہلانہ گفتگو تو جنگ وجدال اور تضییع وقت ہے"۔(ملفوظات حکیم الامت،مجالس الحکمت از حکیم محمد مصطفی بجنوری ص ۱۷۵)

معقولات اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ:

معقولات پڑھایا جاتا تھا ان کا پڑھنا پڑھانا موجب اجر سمجھا جاتا تھا کیوں کہ مقصود ان کا اچھا تھا۔

اس اخیر زمانہ میں جن حضرات سے دین کو نفع ہوا۔وہ معقول ہی کی بدولت ہوا۔انہوں نے معقول کو منقول کرکے دکھلادیا تاکہ اغبیاء کی سمجھ میں آجائے۔مولانا یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں جس طرح مطالعہ بخاری کو موجب اجر سمجھتا ہوں اسی طرح میر زاہد اور امور عامہ کو۔کیوں کہ مقصود ان کا اچھا تھا۔

(ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۵۔ملفوظات اطہر ص ۶۹)

معقولات کی مدد سے تفسیر وحدیث سمجھنے میں سہولت:

حضرت حکیم الامت نے احادیث صلاۃ اللیل میں لطیف تطبیق دیتے ہوئے ارشاد فرمایا!

حدیث ماکان یزید علی احدی عشرۃ رکعۃ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ گیارہ رکعت پر زیادہ نہ کرتے

تھے۔ بظاہر باقی روایات کے خلاف اور متعارض (مزاحم) ہے جن میں کم وبیش الاحیانا صلوٰۃ الضحیٰ کا ذکر ہے۔اس کی نہایت لطیف تطبیق ارشاد فرمائی کہ اس حدیث میں عدم استمرار زیادت (ہمیشہ زیادہ نہ ہونا) یعنی سلب دوام کلی ہے نہ دوام السلب الکلی اب کوئی تعارض نہیں۔(جلد ۱۵، خیر الافادات ص ۲۵۳)

علوم عالیہ مسئلہ تقدیر میں 'فرمایا کہ اگر لکھا ہوا بھی نہ ہوتا تب بھی چوں کہ علم وقدرت کا ہر حادثہ سے تعلق ہے، اس کے خلاف ہرگز نہ ہوتا قضیہ عقلیہ مسلمہ ہے، الشیء مالم یجب لم یوجب'' (ملفوظات حکیم الامت: ج ۲ ۱۱ الافاضات الیومیہ: ج ۲/ص ۲۸۲) علوم آلیہ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے قرآن کریم کے بعض مشکل مقام کے اشکال کو حل کرتے ہوئے فرمایا: مثلاً آیت کریمہ (پ۹ انفال) و لو علم اللہ فیھم خیرا لاسمعھم و لو اسمعھم لتولوا وھم معرضون (اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں خوبی دیکھتے تو ان کو سننے کی توفیق دیتے اور اگر ان کو اب سنا دیں تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے)۔اس میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ قیاس منطقی کی ایک شکل ہے اور حد اوسط حذف ہونے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے ولو علم اللہ فیھم خیرا لاسمعھم ولو اسمعھم لتولوا لیکن ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ بالکل غلط ہے تو اب اشکال یہ ہے کہ نتیجہ غلط کیوں نکلا۔تو پھر فرمایا کہ ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ حد اوسط کا مکرر ہونا جو شرائط انتاج ہے، وہ اس شکل میں موجود نہیں کیونکہ پہلا اسمعھم سماع بمعنی القبول سے مشتق ہے اور دوسرا اسمعھم سماع حاسہ کے معنی میں ہے، اس لیے دو جگہ اسمعھم کا لفظ اگرچہ مکرر ہے مگر معنی الگ الگ ہیں اس لیے حقیقۃً تکرار اوسط نہیں ہوا اس لیے نتیجہ غلط نکلا۔اب اگر کسی کو منطق نہ آتی ہو تو اشکال کا حل سمجھنا اس کو دشوار ہے۔

(آیت) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (پ ۱۷) (اور ہم کتابوں میں لوح محفوظ کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے) کے متعلق ایک صاحب نے مجھ سے (حضرت حکیم الامتؒ سے) سوال کیا کہ آج کل یہ واقعہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ عموماً زمین پر کفار اور فجار کا تسلط ہے۔سوال کرنے والے ایک مولوی صاحب تھے میں نے ان سے پوچھا یہ کون سا قضیہ ہے۔محصورہ یا مہملہ کہنے لگے مہملہ۔میں نے کہا کہ قضیہ مہملہ حکم میں جزئیہ کے ہوتا ہے۔کلیہ نہیں ہوتا، اس لیے اس آیت کا یہ مفہوم ہی نہیں کہ ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر زمانہ میں یہی حال رہے گا، کہ صالحین زمین کے وارث ہوں۔بل کہ بعض مرتبہ ایسا ہوا اس قضیہ کے صدق کے لیے کافی ہے۔اب منطق کی وجہ سے اس کا جواب کس قدر سہل اور مختصر ہو گیا۔
(جلد ۱۵۔فیض الرحمن ص ۱۹۴ تا ۱۹۶)

یہی تو فرق ہے ندوہ اور دیوبند میں:

ایک ندوی مولوی صاحب نے ایک کتاب جس کا نام صحیح یاد نہیں میرے دیکھنے کو بھیجی تھی جو انہوں نے خود لکھی تھی اس میں ایک مقالہ مجھ کو بہت پسند آیا لکھا تھا کہ اس کی کوشش کرنا کہ نقلیات کو معقولات پر منطبق کریں اور دلائل عقلیہ سے ثابت کریں۔یہ سخت غلطی ہے کیونکہ مذہب ایمان اور انقیاد محض کا نام ہے اس میں رضا وتسلیم کے سوا کچھ نہیں اور معقولات میں دلائل عقلیہ اور نظریہ کی ضرورت ہے۔

ندوہ اور دیوبند میں یہی تو ایک فرق ہے، اب یہاں اہل دیوبند کی ضرورت سمجھیں گے کہ اس کے ساتھ یوں اور لکھا جاتا ہے کہ واقعی فروع میں تو ایسا ہی ہونا چاہیے ان میں دلائل عقلیہ نظریہ کی ضرورت نہیں لیکن اصول میں دلائل عقلیہ کی ضرورت ہے۔ خدا کا خدا اور رسول کا رسول ہونا ہم دلائل عقلیہ سے ثابت کردیں گے لیکن فروع میں تفویض محض ہوگی۔ اور اہل مذاہب باطلہ اپنے اصول پر دلیل عقلی صحیح قائم نہیں کرسکتے۔ (جلد ۱۱، ص ۱۱۸ تا ۱۱۹)

ماخذ ومراجع:

اشرف التفاسیر جلد ۲	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
فہم انسانی (ترجمہ ہومن انڈر اسٹینڈنگ از ڈیوڈ ہیوم)	مولانا عبد الباری ندویؒ
ہماری سائنٹیفک طب یونانی	حکیم عبد اللطیف فلسفی
تبع تابعین حصہ اول	مولانا مجیب اللہ ندوی
تسہیل الفلسفہ	مولانا ارشاد صاحب (استاذ فقہ وحدیث ریاض العلوم گورینی)
تاریخ طب	حکیم سید علی حیدر جعفری
معین الفلسفہ	مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری
تلخیص الہدایہ	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
درایۃ العصمۃ حصہ اول	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
درایۃ العصمۃ (ایرادات علی الفلسفۃ القدیمۃ)	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
درایۃ العصمۃ (تنقیدات علی الفلسفۃ الجدیدۃ)	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
ملفوظات حکیم الامت الافاضات الیومیہ جلد ۱ ص ۲۷۵	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
اشرف التفاسیر جلد ۴/ص ۴۲	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۵۔ ملفوظات اطہر ص ۶۶ تا ۶۹۔ الافاضات الیومیہ جلد ۴/ص ۸۰۳۔ جلد ۱۰/ص ۴۳	
کمالات اشرفیہ حصہ دوم ص ۲۵۵ تا ۲۵۶	
الکلام الحسن جلد ۲۶/ص ۲۴۳	مفتی محمد حسن امرتسری
میرے والد میرے شیخ	مفتی تقی عثمانی
ملفوظات مجالس الحکم۔ حکیم محمد مصطفی بجنوری جلد ۱۷	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۵ (خیر الافادات از مولانا خیر محمد صاحبؒ)	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۔ الافادات الیومیہ جلد ۲/ص ۲۸۲۔ جلد ۱۵۔ فیض الرحمن ص ۱۹۴ تا ۱۹۶	
یادوں کے چراغ	مفتی عبد القدوس رومی مفتی شہر آگرہ

نور الانوار و شرحہ قمر الاقمار | حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ
جدیدیت کا تنقیدی تناظر | (اشتیاق احمد)

اہمیتِ حفظِ قرآن

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے اور اس ذمہ داری کو اللہ تعالیٰ نے یوں پورا کیا کہ پوری امت کے دلوں میں حفظِ قرآن کی محبت اور شوق ڈال دیا اور اس کے حفظ کو آسان فرما دیا" وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ "یعنی ہم نے اس کے حفظ کو آسان کر دیا اور ہم اس کی مدد کریں گے جو اس کو حفظ کرنا چاہے، پس ہے کوئی اس کو حفظ کرنے کا طالب پس اس کی مدد کی جائے" چناں چہ جو خوش نصیب بچے اپنے سینوں میں قرآن محفوظ کر لیتے ہیں ایسے بچوں کو حافظ کہا جاتا ہے، سلف صالحین میں حفظِ قرآن اور اس کی تعلیم کا خاص ذوق تھا اسی لیے پہلے شاگردوں سے قرآنِ پاک حفظ کرواتے بعد میں دوسرے علوم کے سیکھنے کی اجازت دیتے، ولید بن مسلم سے منقول ہے کہ جب بھی ہم امام اوزاعیؒ کی مجلس میں ہوتے، اور کوئی نو وارد شخص مجلس میں ہوتا تو امام اوزاعیؒ اس سے پوچھتے کہ اے شخص تو نے قرآن حفظ کیا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہوتا تو اس کا امتحان لیتے اور آیاتِ مواریث "يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ الخ" سنتے، اگر وہ شخص یہ آیتیں نہ پڑھ سکتا تو اس سے فرماتے کہ جاؤ پہلے قرآن حفظ کرو، بعد میں علم (حدیث) سیکھو، امام اوزاعیؒ میراث سے متعلق آیات کا اس لیے امتحان لیتے کہ یہ مشکل آیات میں سے ہیں کیوں کہ ان میں متشابہات ہیں، ان کو وہی شخص بلا تردد اور بغیر شک و غلطی کے یاد کر سکتا ہے جو ذہین ہو اور اس کا حافظہ قوی ہو۔

علم ہیئت

از: حکیم فخر الاسلام الہ آبادی

"علم ہیئت وہ علم ہے جس میں آسمانوں اور ستاروں کے حالات کرہ زمین کی مسافت اور انسانی زندگی پر پڑنے والے آسمانی اثرات کا بیان کیا جائے"۔

فلاسفہ نے جب محسوس کیا کہ نظام کائنات اور عالم عناصر میں انقلابات و حوادث کا ذمہ دار نظام فلکی کی گردش ہے، گردش فلکی سے عالم عناصر میں رات دن ماہ و سال اور موسموں کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے تو انہوں نے ہیئت کے مسائل کو بطور خاص موضوع بنایا اور پھر چاند، ستارے، سیارات، ثوابت، آفتاب، کواکب اور کہکشاؤں کی ماہیت و حقیقت کے باب میں جستجو اور تلاش شروع ہوئی۔ زمین کو پہلے ساکن تسلیم کیا جاتا تھا۔ بعد کی تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ زمین

متحرک ہے۔ زمین نظامِ شمسی کا ایک سیارہ ہے، ستارے سیارے، نظامِ شمسی اور کہکشاں کے بارے میں علم ہیئت اور فلکیات کے ماہرین نے اپنے خیالات ذکر کئے کہ:

تمام ستارے گیس سے بنے ہیں، اس طرح کہ گیس کے اجزاء نے اژدحام کی وجہ سے ایک مقام پر بگولے کی طرح گردش شروع کر دی، گردش کے دوران اجزاء باہم ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے، مدت مدید کے بعد وہ چمک دار حسین اجسام بنے، یہی روشن اجسام ستارے کہلاتے ہیں۔

سیارے کے گرد حرکت کرنے والا چاند، سورج کے گرد گھومنے والا سیارہ اور سیاروں کا مرکز اور مستقل نظام رکھنے والا آفتاب کہلاتا ہے۔

ایک وقت میں تیز بصارت رکھنے والے کو بھی تین ہزار سے زیادہ ستارے نظر نہیں آسکتے بڑی سے بڑی دوربین سے جو زیادہ سے زیادہ ستارے نظر آسکتے ہیں ان کی تعداد دس کروڑ ہے۔

کائنات میں ہماری کہکشاں کے مانند کئی کروڑ کہکشائیں موجود ہیں اور ہر ایک کہکشاں ارب ہا کواکب پر مشتمل ہے، خود ہماری کہکشاں میں ایک کھرب ستارے موجود ہیں۔

ماہرین کی رائے میں کل ستاروں کی تعداد (۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰) ہے (دو سے پہلے ۲۴ صفر ہے) لیکن یہ محض تخمینہ اور موہوم اندازہ ہے۔ سر جیمس جینس کہتا ہے کائنات میں ستاروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے جتنے ریت کے ان گنت ذرے۔ سر جیمس جینس ایک عیسائی محقق ہے، سائنس اور فلسفہ دونوں کا ماہر ہے۔

ستاروں کی درجہ بندی:

کون سے ستارے زیادہ روشن ہیں اور کیوں؟ اور کون سے کم روشن؟ اس لحاظ سے ان کی درجہ بندی کی گئی ہے، جو سب سے زیادہ روشن ستارے ہیں ان کو درجہ اول، یا قدر اول میں رکھا گیا۔ قدمائے یونان بطلیموس وغیرہ کے نزدیک ان کے چھ درجات مقرر ہیں۔ دوربین کی ایجاد کے بعد یہ درجات چھ سے بڑھ کر بیس ہو گئے۔

سب سے روشن ستارہ "شعریٰ یمانی" ہے۔ پھر "سہیل"۔

مطلع استوائی نقطہ اعتدال ربیعی (برج حمل) سے شمار کرتے ہیں۔ کسی ستارے کا مطلع استوائی چار گھنٹے ہو تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ستارہ نقطہ اعتدال ربیعی سے چار گھنٹے بعد نصف النہار پر پہنچے گا۔

آسمان کے شمالی حصہ میں مجموعہ "دُبِّ اکبر" (بڑا ریچھ) تمام مجامع النجوم سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے سات روشن ستارے عربی میں "بنات النعش کبریٰ" کہلاتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک مدھم ستارہ ہے لوگ اس کے دیکھنے میں قوت باصرہ کا امتحان لیتے ہیں اس کا نام "سہا" ہے۔ عربی اشعار و محاورات میں سہا کا ذکر بہت آتا ہے۔

"بنات النعش کبریٰ" کے دو ستارے (ا-ب) "بادیین" کہلاتے ہیں۔ ان میں سے گزرتا ہوا خط

مستقیم ''قطب تارے'' کی نشاندہی کرتا ہے۔

قطب تارا ایک اور مجمع النجوم کا حصہ ہے جو دُبّ اصغر (چھوٹا ریچھ) یا نبات النعش صغری کہلاتا ہے۔

قطب تارے کے ذریعہ سمت قبلہ معلوم کرتے ہیں۔

قطب تارے کے ایک طرف دُبّ اکبر اور دوسری طرف پانچ روشن ستاروں کے مجموعے کا نام ذات الکرسی ہے۔

چار ستارے اور ہیں جن کی صورت ایک اژدہے کی سی ہے جو قطب شمالی کے گرداگرد واقع ہیں، انہیں مجمع النجوم تنین کہتے ہیں۔

شمالی ستاروں میں مجمع النجوم شلیاق ہے اس میں سب سے زیادہ روشن ستارا ''نسر واقع'' (جھپٹتا ہوا گدھ) ہے۔

دب اکبر کی دم میں سرخ رنگ کے روشن ستارے ہیں جو سماک رامح یا حارس کہلاتے ہیں۔

ستاروں کا ایک عقد برج ثور کا حصہ ہے جسے ثریا کہتے ہیں، مطلع صاف ہو، بصارت اچھی ہو تو گیارہ ستارے دکھائی دیتے ہیں بڑی دوربین سے ۱۲۵ رتک نظر آتے ہیں، ثریا مشہور ومعروف ستاروں کا جھنڈ ہے، جس کے نام سے سب واقف ہیں۔ بنیاد جس چیز کی بھی کمزور ہو اس پر بننے والی عمارت خواہ ثریا تک پہنچ جائے کمزور ہی ہوگی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یہ شعر بطور ضرب المثل کے پڑھا جاتا ہے:

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رَوَد دیوار کج

برج ثور کا دوسرا حصہ الدبران ہے، یہ قطب تارے کے مخالف جانب ہے۔

قطب و دبران کو ایک خط پر اپنے سامنے فرض کریں تو بائیں جانب موسم سرما کا مشہور مجمع النجوم، الجبار ہے۔ الجبار میں دو روشن ستارے ہیں، ایک کو ابط الجوزا اور دوسرے کو رجل الجوزا کہتے ہیں، ان دونوں کے بیچ میں تین ستارے جن کو نطاق الجوزا اور انہیں کے قریب ذرا کم روشن ستارے سیف الجبار کہلاتے ہیں۔

نطاق الجوزا میں سے گزرتا ہوا ایک خط نیچے کی طرف بڑھائیں تو شعرائے یمانی پر جا پہنچے گا اسے کلب الجبار اور عبور بھی کہتے ہیں۔ یہ آسمان پر زہرہ کی بعد سب سے زیادہ روشن ستارہ ہے۔

یہی کلب اکبر ہے اس سے شمال کی طرف قریب ہی مجمع نجوم کا کلب اصغر (چھوٹا کتا) ہے اسی میں روشن ستارا شعرائے شامی واقع ہے۔

دب اکبر کے بعض ستاروں مین سے گزرتا ہوا خط مجمع النجوم کے جس حصہ سے گزرتا ہے اسے توأمین (راس التوأم المقدم۔ راس التوأم الموخر) کہتے ہیں اسی کو جوزا بھی کہتے ہیں۔

دب اکبر کے ستاروں میں سے گذرتا ہوا خط کسی قدرتِ چھابڑھائیں الاوخمیلین پر ۲۳ تک اعزل ہے، اور یہ مجمع النجوم عذرا (سنبلہ) کا روشن ستارا ہے۔

بادیین کے جس طرف قطب تارا ہے اس سے دوسری طرف یعنی جنوب میں مجمع النجوم اسد واقع ہے۔

اس مجمع النجوم اسد میں قطب الاسد اور ذنب الاسد نام کے تارے ہیں۔

نسر واقع کے قریب مجمع النجوم دجاجہ ہے، اس مجمع کے پانچ ستارے مل کر صلیب کی شکل بناتے ہیں، اس لیئے وہ صلیب شمالی کہلاتے ہیں، ایک ذنب الدجاجہ دوسرا منقارالدجاجہ اور باقی چار فوارس کہلاتے ہیں۔

نسر واقع اور منقارالدجاجہ کے بیچ میں ذرا ترچھے طور پر مجمع النجوم عقاب ہے، اس میں تین ستارے ہیں وسط والا نسر طائر ہے۔

عالم شمسی

ہماری زمین، چاند اور سورج کے گرد گھومنے والا سیارہ اور سیاروں کا مرکز آفتاب، ان سب سے مل کر ایک پورا نظام قائم ہوتا ہے جو نظام شمسی کہلاتا ہے، اس نظام شمسی کی ابتدا کے متعلق سائنس دانوں کے اپنے اپنے نظریات ہیں جنہیں مختصراً یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) بفن کا نظریہ بفن نے ۱۷۵۰ء میں یہ خیال پیش کیا کہ زمانہ قدیم میں سورج اور ایک آوارہ دمدار تارے کے درمیان یکایک تصادم ہوگیا، دونوں کے جسم سے جلتے ہوئے مادے کے بڑے بڑے شرارے چھوٹے۔ ان شراروں یا ٹکڑوں میں سے کچھ تو خلا میں گم ہو کر رہ گئے اور کچھ دمدار تارا اپنی کشش کے زور سے اپنے ساتھ لے گیا اور کچھ کو سورج نے اپنی قوت جاذبیت سے واپس کھینچ کر تابع بنا دیا چناں چہ وہ مختلف مداروں پر سیاروں کی شکل میں آفتاب کے چاروں طرف گھومنے لگے۔

(۲) اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ نظام شمسی ابتدا میں گیس کی حالت میں ایک سحابی مادہ تھا پھر آہستہ آہستہ سکڑنے لگا اور اس کے تکاثف سے مختلف اجرام نمودار ہوئے جن میں سب سے بڑے جرم کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی اور دیگر اجرام اس کے گرد گردش کرنے لگے، یہی مرکزی جسم آفتاب کہلاتا ہے اور باقی اجسام کو سیارے کہتے ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق سیارے خود بہ خود سورج سے پیدا ہوئے آفتاب کے اندر ایک زبردست انقلاب پیدا ہونے لگا جس نے اس کے جسم سے کچھ مادہ باہر نکال پھینکا، پھر وہ مادہ مدت کے بعد منجمد ہو کر سیارہ بنا پھر وہی عمل آفتاب میں ہوا اور دوسرا سیارہ وجود میں آیا علی ہذا القیاس سات سیارے (سبعہ سیارہ) اور نئی تحقیق کی روشنی میں نو ستارے ظہور میں آئے۔ اور ماہرین کا کہنا ہے کہ ۱۰ رواں سیارہ بھی ہے جس کی جستجو جاری ہے۔ یہ نظریہ

فرانسیسی ریاضی داں لیپ لیس کا ہے جو دراصل مشہور جرمن فلسفی ایمنوئل کانٹ کے الآخری نظریے ۱۲۳۰ھ سے ماخوذ ہے۔

کانٹ کے مطابق ابتدا میں تمام فضائے بسیط لطیف مادی ذرات سے پر تھی۔ یہ مادی ذرات کسی سبب سے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے، آخر کار انہوں نے بہت بڑے کرہ کی شکل اختیار کرلی، پھر اس میں دوری حرکت پیدا ہوگئی اور سکڑاؤ نمودار ہوا۔ آخر کار زیادہ سکڑاؤ سے اس کی رفتار اتنی تیز ہوئی کہ جس طرح گردش کرتے وقت کمہار کی چاک کے کنارے سے کچھ مٹی اڑنے لگتی ہے اسی طرح کرہ آفتاب سے کچھ مادہ الگ ہوگیا اور یہی مادہ ٹھنڈا ہوکر اس سے زمین اور سیارے بن گئے۔

لیپ لیس کا نظریہ ایک صدی تک رائج رہا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں سر جیمس جنز وغیرہ نے بفن کا نظریہ ہی کسی قدر اصلاح کے ساتھ پیش کیا۔

(۳) ایک نظریہ یہ ہے کہ کئی ارب سال پیشتر سورج کے گرد اس کا تابع ایک بڑے ستارہ میں آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کے مانند ہلچل پیدا ہوئی اجزاء کے باہمی دباؤ کے نتیجہ میں محوری حرکت تیز ہوئی، قوت طاردہ ستارے کی مرکز گریز طاقت میں اضافہ ہوا اور ایک زبردست قیامت خیز دھماکہ سے وہ ستارہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا، گیس کے یہ آتشیں ٹکڑے فضا میں بکھر گئے، ان میں سے نو بڑے بڑے ٹکڑے نو سیارہ بن گئے۔

یہ نظریہ ہویل وغیرہ کا ہے، جس کی رو سے نظام شمسی کی طرح کئی کروڑ نظام موجود ہیں۔

نظریہ مرکزیت شمس

قدیم علم ہیئت کے معلم اول ارسطو کے نزدیک عالم کا مرکز زمین ہے، سیارات وثوابت بلکہ سارا جہاں اس کے گرد گھوم رہا ہے، یہ نظریہ ڈیڑھ ہزار سال تک مسلم رہا تھا اس کو بطلیموسی نظریہ یا بطلیموسی نظام بھی کہتے ہیں۔ جدید فلکیات میں سورج کو مرکز مانا جاتا ہے اور جدید علم فلکیات کا بانی کوپرنیکس پولینڈی کو بتایا جاتا ہے لیکن قدماء میں حکیم فیثا غورس (م ۴۹۷ ق م)، حکیم ارسٹارکومن (۲۸۰ ق م) حکیم پلوتارکا ئیرونی (و ۱۵ ق م متوفی ۴۲، اور ۵۰ء کے درمیان) اور ہراک لڈیسن اپنی آخری رائے کے تحت مرکزیت شمس کے قائل تھے۔

لیکن سب سے حیرت انگیز تحقیق اس باب میں ابو اسحاق بن یحیٰ زرقانی اندلسی قرطبی (۱۰۲۹ء تا ۱۰۸۷ء) کی ہے جس نے بطلیموسی نظام پر کاری ضربیں لگائیں اور (۱۰۸۰ء) میں یہ نظریہ پیش کردیا کہ زمین محور پر بھی اور آفتاب کے گرد بھی محو حرکت ہے اسی طرح تمام سیارے بھی آفتاب کے گرد گردش کر رہے ہیں۔

زرقانی یورپ میں ارزاکیل (ARZACHEL) کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲ویں صدی میں کریمونا کے جرارڈ نے اس کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ۱۱۴۰ء میں ماسلینر کے ریمنڈ نے ہیئت میں جتنا کام کیا اس

کی بنیاد زرقالی کے نقشوں اور جدولوں پر رکھی گئی۔ کوپرنیکس جس کے سر جدید فلکیات میں مرکزیت شمس کے نظریہ کا سہرہ باندھا جاتا ہے، اس نے اپنی کتاب میں زرقالی سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود محققین کی نظر میں کوپرنیکس کا نظریہ بطلیموسی نظریہ کی طرح پیچیدہ تھا کیوں کہ اس کی رائے میں بھی سیاروں کے مدار گول تھے بعد میں کپلر نے کوپرنیکس کے نظریے کی اصلاح کی اور وہی زرقالی کا نظریہ پیش کیا۔

زرقالی کے نظریہ میں کوئی جھنجلک نہیں کیوں کہ اس کے خیال میں سیاروں کے مدار بیضوی ہیں۔

نورالدین البطر وجی (وفات ۱۲۰۴ء) اشبیلیہ کا نامور فلکی بھی گردش ارض کا قائل تھا۔

اس طرح گردش ارض کا کوپرنیکس کا نظریہ درحقیقت مسلمان سائنس دانوں کا نظریہ ہے۔

(ماخوذ از فلکیات جدیدہ از مولانا موسیٰ روحانی بازی از ابتدا تا ص ۳۲ جستہ جستہ)

۱۶۰۹ء میں دوربین کی ایجاد ہوئی۔ اور ۱۶۱۰ء میں گلیلیو نے دوربین کے ذریعہ زہرہ سیارہ کا مشاہدہ کیا، اور آفتاب کی سطح پر موجود داغوں کے گھومنے سے گلیلیو نے آفتاب کی محوری حرکت کا بھی پتہ لگایا تھا۔

احتراق کوکب

جب سورج اور زمین کے درمیان اجرام سماوی میں سے کوئی جرم (کوکب) سورج پر سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو اسے احتراق کوکب کہتے ہیں، چاند جب کبھی سورج پر گزرتا ہے تو وہ کسوف کہلاتا ہے۔

بوقت احتراق زہرہ یا عطارد کا تاریک ترین پہلو زمین کی طرف ہوتا ہے اس وجہ سے وہ آفتاب کی سطح پر ایک سیاہ داغ سا نظر آتا ہے۔ احتراق جب زہرہ کے ایک عقدہ پر ہوجائے تو آٹھ سال بعد اسی عقدہ پر احتراق ممکن ہے، اس کے بعد ۲۳۵ سال بعد۔ اس طرح کے اندازے لگائے گئے ہیں۔ احتراق کی اس حقیقت کا انکشاف اور تفصیلات کا علم جدید علم ہیئت کے ذریعہ حاصل ہوا مگر علمائے ہیئت قدیم بھی اس سے آشنا تھے۔

شرح چغمینی میں ہے کہ بوعلی بن سینا نے آفتاب پر زہرہ کو مثال داغ نیز زہرہ اور عطارد دونوں کو دو داغوں کے مانند دیکھا تھا۔ ابن ماجہ اندلسی نے ایک دن طلوع شمس کے وقت عطارد اور زہرہ دونوں کو آفتاب کی سطح پر دو سیاہ داغوں کی شکل میں دیکھا۔ (فلکیات جدیدہ: ۵۳ تا ۵۶)

روشنی اور رنگ

سورج مختلف قسم کی برقی مقناطیسی موجیں پیدا کر کے تمام عالم میں روشنی پھیلاتا ہے۔ بقول نیوٹن (۱۶۴۲ تا ۱۷۲۷) کے روشنی دراصل سات رنگوں کا مجموعہ ہے۔ سرخ، نارنجی، زرد، سبز، آسمانی، نیلا اور بنفشی بعض ماہرین کے نزدیک تین رنگ سرخ، زرد اور آسمانی اصول کا درجہ رکھتے ہیں اور باقی چار رنگ ان تینوں کی

آمیزش سے پیدا ہوتے ہیں۔

سفید کاغذ اس لیے سفید نظر آتا ہے کہ وہ سات رنگوں میں سے کسی ایک کو بھی جذب نہ کرسکا بل کہ رنگوں کی ساری موجیں اس کاغذ سے ٹکرا کر منعکس ہونے لگیں۔

سرخ نظر آنے کا مطلب یہ ہے کہ سرخ لہروں کے سوا سب اس میں جذب ہوئیں وعلی ہذا القیاس۔

روشنی کے یہ رنگ حرارت کے حامل ہیں، سفید کپڑا سب سے ٹھنڈا اس لیے ہے کہ اس میں ایک رنگ بھی جذب نہیں ہوسکتا۔اور کالا کپڑا سب سے گرم اس لیے ہے کہ حرارت کی حامل ساری موجیں اس میں سمٹ جاتی ہیں۔

قوس قزح

روشنی کے یہی سات رنگ قوس قزح میں چمکتے ہیں، فضا میں موجود پانی کے قطرے منشور مثلثی (PRISM) کا کام سرانجام دیتے ہیں، ان قطروں سے سورج کی کول پٹی بن جاتی ہے۔یہ ہے قوس قزح کی حقیقت۔(فلکیات جدید ص ۸۹،۹۵)

شعاع بالائے بنفشی کے زہریلے اثر سے حفاظت کا قدرتی نظام:

روشنی کے سات رنگوں کی موجوں کے ایک کنارے پر سب سے بڑی طویل موج سرخ ہے اور دوسرے کنارے پر کمتر طویل موج بنفشی ہے۔

سائنسی آلات کی مدد سے یہ انکشاف ہوگیا ہے کہ بنفشی سے بھی چھوٹی موج کی شعاع موجود ہے اس کا نام بالائے بنفشی ہے۔یہ زہریلی شعاعیں ہیں۔فضا کا ایک خاص طبقہ اوزان ہے (اوزون گیس آکسیجن ایٹموں کی ایک خاص ترکیب ہوتی ہے)۔

یہ طبقہ زمین سے ۳۰ میل کی بلندی پر شروع ہوتا ہے اور یہ اوزوں طبقہ بالائے بنفشی کے بیشتر حصہ کو ہم تک پہنچنے سے پہلے پہلے جذب کرکے ختم کردیتا ہے۔اس طرح بالائے بنفشی لہروں کی تھوڑی سی مقدار زمین تک پہنچتی ہے۔

لاشعاع۔(XRAY)

بالائے بنفشی سے آگے اور بھی چھوٹی موجیں ہیں جنہیں لاشعاعیں یا ایکس ریز کہا جاتا ہے، یہ شعاعیں ٹھوس چیزوں سے بھی گزر جاتی ہیں، تشخیص امراض کے لیے جو ایکسرے کئے جاتے ہیں ان میں ان ہی شعاعوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ لاشعائیں رونٹگن نے ۱۸۹۶ء میں دریافت کیا تھا۔
اس کے بعد دوسائنسدانوں رودرفورڈ (۱۸۸۱ تا ۱۹۳۷ء) اور فریڈرک سوڈی (۱۸۷۷ تا ۱۹۵۲) نے لاشعائیں سے بھی چھوٹی موجیں جیہ شعاعیں اور گاماریز دریافت کیں۔
یہ ایسی سریع النفوذ ہوتی ہیں کہ کئی کئی انچ موٹی چادروں سے گزر جاتی ہیں، یہ شعاعیں ریڈیم جیسے عناصر سے نکلتی ہیں۔
یہ تو چھوٹی سے چھوٹی شعاعوں کا حال تھا، بڑی سے بڑی شعاعوں میں سرخ سے ذرا بڑی طویل موج کی شعاع کو پائین سرخ، زیریں سرخ اور انفراریڈ شعاع کہا جاتا ہے، ۱۹۵۶ء میں زیریں سرخ شعاعوں کو جمع کرنے کا ایک آلہ اوآنام کا ایجاد ہوا، ان شعاعوں کی مدد سے اندھیرے میں اجسام کی تصویر اتاری جاسکتی ہے۔
زیریں سرخ سے بھی بڑی موج لاسلکی اور ریڈیائی موج ہوتی ہے۔انہیں شعاعوں اور موجوں پر بنیاد رکھ کر مواصلات کا ایک پورا نظام قائم کردیا گیا، جسے لاسلکی نظام کہتے ہیں۔مارکونی (۱۸۷۴ تا ۱۹۳۷ء) نے لاسلکی نظام رسانی اور عالمی مواصلات کی داغ بیل ڈالی۔

ریڈیو۔وائرلیس۔ٹیلی فون

آواز کی لہروں کی رفتار فی گھنٹہ ۷۲۰ میل ہے اور ریڈیائی لہروں کی رفتار فی سکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ریڈیو اسٹیشن میں وائرلیس کے ذریعہ آواز کی لہروں کو ریڈیائی لہروں میں تبدیل کردیتے ہیں، ٹیلی فون میں جو حصہ آپ کے سامنے (منہ پر) رہتا ہے وہ آپ کی آواز کی لہروں کو برقی موجوں (ریڈیائی لہروں) میں تبدیل کردیتا ہے اور جو حصہ آپ اپنے کان پر رکھتے ہیں وہ دوسری طرف سے آنے والی برقی موجوں کو آواز میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

دوائر:

فلکیات میں ۹ دائروں کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، جن کی حقیقت جاننے سے طلوع وغروب کے اوقات سمتوں کا سمجھنا، جغرافیہ معلوم کرنا، ملکوں کے نقشے دریافت کرنا اور مختلف بلاد اور وہاں کے باشندوں کے امزجہ وطبائع کو معلوم کرنا آسان ہوجاتا ہے۔وہ نو دائرے حسب ذیل ہیں:
(۱) خط استوا۔یہ زمین پر قطب جنوبی اور قطب شمالی کے وسط میں فرض کیا جاتا ہے۔جب سورج اپنی گردش سالانہ کے دوران خط استوا کے مقام پر پہنچتا ہے تو تمام دنیا میں رات اور دن دونوں برابر ہوتے ہیں۔(۲) معدل النہار: خط استوا کی سیدھ پر بالا بالا کل جہاں کو کاٹتے ہوئے جو دائرہ بنتا ہے۔(۳) منطقۃ البروج۔وہ لائن جس پر آفتاب ستاروں میں حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔دراصل یہ آفتاب کے گرد زمین کی حرکت

کا نتیجہ ہے۔

منطقۃ البروج معدل النہار کو جن دو مقابل نقطوں پر قطع کرتا ہے وہ اعتدالین کہلاتے ہیں۔ برج حمل سے متصل اعتدال ربیعی اور برج میزان سے پیوست اعتدال خریفی۔ دونوں دائروں کے تقاطع سے تقریباً ۲۳ء۵۰ (ساڑھے تئیس) درجہ کا زاویہ پیدا ہوتا ہے، یہ میل کلی کہلاتا ہے، میل کلی کی مقدار کی تحقیق محقق نصیر طوسی نے کی تھی۔

(۴) خط سرطان (۵) خط جدی۔ یہ دونوں دائرے انقلابین پر معدل کے متوازی شمالاً وجنوباً کھینچے جاتے ہیں۔ جب آفتاب اپنی سالانہ گردش کے دوران جانب شمال (خط سرطان) پر پہنچتا ہے تو دنیا کے اس حصہ میں جو خط سرطان کے سامنے واقع ہیں گرمی پڑتی ہے دن بڑا، رات چھوٹی ہوتی ہے۔ اور خط جدی یعنی جنوب کی طرف سردی بڑھ جاتی ہے۔ دن چھوٹا، رات بڑی ہوجاتی ہے۔

لیکن جب سورج جانب جنوب (خط جدی) پر پہنچتا ہے تو یہاں گرمی پڑنے لگتی ہے دن بڑا اور رات چھوٹی ہوجاتی ہے۔ اور جانب شمال میں سردی بڑھ جاتی ہے۔ دن چھوٹا رات بڑی ہوجاتی ہے۔

(۶ و ۷) معدل کے قطبین کے اردگرد ۲۳ء۵۰ (ساڑھے تئیس) درجے بُعد پر یہ دو چھوٹے دائرے منطقۃ البروج کے قطبین کی گردش سے بنتے ہیں۔

(۸) دائرہ نصف النہار۔ یہ شمالاً وجنوباً ہمارے سروں پر گزرتا ہے اس کے ذریعہ زوال شمس اور ستاروں کے صعود وہبوط کا پتہ چلتا ہے۔

(۹) دائرہ افق: یہ دائرہ زمین کو ایک نصف اوپر اور ایک نصف نیچے دو حصوں میں تقسیم کردیتا ہے، کواکب کا طلوع وغروب اسی سے متعلق ہے۔

دائرہ افق کو پار کرتے ہوئے کوکب کا اس سے اوپر ہونا طلوع اور اس سے نیچے ہونا غروب کہلاتا ہے۔

ماہرین علم ہیئت دائرہ نمبر ۳ منطقۃ البروج میں بارہ مہینوں کے لحاظ سے ۱۲/ مساوی حصے بناتے ہیں۔ یہ حصے ۱۲/ بروج کہلاتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

(۱) حمل (۲) ثور (۳) جوزا (۴) سرطان (۵) اسد (۶) سنبلہ

(۷) میزان (۸) عقرب (۹) قوس (۱۰) جدی (۱۱) دلو (۱۲) حوت۔

پہلے چھ برج شمالی ہیں اور آخری چھ برج جنوبی۔

مدوجزر

ماہرین ہیئت نے کافی تجربات کے ذریعہ دریافت کرلیا ہے کہ چاند کی کشش کے باعث نہ صرف پانی میں

اتار چڑھاؤ ہوتا ہے مثلاً کہ کرۂ ارض کے جرم کا وہ حصہ جو اس کے محاذی و مقابل ہوتا ہے چاند کی طرف بلند اور کھینچا رہتا ہے۔پانی چوں کہ سیال ہے اس لیے اس میں مدوجزر (جوار بھاٹا) کی لہریں زیادہ قوت سے نمودار ہوتی ہیں۔

اسی اصول پر اطباء نے جسم انسانی میں پائی جانے والی اخلاط و رطوبات سے متعلق امراض کی شدت و خفت کے اوقات و ایام کی تعیین کی مثلاً صفراوی نوبتی بخار (غب دائرہ) میں دردسر پہلے روز ہو تو چوتھے روز قوی ہوجائے گا اور ساتویں روز بحران ہوگا (یعنی مرض پیدا کرنے والے مادہ اور جسم کے مدافعت کرنے والی قوت جسے طبیعت مدبرہ بدن کہتے ہیں دونوں کے مابین شدید مزاحمت کے نتیجہ میں اچانک ظاہر ہونے والی شدید علامت کے طور پر کبھی قے، کبھی اسہال کبھی ادرار کبھی رعاف اور کبھی بثور وغیرہ ظاہر ہوں گے۔اسی طرح دردسر تیسرے روز شروع ہو تو پانچویں روز قوی ہوگا اور بحران کی حالت نویں روز یا گیارھویں روز طاری ہوگی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہلال اور بدر کے وقت جب کہ چاند، سورج اور زمین تقریباً ایک ہی لائن پر واقع ہوتے ہیں اس وقت سمندر کی موجوں میں شدید مدوجزر (مدا کبر) ہوا کرتا ہے، مثلاً: دریا ہگلی کے اس حصہ میں جس کے کنارے کلکتہ آباد ہے مدا کبر کے وقت پانی ۱۵ر فٹ اوپر چڑھ آتا ہے۔شمالی امریکہ کی خلیج فنڈی میں موجیں ستر ۷۰ر فٹ تک بلند ہوجاتی ہیں۔یہی حال رطوبات بدن کا ہے غیر طبعی اور مرضی حالت میں خصوصاً جب کہ مرض حار ہو، رطوبات متعفن ہوں اور حرارت غریبہ کا ہیجان ہو تو چاند کی گردش، اس کے گھٹنے اور بڑھنے اور دور کرنے کے لحاظ سے رطوبات بدن بھی متاثر ہوتی ہیں، ان میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے اور چودھویں روز، ساتویں روز اور چوتھے روز عموی اور کلی طور پر کوئی شدید علامت اور بحرانی کیفیت رونما ہوا کرتی ہے۔اس فن کا طب سے یہ تعلق ہے جس کی وجہ سے طبیب کے لیے ہیئت سے واقفیت ضروری قرار دی گئی ہے۔

”و يحتاج الطبيب أن يعرف الهندسة و النجوم والا لم يعرف تقسيم الازمنة وحال البلدان“۔(الحاوی جلد: ۲۳ / ۲۹۳ از ابو بکر رازی)

۲۸ / ۲۹ر تاریخ کو چاند کا روشن حصہ آفتاب کی طرف اور تاریک پہلو زمین کی جانب ہوتا ہے اور وہ بالکل نظر سے غائب ہوجاتا ہے اس حالت کو محاق کہتے ہیں۔پھر چاند آہستہ آہستہ سورج سے مشرق کی جانب ہوتا جاتا ہے کم کو اس کے چمکتے ہوئے چہرے کا صرف ایک باریک کنارہ ہمیں نظر آتا ہے یہ ہلال کہلاتا ہے۔

خسوف قمر اور کسوف شمس

چاند روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے کبھی اس کے اور سورج کے درمیان زمین حائل ہوجاتی ہے اس وقت خسوف یعنی چاند گرہن واقع ہوتا ہے۔

اور کبھی چاند زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے تو یہ کسوف یعنی سورج گرہن ہے۔

قدیم ہیئت کے ماہرین نے کسوف وخسوف کے اوقات کے انضباط کے لیے ایک ضابطہ وضع کیا ہے اسے سیروس کہتے ہیں۔

ضابطہ سیروس: اگر آج کسوف یا خسوف ہو تو ۱۸ ر سال ۱۱ ر دن کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اعادہ ہوگا۔

قدیم ہیئت میں جو نو افلاک فرض کر کے نو آسمان سمجھ لیے گئے وہ باطل ہے۔

سماء اور فلک دونوں ایک شئ نہیں۔ سماء تو ٹھوس جسم کا نام ہے جو عالم پر محیط ہے۔ اور افلاک خلاء بسیط میں ستاروں، سیاروں اور چاند و اقمار کے مدارات یعنی خلائی شاہراہوں کا نام ہے جن میں ستارے اور سیارے علی الدوام گردش کر رہے ہیں۔

نظام شمسی کی بے انتہا وسعت

سائنس دانوں کی ساری کوشش کائنات کے صرف ایک گوشہ سے متعلق ہے موجودہ خلائی دوڑ صرف چاند (زمین سے بعد ۲۴۰۰۰۰ میل)، زہرہ مریخ مشتری زحل اور یورینس وغیرہ سیاروں تک محدود ہے۔

عالم شمسی سے باہر ستاروں (ثوابت) کی کائنات ہے۔

نظام شمسی میں ایک کھرب ستارے ہیں، ہر ایک ستارہ دوسرے ستارے سے سینکڑوں نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایسی تین کروڑ کہکشاؤں کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ (فلکیات جدیدہ)

ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اتنی دور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں حالاں کہ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔

سحابئے بھی دراصل ستارے ہیں جو کہکشاں سے بے انتہا دور فاصلوں پر پائے جاتے ہیں اینڈرومیڈا (ANDROMEDA) سحابہ سے جو روشنی ہماری دوربین تک پہنچتی ہے وہ ۲۰۰ ر لاکھ سال سے گر رہی ہوت ہے۔ اس طرح کے ہزاروں ملین مل کہ بلیوں سحابے پائے جاتے ہیں جو سب کے سب بجائے خود ہزاروں ملین ستاروں سے بنے ہوئے کواکبی نظامات (STELLOR SYSTEMS) ہیں ــــــــ جس قدر خلایا مکان (SPACE) میں ہم پیچھے کی طرف بڑھتے جاتے ہیں کہکشاؤں کا پھیلاؤ (EXPANSION) بھی برابر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ہمارے روزانہ مطالعہ کے ایک مجموعہ یا تارہ منڈل (CONSTELLAHON) جس کا نام سگنوس (CYGNUS) ہے، یہ ایک سکنڈ میں دس ہزار میل کی رفتار سے برابر پیچھے ہٹتا جارہا ہے۔

(مذہب اور سائنس ص ۶۸، از مولانا عبدالباری ندوی)

ہمارا کواکبی نظام ایک عالم ہے۔ اس کے علاوہ بکثرت عوالم پائے جاتے ہیں۔ ان ہزاروں عالموں میں ہر ایک اتنا ہی عظیم الشان ہے جتنا کہ یہ ہمارا عالم ــــــ ہمارا علم و تصور مسلسل وسیع تر ہوتا جارہا ہے، بل کہ خود پوری کائنات جیسا کہ عرض کیا گیا روز بہ روز وسیع تر ہوتی یا پھیلتی جارہی ہے۔ دوربین سے دیکھے جانے والے بعید ترین اجرام سماوی بھی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ (سکنڈ) کی رفتار سے حرکت کرنے والی روشنی کو ان اجرام سے ہم تک آنے میں ایک سو چالیس ملین (چودہ کروڑ) سال لگ جاتے ہیں، سب سے قریب چاند ہے وہ بھی دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے۔ سورج قریب نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ تاروں میں قریب ترین تارہ (ALPHAPHAIMA) نوری یا

روشنی کے سالوں کے حساب سے چار سال کی دوری پر واقع ہے۔

ہمارا ذہنی تخیل جواب دے جاتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ ایسے سدیم یا سحاب(NEBULA) پائے جاتے ہیں جو روشنی کے سالوں کے حساب سے سوملین (دس کروڑ) سال کی مسافت پر واقع ہیں۔کوئی انسانی ذہن ان فاصلوں کے تصور پر قادر نہیں ۔(مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری بحوالہ ماڈرن بلیف ،حصہ اول/ص ۱۵۔۱۶)

اجرام سماوی میں سب سے قریب ہمارے علم ومشاہدہ کے لیے نظام شمسی ہے،اس کے بعد چند ہزار ملین روشنی کے سالوں تک علمائے فلکیات کا سائنسی مشاہدہ ومطالعہ اور کام دیتا ہے پھر آگے روشنی اور ریڈیو کی لہریں اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ اب اور آگے کیا ہے۔

(مذہب اور سائنس:۶۷ از مولانا عبدالباری ندوی بحوالہ THE INDIMDUAL AND THE UNIVERSE BY. A-C.LOVELL)

آفتاب کو جس وقت ہم دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا آفتاب ہوتا ہے،قریب ترین جس ستارے کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔

قریب کے پڑوسی ستاروں کا روشنی اور ریڈیو کی لہروں کے واسطے سے مطالعہ کرتے ہیں،یہ لہریں ملیوں سال پہلے سے سفر کرتی آرہی ہوتی ہیں۔لہٰذا ان کی نسبت ہماری اطلاع وعلم بھی اتنا ہی پرانا یا فرسودہ (OUTOF DATE)ہو چکا ہے۔اس طرح آج کے مشاہدات پر مبنی ہماری معلومات ہزاروں ملین سال کی فرسودہ (OUT OF DATE)ہوتی ہیں۔(مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری ندوی:۶۷)

"ماہران فلکیات نے فضائے بسیط میں دوراتنے فاصلہ پر کوئی شئ اتنی تیزی سے حرکت کرتے دیکھی ہے اور یہ چیز اتنی حیرت انگیز ہے کہ ہمارے تمام آلات کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دینے کے لائق رہ گئے ہیں۔اس شے میں بے حد تیز روشنی اور لہریں پھوٹ رہی ہیں۔۔خیال ہے کہ یہ شئ ایک ایسی کہکشاں یا کہکشاؤں کا مجموعہ ہے جو پھٹ رہا ہے۔اور یہ شئے اتنی تیزی سے چل رہی ہے کہ جس کا اندازہ محال ہے یعنی تقریبا روشنی سے نصف رفتار سے (گویا ایک سکنڈ میں ۹۳ ہزار میل کی رفتار سے۔ف)

یہ طلسم ہوش ربا کائنات بھی ہماری ہی کائنات نظام شمسی کا ہی سلسلہ ہے جس کے ایک حقیر سیارہ زمین پر ہم آباد ہیں کہ اس زمین کی بساط خود ہمارے سورج کے مقابلہ میں بھی مٹر کے ایک دانہ سے زیادہ نہیں۔

(مذہب اور سائنس:۷۹۔۸۰،از مولانا عبدالباری ندوی)

عقائد فلاسفہ جدید واہل سائنس

اگر اہل ہیئت بعض احکام کی لم (علت اور وجہ) کے بارے میں غلط دعوے نہ کرتے تو ہم ان سے منازعت نہ کرتے اور نہ ہی انہیں کچھ ملامت کرتے لیکن چوں کہ انہوں نے ہیئت کے بعض احکام کی بنا فن طبعیہ کی خرافات پر رکھی ہے اور شریعت پر اعتراض کر بیٹھے ہیں لہٰذا مسلمان کے لیے ان لمیات کے بطلان کا اعتقاد ضروری ہے۔

(الشطر الثاني من دراية العصمة ص ۹۱ / ۹۲ عربی عبارت کا مفہوم اخذ کیا گیا ملحضا۔ف)

اہل ہیئت اور منجمین

اہل ہیئت کی بعض چیزوں سے استفادہ کر کے اور اکثر چیزوں میں تخمینیات، توہمات اور خرافات سے اہل نجوم نے کچھ دعاوی کئے ہیں، لیکن ان پر وہ دلیل نہیں قائم کر سکتے اسی لیے "منجمین حکماء نہیں کسی شخص نے ان کو زمرہ حکماء میں نہیں شمار کیا۔

"حکماء وہ لوگ ہیں جنہوں نے حقائق واصول اشیاء معلوم کر کے دلائل عقلی و براہین قطعی سے ثبوت دیا۔ اور اہل نجوم محض تخمینات وتوہمات وخرافات سے کام لیتے ہیں اور ہمارے بعض مفسرین نے غضب ہی کیا ہے کہ بعض آیات کی تفسیر ان (اہل نجوم، ف) کے اقوال پر مبنی کر دی (دراصل ف) بعض اصطلاحات ایسے مشہور معروف ہو جاتے ہیں کہ ان سے اصاغر و اکابر کوئی نہیں بچتا الا ماشاء اللہ چنانچہ بعض مفسرین نے تو قرآن شریف میں بروج سے بارہ بروج اہل ریاضی کے مراد لیے ہیں حالاں کہ وہ خود اجزاء تحلیلیہ ہیں موجود حقیقی نہیں اور متبادر قرآن سے انکا وجود حقیقی ہے ـــــ سیدھی تفسیر "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے فرماتے ہیں کہ بروج سے مراد کواکب عظام ہیں نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ صحابہ رضی اللہ عنھم کے اقوال کو چھوڑ کر اہل ریاضی کی تقلید قرآن مجید میں کی، خود قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے "ولو کنتم فی بروج مشیدۃ" اس سے صریح تائید تفسیر ابن عباس کی ہوتی ہے۔

اور بعض نے ہیئت اور نجوم دونوں کو مخلوط کر دیا ہے یعنی ان بروج کے ساتھ خاص خاص کواکب کو مختص بھی کر دیا ہے جس کی بنا محض خرافات نجومیہ ہیں ورنہ اہل ہیئت بعض کواکب کو بعض بروج سے مختص نہیں سمجھتے بل کہ ہر کوکب برج میں گردش کرتا ہے۔ البتہ اہل نجوم کہتے ہیں کہ بعض کواکب بروج کے ساتھ مختص ہیں اور دلیل وہ لچر پوچ کی کہتے ہیں، مثلاً: ایک برج ہے جس میں کچھ کواکب ثابتہ جمع ہو کر بشکل اسد موہوم ہو گئے ـــــ ان عقل کے دشمنوں نے یہ گھڑا کہ اسد حار المزاج ہوتا ہے اس واسطے کواکب حار کو کہ شمس ہے اس سے مناسبت ہے بھلا کیا محض نام سے اس برج میں حرارت آ گئی"۔ (ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۹ مجالس الحکمت جامع ملفوظات حکیم محمد مصطفی بجنوری)

فائدہ: سات سیاروں کے سوائے تمام ستارے ثوابت کہلاتے ہیں۔

عقائد فلاسفہ جدید در باب ہیئت:

(۱)　اجرام اثیریہ میں مبدا میل مستقیم نہیں ہوا کرتا؟

جواب: کل میں میل مستدیر کے ہونے سے اجزاء کے اندر میل مستقیم کا نہ ہونا لازم نہیں آتا۔

(۲)　ہر جسم بسیط کروی الشکل ہوا کرتا ہے؟

جواب: مبنی فاسد ہے۔

(۳)　افلاک تمام کے تمام کرویۃ الشکل ہیں؟

جواب: یہ قول بے دلیل ہے۔

(۴) افلاک ۹ ہیں (افلاک کی صحیح تعداد کا ان کو پتہ نہیں کیوں کہ اب دسواں فلک الافلاک بنایا جا رہا ہے، اس کے علاوہ یہ لوگ ۔ف) اس کے بھی قائل ہیں کہ کواکب افلاک میں مرکوز ہیں، خلا محال ہے، خرق والتیام ممتنع ہے اور یہ سب فلاسفہ کے مزعومات ہیں، غلط ہیں۔

(۵) فلک اعظم کے بعد کچھ نہیں ہے نہ خلا نہ ملا؟

جواب: یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔

(۶) دوائر عظیم میں سے دائرۃ البروج ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جواب: فلاسفہ کی یہ چیزیں امور مفروضہ سے تعلق رکھتی ہیں جو انہوں نے ضرورۃً فرض کی ہیں پھر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآن نے متعدد آیات میں بروج کو ثابت کر کے اہل سائنس کی تصدیق کی ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں کیوں کہ اہل سائنس جس بروج اصطلاحیہ کی گفتگو کرتے ہیں عرب ان سے واقف نہیں تھے اور لفظ کی ایسی تفسیر جس سے اہل عرب واقف نہ ہوں جائز نہیں کیوں کہ قرآن انہیں کی زبان میں نازل ہوا۔

قرآن میں جو بروج ہے اس سے مراد وہ بڑے کواکب ہیں جو اپنے عظم میں بروج مشیدہ سے مشابہ ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اس کی تائید قرآنی آیت "تبارک الذی جعل فی السماء بروجا۔۔۔ الآیۃ" سے ہوتی ہے اور ان بروج کو اللہ تعالیٰ نے آسمان کے لیے زینت اور شیاطین کے لیے سنگساری اور رجم کا سامان بنادیا۔ "ولقد جعلنا فی السماء بروجا و زیناها للناظرین و حفظناها من کل شیطان الرجیم" لہٰذا جس کسی نے قرآن کریم کی ان آیات کی تفسیر اہل ہیئت کے ان امور مفروضہ سے کی وہ شریعت کی ڈگر سے پھسل گیا۔ اور ان لوگوں کا قدم اور بھی زیادہ پھسلا جنہوں نے اوہام نجومیہ پر بنا رکھتے ہوئے بروج کی صورتوں اور ان کے ناموں کے لحاظ سے امزجہ ثابت کر کے خاص خاص کواکب کے ساتھ ان مزاجوں کو وابستہ کیا ہے اور ان کی مناسبت و مماثلت دکھلائی ہے۔

(۷) چاند کے گھٹنے بڑھنے چاند گہن لگنے اور سورج کی حرکات کے منضبط منظم مختلف آثار مرتب ہونے کی نفی نہیں کی جاتی لیکن ان کی جو توجیہات وعلیات بیان کی جاتی ہیں وہ ان کی حرکت تداویر پر مبنی ہیں اور اس پر کہ افلاک میں خرق والتیام نہیں ہوسکتا اور اس اصل اور نظریہ کے باطل ہونے کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور ظاہر نصوص یہ ہیں جن سے فلاسفہ کا نظریہ معارض ہے "فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس" جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کواکب کی حرکت ذاتی نہیں خالق کے حکم سے ہے (باذن خالقها ہے) فلاسفہ کے اس نظریہ سے جو انکار خالق پر مبنی ہے بچتے ہوئے مسلمان کو تو چاند سورج کے نظام میں حدیث نبوی سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے "ان الشمس و القمر آیتان من آیات اللہ" (الشطر الثانی من درایۃ العصمۃ ص ۹۱ تا ۹۵، عربی عبارت سے مفہوم اخذ کیا گیا ملخصا) (نمبر ۱ سے ۶ تک کے تفصیلی جواب کے لیے ہدایۃ الحکمۃ، درایۃ الحکمۃ، بوادر النوادر وغیرہ کتب کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔ف)

(۸) بارش بادل

بارش بادل وغیرہ کے تکون طبعی (اسباب طبعیہ) کے فی الجملہ سبب ہونے میں کلام نہیں لیکن ان کے اسباب حقیقی ہونے اور انہیں اسباب میں حصر کے جو اہل ہیئت قائل ہیں وہ صحیح نہیں یہی معاملہ رعد و برق کا ہے ممکن ہے کبھی تو وہی سبب ہوتے ہوں جو اہل سائنس بیان کرتے ہیں اور کبھی دوسرے طرق سے بھی پیدا ہوتے ہوں جیسا کہ روایات میں رعد و برق کا سبب سوط الملک بتایا گیا ہے۔

(۹) شہاب ثاقب

شہب میں بھی یہی بات ہے کہ کبھی تو اہل فلسفہ و سائنس کا بتایا ہوا سبب موثر ہو اور کبھی اس کا طریق وہ ہو جو روایات میں آیا ہے کہ آسمانی خبروں کو اچک لینے کی کوشش کرنے والے شیاطین کے احراق کے واسطے کوکب کے شعلے ٹوٹ کر شہاب اور شہاب ثاقب کی صورت میں گرتے ہیں: ''وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ ''نص قرآنی ہے۔

(۱۰) زلزلہ

اسی طرح زلزلہ کا سبب کبھی تو وہی ظاہری سبب ہو جو بیان کیا جاتا ہے کہ زمین کے اندر دخانی بخارات کثیف اور کافی مقدار میں باہر نکلنے کا راستہ نہ ملنے پر اندر ہی اندر گھومتے ہیں، جس کی وجہ سے زمین ہلتی ہے اور کبھی اس کا سبب وہ ہو کہ فرشتوں کے عروق ارض کو کھینچنے کی وجہ سے زلزلہ آتا ہے۔

(درایۃ العصمۃ علی ہدایۃ العصمۃ، ص ۶۹ تا ۷۰ از حکیم الامت حضرت تھانوی اصل عربی عبارت سے مفہوم اخذ کیا گیا مختصراً)

(۱۱) رعد و برق کے بارے میں:

ارسطو وغیرہ کا خیال تھا کہ بادل میں زمین سے بلند ہونے والے دھوئیں کے آتشی اجزاء پھنس جاتے ہیں اور بادل کی مضبوط تہوں کو زور سے پھاڑتے ہیں اس توڑ پھوڑ سے زبردست کڑک اور چمک پیدا ہوتی ہے یہی رعد و برق کی حقیقت ہے۔ لیکن سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ بادل کے اندر مثبت و منفی قوتوں کا باہمی تصادم رعد و برق اور بجلی گرنے کا باعث ہے۔

برق کی حقیقت کے باب میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ ارشاد فرماتے ہیں:
علی گڈھ جانا ہوا تو کالج والوں نے سائنس کے کمرہ کی بھی سیر کرائی اور بجلی کے تصرفات دکھلائے تو قدرت کے کرشمے نظر آتے تھے کہ حق تعالیٰ نے کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں اور انسان کو سب پر غالب کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے وعظ میں اس کے متعلق بیان کیا کہ اہل سائنس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ بجلی اور آسمانی بجلی ایک ہی ہیں۔ تو یوں کیوں نہ کہا جاوے کہ یہ بھی دو قسم کی ہوتی ہے ارضی اور سماوی۔ ارضی وہ ہے جو صناع خاصہ سے بن سکتی ہے جو یہ موجود ہے اور سماوی وہ جو شریعت میں ثابت ہے اور جس کی حقیقت سوط الملک ہے، اس کو کالج والوں نے بہت پسند کیا۔ اس مجمع میں چند پروفیسر اور ماسٹر بھی تھے ان کو تو بہت ہی حظ ہوا۔ (ملفوظات: جلد ۲۳ کمالات اشرفیہ: باب دوم ص ۴۵۱) یہ توجیہ و تکلف نہیں بلکہ توضیح و تحقیق ہے یعنی حقیقت کا اظہار۔ جو شخص دونوں میں منافات سمجھتا تھا اس کو حقیقت سمجھا دی۔

(ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۰ الافاضات الیومیہ ص ۵۵)

(۱۲) واقعہ معراج

واقعہ معراج کے متعلق ایک انگریزی خواں نے کہا کہ اس کی کوئی نظیر بھی ہے۔(انفاس عیسیٰ: حصہ دوم ص ۲۴۹)
(یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اور بھی گیا ہے کیونکہ جسم بشری کا اس قدر بلندی پر جانا جہاں ہوا نہ ہو۔اس کو یہ لوگ خلاف فطرت سمجھتے ہیں۔ف) حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ ارشاد فرماتے ہیں ”خدا نے ان ہی سے وہ کام لیا جس سے خود لاجواب ہو گئے مگر باوجود اس کے اس کی قدرتوں کا انکار کرتے ہیں اپنے تجربہ میں آجائے اس کے تو قائل اور جو اسلام کہے کو وہ اسی کی نظیر ہو اس سے انکار“۔(ملفوظات حکیم الامت الافاضات الیومیہ: جلد ۸ ص ۱۱۹ تا ۱۲۰)

جس روز مریخ پر پہنچ گئے چند رکعتیں شکرانہ کی پڑھوں گا اگر یا درہا (کیونکہ ف) ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی معراج سے انکار ہے۔ہمارے پاس جواب ہوگا کہ وہاں (معراج نبی میں۔ف) موانع کے قائل ہو اور تمہارے لیے وہ موانع کیوں مرتفع ہو گئے۔(ملفوظات حکیم الامت جلد ۸ الافاضات الیومیہ جلد ۸ ص ۳۳۸، ۳۳۹)

کیونکہ آخر یہ بھی تو ان ہی طبقات کو طے کر کے مریخ تک پہنچیں گے جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مانع معراج جسمانی کہتے ہیں تعجب ہے کہ ان کی کوئی تکذیب نہیں کرتا اور شریعت کی تکذیب کرنے کو تیار ہیں ہوائی جہاز کے ذکر پر فرمایا کہ اب حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر اعتراض کا منہ نہ رہا اس بدفہمی کا کچھ علاج ہے کہ جو یہ کریں وہ ہو جائے اور خدا جو چاہے وہ نہ ہو۔کس قدر یہ ظلم عظیم ہے۔اگر نظر عمیق سے دیکھا جائے تو یہ تمام صنعتیں بھی حق تعالیٰ کی ہی قدرت کے کرشمے ہیں اس لیے کہ جن دماغوں کی یہ ایجاد ہیں وہ دماغ بھی تو ان کے (یعنی خداوند قدوس کے۔ف) ہی بنائے ہوئے ہیں۔(ملفوظات: جلد ۳۔الافاضات الیومیہ: جلد ۳ ص ۹۷)

”ان سب ایجادوں کی جو چیز جڑ ہے وہ کسی کے بھی اختیار میں نہیں یعنی کسی صورت صنعت کا قوت فکریہ میں فائض ہو جانا اگر یہ ان کے اختیار میں تھا تو قوت فکریہ تو بیس برس پہلے بھی تھی اس وقت کیوں وہ صورت ذہن میں نہیں آگئی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات ذہن سے اتر جاتی ہے تو لاکھ قوت فکر کو عمل میں لائے وہ یاد ہی نہیں آتی کسی بات کا سوجھا دینا یہ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے“۔(ملفوظات حکیم الامت: جلد ۲۳۔کمالات اشرفیہ: ص ۴۶)

اہل سائنس کے وہمی، سفسطی خیالات

چاند زمین کا بیٹا اور آفتاب کا حفید (نواسا) ہے۔وہ ایک دو ارب سال قبل بحر الکاہل کے مقام میں زمین سے جدا ہو کر مستقل کرہ بنا۔یہ نظریہ دنیائے سائنس میں صحیح تسلیم کیا جاتا تھا یہ سر جارج ڈارون کا نظریہ تھا جو نظریہ ارتقاء حیات والے ڈارون کا بیٹا ہے۔مگر تسخیر قمر کے بعد یہ نظریہ غلط قرار دیا گیا۔(فلکیات جدیدہ حصہ دوم ص ۳۰۰)

اسی طرح کے ظنی ہل کہ وہمی خیالات پر تکیہ کر کے ان کو تحقیق کے نام پر نہ معلوم کتنی کتنی مدت تک نبایا جاتا ہے اور سائنسی تحقیق کے نام کا رعب ایسا اس کے ساتھ چپکا رہتا ہے کہ کوئی دم نہیں مار سکتا۔اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ:

علم ہیئت کے ماہرین نے دوربین سے جب چاند کا مشاہدہ کیا تو انہوں [illegible] کو براعظم، داغ والے حصہ کو سمندر اور جھیلیں سمجھا۔ انہوں نے سمندر کے نام بھی رکھے بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ چاند پر ہوا اور پانی موجود نہیں (جب پانی موجود نہیں تو سمندر کیا؟ لیکن۔ف) فرضی سمندروں کے نام اب بھی چاند کے نقشے میں درج چلے آرہے ہیں۔(حوالہ بالا) فیا للعجب

کائنات کے اختتام کے باب میں سائنسدانوں کے اندازے

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ فلکیات اور علم ہیئت کے ماہرین کے نزدیک جو آسمانی ہدایات اور وحی الٰہی سے آزاد ہیں، ان میں قدماء یونان کے نزدیک عالم قدیم یعنی ازلی وابدی ہے اور جدید فلکیات کی رو سے ایک وقت ایسا تھا کہ اس جہاں میں کسی سحاب یا ستارے کا وجود نہ تھا کل جہاں پر گھٹا ٹوپ تاریکی حاوی تھی عالم مادہ سے بالکل فارغ تھا لیکن کائنات کے ظہور پذیر ہونے کی کیفیت کیا ہوئی، اس باب میں فلسفہ جدید اور اہل سائنس کا بالکل کھلا اعتراف ہے کہ ''اگر چہ ہمارے مکان وزمان کی اتنی وسعتوں اور ماضی کی طرف اتنے فاصلوں تک ہم کچھ نہ کچھ کھوج لگا چکے ہیں پھر بھی ہمارے پاس اس مسئلہ کا کوئی آخری جواب نہیں کہ جب کائنات پیدا ہوئی اس وقت کیا صورت تھی؟

(مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری ندوی ص ۶۹)

کائنات کی ابتدا کب ہوئی اور کس طرح ہوئی اس باب میں انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ ''اس طرح کے سوالات میں ہم سائنسی مشاہدہ کی دنیا سے نکل کر فلسفیانہ نظریات وقیاسات کی دنیا میں جا پڑتے ہیں''۔

(مذہب اور سائنس بحوالہ فرداور کائنات از مولانا عبدالباری ندوی ص ۶۹)

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس قسم کے سوالوں کا جواب سائنس کا موضوع نہیں ہے اور یہ کہ انسانی کوشش کی بے بسی اور ذہن کی نارسائی کا اس میں اعتراف بھی ہے لیکن اس کے باوجود اپنی بساط بھر کوشش اور توانائی اہل سائنس نے اس باب میں بھی صرف کر ڈالی ہے اور کچھ نہ کچھ ظن وگمان اور موہوم اندازے قائم کئے ہیں مثلاً یہ کہ: کئی ارب سال قبل منتشر مادی ذرات نے آہستہ آہستہ جمع ہونا شروع کیا ان ذرات کے اجتماع سے ایک لطیف گیس نما سحابیہ کا ظہور ہوا۔ جوں جوں اس سحابیے کے اندر تکاثف بڑھتا رہا چمک میں بھی اضافہ ہوتا رہا، اس طرح طویل زمانہ کے بعد کہکشاؤں اور کہکشاؤں کے اندر اربہا ستاروں کی تشکیل ہوئی۔ یہ کائنات کی ابتدا کی بارے میں تخمینہ تھا کائنات کی انتہا واختتام کا بھی جو تخمینہ لگایا گیا ہے وہ اس طرح ہے کہ:

(۱)　''ممکن ہے کہ نظام شمسی سخت برفانی دور سے دوچار ہوجائے جس سے کوئی جاندار زندہ نہ بچ سکے۔ ہمارا یہ نظام شمسی تقریباً ۱۲ میل فی سکنڈ کی رفتار سے ایک طرف رواں ہے گزشتہ دس لاکھ سال کے عرصہ میں ہم کامیابی کے ساتھ چار ایسے بادلوں میں سے گزر چکے ہیں جو نہایت سرد تھے اسی وجہ سے زمین پر سردی کے چار زبردست دور گزرے ہیں'' یہ مسٹر میکسویل کا اندازہ ہے اور ماہرین ارضیات کہتے ہیں کہ چوتھے اور آخری برفانی دور کا تقریباً چوتھائی حصہ گزر چکا ہے کیوں کہ ابھی تک گرین لینڈ اور قطب جنوبی کا علاقہ مستقل طور پر برف سے ڈھکا رہتا ہے ممکن ہے آئندہ سابقہ ادوار

سے بھی سخت برفانی دور قیامت کا باعث بن جائے۔ آفتاب بڑی تیزی سے اپنا مادہ یعنی ہائیڈروجن عنصر خرچ کررہا ہے۔ سورج ہائیڈروجن جلا جلا کر ہیلیم پیدا کرتا ہے۔ بقول جارج گیمو جیسے جیسے سورج کا یہ خزانہ ختم ہوتا جائے اس کی چمک اور تمازت میں اضافہ ہوتا جائے گا دس ارب سال کے بعد سورج اب کے مقابلہ میں سوگنا زیادہ گرم اور چمکدار ہوجائے گا، اس وقت زمین پر اتنی گرمی پڑے گی کہ پانی کھولنے لگے گا۔ سمندروں کا پانی ابخرات بن کر فضا میں غائب ہوجائے گا ظاہر ہے کہ اس وقت زمین پر حیات ناممکن ہوجائے گی یہ بات معلوم رہنا چاہیے کہ موجودہ حالت میں آفتاب کی حرارت کا جو قلیل حصہ زمین کو پہنچتا ہے وہ یہ ہے: ۲۱۳۹۰۰۰۰۰۰ (یعنی ایک حصہ کا ۲ ارب ۳ کروڑ ۹ لاکھواں حصہ)۔

(فلکیات جدیدہ، ص ۴۴)

(۲) آفتاب یا کسی اوارہ ستارے کا باہم تصادم بھی ممکن ہے جو نظام شمسی کی بربادی کا باعث بن جائے۔

(۳) ممکن ہے زمین کسی ستارے یا سیارے سے متصادم ہوجائے اور نوع انسانی اور عالم شمسی کا نظام تباہ ہوجائے۔

(فلکیات جدیدہ از مولانا موسیٰ روحانی بازی)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد:

ایک دفعہ تو تاریخ اور وقت تک مقرر ہوگیا تھا کہ زمین اور چاند میں تصادم ہوگا، ہمارا اس سے ایک مطلب تو حاصل ہوگیا کہ تم قیامت کو نفخ صور سے تو مانتے نہیں یوں ہی مان لو کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ زمین کسی سیارہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجائے گی۔ بس اسی کا نام قیامت ہے۔

(ملفوظات حکیم الامت جلد ا۔ احسن العزیز جلد ۲ جدید ملفوظات: ص ۱۸۰)

علم ہیئت اور مسلمان

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ فرماتے ہیں ہیئت کے اکثر مسائل چوں کہ مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں (مثلاً کیفیت طلوع وغروب، جانب مشرق ومغرب حرکات اور اقالیم سبعہ کی تقسیم، خط استوا کے محاذات میں واقع ہونے والے بلاد کے خواص ظل (سایہ) نصف نہار اور سمت قبلہ کے احکام کی معرفت۔ یہ وہ امور ہیں جو علم ہیئت میں بیان کئے جاتے ہیں۔ ف) اور یہ سب امور مفید ہیں جن کی وقتاً فوقتاً ضرورت پیش آتی ہے۔ لہٰذا ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کا علم حاصل کرنا چاہیے۔ (الشطر الثانی من درایۃ العصمۃ ص ۹۱ عربی عبارت سے مفہوم اخذ

کیا گیا ملخصاً۔ف) اسی بنا پر مسلمانوں کو ہمیشہ اس فن کی طرف توجہ رہی ہے، اور قدیم ہیئت دانوں نے اور مسلمانوں نے اس فن میں اس قدر قوت اور صلاحیت صرف کی ہے کہ کے اہل تحقیق کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ فلکیات کے باب میں جدید تر اور صحیح تر نظریہ مسلمانوں کی تحقیقات پر مبنی ہے۔

سائنس نے ہر میدان میں ترقی کی ہے مگر حرکات سیارات کی مقدار اس سے مستثنی ہے۔ یہ میدان اب بھی جوں کا توں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہیکہ یہ فن پہلے سے اتنا مکمل تھا کہ اس میں ذرا بھی ردوبدل کی گنجائش باقی نہ تھی۔ چار ساڑھے چار ہزار سال قبل حکماء چین و ہندو بابل و مصر و یونان چاند و سیارات کی حرکات کا ثانیوں اور ثالثوں تک کا حساب محفوظ رکھتے تھے۔ آج تک ان کی تقویمات میں چند منٹ کی بھی کوئی غلطی نہیں بتا سکتا۔ باقاعدہ سب سے پہلی تقویم ابرخس نے ۱۵۰ ق م میں تیار کی تھی۔ یہ تقویم بطلیموس کی مجسطی ہے۔ عبدالرحمن صوفی منجم فارس نے ۹۶۴ء میں، الغ بیگ گورگانی نے پندرہویں صدی میں پروفیسر تانکو، آرجی، لینڈر، شان فیلڈ وغیرہ نے رصد گاہوں میں تقویم قائم کی تھیں۔ ان تقاویم میں معدل النہار، مطالع، نصف النہار ستاروں کے تخمینی مقامات کی فہرستیں درج تھیں۔

سائنس نے اگر کوئی جدت اس فن میں پیدا کی ہے تو صرف اتنی کہ شب و روز کا ایلاج اور موسموں کا اختلاف زمین کی گردش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن گردش ارض اور مرکزیت شمس کا نظریہ بھی فیثاغورث ۴۵۰ ق م کے بعد واضح دلائل کے ساتھ ابواسحق بن یحیی زرقالی ۱۲۰۹ تا ۱۲۸۷ء، اور نورالدین البطروجی وفات ۱۲۰۴ء نے پیش کیا جس پر کوپرنیکس نے جدید فلکیات کی بنیاد رکھی۔

قدیم ہیئت اور جدید ہیئت۔ ایک سرسری موازنہ:

عمیق موازنہ فن کا جاننے والا ہی کوئی کر سکے گا لیکن ہم نے جن لوگوں کی کتابیں پڑھی ہیں ان کی روشنی میں درج ذیل پہلو بھی توجہ کے لائق ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اہل ہیئت جدید کے بعض اصولوں میں اختلاف کرنے کے باوجود قدیم وجدید دونوں کی رو سے نتائج پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا قدیم ہیئت میں شب و روز اور موسموں کے اختلاف کا سبب آفتاب کی حرکت ذاتی کو قرار دیا جاتا تھا۔ جدید سائنس والے کہتے ہیں کہ آفتاب مرکز ہے زمین نہیں، اور سیاروں کے مدار بیضوی ہیں، اور ارسطو وغیرہ کے خیال میں زمین کل عالم کی لیے مرکز ہے اور افلاک گول ہیں، اب ہم چند مثالوں سے مذکورہ صدر دعوی واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) متحرک شمس ہو (ہیئت قدیمہ) یا زمین (ہیئت جدید) موسموں اور سال کے دنوں کی تعداد کے متعلق نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔

ہیئت قدیمہ کے ماہر محقق طوسی اور امام رازی کی تحقیق کے مطابق شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۴۹ منٹ کا ہوتا ہے محقق طوسی کے بعض رفقاء جوان کے ساتھ رصد گاہ سمرقند میں کام کرتے تھے، وہ مذکورہ صدر مقدار پر ۱۵ سیکنڈ کا

اضافہ کرتے ہیں۔محی الدین مغربی کے نزدیک کسر کی مقدار پر ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ ربیع الثانی ۲۱ ح ص/ ۹۲ پر ۴۸ منٹ کی بجائے ایک منٹ کا اندراج قلم کی غلطی ہے دیکھو شرح چغمینی اور اس کے حواشی ص/ ۱۲۶۔اور ہیئت جدیدہ میں بھی سال کی یہی مقدار ہے اور بقول بعض محققین ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ ۴۶ سیکنڈ ہے۔

(۲) فلکیات جدیدہ کے ماہرین کہتے ہیں کہ سورج معدل النہار کے شمالی بروج میں ۲۱ مارچ سے ۲۲ ستمبر تک یعنی ۱۸۵ دن تک رہتا ہے اور جنوبی بروج میں اس کا قیام صرف ۱۸۰ دن ہوتا ہے۔علم ہیئت قدیم کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ جدید فلکیات والے اس کی توجیہ بتانے سے قاصر ہیں۔مگر علمائے قدیم فلکیات کے اصول کے پیش نظر اس کی توجیہ آسان ہے۔وہ یہ کہ آفتاب کا اوج شمالی برجوں میں ہے جس سے آفتاب کے مدار کی مسافت بڑھ گئی۔اس واسطے زمانہ بھی چاہیے۔جدید سائنس کے بعض ماہرین بھی اسی توجیہ پر قناعت کرتے ہیں۔

(۳) کل جہاں کی اس حرکت مرئیہ جس کے ذریعہ تمام کواکب کا طلوع وغروب ہوتا ہے، کا دورہ قدیم وجدید دونوں کے اصولوں پر ۲۳ گھنٹہ ۵۶ منٹ ۴ سیکنڈ میں پورا ہوتا ہے۔مگر ہیئت جدیدہ میں اس کا سبب زمین کی محوری گردش ہے۔اور قدیم میں فلک افلاک کی حرکت باقی تین منٹ چھپن سیکنڈ کے اضافہ کا سبب جدیدہ میں زمین کی سالانہ گردش اور قدیم میں آفتاب کی ذاتی حرکت ہے، جو بہ طرف مشرق متحرک ہے۔نتیجہ بالکل ایک ہے یعنی شب وروز پورے ۲۴ گھنٹہ کے ہوتے ہیں۔

(۴) آفتاب اور چاند گرہن کی پیش گوئی کرنے کے لیے علمائے قدیم میں ایک طریقہ رائج تھا جسے سیروس کہتے ہیں۔یہ یونانی لفظ ہے۔آج تک یہی نام رائج ہے، یہ طریقہ علمائے بابل نے آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل دریافت کیا تھا اور آج تک اسے حرفِ آخر کا مقام حاصل ہے۔زمانۂ حال کے سائنسدان بھی خسوف وکسوف معلوم کرنے میں یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔(فلکیات جدیدہ حصہ دوم ص ۲۹۶۔۲۹۷)

علم ہیئت اور درس نظامی

علم ہیئت فلسفہ کی شاخ ہے اور فلسفہ" العلم بحقائق الاشیاء علی ماھی علیہ بقدر الطاقۃ البشریۃ " (حتی المقدور چیزوں کی صحیح حقیقت کے جاننے) کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ طلوع وغروب شمس، نصف النہار، سمت قبلہ وغیرہ کے کتنے ہی شرعی احکام ہیں جو علم ہیئت سے متعلق ہیں۔اسی لیے فلسفہ اور ہیئت کو درس نظامی کی تعلیم میں ضروری سمجھا گیا۔چناں چہ علم ہیئت درس نظامی کے نصاب کا حصہ ہے جس میں چاند کواکب سیارات وثوابت کی حرکات پر باقاعدہ بحث شامل ہے، چوں کہ یہ، علوم میں معین ہے اور فنون کی حیثیت سے بطور مبادی کے درسیات میں داخل ہے، جس کی وجہ سے درس نظامی کی نہایت درجہ اہمیت ہے۔درس نظامی کی اسی اہمیت کی وجہ سے جامع الاصول

والفروع حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ارشاد فرماتے ہے کہ یہ "درسیاتِ اخریٰ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہیں علما کے قلوب میں یہ اللہ تعالی کی الہام فرمائی ہوئی ہیں۔یہاں تک کہ فلسفہ اور منطق بھی جو داخل درس ہیں،یہ بھی بڑے کام کی چیز ہے گو یہ مبادی ہیں مقاصد نہیں لیکن چوں کہ مقاصد کی تحصیل ان پر مبنی ہے اس لیے یہ بھی ضروری ہیں گو مقاصد کے درجہ کو نہ پہنچے مقاصد تو بہت عالی ہیں"۔(حکیم الامت حضرت تھانویؒ اشرف التفاسیر جلد ۴ ص ۷۲)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ملفوظ میں یہ جو بات فرمائی گئی ہے کہ "فلسفہ اور منطق بھی جو داخل درس ہیں یہ بھی بڑے کام کی چیز ہیں مقاصد کی تحصیل ان پر مبنی ہے" یہ بڑی اہم بات ہے۔میں یہاں صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ مقاصد کے لیے ان مبادی کی کیا اہمیت ہے۔

برطانیہ کے مشہور سائنسدان نیوٹن نے یہ قانون وضع کیا کہ:

(۱) کائنات میں ہر شئ ساکن ہمیشہ ساکن رہتی ہے جب تک کہ اس پر کسی بیرونی قوت کا اثر نہ پڑے۔اور (۲) ہر شے متحرک ابد تک خود بخود حرکت کرتی رہے گی تا آنکہ کوئی قوت خارجی اسے روک دے۔اس قانون کا انطباق افلاک کی حرکت پر کرکے کہہ دیا گیا کہ افلاک کی حرکت دائمی ہے۔یہی نظریہ قدیم فلاسفہ یونان کا تھا کہ افلاک کی حرکت دائمی ہے۔اور اس دوام حرکت سے قدیم وجدید تمام ملحد فلاسفہ وملحد اہل سائنس افلاک کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔انہیں کی تقلید میں جدید تعلیم یافتہ بعض مسلمانوں کو بھی اس باب میں اشتباہ پیدا ہوگیا۔لیکن فلسفہ اور منطق کی مدد سے اس کا جواب کس قدر سہل ہوجاتا ہے ملاحظہ کیجیے:

جواب: اگر افلاک کی حرکت دائمی بھی ہوتو "دوام سے سلب امکان عن الجانب المخالف لازم نہیں آتا۔نفی امکان کے لیے مستقل دلیل درکار ہے" اور وہ ہے نہیں لہٰذا ضروری ہونا ثابت نہیں ہوا۔بس ممکن رہا اور ممکن شے قدیم نہیں ہوسکتی خواہ دائمی ہی کیوں نہ ہو۔

"دائمی" (دوام) کا حاصل یہ ہے کہ کوئی صفت کسی چیز کے لیے اس وقت تک ثابت ہے جب تک وہ چیز ہے لیکن صفت کا اس چیز سے جدا ہوجانا محال نہیں ہے۔اگر صفت کا اس سے جدا ہوجانا محال ہوتو اسے دائمی نہیں کہیں گے بل کہ "ضروری" کہیں گے۔نیوٹن کے مذکورہ قانون میں "جب تک اس پر کسی بیرونی قوت کا اثر نہ پڑے" اور "تا آں کہ کوئی قوت خارجی اسے روک دے"، جیسے الفاظ اور قیدیں خود بتلارہی ہیں کہ افلاک سے حرکت کا جدا ہونا (انفکاک) محال نہیں ہے۔اور اگر اس قانون میں یہ قید صراحۃً مذکور نہ ہوتی تو بھی معہود(Under stood) سمجھی جاتی۔کیوں کہ حرکت کا وصف افلاک کے ساتھ وابستہ ہے اور مستقل طور پر قائم ہے،لیکن اس وصف کا اس سے جدا ہونا محال ہو یا بالفاظ دیگر حرکت افلاک کے لیے "ضروری" ہو،یہ ثابت کرنے کے لیے مستقل دلیل درکار ہے۔

اور اسی سے یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ افلاک کی حرکت جب "ضروری" بھی نہیں تو اس کی یہ حرکت "ذاتی" کیسے

ہوسکتی ہے۔لہٰذا ''خودبخودحرکت کرتی رہے گی'' والی بات بھی غلط ہے۔یہ طبیعات اور فلکیات کا وہ افسوس ناک پہلو ہے جس کی وجہ سے مفید معلومات بھی شرک اور قدرت خداوندی کے عقیدے (وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور ''الَّذِيْ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَه ثُمَّ هَدٰى'') سے بغاوت کے ساتھ ظلمت اور عفونت ونجاست میں آلودہ کرکے پیش کی جاتی ہیں۔''خودبخودحرکت کرتی رہے گی'' جیسے الفاظ فلاسفہ کا ''طبیعت'' یا سائنسدانوں کا Belind in terplay of Physical and chemical forces (اندھے، بہرے طبعی وکیمیاوی عمل یا مؤثر ۃ بذاتہا وغیرہ تصورات کو جاری کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ افلاک کی گردش میں اس کی طبعی حرکت مؤثر ہے۔لیکن یہ طبیعت خودبخود (مؤثرۃ بذاتہا) نہیں بلکہ ''مؤثرۃ باذن ربہا'' ہے۔

درسی کتابوں میں عربی سال سوم کے طالب علم جس نے منطق کی کتاب پڑھی ہو، اس کو بھی یہ جواب سمجھا دینا کچھ مشکل نہیں، اور جواب کا سمجھنا موقوف ہے صرف دو اصطلاحوں، قضیہ ضروریہ اور قضیہ دائمہ کے سمجھنے پر۔

(ھذا ما اوردنا ایرادہ و اللہ الموفق للصواب و الیہ المرجع و الماب)

العبد الضعف فخر الاسلام الہ آبادی/۲۱ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ ۱۸ فروری ۲۰۰۹ء بوقت عصر

ماخذ ومراجع:

فلکیات جدیدہ از مولانا موسیٰ روحانی بازیؒ
مبادیات منطق وفلسفہ از حکیم تسخیر احمد
مذہب اور سائنس مولانا عبدالباری ندویؒ
الحاوی فی الطب جلد ۲۳ از ابوبکر محمد زکریا رازیؒ
ملفوظات حکیم الامت (حضرت تھانویؒ)
الافاضات الیومیہ (حضرت تھانویؒ)
حسن العزیز (حضرت تھانویؒ)
کمالات اشرفیہ (حضرت تھانویؒ)
القول الحسن (حضرت تھانویؒ)
جدید ملفوظات (حضرت تھانویؒ)
انفاس عیسیٰ حصہ دوم (حضرت تھانویؒ)
مجالس الحکمت (حضرت تھانویؒ)
درایۃ العصمۃ حصہ اول اور سوم (حضرت تھانویؒ)
اشرف التفاسیر: ج ۴/ص ۴۷ (حضرت تھانویؒ)

دنیا کے باطل مذاہب: ایک تعارف، ایک جائزہ

بہ قلم: مولانا افتخار صاحب قاسمی بستوی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا فرما کر ان کو اپنی ذات سے مربوط رکھنے کا جو مکمل ضابطہ بنایا ہے، اسی کا نام دین ہے، یہ دین کلیدی طور پر ایک رہا، آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے نبی اور رسول ایک ہی دین کی تبلیغ کے لیے دنیا میں تشریف لائے، اور بندگانِ خدا کو خداوند قدوس کی عبادت و توحید سے وابستہ کرنے کی جان توڑ کوشش فرماتے رہے، جس میں تمام انبیا و رسل پوری طرح کامیاب رہے، بندوں کو خدا کی طرف سے کم وبیش ہدایت ملتی رہی، لیکن تمام انبیا اپنے مشن میں مکمل کامیاب رہے، ایک طرف خداوند قدوس کی طرف سے بعثت انبیا کا مسلسل عمل ہر دور میں جاری جارہا، دوسری طرف نفس پرستی اور ابلیس پرستی نے لوگوں کو زندگی گزارنے کے لیے الگ الگ اسلوب اور مختلف طریقے سکھائے۔ ''دین'' تو خداوندِ قدوس نے زندگی گزارنے کے لیے دیا ہی تھا، لیکن لوگوں نے اپنی اپنی خواہش کے مطابق اسی اصول میں سے اپنی نفسانی جزئیات تراشیں، جو مذہب باطل کی شکل میں مستقل عمل کا محور بن گئیں؛ اسی طرح مختلف ادوار میں مختلف باطل مذاہب مختلف اقوام وملل میں صفحۂ ہستی پر وجود پذیر ہوئے۔ کچھ مذاہب عالم اور ادیانِ باطلہ کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) ہندوازم (۲) عیسائیت (۳) یہودیت (۴) زرتشت (۵) شنتوازم (۶) کیلٹی ازم

(۷) ٹیوٹانی مذہب (۸) مانوی مذہب (۹) بدھازم (۱۰) سکھ ازم (۱۱) جین ازم۔

اب قدرے تفصیل ملاحظہ ہو:

ہندوازم

ہندو مذہب میں کسی نبی یا رسول کا کوئی تصور ہرگز نہیں، ہندو مذہب کی جو کتابیں اس وقت پائی جاتی ہیں، ان کے مصنفین کو (رشی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ہاں ہندوؤں میں ایک قوم (آریہ) کے نام سے جانی جاتی ہے، جس کے نزدیک، وحی، الہام، اور ہدایت الٰہی کی کچھ روشنی تو بہر حال موجود ہے، لیکن اس پر حالات کے تاثرات اور رشی لوگوں کی تحریفات کا اتنا غلبہ ہے کہ وحی والہام کا پتہ لگانا یکسر مشکل ہے۔

نجات کے طریقے: ہندو مذہب میں نجات کے تین طریقے بتلائے گئے ہیں: (۱) علم (۲) عمل (۳) ریاضت۔

اور اسلام میں نجات کے صرف دو طریقے بتلائے گئے ہیں: (۱) اللہ پر ایمان لانا۔ (۲) اور عمل صالح پر مداومت۔ عمل ہی کو پابندی سے بجالانا، ریاضت اور مجاہدے میں داخل ہے۔

تناسخ: ہندو مذہب میں ''آواگون'' نام کے عقیدے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، جس کو ''تناسخ'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اسی دنیا میں انسان کا دوبارہ جنم ہوتا ہے، اور اپنے اعمالِ بد یا اعمالِ خیر کی بنیاد پر اچھا یا برا جنم پاتا ہے، اور یہی سلسلہ ابد تک جاری رہتا ہے، لیکن اسلام میں جنت و دوزخ کا بنیادی تصور ہے، جس میں داخل ہونے کے بعد موت نہیں آئے گی۔

مذہبی کتابیں

ہندوؤں کی مذہبی کتابیں 'رامائن'، 'مہابھارت' اور 'گیتا' ہیں، جس میں 'گیتا' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

رامائن: ''رامائن'' کے مصنف کا نام ''والمیکی'' ہے، جب کہ ''رام کالی داس'' اور ''ھیم چند'' نے بھی رامائن نام کی کتاب لکھی ہے۔

''رامائن'' میں اڑتالیس ہزار اشعار ہیں، جن میں سری رام چندر جی کی لڑائیوں کا تفصیلی خاکہ کھینچا گیا ہے، جو انہوں نے سری لنکا کے راجہ ''راون'' سے اپنی شریکِ حیات ''سیتا'' کو چھڑانے کے لیے لڑی تھیں۔

مہابھارت: ''مہابھارت'' ہندوؤں کی بڑی مشہور کتاب مانی جاتی ہے، جس کے مصنف کا نام ''ویاس جی'' ہے، اسی کتاب کی وجہ سے ہندوستان کا نام پاکستان بننے کے بعد ''بھارت'' رکھا گیا ہے، اس کتاب میں دو لاکھ ۱۵/ہزار اشعار ہیں، اس میں ہستناپور کے دو خاندانوں کی آپسی خانہ جنگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو ۱۸/دن تک جاری رہی۔

گیتا: ''گیتا'' کا پورا نام ''بھگوت گیتا'' ہے۔ جو مہابھارت کا ہی ایک حصہ ہے، جس کے مصنف کا نام ''سری کرشن جی مہاراج'' ہے، اس میں ''کرشن جی مہاراج'' کے وہ ''ملفوظات'' ہیں، جو انہوں نے ''ارجن'' کو نصیحت کے طور پر کہے تھے۔

ڈاکٹر داس گپتا کے مطابق یہ مستقل تصنیف نہیں ہے، آج کل ہندوؤں میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل ہے، اس لیے ''پنڈت جواہر لال نہرو'' نے کہا ہے: ''آج ہندوؤں کے ہر فلسفے اور سوچ کا کلیدی مرکز ''گیتا'' ہے۔

وید: حالاں کہ ان کو اپنی قدیم کتابوں کو یاد رکھنا چاہیے تھا، جن کو ''وید'' کہتے ہیں اور وہ چار ہیں: (۱) رگ وید (۲) یجر وید (۳) سام وید (۴) اتھر وید۔ ''رگ وید'' میں ۱۰/ہزار مناجاتی گیت ہیں، پوری کتاب نظم میں ہے، جس میں دیوتاؤں کی تعریف اور ان سے دعا کی گئی ہے ''یجر وید'' میں رسومات کا بیان ہے، اور ''سام وید'' میں صرف راگ اور گیت ہے، اور ''اتھر وید'' میں ۶/ہزار مناجات کے اشعار ہیں، جن میں سے تقریباً ایک ہزار دو سو منتر ''رگ وید'' سے ماخوذ ہیں۔

ویدوں میں ہندو رہنماؤں کے مطابق تحریف ہو چکی ہے ''رشی'' انہیں ویدوں کے شاعر کو کہتے ہیں، جس کی تعریف رسول کی تعریف سے بالکل متضاد ہے۔

معبود: ہندوؤں کے معبود بنیادی طور پر تین ہیں: (۱) برہما (۲) وشنو (۳) شیوا۔

اس طرح یہ لوگ بھی عیسائیوں کی طرح ''تثلیث'' کے قائل ہیں جس کو ''تری مورتی'' اور ''تِکڈم'' کہتے ہیں۔

ذات: ہندوؤں کی ۴/ذاتیں ہیں:

(۱) ''برہمن'': جس کا کام ''حصول علم'' ہے۔
(۲) ''کھشتری'': جس کا کام برہمن کو ''خیرات'' دینا ہے۔
(۳) ''ویش'': اس کا کام ''زراعت'' ہے۔
(۴) ''شودر'': اس کا کام ''تینوں ذاتوں کی خدمت'' ہے۔

وید میں لکھا ہے کہ:

برہمن: پرماتما کے منہ سے پیدا ہوئے۔
کھشتری: پرماتما کے بازو سے۔
ویش: رانوں سے ــــ اور ــــ
شودر: پرماتما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ''وید'' سے ماخوذ ہے:

'''''وید'' کے لیے برہمن پیدا کیا گیا ہے، حکومت کے لیے ''کھشتری''، کاروبار کے لیے ''ویش'' پیدا کیا گیا ہے، اور دکھ اٹھانے کے لیے ''شودر'' پیدا کیا گیا ہے''۔

اسی لیے شودروں پر بڑے مظالم ڈھائے گئے ''منوشاستر'' میں ہے کہ شودر جس عضو سے برہمن کی بے عزتی کرے اس کا وہ عضو کاٹ دو، اگر وہ برہمن کے برابر بیٹھ جائے، تو اس کے کولھے کٹوادو، اور اسے ملک بدر کردو، اگر وہ وید کی عبارتیں سن لے، تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دو، اور اگر انہیں پڑھ لے، تو اس کی زبان کاٹ دو، اور اگر وہ اسے یاد کرنا چاہے، تو اس کا دل چیر دو۔

یہ بات ہندوؤں میں ان کی مذہبی کتابوں سے ماخوذ ہے، معلوم ہوا کہ ہندو دھرم خود ذات پات کی تفریق سکھاتا ہے، سوامی دیانند نے کہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ویدک دھرم میں داخل ہو، تو وہ جس ذات کے لائق ہوگا، اس کو اسی میں ڈالیں گے۔

اسلام کی وسعتِ ظرفی: لیکن اسلام میں ذات پات کی کوئی تفریق نہیں، آج بھی کوئی اسلام قبول کرے، تو قدیم ترین مسلمان کے ساتھ مسجد میں اس کے پہلو میں برابر کھڑا ہو کر نماز ادا کر کے مساوات کا درس دے سکتا ہے۔

مصادر و مراجع:

ہندو دھرم ایک مطالعہ (محمد فاروق خان) — اگر اب بھی نہ جاگے تو ــــ (شمس نوید عثمانی)
ہندازم (عبدالحمید نعمانی) — مذاہب اور اسلام (جناب متین طارق باغپتی)
ہندومت ایک مطالعہ (وصی اقبال) — ہندو دھرم میں بھی جدید شخصیتیں (محمد فاروق خان)
وید اور اس کی قدامت (اکبر نجیب آبادی) — نراشنس اور آخری رسول (پنڈت وید پرکاش)

عیسائیت اور اس کا خط و خال

عیسائیت: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں عیسائیت کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے۔

"وہ مذہب جو اپنی اصلیت کو "ناصرہ" کے باشندے "یسوع" کی طرف منسوب کرتا ہے، اور اسے خدا کا منتخب (مسیح) مانتا ہے"۔ (برٹانیکا: ۵ / ۶۹۳)

"الفرید، ای، گاروے" لکھتا ہے: "عیسائیت کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی، موحدانہ اور کفارے پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کے ذریعے پختہ کر دیا گیا ہے"۔

بنیادی عقائد

خدا کا تصور: دوسرے مذاہب کی طرح عیسائیت میں بھی خدا کا تصور تقریباً انہیں صفات کی طرح ہے جو اور مذاہب میں ہے "مارس ریلٹن" لکھتا ہے: "عیسائیت کا خدا کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وہ ایک زندۂ جاوید وجود ہے، جو تمام امکانی صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے، اسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے، لیکن پوری طرح سمجھا نہیں جاسکتا"۔

(H. MAURICE RELTON: STUDIES IN CHRISTAON DOCTSINE 1950 PAGE NO: 3)

عقیدۂ تثلیث: عیسائی مذہب میں خدا کے تصور اور عقیدۂ تثلیث کو اس طرح الجھے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے جسے سمجھنا آسان نہیں ہے۔

عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم (PERSPNS) سے بنا ہے:

(۱) باپ　(۲) بیٹا　(۳) روح القدس

اسی عقیدہ کو "عقیدۂ تثلیث" (TRINITARIAN DOCTRINE) کہتے ہیں۔

تین اقانیم: عیسائیوں کے نزدیک جن تین چیزوں سے خدا مرکب ہے، وہ کیا ہیں؟ بعض کہتے ہیں، وہ:

(۱) خدا　(۲) باپ بیٹے اور　(۳) روح القدس ہیں

اور بعض دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ: (۱) باپ　(۲) بیٹا　(۳) کنواری مریم

کے مجموعے کو "تین اقانیم" کہنا چاہیے۔ (برٹانیکا: ص/۴۷۹: TRINITY)

توحید فی التثلیث: خود عیسائی حضرات ایک کو تین اور تین کو ایک سمجھ کر خدا کی توحید کو پایۂ ثبوت تک پہونچانے

میں حد درجے پریشانیوں کا شکار ہو چکے ہیں، چناں چہ "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" میں لکھا ہے کہ "تثلیث کے نظریے کو اور روح القدس خدا ہے، لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں، بل کہ ایک ہی خدا اس لیے کہ عیسائی نظریے کے مطابق ہم جس طرح ان تینوں میں سے ایک ہی خدا کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں، اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی بھی ممانعت کردی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں"۔

باپ: باپ سے مراد عیسائی مذہب میں "خدا کی اکیلی ذات" ہے، جس میں سے صفتِ کلام اور صفتِ حیات الگ کرلی گئی ہے۔

بیٹا: بیٹے سے مراد "خدا کی صفت کلام" یعنی (WORD OF GOD) ہے۔

روح القدس (HOLY SPIRIT): روح القدس سے مراد "باپ" اور "بیٹے" کی "صفتِ حیات" "صفتِ محبت" ہے اسی صفت کے ذریعے خدا کی ذات یعنی باپ بیٹے سے محبت کرتی ہے، اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے۔

"تین" ایک کیسے؟: اسی گتھی کو سلجھانے کے لیے بڑی بڑی عیسائی شخصیات میدان آئیں لیکن ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ یہاں تک کہ "ابیونی فرقے" نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: حضرت مسیح علیہ السلام کو ہم خدا مان کر عقیدۂ توحید کو سلامت نہیں رکھ سکتے" اس جملے عیسائی علما اور کلیسا بے حد ناراض ہوئے اور اس فرقے کو ملحد و زندیق قرار دیا۔

ایک حل: ہندوستان کے پادریوں نے "تین کو ایک" "متشابہات" میں شامل کیا ہے، لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں۔

عیسائیوں کے حضرت مسیح کے بارے میں عقائد:

حضرت مسیح کے بارے میں عیسائیوں کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی صفت کلام (یعنی بیٹے کا اقنوم) انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کے انسانی وجود میں حلول کر گئی تھی، جب تک حضرت مسیح دنیا میں رہے، یہ خدائی اقنوم ان کے جسم مین حلول کیے رہا، یہاں تک کہ یہودیوں نے آپ کو سولی پر چڑھا دیا، اس وقت یہ خدائی اقنوم ان سے الگ ہوگیا، پھر تین دن کے بعد آپ دوبارہ زندہ ہو کر حواریوں کو دکھائی دیے، اور انہیں کچھ ہدایات دے کر آسمان پر تشریف لے گئے، اور یہودیوں نے آپ کو سولی پر چڑھا دیا۔ اس سے تمام عیسائی مذہب پر ایمان رکھنے والوں کا وہ گناہ معاف ہوگیا جو حضرت آدمؑ کی غلطی سے ان کی شرست میں داخل ہوگیا تھا۔

اس عقیدے کے چار بنیادی اجزا ہیں:

(۱) INCARNATION عقیدۂ حلول و تجسم — (۲) CRUCIFIXION عقیدۂ مصلوبیت

(۳) RESURRECTION عقیدۂ حیاتِ ثانیہ — (۴) REDEMPTION عقیدۂ کفارہ

عیسائی فرقے: یولی فرقہ: پانچویں صدی عیسوی میں یولی فرقہ نمودار ہوا، اس کے رائے حضرت عیسیٰ خدا نہیں بل کہ فرشتے تھے۔

نسطوری فرقہ: نسطوریوں (م ۴۵۱ء) کے نام نسطوری فرقہ بنا ت اس کے نزدیک حضرت مسیح میں دو صفات ہیں:

۱۔انسانی ۲۔خدائی

یعقوبی فرقہ: شام، عراق مین اب تک یہی فرقہ ہے، چھٹی صدی عیسوی اس کا زمانہ ہے، اس کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح صرف خدا تھے، اگر چہ ہم کو انسان کی شکل مین نظر آتے تھے۔

"The world family Enay dopedia" میں تحریر ہے کہ "مسیح میں خدائی اور انسانی حقائق کچھ اس طرح متحد ہو گئی تھیں کہ وہ صرف ایک حقیقت بن گئی تھی"۔

عقیدہ مصلوبیت: عیسائیوں کا دوسرا عقیدہ عقیدۂ مصلوبیت ہے، ان کا خیال ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نی سولی دے دی، لیکن "اقنوم ابن" کو سولی نہیں دی گئی، بل کہ حضرت مسیح کو دی گئی جو ایک مخلوق ہیں۔

صلیب مقدس: (+) صلیب کے اس نشان کی اہمیت عیسائیوں کے نزدیک بہت زیادہ ہے، چوتھی صدی عیسوی تک اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، ۳۱۲ء میں شاہ قسطنطین نے ایک خواب میں اپنی فتح کے لیے آسمان صلیب کا یہ (+) نشان دیکھا، پھر مئی ۳۲۶ء کو اس کی والدہ "سینٹ ہلینا" کو ایک صلیب ملی، جس کو وہ بزعم خود وہی صلیب سمجھتے ہیں جس پر حضرت مسیح کو پھانسی دی گئی، اب ۳ مئی "دریافت صلیب" کے نام سے ایک جشن منانے لگے۔

عقیدہ حیات ثانیہ: حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی، پھر تدفین عمل میں آئی، تین دن کے بعد حضرت عیسیٰؑ عیسائیوں کے پاس آئے، اور ان کو کچھ ہدایات دیں، پھر آسمان پر چلے گئے، یہی حیات ثانیہ کا عقیدہ ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے "اظہار الحق" میں اس واقعے کی پرزور تردید فرمائی ہے۔

عقیدہ کفارہ: "مسٹر ڈینیل ولسنی کے مطابق "عقیدہ کفارہ" عیسائیوں کے عقائد کی جان ہے۔

"عقیدۂ کفارہ کے ذریعہ ایک گنہ گار انسان یک محنت خدا کی رحمت کے قریب پہونچ جاتا ہے"

اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی جان دے کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

عبادات اور رسم و رواج

اصول عبادت: عیسائیوں کے نزدیک اصول عبادت ۴ رہیں:

(۱) عبادت: حضرت عیسیٰؑ کی قربانی کا شکرانہ ہے جو حضرت عیسیٰؑ نے بندوں کی طرف سے دی تھی۔

(۲) صحیح عبادت: روح القدس کے عمل سے ہو سکتی ہے۔

(۳) عبادت: درحقیقت ایک اجتماعی فعل ہے جو کلیسا انجام دے سکتا ہے۔

(۴) عبادت: کلیسا کا کلیدی عمل ہے۔

حمد خوانی: اسی طریقہ عبادت کو عیسائی "نماز" بھی کہتے ہیں۔اس کا طریقہ یہ ہے لوگ صبح وشام کلیسا میں جمع ہوتے ہیں۔ایک شخص بائبل کا کوئی حصہ تلاوت کرتا ہے، جو عام طور پر زبور کا کوئی ٹکڑا ہوتا ہے لوگ کھڑے ہوکر سنتے ہیں، اور بعد میں دعا کرتے ہیں۔

بپتسمہ (BAPTISA): یہ ایک قسم کا غسل ہے جب کوئی عیسائی بنتا ہے تو اس کو ایک خاص قسم کا غسل دیا جاتا ہے، اسی غسل کے بعد وہ آدمی عیسائی بن جاتا ہے۔

عشاء ربانی: عیسائی بننے کے بعد ایک خاص قسم کا کھانا عیسائیوں کے ساتھ کھایا جاتا ہے، حضرت عیسیٰ نے قربانی سے پہلے، اپنے حواریوں کے ساتھ رات میں کھانا کھایا تھا، اسی کو یادگار کے طور پر لوگ بھی کھانا کھاتے ہیں، اسی کو عشاء ربانی کہتے ہیں۔

عیسائیت کا بانی: ظاہر ہے کہ عیسائیت کی نسبت حضرت عیسیٰ کی طرف ہے، اور وہی اس مذہب کو لانے والے ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر آج کا عیسائی مذہب قائم نہیں ہے، آج کی عیسائیت کا بانی "پوس" نامی کٹر یہودی ہے، جس کے زندگی کے ابتدائی حالت تو تاریکی میں ہیں، البتہ "کتاب اعمال" اور اس کے "خطوط" سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدا میں قبیلۂ بنیامین کا ایک کٹر فریسی یہودی تھا اور اس کا اصلی نام "ساول" تھا یہ روم کے شہر "ترسُس" کا باشندہ تھا، حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور ان پر ایمان لانے والوں کا سخت دشمن تھا اور شب وروز ان کی ایذا رسانی کے درپے رہتا تھا لیکن اچانک اس نے یہودیت سے عیسائیت کا لبادہ اوڑھ لیا اور حواریوں کی بتلایا کہ دمشق کے راستے میں آسمان سے ایک نور ظاہر ہوا، اس نور میں خداوند یسوع نے مخاطب بنا کر مجھ سے کہا: اے ساول! تم مجھ کو تکلیف کیوں پہونچاتے ہو، اٹھو! اور عیسائیت کی تبلیغ کرو"۔

اسی وقت سے اس ڈرامائی انداز سے عیسائیت کی بیخ کنی کے لیے نفاق کے انداز میں ساول حواریوں کے ہمراہ رہنے کے ارادہ تبلیغی مشن پر روانہ ہوکر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

قدیم عیسائیت اور موجودہ عیسائیت: قدیم عیسائیت میں "تثلیث" کا عقیدہ قطعانہ تھا، پوس یعنی ساول ہی نے یہ عقیدہ بیان کیا۔

حلول وتجسم اور کفارے کا عقیدہ بھی اسی ساول یہودی کا بڑھایا ہوا ہے جس نے اپنا نام بدل کر پوس رکھ لیا اسی طرح موجودہ عیسائیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے، بل کہ پوری عیسائیت ساول نامی یہودی کی تراشی ہوئی ہے۔لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے موجودہ عیسائیت کلی طور پر محرف ومبدل ہے۔

اناجیل اربعہ: "لوقا" "متی" "یوحنا" "مرقس" نامی چاروں انجیلیں آج عیسائی مذہب میں معتبر مانی جاتی ہیں۔ جب کہ ان کا ایک حرف بھی حضرت عیسیؑ کے ملفوظ ونصائح میں سے نہیں ہے۔

انجیل برنا باس: ایک پانچویں انجیل جس کا نام "انجیل برناباس" ہے، اس میں اسلام کی تعلیمات وافر مقدار میں موجود ہیں، ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی بھی اس میں موجود ہے، اس انجیل کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے جس کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

(۱) لست أهلا ان أحل رباطات جرموق او سيور حذاء رسول الله الذي تسمونه مسيا الذي خلق قبلي، و ياقي بعدي ۔ف: ۴۲، آیت ۴۴)

میں اس کے لائق بھی نہیں ہوں کہ اس رسول اللہؐ کے جوتے کے بند یا نعلین کے تسمے کھولوں جس کو تم مسیّا کہتے ہو، وہ جو کہ میرے پہلے پیدا کیا گیا اور اب میرے بعد آئے گا۔ (عربی ترجمہ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۸ء (اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۶ ص ۶۴)

یہ انجیل برناباس حواری کی تحریر کردہ ہے، اس کو "کریمر" نامی شخص نے اس کا اطالوی نسخہ ایمسٹرڈم کے کسی صاحب حیثیت آدمی سے حاصل کیا تھا، پھر ۱۷۳۸ء میں اسٹریا کے پایۂ تخت "وائنا" کے شاہی کتب خانے میں منتقل ہو گیا۔ اور آج تک وہیں ہے۔

چوں کہ اس انجیل کے پڑھنے سے آدمی مسلمان بن سکتا ہے، اس لیے کہ اس میں ایک نوعیت سے اسلام کی تبلیغ ہے، اس لیے موجودہ عیسائی حضرات کہتے ہیں کہ یہ انجیل کسی مسلمان کی گھڑی ہوئی تصنیف ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس انجیل کا درجۂ استناد بائبل کے کسی بھی صحیفے سے کم نہیں ہے، بل کہ اس سے کہیں زیادہ ہے، خدا سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ آمین!

مصادر و مراجع:

عیسائیت کیا ہے؟ (مولانا تقی عثمانی) — بائبل سے قرآن تک (رحمت اللہ کیرانوی، ترجمہ: مولانا تقی عثمانی)
برناباس کی انجیل (پروفیسر ضیائی صاحب) — بائبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کیا کہتی؟ (احمد دیدار)
عیسائیت اور اسلام (غازی احمد) — عیسائیت کلیسا کی روشنی میں (مولانا نعمت اللہ صاحب کا محاضرہ)
توحید سے تثلیث تک — عیسائی انجیل اور قرآن کی روشنی میں — نان لے ایمان دے

مذہب یہود: عقائد و تعلیمات

یہود کا لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے، ان کو "بنی اسرئیل" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، اسرائیل، عبرانی زبان کا لفظ ہے، اسرا کے معنی بندہ اور "ایل" کے معنی اللہ، اس طرح اسرائیل کے معنی "عبداللہ" کے ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے قبل یہودیوں کی عبادت کے ۳ طریقے الاخر ۱۴۴۲ھ

(۱) خاندانی دیوتاؤں کی عبادت (۲) پتھر کی عبادت (۳) بادشاہوں کی عبادت

یہود: یہودیوں کا قومی بت ''یہوداہ'' تھا، اسی نام پر اس قوم کو ''یہود'' کہتے ہیں، اس کا اصلی نام ''بعل'' اور ''مولک'' تھا جو دو قومی بادشاہ تھے۔ وہی دونوں مل کر ایک بت ''یہوداہ'' کی شکل میں متعارف ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام: قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات تفصیل سے موجود ہیں: یہاں کچھ اختصار کے ساتھ عرض ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام ''یوکابد'' تھا آپ کی ولادت سے قبل فرعون کا نام ''رامسیس'' تھا، اسی نے خواب دیکھا تھا، اسی نے قتل کا حکم جاری کیا تھا۔

فرعون کا بچوں کو قتل کرنا، حضرت موسیٰ کا معجزاتی طور پر بچ جانا، شاہی محل میں اپنی ماں کے ذریعہ پرورش پانا، حضرت آسیہ کی نگرانی، قبطی کے قتل کا واقعہ، مصر سے ترک وطن کر کے مدین روانگی، حضرت شعیبؑ سے ملاقات، دس سال ان کی خدمت، ان کی بیٹی سے نکاح، راستہ میں نبوت ملنا، معجزات ملنا، فرعون کے دربار میں نعرۂ توحید بلند کرنا، فرعون کا مقابلہ بازی پر اتر آنا، جادوگروں کا ایمان، بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جانا، فرعون کا تعاقب، لشکر سمیت فرعون کا غرق آب ہونا، حضرت موسیٰ کا وادی سینا میں، گرمی کی وجہ سے استقا رحمت کرنا، پتھر سے ۱۲ چشمے جاری ہونا، بادلوں کا سایہ، من وسلویٰ کا نزول، بنی اسرائیل کا سبزیوں کا مطالبہ، اور بچھڑے کی پوجا وغیرہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہ تفصیلی واقعات ہیں تو اتنی صحت واستناد کے ساتھ شاید توریت میں بھی نہیں ہیں۔

یہودیوں کی مقدس کتابیں: توریت کے پانچ حصے ہیں، جن کو ''کتب خمسہ موسوی'' کہتے ہیں:

(۱) کتاب پیدائش (۲) کتاب خروج (۳) کتاب احبار (۴) کتاب اعداد (۵) کتاب استثناء

دوسرے سلسلے میں کل ۲۲ کتابیں ہیں جن میں:

(۱) کتاب یوشع (۲) کتاب یسقیاہ (۳) کتاب جوئیل، وغیرہ کا حوالہ ملتا ہے۔

ان کے مجموعے کو ''جنیم'' کہتے ہیں۔

کتب مقدسہ کا تیسرا سلسلہ ''کتبیم'' کہتے ہیں، زبور اور تورات دونوں کو یہودی مانتے ہیں، اور دونوں کو الگ الگ کتابیں مانتے ہیں۔

زبان: یہودیوں کا کہنا ہے کہ ہماری کتب کی زبان اصلاً ''عبرانی'' تھی، بعد میں تبدیلی ہوگئی، چناں چہ پہلے ''آرامی'' زبان میں جمع کیا گیا، پھر ''یونانی'' زبان میں، پھر رومی زبان میں بھی۔

تالمود: حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کی اولاد کے احوال پر مشتمل یہ یہودیوں کی مقدس کتاب ہے۔

تہوار

یوم السبت: ہفتے کا تہوار ہے، جو جشن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

عید فصیح: ملک مصر سے آزادی کے طور پر ''عید فصیح'' مناتے ہیں۔

یوم الخمیس: عید فصیح کے ۵۰/دن بعد مناتے ہیں۔

یوم ختنہ: بچے کی پیدائش پر ۸/دن کے بعد ''یوم ختنہ'' مناتے ہیں۔

رسم عقیقہ: عقیقے کا ثبوت یہودی مذہب میں بھی ملتا ہے، مدینہ منورہ میں یہودیوں کے عقیقے کا ذکر ملتا ہے لیکن ہمارے یہاں اسلام میں لڑکے کی پیدائش پر ۲/جانور اور لڑکی کی پیدائش پر ایک جانور ذبح کیا جاتا ہے، یہودیوں کے یہاں لڑکے کی پیدائش پر ایک اور لڑکی کی پیدائش پر کچھ نہیں ذبح کیا جاتا۔

یوم کفارہ: ''یوم کفارہ'' یہودیوں کا سب اہم تہوار ہے، سالِ نو کے موقعے پر دس روز تہوار مناتے ہیں، جس میں اپنے گناہ سب کی معافی، خصوصی دعائیں اور صدقہ وخیرات کا اہتمام ہوتا ہے۔

یہودی ٹوپی: یہودیوں کی ٹوپی چھوٹی سی اور جالی دار ہوتی ہے ان کے جھنڈے پر ان کی ٹوپی کی طرح ستارہ بنا ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں اس طرح کی ٹوپی سے بچنا چاہیے۔

عید تجدید: دسمبر کے مہینے میں یہ عید پڑتی ہے، ۱۶۵/سال قبل مسیح ہیکل کی عبادت اسی روز بحال ہوئی تھی۔ یونانی بادشاہ ''انتوکس ابی فانس'' کی غلامی سے اسی روز نجات ملی تھی، اسی کی خوشی میں 'عید تجدید' منائی جاتی ہے۔

عالمی عید: یہ عید عام طور پر سے جولائی یا اگست کے شروع میں آتی ہے، اس دن یہودیوں کے لیے دو عظیم حادثے پیش آئے: (۱) ایک یہ کہ بخت نصر نے تمام اعلیٰ طبقے کے یہودیوں کو اسی روز قیدی بنا کر بابل لے گیا اور ہیکل کو تاخت وتاراج اور برباد کر ڈالا۔ (۲) دوسرا واقعہ ہوا کہ اسی روز ۶۵۶ سال بعد ۷۰ء میں رومی فوجوں نے دوبارہ ہیکل کو لوٹنے کے بعد جلا کر راکھ کر دیا۔

یہودی یہ دونوں واقعہ یاد کر کے آج کی تاریخ میں روتے گڑگڑاتے اور دعا کرتے ہیں۔

یہودیوں کی بداعمالیاں: یہودیوں کے کرتوت اور گھناؤنی عادتوں کو اگر آپ جان لیں تو صہیونی حرکات کو سمجھنے میں مدد بھی ملے گی۔

(۱) مکر وفریب۔ (۲) کبر وغرور۔

(۳) دوسروں کی چیزوں کو حلال سمجھنا۔ (۴) دوسروں کو ایذا پہونچانا۔

(۵) دوسروں کے لیے بدخواہی، اور وفاداری سے خالی ہونے کی خوبو۔

(۶)معاہدے کی خلاف ورزی۔

(۷)معاہدے کی پابندی بالآخری پچھاوا ہے۔

(۸)دوسروں کے مال غصب کرنا۔

(۹)خدائی کی طرف غلط باتوں کی نسبت۔

(۱۰)خدا کے احکامات میں تبدیلی۔

(۱۱)خدا اور اس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی۔

(۱۲)خدا کے احکام چھپالینا۔

(۱۳)فسق وفجور کے لیے ہر طریقے کا بلاجھجک استعمال۔

(۱۴)حد سے زیادہ بخیلی۔

(۱۵)ضرورت سے زیادہ بزدلی۔

مذکورہ بالا عادات واطوار یہودیوں کے ہیں۔

جو خود ان کی کتابوں سے جانے گئے ہیں، یہ عادات واطوار یہودیوں فی نسل میں سرشت اور فطرت ثانیہ ہیں جن پر وہ نسلاً بعد نسل کار بند رہے، اور خدا کی طرف سے سزا کے بھی مستحق ہوئے۔

قرآن کریم میں بھی اللہ تعالی نے یہودیوں کے ان اطوار میں سے بعض کو اچھی طرح زور دے کر بیان کیا ہے، جن کو قرآن کریم کی آیات میں دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

(۱)ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعملون (آل عمران:۷۸)

(۲)قالت الیھود ید اللہ مغلولۃ (مائدہ:۶۴)

(۳)قالوا ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء (آل عمران:۱۸۱)

(۴)نحن ابناء اللہ و احباءہ (آل عمران:۱۸۱)

(۵)تمسنا النار الا ایاما معدودات (آل عمران:۲۴)

(۶)فبما نقضھم میثاقھم (مائدہ:۱۳)

(۷)لن نومن لک حتی نری اللہ جھرۃ (بقرہ:۵۵)

(۸)اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (مائدہ:۲)

(۹)ویقتلون النبی بغیر الحق (آل عمران:۲۱)

(۱۰)یحرفون الکلم عن مواضعہ (مائدہ:۱۳)

اس طرح کی بے شمار آیات یہودیوں کی گندی خصلتوں کی نشاندہی کرتی ہیں جن میں سے "مشتے از خروارے" ۱۰ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

بدھ مذہب

۵۶۸ق م شمالی ہند کے علاقہ نیپال میں پیدا ہونے والے "گوتم بدھ" اس مذہب کے "بانی" ہیں۔ جس کا نام "سدھارتھ" تھا اور خاندانی نام گوتم "محنت وریاضت کی وجہ سے "بدھ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ دونوں کو ملا کر گوتم بدھ بنے"۔

بدھ مذہب کے عقائد

روح: شردھے پرکاش دیو جی" لکھتے ہیں کہ روح سے متعلق بدھ مذہب کا عقیدہ یہ ہے، کہ روح مرتی نہیں ہے، بل کہ انسان کی موت کے وقت روح کو ایک اعلی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

فرشتہ: گوتم بدھ کے ایک شاگرد "اشوک" لکھتے ہیں: کہ گوتم بدھ دیوتاؤں کہ قائل تھے اور ان میں فرشتوں کی سی صفات کا اظہار کیا کرتے تھے، سورگی دیوتا، کے بارے میں گوتم بدھ کی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اس کا چہرہ روشن اور لباس برف کی طرح سفید تھا، ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ آسمان اور اس کی بلندیوں میں دیوتا (فرشتے) بھرے پڑے ہیں، سب سے اوپر "برھما" کا عرش اور اس کے دیوتا (فرشتے) ہیں۔

قیامت: اشوک کے نزدیک "گوتم بدھ" قیامت کے قائل تھے "سنگی کتبہ چہارم" میں لکھا کہ میری اولاد اور جانشین اگر قیامت تک میری اتباع کریں تو قابلِ تعریف کام کریں گے۔

مرنے کے بعد کی زندگی: "اشوک" کہتا ہے کہ "بدھ مذہب" میں مرنے کے بعد کی زندگی کا تصور پایا جاتا ہے۔

جنت: جنت کا بھی تصور "گوتم بدھ" کے یہاں موجود ہے، دریافت کتبوں میں درج ہے کہ ------------ تاکہ لوگ دوسری دنیا میں "بہشت" حاصل کریں۔

بدھ مذہب کی تعلیمات

ممنوعات: چوری، زنا، جھوٹ، نشہ، قتل، رات کو دیر سے کھانا، زمین پر سونا، ہار پہننا، خوشبو لگانا، یہ سب چیزیں منع ہیں۔

والدین اور اولاد: والدین اولاد کو برے کام سے روکیں، خود نیکی کریں، دوسروں کو بھی نیکی کا حکم دیں، اولاد کو علم دنیوی سے نوازیں، اسی طرح گوتم بدھ نے والدین اور اولاد کے علاوہ شاگردوں کے حقوق وفرائض، استاذ کے فرائض، زن وشوہر کے حقوق وفرائض، دوستوں کے حقوق، آقا وملازم کی ذمے داریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایصالِ ثواب، حلال جانور کو کھانا، خنزیر سے اجتناب، درندوں کے گوشت سے پرہیز بدھ مذہب میں قانونی حیثیت رکھتا ہے، جوان کو اہلِ کتاب میں شمولیت کی طرف غماز ہے۔

تعداد: بدھ مذہب کی پوری تعداد ۵۰ کروڑ تک ہے، پوری دنیا میں مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے والوں کی تعداد ۳ کروڑ ہے، "تبت" میں سرکاری مذہب "بدھ مذہب" ہی کو تسلیم کیا گیا ہے، چین، جاپان، کوریا، سنگاپور، اور سری لنکا میں بھی گوتم بدھ کو ماننے والے پائے جاتے ہیں۔

جین ازم

"جین" مذہب کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ "جین مذہب" ازلی ابدی ہے الاخریٰ ۱۴۴۰ھ لوگوں کی عمریں بڑی طویل ہوتی تھیں، "جین" کا لفظ جنا سے بنا ہے، جس کے معنی فاتح، اور غالب کے آتے ہیں۔

بانی: جین مذہب کا بانی اولاً "ناتھ" نامی شخص تھا، اور سب سے آخری مصلح "پرسوناتھ"۔ موجودہ جین مذہب کا بانی "مہاویر" کو بتایا جاتا ہے، جس کی پیدائش "پرسوناتھ" کے ڈھائی سوسال بعد ۵۴۰ ق م میں ہوئی۔

نام ونسب: مہاویر کا، اصلی نام "وردھمان" والد کا نام "سرھاوتہ" خاندان: کھشتری، پرورش نازونعمت کی حالت میں ہوئی، تیس سال کی عمر میں ہندوازم سے رہبانیت اختیار کی۔

وفات: ۷۲ سال کی عمر میں جنوبی بہار "پاواں" کے مقام پر انتقال ہوا۔

تعلیمات وارشادات

(۱) سچائی کو لازم پکڑیں۔ (۲) ایذارسانی سے بچیں۔ (۳) حلال روزی کا اہتمام کریں۔
(۴) عفت کا خیال رکھیں۔ (۵) حواس خمسہ پر غلبہ رکھیں۔

مذکورہ بالا امور کو بالترتیب "(۱) ستیام (۲) اہمسہ (۳) استیام (۴) برہمچاری (۵) اپری گراہہ" کہتے ہیں۔

جین مذہب کی حلف برداری: مندرجۂ ذیل شرائط کے ساتھ حلف برداری ہوتی ہے۔

(۱) کسی ذی روح کو نقصان نہ پہونچانے کی قسم کھائی جائے۔
(۲) کسی کو نقصان پہونچانے کا موقع بھی نہ دے۔ (۳) اقرار کرے کہ ہمیشہ کنوارا رہوں گا۔
(۴) راہبانہ زندگی گذاروں گا۔ (۵) ذی روح کو ہلاک کرنا قابلِ مذمت عمل ہے۔

جینی فرقے: زیادہ مشہور جین مذہب میں صرف دوفرقے ہیں:

(۱) ایک کا نام "سوتیامبر" ہے۔
(۲) دوسرے کا نام "گمبر" ہے، ایک کو وائٹ کلیڈ White clad کہتے ہیں، اور دوسرے کو اسکائی کلیڈ Sky clad گمبر فرقے کے لوگ زیادہ تر مادرزاد ننگے رہتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں ان کی اکثریت پائی جاتی ہے اور "سوتیامبر" فرقہ شمالی ہندوستان میں آباد ہے۔

کتابیں: چار کتابیں زیادہ مشہور ہیں: (۱) آنگس (۲) میولہ (۳) سوترا (۴) اپانگا۔

عقیدہ: جین مذہب کے لوگ مرنے کے بعد آواگون یعنی تناسخ کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو روح اس قدر بوجھل ہوتی ہے کہ ٹوٹنے لگتی ہے، اور ساتویں دوزخ کا رخ کرتی ہے اور کوئی اگر نیک عمل کرتا ہے تو ۲۶/ویں بہشت میں جاتی ہے۔

اسلام اور جین مذہب: اسلام میں بھی ایذا احرام ہے، لیکن جین مذہب میں ایذا کی حرمت ایک نا قابلِ عمل مبالغہ آرائی کی حد تک حرام ہے، اسی لیے یہ مذہب دنیا میں چل نہ سکا۔

خالق کائنات کا واضح تصور جین مذہب میں ملنا مشکل ہے، البتہ اسلام میں سینکڑوں احادیث وآیات میں خالق کائنات کی قدرتی ووحدانیت کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

جین مذہب میں رہبانیت کی تعلیم ہے اور اسلام رہبانیت کا شدت سے مخالف ہے۔

ازدواجی زندگی کے ساتھ خداوند قدوس کی عبادت کا اسلام بھرپور رہنما ہے۔ جب کہ جین مذہب میں شادی کی شدت سے ممانعت ہے۔

کنفیوشس ازم

بانی: اس مذہب کو ''کنفیوشس ازم'' کہتے ہے، اس لیے کہ اس کے بانی کا نام ''کنفیوشس'' تھا۔ یہ ملک چین کا ایک بہت ماہر فلسفی تھا، ۵۱ ق م، اس کی پیدائش چین کے صوبے ''لو'' میں ''شولان'' کے گھر ہوئی۔

اصول وتعلیمات:

(۱) بادشاہ اپنے عوام کے لیے قابل تقلید شخص ہوتا ہے۔ (۲) حکومت عوام کا اعتماد حاصل کرے۔
(۳) حکمرانوں اور عوام کے درمیان خلوص ہو۔ (۴) اچھا سلوک۔
(۵) ایمان داری کا جذبہ۔ (۶) والدین اور اولاد کا خیال رکھیں۔
(۷) اولاد والدین کا احترام کرے۔ (۸) دوست دوست کی خوشی غمی میں کام آئے۔
(۹) میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق وفرائض کا خیال رکھیں۔

مذہبی کتابیں: بانیٔ مذہب اپنی حیاتِ مستعار میں اپنے مذہب پر کوئی لٹریچر فراہم نہ کر سکا لیکن بعد میں شاگردوں نے اتنا لکھا کہ یہ کتابوں کا مذہب کہا جانے لگا۔

چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) لُن: چینی زبان کا لفظ ہے، عقل ودانش مندی کے ہم معنی ہے، اس کتاب سے زرلشت سمجھنا آسان ہے۔
(۲) تعلیم۔ اس میں ''کنفیوشس'' کے ملفوظات ہیں جسے اس کے پوتے ''تسز'' نے جمع کیا ہے۔
(۳)۔ علم عظیم ''گریٹ لرننگ'' great learning کے نام سے انگریزی زبان میں اس کا نام مشہور

ہے، یہ کتاب کنفیوشس کی طرف منسوب ہے۔

(۴)"شو چنگ" (۵)"شی چنگ" (۶)"لی چی"

(۷)"یی چنگ" (۸)"چوں چن" (۹)"چونگ چونگ"۔

اسلام اور کنفیوشس ازم

(۱) توحید: کا عقیدہ اسلام میں اصل الاصول اور سارے عقائد کی بنیاد، کنفیوشس ازم میں بھی توحید کا تصور ہے، لیکن بالکل دھندلا۔

(۲) حیات بعد الموت: کنفیوشس کے سامنے حیات بعد الموت کا سوال آیا، تو اس نے کہا اس بات کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، اس کی کوشش نہ کرو۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ اس مذہب میں آخرت کا کوئی صاف تصور نہیں۔

۳) تخلیق کائنات: کائنات کو خدا نے بنایا، ہم کو ماضی کے قدرتی واقعات معلوم کرکے قدرت خداوندی سمجھ میں آئے گی، لیکن کنفیوشش صرف حال کا بندہ تھا، اور ماضی اور مستقبل کے چکروں سے اسے نفرت حد درجے تھی۔

عالمگیریت: کنفیوشش کا اسلام سے تقابل ایک طرح کا ظلم ہے، اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے، کنفیوشش میں اس کی صلاحیت نہیں۔

دیانت داری: کنفیوشش کے یہاں، دیانت داری کے ساتھ حلال روزی کمانے کا سبق ملتا ہے، یہی اسلام کا بھی نعرہ ہے، لیکن ایک دوسرے کی تشریحات میں یکسر فرق ہے۔

زاویہ نگاہ: کنفیوشش کا مطمح نظر عوام کو خوش کرنے اور ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا ہے، جب کہ اسلام اللہ کی توجہ اور اس کی مرضی کے حصول کی تعلیم اپنے پیروکاروں کو بڑی پختگی سے دیتا ہے، اس لیے اسلام کا تقابل کنفیوشش ازم سے کرنا لاحاصل اور ظلم بالائے ظلم سے کم تر کیسے کہا جائے۔

زرتشت ازم

زرتشت، زردشت بھی کہتے ہیں، یہ مذہب بھی اپنے بانی کی طرف منسوب ہے، اس کا وجود "ایران" "آذربائیجان" اور اس کے آس پاس کی ریاستوں میں ہے۔

بانی: زرتشت جوزرتشت ازم کا بانی ہے، اس کی پیدائش سنہ ۶۶۰ق م ہوئی، صرف ۷۲ سال کی عمر پاکر ۵۸۳ق م میں اس کا انتقال ہوگیا، لیکن یہ مؤرخین کی غلط فہمی ہے، پروفیسر لیوس مور کے مطابق ۷۷ سال کی عمر میں زرتشت کا انتقال ہوا، پروفیسر لیاقت حسین کا کہنا ہے کہ صرف ۴۷ سال تو زرتشت نے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت میں صرف کیا، زرتشت کی پیدائش ''آذربائیجان'' میں ہوئی، والد کا نام ''پورشاپ اسپیتما'' ہے، والدہ کا نام ''دگدو'' یا ''آسان'' ہے۔

ایک قصہ: زرتشت کی پیدائش کے وقت کاہنوں کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی، انہوں نے زرتشت کو آگ میں ڈال کر جلانا چاہا، تو آگ میں زرتشت کو ڈالا گیا، لیکن کچھ نہ ہوا، پھر ایک دن جنگل میں اکیلا چھوڑ دیا گیا، تاکہ جنگلی درندے اس کو چیر پھاڑ ڈالیں، لیکن ایک گائے نے اپنے چاروں پیروں کے درمیان میں اس کو چھپالیا، سارے جانور گزر گئے، زرتشت محفوظ رہا، پھر اکیلا ایک بھیڑیئے کے غار میں اسے چھوڑ دیا گیا، تو وہاں اچانک دوفرشتے دو بکریوں کی شکل میں نمودار ہوئے، اور انہوں نے اس کو دودھ پلا کر بڑا کیا۔

اس کے استاذ کا نام ''بڑا کرزا'' ہے، انہوں نے زرتشت کو تمام علوم وفنون میں ایسی دل چسپی پیدا کی کہ مذہب، زراعت، گلہ بانی، جراحی تمام قسم کے علوم وفنون میں زرتشت نے مہارت تامہ حاصل کی، لیکن خدمت خلق کی طرف زرتشت کی توجہ زیادہ تھی۔ اس کو خیال تھا کہ انسان پر مصائب کہاں سے آتے ہیں، اس سوال کا جواب بہت دنوں تک سوچتا رہا، اچانک ایک دن غروب آفتاب کے وقت اس کا جواب اس کے ذہن میں خود بہ خود آگیا، اور حد درجہ خوشی کا اظہار کیا، پھر زرتشت نے اپنا ایک جدید عقیدہ بتایا کہ خیر کی تمام اشیا کا خالق الگ ہے، اور شر کی تمام اشیا کا خالق الگ، خالقِ خیر کا نام ''اھورا ماژدا'' ہے، اور خالق شر کا نام ''اینگرومینو'' اسی کو شیطان کہتے ہیں، اس لیے اھوراماژدا کی زرتشت عبادت کرتا، اور اینگرومنیو سے بچتا۔ آفتاب پرستی، آب پرستی، بادپرستی، اور ماہ پرستی، فارس یعنی ایران میں عام تھی، آذر بائجان میں بھی یہی سب کچھ تھا۔ زرتشت نے مادہ پرستی سے لوگوں کو نکالنا چاہا۔ حکومت کے دربار میں پہونچ کر علما سے مناظرہ کیے، فتح حاصل کی، لوگوں نے زرتشت کا مذہب قبول کیا۔

دوسرا قصہ: بادشاہِ وقت کا گھوڑا بیمار ہوگیا۔ علاج ومعالجہ میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، لیکن خدا کی مرضی کہ گھوڑا ٹھیک نہیں ہوا۔ زرتشت کو پتہ چلا تو پیغام بھیجا کہ اگر میں گھوڑے کا علاج کروں تو ٹھیک ہوجائے گا، لیکن بادشاہ کو میرا مذہب قبول کرنا پڑے گا۔ بادشاہ نے حامی بھرلی۔ زرتشت نے علاج شروع کیا، واقعی گھوڑا بیماری سے شفایاب ہوگیا، تو بادشاہ نے زرتشت ازم کو قبول کرلیا۔ اس طرح زرتشت مذہب ایک سرکاری مذہب بن گیا جس کے پھلنے پھولنے کے خوب مواقع ملے۔ اسی اثنا میں ایران توران کے درمیان جنگ شروع ہوگئی، کسی نے موقع پاکر ''زرتشت'' کو قتل کرڈالا۔

تنبیہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ لوگوں نے زرتشت کے ساتھ بھی بیان کیا ہے، لیکن یہ بات قطعاً صحیح نہیں ہوسکتی، معراج جسمانی حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔

عقائد: زرتشت موحد تھا۔اس کا یہ قول ہے۔

توحید: ”تو ہی خدا ہے، یہ میں جانتا ہوں، اے قادرِ مطلق! تو ہی اول تھا، جب زندگی نے جنم لیا“۔

صفات باری تعالیٰ: صفات خداوندی کے سلسلے میں بھی زرتشت ازم کا اسلام سے کوئی تصادم نہیں ، زرتشت کا قول ہے:

”خدا ایک ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں وہ آغاز وانجام، شریک ، دشمن دوست ، ماں ، بیوی، اولاد، مکان جسم اور رنگ وبو کے بغیر ہے، اس کو نہ آنکھیں پاسکتی ہیں نہ خیال کی گرفت میں لایا جاسکتا ہے، اس کی ہر صفت برتر ہے، وہ غیر فانی ہے، عقل کل ہے، وہ تمام زمین کی نعمتوں کا مالک ہے، وہ حقیقتِ اعلیٰ ہے“۔(تقابل ادیان: ص ۱۴۲)

فرشتے: زرتشت کے نزدیک فرشتے ایک مخلوق ہیں، جن کو خدا اور بندے کے درمیان واسطے کے طور پر پیدا کیا گیا ہے، ہماری روحانی جسمانی نشوونما و تربیت کی ذمہ داری ان کو دی گئی ہے۔

جنت: زرتشت کہتا ہے: ”جب نیک آدمی جسم کو چھوڑتا ہے، تو وہ بہشت میں پہونچ جاتا ہے، اور خدا بہشتیوں کو جسم عطا کرے گا، نہ وہ ریزہ ریزہ ہوگا، نہ پرانا ہوگا، اور نہ اس میں گند پیدا ہوگا۔(ادیان باطلہ: ص ۱۴۲)

دوزخ: زرتشت لکھتے ہیں: ”ان کی برائیاں انہیں آگ کی صورت میں جلائیں گی، تیز ٹھنڈی ہوائیں، برف، سانپ، بچھو، اور دوسرے موذی جانور اسے عذاب دیں گے“۔(ادیان باطلہ: ص ۱۴۲)

رسالت ونبوت: نبی ورسول کے متعلق بھی زرتشت لکھا ہے:

پیغمبر اس لیے ہونا چاہیے کہ جس طرح لوگوں کی زندگی کے کاروبار میں ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے ،اس طرح لوگوں کو شریعت مرتب کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جنھیں سب لوگ مانیں، آپس میں ظلم نہ کریں اور کسی کو دھوکہ نہ دیں اور دنیا کا نظام درست رکھیں، اور پیغمبر خدا کی طرف سے ہونے چاہیے تا کہ عام لوگ انہیں قبول کریں“۔
(ادیان باطلہ: ص ۱۴۲)

تخلیق ارض وسما:

زرتشت لکھتا ہے کہ ”کائنات کی تخلیق چھ ادوار میں ہوئی خدا نے بالترتیب آسمان، زمین، پانی، نباتات، حیوانات اور سب سے آخر میں انسان کو پیدا کیا“۔

آدم وحوا:

زرتشت کا قول ہے کہ ”تمام نسل انسانی کو ایک ہی جوڑے سے پیدا کیا گیا ہے، جس کا نام ’مشیہ‘ اور مشیات تھا یعنی مذکر ومونث“۔(ادیان باطلہ: ۱۴۳)

تدفین:

لیکن زرتشت نے مردوں کو دفن نہ کرنے کی بات کہی ہے، اس کا کہنا ہے کہ انسانی میت ناپاک ہے، اس لیے پاک زمین میں مردے کو دفن کر کے اسے ناپاک نہیں کرنا چاہیے۔

انسان کو تب تو استنجا، پاخانہ اور دوسری ضروری چیزیں جو بظاہر گندگی پھیلائیں زمین پر یا اس کے اندر نہ کرنا چاہیے۔

زرتشت ازم میں توحید یا ثنویت

زرشت ازم کے بغور مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بانی مذہب دراصل ثنویت (خالق خیر و خالق شر) کا قائل نہ تھا۔ وہ حقیقت میں ایک ہی خدا کو مانتا تھا، اسی کو "اھورا ماز دا" کہتا تھا، یعنی بہت زیادہ جاننے والا۔ اور خیر کی راہوں میں رکاوٹ بننے والے کو "انگرومینو" کہتا تھا یعنی غصیلا اور ناراض۔ جس کو اسلام کی اصطلاح میں "شیطان" کہتے ہیں، لیکن بعد میں زرتشت ازم کے پرستاروں نے اس مذہب ہی کو ثنویت کا علم بردار قرار دیا، آگے چل کر اب زرتشت ازم میں دو خداؤں کا مستقل علی الاعلان اشتہار دیا جاتا ہے، توحید کی تعلیم کا سرے سے کچھ پتہ نہیں۔

مذہبی کتابیں:

زرتشت ازم میں کلیدی طور پر "توحید" کی تعلیم موجود تھی، لیکن زرتشت کی کتابوں میں، شرک، وثنیت، ثنویت، بت پرستی، آتش پرستی اور دیوی دیوتاؤں کا تذکرہ ایرانیوں اور ہندوؤں سے متاثر ہونے کی بنیاد پر ایک تحریف کی شکل میں ماننا چاہیے، کیوں کہ اصل حقیقت ان کی کتابوں میں توحید کی تعلیم تھی جو مفقود ہے، بہر حال زرتشت ازم کی کچھ کتابیں حوالہ قرطاس وقلم ہیں:

(۱) وسائر خورد (۲) وسائر کلوں (۳) اوستا خورد (۴) اوستا کلاں (۵) اوستا کو مذہبی حیثیت سے اونچا مقام حاصل ہے، اس کتاب میں ابتدائی اور بنیادی حیثیت سے پانچ باب ہیں۔

باب اول: یاستا: اس میں قربانی اور اس کی دعائیں مذکور ہیں۔

باب دوم: گاتھا: اس میں توحید کی تعلیم ہے، کہتے ہیں کہ یہ حصہ زرتشت کا اپنے ہاتھوں لکھا ہے، اسی لیے اس میں بت پرستی نہیں ہے۔

باب سوم: وسپرڈ: خدا کی حمد وثنا پر مشتمل ہے۔

باب چہارم: ونڈیداؤ: شیطان سے بچنے کی تدابیر۔

باب پنجم: الیشٹ: اس میں اکیس بھجن ہیں، اس میں ملائکہ اور قدیم ایرانی سورماؤں کا تذکرہ ہے۔

خلاصہ: توحید، رسالت، آخرت، ملائکہ، تدفین، مذکورہ بالا پانچ باتوں کی تعلیم زرتشت میں بھی پائی جاتی ہیں، اسلام میں بھی، لیکن زرتشت میں اس کی تعلیم میں کچھ ترق ہے، مثلاً تدفین کو زرتشت میں قبیح رسم تصور کیا جاتا ہے، جب کہ اسلام

میں مردے کی عزت افزائی کے لیے تدفین ضروری ہے۔

باہمی مناکحت: سگے بھائی بہنوں میں مناکحتِ باہمی کی بنیادی تعلیم زرتشت ازم کی خصوصی پہچان ہے، جس کو "رسم حنا" کہنا چاہیے، اسلام میں اس کی سختی سے ممانعت ہے۔

مانوی مذہب

"بانی" کا نام "مانی" ہے، تاریخ پیدائش ۲۱۶ھ میں "طسیفون" میں پیدا ہوا، اس کو نقاشی اور فلسفے سے دلچسپی تھی، اس کے والد کو عیسائیت سے تعلق نہ تھا، "مانی" نے مانوی مذہب کی بنیاد ۲۴۲ھ میں ۲۶/سال کی عمر میں رکھی، زرتشتی علما نے مخالفت کی، وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ ایران کا باشاہ "شاہ پور اول" جب مرگیا تو "مانی" اپنے وطن ایران میں واپس آکر نبوت کا دعوی کردیا، اور ایک کتاب لکھی جس کا نام "اژتنگ" رکھا اور اس کو خدا کی کتاب بتلایا، "شاہ پور دوم" کے بھائی فیروز سے تعلقات بڑھا کر حکومت تک پہونچا اور پھر بادشاہ کو اپنا حامی بنا کر ایران میں سرکاری طور پر "مانوی مذہب" پھیلایا۔

ادھر ایران میں زرتشتی علما مانوی مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے درپے تھے، جب "بہرام" نامی شخص ایران کا باشاہ ہوا تو اس کی مدد سے زرتشتی علما کے کہنے پر مانوی مذہب والوں پر بڑا ظلم کیا اور خود مانی کو قتل کردیا اور اتنا ہولناک سلوک کیا کہ "مانی" کی کھال کھینچ کر اس میں بھوسہ بھر دیا، یہ ہیبت ناک واقعہ ۲۷۶ھ میں پیش آیا۔

بنیادی تعلیمات: "مانی" یہ تسلیم کرتا تھا کہ اللہ تعالی نے انسانوں کو برائی سے بچانے کے لیے بہت سارے پیغمبر بھیجے ہیں، جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ، اسی میں زرتشت اور گوتم بدھ کو بھی شامل کرتا تھا لیکن حضرت موسیٰؑ کو شامل نہیں کرتا تھا، نہ ہی ان کا نام لیتا تھا، تعجب خیز بات یہ ہے کہ خود کو "خاتم الانبیا" کہتا تھا اور انجیل میں "فارقلیط" کے لفظ کا مصداق خود کو مانتا اور منواتا تھا، اور کہتا تھا کہ "میں آخری پیغمبر اور علم و حکمت لے کر آیا ہوں"

(ادیان باطلہ: ۱۵۴)

ثنویت اور تثلیث: زرتشت کے نظریۂ ثنویت اور عیسائیت کے تثلیث سے "مانوی مذہب" متاثر ضرور تھا لیکن اس کا اپنا خیال تھا کہ ابتدا میں دو چیزیں تھیں: ۱-نیک شئی، ۲-بری شئی۔

۱-نیک شئی کا نام "بدر عظمت" تھا اور (۲) بری شئی کا نام "خدائے ظلمت" اور "خدائے ظلمت" کے تحت ۱- دھواں، ۲-آگ، ۳-ہوا، ۴-گدلا پانی، ۵-اندھیرا سب شامل تھے۔

تثلیث متاثر ہو کر مانوی مذہب میں ۱-پدر عظمت، ۲-مادر زندگان اور ۳-اولین انسان شامل ہیں۔

اسلام مین توحید پر زور ہے، مانوی مذہب میں اس کی مخالفت پر زور۔

شنٹوازم

جاپان میں یہ مذہب رائج ہے، جاپان میں بدھ مت، تاویت اور کنفیوشس ازم بھی رائج تھے۔

''شنٹو''''شن''اور''تاؤ''سے مل کر بنا ہے، چینی زبان کا لفظ ہے معنی میں ''دیوتاؤں کا ڈھنگ''

''شنٹوازم''صرف جاپان تک محدود ہے، اس کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اس مذہب میں ''کثرت پرستی'' ہے کیوں کہ ان کے معبودوں کی تعداد ۸۰ / کروڑ ہے اور اب موجودہ کتابوں میں ۸۰۰ / کروڑ بتلائی گئی ہے۔

شنٹوازم میں کل ۱۳ / فرقے ہیں، بعض کے نزدیک پتھر عبادت کے مستحق ہیں بعض کے نزدیک سماجی کام عبادت ہے اور بعض کے نزدیک فاقہ کشی، ضبط نفس وغیرہ چیزیں اہم ہیں۔

تاؤمت

بانی کا نام ''لاوزے تاؤ'' ہے، اصلی نام ''لی پہ پانگ'' ہے، معنی ہیں ''بوڑھا فلسفی'' اس کی پیدائش ۶۱۰ / ق م کی ہے، کنفیوشس سے ۵۰ / سال پہلے۔ یہ چین کا مذہب ہے، یہ شخص چینی سرکاری دستاویزات کا محافظ تھا۔ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر بھاگ کر جا رہا تھا، سرحد پر لوگوں نے پہچان لیا اور کہا کہ جانے سے پہلے اپنی تعلیمات ہم کو دے کر جائیں تو اس نے ''تاؤ تے چنگ'' نامی کتاب دی۔ پھر چلا گیا اور کچھ پتہ نہیں کہ کہاں گیا، کب انتقال ہوا؟

اس کتاب میں ۸۱ / ابواب ہیں۔ پوری کتاب میں صرف ایک مرتبہ ''خدا'' کا لفظ ہے حیات بعد الممات کا کوئی ذکر نہیں۔

عقائد: (۱) ''تاؤ'' کا وجود ہمیشہ سے ہے۔ (۲) ''تاؤ'' ہر جگہ موجود ہے۔ (۳) ''تاؤ'' ہی دم سے کائنات ہے۔ (۴) چاند سورج اپنی اپنی جگہ پر ''تاؤ'' کی وجہ سے گردش کرتے ہیں۔ (۵) رازق ''تاؤ'' ہے۔

مقدس کتابیں: صرف ایک کتاب ''تاؤ کے جنگ'' ہے۔ جس کے معنی میں قدیم راستہ اور اس کی قوت، ۵ / ہزار الفاظ پر مشتمل ۸۱ / ابواب کے ساتھ شاعرانہ انداز کی یہ کتاب ہے۔

کیلٹی ازم

کیلٹی ازم میں ظاہر پرستی ہے، یہ لوگ دریا، سمندر اور جھیلوں میں خدا کا وجود مانتے ہیں، درختوں اور جانوروں کی پوجا کرتے ہیں، مرنے کے بعد مردوں کی روحوں کی واپس لوٹ آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اسی لیے مردوں سے بہت ڈرتے ہیں۔

اسی وجہ سے مردوں کو دفن کرتے وقت ان کی ساری چیزیں قبر میں اس کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں، تا کہ سامان کی لالچ میں کہیں مردے کی روح واپس آ کر ان کو نقصان نہ پہونچائے۔

اکثر عقائد ہندوؤں کے سے ہیں، لیکن مندر نہیں بناتے، گھر ہی میں عبادت کرتے ہیں، آوا گون کا عقیدہ رکھتے ہیں۔(ادیانِ باطلہ:۱۶۸)

ٹیوٹانی مذہب

ٹیوٹانی مذہب میں مظاہر پرستی، آسمان، سورج، چاند، زمین اور ستاروں وغیرہ کی پوجا کی جاتی ہے، یہ مذہب ''ناروے'' ''سویڈن'' ''ڈنمارک'' ''ہالینڈ'' ''انگلینڈ'' ''سوئزرلینڈ'' اور ''آئرلینڈ'' میں پایا جاتا تھا۔اب تقریباً اس کے ماننے والے نہیں پائے جاتے تیرھویں صدی میں اس مذہب کی کتابیں لکھی گئیں جن کا مصنف ''اسنوراسٹر'' تھا۔انہیں کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان بے تمام قبائل کے الگ الگ بت تھے، ایک کا نام ''تھور'' تھا جو بڑا دیوتا شمار ہوتا تھا، اس سے بڑا دیوتا ''ڈون'' تھا وہ ''جنگجو'' تھا۔اس کی بیوی کا نام ''ڈرگ'' تھا جو شادی کے فرائض انجام دیتی تھی۔

ٹیوٹانی مذہب کے عقائد ونظریات

(۱) مظاہر پرستی، ان کے عقائد اولین جز ہے۔
(۲) زمین، چاند، سورج، فلک اور ستارے ان کے دیوتا ہیں۔
(۳) بادشاہِ وقت بھی ایک دیوتا ہوتا ہے۔
(۴) تخلیق کائنات سے پہلے کچھ نہ تھا۔صرف خلا تھا۔
(۵) ان کا عبادت خانہ ''مندر'' کی طرح ہوتا ہے۔
(۶) مندر میں جانور کی قربانی کر کے، حاضرین پر اس کا خون چھڑکا جاتا ہے۔
(۷) قربانی کا گوشت مہمانوں کو کھلاتے تھے۔
(۸) مرنے کے بعد روح قبر میں رہتی ہے۔
(۹) جزا وسزا کا نظریہ نہیں رکھتے۔
(۱۰) بعض عیسائیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

باطل فرقوں کی ریشہ دوانیاں اور ہماری ذمے داریاں

الاخری ۱۴۴۰ھ افتخار احمد قاسمی بستوی
استاذ جامعہ اکل کوا

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جناتوں میں سے بہت سارے دشمن بنائے ہیں، جن میں سے بعض بعض کے ذہنوں میں چکنی چپڑی باتوں کے خیالات پیدا کرتے رہتے ہیں جس کا مقصدان کودھوکہ دینا ہوتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بتارہے ہیں کہ انسانوں اور جناتوں دونوں فریق میں غلط روش پر ڈالنے والے دشمن موجود ہیں، اوراس صحیح روش سے ہٹانا انہیں شیاطین اور جناتوں کا کام ہوتا ہے جن کو خدا کی توحید، نبی کی رسالت اور اعمال کی جزاوسزا بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اسی توحید ورسالت اور آخرت کی منظم تبلیغ کے لیے نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ جاری فرمایا اور سب سے آخیر میں ہمارے نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر توحید ورسالت اور آخرت کی دعوت کو تکمیل کے درجے تک پہونچا دیا اور قرآن میں اعلان کر دیا کہ

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے، اور ”اسلام“ کو تمہارے لیے پسندیدہ دین بنادیا ہے“۔(مائدہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تبلیغی مشن کی تگ و دو کو ۲۳/ سال پر محیط طویل عرصے تک جاری رکھا جس میں عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، معاذ بن جبلؓ، جیسے علما، فضلا اور معلمین پیدا ہوئے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ جیسے عظیم وجلیل خلفا اور بارامانت کو اٹھا کر بحسن وخوبی انجام تک لے کر چلنے والے صحابہ پیدا ہوئے، انہیں حضرات کا جم غفیر ابوزرعہ رازیؒ کی تحقیق کے مطابق ایک لاکھ ۱۴/ ہزار پاک نفوس کی تعداد میں چہاردانگ عالم میں پہونچا، کسی نے مدینہ کو مستقر بنایا تو کسی نے کوفہ کو، کسی نے ملک شام میں دولت علم وحکمت لٹائی تو کسی نے مصرودمشق میں۔

اسی طرح نبی کے سچے وارث صحابۂ کرام ہزاروں کی تعداد میں اپنے مقام وقیام کو بطیب خاطر خیرباد کہہ کر دشت وصحرا میں، جنگل وآبادی میں، بل کہ کہنا چاہیے کہ بحر وبر میں، پرچم توحید ورسالت کو لے کر نکلے اور تکمیل دین کی تشریح وتشہیر میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر خدا کی سیدھی راہ سے بھٹکی ہوئی سسکتی انسانیت کو صراط مستقیم دکھلائی۔

اسی ایمانی کوشش اور سعادت مند محنت میں توحید ورسالت کتنے ہی ”شیاطین الانس“ اور ”شیاطین الجن“ کو خراب لگی، تو انہوں نے خدا کی وحدانیت کو نظام عالم کے چلانے اور رہر ہر مخلوق کو زندہ وتابندہ رکھنے میں ناکافی سمجھا اور طرح طرح سے نفرت کا اظہار کرنے لگے طرح طرح کے خیالات واحساسات سے سماج کے افراد کو روشناس کرانے کی شیطانی ڈیوٹی سنبھالی، یہیں سے ایک راہ، راہِ مستقیم چھوٹی اور سیکڑوں راہیں، راہ ضلالت سامنے آئیں جس کو قرآن نے

کہاہے کہ

"مختلف راستوں پر نہ چلنا، ورنہ یہ مختلف راستے تم کو خدا کی ایک سیدھی راہ سے ہٹا دیں گے، اور دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے:

"اور جب خدائے واحد کا ذکر ہوتا ہے، تو آخرت (توحید و رسالت) پر ایمان نہ رکھنے والے کبیدہ خاطر ہوجاتے ہیں، اور جب ان کے معبودانِ باطل کا ذکر چھڑتا ہے، تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔(پ:۲۴)

انہیں انسانوں اور جناتوں کے گروہ نے توحید میں تبدیلیاں کیں، تو کسی نے توحید کو بالکل از سر نو تسلیم ہی کرنے سے انکار کردیا، اور تخلیق کائنات کی ذمہ داری انہوں نے زمانے کے حوالے کی، کسی نے توخدائے واحد کی تمام صفات اپنے ہی دوستوں انسانوں اور جناتوں میں ثابت کرنا شروع کیں، اسی طرح جب توحید باری تعالیٰ مخدوش ہوئی، تو گوناگوں باطل فرقوں نے جنم لیا، کسی نے تو انسان و جنات ہی کو خدا کہہ ڈالا، کسی نے پتھروں اور درختوں کو خدائی خوبیاں دے ڈالیں، اسی طرح ہزار طرح کی بت پرستی، صنم نوازی، شرک، بدعت وخرافات اور بدعقیدگی وجود پذیر ہوئی اور نئے نئے باطل فرقے جنم لیتے چلے گئے۔

رسالت میں خرد برد اور گھٹانا بڑھانا شروع ہوا، تو رسالت کی صفات کو عام انسانوں میں ثابت کرنے کی بدعت شروع ہوئی یا پھر رسول کو خدا کے ساتھ ملا کر ایک درجہ بھی خالق و مخلوق کے درمیان فرق و امتیاز کا باقی نہ چھوڑا، اسی طرح عشقِ انبیا میں حدود کو پھلانک کر نئے نئے فرقوں نے جنم لیا، اور عشقِ رسل سے انکار کرتے ہوئے بھی باطل فرقوں کی مینڈک کی طرح پیدائش اور پھر نشوونما ہوئی، اسی طرح "شیعیت" "قادیانیت" "بریلویت" "مودودیت" اور "غیر مقلدیت" نے انہیں مذکورہ بنیادوں کو چھوڑا اور نیا لباس پہن کر نئے زمانے کی نئی روشنی میں، نئی آب و تاب کے ساتھ

ع　　"نیا جال لایا پرانا شکاری" کی مثال پیش کی

قدیم فرقے جتنے بھی ہیں، سب کی خوبو، صفات اور امتیازی نشان جدید فرقوں میں رنگ و روغن اور ذائقہ و لباس بدل کر پایا جاتا ہے۔

بریلویت

ان جدید فرقوں میں بریلویت ہی کو لیجئے تو اس کے بانی "احمد رضا خاں صاحب بریلوی" اپنے "وصایا" ص ۱۱ ار پر میں لکھ گئے ہیں کہ "میرا دین دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا، ہر فرض سے اہم فرض ہے"۔(وصایا، ص ۱۱)

اس فرقے کو سمجھنے کے لیے اور توحید و رسالت اور آخرت کی بنیادی تعلیم سے انحراف کے لیے بانی مسلک و مذہب کی یہی وصیت کافی ہے، جو اپنے وصایا میں نہ تو اللہ کی وحدانیت، خالقیت، مالکیت، رازقیت، قیومیت اور اماتت

واحیا اور قدرت و علم اور رأفت و رحمت کو بتاتا ہے اور نہ اپنے ماننے والوں کو اس کی تاکید و تلقین کرتا ہے، نہ ہی رسالت مآب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے نازک مقام کی اجمالی یا تفصیلی توضیح کرکے لوگوں کو اس نازک مقام پر نزاکت و اخلاص سے قدم رکھنے کی تلقین کرتا ہے، نہ ہی آخرت سے متعلق سوال و جواب ہی کی کوئی بات عرض کرکے پیروانِ مسلک کو خوفِ خدا، یادِ آخرت، محاسبۂ عمل اور موت اور زیست کا مقصد بتاتا ہے، اس کو تو صرف یہ پڑی ہے کہ میں نے جو کچھ دین بنا کر پیش کیا ہے، اور وہ میری کتابوں سے ظاہر بھی ہے، وہ خواہ قرآن و سنت، اور اجماعِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی اجماعی روش سے کتنا ہی متضاد کیوں نہ ہو، بس اسی کو ماننا ہے، اور اس کی تعبیر بھی ایسی کہ تمام تر احتمالات یکسر ختم ہوجائیں، یعنی ان باتوں پر عمل کرنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ بانیٔ مذہب کی کیا نیت ہے، اور اس عبارت سے بانیٔ مذہب کی کیا مراد ہے، اگر اس کی اجتہادی غلطی ہے تو دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس اجتہادی غلطی پر ایک اجر دے، لیکن صراحت و وضاحت کے الفاظ تو چیخ چیخ کر یہی کہہ رہے ہیں کہ

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب

نیز عرفانِ شریعت نامی کتاب میں ۳۹ پر بانیٔ مسلک احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے اپنے زمانے کے خاص مد مقابل علمائے دیوبند کو (جنھیں پوری دنیا میں متقی، پارسا، بزرگ، مخلص، نیک کار، اور نہ جانے کیا کیا عمدہ القاب سے انہیں یاد کیا جاتا تھا) کن کن فتاویٰ کا نشانہ بنایا ہے چند ملاحظہ ہوں:

”اسے (دیوبندیوں سے) سلام کرنا حرام، اس کے پاس بیٹھنا حرام، اس کے ساتھ کھانا پینا حرام، اس کے ساتھ شادی بیاہ حرام، بیمار پڑے تو اسے پوچھنے جانا حرام، مرجائے تو اس کے جنازے میں شرکت، اسے مسلمانوں کا سا کفن دینا، اس پر نمازِ جنازہ پڑھنا حرام بل کہ کفر، اس کے لیے دعائے مغفرت حرام، بل کہ کفر“۔

(عرفان شریعت ص:۳۹)

انہوں نے جو فتاویٰ اپنی تیار کردہ امت کو اپنے خاص مد مقابل دیوبندں کے خلاف سنائے ہیں، وہ تو بہر حال مسلمان تھے، اور جن چیزوں کا الزام ان پر تھا وہ لوگ بڑی سختی اور بڑے ہی شدومد سے ان کی تردید کرتے تھے، پھر بھی اتنے ہوش ربا قسم کے فتاوے دینا، ان کو سماج کا ایک عضو معطل ہی نہیں ناپاک ترین حصہ بدن قرار دینا کسی طرح بھی بانی کے اخلاص کا غماز نہیں۔ اسی طرح کی تحریروں سے بریلویت کو سمجھنا نہایت آسان ہوجاتا ہے، اور بریلویت کے ارد گرد جتنے اعمالِ صالحہ کی چکی گھومتی ہے اس کا محور بھی طے ہی ہوجاتا ہے۔

بریلویت کو خیرباد کہنے والے:

چوں کہ بریلویت توحید و رسالت اور آخرت کے کلیدی عنوان سے یکسر ہٹی ہوئی ہے، یا جب اور جیسا موقع ہوتا ہے تو ہٹ ہی جاتی ہے۔ اس لیے بریلویت کے ماننے والے علما اور مفتیانِ کرام کو بریلویت کے سایے میں زندہ

رہنے سے شرح صدر نصیب نہیں ہوتا، کیا عوام؟ کیا خواص! کسی نہ کسی موقع پر ان الاخوین فی عصر انہا کے لوگوں سے دل کی بات زبان پر آتے بارہا سنا گیا ہے۔ عوام تو عوام خواص کی باتیں قابلِ ذکر ہوتی ہیں کہ لوگ ان کو اپنا مقتدا مانتے ہیں اور اگر وہ اپنی ہی کہی ہوئی بات سے منحرف نظر آتے ہیں تو اس کا اثر اور پیغام بڑا دوررس اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ بانی مذہب نے جن باتوں کو اپنی امت کے لیے حرام و ناجائز قرار دیا ہے ان کے بڑے اسی کے مرتکب نظر آتے ہیں۔

(۱) مفتی احمد یار خاں بدایونی ثم گجراتی کا نام تو بڑا اونچا اور بریلویت کے لیے قابلِ فخر ہے لیکن وہ بھی اپنی طے کردہ راہ سے ہٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، انہوں نے بڑی مشہور کتاب "جاء الحق" لکھی ہے، اور بریلویت کی بے جا طرفداری میں طرح طرح کی کمزور دلیلیں مضبوط بنا کے بریلویت کے شیش محل کو فولادی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اور خود ان کا یہ حال ہے کہ "مدینہ منورہ میں ایک مرتبہ قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند موجود تھے، مفتی احمد یار خاں گجراتی، قاری محمد طیبؒ سے باضابطہ ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر تشریف لائے"۔

آخر عرفانِ شریعت میں بانی مذہب احمد رضا خاں صاحب نے جو یہ لکھا تھا کہ دیوبندیوں سے سلام کرنا حرام ہے، ان کے پاس بیٹھنا بھی ممنوع ہے، تو مفتی احمد یار خاں گجراتی قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ملاقات کے لیے گئے تو آخر حرام وممنوع کا ارتکاب کیا یا نہیں، یا تو یہ فعل ان کے نزدیک قابلِ تعریف ہے، لیکن عوام میں اپنی جمعیت کی خاطر غلط مسائل بیان کیے جاتے ہیں، یا اصل مسئلہ حرمت دیوبندیت کا ہے، لیکن مفتی احمد یار کو پتہ نہیں، پھر اتنی بڑی بڑی کتابوں پر اعتماد کیسے رہے گا، جو مفتی صاحب کے ہاتھ کی تصنیف ہیں۔ قارئین اس کا فیصلہ خود فرمائیں۔

شیعیت

"شیعیت" گروہ، جماعت، مددگار اور حامی کے معنی استعمال ہوتا ہے، یہ لفظ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں "وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰھِیْمَ" (پ: ۲۳) استعمال ہوا ہے۔

موجودہ زمانے میں "شیعہ" اس گروہ کا نام ہے جو حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کا حامی ہو، اور شیخینؓ پر حضرت علیؓ کو فوقیت دیتا ہو، اور امامت کا انہیں کی ترتیب کے مطابق قائل ہو۔

مسند احمد اور مستدرک حاکم کی روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ایسے دو فرقوں کی خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشن گوئی فرمائی ہے جن کو حضرت علیؓ سے یا تو حد درجہ بغض ہوگا یا حد درجہ محبت ہوگی۔

شیعوں کی مشہور کتاب "نہج البلاغہ" ص: ۱/۲۶۱ میں حضرت علیؓ کا ارشاد بھی اسی کے ہم معنی موجود ہے۔

چناں چہ خوارج کا فرقہ حضرت علیؓ کی عداوت میں اس قدر آگے نکل گیا کہ حضرت علی کو نعوذ باللہ مخرب دین، واجب القتل اور کافر قرار دیا، اور عبدالرحمن بن ملجم، انہیں خوارج کا ایک شقی فرد آخرش یہ کام کر گذرا۔

اور شیعہ حضرت علیؓ سے اس قدر محبت رکھتے ہیں کہ "الٰہ" کا درجہ دے کر المختار فی کل الامور والشئون قرار دے کر ہر طرح کا اختیار، جنت و دوزخ میں داخلے کا اختیار، حتیٰ کہ اپنی موت وحیات کا بھی اختیار حضرت علیؓ کے حوالے کرتے ہیں، اس سلسلے میں عبد اللہ بن سبا کی شخصیت نے سارا رول ادا کیا ہے، جن کے بارے میں "الفرق بین الفرق" میں ص: ۲۳۳ پر البغدادی نے لکھا ہے کہ ابن سوداء حقیقت ایک یہودی تھا، اس کا مشن مسلمانوں کو گمراہ کرنا تھا، حضرت علیؓ کے متعلق وہ سب باتیں پھیلاتا تھا جو حضرت عیسیٰ کے بارے میں ملتی ہیں۔

شیعوں کے فرقے:

فرقۂ سبائیہ: یہ فرقہ عبد اللہ بن سبا کی طرف منسوب ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ عبد الرحمن بن ملجم نے حضرت علیؓ کو نہیں، بل کہ ایک شیطان کو قتل کیا، حضرت علیؓ کی شہادت کی خبر ۴۰ھ میں عبد اللہ بن سبا کو دی گئی تو اس نے کہا: حضرت علی کو کوئی شہید نہیں کرسکتا، ستر مرتبہ بھی حضرت علیؓ کا سر کاٹ کر میرے سامنے لایا جائے تو یقین نہیں کرسکتا کہ حضرت علیؓ شہید ہوئے ہیں، اس فرقے کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ ابر میں چھپے ہیں، رعد کی آواز یہ حضرت علیؓ کی ہی آواز ہے، اسی لیے جب رعد کی آواز یہ لوگ سنتے ہیں، تو "الصلاۃ والسلام علیک یا امیر المؤمنین!" پڑھتے ہیں۔

فرقۂ مفضلیہ: یہ فرقہ سبائیہ کی شاخ ہے فرقہ سبائیہ کی کچھ برائیاں دیکھ کر نیا فرقہ بنالیا۔

۳۔فرقۂ کاملیہ	۴۔فرقۂ بزیغیہ	۵۔فرقۂ مغیریہ	۶۔جناحیہ
۷۔منصوریہ	۸۔امامیہ	۹۔غمائیہ	۱۰۔ذمیہ، وغیرہ۔

شیعوں کی بنیادی کتابیں:

فقہ میں سب سے پہلی کتاب "فقہ الرضا" ہے۔

شیعوں کی اصول اربعہ: یہ چاروں کتابوں ہیں:

۱۔اصول کافی	۲۔تہذیب	۳۔الاستبصار	۴۔من لا یحضرہ الفقیہ

باجماع اثنا عشریہ شیعوں کے نزدیک تمام احادیث مذکورہ چاروں کتابوں میں ہیں، یہ اصح الکتب کہلاتی ہیں۔

ان چاروں میں بعض کے نزدیک "اصول کافی" اصح الکتب ہے۔

عقائد کے موضوع پر:

۱۔کتاب الیاقوت	۲۔بصائر الدرجات	۳۔کتاب الشافی للمرتضیٰ

۴۔تجرید العقائد للطوسی		۵۔نہج البلاغۃ للنجرانی

تفسیر میں:

۱۔تفسیر مجمع البیان للطبری		۲۔تفسیر البیان للطوسی ۳۔تفسیر العمان للآملی

اسماء الرجال میں:

۱۔کتاب عضایری	۲۔کتاب نجاسی	۳۔کتاب ابوجعفر طوسی	۴۔ایضاح	۵۔زبدۃ الاصول۔

اصول حدیث میں:

۱۔ہدایہ فی علم الدرایہ ۲۔تحفۃ القاصدین فی معرفۃ اصطلاح المحدثین۔

علمائے شیعہ:

(۱)سب سے بڑا عالم عبد اللہ بن سبا۔(۲) کیسان: اسی کی طرف فرقہ کیسانیہ منسوب ہے۔ (۳)ابوکریب۔(۴) عبداللہ بن حرب(۵) یحیٰ بن زید۔فرقہ زیدیہ اسی کی طرف منسوب ہے۔(۶) ناصر:اس کے نزدیک وضو میں پیر دھونا اور مسح کرنا دونوں ضروری ہے۔(۷) مبارک(۸) عبداللہ میمون۔(۹) محمد بن علی برقعی۔ (۱۰)ابوالحسن بن نعمان۔

علمائے حق کی کتابیں:

ردِ شیعت پر علمائے حق نے خوب کتابیں لکھی ہیں، چند کے نام یہ ہیں:

۱۔قرۃ العین فی تفضیل الشیخین۔شاہ ولی اللہ		۲۔السیف المسلول: قاضی ثناء اللہ پانی پتی

۳۔رسالہ رد روافض: مجدد الف ثانی		۴۔الشیعۃ فی المیزان: محمد یوسف نگرامی

۵۔اظہار الحق: مولانا عبدالشکور لکھنوی		۶۔ فیوض قاسمیہ: امام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ

۷۔تحذیر المسلمین: مولانا عبدالشکور لکھنوی		۸۔ انتباہ المؤمنین: امام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ قدس سرہ

۹۔ہدیۃ الشیعہ: قطب الارشاد مولانا رشید گنگوہیؒ	۱۰۔ہدایات الرشید: مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ

۱۱۔ارشاد الثقلین: مولانا حبیب الرحمان اعظمی محدث کبیرؒ

امامت سے متعلق عقائد:

شیعوں کے نزدیک ۱۲ ر امام ہیں:

۱۔حضرت علی	متوفی	۴۰ھ	۷۔موسیٰ کاظم	متوفی	۱۸۲ھ
۲۔حضرت حسن	//	۵۰ھ	۸۔علی رضا	//	۲۰۳ھ
۳۔حضرت حسین	//	۶۰ھ	۹۔محمد تقی	//	۲۲۸ھ
۴۔حضرت علی بن حسین	//	۹۵ھ	۱۰۔علی نقی ہادی	//	۲۵۴ھ
۵۔محمد باقر	//	۱۱۴ھ	۱۱۔ابو محمد حسن عسکری	//	۲۶۰ھ
۶۔جعفر صادق	//	۱۴۸ھ	۱۲۔المہدی الغائب محمد المنتظر :	پیدائش:	۲۵۵ھ
				غائب ہوئے:	۲۵۹ھ

اصول کافی ج ا رص ۱۶۱ پر ہے کہ ”اگر ایک لمحے کے لیے دنیا امام سے خالی ہوجائے تو زمین دھنس جائے، اور ساری کائنات فنا ہوجائے، یہ تمام ائمہ صاحب معجزہ تھے، ان کے پاس ملائکہ اسی طرح آتے تھے جس طرح انبیا علیہم السلام کے پاس آیا کرتے تھے، تمام ائمہ ”ماکان“ ”ومایکون“ کا علم رکھتے تھے، جو قرآن کریم کے ذریعہ نہیں بل کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ ان کو دوسرے ذرائع سے عطا کرتے۔ائمہ کو اختیار تھا کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں، جس کو چاہیں حرام کریں، ہر امام کو اپنی موت کا وقت بھی معلوم ہوتا ہے، موت بھی انہیں کے اختیار میں تھی۔(اصول کافی: ج ا / ص ۱۵۶-۱۶۱)

امام جعفر صادق کہتے ہیں:

”ہم ہی وہ لوگ ہیں جن کی فرمان برداری اللہ نے فرض کی ہے، ہماری معرفت کے بغیر لوگوں کو چارہ نہیں، ہماری پہچان نہ ہونے میں لوگوں کو معذور نہ سمجھا جائے گا۔

من عرفنا کان مؤمنا، ومن أنکرنا کان کافراً (اصول کافی: ا / ۱۸۷)

تقیہ کیا ہے:

تفسیر عسکری جو شیعوں کے نزدیک ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے اس میں حضرت علیؓ کی روایت ہے:

انہ قال: التقیۃ من أفضل أعمال المؤمنین یصونون بہا نفسہ وإخوانہ من الفاجرین:

تقیہ مومن کا افضل ترین عمل ہے، جس سے وہ خود کو اور اپنے بھائی بندوں کو فاسق و فاجر لوگوں سے بچاتا ہے۔

شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ خواجہ ابو طالب کا انتقال حالتِ ایمان میں ہوا ہے، اور وہ تقیہ کی برکت ہے کہ انہوں نے ایمان چھپایا اور کفر ظاہر کیا۔ اور تقیہ کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اصلی حالت کو چھپا کر دوسری حالت ظاہر کرنا تقیہ کہلاتا ہے۔

افضل ترین عمل:

شیعوں کے نزدیک مذکورہ بالا روایت کی روشنی میں ''تقیہ'' افضل ترین عمل الاخیری نمبر ۲ ہوتا ھے۔

ہر ضرورت کے لیے تقیہ:

''عن زرارۃ بن أعین عن أبي جعفر علیه السلام قال: التقیة في کل ضرورۃ و صاحبها أعلم بها حین تنزل بها''۔

زرارہ بن اعین نے امام جعفر صادقؒ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ تقیہ ہر ضرورت میں ہے، اور صاحب ضرورت ہی اپنی ضرورت سے واقف ہوتا ہے۔

تقیہ کا حاصل جھوٹ اور کذب بیانی اور دروغ گوئی ہے، دنیا میں کسی بھی مذہب وملت میں جھوٹ کو شرعی درجۂ جواز نہیں ہے، سوائے شیعہ مذہب کے، اس مذہب میں جھوٹ کو افضل ترین ثواب کا عمل قرار دیا گیا ہے۔ اللہم احفظنا منہ

شیعوں کا شرعی حکم:

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ رشیدیہ ۶۸ / پر لکھا ہے کہ رافضی کے کفر میں اختلاف ہے، بعض کافر کہتے ہیں اور بعض فاسق، پھر جو علما کافر کہتے ہیں، بعض نے ان کو اہلِ کتاب کا حکم دیا ہے، اور بعض نے مرتد کا (خلاصہ مع تشریح)

اختلاف کی تین وجوہ ہیں:

(۱) شیعوں کے بے شمار فرقے ہیں، ان کے عقائد بھی مختلف ہیں، اس لیے قطعی حکم لگانا مشکل ہے۔

(۲) شیعہ اپنے عقائد عموماً تقیہ کی بنیاد پر چھپاتے ہیں، بعض مرتبہ صریح عقیدے کا انکار کر جاتے ہیں، اس لیے ان کو پکڑنا ذرا مشکل ہے۔

(۳) کفر کا مسئلہ بڑا سنگین ہے، جب تک ایمان کا ادنیٰ احتمال بھی رہے، کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا، اس لیے علما نے غایت احتیاط کی بنا پر ان کو کافر کہنے میں احتیاط برتی ہے۔

اسی بنیاد پر فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں بالعموم شیعوں کے عقائد بیان کر دیے جاتے ہیں، ان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا۔

ہاں! عقیدہ کفر تک پہونچانے والا ہے تو اس عقیدہ کا رکھنے والا لا محالہ کافر ہو جاتا ہے، احتیاط کی بنا پر ان کو صراحتاً کافر کہا نہیں جاتا لیکن جب کفر کا عقیدہ رکھے گا، تو اسے کافر کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ امامت

اہل سنت والجماعت کے نزدیک مسلمانوں ہی میں سے اہل حل وعقد یہ طے کریں گے کہ کس کو امامت کا منصب دیا جائے، خدا پر امامت واجب نہیں ہے، نہ یہ بنیادی عقائد اسلامیہ میں سے ہے، بل کہ یہ ایک فرعی مسئلہ ہے،

اماموں کے بارے میں جو عقائد شیعہ نے بیان کیے وہ خود ان کی زندگی میں فٹ نہیں

اماموں کو اپنے مرنے کا اختیار رہتا ہے اور ان کو وقت بھی معلوم ہوتا ہے پھر بھی ان کے پانچ اماموں نے زہر کھا کر خودکشی کیوں کی:

۱۔امام حسن بن علی ۲۔امام باقر ۳۔جعفر صادق ۴۔امام تقی ۵۔امام نقی۔

ان لوگوں کا انتقال زہر خورانی سے ہوا۔

قرآن اور شیعہ:

ابن حزم ظاہریؒ نے لکھا ہے کہ قرآن میں تحریف کا عقیدہ رکھنا صریح کفر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ (الملل والنحل: ۴/۱۲۸)

"قال البغوی فی شرح السنۃ أن الصحابۃ جمع بین الدفتین القرآن الذی أنزل اللہ تعالی علی رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم من غیر زیادۃ و نقصان"۔(الشیعہ والسنۃ ص ۱۴۴)

قرآن کے متعلق شیعی عقیدہ:

"اصول کافی: ص ۱۳۹-۸۱" میں عبارت ہے کہ "عن جابر قال سمعت ابا جعفر یقول ما ادعی أحد من الناس أنہ جمع القرآن کلہ کما نزل کذاب، وما جمعہ وما حفظہ کما نزلہ اللہ تعالی إلا علی بن ابی طالب و الأئمۃ بعدہ"۔

حضرت جابر سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر سے سنا وہ فرماتے تھے کہ جو شخص یہ دعوی کرے کہ اس نے پورے قرآن کو جس طرح نازل ہوا تھا جمع کیا ہے وہ جھوٹا ہے، قرآن کو نزول کے مطابق حضرت علیؓ اور ۱۲/ائمہ کے علاوہ کسی نے نہ جمع کیا، نہ یاد کیا۔

شیعہ حضرات کے نزدیک امام مہدی ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۹ میں ۴/سال کی عمر میں اصلی قرآن جس میں ۱۸/ہزار آیات یا ۱۲/ہزار آیات تھیں انہیں لے کر "سُر مَن رای" کے غار میں چھپ گئے، اب صرف ۶/ہزار ۶/سو، چھیاسٹھ آیات قرآن میں ہیں۔ تو اس مرحلے میں شیعہ حضرات سے سوال ہے کہ اصلی قرآن ڈھائی سو سال کی طویل ترین مدت تک امام مہدی کے پاس رہا اور وہ اسے لے کر غائب بھی ہو گئے، تو اس طویل مدت میں اصلی قرآن کی نشر و اشاعت کیوں نہ کی گئی۔

موجودہ قرآن شیعوں کی نظر میں:

محسن فیض کاشانی (۱۰۹۱ھ) "صافی" نامی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ موجودہ قرآن کیسا ہے:

(۱) ہمارے سامنے موجودہ قرآن وہ نہیں ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ (۲) اس کا بعض حصہ نازل کردہ کے خلاف ہے۔ (۳) کچھ حصہ محرف ہے۔ (۴) حضرت علی کا نام قرآن سے نکال دیا گیا ہے۔ (۵)

خدا رسول کی پسندیدہ ترتیب پر موجودہ قرآن نہیں ہے۔

محسن صاحب کی تشریح سے موجودہ قرآن سے آدھایا آدھے سے زیادہ حصہ غائب اور محرف معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا موجودہ شیعہ حضرات میں سے جو بھی اس پر یقین رکھیں گے وہ یقیناً ''کافر'' ہیں۔

دوتہائی قرآن غائب:

اصول کافی (ص ۶۷۱) پر عبارت ہے:

''عن هشام بن سالم عن أبي عبد الله عليه السلام قال: أن القرآن الذي جاء به جبرئيل إلى محمد صلى الله عليه وسلم سبعة عشر الف آية''

''وہ قرآن جس کو جبرئیل محمد پر لے کر آئے تھے اس میں ۱۷ ہزار آیات تھیں''۔

یہ اصول کافی شیعوں کی اصح الکتب ہے، اس میں صرف سے ۲/۳ حصہ قرآن کا غائب بتلایا گیا ہے۔

غیر مقلدیت

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جدال ونزاع کی قطعی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے، جو حضرات اللہ کی آیات میں نزاع وجدال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی سخت تنقید فرمائی ہے ان کو اس حرکت شنیعہ سے بالکل ہی باز رکھنے کے لیے قرآن کریم میں مختلف اسلوب بیان سے اللہ تعالیٰ نے مجادل منازع کا رد کیا ہے۔

اللہ نے اپنے بندوں پر اپنی ذات گرامی سے مربوط رکھنے کے لیے نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ جاری فرمایا ،سب سے آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری دین لے کر بھیجا یہی آخری دین اللہ اور بندے کے درمیان مربوط رہنے کی آخری شکل ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے اپنے بندوں کی خاطر پسند فرمالیا ہے، اسی آخری دین پر عمل پیرا رہنے میں اخروی نجات اور دنیوی فلاح ہے۔ اسی فلاح ونجات سے روکنے کا سب سے خطرناک حملہ نفس وشیطان کا حملہ ہے، نفس وشیطان میں بھی نفس کا حملہ شیطان کے حملے سے بھی خطرناک ہے، کیوں کہ نفس ہی نے شیطان پر حملہ کر کے اس کو راندہ درگاہ ایزدی بنایا ہے۔ نفس پرستی کے حملے کو روکنے کا اور اس کی تمام مخالف ومضر ریشہ دوانیوں کے سدباب کا مجرب وواجب ذریعہ ''تقلید'' ہے، تقلید سے نفس پرستی کے کاری حملوں سے مکمل نجات رہتی ہے، اسی تقلید سے چھٹکارا حاصل کر کے آدمی جو بھی راستے سے نفس پرستی کے دلدل مین ایسا پھنس جاتا ہے کہ دین کو بھی نفس پرستی کے راستے سے عمل میں لاتا ہے۔ جو اس کا نفس کہتا ہے وہی دین ہوتا ہے، قرآن کی آیات اور احادیث کی تصریحات ہزار بار اعلان کریں کہ اللہ اور اس کے رسول کا فرمان یہ نہیں ہے، لیکن نفس پرستی اس کو اپنے انداز اللہ اور اس کے رسول کا فرمان قرار دے کر ہمیشہ کے لیے انسان کو جہنم کا مستحق بنا دیتی ہے۔ برصغیر ہند میں بارہ صدیوں سے اسلام آیا ہوا ہے، یہاں اسلام لانے والے، اسلام پھیلانے والے اور اسلام قبول کرنے والے سب کے سب مقلد، اہل سنت والجماعت حنفی تھے، یہاں کے تمام مفسرین، محدثین، فقہا، اتقیا، اولیائے کرام اور سلاطین عظام اہل سنت والجماعت حنفی تھے،

لیکن جب انگریز کے منحوس اورناپاک قدم آئے ،تووہ یورپ سے ذہنی آوارگی ، مادرپدرآزادی جو دینی بے راہ روی اور نفس پرستی کی سوغات لایا ،اورمذہبی آزادی اورمذہبی تحقیق کے خوش اوردل فریب عنوان سے اس ملک میں ایک خودسر، خودرائے اورمتعصب فرقے کوجنم دیا،اس فرقے کا پہلاقدم بقول محقق تھانویؒ "سلف سے بدگمانی" ہے،اوراس کی انتہا "سلف پر بدزبانی" ہے۔بس یوں سمجھنا چاہیے کہ اس فرقۂ غیرمقلدیت کا ہر شخص "اعجاب کل ذی رای برایہ" پر نازاں وفرحاں ہونے کے ساتھ ساتھ "لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا" کا مصداق ہے۔بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ اس فرقے کا ہرفرد اپنے آپ کوائمہ اربعہ بل کہ صحابہ سے بھی برتر سمجھتا ہے۔میاں نذیر حسین دہلوی کے خسر مولانا عبدالخالق صاحب "الحیاۃ بعد الممات: ص ۲۲۸" پر،اور "تنائج التقلید: ص ۳" پرفرماتے ہیں: "سوبانی مبانی اس فرقۂ نواحداث کا عبدالحق ہے، اورحضرت امیرالمؤمنین سید احمد شہیدؒ نے ایسی ہی حرکات ناشائستہ کی باعث اسے اپنی جماعت سے نکال دیا،اورعلمائے حرمین معظمین نے اس کے قتل کافتویٰ دیا،مگرکسی طرح بھاگ کروہاں سے بچ نکلا"۔
(تنبیہ الضالین: ۱۳)

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا گستاخ،مولوی عبدالحق بناری (بانی غیرمقلدیت) نے برملا کہا کہ حضرت عائشہؓ علیؓ سے لڑی، اگرتوبہ نہ کی تومرتد مری،اوریہ بھی دوسری مجلس میں کہا کہ صحابہ کاعلم ہم سے کم تھا،ان میں سے ایک کوپانچ پانچ حدیثیں یادتھی،اورہم کوان سب کی حدیثیں یادہیں۔
(کشف الحجاب: ۲۲ قاری عبدالرحمن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ شاگردشاہ اسحاقؒ)

یہ باتیں اس کی گواہی ہیں کہ یہ فرقۂ غیرمقلدیت نہ تواپنے ذہن ودماغ کولگام دینے پرقادر ہے، نہ ہی اپنی زبان کوقابومیں رکھتا ہے، جب اس کاذہن ودماغ چلتا ہے،توکسی کے ساتھ بدگمانی کامرتکب ہوجاتا ہےاورزبان چلتی ہے توصحابہ وتابعین اورسلف عظام کی گستاخیاں کرتے بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب اہل حدیث فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں ایک ریاکاراورشہرت پسند فرقے نے جنم لیا ہے، جوہرقسم کی خامیوں اورنقائص کے باوجود اپنے لیے قرآن وحدیث کے علم اوران پرعامل ہونے کے دعوے دار ہیں، حالاں کہ علم وعرفان سے اس فرقے کو دورکا بھی واسطہ نہیں،یہ لوگ علوم آلیہ وعالیہ دونوں سے جاہل ہیں"۔(الحطہ: ۱۵۳)

اوریہ لوگ معاملات کے مسائل میں حدیث کی سمجھ اوربوجھ سے بالکل عاری ہیں،اوراہل سنت کے طریق پر ایک مسئلہ بھی استنباط نہیں کرسکتے۔

یہ لوگ حدیث پرعمل کرنے کی بجائے زبانی جمع خرچ پراورسنت کی اتباع کی جگہ شیطانی تسویلات پر اکتفاکرتے ہیں،اوراس کوعین دین تصورکرتے ہیں،یہ لوگ اسلام کی حلاوت،مٹھاس اورشیرینی سے خالی الذہن ہیں، اورمسلمانوں کی نسبت بڑے سنگ دل ہیں۔"یقولون عن خیر البریۃ وھم شر البریۃ"۔

پھرخداکی قسم! کتنے تعجب کی بات ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کوخالص موحد کہتے ہیں،اوردوسرے مسلمانوں کو

بدعتی اور مشرک کہتے ہیں، حالاں کہ یہ لوگ سب سے زیادہ غالی، اور دین کے بارے میں متعصب ہیں۔

"فماھذادین، إن ھذا إلا فتنۃ في الأرض و فساد کبیر"۔۔۔۔۔۔۔

نواب صدیق حسن خان صاحب نے اس فرقے کے تقدس کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس زاہد کی مثال دی ہے جو اپنی مکاری اور عیاری سے خوب وعظ کرتا کہ سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال سے ڈراتا، قبر و حشر کے ہولناک مناظر بیان کرتا، مگر موقع ملتے ہی سونے چاندی کے سب برتن چوری کر کے رفو چکر ہوجاتا ہے۔(الحطۃ: ۱۵۱ تا ۱۵۶)

آپ نے سنا، یہ غیر مقلدین کے ہی ایک اہم ترین عالم کا اپنے گھر کے واقعی احوال کا تذکرہ تھا، واقعی نواب صاحب کا کلام "کلام الملوک ملوک الکلام" کا مصداق ہے، انہوں نے غیر مقلدین کے فرقے کو "نوزائیدہ فرقہ" کہا، یعنی یہ حدیثِ تفرقہ کا مصداق ہے۔(زجاجہ)

"ضلّو فاضلّو" کا مصداق ہے، اس لیے کہ نواب صاحب نے "علوم آلیہ وعالیہ" سے اس فرقے کو "جاہل" کہا، جو حق ہے۔

"فقیہ واحد أشد علی الشیطان من ألف عابد"۔(زجاجہ)

اور "شیطان ہی پہلا غیر مقلد ہے"

اور جس گلی میں حضرت فاروق اعظمؓ قدم رکھیں، وہاں سے بھاگتا ہے، بیس رکعت تراویح، طلاق ثلاثہ، فقہ سے انکار حضرت عمرؓ ہی کی مخالفت ہے۔(رسالہ فرقہ غیر مقلدین)

"الارشاد الی سبیل الرشاد: ص ۱۳" پر غیر مقلدین کے مشہور محدث مولانا محمد شاہ جہاں پوری تحریر فرماتے ہیں:

"کچھ عرصے سے ہندوستان میں ایک ایسے غیر مانوس مذہب کے لوگ دیکھنے میں آرہے ہیں، جس سے لوگ بالکل ناآشنا ہیں، پچھلے زمانے میں شاذ و نادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں، مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے، بل کہ ان کا نام ابھی تھوڑے ہی دنوں سے سنا ہے، اپنے آپ کو وہ "اہلِ حدیث" یا "محمدی" یا "موحد" کہتے ہیں، مگر مخالف فریق میں ان کا نام "غیر مقلد" یا "وہابی" یا "لامذہب" لیا جاتا ہے، کیوں کہ نماز میں یہ لوگ "رفع الیدین" کرتے ہیں، یعنی رکوع جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت ہاتھ اٹھاتے ہیں، جیسا کہ تحریمہ باندھتے وقت ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، بنگالہ کے عوام ان لوگوں کو "رفع الیدینی" کہتے ہیں"۔(الارشاد الی سبیل الرشاد: ۱۳)

غیر مقلدین کے مسائل:

(۱) کافر کتابی کا ذبح کیا ہوا جانور بھی حلال ہے۔(عرف الجادی: ۱۰، ص ۲۳۹، دلیل الطالب: ۴۱۳)

(۲) غیر مقلدین کے نزدیک جانور کے ذبح کرتے وقت بسم اللہ نہیں پڑھیں تو کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے اس کا کھانا جائز ہے۔(عرف الجادی: ۲۳۹)

(۳) غیر مقلدین کے نزدیک "خار پشت" یعنی "ساہی" کھانا حلال ہے، اس کی حدیث ان کے نزدیک ضعیف ہے۔ (لیکن حلال ہونے کے لیے صریح حدیث لائیں)۔ (بدور الاہلۃ: ص ۳۵۱)

(۴) جو جانور بندوق سے مر جائے، اس کا کھانا جائز اور حلال ہے۔ (بدور الاہلۃ: ۳۳۵)

(۵) گھوڑا حلال ہے۔ (عرف الجاوی: ۲۳۶)

(۶) گھوڑے کی قربانی کرنا بھی ثابت ہے، بل کہ ضروری ہے۔ (فتاوی ستاریہ: ۱/ ۱۴۷)

(۷) ماکول اللحم کا بول و براز پاک ہے، جس کپڑے پر لگا ہو اس سے نماز پڑھنی درست ہے۔ (فتاوی ستاریہ: ۱/ ۵۶)

(۸) کچھوا، کوکر، اور گھونگھا حلال ہے۔ (فتاوی ثنائیہ: ۲/ ۷۰)

(۹) مرد کو دودھ پلانا عورت کے لیے جائز ہے، تا کہ ایک دوسرے کو دیکھنا جائز ہو جائے۔ (نزل الابرار: ۲/ ۷۷)

(۱۰) کتے کا پیشاب اور پائخانہ بھی (غیر مقلدین کے نزدیک) پاک ہے۔ (نزل الابرار: ۱/ ۵۰)

(۱۱) ہر حلال اور حرام جانور کا پیشاب پاک ہے۔ (نزل: ۱/ ۷۹ تا ۸۸)

(۱۲) کتے کے کھال کا ڈول بنانا جائز ہے۔ (نزل: ج ۱/ ص ۷۹ تا ۸۸)

(۱۳) کتے کی کھال کا جائے نماز بنانا جائز ہے۔ (۱/ ۷۹ تا ۸۸)

(۱۴) جوتے پہن کر نماز پڑھنا سنت ہے۔ (۱/ ۶۸)

(۱۵) اذان اور خطبہ عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں جائز ہے۔

(۱۶) اس طرح نماز میں قرآن پڑھنا جائز ہے:

"ا، ل، ح، د، ل، ہ، ر، ب، ا، ل، ع، ا، ل، م، ی، ن"

(۱۶) کھانا حاضر ہو، تو کھانے کھانے سے پہلے نماز پڑھی وہ نماز (غیر مقلدین کے نزدیک) نہیں ہوتی۔ (۱۵۶، ۱۰۷/ ۱/ ص ۵۵)

یہ مذکورہ بالا مسائل اکثر و بیشتر اس کتاب کے ہیں جس کو ایک غیر مقلد عالم نے "درمختار" کے مقابل میں لکھی ہے جس کا نام "نزل الابرار من فقہ النبی المختار" ہے۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فقہ سے نیک لوگوں کے لیے سامانِ ضیافت۔ آپ اندازہ لگائیں کہ کیا اسی طرح کے مسائل نیک لوگوں کے لیے سامان غذا و ضیافت بنیں گے۔

اس کے برعکس "درمختار" نامی کتاب کے تقدس کا یہ عالم ہے کہ یہ فقہ حنفی کی ایسی کتاب ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منامی اجازت سے لکھی گئی ہے، حدیث شریف میں ہے کہ "من رآنی فقد رای الحق"۔

مؤلفِ کتاب کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں ملے، اپنی زبانِ مبارک جو "وما ینطق عن الھوی،

اِنْ ھو اِلاّ وحیٌ یُوحیٰ " کی ترجمان تھی، چونے کا حکم فرمایا۔ اور مؤلف نے یہ کتاب اواخر ذی قعدہ ۱۲۵۲ھ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ پاک کے پاس بیٹھ کر تالیف فرمائی، یہی وہ مقام ہے جو" رَوْضَۃٌ مِّن رِیاضِ الجنۃ" وہی رشکِ عرش ٹکڑا اس کتاب "درمختار" کی تالیف گاہ ہے۔

اس کتاب کے مسائل کو چھوڑ کر غیر مقلدین نے الگ سے مسائل کی کتاب تیار کی، اس لیے کہ ان کے پاس عمل کرنے کے لیے کوئی کتاب تھی نہیں، تو جب تیار کی تو اس کی یہ حالت ہے کہ ایسے ایسے مسائل بیان کیے جن کا تعلق حدیث سے کجا حدیث اس کے خلاف کو ثابت کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ غیر مقلدین کو سمجھ عطا فرمائے۔

غیر مقلدین سے کچھ سوالات

(۱) کیا قرآن کریم میں نماز پڑھنے کا مکمل طریقہ بالترتیب والتفصیل موجود ہے۔

(۲) کیا صحیح بخاری شریف میں نماز پڑھنے کا مکمل طریقہ موجود ہے۔

(۳) کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زیر نگرانی کوئی ایسی کتاب مرتب کروائی جس میں نماز کا مکمل طریقہ بالتفصیل والترتیب درج ہو، اور وہ کتاب آج تک امت میں متداول ہو؟

(۴) نماز کی کتنی اور کون سی شرائط قرآن و حدیث میں کتنی مذکور ہیں۔

(۵) آپ یہ بیان کریں کہ نماز کے ارکان کون کون سے ہیں؟ رکن کی تعریف کریں؟!۔
(یہ سب صحیح صریح غیر مرجوح حدیث سے کریں)

(۶) سنتِ مؤکدہ کی تعریف، واجب اور فرض کی تعریف حدیث صریح صحیح غیر مرجوح سے کریں۔

(۷) کیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا سے منع کرتے تھے۔

(۸) خون پاک ہے یا ناپاک؟ حدیث سے صراحت دکھائیں۔

(۹) خنزیر کا جھوٹا یا خنزیر پاک ہے یا ناپاک؟ صریح حدیث دکھائیں۔

(۱۰) قربانی فرض ہے، یا واجب، سنت یا نفل؟ صریح حکم قرآن و حدیث سے دکھائیں۔

(۱۱) مرغی، بطخ، چڑیا، کچھوے کے انڈے کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ صریح حدیث پیش کریں۔

(۱۲) بجو، مرغ، مچھلی، گوہ، مینڈک کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ صریح حدیث سے جواب دیں۔

(۱۳) اہلِ حدیث نے حنفی کے پیچھے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھ لی، پھر قربانی کی، تو یہ قربانی جائز ہے یا نہیں؟

(۱۴) ذبح میں کتنی رگیں کا ٹنا شرط ہے؟ ان کی تعداد اور نام صحیح حدیث سے بتلائیں۔

(۱۵) قربانی کا گوشت کسی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، بریلوی کو دینا جائز ہے یا نہیں؟
صریح حدیث سے جواب دیں۔

(۱۶) قربانی کا گوشت تول کر تقسیم کرنا چاہیے یا اندازے سے؟ حدیث سے جواب دیں۔

(۱۷) رات کو قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب میں حدیث صحیح لائیں۔

(۱۸) قربانی کے ایام بیت گئے قربانی نہیں کرسکا، اب حدیث میں تلافی کی کیا صورت ہے؟

(۱۹) ایک آدمی بیس نصابوں کا مالک ہے، وہ ایک قربانی کرے یا بیس؟

(۲۰) قربانی کا جانور کوئی کافر بغیر بسم اللہ کے ذبح کرے تو قربانی جائز ہے یا نہیں؟ حدیث صحیح صریح سے جواب دیں۔

ترک تقلید کے مفاسد

(۱) مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کی پابندی نہ کرنے اور غیر مقلد ہوجانے میں سراسر فتنہ، فساد، شرارت، خباثت اختلاف وافتراق اور انتشار وفساد ہے۔

چناں چہ "فیصلہ مکہ" ص ا" پر درج ہے کہ "سب سے زیادہ نقصان جماعت کو یہ پہونچا کہ عام طور پر مذہبی پابندی، مذہبی گرفت، اور مذہبی اقتدار جو مسلمانوں کے دلوں سے کم ہورہا تھا، اس اختلاف "حزبندی" اور پارٹی بازی کی وجہ سے اہل حدیث اس میں مبتلا ہوگئے۔ دینی حمیت وغیرت، عقائد کی پختگی اور مضبوطی جو جماعت کا طرۂ امتیاز تھا آہستہ آہستہ آپس کے مقابلے کی وجہ سے رخصت ہونے لگی"۔

اب غیر مقلدین کے آپسی اختلاف کی یہ حالت ہے کہ کوئی "غزنوی" ہے تو کوئی "روپڑی"، کوئی "لکھوی" ہے تو کوئی "ثنائی" کوئی "ستاری" ہے، تو کوئی "غفاری"۔ پھر ہر فرقہ دوسرے فرقے کی تفسیق، تحمیق، تجہیل وتکفیر کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

(۲) ترک تقلید کا یہ بھی نقصان ہے کہ، کفر، ارتداد، الحاد وزندقہ، اور فسق وفجور بڑی تیزی سے اسی جماعت میں راہ پاجاتے ہیں۔

مولانا محمد حسین بٹالوی "رسالہ اشاعۃ السنۃ" میں لکھتے ہیں کہ "۲۵/ برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ (اے کاش! اس سے قبل معلوم ہوجاتی تا کہ اس کے روح فرسا نتائج سے امت مسلمہ محفوظ رہتی) کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق (ہونے کا دعوی کرتے ہیں) اور مطلق تقلید کے تارک بنتے ہیں، وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، ان میں بعض عیسائی ہوجاتے ہیں، اور بعض لامذہب (نیچری، چکڑالوی، مرزائی وغیرہ) جو کسی دین ومذہب کے پابند نہیں رہتے، اور احکام شریعت سے فسق وخروج تو اس آزادی کا ادنیٰ نتیجہ ہے، ان فاسقوں میں تو بعض کھلم کھلا جماعت، نماز، روزہ چھوڑ دیتے ہیں سود وشراب سے پرہیز نہیں کرتے، اور بعض جو کسی مصلحت دنیاوی سے فسق ظاہری سے بچتے ہیں وہ فسق مخفی میں سرگرم رہتے ہیں، ناجائز طور پر عورتوں کو نکاح میں پھنسا لیتے ہیں، ناجائز حیلوں سے لوگوں کے اور خدا کے مال وحقوق کو دبا لیتے ہیں، کفر وارتداد کے اسباب دنیا میں بہ کثرت موجود ہیں، مگر دین داروں کے بے

دین ہوجانے کے لیے ''بے علمی کے ساتھ ترک تقلید'' بڑا بھاری سبب ہے''۔ (اشاعۃ الاخیری ۱۱/۵۳/۱۴۲ھ)

یہ تھا بیان اہلِ حدیث کے وکیل اعظم مولانا محمد حسین بٹالوی کا، جو صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ترک تقلید سے آدمی مرتد بھی ہوجاتا ہے اور کفر و جہنم تک پہونچنا اس کے لیے نہایت آسان ہوجاتا ہے۔

پھر بھی ہمارے کتنے بھولے بھالے بھائی ہیں جو ترک تقلید کی بیماری میں پھنسے ہیں، امام ابو حنیفہؒ کو بُرا بھلا کہنا، ان کا شیوہ ہے، اور آسانی سے سمجھانے سے باز نہیں آتے، بحث کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت ان کی بات کسی طرح بھی درست نہیں ہوتی، آدمی لاحاصل بحث اور کٹھ حجتی سے گریز کر کے بات ختم کرتا ہے۔

(۳) جب آدمی کسی کی تقلید نہیں کرتا، تو اپنے نفس کی تقلید کرتا ہے پھر انتہائی دریدہ دہن، گستاخ اور بے ادب ہوجاتا ہے، صحابۂ کرام، تابعین، ائمہ اسلام کی توہین و تنقیص اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے، ان کے لیے ناشائستہ کلمات کا استعمال اس کا شیوہ ہوجاتا ہے، وہ اجتہاد کے زعم فاسد اور ظن کاسد میں بری طرح مبتلا ہوکر غرور، تکبر اور انانیت کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ خود بینی اور مطلق العنانی کی وجہ سے وہ سلف صالحین پر تنقید اور نکتہ چینی کرنے میں بڑا دلیر اور بے باک ہوجاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کی بدعتی اور ائمہ عظام کو اندھے امام لکھتا ہے (رسالہ رفع یدین ص/۱۴۰، پروفیسر عبداللہ بھاول پوری) حضرت عمرؓ کو ۲۰ رکعت تراویح کے بارے میں بدعتی بتلایا ہے، حضرت عثمانؓ کو دوبارہ ''اذانِ ثانی'' مبتدع قرار دیتا ہے۔ طلاقوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کو خطا کار ٹھہراتا ہے۔

اسی کو نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ ''تقلید کے رد و قدح میں حضرات ائمہ عظام تک طعن و تشنیع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، یہ ایک بدبختی اور صریح گمراہی ہے'' اگر کوئی کسی امام یا عالم پر بالتعیین طعن و قدح کرتا ہے تو وہ مغتاب ہے اور غیبت زنا سے بھی بدتر ہے''۔ (مآثر صدیقی: ۴/۲۲)

اختلافی مسائل:

غیر مقلدین ہمیشہ سے وہی مسائل چھیڑتے آئے ہیں، جو شاذ یا اختلافی ہیں، بقیہ دین کے بے شمار اجماعی مسائل ہیں جن سے ان کو کوئی سروکار نہیں، نہ ان کے متعلق احادیث سے بحث کرتے ہیں، نہ ان کو اجماعی مسائل سے متعلق احادیث یاد رہتی ہیں۔

چند اختلافی مسائل حسب ذیل ہیں:

(۱) مسئلۂ قرأت خلف الامام	(۲) طلاق ثلثہ
(۳) رفعِ یدین	(۴) ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا، یا سینے پر
(۵) کندھوں تک ہاتھ اٹھانا	(۶) نماز جنازہ
(۷) ایک ہاتھ سے مصافحہ	(۸) ۸ رکعت یا ۲۰ رکعت تراویح

(۹) آمین بالسر یا بالجہر　　(۱۰) تقلید کی شرعی حیثیت
(۱۱) فرض نماز کے بعد دعا　　(۱۲) ٹوپی لگا کر نماز پڑھنا
(۱۳) ایصالِ ثواب　　(۱۴) قربانی کے ایام
(۱۵) حج وعمرہ دوسروں کی طرف سے کرنا　　(۱۶) طواف دوسروں کی طرف سے کرنا
(۱۷) شعبان کی پندرھویں شب میں عبادت　　(۱۸) ۱۵ رویں شعبان کو قبرستان جانا
(۱۹) وتر کی ایک رکعت پڑھنا　　(۲۰) مغرب کے فرض سے پہلے ۲ رکعت پڑھنا
(۲۱) مسجد میں عورتوں کا جانا　　(۲۲) عیدین میں خواتین کی حاضری
(۲۳) عورتوں کی جماعت　　(۲۴) عورتوں کی امامت
(۲۵) خطبۂ جمعہ اردو زبان میں　　(۲۶) گاؤں میں جمعہ
(۲۷) امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تقلید　　(۲۸) صف میں دونوں ٹانگوں کا پھیلانا
(۲۹) صحابہ کو معیار نہ ماننا

قادیانیت کا اصلی چہرہ

قادیانیت: یہ لفظ ''قادیان'' کی طرف منسوب ہے، قادیان میں مرزا غلام احمد قادیانی ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا تھا، اس نے جھوٹی نبوت کا دعوی کیا اور ایک جماعت تیار کی، اسی کفر قہ قادیانیت کہا جاتا ہے۔

مرزا احمد قادیانی: مرزا قادیانی خود لکھتا ہے کہ ''میرا نام غلام احمد، میرے والد کا نام غلام مرتضی اور دادا کا نام عطا محمد اور میرے پردادا کا نام گل محمد تھا۔ ہماری قوم ''مغل برلاس'' ہے، وہ اس ملک میں سمرقند سے آتے تھے''۔
(کتاب البریہ ۳/۱۶۴)

تعلیم: ''بچپن کے زمانے میں میری تعلیم اس طرح پر ہوئی کہ جب میں چھ سات سال کا ہوا تو ایک فارسی خواں معلم میرے لیے نوکر رکھا گیا جنھوں نے قرآن شریف اور چند فارسی کی کتابیں پڑھائیں میں نے صرف کی بعض کتابیں اور کچھ قواعد نحو کے مولوی فضل احمد سے پڑھے، گل علی شاہ سے نحو، منطق اور حکمت وغیرہ علوم مروجہ پڑھا۔
(کتاب البریۃ: ۱۳/ ۱۷۹)

اساتذہ: (۱) فضل الٰہی حنفی (۲) فضل احمد اہل حدیث (۳) سید گل علی شاہ (شیعہ) (سیرۃ المہدی ص/ ۲۲۳/۱)

بیماری: مرزا غلام احمد کو مندرجہ ذیل بیماریاں تھیں:
(۱) تشنج اعصاب　　(۲) جسمانی قوی کا اضمحلال
(۳) دوران سر　　(۴) شدید درد سر

(۵) حالت مردی کالمعدوم　(۶) دق
(۷) سل　(۸) دماغی بیہوشی
(۹) غشی　(۱۰) مراق
(۱۱) ہسٹریا　(۱۲) ایک دن میں سوسو بار پیشاب
(۱۳) شوگر　(۱۴) کثرت اسہال
(۱۵) مسلوب القوی　(۱۶) دل و دماغ کی سخت کمزوری (آئینہ احمدیہ)

بیویاں: مرزا کی صرف دو شادی ہوئی:

(۱) چودہ سال کی عمر میں ماموں کی بیٹی "حرمت بی بی" سے۔

(۲) نصرت جہاں بیگم، شادی کی تاریخ ۱۸۸۴ء۔

"محمدی بیگم" سے شادی کرنے کا ارادہ تھا لیکن ہزار کوشش کے باوجود اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہوا شادی نہ ہوئی۔

اولاد: (۱) پہلی بیوی سے مرزا سلطان احمد (۲) مرزا فضل احمد پیدا ہوئے۔

دونوں بیٹے مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ سلطان احمد کو مرزا نے عاق کر دیا تھا اور فضل احمد کا جنازہ بھی نہیں پڑھا۔

موت: ہیضے کی موت کو قادیانی عبرت ناک موت تصور کرتے ہیں، اور مرزا غلام احمد قادیانی ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو دس بجے دن میں ہیضے کی عبرت ناک موت مرا۔

زندگی کے تین مرحلے: مرزا غلام احمد قادیانی کی حیات کے تین مرحلے سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ پروفیسر الیاس برنی لکھتے ہیں:

مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے علمی و مذہبی زندگی کے تین دور نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا دور: وہ امت محمدی کی مبلغ کی حیثیت سے ۱۸۸۰ء سے شروع کرتے ہیں۔ پھر دس سال بعد ۱۸۹۱ء میں وہ مسیح موعود ہونے کا باضابطہ اعلان کرتے ہیں، یہاں سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔

دس سال بعد ۱۹۰۱ء میں باقاعدہ نبی کے مرتبے کو پہونچ جاتے ہیں یہاں سے تیسرا دور شروع ہوتا ہے، جو آٹھ سال تک نبوت کے آخری مقام پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

خلفائے مرزا: (۱) مولوی حکیم نورالدین (۲) بشیرالدین محمود (۳) مرزا ناصر احمد (۴) مرزا طاہر۔

عقائد مرزا:

(۱)مرزا قادیانی آخری نبی ہے۔
(۲)حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بعثتیں ہیں۔
(۳)مرزا قادیانی بعینہ محمد رسول اللہ ہے۔
(۴)مرزا قادیانی کی تعلیمات مدار نجات ہے۔
(۵)قادیانی کے الہامات قرآن کی طرح قطعی ہیں۔
(۶)قادیان کا سالانہ جلسہ ظلی حج ہے۔
(۷)مرزا پر ایمان نہ لانے والا کافر اور جہنمی ہے۔
(۸)حضرت عیسیٰ کی حیات کا عقیدہ شرک ہے۔
(۹)مرزا ہی مسیح ہے۔
(۱۰)جہاد منسوخ ہو گیا ہے۔
(۱۱)قادیان کا ذکر قرآن میں ہے۔
(۱۲)مسجد اقصیٰ قادیان میں ہے۔
(۱۳)قادیانی کو ماننے بغیر دین اسلام لعنتی وشیطانی مذہب ہے۔

مصادر و مراجع:

علامات قیامت اور نزول مسیح (علامہ کشمیری)
ختم نبوت کامل (مفتی شفیع صاحب)
قادیانیت (مولانا علی میاں ندوی)
ثبوت حاضر ہے (متین خالد)
عقیدۂ ختم نبوت (مولانا یوسف لدھیانوی)
ردمرزائیت کے زریں اصول (منظور احمد چنیوٹی)
قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ (پروفیسر الیاس برنی)
قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ (مولانا منظور نعمانی)
قادیانیت-تحلیل وتجزیہ (مولانا علی میاں ندوی)
اسلام اور قادیانیت کا تقابلی مطالعہ (عبدالغنی پٹیالوی)
عقیدۃ الامۃ فی معنی ختم النبوۃ (علامہ خالد محمود)
مسئلہ ختم نبوت اور قادیانی وسوسے (سعید احمد پالنپوری)
روداد مقدمہ مرزائیہ بھاولپور (محمد اکبر خاں)
محاضرۂ علمیہ بر موضوع رد قادیانیت (قاری عثمان صاحب)
اسلام اور مرزائیت کے اصول اختلاف (علامہ ادریس کاندھلوی)

مودودیت

''مودودیت'' یا ''جماعت اسلامی'' سید ابو الاعلیٰ مودودی کی قائم کردہ وہ جماعت ہے، جس کا مرکزی نقطۂ نظر اسلام کے مرکزی نقطۂ نظر سے یکسر بدلا ہوا ہے۔

اسلام کا مرکزی نقطۂ نظر ''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول'' ہے، اور جماعتِ اسلامی یا مودودیت کا مرکزی نقطۂ نظر ''سیاست'' اور ''حکومت'' کا قیام ہے۔

اس نقطۂ نظر کے بدلنے سے، یہ عظیم خرابی لازم آئی کہ جو جو چیزیں کلیدی اور بنیادی حیثیت کی، اسلام میں جانی اور سمجھی جاتی تھیں، وہ فروعی، عارضی اور کسی چیز کا ذریعہ بن گئیں، اور جو چیزیں، ذرائع، فروع اور وسیلہ تھیں وہ اصل اور بنیاد بن گئیں۔

چناں چہ نماز کی غایت مودودی صاحب کے نزدیک ''فوجی ٹریننگ''، زکاۃ کا مقصد ''حاصلات (REVENOE)'' روزے کی علت ''فوجی جفاکشی کی مشق''، حج کا روحانی اجتماع ''انٹرنیشنل کانفرس'' اور ارکان اربعہ کا

مجموعہ ''ٹریننگ کورس'' ہوگیا۔ اور تمام وہ اہل ایمان اور انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے لیے ''امامتِ دین'' اور ''حکومتِ الٰہیہ'' مقدر نہیں تھی، مودودی صاحب کو ''ایک نا کام انسان'' اور ''نا کام پیغمبر'' نظر آنے لگے، اسی کا نام ہے ''مودودی صاحب کا نیا اسلام''۔

مودودی صاحب کی ایک کتاب ''اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر'' ہے، جس کے صفحہ ۱۲ر پر ان باتوں کو تفصیل سے دیکھا جاسکتا ہے۔

مودودی صاحب

مودودی صاحب جنھوں نے ''جماعتِ اسلامی'' کی بنیاد ڈالی ہے، ان کا نام ''ابوالاعلیٰ'' ہے، ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء کو اورنگ آباد مہاراشٹر میں پیدا ہوئے، آپ کا اصلی وطن ''دہلی'' ہے، آپ کے والد سید احمد حسن مودودی وکالت کے پیشے کے پیشِ نظر اورنگ آباد میں مقیم تھے۔

''مودودی'' یہ ''مودود'' کی طرف نسبت ہے، خواجہ مودود چشتی نام کے ایک بزرگ چشتی سلسلے کے تیرھویں بزرگ تھے، ان کا پورا نام ''خواجہ قطب الدین مودود چشتی'' ہے، یہ مودودی صاحب کے مورث اعلیٰ ہیں، جن کا انتقال ۵۲۷ھ میں ہوا۔ انھیں کی طرف نسبت کر کے ''ابوالاعلیٰ'' کو ''مودودی'' کہتے ہیں، اور مودود کے معنی ہیں جس سے محبت کی جائے۔

علمی لیاقت

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ذہین بہت تھے، اسی ذہانت ہی کی بنیاد پر آگے بڑھے، لیکن عربی یا انگریزی بولنے پر قادر نہیں تھے، نہ ہی ان زبانوں میں مضمون نویسی آتی تھی، عربی یا انگریزی تصانیف جو مودودی صاحب کی طرف منسوب ہیں، وہ دوسروں کے تراجم ہیں۔

مودودی صاحب نے جدید وقدیم دونوں طریقہائے تعلیم سے کچھ کچھ حصہ پایا تھا، مگر اپنی بصیرت کی بنا پر دونوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، اپنے متعلق خود ہی لکھتے ہیں:

''مجھے گروہ علما میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے، میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں، جس نے جدید وقدیم دونوں طریقہائے تعلیم سے کچھ کچھ حصہ پایا ہے، اور دونوں کوچوں کو چل پھر کر دیکھا ہے، اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو''۔ (ترجمان: ۱۴ر ۳ص ر ۲۲۷)

اخبار ''الجمعیۃ'' کے ایڈیٹر

مودودی صاحب نے تلاش معاش کے لیے ''قلم'' کا سہارا لیا، اس لیے کہ آپ کو تحریر وانشا کا ملکہ تھا۔

۱۹۱۸ء میں ''مدینہ'' نامی اخبار میں کام شروع کیا، پھر دہلی آگئے، یہاں سے جبل پور جا کر ''تاج'' نام سے ایک اخبار نکالا، لیکن وہاں بھی جماؤ نہ مل سکا، اب ۱۹۲۰ء میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مفتیٔ اعظم ہند اور مولانا

احمد سعید صاحب نے جمعیۃ العلماء ہند کی طرف سے اخبار ''مسلم'' نکالا اور مودودی صاحب کو ایڈیٹر مقرر کیا، ۱۹۲۲ء تک اکیلے ایڈیٹرشپ کے فرائض انجام دیتے رہے۔

جب ۱۹۲۲ء میں اخبار ''مسلم'' بند ہوگیا، تو جمعیۃ علمائے ہند نے ۱۹۲۴ء میں ''الجمعیۃ'' جاری کیا، اس کا ایڈیٹر بھی مودودی صاحب کو بنایا گیا، ۱۹۲۸ء تک، تنہا آپ اس کے ایڈیٹر رہے۔

مودودی صاحب کی پہلی تصنیف:

دسمبر ۱۹۲۶ء میں شدھی تحریک کے بانی ''سوامی شردھانند'' کو کسی مسلمان نے قتل کردیا، اس قتل کی ذمے داری امتِ مسلمہ اور اسلام کی تعلیمات پر ڈالی جانے لگی، بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''جب تک قرآن کریم کی تعلیم موجود ہے، دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا، اس لیے تمام انسانوں کو مل کر اس تعلیم کو مٹانے کی کوشش کرنا چاہیے، یہاں تک کہ مہاتما گاندی نے بھی کہہ دیا: ''اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے، جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی، اور آج بھی تلوار ہے''۔

اس سراسیمگی کے ماحول نے مسلمان لیڈروں کو حواس باختہ کردیا، اسی ماحول میں مودودی صاحب نے ''الجمعیۃ'' اخبار میں سلسلہ مضامین شروع کردیا، جس میں اسلام کے طاقت استعمال کرنے کے اصول وضوابط اور تاریخ پر سیر حاصل گفتگو کی، اس طرح اس عنوان پر ''الجمعیۃ'' میں ۲۳، ۲۴ رقسطیں شائع کیں۔ انہیں قسط وار ''الجمعیۃ'' کے مضامین کو ۱۵ رجون ۱۹۲۷ء میں ''الجہاد فی الاسلام'' کے نام سے شائع کیا۔ یہی مودودی صاحب کی پہلی تصنیف ہے، جو ۶۰۰ رسوصفحات پر مشتمل ہے۔ جہاد کے موضوع پر مودودی صاحب نے اس کتاب میں بڑے شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے۔

ترجمان القرآن

۱۹۲۸ء میں مودودی صاحب نے ''الجمعیۃ'' کی ادارت ترک کردی اور دہلی سے حیدرآباد آگئے۔ یہاں ''مجلسِ تحریک قرآن'' نامی نوتشکیل شدہ تنظیم کے ''ترجمان القرآن'' نامی ماہنامے سے وابستہ ہوگئے، ۶ رماہ بعد ترجمان القرآن کے ایڈیٹر ابومحمد صالح نے مودودی صاحب کو ترجمان القرآن کا ایڈیٹر بنادیا۔

''ترجمان القرآن'' ایک خالص دینی رسالہ تھا، جس میں سیاسی مضامین قطعاً نہ ہوتے تھے، ترجمان القرآن کے اجرا کے چوتھے سال ۱۹۳۶ء میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۴ء کی بنیاد پر ہندوستان کو مسلمان منتخب کریں گے، اور ہندو لیڈروں کو ہندو منتخب کریں گے، اس الکشن میں ملک کے سات صوبا جات میں کانگریس کو واضح اکثریت ملی، اور سات صوبوں میں اس کا اقتدار قائم ہوگیا۔

بمبئی ۱۹۳۶ء کا الیکشن ترجمان القرآن میں سیاسی مضامین کے شمولیت کا باعث بنا اور مودودی صاحب کا دینی رخ سیاسی رخ کی طرف کروٹ لینے لگا، آگے چل کر مودودی سے صاحب حیدرآباد سے ۱۹۳۷ء میں دہلی آگئے، اور

اپنے بارے میں خود لکھا: مارچ ۱۹۳۷ء میں جب میں دہلی گیا، اور اپنی آنکھوں الاخری ۱۴۴۲ھ دیکھا کہ سیاسی حالات کے تغیر سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں، تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ جس قدر بھی طاقت خدا نے مجھے دی ہے اس کو اس انقلاب کے مقابلہ میں صرف کروں، چناں چہ میں دہلی سے حیدر آباد پہونچتے ہی اس نئی مہم کی ابتدا ترجمان القرآن کے مضامین سے کردی۔

انہیں مضامین کی آخری قسطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب اب کوئی جماعت اپنے نصب العین یعنی حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے بنانا چاہتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی دار الاسلام:

مولانا مودودی صاحب نے حکومت واقتدار کی خواہش کو اپنے سینے میں محفوظ رکھتے ہوئے اسلام کو عنوان اس کودے کر دار الاسلام کے قیام کی تگ ودو میں تھے، یہاں تک کہ ۱۹۳۸ء میں اپنے چار رفقا کر مدد سے پٹھان کوٹ پنجاب میں دار الاسلام کا قیام عمل میں آگیا۔

۴ر رفقا یہ تھے: (۱) مولانا محمد منظور نعمانی (۲) مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی

(۳) مولانا امین حسن (۴) مولانا مسعود عالم ندوی۔

جماعت اسلامی کی باضابطہ تشکیل:

جماعت اسلامی کی باضابطہ تشکیل کے لیے پہلے ایک مجلس شوری بنائی گئی پھر یکم شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۵ر اگست ۱۹۴۱ء کو ایک عظیم الشان اجلاس عام ہوگیا، یہ اجلاس لاہور میں رکھا گیا۔ اس کے لیے بڑے اعلانات واشتہارات لگائے گئے، خوب تشہیر کی گئی۔

یکم شعبان کی تاریخ اجلاس آئی تو کل ۶۰ر آدمی شریک اجلاس ہوئے، اختتام اجلاس تک شرکاء ۶۰ر سے بڑھ کر ۷۵ر تک ہوئی، یہ اجلاس ۴ر دن تک جاری رہا، کل تعداد ۷۵ر افراد کی تھی، مولانا منظور نعمانی صاحب، مولانا صیف اللہ صاحب، مولانا سید جعفر پھلواروی تھے۔

قابل اعتراض بات:

جماعت اسلامی کے لیے مولانا مودودی صاحب نے باقاعدہ دستور جماعتِ اسلامی کا اعلان کیا جس کی دفعات میں ایک قابل اعتراض دفعہ یہ بھی تھی کہ

”رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو“۔

جماعت اسلامی کے نصب العین کے تحت لکھا ہے کہ ”جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی وجہد کا مقصود دنیا میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ (دستور جماعت اسلامی ۵۲۴)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا مکتوب:

مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں جماعت اسلامی کی تشکیل اور دستور جماعتِ اسلامی کا قدرے تفصیلی ذکر فرما کر حضرت تھانویؒ سے استصواب کیا تھا۔ جواب حسب معمول مختصر آیا، جس میں لکھا کہ سرسری نظر ڈالی ہے لیکن "دل قبول نہیں کرتا" چند دنوں کے بعد مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے تفصیلی خط کا جواب قدرے تفصیل سے تھانہ بھون سے موصول ہوا۔ اس کی قدرے وضاحت یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مولانا نعمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا خط اپنے ایک خادم خاص حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو دیا کہ ذرا مشمولات اور صحیح بات تحریر کر دیں۔

مفتی جمیل احمد صاحب نے خط پر جو تبصرہ کیا تھا وہ کچھ یوں تھا:

"مودودی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تحریک کی شرکت مسلمانان دین کے لیے بہت مضر ہے، ان کتابوں میں صحابہ کرام، تابعین، محدثین، ائمہ مجتہدین سے بے اعتمادی پیدا کر کے دین کے سارے ثبوت کو درہم برہم کیا گیا ہے، اور بہت سی ایسی باتیں لکھیں کہ اگر دور سے دور تک تاویلیں کر کے نہ بچا جاوے تو ایمان کے لیے بھی خطرناک ہیں"۔

اکابر کا اختلاف

جماعت اسلامی کا دستور جس میں گیارہ دفعات تھیں جب سامنے آ گیا تو بعض دفعات محل اشکال بن گئیں، یہیں سے اکابر کا اختلاف شروع ہو گیا، خاص کر پہلی دفعہ جس میں معیار کی تعیین کی گئی تھی اور دوسری دفعہ جس میں نصب العین کی تعیین تھی، پہلی دفعہ میں صحابہ کرامؓ کے اجتماعی عمل اور فیصلہ کی حجت ہونے کی نفی ہے، حالاں کہ اہلِ سنت والجماعت حجتِ شرعیہ ہے، اور صحابہ کرامؓ کے معیارِ حق ہونے نفی اس میں پہلی دفعہ سے ہوتی ہے۔

دوسری دفعہ نصب العین کی تعیین ہوتی ہے، جس کی رو سے سارا دین سیاسی بن کر رہ جاتا ہے۔

اکابر کی تردید:

مودودی صاحب کے مضامین پر سب سے پہلے مولانا مناظر احسن گیلانی نے تردید وقدح کی، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی ادارت میں نکلنے والے "صدق جدید" پرچے میں مولانا مودودی کی تردید میں مضمون لکھا۔ پھر مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی تردیدی مضمون شائع ہوا، علامہ سید سلیمان ندوی اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے بھی تردید کی، مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ دونوں حضرات ۶ / ۷ ماہ بعد "جماعتِ اسلامی" سے مستعفی ہو گئے، مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی علیحدگی اختیار کر لی، اور کچھ دن بعد مولانا مسعود عالم ندوی رحلت فرما گئے

دھیرے دھیرے اکثر علماء کرام نے جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔

تردیدی بیانات:

مفتی کفایت اللہؒ نے بیان دیا کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ان کی اسلامی جماعت کے متعلق میں نے گمراہ ہونے اور اسلام میں ایک فتنہ ہونے کا بیان تو دیا ہے، کافر ہونے کا بیان ابھی تک نہیں دیا ہے، تاہم فتنہ قوی ہے اور اندیشناک ہے۔

مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مودودی صاحب نے اپنی کتاب قرآن کے چار بنیادی اصلاحیں لکھ جو نیا موقف اختیار کیا اس سے اندیشہ ہے کہ جو نسل خالص تحقیقات وخیالات کے سائے میں پروان چڑھے گی اس کا ایک نیا دینی مزاج بن جائے گا۔

مودودی صاحب کا مسلک:

مودودی صاحب لکھتے ہیں:

”میں نہ مسلک اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور حنفیت یا شافعیت کا پابند ہوں“ (رسائل ومسائل: ۱/ ۱۵۳)

فہمِ دین کا مودودی طریقہ:

”دعوتِ دین اور اس کے مطالبات“ صفحہ نمبر ۳۳ پر مودودی صاحب لکھتے ہیں: ”میں نے دین کو ماضی یا حال کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن وسنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں، ب کہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے، اور رسول نے کیا کہا؟ اس ذریعہ معلومات کی طرف آپ لوگوں کو بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔“

گویا مودودی صاحب سقراط اور بقراط، اور حکیم جالینوس کی صرف حکمتیں اور فارمولے دیکھنے کے قائل ہیں اور اس کی تلقین کرتے ہیں، اور فلاں اور فلاں ڈاکٹر اور حکیم کے نسخے پریکٹس کے طریقے جو گزشتہ اسلافِ طب وحکمت ہی کے فارمولوں کی تشریح ہیں، ان کو مودودی صاحب نہیں مانتے۔

اعترافِ حقیقت:

حالاں کہ ایک جگہ خود ہی اعتراف کیا ہے: ”علما کی عزت بلاشبہ مسلمانوں پر واجب ہے، اگر ان کی عزت نہ ہو تو مسلمان اپنے دین کا علم کس سے حاصل کریں گے؟ احکام دین کس سے پوچھیں گے؟ عبادت اور معاملات میں کس کا اتباع کریں گے، اس لحاظ سے علماء کا وقار اور ان کے اعتماد کی حفاظت، درحقیقت دین کی حفاظت ہے، اور اس چیز کے

ضائع ہو جانے سے مسلمانوں کے گمراہی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ یقینی ہے"۔
(ماہنامہ ترجمان القرآن: ۱۲/عدد ۵، جولائی ۳۸ء، ص ۳۳۸)

مولانا مودودی صاحب نے اس بیان میں حقیقت کا اعتراف کیا ہے، لیکن گزشتہ عبارت میں مودودی صاحب خود ہی ایک نئی روش پر چل رہے ہیں، اور دوسروں کو بھی اس نئی روشنی کی دعوت دے رہے ہیں۔

تفسیر کے لئے اعلیٰ درجے کا پروفیسر

مودودی صاحب تفسیر قرآن کے متعلق "جماعت اسلامی" کا نظریہ لکھتے ہیں کہ "قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے، جس نے قرآن کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہو، اور جو جدید طرز پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو، وہ اپنے لکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کردے گا پھر بی۔اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھا دے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے، اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں"۔ (رسائل و مسائل: ج ۲/ ۴۱)

کیا قرآن کریم کے لئے تفسیر کی ضرورت ہے

اور عصری درس گاہوں تک میں معمولی معمولی مضامین کتابوں کے لئے شرح و تفسیر کی ضرورت ہے، طب و قانون کے لئے شارح کی ضرورت ہے، ہندوستان کے قانون کے لئے واضح کرنے والے فرد اور واضح کرنے والی کتاب کی ضرورت ہے، لیکن مودودی صاحب کے نزدیک قرآن کریم کے لئے کسی تفسیر کی ضرورت نہیں۔ "اسلام کی روح" کیا ہے پروفیسر صاحب کو کیا معلوم، پھر وہ کیسے اسلام کی روح پھونکیں گے۔ اور مودودی صاحب کو بھی اسلام کی روح کا پتہ ہوتا تو اصل کو فرع اور فرع کو اصل بنانے کے جرم کا ارتکاب نہ کرتے۔

تواتر اور اجماع کے خلاف مودودی رائے

محدثین کرام کی خدمات کے سلسلے میں جو رائے تواتر اور اجماع امت سے ثابت و منقول ہے، مودودی صاحب نے اس کا بڑے شگفتہ انداز میں رد کیا ہے لکھتے ہیں: "محدثینؒ کی خدمات مسلم، یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لیے انہوں نے جو مواد فراہم کیا ہے وہ صدر اول کی اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے، کلام اس میں نہیں ہے، بل کہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتقاد کرنا کہن تک درست ہے۔ وہ بہر حال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرتاً اللہ نے مقرر کی ہیں ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے، پھر آپ کیسے کہہ سکتے کہ وہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں نہ حقیقت میں بھی صحیح ہے"۔ (تفہیمات: ص ۲۹۲)

مودودی صاحب بھی ایک انسان تھے بفطرتاً جو حدیں اللہ نے انسانی علم کے لیے مقرر کی ہیں، ان سے وہ بھی

آگے ہیں جا سکتے تھے، انسانی کاموں میں فطری طور پر جو نقص پایا جاتا ہے۔اس لیے مودودی صاحب کے کام بھی محفوظ نہ تھے، پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو مودودی صاحب صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے۔

بخاری و مسلم کے بارے میں

مودودی صاحب لکھتے ہیں: ”یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری و مسلم میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنبیہ قبول کر لینا چاہیے۔اس سلسلے میں یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ کسی روایت کے سنداً صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا نفس مضمون بھی ہر لحاظ سے صحیح ہو اور چوں کا توں قابل قبول ہو“(وسائل و مسائل)

مودودی صاحب کے نزدیک نفسِ مضمون کے صحیح ہونے کا کیا معیار ہے، کیا ان کی عقل معیار ہے، یا کوئی اور چیز، اگر ان کی عقل معیار ہے تو پھر ان کا ہی بنایا ہوا یہ دستور ہے کہ ”رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ جانے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو“ کیا مودودی صاحب اپنی ذہنی غلامی کی دعوت دے رہے ہیں، اپنے علاوہ سب کو تنقید کا محل بتا رہے ہے، اپنے کو ہی معیارِ حق بنا رہے ہیں، یا نہیں؟

اپنے بارے میں

مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ: ”میں اپنا دین معلوم کرنے کے لیے چھوٹے یا بڑے علما کی طرف دیکھنے کا محتاج نہیں ہوں بل کہ خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے معلوم کر سکتا ہوں کہ دین کے اصول کیا ہیں اور یہ بھی تحقیق کر سکتا ہوں کہ اس ملک میں جو لوگ دین کے علم بردار سمجھے جاتے ہیں وہ کسی خاص مسئلے میں صحیح مسلک اختیار کر رہے ہیں یا غلط، اس لیے میں مجبور ہوں کہ جو قرآن و سنت حق پاؤں اسے حق سمجھوں اور اس کا اظہار بھی کر دوں“۔

(روداد اجتماع جماعت اسلامی الہ آباد:۴۳)

مودودی صاحب اپنا دین معلوم کرنے لیے چھوٹے یا بڑے علما کی طرف دیکھنے کے محتاج نہیں ہیں بل کہ خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے معلوم کر سکتے ہے، مودودی صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں، خدا کی کتاب سے جب دین معلوم کریں گے تو آخر لغت کی، صرف کی، نحو کی، بلاغت و معانی کی ضرورت پڑے گی یا نہیں، یہ سب وہ اپنے پاس پیدائشی تو لے کر آئے نہیں تھے، آخر لغت کے چھوٹے یا بڑے عالم ہی کی کتاب سے معانی سیکھا ہوگا، نحو، صرف، بلاغت، معانی کا محتاج ہونا یہ کسی چھوٹے یا بڑے عالم کی طرف دیکھنے کا محتاج ہونا ہی کہلائے گا۔آخر اس طرح کی ملمع سازی سے جماعت اسلامی کے سربراہ دین حنیف کی کیا خدمت انجام دے سکیں گے۔

سچی بات

سچی بات یہ ہے کہ مودودیت ”اعتزال، خارجیت، اور شیعیت ہے جس نے نام نہاد ”جماعت اسلامی“ کا روپ دھار لیا ہے، خارجیوں کی طرح حکومت کو اولین درجہ اس نے دیا، صحابہ کو اس نے مطعون کیا، معتزلہ کی طرح عقل کو نقل پر ترجیح دی، شیعیت کی طرح حضرت معاویہ یزید وغیرہ کو کیا کیا الزامات لگائے“۔(محاضرہ مودودیت:۳۹)

مودودی صاحب کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' یا ''تحریف القرآن''

مودودی صاحب اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے بارے مین اپنا طریقہ تفسیر لکھتے ہیں کہ ''میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان مین منتقل کردوں''۔(دیباچہ تفہیم القرآن:۱/۱۰)

قرآن اللہ کی کتاب ہے،اللہ کا کلام ہے،اللہ تعالیٰ جو کلام کریں گے وہی دوسروں کو سمجھانا تفسیر ہے،تشریح وتوضیح ہے،مودودی صاحب نے اللہ کے کلام کے مفہوم کو ایک طرف کردیا،اوراپنی سمجھ کے مفہوم کو لوگوں کو بتایا،تو آپ خودہی فیصلہ کریں کہ یہ قرآن سمجھانا ہوایا اپنا مفہوم سمجھانا،یہ تفہیم القرآن ہوا،یا تحریف القرآن۔

اللہ کے کلام کی تفسیر،اللہ ہی کے نبی،اللہ اور نبی کے وارثین،سمجھائیں،اور جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اسے ہی سمجھائیں تو تفسیر قرآن،کہلائے گی،ورنہ تحریف قرآن ہوجائے گی،تفسیر بالرائے ہوجائے گی جو قطعاً ناجائز ہے۔

تفہیم القرآن کی بنیادی خامیاں

آزاد ترجمانی اور من مانی تفسیر کے باعث مودودی صاحب تفہیم قرآن کے بجائے تحریف قرآن کے مرتکب ہوگئے ہیں۔

۱)اس تفسیر میں عصمت انبیاء کو داغ دار کیا گیا ہے۔

۲)صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخیاں کی گئی ہیں۔

۳)معجزات وخوارق سے انکار کی جھلک نمایاں ہے۔

۴)مسلمات اسلام کی تسلیم سے فرار اختیار کیا گیا ہے۔

الہ،رب،دین،عبادت کی اصطلاح خود پہلے مقرر کرلی گئی ہے،پھر اس کے مطابق آیات کو ڈھالنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا مشورہ:

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے (مودودی) یہ حصہ(سورۂ بقرہ کا) ایک مخصوص صحبت میں مجھے اور مولانا امین احسن کو سنایا —— مولانا امین احسن نے انہیں مشورہ دیا کہ اب آپ اپنے آپ کو علمی کاموں میں زیادہ مصروف نہ کریں۔

مولانا امین احسنؒ نے مولانا منظور نعمانیؒ سے فرمایا:''بھئی میں تو مولانا مودودی کی علمی سطح کے بارے میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ''لافرق بینہ وبین پرویز'' (علامہ مودودی اور منکر حدیث پروفیسر پرویز میں علمی سطح کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے)۔(جماعت اسلامی سے مجلس مشاورت تک:ص ۳۲)

سجدۂ تلاوت بے وضو:

مودودی صاحب کے اسی مبلغ علم کے پیشِ نظر مولانا امین احسن اصلاحی کا مشورہ تھا کہ آپ علمی کاموں میں نہ مصروف ہوں، ورنہ شریعت کے مسائل کچھ سے کچھ کردیں گے چناں چہ سجدہ تلاوت میں انہوں نے ایسا ہی فتوی دیا ہے، لکھتے ہیں:

"آیت سجدہ سن کر جو شخص جہاں، جس حال میں ہو جھک جائے خواہ باوضو ہو یا نہ ہو، خواہ استقبال قبلہ ممکن ہو، یا نہ ہو، خواہ زمین پر سر رکھنے کا موقع ہو یا نہ ہو"۔

نبی کی شان میں گستاخی:

"الاقوم یونس ا ھ" کے تحت علامہ مودودی "تفہیم القرآن ۲/ ۳۱۲" پر لکھتے ہیں: "حضرت یونسؑ سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں، او رغالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا"۔

حضرت نوح علیہ السلام کی شان میں گستاخی:

تفہیم القرآن: ۲/ ۳۴۳ پر حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند کے غرق آب ہونے سے متعلق آیت میں تفسیر کرتے ہوئے مودودی صاحب رقم طراز ہیں کہ "بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلی و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے"۔

اگر اس مقام پر "نبی" کا لفظ ہٹا کر عبارت یوں لکھ دیں کہ بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر مودودی جیسا انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے" تو جماعتِ اسلامی کے شیدائی اس سے بالکل خوش نہ ہوں گے۔ جس جملے کو وہ علامہ مودودی کے لیے کسرِ شان سمجھتے ہیں، کیا نبی کے لیے وہ جملہ گوارہ کیا جاسکتا ہے؟!۔

صحابہ کے حق میں لکھتے ہیں کہ "احد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہوگئے"۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں:

علامہ مودودی نے تمام مفسرین کی اجماعی تفسیر کی شاہراہ سے ہٹ کر قرآن کی ایک ذاتی اور خانہ زاد تفسیر کی اور قرآن کریم میں ۴/بنیادی اصطلاحیں تراشیں "الہ، دین، رب، عبادت" ان چاروں میں اپنا ذاتی معنی ڈالا، چناں چہ

الہ	کے معنی	اقتدار
رب	کے معنی	حاکم
دین	کے معنی	اسٹیٹ

اور عبادت کے معنی اطاعت
مقرر کیا، اس کے لیے علامہ مودودی نے ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام ”قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں“ رکھا، جس کے بارے میں مودودی صاحب خود فرماتے ہیں ”پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بل کہ حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی ——— لہٰذہ یہ نہایت ضروری ہے کہ ان اصطلاحوں کی پوری پوری تشریح کی جائے“۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، ص ۶-۸)

علامہ مودودی صاحب ۱۳۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان سے پہلے تقریباً گیارہ بارہ سو سال تک ”قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بل کہ حقیقی روح نگاہوں سے مستور“ رہی بڑے بڑے فقہا آئے، محدثین آئے، مفسرین آئے، علما و مفتیان کرام آئے، ۱۲؍سو سال تک سب کی نظروں سے ”قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ سے زیادہ تعلیم“ مستور رہی۔ اب ۱۳۲۱ھ میں علامہ مودودی پیدا ہو کر ۱۲؍سو سال تک پوشیدہ ۴/۳ حصہ تعلیمِ قرآنی کو محض اپنی عقل سے، پرانے ذخیروں سے استفادہ کیے بغیر اور قدیم علمائے ستفادہ کیے بغیر لوگوں کے سامنے لانے جا رہے ہیں، کیا کوئی بھی سمجھ دار آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ تقریباً ۱۳؍سو سال پہلے والی تعلیمات کو تقریباً ۱۳؍سو سال بعد ایک آدمی درمیان کے تمام واسطوں کو حذف کرکے محض اپنی عقل سے پیش کر دے، نہ اسے کتابی واسطوں کی ضرورت ہے کہ وہ پرانے ذخیرے ہیں، نہ انہیں اپنے اسلاف و اکابر کی ضرورت ہے کہ تین چوتھائی قرآن کی تعلیم ان کی نظروں سے مستور ہے۔

ظاہری بات ہے کہ بالکل غلط اور بدیہی البطلان ہے، اور دینِ اسلام اپنی تمام تعلیمات و احکام کے ساتھ متوارث صحیح صحیح منقول چلا آرہا ہے، اگلوں نے پچھلوں کو وہ دولت اپنی اپنی بساط کے مطابق صحیح صحیح بانٹ دی ہے۔

مودودی صاحب خطا پر ہیں اور ان کی جماعت کے لوگ اس سلسلے میں صحیح سوچیں تاکہ راہِ حق سے دوری نہ ہو۔

جادۂ حق:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین ایک لاکھ ۲۴؍ہزار صحابہ کو پیش کیا تھا کسی کمی بیشی ہمارے سامنے موجود ہے۔ ائمہ اربعہ نے حالات و تقاضے کے پیشِ نظر کلیات دین ہی غور کرکے تمام جدید فرعیات کو احکام اسلامی کے ساتھ آراستہ کر دیا ہے۔ دین پورا نسلاً بعد نسل متوارث ہے اس کی حفاظت کی ذمے داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے، شریعت کا ایک ایک مسئلہ سند کے ساتھ صحابہ اور اللہ کے رسول تک پہونچتا ہے۔

اسی دین کو سینے سے لگائیں، اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔ آمین!

حفاظت قرآن کے مختلف پہلو

قرآن کریم کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لیے مستقل ایک طبقہ کھڑا ہوگیا۔ الفاظ

کے لیے حفاظ، معانی کے لئے علماء، رسم الخط کے لئے علماء رسم الخط، اور طرز ادا کے لئے قراء اور مجودین، حکم اور مصالح کے لیے حکماء حقائق کے لئے صوفیاء، علل واسرار کے لیے فقہا تو ایک ایک طبقے نے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی، اسی لحاظ سے قرآن کریم ہر اعتبار سے محفوظ ہوا۔

تعارف علم طب نبوی

مولانا ابوفیضان زاہد الندوی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

وہ احادیث نبویہ جو طب وحکمت یعنی صحت ومرض تندرستی وبیماری اور علاج ومعالجہ اور ہر قسم کے امراض جسمانیہ سے تعلق رکھتی ہیں وہ احادیث محدثین عظام کی مصنفات اور علوم حدیث نبوی شریف کی کتابوں کا اہم ترین اور عظیم ترین جزء سمجھی جاتی ہیں، انھیں اچھی طرح تحقیق وتتبع اور خوب چھان بین کر کے یکجا کر دیا گیا، یہ ہمارے محدثین کرام کا عظیم ترین کارنامہ ہے کہ انہوں نے بڑی ہی عرق ریزی اور پوری امانت ودیانت داری کے ساتھ ہر ہر جزئی وکلی شئ جو بھی ہو اور جس شعبۂ حیات سے بھی تعلق رکھتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف وہ منسوب ہے ،اس پر انہوں نے بے مثال ومنفرد تحقیقات پیش فرمائی ہیں اور جرح وتعدیل فرما کر انہیں منقح وموضح مہذب شکل میں پیش فرمایا ہے اور باوثوق ذرائع سے جو سلسلہ رواۃ قابلِ اطمینان تھا اور پورا پورا شرح صدر ہر اعتبار سے ان سے حاصل ہوتا تھا ان ہی کی مرویات کو اپنی مسانید ومصنفات ومسلسلات میں انہیں جگہ دی ہے، بایں طور کہ کوئی بھی اُن پر انگشت اٹھا نہیں سکتا، اور نہ ہی انہیں نا قابل لحاظ وروایت قرار دے سکتا ہے، اس اعتناء کامل ودقیقہ سنجی کے باوجود ان احادیث نبویہ طبیہ کو بھی دیگر علوم وفنون کی طرح جدید عرض ونقد کے منہج وطریقہ پر جانچا و پرکھا جا رہا ہے، کہ وہ احادیث اس معیار جدید کے منہج عرض ونقد کے مقررہ اصول وضوابط پر پورا پورا اترنے کے بعد ان پر حکم لگایا جا رہا ہے، طب نبوی کا طب جدید وجدید سائنس ٹیکنالوجی سے موازنہ کیا جا رہا ہے کہ دونوں طریقہ علاج وطبوں کے درمیان باہم کوئی سرا مل جاتا ہے یا نہیں، یعنی جدید سائنسی طریقہ علاج کو معیار وکسوٹی بنایا جا رہا ہے طریقہ علاج نبوی کے لیے، یہ بھی محسن اعظم اور طبیب حاذق کے منجملہ احسانات میں سے ایک عظیم ترین احسان کی عجیب وغریب اور مضحکہ خیز احسان فراموشی ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ احسان فراموشیاں ہوتی ہیں، لیکن یہ بھی کوئی احسان فراموشی ہے، سبحان اللہ۔

یہ دور، دورِ عقلانیت و مادیت ہے
بُرا ہو اس عقل پرستی و انانیت و مادہ پرستی کا

قد انعکست المعانی المفاہیم معانی و مفاہم بالکل عکس ہو چکے" کھرے کی جگہ کھوٹے نے لے لی، اور کھوٹے کو کھرے کے درجہ میں رکھ دیا گیا، صدق کی جگہ کذب نے لے لی، اور صدق کو کذب کا مقام دے دیا گیا، امانت کو خیانت، اور خیانت کو امانت کا درجہ دیا جانے گا، حق کو پسپا کرنے کے لیے عالمی پیمانہ پر منصوبے، پلانات اور اسکیمیں بنائی جارہی ہیں اور باطل کو ایسا بڑھاوا دیا جارہا ہے کہ لگے جیسے باطل ہی سب کچھ ہے" و ماعدا ذلک فلیس بشیء" لیکن خالق کائنات نے "جاء الحق و زھق الباطل" کا جو خوش کن مژدہ ازل سنایا ہے، اس سے منہ کیسے انحراف کیا جاسکتا ہے۔ کرنے والے ہر دور و عہد میں کرتے رہیں۔ اور آج بھی کرنے والے دھریہ و بد دین و بدعقیدہ لوگ کررہے ہیں۔ اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، لیکن یہ تو آفتاب پر دھول ڈال کر اپنے آپ کی کم عقلی و حماقت و سفاہت بلادت و غباوت اور خفت عقل کا واضح ترین ثبوت ہے کہ دیکھو ہم رہے وہ خفیف العقل اور عقل سے پیدل جنہیں روشن خیال سمجھا جارہا ہے، اس روشن خیالی نے بجز تباہی و ہلاکت کے کچھ نہیں دیا اور دے بھی کیا سکتے ان روشن خیالوں کی زبوں حالی کو بیان کرنا خود اپنے آپ کی زبوں حالی کو دعوت دینا ہے۔ بہر حال آج کا ہمارا خاص موضوع ہے علم طب نبوی کا بہترین جامع و مانع، مزید برآں مقنع للعقول النائھۃ الضالۃ فی الطب النبوی کا تعارف عہد قدیم سے ہی بے شمار علما نے احادیث نبویہ متعلقہ بالطب کو بانفرادیت مؤلفات خاصہ میں باہتمام تمام جمع و یکجا فرمایا ہے؛ نیز ساتھ ساتھ علما نے ان احادیث کی دل نشین تشریح و توضیح بھی فرمائی ہیں، اور ان پر بہترین و مفید و کارآمد تعلیقات و فوائد بھی مستنبط فرما کر تحریر فرمائی ہیں؛ مزید برآں بہت سے وہ امور بھی بیان فرمائے ہیں جو کہ جڑی بوٹی والے طریقہ علاج و معالجہ سے متعلق ہیں۔

اور یہ سب کچھ جو علماء اسلام نے عرق ریزیاں فرمائی ہیں، صرف اور صرف علم طب نبوی کی اہمیت و افادیت و نافعیت کے سبب ہی تو کی ہیں، اور ان علاجات و نصائح اور ادویہ اور ضروری کاروائیوں کے اظہار کے لیے اور ان کے خواص و تاثیرات کو اجاگر کے لیے تھیں جن کی توفیق اللہ پاک نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشی تھی، اور ان کی طرف بذریعہ وحی آپ کی رہنمائی فرمائی تھی، یہ سب چیزیں ایک علم خاص کی نمائندگی کرتی ہیں، تجربات خاصہ آزمودہ سے علم طب نبوی کی صحت و اہمیت کا اصحاب، اختصاص نے اعتراف و اقراری نہیں کیا ہے بل کہ اس طریقہ علاج کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ فللہ الحمد اولاً و آخراً!

طب نبوی دنیائے اسلام کا ایک مقدس موضوع فکر و مطالعہ ہے، اہل اسلام نے ہر دور میں طب نبوی سے استفادہ کیا ہے، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مختلف ادوار اسلامی میں میدان ہائے طب و سائنس میں جو پیش قدمیاں ہوئی ہیں، اور مفکرین و ماہرینِ سائنس نے جو اقدامات کیے ہیں وہ لازماً تعلیماتِ قرآن سے متاثر اور اس کے

آئینہ دار ہیں۔نباتات کے میدان میں مسلمان علمائے طب نے محیر العقول انکشافات اور اکتشافات پیش کیے ہیں، اور ان کا ثبوت وہ سب کتب نباتات ہیں جو کہ دستِ بردِ زمانہ سے محفوظ رہی ہیں اور زیرِ مطالعہ آ چکی ہیں، جبکہ ہنوز لاتعداد کتب نباتات فقط کتب خانوں اور لائبریریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں، یا غفلتوں کی بناء پر خوراکِ دیمک ان کا مقدر رہا ہے۔علاج امراض کے لیے نباتات کے استعمال کو زبردست اہمیت حاصل رہی ہے،اس اہمیت کی وجہ یقیناً وہ نظام قدرت وفطرت ہے کہ جو اس زمین میں ہر سو کارفرما ہے،کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کرے کہ جس خطۂ زمین پر جو حالات ہوتے ہیں اور وہاں جو امراض وجود وظہور میں آتے ہیں،قدرتِ فیاض نے اور فطرتِ نباض نے ان کے علاج کے لیے اس خطۂ ارض پر اس مناسبت سے نباتات کو وجود بخشا ہے،قدرت کا یہ نظام کل بھی برسرِ عمل تھا اور آج بھی ہے، میدانِ طب کے اکابر رجال حقیقت آشنا تھے،اور رموزِ قدرت کے شناس تھے،شفا بخشی کے باب میں نباتات ہی اُن کی توجہ کا اہم مرکز رہے،اور وہ تعلیماتِ اسلامی سے پوری سرشاری کے بعد مبادیاتِ طب سے شناسائی کے بعد خدمتِ خلق میں مصروف ہوئے تو انہوں نے فکر وعلاج بالنباتات کو ایسے خطوط پر مرتب واستوار کیا کہ جو اہمیت کے اعتبار سے آج بھی واجب التسلیم ہیں اور عصری سائنس بھی اکابر طب کے ان انکشافات اور اکتشافات کی نفی نہیں کرتی،افسوس کہ تیرگیٔ خرد نے اور نیرنگیٔ عصرِ حاضر نے آج کی دنیائے اسلام کے زعماءِ طب کو مرکز گریز بنایا اور وہ خود بھی آوازِ مغرب سے ایسے مرعوب ہوئے کہ اپنے ورثہ ہائے علمی کے ناقدین بن گئے،پھر ان کی یہ تنقید تنقیص میں بدل گئی،با ایں ہمہ آج بھی پختہ ماہرین طب اور راسخ العقیدہ مسلم علمائے سائنس نے طبِ نبوی پر اپنی توجہات کو مرکوز رکھا ہے،اور علاج بالنباتات کا سلسلہ غیر منقطع رہا،حتیٰ کہ مغرب کو اپنی بے خبری کا احساس ہوا ہے،اور انسان کو محض مضغۂ گوشت قرار دینے والے متغیرین اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ طب کو آغوشِ فطرت سے باہر نہیں جانا چاہیے اور انسان کو روح ومادہ کا ایک اشرف وجود سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے،جسم انسانی کے فہم نے ان کو بالآخر اس نتیجے پر پہنچا دیا ہے کہ شافیٔ مطلق ذات باری ہے،معالج کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ اپنے محدود علم وعقل کی بناء پر جسم انسانی کو برائے شفا جن دواؤں سے روشناس کراتا ہے،بسا اوقات اسے خود علم نہیں ہوتا کہ ان کی شفا بخشی کا راز کیا ہے،اس لیے ایک حقیقت پسند سائنس داں یہ سمجھتا ہے کہ شفاء ہی اس کا مقام نہیں ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طبیب حاذق

انسان،جب زمین پر آباد کیا گیا،تو اسے وہاں پر رہنے کا سلیقہ سکھانے اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ سکھانے کے لیے تاریخ کے ہر دور میں رسول آئے،یہ لوگوں کو اچھی زندگی گزارنے کا اسلوب سکھاتے تھے،جن میں سے ایک صحت مند رہنا بھی ہے،تندرستی کو قائم رکھنے اور کھوئی صحت کو واپس لانے کی ذمہ داری ایک روحانی علم سمجھا جاتا رہا ہے،اور تاریخ کے ہر دور اور ہر مذہب میں علاج کرنے والے مذہبی پیشوا نظر آتے ہیں،مصر قدیم میں معبدوں کے

پروہت علاج کرتے تھے، شاستروں کے مطابق علاج کا علم برہما کو تھا، اُس الافانی کو انسانوں کے فائدے کے لیے بھاردواج، اور اس کے بعد اتی کمار کو ایک لاکھ اشلوک یاد کروا دیے، تاکہ وہ لوگوں کا بھلا کرسکیں؟ حضرت داؤد علیہ السلام علم الادویہ کے بانی تھے، کیوں کہ جب وہ چلتے تھے، تو ہر درخت اور پتہ مخاطب ہوکر اپنا نام اور فائدہ بتاتا تھا، وہ ان کو لکھ لیا کرتے تھے، اس طرح علم الادویہ پر پہلی کتاب معرض وجود میں آئی قرآن مجید نے، علم حکمت کی اہمیت پر ارشاد فرمایا: "ومن یؤتی الحکمۃ فقد أوتی خیراً أکثراً "۔ (بقرہ: ۲۶۹)

ہم جسے حکمت سکھاتے ہیں، اسے لوگوں کی بھلائی کا بہت بڑا ذریعہ عطا کردیا گیا، اور بھلائی کا یہ ذریعہ جب ایک برگزیدہ بندے لقمان کو عطا ہوا، تو ارشاد ہوا: "ولقد أتینا لقمان الحکمۃ ان اشکر للہ"۔ (سورہ لقمان: ۱۰۰)

ہم نے جب لقمان کو حکمت کا علم عطا کیا، تو اس عطیہ پر اس کے لیے شکر واجب ہوگیا۔ لقمان کو حکمت کا علم ایسا شاندار ملا کہ لوگ آج بھی اپنے آپ کو طب میں لقمان کہلوانا فخر کی بات جانتے ہیں، ان کی یہ شہرت اتنی قابل رشک تھی کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں کی بھلائی کے لیے خدا کا پہلا گھر بنایا تو اس خدمت کے بعد اپنے پروردگار سے جن عنایات کے لیے معروض ہوئے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

"ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلم الکتاب والحکمہ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم" اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما، یہ رسول ان کو تمہاری آیات سنائے، ان کو تمہاری کتاب کتاب کا علم سکھائے، حکمت سکھائے، اور پاکیزہ کرے کیوں کہ تو ہی سب سے بڑائی والا اور حکمت والا ہے۔

کتاب اور آیات سے بالواسطہ مراد یہ ہے کہ اس پر اپنی کتاب نازل فرما حضرت ابراہیم کے خلوص۔ اور محنت اور ایمان کی قدرافزائی میں اللہ ان کی پوری کے پوری دعا قبول فرمائی، اسی شہر میں وہاں کے رہنے والوں میں سے عبدالمطلب کے گھرانے میں عبداللہ کے بیٹے کو نبوت عطا فرمائی، ان کے ذریعہ خدا کی مبسوط کتاب نازل فرمائی، جسے اُنہوں نے لوگوں کو سمجھایا، اور اُس کے ساتھ ہی اُن کو حکمت کا علم عطا فرمایا، اس علم اور آسمانی ہدایات کے ساتھ اُنہوں نے لوگوں کو پاکیزگی سکھائی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا اور حکمت والا ہے، اس نے ان عنایات کے عطا کی بات قرآن مجید میں یوں واضح فرمائی ہے: "وأنزل علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم وکان فضل اللہ علیک عظیما" (النساء: ۱۱۳) ہم نے تم پر اپنی کتاب اتاری، حکمت سکھائی اور ہر وہ علم سکھا دیا جو تمہیں پہلے نہ آتا تھا، اور یہ اللہ کا تم پر بہت بڑا فضل ہے۔

اس آیت نے یہ واضح کردیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ابتدا میں تعلیم یافتہ نہ تھے تو اب وہ جملہ علوم وفنون میں پوری طرح مستند کردیے گئے ہیں، یہ بات طے ہے کہ خدا کو ہر چیز کا علم ہے، اور اس کی صفات میں شفا دینے والا اور حکمت والا ہونا شامل ہے بلاریب وہ علیم، حکیم، شافی اور اعلیٰ ہے، اگر کسی کو یہ علم خود سکھائے تو پھر اس کے علم وحکمت

میں کسی کمی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔قبل اس سے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صلاۃ الاخری محمد ۱۴۳۲ھ امام محمد بن ابو بکر بن القیم کی وہ قیمتی بات جو انہوں نے اپنی کتاب "زاد المعاد إلی ھدی خیر العباد" میں تحریر فرمائی ہے، طب نبوی پر بطور خصوص ایک اہم ترین تنبیہ پیش کریں گے۔"أن رسول اللّٰہ علیہ وسلم قد تکلم في الطب و لیس بطبیب، و عالج أصحابه و لیس بآس" کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طب اور ڈاکٹری سے متعلق بہت سے اہم ترین باتیں ارشاد فرمائی ہیں، حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم طبیب نہیں ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کا علاج فرمایا وہ شفایاب ہوگئے، حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکیم نہیں ہیں۔"و انما ھو رسول اللّٰہ من عند اللّٰہ سبحانه علمه مالم یعلم، و کان فضل اللّٰہ علیه کبیرا" آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بس اللہ پاک کے ایک برگزیدہ و محبوب رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے وہ تمام کے تمام چیزیں سکھلائی تھیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ جانتے تھے، در حقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا بے پایا فضل تھا۔خلاصہ کلام یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شئ کے بھی متعلق ارشادات اور ہدایات فرمائی ہیں وہ سب کے سب نری وحی الٰہی پر مبنی تھیں"ما ینطق عن الھوی، إن ھو إلا وحي یوحی علمه شدید القوی" اب امام ابن القیم کی قیمتی تحریر مع ترجمہ پیش خدمت ہے:

"لیس طبه صلی اللّٰہ علیه و سلم کطب الأطباء، فإن طب النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم متیقن قطعي الھي، صادر عن الوحي و مشکاۃ النبوۃ و کمال العقل، و طب غیرہ اکثر حدسي و ظنون و تجارب، و لا ینکر عدم انتفاع کثیر من المرضی بطب النبوۃ، فإنما ینتفع به من تلقاہ بالقبول و اعتقاد الشفاء و کمال التلقي له بالایمان و الذعان، فھذا القران الذي ھو شفاء لما في الصدور، إن لم یتلق ھذا التلقي لم یحصل به شفاء الصدور من ادوائه، بل لا یزید المنافقین رجسا الا رجسھم و رضا إلی مرضھم"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طب دیگر اطباء و حکماء کی طب کی طرح نہیں ہے، یقینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طب یقینی قطعی اور الٰہی طب ہے، وحی الٰہی اور مشکوۃ نبوت سے صادر ہوا ہے۔

علم طب تو ایک قیافہ ہے، معالج گمان کرتا ہے کہ مریض کو فلاں بیماری ہے، اور اُس کے لے فلاں دوا مناسب ہوگی، وہ ان میں سے کسی چیز کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، اُس کے مقابلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم طب اور اُن کے معالجات قطعی یقینی ہیں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مدار وحی الٰہی پر مبنی ہے، جس میں کسی غلطی اور ناکامی کا کوئی امکان نہیں۔

طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف:

طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اُن چیزوں سے عبارت ہے کہ جن کے ورود کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوں اور اُن کا تعلق کسی نہ کسی وجہ سے میں طب و حکمت سے ہو خواہ کوئی ایسی آیت کریمہ ہو جو مشتمل بر طب ہو یا الٰہی

احادیثِ نبویہ شریف ہوں کہ جو طب سے تعلق رکھتی ہوں، اس موقع پر اس امر کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا کامل و مکمل طب نہیں کہ جو طب کی تمام ہی فروع انواع و اقسام کو سمیٹے ہوئے ہو، جس طرح کہ طب یونانی طب ہندی اور طب فارسی وغیرہ کا معاملہ ہے، بل کہ طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سوابق اور لواحق تمام طبوں سے بالکل ہی ممتاز و منفرد طب ہے، طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو "الطب الوقائی" کے تحت آتا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ طبی ہدایت پر یقین محکم و اعتقاد شفاء من اللہ پوری طرح کاربند رہنا ہے، یہ عملی مشق ساری جسمانی روگ کو دور کر دیتی ہے، یہ مطلب ہے "الطب الوقائی" کا، اور طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوڑا سا حصہ "طب علاجی" کے تحت آتا ہے، نیز قدرِ قلیل حصہ ایسا ہی ہے جو علوم طب سے متعلق رکھتا ہے، جیسے علم جنین یعنی ماں پیٹ کے بچے سے متعلق معلومات اور اس کی ادویہ وغیرہ کی جان کاری اور موروثی امراض وغیرہ ہیں، ان بیماریوں کے سلسلہ میں جدید سائنس نے کافی پیش رفت کی ہے۔

طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے میادین و مقررہ اصول و ضوابط:

(۱) میدان طب وقائی سے متعلق اہم ترین ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم:

جسمانی و بدنی صحت و تندرستی کی بقاء و حفاظت میں جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کا بہت بڑا حصہ اور نہایت ہی اہم کردار ہے، چناں چہ مجملہ اُن ہدایات مہمہ کے چند یہ ہیں: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں پانی کے استعمال کا حکم دیا ہے، اور غسل کا حکم دیا ہے، جب نماز پڑھنے کا ارادہ اور قصد کیا جائے، اور بھی بہت سے مقامات پر پانی کے استعمال کا حکم دیا ہے جس طرح کہ آقا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم ناخن کاٹنے اور زیر بغل زیر ناف بالوں کی صفائی کی پر اُکید تاکید فرمائی ہے، نیند سے بیدار ہونے اور کھانا کھانے کے وقت دونوں ہاتھوں کو دھونے کی ہدایت فرمائی ہے، نیز مسواک کو بدوام و استمرار یوز کرنے کا حکم فرمایا ہے، منہ اور دانتوں کی صفائی اور سر کے بالوں کے منڈوانے، نیز پاخانہ و پیشاب کر لینے کے بعد سبیلین کو اچھی طرح صاف کرنے کی ہدایات فرمائی ہیں۔

جس طرح کے آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے "طب وقائی" سے متعلق سلسلہ ہدایات میں ہمیں ہر نماز میں اپنے اعضاء جسمانیہ کو حرکت دینے کا حکم فرمایا ہے، اور یہ بھی جسمانی و بدنی ورزش کی ایک قسم ہی ہے، اگر چہ مقصد و بالذات نہ ہو، لیکن اداءِ صلوۃ میں ہر حال میں حاصل ہوتی ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس پاکیزہ و حلال کھانوں کی حلت کو لے کر آئے اور برے و بدترین کھانوں کی حرمت کو بیان فرمایا ہے مثلاً: مردار اور خنزیر اور خون یہ سب اشیاء حرام قرار دی، اور کھانے اور پینے میں اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیا ہے اور ان دونوں میں اسراف اور حد سے تجاوز کرنے کو منع فرمایا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ جیسی اہم ترین و مفید ترین عبادت کی فرضیت کو لے کر آئے، اسی

کے ساتھ ساتھ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو امراض جسمانیہ کثیرہ کو دور کردیتا ہے اور روحانی وقوت عطا کرتا ہے، اور بھی بہت سے جسمانی فوائد کو حاصل کروادیتا ہے، نیز آپ نے اس شراب کو بھی ہمارے لیے حرام قرار دیدیا ہے، کہ جس کی نقصاناتِ صحیہ کو شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، اور نقصانات صحیہ کے علاوہ بھی دیگر کثیر الاضرار اور اسی کے ساتھ تمام ہی مسکرات، نشہ آور اشیاء کو حرام قرار دے دیا ہے، بہت سے علما کی رائے یہ ہے کہ تمباکو بھی ان مسکرات، نشہ آور چیزوں میں ہے، کیوں کہ اس کے نقصانات بھی عیاں اور ظاہر ہیں، جس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ختنہ کا بھی حکم دیا ہے کہ جو ان اسباب میں سے ایک سبب ہے کہ جو بہت بیماریوں کے لگنے اور پیش آنے سے بچالیتا ہے، ختنہ نہ کرنے سے جو مہلک بیماریاں جنم لے رہی ہیں جدید سائنسی تحقیقات نے بہت سے انکشافات واکتشافات واضح کردیے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کرنے اور ازدواجی زندگی کے ساتھ منسلک ہونے کی تعلیم دی اور تاکید فرمائی ہے اور نکاح کے منافع تندرستی جو جسم وبدن پر مرتب ہوتے ہیں۔ وہ مخفی اور پوشیدہ نہیں ہیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ سلم نے حائضہ ونفساء عورتوں سے اختلاط یعنی ہمبستری ومجامعت سے منع فرمایا ہے، اور اس حکم کی تعمیل میں جو فوائد صحیہ بدنیہ کثیرہ پنہاں ومضمر ہیں حدِ بیاں سے باہر ہیں، مزید برآں آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے زنا، لواطت وغیرہ جیسی خطرناک جراثیم لے کر اٹھنے والی برائیوں سے بھی دور رہنے کی پرکیدتاکید فرمائی ہے، کپڑوں اور مکانوں اور راستوں کو پاک وصاف رکھنے کا بھی حکم دیا ہے، میل وکچیل اور نجاست وگندگیوں سے کلی احتراز واجتناب کی تعلیم ارشاد فرمائی ہے:

”وأمرنا بالابتعاد الأمراض المعدية مع اعتقاد أنها لاتصيب إلا بإذن الله ــــــ الخ“۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدیاں امراض سے دور رہنے کا بھی حکم دیا ہے، لیکن ایک ایمان والے کو یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ یہ متعدی بیماریاں بناءِ اذنِ خداوندی اور بناء مشیت خداوندی دوسرے کو نہیں لگ سکتی ہے، اللہ پاک چاہے گا تو ہی بیماری آئے گی، ورنہ یہ ایمان وعقیدہ کے استحکام وپختگی کے خلاف عمل ہوگا، چناں چہ جب کسی علاقہ و شہر میں قصبہ وبستی میں طاعون (پلیگ) پھیل جائے تو ہمیں حکم ہے کہ وہاں نہ جائیں اور اگر ہم وہاں ہوں تو وہاں سے بھاگ کر غیر طاعون زدہ شہر میں ہرگز نہ جائیں، کیوں کہ موت کا تو ایک مقررہ وقت ہے وہ اپنے وقت پر آئے گی، تقدیر میں ہوگی تو موت آئے گی ورنہ موت آہی نہیں سکتی، لہٰذا راہِ فرار اختیار کرنے سے کیا فائدہ ہے یہ حکم اس لیے کہ ہم تک اس بیماری کے جراثیم منتقل نہ ہوسکے اور ہمارے ذریعہ سے دوسرے علاقے تک وہ بیماری پہنچ نہ جائیں (احتیاط بہر حال ازحد ضروری ہے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدی امراض میں مبتلاء مریضوں اور بیماروں سے کنارہ کشی کا حکم دیا ہے ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”و فرمن المجذوم فرارک من الأسد“ تم جزام زدہ شخص سے ایسے بھاگو جیسے کہ تم شیر بھاگتے ہو (یہ حکم ہے کمزور عقیدہ رکھنے والوں کے لیے ہے)۔ ورنہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مجزوم اور برص زدہ کے ساتھ کھانا تناول فرمایا ہے۔

میدان الطب العلاجی (طب علاجی کا فیلڈ):

نبی کریم صلی اللہ علیہ نے ہمارے لیے (تداوی) یعنی علاج ومعالجہ کو شروع قرار دیا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اُس کی طرف بلایا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کا حکم دیا ہے، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تداوو اعباد اللّٰہ فإن اللّٰہ لم یضع داءً إلا وضع معه شفاءً إلا الهرم" اے اللہ کے بندو! تم اپنے امراض و بیماریوں کا علاج ومعالجہ کرواتے رہو کیوں کہ بیماریاں اللہ پاک ہی نے رکھی ہیں، اور ہر بیماری کے ساتھ اُس کی شفاء بھی رکھی ہے، بجز بوڑھاپے کے، کہ وہ لاعلاج مرض اور بیماری ہے۔

لیکن یہ یاد رکھو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے محرمات، حرام کردہ چیزوں، مثلاً شراب وغیرہ کے ذریعہ علاج ومعالجہ کو ممنوع قرار دیا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: (ان اللّٰہ لم یجعل شفائکم فیما حرم علیکم) بہت سے علما نے اعضاء موتی سے انتفاع کو حلال قرار دیا ہے، زندہ مریضوں کے علاج کے لیے۔

دوسرے طرف ہم دیکھتے ہیں کہ "میدان طب علاجی کا" کے اندر کہ آپؐ نے بعض امراض اور بیماریوں کے لیے بہت سے نسخہ جات ذکر فرمائیں جیسے عسل یعنی شہد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علیکم بالشفاء العسل والقرآن" یہاں قرآن مجید اور شہد کو شفاء کا یکساں مظہر قرار دیا۔

اس شفاء کی مثال بخاری ومسلم اور ترمذی نے حضرت ابوسعید الخدریؓ اس مشہور روایت سے دی ہے جس میں اسہال کے ایک مریض کو بار بار شہد پینے کی ہدایت کی گئی، جب اس کے لواحقین نے کہا کہ شہد سے اسہال میں اضافہ ہورہا ہے تو خدائی کلام اور اس کے کامل ارشادات پر یقینِ کامل کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد گرامی ہے۔

"صدق اللّٰہ و کذب بطن أخیک" قرآن مجید نے شہد کی افادیت کے بارے میں فرمایا ہے: "یخرج من بطونها شراب مختلف ألوانه فیه شفاء للناس" "شہد کی مکھیوں کے پیٹوں سے مختلف قسم کی رطوبتیں نکلتی ہیں جن میں لوگوں کے لیے شفاء ہے۔ چوں کہ جمع کرنے کے دوران یہ رطوبتیں اس میں شامل ہوجاتی ہے اس لیے چھتے سے میسر ہونے والے شہد میں جملہ عناصر کے ساتھ یہ شفائی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ حضرت عوف بن مالک الاشجعی کی بیماری کا واقعہ ابوالعباس احمد بن علی العبیدی المقریزی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ بارش کا پانی، زیتون اور شہد تلاش کر کے لائے، اس کے جواز میں فرمایا قرآن نے بارش کے پانی اور زیتون کو مبارک قرار دیا ہے اور شہد کو شفاء کا مظہر وہ تینوں کو ملا کر پی گئے اور تندرست ہوگئے۔

السیوطی اور حمید بن زنجویہ نے حضرت عبداللہ بن عمر کے جسم پر پھنسیوں کا حال بیان کیا ہے نافع کہا ایسی حالت میں مٹھاس کا استعمال مناسب نہ ہوگا انہوں نے کہا کہ انہوں کہا علاج بہر حال شہد ہے چوں کہ قرآن کا فرمودہ غلط نہیں ہوسکتا اس لیے وہ شہد ہی سے شفایاب ہوئے۔ شہد میں ہر وہ چیز موجود ہے جو جسم انسانی کی ساخت میں استعمال

ہوتی اور اس کو ضرورت پڑ سکتی ہے، انگلستان کی سالفورڈ یونیورسٹی ڈاکٹر لاری کرافورڈ نے الرجک ایشنٹ ۲۳ اور (HAYFEVER) کے ۲۰۰ سو مریضوں کا علاج صرف شہد سے ۱۹۸۱ء میں کیا ہے۔ ڈاکٹر نا میں نے نمونیہ کے ایک مریض کو پانچ دن میں ایک کلو شہد پلا کر اور کسی دوائی کے بغیر شفایاب کر کے طب کے موقر رسالہ (Lancat) میں چھپوایا۔

الغرض! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کے پہلے طبیب ہیں جنہوں نے طبی لحاظ سے ایسی ہدایات فرمائی ہیں کہ آج کا جدید سائنس جتنی ترقی کرے اپنی جگہ، لیکن طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کئے بغیر رہتی دنیا تک ایجاد ہونیوالا ناقص و نا تمام وادھورا ہی رہے گا۔

طب نبوی کی مشہور کتابیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تندرستی کی بقاء اور بیماریوں کے علاج کے بارے میں بڑی ہی اہمیت کی لازوال ہدایات فرمائی ہیں، محدثین نے "کتاب الطب" کے عزال سے حدیث کی ہر کتاب میں علیحدہ ابواب مزین کئے ہیں، چناں چہ عبدالملک بن حبیب اندلسی نے امراض کے متعلق ارشادات نبوی کو "الطب النبوی" کے نام سے دوسری صدی ہجری میں علیحدہ مرتب کیا، ان کے بعد امام شافعی کے شاگرد محمد بن ابوبکر ابن السنی اور ان کے ہم عصر محدث ابونعیم اصفہانی ہیں، جنہوں نے تیسری صد کے اواخر میں طب نبوی کے ایسے مجموعے مرتب کے جن کیا اکثر روایات انہوں نے خود راویوں سے حاصل کیں، ائمہ اہل بیت میں علی بن موسیٰ رضا اور امام کاظم بن جعفر صادق نے اسی موضوع پر اسائل لکھ کر شہرت دوام پائی! چوتھی صدی میں محمد بن عبداللہ فتوح الحمیدی عبدالحق الاشبیلی! حافظ السخاوی ہے اور حبیب نیشاپوری نے طب نبوی کے مجموعے اپنی ذاتی کوششوں سے مرتب کئے مگر نا قدری علم سے یہ سارے مجموعے اب ناپید ہیں۔

ساتویں صدی ہجری سے نویں صدی ہجری کے دوران ابی جعفر المستغفری ضیاء الدین المقدسی، السید مصطفی للتیفاشی، شمس الدین البعلی، کمال ابن طرخان، محمد بن احمد ذھبی محمد بن ابو بن القیم، جلال الدین السیوطی، اور عبدالرزاق بن مصطفی الانطاکی نے ارشادات نبوی، کے گلدستے بنائے، الحمدللہ ان سب کی کاوش اب زیور طبع سے آراستہ ہو کر موجودہ دور میں موجود ہیں، البتہ ابن القیم کا مجموعہ سب سے ضخیم ثقہ اور مقبول ہے، انہوں نے اپنے عنوانات کا انتخاب بڑی محبت اور خلوص سے کیا ہے۔

محمد احمد ذہبی کا مجموعہ بھی اچھا ہے، مگر وہ درجنوں ایسی دواؤں کا تذکرہ کر گئے جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا اصحاب کرام تک ان کے پاس کوئی سند نہیں، انسوں کچھ علاج ملا اپنی طرف سے شامل کئے ہیں جن کی افادیت محل نظر ہے، السیوطی نے طب روحانی کے معاملہ میں ذاتی مشاہدات کو زیادہ شامل کیا ہے۔ اور "الطب النبوی" برائے نام ہے۔

قرآن کریم بہترین وظیفہ

قرآن کریم کو علم کے درجے میں دیکھو تو اعلیٰ ترین علم اس میں ہے، عمل کے درجے میں دیکھو اعلیٰ ترین عمل کی کتاب ہے، اس کا وظیفہ پڑھو تو وظیفہ کی بہترین کتاب ہے، اس میں سے حکمت نکالو تو بہترین حکمت کی کتاب ہے، آج اس کے علم وحکمت سے کتب خانے بھرے ہوئے ہیں۔

تقریر ضرورت اہمیت تعارف اور اسلوب

(مولانا) حذیفہ وستانوی
استاذ جامعہ اکل کوا

اللہ رب العزت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اور بے شمار خصائص وامتیازات سے اُسے سرفراز کیا، منجملہ اُن امتیازات کے ایک "خطابت، بیان، اور تقریر" بھی ہے، کیوں کہ انسان صرف اپنے ہی لیے عمل کرنے کا مکلف نہیں، بل کہ دوسروں کو بھی خیر کی طرف دعوت دینا، اس کے لیے ضروری ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا، جب کہ وہ "قوتِ گویائی، یا قوتِ تحریر" سے واقف ہو۔

عصرِ حاضر میں "آلات واُمورلغویۃ" (یعنی لغویات کی طرف لے جانے والے آلات اور اعمال) کی کثرت کی وجہ سے جہاں بہت ساری "علمی، دعوتی، فکری" میدانوں میں کمزوری واقع ہوئی ہے، وہیں "تقریر اور خطابی" میدان بھی اس کا شکار ہوا، خاص طور پر سب سے زیادہ ضرورت اس کی "طالبان علوم نبوت" کو ہے، مگر بڑے افسوس اور رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ میدان آہستہ آہستہ انحطاط کی طرف بڑھ رہا ہے، حالاں کہ ہر زمانہ میں اس کے فوائد اور اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا طلبہ سے عاجزانہ اور لجاجت کے ساتھ التماس ہے، کہ وہ اس جانب توجہ دیں، ہم کوشش کریں گے، کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی اہمیت کو بیان کریں، اور اخیر میں تقریر کرنے اور کامیاب مقرر کے گر بتلانے کی کوشش کریں گے۔

خطابت اور اسلام:

یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متضاد صفات کا حامل بنا کر پیدا کیا، انسان کو قوت شہوانیہ، قوت

غضبیہ اور قوت عقلیہ تینوں عطا کی، اب ان تینوں میں کچھ مثبت پہلو، اور کچھ منفی پہلو ہوتے ہیں، مثلاً قوت شہوانیہ کو اگر انسان اللہ سے، رسول اللہ سے، صحابہ سے، اولیاء اللہ، والدین، اپنی بیوی سے، محبت کرنے میں استعمال کرے، تو یہ مثبت پہلو ہوا، اور اگر عشق مجازی میں ناجائز تعلقات کے لیے استعمال کرے، تو یہ منفی پہلو ہوا؛ اسی طرح قوت غضبیہ کو، اگر ظلماً کسی کو مارنے، یا ایذاء رسانی میں استعمال کرے، تو یہ منفی پہلو ہوا، اور اگر جہاد فی سبیل اللہ میں استعمال کرے، تو مثبت پہلو ہوا؛ اب اللہ نے ان دونوں کے مقابلہ میں علم اور عقل عطا کی، جس کی بنیاد پر وہ اپنے اختیار کا صحیح مصرف متعین کرتا ہے، مگر صرف عقل وعلم انسانی وصول الی اللہ کے لیے ناممکن تھے، تو اللہ نے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو تذکیر کی غرض سے مبعوث کیا، کیوں کہ علم الٰہی کی برکت سے عقل اپنے صحیح توازن پر آتی ہے، اور جب عقل صحیح توازن پر آتی ہے، تو انسان ہدایت کو قبول کرکے، اپنی دونوں قوتوں یعنی قوت شہوانیہ، اور قوت غضبیہ کے صحیح مصرف کی تعیین کرتا ہے، اور جب صحیح تعیین ہوجاتی ہے، تو اللہ کی مرضی کے مطابق سب کام کاج شروع کردیتا ہے، یہاں تک "عبادت" کو صحیح ڈھنگ سے ادا کرکے، "تقویٰ وطہارت" اپنے اندر پیدا کرکے، ہر طرح کی "برائیوں" سے اجتناب کرتے ہوئے، اللہ تک رسائی حاصل کرلیتا ہے، اور یہی انسان کی اصل ترقی، اور کامیابی کی معراج ہے، اسی کامیاب راستہ اور محجۃ بیضاء کے لیے تذکیر وتحریر (تقریر وخطابت) امر ناگریز ہیں؛ اسی لیے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے لیے خطابت کو اللہ رب العزت نے لازم قرار دیا۔

ایک بزرگ تحریر فرماتے ہیں، کہ خطابت سنتِ انبیاء ہے، تمام انبیا علیہم السلام خطیب تھے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، دنیا وآخرت کے سب سے بڑے خطیب ہیں؛ حضور علیہ الصلوۃ والسلام قیامت کے دن بھی ایسے خطیب ہوں گے، جب کائنات کا ذرہ ذرہ مہر بلب ہوگا (یعنی خاموش اور بالکل ساکت وصامت ہوگا)، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "العلماء ورثۃ الانبیاء" میری امت کے علماء، انبیاء کے وارث ہیں۔ چناں چہ یہ شرف اور اعزاز علما کو حاصل ہوا، کہ انہیں ان کے ظرف وکمال کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت خطابت کا حصہ ملا۔
(صدائے محراب از ابتدائیہ ۱۱ر)

معلوم ہوا کہ خطابت یہ علما اور طلباء کے لیے از حد ضروری ہے، لہٰذا حتی المقدور ہمیں وارثین انبیاء ہونے کے ناطے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے طریقہ کی ادائیگی، اور تبلیغ کی غرض سے محنت کرکے سیکھنا چاہیے، یہ ہمارے "فرائض منصبی" میں داخل ہے، کیوں کہ "خطاب، تقریر، موعظت، تذکیر، نصیحت" ہی کے ذریعہ ہر عام وخاص تک "پیغام الٰہی" پہنچا کر، اسے "مقصدِ حیات"، "عبادت ایزدی" کی یاددہانی کرائی جاسکتی ہے؛ اسی لیے قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: "فذکر فإنّ الذکری تنفع المؤمنین" نصیحت موعظت اور تذکیر کیجیے، اس لیے کہ مومن کو نصیحت ہی سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس حکم کے فوراً بعد یہ مقصد مباح انسانی بیان کیا: "وما خلقت الجن والإنس إلا لیعبدون" میں نے انسان اور جن کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ تو سیاق وسباق کا تقاضا یہی ہوا کہ تقریر، موعظت وخطابت "فذکر" صیغۂ امر کی بنا پر، علماء اور طلباء پر فرض کفایہ ہے۔

خطابت اتنی اہم چیز ہے کہ ایک جلیل القدر نبی، سیدنا حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو، جب "انا ربکم الأعلی" کے دعویٰ کرنے والے "طاغیۂ عظیم" فرعون ملعون کی جانب ارسال کیا جا رہا تھا، تو انہیں محسوس ہوا کہ "دعوت الی اللہ" کے لیے، طلاقتِ لسانی، اور قوت بیانی کا ہونا ضروری ہے، اور میری زبان میں "عقدۃ" ہے، لہٰذا میں "دعوت الی اللہ" کے فریضہ کو حسن خوبی کے ساتھ انجام دینے سے قاصر رہوں گا، لہٰذا میرا کوئی ایسا معاون ہونا ضروری ہے، جو "دعوت" کے میدان میں، میدان خطابت کو سنبھالے، جس کے لیے ان کی نظر انتخاب، حضرت ہارون علیہ السلام پر پڑی، اور ارشاد فرمایا: "و اخی ھارون ھو افصح منی لسانا فارسلہ معی ردأ یصدقنی إنی اخاف ان یکذبون" میرے بھائی ہارون رواں بیانی میں مجھ سے بہتر ہیں، لہٰذا ان کو میرے ساتھ ارسال کر دیجئے، تا کہ وہ "زوربیان" کے ذریعہ، میری تصدیق کرے، اور میرے لیے ڈھال ثابت ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ نے نبوت اور دعوت کے لیے، بندے کو منتخب تو کرلیا لیکن زبان میں لکنت کی وجہ سے میں "دعوت" کا صحیح حق ادا نہ کرسکوں، اور یوں وہ عدم فہم کی وجہ سے تکذیب پر آمادہ ہو جائے، جس کا ذمہ دار میں خود ہو جاؤں۔

موسیٰ علی نبینا علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ مطالبہ اور دعا صحیح تھی، کیوں کہ اللہ نے ان کی دعا قبول کی، اور ہارون علیہ السلام کو نبی بنا دیا، اگر دعا صحیح نہ ہوتی تو ایسا نہ ہوتا، مگر ہوا، لہٰذا دعا کی صحت بے غبار ہوگئی۔

تیرے سخن سے دب گئے لاف وگزاف کفر کے
تیرے نفس سے بجھ گئی، آتش سحر سامری

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کے "معجزات"، اور حضرت ہارون علیہ السلام کے "قوت بیان" سے ایوان فرعون میں کہرام مچ گیا، اور آخر کار "انا ربکم الأعلی" کا دعویدار "قلزوم" میں ڈوب کر ہمیشہ ہمیشہ انسانوں کے لیے "سرمایۂ عبرت" بن گیا، اور مقولہ مشہور ہو گیا "لکل فرعون موسی" ہر فرعون یعنی باطل کے لیے، چاہے وہ کتنا ہی "سپر پاور" کیوں نہ ہو، بدترین انجام موسیٰ کے مقابلہ میں "غرق آبی"، اور لازمی اور سنۃ اللہ ہے، اور قرآن کا اعلان: "و لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی، لہٰذا آج بھی ضروری ہے کہ ہم معجزات نبویہ کو (یعنی قرآن و حدیث وغیرہ) کو لے کر خطبات اور تقریر سے، ان باطل طاقتوں کو زمیں بوس کر دیں۔

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ میں (اقبال)

اقبال ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ؎

شوق بے پرواہ ہو گیا فکر فلک پیما ہو گیا　　میری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے
ہزار چشمے ترے سنگ راہ سے پھوٹے　　خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کر

"زوربیان" کے سلسلہ میں "و لقد کرمنا بنی آدم" کی تفسیر کرتے ہوئے امام ضحاک نے یہاں تک کہہ دیا "ای کرمنا ما ینطق" یعنی اللہ رب العزت نے تمام مخلوقات پر فضیلت دی نطق اور البیان دے کر، اسی لیے ایک جگہ

پر توصاف ارشاد خداوندی ہے: ''خلق الانسان علمه البیان'' اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے ''البیان'' سکھایا یعنی ''زوربیانی'' عطا کی۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو، اللہ رب العزت نے کہا: ''ثم إنّ علینا بیانه'' یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن کے الفاظ کو نازل کرنے کے بعد، اس کا ''بیان'' بھی ہمارے ذمہ ہے، یعنی ہم آپ ہی کے قلب پہ ایسی ''زوربیانی'' کو وارد کریں گے، کہ الفاظ ہی کے ساتھ معانی بھی بیان کردیے جائیں گے۔ اور واقعی ایسا ہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین ''زوربیانی'' عطا کی گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایسا فصیح وبلیغ، اثر انگیز، فکر آمیز اور جامع ہوتا تھا، کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک مرتبہ فرمایا: ''أعطیت جوامع الکلم'' مجھے ''جوامع الکلم'' کا معجزہ عطا کیا گیا، گویا ''زوربیانی'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منجملہ معجزات میں سے ایک معجزہ شمار ہوتا تھا۔

قرآن نے خود اپنے بارے میں کہا: ''هذا بیان للناس و هدی و موعظة للمتقین'' یہ قرآن، بیان، ہدایت، اور نصیحت ہے متقیوں کے لیے۔

گویا پورا قرآن بھی اللہ کا خطاب ہے، بندوں کو، ویسے بھی قرآن کا اسلوب بھی خطابانہ ہی ہے، قرآن کہیں کہتا: ''یا ایها الناس''، کہیں کہتا ''یا أیها الذین امنوا'' کہیں امر کرتا بھی اور کہیں نہی، اور یہ سب اندازِ خطابت ہے۔

خطابت ایسی زبردست اثر انگیز شئ ہے کہ اگر اندازِ بیاں دلکش ہو، تو بڑے سے بڑا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی سے ایک چرب اللسان سے متنبہ کرتے ہوئے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا: ''و من الناس من یعجبک قوله فی الحیاة الدنیا'' کہ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں کہ اس کی ''زوربیانی'' اور چرب لسانی، آپ کو متاثر کردے۔

گویا اگر ''زوربیان'' انسان باطل بھی ہو اس سے لوگ متاثر ہوسکتے ہیں، جب کہ قرآن صاف نے کہہ دیا کہ مسلمان دنیوی اُمور پر اُبھارنے والے، اور دھوکہ دینے والے چرب اللسان، لوگوں سے بچتے رہنا چاہیے۔ ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا: ''إنّ من البیان لسحرا'' اور بہت سے لوگوں کے کلام میں سحر انگیزی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خطاب انسان کے لیے ازحد ضروری ہے، خطابت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی انسان کی۔ ہر زمانہ میں خطابت انسان کی زندگی کے لیے لازمی عنصر میں شمار ہوتا رہا ہے، ہر زمانہ، ہر معاشرہ میں اہمیت کا حامل رہا ہے، تو آیئے ہم ایک نظر تاریخِ خطابت پر ڈالتے ہیں، کہ خطابت کی تاریخ کیا ہے؟ مشہور خطباء کون گذرے ہیں؟؟؟؟

تاریخ خطابت :

خطابت ''تکلم'' کی ہی ایک قسم ہے، اور اللہ کی صفات میں سے ایک [illegible] ''تکلم'' بھی ہے، لہٰذا خطابت بھی اس میں شامل ہے۔ جب خطابت اس میں شامل، تو ظاہری بات ہے کہ خطابت کی تاریخ صرف انسان اور مخلوق سے متعلق نہیں ہے، بل کہ خود خالق بھی اس سے متصف ہے۔ قرآن کلام اللہ ہے، اور کلام اللہ مخلوق نہیں، بل کہ صفت خالق ہے، اور خالق کی صفات ازلی ہے، لہٰذا خطابت بھی گویا ازلی ہے؛ اور انسان کے خطابت سے، بہت بہت تو انسان یا جنات مستفید ہوتے ہیں، مگر اللہ کی ذات تو ایسی ہے کہ جمادات، نباتات، حیوانات، سب اس کے محتاج، اور زیرِ نگیں مخلوق ہیں، لہٰذا اللہ کا خطاب تو سب کے لیے قابلِ انتفاع ہے۔

اللہ رب العزت نے انسان کو جو ''خلیفۃ اللہ'' بنا کر محدود پیمانے پر اپنی بہت سی صفات سے اس کو متصف کیا، اس میں علم کے ساتھ ساتھ خطابت بھی ہے، اس لیے کہ علم ہو، اور خطابت و کتابت نہ ہو، تو وہ جامد رہتا ہے، اور اگر دونوں، یا کم از کم دو میں سے ایک ہو، تو علم متعدی ہوجاتا ہے، اور ان دونوں میں بھی خطابت زیادہ نافع ہے، اس لیے کہ عامی اور عالم ہر ایک اس سے مستفید ہوسکتا ہے، جب کہ کتابت سے عالم اور پڑھا لکھا ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے؛ البتہ ایک اور زاویہ سے کتابت بھی زیادہ مفید ہے، وہ یہ کہ خطابت صرف معاصرین کے لیے اور عصر حاضر میں تو کیسٹوں، اور سیڈیوں وغیرہ کے ایجاد کی وجہ سے وہ بھی کتابت کی طرح مفید ہوگیا، کہ کتابت سے فائدہ معاصرین اور بعد میں آنے والے بھی اٹھا سکتے ہیں۔

اس سے پہلے واضح کیا جاچکا ہے، کہ خطابت انسان کے لیے ایک لازمی عنصر ہے، خاص طور پر ''دعوۃ الی اللہ''، ''امر بالمعروف نہی عن المنکر'' ''ترغیب وترہیب'' ''تذکیر و نصیحت'' کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتا ہے، بل کہ روح کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ انبیاء، صحابہ وغیرہ، خطابت کو اسی کے لیے تجویز کرتے رہیں؛ البتہ بادشاہوں، امیروں وزیروں، عہدہ داروں، سیاست دانوں، جاہ پسندوں نے بھی اپنی اپنی غرض کے لیے ہر زمانہ میں اسے منتخب کیا، اور اب بھی کرتے چلے جارہے ہیں۔

اَللّٰھم اجعلنا من الزمرۃ الاولی و لاتجعلنا من الثانیۃ و ارض عنا یا ربنا و یا خالقنا و مالکنا و الٰھنا۔

آمین!

فن خطابت کا اہتمام اور با قاعدہ آغاز:

محمد صادق کرباسی اپنی کتاب ''فن الخطابۃ توأم الانسان و الحضارۃ'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''و یستفھم من نص نبوي شریف ان النبی ابراھیم علیہ السلام المولود فی الکوفۃ فی العام ۴۲۳۷ عام الھبوط کان قد اتخذ منبراً للخطابۃ ـــــــ ففی الحدیث الشریف ''ان اتخذ منبراً کما اتخذہ أبی ابراھیم و ان اتخذ عصا فقد اتخذھا ابی ابراھیم''۔

صریح حدیث پاک سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ نبی اللہ و خلیل اللہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام (جن کی

ولادت کوفہ ۳۶۴۲ عام الہبوط یعنی آدم علیہ الصلوۃ والسلام کے نزول وہبوط مذکورالآخرہ کاتین اور قبل مسیح یعنی حضرت عیسی علیہ السلام سے ۲۲۴۳ سال قبل ہوئی)۔کیوں کہ حدیث شریف میں ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب منبر بنانے کا حکم دیا، تو کہا، منبر بناؤ جیسا کہ میرے جدِ امجد، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے منبر بنایا تھا، اور عصا کا بھی انتظام کرو، کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عصا بھی بنایا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام نے اہتمام کے ساتھ منبر بنا کر، باقاعدہ اس پر بیٹھ کر، خطاب دینا شروع کیا، گویا آج سے اندازاً ۹۸۷۹ سال قبل منبر بنا کر، اس پر خطبہ کا آغاز ہوا، مگر قرأت، علم، وغیرہ کی طرح، اسلام نے خطابت کو بہت اونچا، اور رفیع عطا کیا، یہاں تک کہ خطبہ کو عبادت قرار دیدیا، اور جمعہ اور عیدین میں، اسے واجب اور لازم کر دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اور خطابت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں دعوتِ توحید کا صور پھونکا، تو حق و باطل کی کشمکش کا آغاز ہوا، پاسبانِ توحید اور علمبر دارانِ جاہلیت کی اس کشمکش میں خطابت کو غذا ملی، اور خوب پھلی پھولی ــــــــــ غزوات کا دور آیا تو زبان کا فن اور تلوار کی طاقت ہم رکاب رہی ــــــــــ اسلام کا بول بالا ہوا، خلفاء و امراء کا دور آیا تو خطابت کی شان دوبالا ہوگئی ــــــــــ فکر انتشار کے عہد میں وہ ترقی کے اوج ثریا پر پہنچ گئی، شہادت عثمانؓ کا فتنہ ہو، مشاجرات صحابہ کا محدود زمانہ ہو، خوارج اور شیعوں کی بغاوتیں ہو، اور فکری و سیاسی رجحان رکھنے والی پارٹیاں ہوں سبھی کے لیے خطابت ایک کارگر ہتھیار تھا، مگر جب بھی فکر و قلم اور زبان و بیان کی آزادی پہ پہرے بٹھائے گئے حکومت مخالف عناصر کو کچلا گیا تو خطابت کمزور ہوتی چلی گئی۔

اہل عرب اور خطابت:

اہل عرب کے یہاں کلام دو قسم میں منقسم ہے:　　　　۱/نثر　　　۲/نظم

نظم: باوزن مقفّٰی کلام کو کہا جاتا ہے ــ اور ــ **نثر**: جو باوزن اور مربوط مقفّٰی نہ ہو۔

پھر نثر جو کہ کلام میں اصل ہے، اس لیے کہ کم سے کم تکلف اور زیادہ سے زیادہ واضح بات انسان نثر ہی کے ذریعہ بیان کر سکتا ہے، اس کی تین قسمیں ہیں:　　　۱/المحادثۃ، ۲/الخطابۃ، ۳/الکتابۃ

محادثۃ کہتے ہیں، لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے اپنی ضرورتوں اور کام کاج وغیرہ کے بارے میں بات چیت کرنا، اسے "لغۃ التخاطب" بھی کہتے ہیں۔

اور "الخطابۃ" کسی کا دلنشین انداز میں جچے تلے الفاظ، اور عمدہ تعبیرات کے ساتھ لوگوں کے مجمع کے سامنے کسی اہم عنوان پر گفتگو کرنا۔

اور الکتابۃ کہتے ہیں کلام نفسی (یعنی اپنے مافی الضمیر) کو حروف کو مدلول بنا کر نقوش کی صورت عدم تکلم کے

ارادے کے ساتھ، صفحۂ قرطاس پر بکھر دینا پھر اس میں "النثر المرسل، السجع، ضروب الامثال، الحلم "وغیرہ الگ الگ صورتیں نکلتی ہے۔

زمانہ جاہلیت اور خطابت:

اہل عرب کل تین طبقات میں منقسم رہے ہیں، "العرب البائدۃ" اس میں قوم عاد، قوم ثمود، قوم عمالقہ وغیرہ۔ ۲/ "العرب العاربۃ" بنو قحطان، قبیلہ جرہم ان کا اصل مسکن یمن رہا ہے وغیرہ۔ ۳/ "العرب المستعربۃ" جیسے بنو اسماعیل، یہ اصل تو بابل کے تھے، مگر "العرب العاربۃ" (یعنی اصل عرب) سے مصاہرت، اور دیگر رشتے کی وجہ سے اور ساتھ ہی ایک ساتھ سکونت پذیر ہونے سے "عرب مستعربہ" (یعنی عرب بنے ہوئے) کہے جانے لگے، پھر ان دونوں کے، اور دیگر اقوام کے امتزاج، اور گھل مل جانے سے، ایک اور قسم وجود میں آئی، جسے "المخذثون" کہا جاتا ہے۔

دنیا کی زبانوں میں سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ "وسعت" کی حامل اگر کوئی زبان ہے، تو وہ عربی زبان ہے، قحطانیین جو اصل عرب کہے جاتے ہیں، جب انہوں نے یمن سے ہجرت کر کے "الجزیرۃ العربیۃ" میں قیام کیا، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مصاہرت اختیار کی، تو دونوں دوش بدوش زندگی بسر کرنے لگے، جیسے جیسے زمانہ بیتا گیا، ویسے ویسے تجارت وغیرہ کے میدان وجود میں آتے رہے، سوق عکاظ، سوق مجنۃ، سوق ذوالمجاز وغیرہ، اسی کی یادگاریں ہیں۔

ان اسواق کے وجود میں آنے کے بعد یہ لوگ سال میں ایک بار ان مذکورہ مقامات پر جمع ہونے لگے، آہستہ آہستہ ان بازاری میلوں میں آپسی جھگڑوں کے فیصلے ہونے لگے، پھر کچھ مدت بعد "حسب نسب" پر فخر کرنے کے لیے، ہر قبیلے کے شاعروں نے اپنے اپنے قبیلوں کی "مدح سرائی" اور "تفاخر" شروع کردیا۔ اسی طرح زمانہ گذرتا گیا، اور آخر کار ایک مدت کے بعد، جب آپس میں جنگ وجدال شروع ہوا، تو قبائل کے سرداروں نے عصبیت کی دعوت دینے کے لیے اور قومیت کی حمایت کے لیے، خطبوں اور تقریروں کے ذریعہ اپنی اپنی برادریوں کو ابھارنا شروع کردیا، اور یوں اہلِ عرب میں "خطبہ بازی" کا بھی آغاز ہوگیا۔

زمانہ جاہلیت کے مشہور خطباء اور مقررین:

قُس بن ساعدہ، زمانہ جاہلیت کے زبردست شعلہ بیاں خطیب شمار ہوتے ہیں، قُس بن ساعدہ کے خطبہ کا ایک اقتباس پڑھیے اور جھومتے چلے جایئے: "ایھا الناس!، اسمعوا!، و وعوا!، انظروا!، واذکروا!۔

من عاش مات و من مات فات و کل ماھو آت آت۔

لیل داج، و نھار ساج و سماء ذات ابراج

الا ان ابلغ العظات السیر فی الفلوات و النظر الی محل الاموات

ان فی السماء لخبرا وان فی الارض لعبر

مالی آرا الناس یذھبون فلا یرجعون۔۔۔الخ۔(نحو خطبات اسلامی:ص ۱۷۲)

اسی طرح نعمان بن منذر، کعب بن لوی، ذو الاصبع العدوانی، حرثان بن محرث، قیس بن حارثہ، خویلد بن عمر الغطفانی، اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، حارث بن عباد، قیس بن مسعود، خالد بن جعفر، علقمہ بن علاثہ، عامر بن الطفیل، عمرو بن شرید، عمرو بن معدیکرالزبیدی، حارث بن ظالم المری۔(جواہر الادب:۲۳۷)

اسلامی عہد کے مشہور خطباء ومقررین:

عہد اسلامی تاریخ عرب کا سب سے روشن دور شمار ہوتا، کیوں کہ قرآن کریم کے اسی زبان میں نازل ہونے کے بعد، عربی زبان جواب تک ایک علاقہ میں محدود تھی، ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی، اور یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اسلام دنیا میں ''انقلاب خیر'' لے کر آیا تھا، اور کسی بھی انقلاب کے لیے، اور کسی بھی دعوت کو عام کرنے کے لیے، چاہیے وہ سیاسی ہو، یا دینی ومذہبی ہو، خطبات اور تقریر کے بغیر چارۂ کار نہیں، اسلام نے بھی اسی قدرتی قانون کو اپناتے ہوئے خطبات کو، ایک خاص مقام دیا، اور اسے ''عبادت'' کے زمرے میں شامل کردیا، بس پھر تو دیکھنا ہی کیا، دورِ اول میں اسی خطبات نے دعوتی مشن میں زبردست رول ادا کیا۔

اسلامی عہد میمون کے سب سے عظیم اور سب سے پہلے خطیب، خود صاحبِ دعوت وشریعت خاتم الانبیاء، افصح ولد آدم سیدنا، وقدوتنا واامامنا، حبیبنا، حبیب اللہ، حضرت محمد مصطفی واحمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار خطبات دیے۔

مصر قاہرہ کے ایک فاضل نے ''خطب الرسول'' صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ۵۷۴ خطبات کوایک ہی کتاب میں جمع کرکے بڑا عمدہ، کارنامہ انجام دیا ہے، اللہ محمد خلیل الخطیب کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے، آپ ان خطبات کو پڑھیں گے، تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گے، اور بے ساختہ آنسوں کی لڑی، آپ کے رخصار پر بہہ پڑے گی، بطور نمونہ کے ایک خطبہ کے چند اجزاء حاضر ہیں۔

یا معشر الأنصار! لم یمنّ اللّٰہ علیکم بالإیمان، وخصکم بالکرامۃ، وسماکم بأحسن الأسماء انصار اللّٰہ وأنصار رسولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، ولو لا الھجرۃ لکنت امرئ من الأنصار، ولو سلک الناس وادیاً وسلکتم وادیاً سلکت وادیکم، أفلا ترضون أن یذھب الناس بالشاء والنعم والبعیر وتذھبون بہ رسول اللّٰہ________فقال الأنصار رضینا، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لو اجبتونی بغیر ھذا القول لقلت صدقتم، لو قلتم الم تأتنا طریداً فآوینٰک، ومکذباً فصدقناک، ومخذولا فنصرناک وقبلنا ماردالناس علیک، لو قلتم ھذا لصدقتم فقالت الأنصار بل للّٰہ ولرسولہ المن علینا والفضل علینا وعلی غیرنا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا زبردست ،خطبہ دیا کہ ''انصار'' پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے ،یہاں تک ان کے رونے کو دیکھ کر ،خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چشمہائے مبارکہ اشکبار ہوگئی ،ایسے تو کئی مواقع سیرت کی کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز بیاں ،تو ایسا اثر انگیز ،اور فکر انگیز ہوتا تھا ،کہ ابتدائی دور میں کفار مکہ نے آپ کو''ساحر'' تک کہہ دیا ،کسی نے ''شاعر'' کہا ،کسی نے ''کاہن'' یہ محض اس لیے کہ جو شخص بھی آپ کی بات سنتا ،آپ کا ہو کر رہ جاتا ،اتنی اثر انگیزی اس لیے تھی کہ ،اولاً تو نبی ہی نہیں نبیوں کے سردار تھے؛ ثانیاً آپ کو قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ فصیح کلام کا ملکہ عطا کیا گیا تھا؛ ثالثاً آپ اخلاق حمیدہ کے سراپا مجسم تھے؛ رابعاً آپ کے قول اور فعل میں مکمل یکسانیت تھی؛ خامساً آپ لڑھنے والے دل کے مالک تھے وغیرہ وغیرہ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ''لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ أسوة حسنة'' پر عمل درآمد کرتے ہوئے ،صحابہ میں بھی بے شمار جلیل القدر ،خطباء ،اور مقررین پیدا ہوئے ،جن میں سرفہرست اشرف الخلائق بعد الانبیاء سیدنا حضرت عبداللہ بن عثمان یعنی ابو بکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ ہیں ،جن کے فصیح و بلیغ ،خطبات کو بھی ،سیر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ کیا گیا ہے ،اسی طرح سیدنا حضرت عمر بن الخطاب الفاروق ،اور سیدنا ذوالنورین ،حضرت عثمان بن عفان المظلوم الشہید رضی اللہ تعالی عنہ ،اور حضرت علی بن طالب المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ،ان کے علاوہ حضرت سحبان بن وائل ،حضرت امیر معاویہ ،ثابت بن قیس آپ کو خطیب الانصار اور خطیب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی کہا جاتا تھا ،انس بن مالک بن النضر ،اسلع بن شریک بن عوف اشجعی ،ثعلبہ بن عبدالرحمن انصاری ،ابوذر جندب بن جنادہ ،عبداللہ بن رواحہ ،عبداللہ بن مسعود ،عقبہ بن عامر ،قیس بن سعد انصاری ،مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اسلام کے اس صدر اول کے بارے میں صاحب ''جوہر الادب '''' معلم البیان شیخ احمد بن ابراہیم الہاشمی'' فرماتے ہیں: دنیا کی تاریخ کا کوئی دور اتنا سنہرہ نہیں ہوگا ،جتنا یہ دور خطابت کے اعتبار سے گذرا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی دور بھی ایسا نہیں گذرا جس میں بیک وقت اتنی وافر مقدار اور راتنے قادر الکلام خطباء ہوئے ہوں ،صحابہ نے دنیا میں اسلام اپنے کردار اور اپنے زور بیاں اور خطابت سے اتنی تیزی کے ساتھ پھیلایا کہ مسلمانوں کا خلیفہ ان کا امیر ،ان کا سالار ،ان کا جنرل ،ان کا قاصد ،ان کا سفیر ،سب زور بیانی کے بام عروج کو پہنچے ہوئے ہوتے تھے۔(جواہر الادب :ص ۴۰۷ ،آزاد ترجمانی)

اس کے بعد بھی زیاد بن ابیہ ،حجاج بن یوسف ،طارق بن زیاد ،ہارون الرشید ،یہ سب قرون اولیٰ کے نامور مقررین و خطباء ہوئے ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا ،کہ خطابت بنی نوع انسانی کے لیے کتنی ضروری ہے ،اور ہر دور میں

اس کا کیسا کردار رہا، خاص طور پر اسلام اور مسلمانوں نے اس کو کتنی اہمیت دی، الغرض موضوع بڑا طویل مجھے اس لیے لکھنا پڑا کہ طلباء و علماء میں خطابت و تقریر کی اہمیت بے حد کم ہو چکی ہے، اور ہم طبقۂ مدارس اسے یا تو اپنا فریضہ نہیں سمجھتے، یا عمداً اس سے روگردانی کرتے ہیں، جو ایک نامناسب طرز ہے۔

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نا دیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

وارث انبیاء ہونے کا دعوی اور خطابت سے فرار ہے؟

تعجب اور افسوس ہے کہ ہمارے طبقۂ علما و طلبہ پر کہ وہ وارثین انبیا کا دعویٰ کرتے ہیں اور اُن میں سے اکثریت فریضۂ خطابت سے نابلد اور بے فکر ہیں۔ (اللھم اھدنا و اھد الناس جمیعا)

خطابت کا تعارف

خطابت کیا ہے؟

تعریف: خطابت کے لغوی معنی ہیں: وعظ کہنا، خطبہ پڑھنا۔

علامہ ابن رشد اپنی کتاب، "تلخیص الخطابۃ" میں فرماتے ہیں: "خطابت نام ہے اس فن کا جس کی مدد سے اپنی بات دوسرے سے کہی اور منوائی جاسکتی ہے۔

گویا اس سے مراد وہ بیان ہے جو دلوں کو گرمانے، کسی بات کو واضح کرنے، کسی امر کا یقین دلانے، اثر پیدا کرنے، ترغیب دینے، یا سامعین کو کسی خاص عمل یا روش پر آمادہ کرنے میں مدد دے۔

خطابت بے حس قوموں کو چونکاتی ہے، مردہ جذبات کو جگاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے، دکھ میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنواتی ہے، گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے، یہ عوام کے جمگھٹوں کو پر کیف، غم و مسرت کی محفلوں کو کامیاب اور دینی و سیاسی جلسوں کو پر لطف بنا دیتی ہے۔

(رہنمائے خطابت: ص ۲۱)

خطابت کی اقسام

پہلی تقسیم:

بنیادی طور پر خطابت کی چار قسمیں ہیں جو فنی اعتبار سے درجہ بدرجہ بالترتیب یوں ہیں:

(۱) مکتوبی (۲) حفظی (۳) اعدادی (۴) ارتجالی (فی البدیہہ)

(۱) خطابت مکتوبی: اس سے مراد وہ تقریر ہے جو پہلے سے لکھ لی گئی ہو، اور سامعین کے سامنے پڑھ دی جائے،

اس میں کسی ایسی بات کے زبان سے نکل جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا جسے کہنا مقصود نہ ہو۔ یہ بالکل ابتدائی نوع ہے
۔

(۲) خطابت بالحفظ: اس سے مراد وہ خطابت ہے جو تحریر کی مدد سے نہیں، حافظے کے وسیلے سے دہرائی جائے، دوسرے لفظوں میں اسے رٹی ہوئی تقریر کہتے ہیں۔ یہ قسم فنی اعتبار سے مبتدی کی مشق کے لیے تو ٹھیک ہے، لیکن اصل فن میں اس کی چنداں حیثیت نہیں۔ فنِ خطابت کا اظہار اگلی دو قسموں میں ہوتا ہے۔

(۳) خطابت اعدادی: یہ وہ خطابت ہے جس میں مواد اکٹھا کر کے پہلے سے تقریر کا ذہنی خاکہ تیار کرلیا جاتا ہے، اکثر مقرر آسانی اور سہولت کے خیال سے اہم نکات کو کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ لیتے ہیں اور دوران تقریر اس پر نظر ڈالتے رہتے ہیں۔ اس میں نہ تو تقریر کو لکھ کر حرف بحرف پڑھ دیا جاتا ہے اور نہ لکھی ہوئی تقریر کو رٹ کر سنایا جاتا ہے۔ یہ پہلی دو قسموں کے درمیان کی ایک چیز ہے۔

(۴) خطابت ارتجالی: فی البدیہہ اس تقریر کو کہتے ہیں یعنی کسی موضوع پر بغیر کسی تیاری کے دفعتًا برجستہ بولنا، ارتجالی خطابت انسان کو دی گئی نعمتِ نطق کا نقطہء کمال ہے۔ یہ عوام الناس کو متاثر کرنے کا بڑا اچھا ذریعہ ہے۔ تبلیغ کے لیے بھی یہ بہت مفید ہے۔

چناں نچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامیاب مواعظ مبارکہ میں جو قوت پائی جاتی تھی وہ ارتجالی خطابت کی غیر معمولی تاثیر کا نقطہء عروج تھی۔ یہ معجزانہ قوت آپ کے خلوص، یقین، جوشِ ایمان اور روحی تڑپ سے دو چند ہو جاتی تھی۔

ممتاز مقتدر مذہبی و سیاسی رہنما مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری اور تبلیغ کے اکابرین ارتجالی خطابت کرتے تھے اور اس میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

وعظ اور بیان کی مشق عموماً تیسرے طریقے سے شروع ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ چوتھی قسم جو اصل کمال اور مقصود ہے پر عبور حاصل ہو جاتا ہے، لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ مبتدی کو خطابت اعدادی کی ہمت نہ ہو رہی ہو تو اساتذہ اور نگراں حضرات پہلی یا دوسری قسم سے مشق کی ابتدا کرواتے ہیں اور رفتہ رفتہ تیسری قسم پر لے آتے ہیں۔

دوسری تقسیم:

خطابت اور وعظ کی ایک تقسیم موضوع کے لحاظ سے ہے۔ اس اعتبار سے بھی اس کی چار قسمیں بنتی ہیں:

(۱) درس قرآن و حدیث　(۲) اصلاحی بیان　(۳) فکری خطاب　(۴) عام تقریر۔

☆۔۔۔۔۔درس قرآن و حدیث کسی آیت و حدیث کے ترجمہ و تشریح، نکات و معارف اور اس سے ملنے والی حکمت و موعظت، عبرت و نصیحت یا سبق و ہدایت پر مشتمل ہوتا ہے۔

☆۔۔۔۔۔اصلاحی بیان، عقائد و اعمال کی اصلاح، بدعات و رسومات کی تردید، رسوم و منکرات چھڑوانے کے لیے کی گئی مخلصانہ دعوتی کوشش کو کہتے ہیں۔ اخلاق حسنہ کے حصول کی ترغیب اور عادات رذیلہ چھڑوانے

کے لیے اس سے بہتر ذریعہ نہیں۔علمائے اسلام نے اپنی اصلاحی ودعوتی کاوشوں کوالاخریٰ ذریعہ ۱۴۳۲ھ یاب بنایا ہے۔

☆ ــــــــ فکری نشست سے خطاب خالصۃً علمی وفکری کاوش ہے۔اس میں سطحیت وجذباتیت کا گذر نہیں۔اس میں مقرر اپنے وسیع مطالعہ اوراعلیٰ ذہنی قوتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے تاریخی وزمینی حقائق، اہل علم کی آراء اور مستند اعداد وشمار کی مدد لیتے ہوئے مدلل تجزیے اور جاندار تبصرے اور کارآمد تجاویز کے ذریعہ سامعین کے علم ودانش میں اضافہ کرتا ہے،ان کے ذہن وفکر کو ایک رخ دیتا اور لائحہ عمل تجویز کرتا ہے۔عام طور پر سیمینار، کانفرنس یا فکری نشست سے خطاب کورس کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

☆ ــــــــ عام تقاریر میں دینی وسیاسی بیانات، اجتماعات وجلوس سے خطاب اور مختلف محافل ومجالس میں کی جانے والی وعظ وتقاریر آتی ہیں۔جمعہ کے بیانات کو بھی اسی نوع میں شامل کیا جاتا ہے۔اس ہفتہ واری مجلس میں معلومات کی فراہمی سے زیادہ احوال کی اصلاح عوام کے لیے زیادہ مفید اور موثر ہوتی ہے۔اس لیے اس میں ملکی حالات پر تبصروں کی بجائے عوام کی دینی ذہن سازی اور مذہبی اصلاح وترقی کا کام لینا چاہیے۔

درس قرآن وحدیث کی تیاری کے حوالے سے کتاب کے آخر میں دو مستقل باب دیے گئے ہیں۔بقیہ اقسام کے آداب واصول ملتے جلتے ہیں۔بس موضوع اور غرض وغایت کے لحاظ سے تھوڑا بہت فرق ہے۔ایک پر دسترس حاصل کر لینے سے دوسرے پر بھی عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔(ایضا،ص ۳۲ تا ۳۴)

تقریر کی تیاری کیسے کریں؟

تقریر کی تیاری کے پانچ مراحل:

جب آپ کو کسی موضوع پر تقریر کرنے کو کہا جائے تو اس کی تیاری کے لیے بالترتیب ذیل کے پانچ مراحل پر عمل کیجیے۔ان شاء اللہ تقریر تیار ہو جائے گی۔

مواد کی فراہمی:

سب سے پہلے اس موضوع کے متعلق آیات قرآنی، احادیث نبوی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات، بزرگان دین کی حکایت، منفرد اور اچھوتے نکات اور ذاتی مشاہدات تاثرات ترتیب وار جمع کریں۔پھر موضوع کی مناسبت سے ایک آدھ لطیفہ، چٹکلہ اور تین چار اشعار تلاش کر لیں تاکہ انہیں مناسب جگہ ٹانکا جا سکے۔اس کام کے لیے آپ کو دو چیزیں کام آئیں گی، ذاتی یادداشتیں اور کتب بینی۔

ذاتی یادداشتیں:

خطابت کی بنیاد علم ہے اور یادداشتیں انسان کے لیے علم کا سرمایہ ہوتی ہیں۔کسی بھی موضوع سے متعلق تقریر

تیار کرتے وقت مقرر کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی ذاتی یا داشتوں کو کھرچے اور کریدے۔ ذہن کے نہاں خانوں میں موضوع سے متعلق اسے بہت سا مواد اور اشعار بکھرے پڑے ملیں گے۔ ان سب کو وہ احاطہ تحریر میں لے آئے۔

کتب بینی:

دوسرے مرحلہ میں وہ اپنے وسعت مطالعہ پر نظر دوڑائے کہ متعلقہ موضوع پر اس نے کن کن کتب اور کن کن رسائل میں کچھ پڑھا تھا؟ ممکن ہو تو دوبارہ ان کتب سے استفادہ کرے۔ ورنہ جو کچھ یاد ہے اسے ہی آئینہ تحریر میں اتارے۔ مزید مطالعہ کے لیے وہ اپنے ادبی دوستوں اور اساتذہ و اہل علم سے رہنمائی حاصل کرسکتا ہے، کہ اسے کون سی کتب پڑھنی چاہیے؟ اب آگے بڑھنے سے پہلے تین چیزیں مزید منتخب فرمالیں، تاکہ تقریر کے لیے درکار مواد مکمل ہو جائے۔

ایک تو مختصر و منفرد الفاظ پر مشتمل خطبہ؛ دوسرے غیر روایتی اور خوبصورت الفاظ پر مشتمل آغاز؛ تیسرے تقریر کے خلاصہ اور واضح پیغام پر مشتمل بامعنی اور دل کش اختتام۔ یہ تین چیزیں بھی اگر متاثر کن اور معیاری ہیں، تو سمجھئے کہ آپ نے پچاس فیصد کام، کامیابی سے مکمل کرلیا ہے۔

اب ذرا یادداشت پر نظر دوڑائیے۔ آپ کے پاس بالترتیب یہ دس چیزیں جمع ہوچکی ہیں، جو کسی بھی اچھی تقریر کے بنیادی عناصر ہوتی ہیں:

(۱) خطبہ (مختصر و منفرد)
(۲) افتتاحی الفاظ (غیر روایتی)۔
(۳) آیات قرآنیہ۔
(۴) احادیث نبویہ۔
(۵) مستند واقعات۔
(۶) کوئی منفرد خیال یا اچھوتا نکتہ۔
(۷) ذاتی مشاہدات و تاثرات۔
(۸) لطائف، چٹکلے۔
(۹) موضوع سے متعلق معیاری اشعار۔
(۱۰) بامعنی اور خوبصورت اختتام۔

یاد رکھیے! یہ سب چیزیں ہر تقریر میں لازمی نہیں لیکن اچھی اور معیاری تقریر کا قوام بنیادی طور پر ان ہی دس عناصر سے تیار ہوتا ہے۔

ایک چبھتا ہوا سوال:

ممکن ہے یہاں پہنچ کر طالب علم کے دل میں سوال پیدا ہو کہ کسی مقابلے میں شریک تمام ہی امیدوار یہی چیزیں تیار کرکے لائیں گے تو میری کامیابی کی کیا ضمانت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ضمانت دو چیزوں میں ہے: انفرادیت اور مشق۔ یعنی آپ نے آغاز غیر روایتی انداز میں کیا، الفاظ کے انتخاب میں سلیقے کا مظاہرہ کیا۔ کوئی ایسا منفرد نکتہ یا اچھوتا خیال پیش کیا جس تک دوسروں

کا ذہن نہیں پہنچ سکا۔ آپ کا لہجہ پراعتماد اور انداز و اطوار اصولوں کے مطابق تھے تو یہ آخری چیز حل کر آپ کو سبقت دلا سکتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کی مشق کیسی تھی؟ جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی یا نہیں؟ اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے آپ تقریر کو پکاتے اور رواں کرتے تھے یا نہیں؟ یہ چیز ایسی ہے جو (اس مرتبہ نہیں تو اگلی مرتبہ) کامیابی کا تاج آپ کے سر پر سجا کر چھوڑے گی۔ آزمائش شرط ہے۔

(۲) خاکہ سازی:

اس مرحلہ میں طالب علم جو کچھ جمع کر چکا ہے اس کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے۔ حسن ترتیب کے بغیر مقرر کو پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ اسے بات کہاں سے شروع کرنی ہے اور کس موڑ پر جا کر ختم کرنی ہے؟ خاکہ مرتب کئے بغیر مائیک کے سامنے جانا اندھیرے کمرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات ہے۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا، خطیب خواہ کتنا بڑا عالم اور صاحب مطالعہ شخص ہی کیوں نہ ہو، کم از کم اپنے ذہن میں کوئی خاکہ مرتب ضرور کر لیتا ہے تا کہ اس خاکہ کے مطابق بات آگے بڑھاتا چلا جائے۔

(۳) قلم بندی:

اب آپ کو اس خاکہ میں رنگ بھرنا ہے۔ تقریر کو تحریری صورت میں لانا ہے۔ کسی مقابلے میں حصہ لینے والے ایسا کرتے ہوئے تقریر کے ابتدائیہ، مرکزیہ اور اختتامیہ کے مطابق الفاظ اور مواد مرتب کریں۔ موضوع سے خارج یا کم مطابق مواد کو حذف کر دیں۔ طالب علم مقررین کے لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ وہ موضوع کے عین مطابق باتوں کو باقی رکھیں اور غیر متعلق سب باتیں قلم زد کر دیں۔ کیوں کہ مقابلے کی تقریر میں ان کے پاس سات آٹھ منٹ سے زیادہ وقت نہ ہوگا۔ تقریر ایک مرتبہ تحریر میں لانے کے بعد اس پر غور و فکر کریں۔ نا مناسب الفاظ" کمزور ترکیبوں اور استعاروں کو نکال باہر کریں اور ان کو زیادہ موزوں الفاظ اور ترکیبات کے موتیوں سے سجائیں۔ یوں آپ کا تقریر نویسی کا مرحلہ طے ہو گیا۔

(۴) ذہن نشینی:

اس مرحلہ سے آپ اپنے آپ کو سامعین کے سامنے لے جانے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اگر آپ تھوڑے تجربہ کار ہیں تو تقریر کو ذہن نشین کر لینا ہی کافی سمجھیں اور اس کی مشق شروع کر دیں، لیکن اگر آپ بالکل نئے ہیں تو پھر آپ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ شروع کی چند تقاریر یا ان کا اکثر حصہ لفظ بہ لفظ یاد کر کے ہی سامعین کے سامنے جائیں۔ اس طرح آپ خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس کریں گے۔

مقررین کے لیے ضروری ہے کہ ایک آدھ تقریر کر لینے کے بعد جب سامعین کا سامنا کرنے کا خوف دور ہو جائے تو رٹے لگا کر تقریر کرنے کی عادت تو بالکل چھوڑ دیں لیکن ضروری ہے کہ تقریر کا خلاصہ اور خاص خاص نکات کسی

چھوٹے کاغذ پر لکھ کر تنہائی میں بیٹھ کر ذہن نشین کرنے اور مرتب انداز میں پیش کرنے کے لئے آخری کوشش اور مشق جاری رکھیں۔

(۵) مشق! مشق! مشق!

یہ تقریر تیاری کا آخری اور سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے۔پہلے خیال خیال میں تقریر کو اتنا پکائیں کہ رواں ہو جائے پھر آواز کے اتار چڑھاؤ، وقف و وصل اور اعضا کی زبان (باڈی لینگویج) کا خیال رکھتے ہوئے عملی مشق شروع کر دیں۔فن کوئی بھی ہو محنت چاہتا ہے۔وقت کا نذرانہ مانگتا ہے۔کسی بھی ہنر میں مہارت پیدا کرنے کے لیے دیوانہ وار محنت بہت ضروری ہے۔جوئے شیر لانے کے لیے تیشہ بکف رہنا ہی پڑتا ہے۔

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا

خواہ آپ کا کتنا ہی مطالعہ کیوں نہ ہو، مشق کے بغیر تو گویا ابر ہے بارش نہیں، چمن ہے پھول نہیں، درخت ہے ثمر نہیں، چراغ ہے تیل نہیں، اور کھانا ہے مگر نمک نہیں، لیکن اگر آپ مطالعے کے ساتھ ساتھ مشق جاری رکھتے ہیں، تو ضرور آپ کے جوہر کھلنے لگیں گے۔

سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

فن خطابت شعر و شاعری سے مختلف ہے، شاعری کے برعکس یہ فن مشق سے سیکھا جا سکتا ہے، اور مسلسل محنت سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔مقرر پیدائشی نہیں ہوتے، مستقل محنت اور مشق سے آگے بڑھتے ہیں۔فن پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی جھولی میں نہیں گرے گا۔پہلے آپ کو تخم ریزی کے بعد ایک خاص مدت تک اس کی حفاظت کرنی پڑے گی

۔

کچھ ممتاز مقررین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں درختوں کے سامنے تقریر کرتے تھے، یا بچوں کو اکٹھا کر لیتے، اور ان کے سامنے تقریر کی مشق کرتے رہتے۔آپ بھی کھلی فضا میں کہیں جا کر، یا کسی بند کمرے میں بیٹھ کر، اپنے سامنے سامعین کا تصور باندھ کر تقریر کی مشق نہایت عمدگی سے کر سکتے ہیں۔صحت تلفظ اور حسن ادا کا جائزہ لینے کے لیے، آپ اپنی تقریر ریکارڈ کر کے سن سکتے ہیں۔بہت سے مقررین مشق نہ کرنے کی وجہ سے سامعین کے سامنے آ کر دو چار منٹ ہی تقریر کرتے ہیں تو ان کا حافظہ، ان کا گلا اور ان کی آواز نہیں بیچ منجدھار چھوڑ، کر کنارے پر کھڑی تماشا دیکھتی رہتی ہے۔(ایضا: ص ۳۵ تا ۳۹)

تقریر کا عظیم مقصد:

یعنی آپ یہ سوچیے کہ آپ اپنی دھاک بٹھانے نہیں، بل کہ اللہ کا حکم پورا کرنے اور انبیا علیہم السلام کی نیابت میں اپنا فرض منصبی ادا کرنے جا رہے ہیں، آپ خود کچھ بھی نہیں، لیکن جس عظیم ذات کا پیغام آپ اس کے بندوں تک پہنچا رہے ہیں وہ سب کچھ ہے، اور لا متناہی قوتوں کی مالک ہے۔

اس تصور کے ساتھ ہی تعلق مع اللہ کا ایک احساس آپ کے دل و دماغ کو تقویت دے گا، اور آپ وساوس

واوہام کے ہجوم سے آزاد ہو کر سنتِ انبیاء کو ادا کرنے کے لیے بھرپور اعتماد اور قوت القلب صلی اللہ علیہ وسلم الحزن علی اللہ کے ساتھ مائیک کے سامنے جا سکیں گے۔(ایضاً:ص ۴۲)

ماہر خطیب کیسے بن سکتے ہیں؟

اس دنیا میں کس بھی کمال تک پہنچنے کے لیے محنت، ایک لازمی شئ اس کے بغیر نہ تو خطیب ماہر خطیب بن سکتا ہے، نہ عالم صاحب کمال ہو سکتا ہے۔لہٰذا سب سے پہلے اپنے آپ کو محنت کے لے تیار کرنا ہوگا، خطیب کے ماہر ہونے کے لیے، ذیل میں دیے جارہے امور پر محنت کرنا ضروری ہے۔

مطالعہ:

مطالعہ خطیب کے لیے پیٹرول کے مانند ہے، اگر پیٹرول نہ ہو تو گاڑی نہیں چل سکتی، بس اسی طرح مطالعہ کے بغیر خطیب کے خطاب میں جان، اور اثر نہیں آسکتا، اور خطیب کو تو ہر چیز کا مطالعہ ضروری ہے، دنیوی کی معلومات بھی ہو، سائنسی بھی اہم اور بنیادی معلومات اور اس کے پاس ہو، معاشیات، سیاسیات، تاریخ، سیرت، قصص، وواقعات، ان تمام موضوعات پر، ہر وقت مطلع ہوتا رہے، تو جب ذہن میں مواد ہوگا، جس سے سمجھانے میں سہولت ہوگی، اور بات میں وزن پیدا ہوگا۔

خطیب، خاص طور پر جرائد، مجلات، رسائل، مشہور معاصرین، ومتقدمین کے مطبوعہ خطبات، وتقریریں جیسے اردو میں، اصطلاحی خطبات، خطاب ذوالفقار، بیاناتِ طارق جمیل، خطباتِ قاسمی، ندائے منبر ومحراب، صدائے محراب، خطبات حکیم الامت، خطبات حکیم الاسلام، اصطلاحی مواعظ، اصلاحی تقریریں، خطبات علی میاں، خطبات بھاولپور، خطباتِ منور، خطباتِ ادریس، مفکرِ مسلسل ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ وغیرہ کی تقریریں وغیرہ کے مجموعے۔

اگر ابتدائی اردو، فارسی، عربی اول، وغیرہ کے طلبہ ہیں، تو ان کے لیے، تقاریر کے عنوان پر شائع شدہ بہت سی کتابیں، مثلاً نظامت، اور خطبات گوہر علم جوہر سیرت، دلنشین تقاریر، دل پذیر تقاریر وغیرہ زیادہ مفید ہوگی، کیوں کہ اسے الفاظ کا ذخیرہ حافظہ میں اکٹھا ہو جائے گا، جو مقرر اور خطیب کے لیے ازحد ضروری ہے۔

نامور خطباء کا مشاہدہ اور ان کی تقاریر کا سماع:

اس میدان میں مہارت حاصل کرنے کے ضروری ہے، مشہور ومعروف مقررین کو دیکھیں، تا کہ انداز بیاں طریقہ معلوم ہو سکے، اور ان کو یا ان کی کیسٹوں کو سنیں، تا کہ اسلوب بیان کا علم ہو سکے، اور عمدہ لب ولہجہ کو اپنانے میں سہولت ہو، مثلاً قاری حنیف ملتانی، قاری ندیم، مولانا علی میاں ندوی، قاری طیب صاحب، مولانا سید سلمان ندوی، مولانا طارق جمیل، مولانا ذوالفقار نقشبندی، ابو طالب رحمانی وغیرہ۔

تقریر کے محاسن:

تقریر کے الفاظ میں فصاحت وبلاغت کی چاشنی ضروری ہے، تاکہ زبان سے نکل کر بھی کے قلب پر اثر انداز ہو، صاف ستھرے انداز، تسلسل الفاظ کے ساتھ، مجمع کی رعایت کرتے ہوئے، اگر علمی جلسہ ہو علمی پہلو پر نظر ہو، اگر عوام ہے، اصلاحی اور فکری پہلو مدِنظر ہو، اگر تعلیم یافتہ ہو تو اسلام، اور دیگر تعلیمات میں تقابل کرتے ہوئے، اسلامی تعلیمات کی برتری عقلی انداز میں ثابت کرے، مشکل اور پیچیدہ الفاظ تقریر کو غیر مفید بنا دیتے ہیں۔

تقریر کرنے کا اسلوب بھی اچھوتا، اور نرالہ ہو، باتیں مختصر، اور معقول ہو لہجہ پر سوز ہو کہ قلب و دماغ کی کایا پلٹ دے، تقریر کے دوران اتار چڑھاؤ ہو، مناسب اشارے یہ بھی تقریر میں حسن پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔

تقریر میں عمدہ معنی خیز، اور ولولہ انگریز اشعار وقفہ وقفہ سے پڑھنے سے تقریر کے حسن میں نکھار پیدا کرتے ہیں، البتہ ایک ہی شعر کو بار بار نہ دہرائیں، یا کسی زبان زد عام شعر کو بھی تقریر میں استعمال نہ کرے، ورنہ مزہ کھرکھرا ہو جاتا ہے۔

تقریر کے اصول:

عصرِ حاضر میں جہاں دوسرے علوم وفنون کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے، وہیں فنِ تقریر کے سائنسی تجزیہ اور مطالعہ کی طرف بھی پوری توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ گفتگو اور تقریر کے فن پر مستقل تصنیفات کی گئی ہیں۔ اچھی تقریر کے متعلق ذیل کی باتوں پر تقریباً سبھی مصنفین متفق نظر آتے ہیں۔ اس لیے انہیں "تقریر کے بنیادی اصول" کہا جاسکتا ہے۔

(۱) بھرپور تیاری:

(۱) تقریر کرنے سے پہلے اس کی تیاری پر خوب محنت کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں پہلا مرحلہ غور وخوض کا ہے۔ جتنا اہم موضوع ہوگا اتنا ہی زیادہ اس پر غور وخوض ہونا چاہیے۔

(۲) متعلقہ مواد کا تفصیلی مطالعہ نہایت ضروری ہے، اور اس تفصیلی مطالعہ میں ابتدائی کتابوں سے لے کر انسائیکلوپیڈیا تک سے کام لینا چاہیے۔

(۳) اس کے بعد بہترین خیالات کا انتخاب کرنا چاہیے، کیوں کہ جتنا کچھ پڑھا گیا وہ سب تو ایک تقریر کے اندر سما نہیں سکتا۔ خیالات کا عمدہ انتخاب تقریر کی عمدگی کا ضامن ہے۔

(۴) اچھی تقریر کے لیے تقریر کا خاکہ تیار کرنا ضروری ہے۔ جس طرح کوئی عقلمند معمار نقشے کے بغیر مکان تعمیر کرنے کا ارادہ نہیں کرتا، اسی طرح کوئی اچھا مقرر تقریر کا خاکہ تیار کیے بغیر تقریر کا ارادہ نہیں کرتا۔

اندازِ خطاب:

(۱) تقریر کے انداز میں تصنع نہ ہو۔ قدرتی اور بے تکلفانہ انداز اختیار کیا جائے۔ تقریر میں گفتگو کا فطری انداز سامعین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور مقرر و سامعین کے درمیان خوشگوار رابطے کا کام دیتا ہے۔

(۲) تقریر کے لیے موزوں تیاری ضروری ہے، لیکن تحریری نوٹ لے کر ان کی مدد سے تقریر کو آگے چلانے کی کوشش عام طور پر خوشگوار نتائج پیدا نہیں کرتی۔ اگر ان کو خوبی اور چابکدستی سے استعمال نہ کیا جائے تو یہ نوٹ مقرر اور سامعین کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور ان کا ذہنی رابطہ قائم نہیں رہتا۔

(۳) ہاتھ کے اشاروں، چہرے کے تاثرات اور سر اور آنکھوں کی حرکات سے تقریر میں اثر بڑھتا ہے لیکن حرکات و سکنات قدرتی ہونی چاہییں۔ اگر ان میں اداکاری کا بناوٹی رنگ آجائے تو سامعین مقرر کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔

(۴) آواز نہ اتنی بلند ہو کہ مقرر چیختا چلاتا سنائی دے اور نہ اتنی دھیمی کہ تمام سامعین تک بخوبی پہنچ نہ سکے۔

(۵) مائیک سینس بھی بہت اہم چیز ہے۔ بیان کے دوران دائیں بائیں متوجہ ہوتے وقت سینہ تو موڑیں لیکن منہ کو مائیک کے سامنے سے نہ ہٹنے دیں تاکہ آواز کا تسلسل نہ ٹوٹے۔

تقریر کی صحیح تیاری کا طریقہ:

(۱) اساتذہ اور اہلِ ذوق حضرات کی مدد سے کتابوں کا انتخاب، انسائیکلو پیڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ سے معلومات کا حصول۔

(۲) متعلقہ مواد کا گہرا مطالعہ اور گہرا غور و خوض۔

(۳) بہترین خیالات کا انتخاب۔ ایک سو خیالات جمع کریں۔ ان میں سے نوے خیالات ضائع کر دیں۔ مواد او مقررہ وقت کے باہمی تناسب کا خیال رکھیں۔

(۴) تقریر کا خاکہ تیار کرنا اور پھر اس میں رنگ بھرنے کے لیے وقتاً فوقتاً مراجعت کرتے رہنا۔

(۵) تقریر آپ کے ذہن کی تخلیق ہونی چاہیے۔ مختلف قسم کا مواد دماغ میں موجود ہو، لیکن خود پھلے پھولے اور لا شعوری طور پر پروان چڑھے۔

(۶) ایک دانشور کا قول ہے: الفاظ کے پیچھے مت بھاگو بلکہ خیالات کی تلاش کرو۔ جب خیالات کا ہجوم ہوگا تو الفاظ بخود چلے آئیں گے۔ (ایضاً: ص ۸۳ تا ۸۷)

مقرر کن موضوعات کا انتخاب کرے:

مقرر کے لیے ماضی اور حال دونوں سے واقف ہونا ازحد ضروری ہے، اس کو ماضی کی تاریخ اگر معلوم ہے، تو

اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھ کر، سامعین کو واقعات سے نتائج اخذ کر کے انجام الاخریٰ ۱۴۳۲ھ ہے، اور اس کے لیے خطیب کا حافظ ہونا، یا کم از کم آیات قرآنیہ کے بڑے ذخیرے کا حفظ کرنا بے حد ضروری ہے، اسی طرح کتب احادیث کا زیر مطالعہ ہونا بھی لازم ہے، کیوں کہ ماضی کے واقعات کو پورے شرح و بسط کے ساتھ احادیث میں بیان کیا گیا، اور ”دینی امور“ مکمل تفصیلات کے ساتھ بھی احادیث میں وارد ہیں، اردو میں معارف القرآن، معارف الحدیث، منتخب احادیث، وغیرہ کا اس کے لیے معین و مدد گار ثابت ہوگی۔

اسی طرح اعمال صالحہ کے فضائل اور اعمال سیئہ پر وعیدوں کا جاننا ضروری، تا کہ اسلامی خطابت کے طرۂ امتیاز ”امر بالمعروف اور نہی عنہ المنکر“ کے فریضہ کو صحیح معنی میں انجام دیا جا سکے۔

عصر حاضر میں عقلیت کا رجحان غالب ہے، لہٰذا اسلامی تعلیمات کو عقلی انداز میں اس کے اسرار و رموز کا بتانا بھی ناگریز ہے، اس کے لیے حجۃ اللہ البالغۃ، احیاء علوم الدین، ملفوظات حکیم الامت، ملفوظات فقیہ الامت وغیرہ کی ضرور ورق گردانی کرے۔

ہم جس دور گذر رہے ہیں وہ دور مغرب کے غلبہ کا دور ہے، جس نے علم ”تحقیق“ ”ریسرچ“ ”آزادیٔ رائے“ ”مساوات“ جیسے خوشنما الفاظ کو فروغ دے کر پوری دنیا کو فریب میں مبتلا کیا ہے، لہٰذا خطباء اور مقررین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان اصطلاحات کے مغربی اور اسلامی تصور کو بیان کرے اور اسلام نے اس کی جو صحیح تعبیر و تحدید کی ہے، اسے بیان کرے تا کہ مسلمان اس کے دام فریب سے بچ جائے یا نکل جائے۔

اس کے لیے شیخ الاسلام، حضرت مولانا تقی عثمانی، مفکر اسلام، حضرت مولانا علی میاں ندوی، انشاء پرداز وادیب و عالم حضرت مولانا ابن الحسن عباسی، جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا رابع صاحب، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ یوسف بنوری، شہید اسلام مولانا یوسف لدھیانوی، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ابو عمار زاہد الراشیدی، شیخ الحدیث مولانا شامزی، شہید حضرت مولانا رفیع عثمانی، مولانا اسرار احمد، علامہ اقبال اکبر الہ آبادی وغیرہ کی تصنیفات، تالیفات، اور تحریرات کو خوب پڑھ ہیں۔

”ذرائع ابلاغ، اور نصاب تعلیم“ وغیرہ کے ذریعہ مغربی افکار و نظریات، مثلاً ”نظریۂ ارتقاء“ ”نظریۂ جنسیت“ ”نظریۂ وجودیت“ ”نظریۂ اضافت“ ”نظریۂ سیکولرزم“ ”نظریۂ جمہوریت“ ”نظریۂ سرمایہ داریت“ ”نظریۂ اشتراکیت“ ”نظریۂ تجربیت“ وغیرہ کو پچھلے تقریباً دو تین صدیوں سے عام کیا جا رہا ہے، جو ایمان کے لیے خطرناک ہے، لہٰذا ان خطباء پر ضروری ہے کہ وہ دنیوی تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے، اسی کو اپنا موضوع بنایا، اور قرآن وحدیث اور جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں اس کے بطلان کو ثابت کرے، اس کے لیے ہارون یحیٰ کی کتابیں، اور ویب سائٹ www.harunyahya.com مفتی ابو لبابہ شاہ منصور، انور غازی، یوسف غازی، یاسر محمد خان، قاری منصور احمد، ڈاکٹر محمد امین، پیر ذو الفقار نقشبندی، ڈاکٹر عدنان سہیل، پروفیسر محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وسیم اکبر شیخ وغیرہ کی تحریرات اردو میں پڑھیں، اور عربی میں ”الاستاذ انور الجندی“ عبد الرحمن حبنکہ المیدانی محمد حامد ناصر قرہ داغی،

توفیق الواعی، محمود عقاد وغیرہ کی کتابوں سے استفادہ کرے۔

غرضیکہ انقلاب کے لیے کردار عمل کے ساتھ کردار خطاب کو بھی نیا رخ دینے کی سخت ضرورت ہے، اسلامی تعلیمات اور مغربی تعلیمات کا مقارنہ، اور پھر اسلامی تعلیمات عقل، اور فطرت کے عین مطابق ثابت کرنا، یہ وقت کی اہم ضرورت، لہٰذا آپ کی تقریر کے عناوین یہ ہونے چاہیے:

☆فکر اسلامی اور فکر مغرب میں فرق
☆نئی دنیا کی دریافت اور اسلامی نظریہ جہاد کے درمیان تقابل
☆مغربی نظریات کے ایمان پر اثرات
☆قوانین وضعیہ یا مغربی قوانین اور اسلامی قوانین میں تقابل
☆عقل اور روحی اسلام اور مغربی نقطۂ نظر سے
☆دنیا پر اسلام کے احسانات اور مغرب کے مظالم
☆دہشت گردی، اسلام اور مغرب
☆روحانیت اور مادیت کی کشمکش
☆جمہوریت اور خلافت کے، دنیا پر اثرات
☆عورت اسلام اور مغرب کی نظر میں
☆ایمان اور اسلام میں فرق
☆اسلامی عقائد، عقل کی کسوٹی پر
☆ریاست اور دین میں تفریق نا قابل قبول
☆دجال اور دجالی طاقتیں
☆قیامت کی نشانیاں حقیقت کے آئینہ میں
☆ظہور مہدی اور اس کے خدوخال
☆عالمی تخریبی ادارے
☆سود ہر حالت میں ناسور
☆معیشت، اسلامی نقطۂ نظر سے

صہیونیت، بہائیت، ماسونیت، قادیانیت، جدیدیت، صلیب، گوہر شاہیت وغیرہ وغیرہ فرقوں کے بارے میں امت کو متنبہ کریں۔

اخیر میں معذرت کے ساتھ یہ درخواست ہے کہ اللہ کے واسطے میدان خطابت کو سنبھالیے، بے شک اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے مضمون کو طوالت دیدی مگر طلباء کی تقاریر سے بے رغبتی اور بے توجہی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اتنا طویل مضمون لکھنے کی جسارت کر بیٹھوں، امید ہے کہ یہ تحریر طلباء کے لیے علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق ہو گی:

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلہ سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل
میں بلبل نالاں ہوں ایک اجڑ گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

اخیر میں علامہ اقبال کے اس شعر پر موضوع سمیٹتا ہوں ۔

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

حاشیہ: تقریر پر مزید عمدہ معلومات کے لیے حضرت تھانوی کی کتاب ''آداب التقریر والتصنیف'' اسی طرح مفتی ابو لبابہ کی کتاب ''رہنمائے خطابت'' نہایت ہی مفید ہے، طلبا اور علما ضروران دونوں کتابوں کا مطالعہ کریں۔

عربی زبان میں خطابت کیوں ضروری؟

جہاں تک عربی زبان کا ن معاملہ ہے تو وہ الفاظ کی جادوگری کا فنی شاہکار ہے، اس کی ساخت خطیبانہ ہے، اس کی روح میں احساسات کی گرمی ہے، عربی زبان کو قرآن وسنت کی زبان بننے کا شرف حاصل ہے، اس لحاظ سے وہ ہمارے ایمان وعقیدہ کی زبان ہے، اس سے شیفتگی ہمارے ایمان کی دلیل ہے، اس سے شغف ہماری دینی غیرت کا تقاضا ہے، ایک زندہ زبان کی حیثیت سے اس کا سیکھنا سکھانا ہماری سعادت کا ذریعہ ہے، اور اس میں مہارت پیدا کرنا ایک دینی فریضہ، ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ قرآن کے بحر ناپید کنار میں غواصی کر کے ہم موتیاں اس وقت تک نکال ہی نہیں سکتے جب تک ہم عربی زبان کے دریا میں شناوری نہ کریں ---------- اگر آپ عربی خطابت کے میدان میں فراٹے بھرنا چاہتے ہیں، تو ذیل کے اوصاف کو خاطر میں لائیں۔

(۱) اپنی سیرت وکردار کو نکھاریے۔
(۲) اخلاص عمل اور نصب العین کی بلندی کو مطمح نظر بنائیے۔
(۳) زبان کی درستگی کی سمت دھیان دیجیے۔
(۴) زبان میں سلاست اور طلاقت پیدا کیجیے۔
(۵) الفاظ کے صحیح تلفظ کی سمت توجہ دیجیے۔
(۶) مطالعہ کا شوق ابھاریے، اور ہر موضوع پر مطالعہ کیجیے۔
(۷) آواز میں ترنم اور زیر و بم پیدا کیجیے۔
(۸) اپنی شخصیت میں وجاہت، متانت اور سنجیدگی پیدا کیجیے۔
(۹) برمحل اشارات سے خطابت کے وزن کو بڑھائیے۔

آپ کو اگر قدرت نے خطابت کا وہبی ملکہ بخشا ہے، تو نامور خطباء سے اکتساب فیض کر کے، اسے دو آتشہ کیجیے، اور پھر دوسروں میں خوب لٹائیے، یہ آپ کی نجی ملکیت نہیں ہے کہ بچا بچا کے رکھیے، اس سلسلہ میں چند وضاحتیں ملحوظ رکھیے۔

(۱) کبھی معذرت آمیز لہجہ نہ اپنائیے، جو کچھ کہنا ہو پورے اعتماد واستقلال کے ساتھ کہیے۔
(۲) اصل موضوع پر آنے سے پہلے، مناسب و موثر تمہید سے سامعین کے ذہن کو متوجہ کیجیے۔
(۳) خطابت کو شوق کا سامان یا پیشہ نہ بنائیے، بل کہ تقریر اس لیے کیجیے کہ لوگ آپ کو سن کر کچھ لینا چاہتے ہیں، اور انہیں سنانا اور دینا آپ کی ضرورت ہے۔

(۴) گلے پھاڑیے، نہ شوروغل کیجیے، خطابت کی اصل روح سلامت [illegible] میں ہے۔ہاں! آواز میں ترنگ اور اظہار میں مدوجزر پیدا کیجیے اور موضوع کی طرح آواز کو بھی ترتیب دیا کیجیے۔

(۵) الفاظ معانی رکھتے ہیں، معانی لہجے بناتے ہیں اور لہجے کا اظہار آواز کے حسن سے ہوتا ہے لہٰذا الفاظ کو نہ تو اگلیے نہ چبایئے۔

(۶) تقریر کا پڑھنا خطابت نہیں ہے مطالعہ کی طاقت پر فی البدیہہ بولنا تقریر و خطابت ہے۔

(۷) ہمیشہ ان موضوعات پہ بولیے جن پر آپ کا دل خود مطمئن ہو، محض کسی موضوع پہ طلاقتِ لسانی آپ عوام کا دل جیت نہیں سکتے، نہ علم کا بھرم قائم رکھ سکتے ہیں۔

(۸) اسٹیج کے خوف پہ قابو پانے کے لیے خوداعتمادی پیدا کیجیے اور خوف کو گردجھ کر جھاڑ دیجیے۔

(۹) آپ ایک نصب العین کے داعی ہیں اور آپ کا مقصد دلوں کو فتح کرنا ہے، لہٰذا خوداعتماد، خوش چہرہ اور بھی خود بنئے۔

(۱۰) خطابت میں زبان بڑی دولت ہے، زبان پہ قدرت نہ ہو تو خیالات پہ کما حقہ روشنی نہیں ڈالی جاسکتی "ایک بے زبان شخص علم کا مزار ہے" لہٰذا زبان سے کبھی غفلت نہ برتیے۔

(۱۱) موضوع اور ماحول کے ساتھ خطابت کا لہجہ بدلتا ہے، وہ راگ نہیں کہ ایک ہی لے پر چھیڑ دیا جائے، لہٰذا آواز کی اہمیت وتاثیر سے صرفِ نظر نہ کیجیے۔(فصل الخطاب، علاؤالدین ندوی)

جلسے اور ان کی قسمیں

جلسہ، اجلاس	حفلة ج احفلات، حفل ج احتفال، ذوزة ج ذوزات		
کانفرنس	مؤتمر ج مؤتمرات	کنونشن	مجتمع، ندوة
سیمینار	ندوة علمية ج ندوات	جشن تعلیمی	مهرجان تعليمي
سمپوزیم	عرض	گولڈن جبلی	مهرجان ذهبي
ہفتہ واری جلسہ	الحفلة الاسبوعية	ماہوار جلسہ	الحفلة الشهرية
سالانہ جلسہ	الحفلة السنوية	صد سالہ اجلاس	الاحتفال المئوي
جشن صد سالہ	عيد مئوي	جشن سالانہ	عيد سنوي
چوٹی کانفرنس	مؤتمر القمة	امن کانفرنس	مؤتمر السلام
چھوٹی کانفرنس	مؤتمر مصغر	بڑی کانفرنس	مؤتمر موسع
پریس کانفرنس	مؤتمر صحفي	گول میز کانفرنس	مؤتمر المائدة المستديرة
خفیہ اجلاس	اجتماع سري	بند اجلاس	اجتماع مغلق

میعادی اجلاس	اجتماع دَوْرِی	تعزیتی جلسہ	حفلة التأبين
ہنگامی اجلاس	حفل طارِی	نمائندہ کنونشن، نمائندہ اجلاس	اجتماع المندوبين
جلسۂ تقسیم انعام	حفلة توزيع الجوائز	جلسۂ میلاد النبی	الاحتفال بمولد النّبی
جلسۂ تقسیم اسناد	حفلة توزيع الشّهادات، حفلة توزيع الإجازات		
عمومی اجلاس	حفلة عامة، جلسة عامة	خصوصی اجلاس	حفلة خاصة
زبردست اجتماع	اجتماع حاشِد	افتتاحی اجلاس	حفلة افتتاحية
آخری اجلاس	حفل ختامی	افتتاحی تقریر	خطبة افتتاحية
آخری تقریر	خطبة ختامية	دینی اجتماع	لقاء دینی
اسلامی اجتماع	لقاء اسلامی	تہذیبی اجتماع	لقاء حضاری

جلسے کے پروگراموں کی اصطلاحیں

تقریر	خطبة، خطاب، كلمة	تقریر کرنا	خطب يخطب، ألقى خطاباً أمام___
تقریری پروگرام	البرنامج الخطابی	توسیعی لیکچر، علمی تقریر	محاضرة
جلسہ ہونا	انعقاد الحفلة	جلسہ کرنا	عقد الحفلة، إقام الحفلة
جلسہ کی کاروائی	وقائع الحفلة	جلسہ جاری رکھنا	متابعة الاحتفال
جلسہ کامیاب ہونا	نجحت الحفلة	جلسہ برخاست کرنا	رفض الحفلة، رفض الاجتماع
جلسہ ملتوی ہونا	تأجّلت الحفلة لمدة كذا، تأخرت الحفلة لمدة كذا		
جلسہ ملتوی کرنا	أجّل الحفلة إلى_	خطبۂ صدارت	كلمة الرئاسة
خطبۂ استقبالیہ	كلمة الترحيب	صدر جلسہ	رئيس الحفلة
اناؤنسر	المعلن، المذيع	اناؤنسمنٹ	إذاعة، إعلان
مقرر	خطيب ج خطباء	مقرر بلیغ، بلند آواز	الخطيب المصقع
لسان مقرر	الخطيب المفوه	پیشہ ور مقرر	الخطيب المتحرِف
حاضرین جلسہ	المستمعون، الحضور	تجویز صدارت	إقتراح الرئاسة
صدارت کرنا	رئاسة الحفلة	تائید کرنا	اتّفق على
اعلان جلسہ	إعلان الحفلة	جلسہ بلانے والا، داعی	مجمع ج مجمعون، الآذن
مجلس استقبالیہ، استقبالیہ کمیٹی	اللجنة التحضيرية، لجنة الاستقبال		
مجلس انتظامیہ	مجلس الادارة، مجلس التنفيذ		

مجلس تقریر	لجنة الخطابة	مجمع	جَمع ج جموع، حشد ج حشود
جم غفیر	جمع حاشد ج جموع حاشدة	تقریر کا متن	نصّ الكلمة
مجمع ہونا	إحتشاد، إجتماع الناس	مجمع پر چھا جانا	سَاد على الجمع
مجمع پر کنٹرول کرنا	الهيمنة على الجمع	اجلاس میں شرکت کرنا	حضور الاجتماع
بحث	نِقاش، مناقشة	بحث چھیڑنا	إثارة موضوع كذا
بحث ختم کرنا	إنهاء المناقشة	بحث ہونا	جرت المناقشة حول كذا
بحث کرنا	ناقش	بحث کی آزادی	حرية المناقشة
پرجوش نعرے	هتافات حماسية	پرجوش الفاظ	عبارة مخمومة
پروگرام میں حصہ لینا	المساهمة في البرنامج	پروگرام سننا	الإستماع إلى برنامج
پرجوش تقریر	خطبة حماسية	خراج تحسین حاصل کرنا	نيل التقدير
خراج تحسین ادا کرنا	أشاد بشيء وحياه	خراج تحسین پیش کرنا	ثمنه وقدره
پروگرام بنانا	وضع برنامج	پروگرام چلانا	ادارة البرنامج
تلاوت قرآن مجید کرنا	تلى يتلو تلاوة	نظم پڑھنا	أنشد ينشد إنشاداً
ترانہ	أنشودة، نشيد ج أناشيد		

جلسہ کے سامان اور انتظامات:

اسٹیج	منصة ج منصات	پنڈال	سرادق ج سرادقات
شامیانہ	مظلة ج مظلات	جلسہ گاہ	مكان الحفلة
بھرا ہوا پنڈال	السرادق الغاصّ	خالی پنڈال	السرادق الشاغر
پنڈال بھر جانا	إغتصّ السرادق بالناس	کرسی	كرسي ج كراسي
تقریری ٹائم ٹیبل بنانا	وضع الجداول الخطابية	آرام کرسی، صوفہ، تخت	أريكة ج أرائك
اجلاس کا ایجنڈا	جدول أعمال الإجتماع	اوقات	مواعيد واحد موعد
رضا کار	متطوع ج متطوعون، مطاوع ج مطاوعون		
رضا کارانہ خدمات	الخدمات التطوعية	بیج (نشان)	وسام ج أوسمة، وسامات
رضا کار کا بیج	وسام المتطوع	ڈیلیگیٹ کا بیج	وسام المندوب
بیج لگانا	إرفاق الوسام	جلسہ کی رپوٹ	تقرير الاحتفال، بيان الحفل
انتظامی شعبے	أقسام إدارية	انتظامیہ	هيئة الادارة

انعام	جائزۃ ج جوائز	انعام کی رقم	قیمۃ الجائزۃ
لاؤڈاسپیکر	مُکَبِّرُ الصوت، مِجْهَار ج مَجَاهِير	ہارن	بُوْق ج أبْوَاق
مائک	مُكَبِّر فون، مِذْيَاع	چادر	رِدَاء ج أرْدِيَة
فرش	فَرْش ج فُرُش، مَفْرُوش ج مَفْرُوشات	گاؤتکیہ	وِسَادَة ج وَسَائِد
قالین	سَجَّادَة ج سَجَاجِيد	ٹکٹ طعام	تَذْكِرَةُ الطَّعَامِ ج تَذَاكِر
بینر	لَوْحَةُ الثَّوْب ج لَوْحَات		

عربی میں تقریر کیسے کریں؟:

جس طرح اردو تقریروں میں سب سے پہلے خطبہ پڑھا جاتا ہے، اسی طرح عربی تقریروں میں بھی سب سے پہلے خطبہ پڑھا جاتا ہے، البتہ تقریر کے دوسرے متعلقات سے واقف کرانے کے لیے اگلی سطور لکھی جارہی ہیں، خطبہ کے بعد خطاب کا نمبر آتا ہے، موقع و محل کے لحاظ سے خطاب کے الفاظ بدلتے بھی ہیں، مگر کچھ ایسے ہیں جو ہر جگہ کام دیتے ہیں۔ مثلاً

(۱) أيها الاخوة (۲) ايها الاخوة الاعزاء (۳) ايها الاخوة الكرام
(۴) ايها الاخوة في الدين (۵) ايها الاخوة في الله (۶) ايها الاخوة في العقيدة
(۷) ايها الاخوة المؤمنون (۸) ايها الاخوة المسلمون (۹) إخواني
(۱۰) اخواني الأعزاء (۱۱) اخواني الأحباء (۱۲) ايها المسلمون
(۱۳) الاخوة الحضور (۱۴) ايها السّادة (۱۵) ايها السّادة الكرام
(۱۶) ايها السادة الأفاضل (۱۷) اخواني و سادتي (۱۸) عباد الله
(۱۹) حضرة المستمعين الكرام (۲۰) ايها الجمع الكريم
(۲۱) ايها المحفل الكريم (۲۲) ايها الاخوة الأكارم (۲۳) سادتي

مذکورہ کلماتِ خطاب کو ہر تقریر میں استعمال کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہو، اور خواہ صرف عوام کا مجمع ہو یا خواص کا، یا ملا جلا، اپنے سے بڑوں کا ہو یا چھوٹوں کا، یا دونوں کا مخلوط، اور خواہ تقریر اپنے وطن میں ہو رہی ہو، یا غیر ملک میں۔

یہ خطاب کے عام کلمات تھے، لیکن مخصوص مقامات پر، جلسہ میں شریک شخصیات و حاضرین کے پیش نظر مخصوص کلمات بھی استعمال کئے جاتے ہیں، مثلاً علماء، دانشور اور عوام کے مخلوط مجمع کو خطاب کرنے کا انداز یوں ہونا چاہئے:

(۱) اصحاب الفضيلة و إخواني الكرام (۲) سماحة الرئيس و العلماء الأجلاء و الاخوة الكرام

(۳) فضیلۃ الشیخ و الإخوۃ الحضور

علماء، دعاۃ، وزراء وغیرہ کے مجمع کے لیے:

(۱) ایہا الدّعاۃ المخلصون

(۲) اصحاب المعالي و السماحۃ و الفضیلۃ و الاخوۃ الکرام

(۳) اصحاب السّماحۃ ــــــ اصحاب المعالي ــــــ اصحاب الفضیلۃ

ایسے جلسے کے لیے جس میں بادشاہ یا صدر مملکت بھی شریک ہوں

(۱) فخامۃ الرئیس و اصحاب المعالي و السماحۃ

(۲) صاحب الجلالۃ و اصحاب السّماحۃ و الفضیلۃ

جس جلسہ میں کسی بادشاہ یا صدر مملکت کا نمائندہ شریک ہو

(۱) ممثل فخامۃ الرئیس، اصحاب المعالي و السماحۃ

(۲) ممثل جلالۃ الملک ــــــ اصحاب المعالي و الفضیلۃ

اساتذہ وطلبہ کے مشترکہ جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے

الاخوۃ الحضور و الاساتذۃ و الدّارسون

صرف طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے

(۱) أبنائي　　(۲) ایہا البراعم المؤمنۃ　　(۳) أطفالي الأعزاء

(۴) ایہا الطلبۃ　　(۵) أحبائي الأطفال　　(۶) شباب المسلمین

(۷) ایہا الأبناء　　(۸) احبائي البراعم　　(۹) ایہا الدارسون

ہم وطنوں کو خطاب کرتے ہوئے

ایہا الإخوۃ المؤاطنون

لیڈروں اور قائدین کو خطاب کرتے ہوئے

ایہا الزّعمائ و القادۃ

صرف وزراء کے لیے

(۱) صاحب السّمو　　(۲) صاحب المعالي　　(اسالیب الخطاب)

اور عربی زبان میں تقاریر کے لیے یہ کتابیں معاون ثابت ہوں گی:

"فصل الخطاب (علاؤ الدین ندوی)۔ اسالیب الخطاب کیف تخطب (مولانا مرشد شوکت قاسمی)۔ خطب سهلة (مولانا افتخار احمد قاسمی)۔ الخطب العربية۔ الخطب المتنوعة (عبدالقدوس قاسمی۔وغیرہ۔کتاب المنبر (ابوبکر جابر الجزائری)،الخطب المنبریہ (صالح بن فوزان)،

امامت اور خطابت اور اسکے تقاضے (مولانا عبداللہ طارق) خطبات حکیم الامت (حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

خطبات حکیم الاسلام (حکیم الاسلام قاری طیب صاحب)	اصلاحی خطبات (مولانا محمد تقی عثمانی صاحب)
پیغام حق وصداقت (مولانا عبدالمجید ندیم)	خطبات قاسمی (مولانا ضیاء القاسمی)
خطبات عثمانی (مولانا شبیر عثمانی)	ندائے منبر ومحراب (مولانا اسلم شیخوپوری)
تقاریر حقانی (محمد پالن حقانی)	خطبات مفکر اسلام (مولانا کاظم ندوی)
خطبات مدراس (علامہ سلیمان ندوی)	آداب تقریر وتصنیف (حکیم الامت حضرت تھانوی)
دیکھنا تقریر کی لذت (مولانا شکیل احمد)	افضل المواعظ (مولانا ابراھیم صاحب)
گوہر علم جوہر سیرت (مولانا شکیل احمد)	خطبات ذوالفقار (مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی)
بیانات طارق جمیل صاحب (ترتیب: محمد ارسلان بن اختر)	خطبات بھاول پور (ڈاکٹر محمد حمید اللہ)
نشاط افزاں تقریریں (مولانا ناظم ملی)	

تحریر وقلم: اہمیت ضرورت اسلوب

(مولانا) حذیفہ وستانوی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

اللہ رب العزت نے انسان کو، اپنا خلیفہ بنایا اور اسے صفت علم سے نوازا، اور اس علم سے افادے اور استفادہ کے لیے قوت نطق اور قوت کتابت عطا کی، تکلم اور کتابت کے بغیر علم جامد ہوکر رہ جاتا، جب کہ انسان کے لیے اپنے علم کو متعدی کرنا لازم ہے، تاکہ "فن دل علي الخير كفاعله" کا مصداق ٹھہرے۔

قلم اتنی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی تو اس میں ارشاد تھی "الذی علم بالقلم" علم محض مفید ہی نہیں، بل کہ ایک فطری چیز ہے اور انسان کو اس لیے دیا گیا، تاکہ وہ علم کے ذریعہ اشیاء کی حقیقتوں کو جانے، مگر ہر ایک کا مزاج الگ الگ، ہر ایک کا طریقہ فہم الگ الگ ہے، اس لیے نتائج بھی علیحدہ علیحدہ مرتب ہوں گے، کبھی کوئی کسی چیز سے بہت عمدہ نتیجہ اخذ کرلیتا ہے، اور دوسرا ایسا نہیں کرسکتا، اب یہ علم کیسے متعدی ہوسکے گا، اور دوسروں تک اس کی رسائی کیسے ممکن ہوسکے گی، تو ظاہری بات ہے کہ اس کو قید تحریر میں لانا ضروری ہوگا، جب وہ

تحریر میں آجائے گا، تو خود بخود صدیوں تک لوگوں تک پہنچتا رہے گا، لوگ اس سے استفادہ کرتے رہیں گے، اور خیر ہونے کی صورت میں "من دل علی الخیر" کے تحت اس کو ثواب بھی ملتا رہے گا، جس کا انسان آخرت میں محتاج ہوگا، حدیث نبوی بھی ہے: "اذا مات الانسان انقطع عمله الا عن ثلاث: صدقة جارية، و لد صالح، علم ينتفع به"۔

اگر، اس پہلی وحی پر غور کریں گے، تو بڑے ہی حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچ سکیں گے:

(۱) سب سے پہلے یہ کہا گیا "اقرأ" یعنی پڑھو، کیوں کہ قرأت اور پڑھے بغیر علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

(۲) فرمایا "باسم ربک" پڑھو، مگر کیوں "دولت کمانے کے لیے؟ عزت کمانے کے لیے؟ ظلم کرنے کے لیے؟ رشوت خوری کے لیے؟ نہیں، صرف اور صرف اس اللہ کے لیے، جو تجھے نطفہ سے پیدا کرتا ہے، ماں کے پیٹ میں رزق پہنچاتا ہے، اور دنیا میں آنے کے بعد تیرے کھانے، پینے، رہنے سہنے، پھلنے پھولنے کا پورا انتظام کرتا ہے، اپنے رب کی ذات وصفات کی معرفت کے لیے علم سیکھو، کیوں؟ تو اس کا یہ جواب دیا گیا "الذی خلق" جس نے تجھ کو نہ صرف پیدا کیا، بل کہ جو کچھ تیرے اردگرد، اوپر نیچے، اندر باہر، بڑا چھوٹا، ظاہر و باطن، مرئی غیر مرئی۔ غرضیکہ سب کچھ اس نے پیدا کیا، لہٰذا وہی اس لائق ہے کہ اپنا سب کچھ اسی کے لیے کیا جائے، جان، مال، عزت، آبرو، اولاد، وقت۔

(۳) پھر فرمایا عجیب ارشاد فرمایا "خلق الانسان من علق" یعنی زمین پر بسی ہوئی مخلوقات میں سب سے زیادہ حیرت انگیز مخلوق حضرت انسان کو بھی، اللہ رب العزت، قادر مطلق، اور غالب مطلق نے بے جان، گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، اور اسے علم، عقل، نطق، ملکہ تسخیر، فراست، طاقت، روحانیت سب کچھ دیا، جس کے بل بوتے پر آج وہ مادی اعتبار سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا، اور ان میں سے بعض روحانیت میں ترقی کے اعلیٰ منزلیں طے کرتے رہے۔ اب ذرا سوچیے، اتنے عظیم معبود برحق ہی کی ذات وصفات کا علم حاصل کرکے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسی کی عبادت نہ کی جائے، تو اور کس کی کی جائے؟

(۴) پھر آگے بیان کیا "اقرء و ربک الاکرم" تیرا پروردگار ہی سب سے زیادہ باعزت، مالک عزت ہے، انسان کو جب عقل دی جاتی ہے تو اسے سب سے زیادہ عزت ہی کی فکر ہوتی ہے، فرمایا جب عزت دینا اس کے ہاتھ میں ہے، تو، تو اس کا ہوجا، عزت تیری ہوجائے گی۔

(۵) پھر آگے فرمایا "الذی علم بالقلم" عزت حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ہوں گے، ایک اہم طریقہ اللہ کے دیے ہوئے علم کو "قلم" کے ذریعہ لکھ کر بھی عزت حاصل ہوتی ہے، اور یہ عزت حاصل کرنے اور مرنے کے بعد بھی لوگوں میں ذکر خیر باقی رکھنے اہم ذریعہ ہے، بعد والے ذکر خیر کرے، یہی عزت کی انتہا ہوتی ہے، اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے بھی یہ دعا کی تھی "واجعل لی لسانی صدق فی الآخرین" یعنی میرے بعد لوگوں میں میرا ذکر خیر چھوڑ، مگر کہیں دنیوی عزت حاصل ہونے کے بعد انسان اپنے علم وقلم یعنی تحریر پر مغرور ہوکر تکبر میں مبتلا نہ ہوجائے۔

(۶) آگے فرمایا "علم الانسان مالم یعلم" انسان جو کچھ جانتا، اس کا علم دینے والی ذات حقیقی اللہ ہے،

لہذا "دورحاضر کے سائنس دانوں" کی طرح کہیں تم العیاذ باللہ قدرت کے مقابلہ پر الاخوی جاؤ۔!اورعلم کے باوجود ہلاک نہ ہوجاؤ، اسی لیے آگے فرمایا کہ علم جب برائے علم ہوتا ہے، تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے فرمایا "کلا ان الانسان لیطغی" ہرگز ایسا نہ ہو کہ انسان طغیانی اور سرکشی پر اتر آئے اور اپنے او پر حد سے زیادہ اعتماد کر کے اپنے آپ کو اللہ سے بے نیاز نہ جان لیوے، اگر کبھی دل میں اللہ سے بے نیازی کا وسوسہ آئے، تو یہ تصور دل میں جگا دے "ان الی ربک الرجعی" یہ دنیا دائمی نہیں، بل کہ ایک نہ ایک دن مر کر اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، اور زندگی کا جواب دینا ہے۔

ذرا آپ ان آیات پر غور کیجیے، قرآن حکیم کے سیاق وسباق میں اتنی اہم باتیں بیان کی جارہی ہے، ان آیات نے یہ بھی بتادیا کہ، لکھنے کے لیے مطالعہ، اور مسلسل پڑھنا ضروری ہے، مگر پڑھنا اور لکھنا محض لکھنے اور پڑھنے تک محدود نہ ہو، بل کہ مقصد اللہ کی ذات کی معرفت حاصل کر کے اس کے لیے سب کچھ قربان کردینا ہو، کیوں کہ علم کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ، کرامت، علم اور قلم کے بعد، اور حد سے زیادہ اعتماد کا شکار ہو کر، کہیں قدرت کے مقابلہ پر نہ اتر آئے، اگر ایسا کیا تو انجام اچھا نہ ہوگا، اللہ اعلم۔

حضرت مفتی شفیع صاحب نے اس سورت کی تفسیر کرتے ہوئے، ان آیات کی بڑی جاندار، اور معلومات افزاں تفسیر کی ہے، جو پیش خدمت ہے۔

ایک صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لما خلق اللہ الخلق کتب فی کتابه فهو عنده فوق العرش، ان رحمتی غلبت غضبی" یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں جب مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ کلمہ لکھا کہ "میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی"۔

اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اول ما خلق اللہ القلم فقال له اکتب فکتب ما یکون الی یوم القیامة فهو عنده فی الذکر فوق عرشه" یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو حکم دیا کہ لکھے، اس نے تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھی لکھ دیں، یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر ہے۔(قرطبی)

قلم کی تین قسمیں

علما نے فرمایا ہے کہ عالم میں قلم تین ہیں۔

ایک سب سے پہلا قلم جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تقدیر کائنات اس کو لکھنے کا حکم دیا۔

دوسرے فرشتوں کے قلم جس سے وہ تمام ہونے والے واقعات اور ان کی مقادیر کو نیز انسانوں کے اعمال کو لکھتے ہیں۔

تیسرے عام انسانوں کے قلم جن سے وہ اپنے کلام لکھتے اور اپنے مقاصد کا کام چلتے ہیں اور کتابت در حقیقت بیان کی ایک قسم ہے اور بیان انسان کی مخصوص صفت ہے۔ (قرطبی) امام تفسیر مجاہد نے ابوعمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دستِ قدرت سے بنائیں اور ان کے سوا باقی مخلوقات کے لیے حکم دیا ''کن'' ہوجا، وہ موجود ہوگئیں۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں: قلم، عرش، جنت عدن، آدم علیہ السلام۔

علمِ کتابت سب سے پہلے دنیا میں کس کو دیا گیا

بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن کتابت ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا تھا اور سب سے پہلے انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ (کعب احبار) اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے اور سب سے پہلے کاتب دنیا میں وہی ہیں (ضحاک) اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ہر شخص جو کتابت کرتا ہے، وہ تعلیم من جانب اللہ ہی ہے۔

خط و کتاب اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا اور نہ دنیا کے کاروبار درست ہوتے۔ حضرت علی کرم وجہہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے، اور ان کو جہل کی اندھیری سے نورِ علم کی طرف نکالا اور علمِ کتابت کی ترغیب دی کیوں کہ اس میں بے شمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا اور کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ تمام علم و حکم کی تدوین اور اوّلین و آخرین کی تاریخ ان کے حالات و مقالات اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعہ لکھی گئیں، اور رہتی دنیا تک باقی رہیں گی، اگر قلم نہ ہو تو دنیا و دین کے سارے ہی کام مختل ہوجائیں۔

علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ خط و کتابت کا بہت اہتمام کیا ہے

علمائے سلف و خلف نے ہمیشہ تعلیم خط و کتاب کا بڑا اہتمام کیا ہے جس پر ان کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے اس دور میں علما و طلبا نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سیکڑوں میں دو چار مشکل سے تحریر کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں، فإلی اللہ المشتکی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتابت کی تعلیم نہ دینے کا راز

حق تعالیٰ جل شانہ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو لوگوں کے فکر و قیاس سے بالاتر بنانے کے لیے آپ کی جائے پیدائش سے لے کر آپ کے ذاتی حالات تک سب ایسے بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش و محنت سے کوئی کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ جائے پیدائش کے لیے عرب کا صحرا تجویز ہوا جو متمدن دنیا اور علم و حکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہوا تھا، اور راستے اور مواصلات اتنے دشوار گذار تھے کہ شام و عراق اور مصر وغیرہ کے

متمدن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہ تھا، اسی لیے عرب کے سب ہی النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم ، ایسے ملک اور ایسے سامان کئے کہ عربوں کے لوگوں میں جو خال خال کوئی علم وحکمت اور خط وکتابت سیکھ لیتا تھا، آپ کو اس کے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا، ان حالات میں پیدا ہونے والے انسان سے علم وحکمت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کی زبان مبارک پر جاری فرما دیا، فصاحت و بلاغت میں عرب کے بڑے بڑے شعراء و بلغاء آپ کے سامنے عاجز ہو گئے، یہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ تھا کہ ہر آنکھوں والا اس کو دیکھ کر یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کے کمالات انسانی سعی وعمل کا نتیجہ نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ کے غیبی عطیات ہیں، خط وکتابت کی تعلیم نہ دینے میں بھی یہی حکمت تھی۔ (ماخوذ از قرطبی)

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: اس سے پہلی آیت میں تعلیم کے ایک خاص ذریعہ کا ذکر تھا، جو عام طور پر تعلیم کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی قلمی تعلیم۔

ذریعۂ قلم نہیں، بل کہ بے شمار ذرائع ہیں:

اس آیت میں اس کا ذکر ہے کہ اصل تعلیم دینے والا اللہ تعالیٰ سبحانہٗ ہے، اور اس کے لیے ذرائع تعلیم بیشمار ہیں، کچھ قلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا، جس سے وہ پہلے ناواقف تھا، اس میں قلم یا کسی دوسرے ذریعۂ تعلیم کا ذکر نہ فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ کی یہ تعلیم انسان کی ابتداء آفرینش سے جاری ہے، اول اس میں عقل پیدا کی جو سب سے بڑا ذریعۂ علم ہے، انسان اپنی عقل سے خود بغیر کسی تعلیم کے بہت سی چیزیں سمجھتا ہے، پھر اس کے پس وپیش میں اپنی قدرت کاملہ کے ایسے مناظر اور دلائل قدرت رکھ دیے، جن کا مشاہدہ کر کے وہ اپنی عقل سے اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان سکے۔ پھر وحی اور الہام کے ذریعہ بہت سی چیزوں کا علم انسان کو عطا فرمایا اور بہت سی ضروری چیزوں کا علم انسان کے ذہن میں خود بخود پیدا فرما دیا، جس میں کسی زبان یا قلم کی تعلیم کا دخل نہیں، ایک بے شعور بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنی غذا کے مرکز یعنی ماں کی چھاتیوں کو پہچان لیتا ہے، پھر چھاتی سے دودھ اُتارنے کے لیے منہ کو دبانا (اس کو کس نے سکھایا، اور کون سکھا سکتا تھا، پھر اس کو ایک ہنر رونے کا اللہ تعالیٰ نے اول ولادت ہی سے سکھا دیا، بچے کا یہ رونا اُس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اس کو روتا ہوا دیکھ کر، ماں باپ اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس کو کیا تکلیف ہے۔ اس کی بھوک، پیاس، سردی، گرمی کی سب ضروریات اسی رو دینے سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ یہ رونے کی تعلیم اس نومولود کو کون کر سکتا تھا، اور کس طرح کرتا۔ یہ سب وہی علم ہے جو اللہ تعالیٰ ہر جاندار کے خصوصاً انسان کے ذہن میں پیدا فرما دیتا ہے۔ اس ضروری علم کے بعد پھر زبانی تعلیم، پھر قلبی تعلیم کے ذریعہ اس کے علوم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور "مالم یعلم" یعنی جس کو وہ نہیں جانتا تھا، اس کی کہنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ عادۃً تعلیم تو اسی چیز کی ہوتی ہے جس کو انسان نہیں جانتا تھا، اس کے فرمانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس خداداد علم وہنر کو انسان اپنا ذاتی کمال نہ سمجھ بیٹھے، مالم یعلم سے اشارہ فرما دیا، کہ انسان پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے، جب وہ کچھ نہیں جانتا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "اخرجکم من بطون امھتکم لا

تعلمون شیئا ''یعنی اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے بطن سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے، معلوم ہوا کہ انسان کو جو بھی علم و ہنر ملا ہے وہ اس کا ذاتی نہیں بلکہ سب خالق و مالک کا عطیہ ہے۔(مظہری) اور بعض حضرات مفسرین نے اس آیت میں انسان سے حضرت آدم یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد قرار دیا ہے کیونکہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں جن کو تعلیم دی گئی ''وعلم ادم الاسماء کلھا''، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی تعلیم میں تمام انبیاء سابقین کے علوم اور لوح وقلم کے علوم شامل ہیں کما قال ؎

وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

مذکورہ تفصیلات سے تحریر و کتابت کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا ہو، مگر بڑے افسوس کا مقام ہے کہ، آج مدارس سے فارغ ہونے والوں میں سوائے ایک دو فیصد کے کوئی تحریر و کتابت پر قدرت نہیں رکھتا، اور اگر رکھتا بھی ہے، تو کوئی اتنی خاص معیاری نہیں، لہٰذا ہم بطور رہنمائی کہ مفتی ابولبابہ شاہ منصور کی بہترین کتاب ''تحریر کیسے سیکھیں''، اسے ضروری اقتباسات نقل کیے دیتے ہیں۔امید ہے کہ طلبہ اس جانب بھی متوجہ ہوکر، جہاد باللسان کے ساتھ جہاد بالقلم کے لیے بھی تیاری شروع کردیں گے۔

تحریر کے پانچ مراحل

جب کوئی تحریر لکھی جاتی ہے تو لکھنے کے عمل کے آغاز سے اختتام تک کئی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔تحریر کا معیار افادیت اور مقبولیت ان مراحل سے خوش اسلوبی سے گذر جانے پر موقوف ہوتی ہے۔وہ مراحل فطری اور عقلی و منطقی ترتیب کے اعتبار سے پانچ ہیں: پہلے مرحلے میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ ''کیا لکھا جائے'' بقیہ مراحل میں یہ طے پاتا ہے کہ کیسے لکھا جائے؟ وہ پانچ مراحل بالترتیب یہ ہیں:

(۱)سوچ وبچار (۲)پیشِ تحریر (۳)ترتیب وتدوین (۴)نظر ثانی (۵)حتمی مسودہ

۱۔سوچ و بچار (Consideration):

تحریر دراصل اس سوچ وفکر کے لفظی اظہار کا نام ہے جو قلم کار کے ذہن کے نہاں خانوں سے ابھرتی اور قلم کی نب سے گذر کر صفحات پر نقوش بکھیرتی ہے۔فکر کی بلند پروازی اور نظر کی وسعت و عمق وہ چیز ہے جس کی بنا پر کسی تحریر میں معلومات اور نظریات نمو پاتے ہیں اور اس کی قدرو قیمت متعین کرتے ہیں، لہٰذا جس قدر سوچ و بچار میں گہرائی اور گیرائی ہوگی تحریر فکری و نظری اعتبار سے اسی قدر بلند پایہ قرار پائے گی۔سوچ و بچار کے عمل سے تحریر کا مرکزی خیال اور اس کے معاون خیالات (یا دلائل و شواہد) ڈھونڈے جاتے ہیں۔

تین ذرائع:

یہ مرکزی خیال اور اس کے معاون خیالات (آئیڈیاز) کس طرح تلاش کیے جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تین ذرائع سے: مشاہدہ، مطالعہ، اور سماعت۔

قلم کار صبح سے شام تک گھر سے دفتر اور انتظار گاہ سے سیر گاہ تک ،بیسیوں لاتعداد چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔اس رنگا رنگ دنیا کی ہر چیز اسے کچھ نہ کچھ کہتی ہے اور اپنا حال سناتی ہے۔اگر فطرت کی ان سرگرشیوں کو سننے کی صلاحیت پیدا کر کے انہیں حروف کی زبان عطا کرنے کا سلیقہ پیدا کر لیا جائے،تو کالموں کی قطار وجود میں آجائے۔پھر جس طرح اہل علم وادب اور اہلِ فکر ودانش کی تحریریں انسان کی سوچ کو نئے زاویے عطا کرتی اور تحریر کا موضوع سجھاتی ہیں،اسی طرح اہل علم کی صحبتوں میں بیٹھنے سے انسان کو ایسے ملفوظات اور خیالات سننے کو ملتے ہیں،جن کے سماعت سے ٹکراتے ہی اس کے ذہن میں دھماکہ سا ہوتا ہے،اور کوئی ایسا نکتہ ذہن میں آجاتا ہے جو ایک اچھے کالم کا مرکزی خیال بن سکتا ہے۔اس کے بعد نکتہ در نکتہ اور سخن در سخن کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔آدمی اگر بیدار مغز اور حاضر دماغ رہے تو مشاہدہ،مطالعہ اور سماعت تین ایسے ذرائع ہیں،جو اس کو نت۔نئے خیالات وافکار سے آگاہ کرتے اور ایسے فوائد ونکات کا جہان کھولتے ہیں جو کامیاب تحریر کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

جرنل اور نوٹ بک:

ان خیالات (آئیڈیاز) کو محفوظ کیسے کیا جائے؟اس کے لیے جرنل یا نوٹ بک کا استعمال کیا جاتا ہے۔

"جرنل"یا"نوٹ بک"(بیاض) اچھی تحریر کا فن سیکھنے،اچھی تحریر کی مشق کرنے اور اچھے موضوعات تک مسلسل رسائی رکھنے کا ایک بہترین طریقہ ہے۔نئے نئے آئیڈیاز کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے پاس اس کے لیے جرنل یا پھر کوئی کاپی یا چھوٹی سی نوٹ بک (جو آپ کی جیب میں آسکے) ہر وقت آپ کے پاس رہے۔

آپ کا یہ جرنل یا نوٹ بک دراصل آپ کی آئیڈیاز بک ہے،جس میں آپ کے ذہن میں آنے والے خیالات محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔اس جرنل یا نوٹ بک میں آپ ذہن میں کسی موضوع سے متعلق جو خیال آئے اسے لکھ لیجیے۔ کوئی حوالہ ملے اسے لکھ لیجیے۔کوئی خیال یا انداز متاثر کرے اسے لکھ لیجیے۔کوئی تجربہ متاثر کرے اسے درج کر لیجیے۔

زندگی میں روزانہ ایسے بے شمار واقعات آتے ہیں جن کی یاداشت لکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔جرنل کی صورت میں یہ تجربہ یا خیال آپ کے پاس محفوظ ہو جاتا ہے۔اگر یہ جرنل نہ ہو تو تجربہ یا خیال ضائع ہو جائے گا۔

جب بھی آپ اپنی بیاض پر کچھ لکھیں،دس سے بیس منٹ اس پر توجہ دیجیے۔موضوع پر توجہ مرکوز کیجئے اور چاہیں تو مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔جرنل پر حاشیہ بنا کر بھی لکھ سکتے ہیں۔اس سے آپ کو بعض اہم نکتے حاشیے میں نمایاں کرنے میں مدد ملے گی۔کسی خاص عنوان یا نکتے تک پہنچنے اور اس پر توجہ مبذول کرنے میں آسانی بھی ہوگی اور وقت بھی بچے گا۔کسی خاص نکتے کو نمایاں کرنے کے لیے آپ ایسے انڈر لائن یا زیر حلقہ بھی کر سکتے ہیں۔

(۲) پیش تحریر (Pre-Writing, Manuscript):

پیش تحریر جیسا کہ نام سے ظاہر ہے،تحریر سے پہلے کا قدم ہے جس میں تحریر کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔

آپ کے ذہن میں جو چھوٹا خیال آیا ہے،اور آپ اُسے تحریر کرنا چاہ رہے ہیں،پیش تحریر اس خام خیال (یا خیالات)

کومنضبط اور پختہ کرنے کا نام ہے۔اس میں ذہنی برانگیخت (برین اسٹارنگ) کی عملیات کے ذریعے ذہن کو متعلقہ خیال یا موضوع پر مرکوز کرتے ہوئے ذہن میں آنے والے مزید خیالات کی فہرست بنائی جاتی ہے،ان کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ کم اہم یا غیر متعلقہ خیالات کو الگ کیا جاتا ہے۔اس مرحلے میں مصنف یا قلم کار تحریر کا عنوان،موضوع،غرض وغایت، پیغام اور آغاز واختتام کا انداز متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔متعلقہ معلومات جمع کرتا ہے۔حوالہ جات،اعداد وشمار یا حقائق ووا قعات اکٹھے کرتا ہے اور ان سب چیزوں کو ترتیب دے کر تحریر کا خاکہ تشکیل دینے کی کوشش کرتا ہے۔

(۳) تدوین (Writing):

اس مرحلے سے حروف والفاظ کا معرکہ شروع ہوتا ہے۔اس میں کامیابی کا دارومدار منتخب الفاظ کو جوڑ کر خوبصورت جملے اور جملوں کو ترتیب دے کر بامعنی پیراگراف وجود میں لانے پر ہوتا ہے۔''پیش تحریر''میں جو خاکہ تیار ہوا ہے اس میں مشاقی سے رنگ بھرنا اور ان رنگوں کو اس انداز میں سجانا کہ قوس قزح کا منظر پیش کریں،اسی مرحلے کا خاصہ ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ مصنف یا مضمون نگار کے پاس:

(۱) الفاظ (بشمول مترادف ومتضاد) اور بامعنی تراکیب کا خاطر خواہ ذخیرہ ہو۔

(۲) محاورات اور ضرب الامثال کے صحیح اور برمحل استعمال سے واقف ہو۔

(۳) املا وانشا کے قواعد کا لحاظ رکھے۔　　(۴) مختصر،آسان اور موثر الفاظ میں موضوع کو سمیٹے۔

(۵) موضوع سے وابستگی اور پیراگرافوں میں تسلسل،ربط اور وحدت کا خیال رکھے۔

(۴) نظر ثانی (Re- setting):

تحریر کے بارے میں یہ غلط فہمی عام طور پر پائی جاتی ہے کہ موثر تحریر کا عمل بس ایک ہی بار میں تکمیل پا جاتا ہے۔گویا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں،اس کا حتمی مسودہ پہلی ہی بار میں خامیوں سے پاک اور معیاری ہوتا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے۔ایک اچھا اور معیاری مسودہ کئی بار نظر ڈالنے اور اس میں اصلاح کرنے کے بعد وجود میں آتا ہے۔اگرچہ اتنا ضرور ہے کہ مصنف جوں جوں تجربہ کار ہوتا جاتا ہے نظر ثانی کا عمل کم سے کم ہوتا رہتا ہے۔

پیشہ ور قلم کاروں کے لیے جو کسی اخبار یا ہفت روزہ کے لیے لکھ رہے ہیں،ایک محدود وقت میں اپنے مسودہ کو حتمی (فائنل) کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن اگر آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں جس میں وقت کی قید نہیں،تب آپ کو زیادہ سے زیادہ مرتبہ اپنے مسودے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔اس سے کتاب کا معیار بڑھے گا،اور اس کی قدر میں اضافہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھی معیاری اور موثر تحریر کے لیے وقت،محنت،یکسوئی اور صبر کی ضرورت ہے تاکہ اس کو قاری کی نظر سے پڑھا جائے اور ناقد کی حیثیت سے نظر ثانی کی جاتی رہے۔نظر ثانی کا عمل تحریر کو بہتر کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور اس سے مراد محض لفظی تصحیح نہیں،بل کہ اس میں لفظوں کی عدالت میں پیش ہو کر بہت سے کام کیے

جاتے ہیں، مثلاً:

☆۔۔۔۔۔الفاظ کی نوک پلک، نشست و برخاست اور استعمال کی درستی۔

☆۔۔۔۔۔لہجوں اور شوشوں پر توجہ، املا و انشا کے قواعد اور رموز و اوقاف کا لحاظ۔

☆۔۔۔۔۔حشو و زوائد اور غیر متعلقہ تفصیلات و معلومات کا اخراج تا کہ تحریر میں ربط اور وحدت پیدا ہو سکے۔

نظر ثانی بقلم خود بھی ہوتی ہے، اور کسی استاد فن کو دکھا کر بھی۔ ماہر فن کی طرف سے دی گئی اصلاح وادارت (ایڈیٹنگ) نظر ثانی کا اعلیٰ درجہ ہے۔ ناپختہ ذہن کا نو آموز تو محض قلم کار رہتا ہے، مشق و تجربے کے طویل اور جاں گسل مراحل سے گذرنے کے بعد، مدیر کا مقام آتا ہے۔ مدیر کا درجہ، مصنف یا قلم کار سے بہت آگے کا ہے۔ فن پر اس کی گرفت اور معلومات کی وسعت، اسے یہ استحقاق دیتی ہے کہ وہ اپنی میز پر آئی ہوئی تحریروں میں حسب منشا کانٹ چھانٹ، قطع و برید، اصطلاح و ترمیم اور کمی بیشی کرے، یہ اس کا بنیادی اور منصبی حق ہے، جس پر قلم کار کو، ناک بھوں چڑھانے کی بجائے، شکر گذار ہونا چاہیے۔

انسان کا ذہن اگر کسی حادثے کا شکار نہ ہو تو چوں کہ وہ ہر لحہ ارتقا پذیر ہے، اس لیے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کام کا معیار قدرتی طور پر ارتقائی مراحل طے کر لیتا ہے اور بہتر ہو جاتا ہے، اس لیے مشہور ہے کہ نظر ثانی کا عمل جتنی زیادہ مدت کے بعد کیا جائے گا، اتنا ہی موثر اور مفید ہوگا۔ بعض مشہور ادیب تحریر لکھنے کے بعد، اسے رکھ کر بھول جاتے ہیں، اور پھر ایک مناسب وقفے کے بعد دوبارہ اسے ایک ناقد کی نظر سے دیکھ کر تراش خراش کرتے اور سنوارتے سجاتے ہیں۔

(۵) حتمی مسودہ (Final Proof):

تحریر کی آخری ترمیم شدہ شکل، حتمی مسودہ کہلاتی ہے۔ چوں کہ انسان کی کاوشوں میں اصلاح، بہتری اور عمدہ تر ہونے کی گنجائش ہر وقت موجود ہوتی ہے، اس لیے اپنے فرض سے شغف اور کام سے لگن رکھنے والے قلم کار، اس پر وقتاً فوقتاً نظر ڈالتے رہتے ہیں، اور شائع ہونے کے بعد بھی اس کا جائزہ لیتے اور اپنی کوتاہی کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہوئے اس میں تغیر و ترمیم کرتے رہتے ہیں۔

تحریر کے تین مقاصد:

یہ تو تحریر کے پانچ مراحل تھے۔ یہ مراحل چوں کہ تحریر کے مقاصد سے پیوست اور مربوط ہوتے ہیں اس لیے ان کا مختصر ذکر بھی ضروری ہے۔

عام طور پر تحریر کے تین مقاصد بیان کیے جاتے ہیں:

(۱) معلومات فراہم کرنا۔ (۲) دعوت و ترغیب۔ (۳) تفریح مہیا کرنا۔

دراصل ان میں مقصد کا لفظ پہلے دو پر صادق آتا ہے۔ تیسری چیز بذات [illegible] بھی کہ پہلے دو مقاصد کی تکمیل اور حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ تحریر میں شگفتہ مزاج اور سنجیدہ و بامعنی طنز ہو تو اس کے ضمن میں کام کی بات بہت خوبی سے کہی جاسکتی اور بہت آسانی سے قاری کے دل میں اتاری جاسکتی ہے۔

یہ تینوں مقاصد آپس مین متباین نہیں کہ جہاں ایک دوسرے کا گذر نہ ہو سکے بل کہ یہ کسی تحریر میں اکٹھے بھی ہوسکتے ہیں۔ جیسے اعداد و شمار اور حقائق و واقعات پر مشتمل ایک مستند معلوماتی تحریر جس میں کہیں کہیں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہو، دعوت و ترغیب کا بہترین ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسی تحریر بیک وقت ان تینوں مقاصد کی حامل ہوگی اور معیاری اور مقبول تحریر پر قرار پائے گی۔

تحریر کے ابتدائی مراحل یعنی غور و فکر اور خاکہ سازی جس طرح ان مقاصد سے مربوط ہوتے ہیں اسی طرح اس کا وسطی مرحلہ یعنی تحریر و تدوین اور اختتامی مراحل یعنی نظر ثانی اور حتمی صورت گری کو بھی مقاصد کی اثر انگیزی سے مبّر ا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ تحریر ان تمام مراحل میں مصنف یا صاحب قلم ان مقاصد ثلثہ سے شعوری یا لاشعوری طور پر اثر پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں تحریر کے مراحل و مقاصد کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔

اچھی تحریر کی پانچ معنوی خوبیاں:

پاکستان میں کھانے پینے کا رواج گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے بہت بڑھ گیا ہے۔ خاص طور پر کراچی جیسے بڑے شہر میں پہلے اگر چند مخصوص علاقے کھانوں کے بارے میں مشہور تھے تو اب ہر گلی اور ہر محلے میں طرح طرح کے پکوان بن رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں امریکی اور یورپی کمپنیاں بھی اپنی دکانیں سجائے بیٹھی ہیں اور پاکستانی مسلمان حلال اور حرام کی چھان بین کیے بغیر شوق کے اظہار اور خودنمائی کے لیے ان غیر ملکی ریستورانوں میں جا جا کر پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔

لیکن آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا! کہ چند خاص پکوانوں کے لیے چند خاص ہوٹل ہی کیوں مشہور ہوجاتے ہیں اور ایک ہی پکوان کا مزہ اس مخصوص دکان پر خاص الخاص مزہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ کھانے کی تیاری کا خاص انداز ہے۔ اس انداز میں مصالحوں کی شرح۔ پانی اور گوشت وغیرہ کا تناسب، چولہے پر رکھنے کی مدت، دم وغیرہ ہر چیز شامل ہے۔ اس طرح ایک منفرد اور ذائقے دار پکوان تیار ہوتا ہے جو دوسرے ہوٹلوں سے معیار میں کہیں بہتر ہوتا ہے۔

اور کچھ یہی حال تحریر کا بھی ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے قلم کار کا بھی زور ہے، لوگ لکھ رہے ہیں اور بہت سے لکھ تو نہیں رہے، لکھنا چاہتے ہیں لیکن پکوان کی طرح تحریر کے بھی چند لوازمات ہوتے ہیں۔ اگر تحریر کے اجزائے ترکیبی مکمل نہ ہوں اور ان کی مقدار کا تناسب درست نہ ہو تو اس تحریر کی حیثیت چند منتشر الفاظ کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ جس طرح محض چند مصالحے لئے پیاز، مرچ، نمک، گوشت، سبزی، پانی، گھی اور تیل ملا دینے اور آگ پر رکھ دینے سے سالن تیار نہیں

ہوجاتا اسی طرح کاغذ قلم تھام کر چند جملے کاغذ پر بکھیر دینے سے تحریر وجود میں نہیں آتی لیکن آج کل کی اکثریت اسی طرز پر چند جملے کاغذ پر بکھیر دیتی ہے، اور پھر ایسے مضمون نگاروں کا اصرار یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریر شائع کی جائے۔ رسالوں کے ادارتی عملے کو بھی آئے دن اسی قسم کے تلخ تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک معروف ماہنامے کے نائب مدیر نے اپنا دلچسپ واقعہ بتایا کہ ایک صاحب نے ایک سیاسی موضوع پر ایک مضمون ان کے ماہنامے میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ پھر انہوں نے دفتر سے رابطہ کیا اور اصرار کیا کہ انہوں نے اس مضمون پر بہت محنت کی ہے اور تین سو روپیہ کی ایک کتاب محض اس مضمون کی تیاری کے لیے خریدی ہے، لہٰذا اس مضمون کو ضرور بالضرور شائع کیا جائے۔ محترم نائب مدیر نے اس گزارش پر اس مضمون کو خاص اہمیت دی اور کوشش کی کہ یہ مضمون اشاعت کے قابل ہوجائے لیکن نہایت کوشش کے باوجود وہ مضمون قابل اشاعت نہ ہوسکا، الّا یہ کہ اس مضمون کو نئے سرے سے ہی لکھا جاتا یا وہ اصل کتاب ہی چھاپ دی جاتی جس سے یہ مضمون لکھا گیا تھا۔

جب آپ ایک اچھے لکھاری بننے جارہے ہیں تو اس کے لیے یہی کافی نہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہورہی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کی تحریر پڑھی بھی جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اخبارات صرف اس میں چھپنے والے کسی کالم کی وجہ سے خریدے جاتے ہیں۔ قارئین کا ایسا حلقہ اخبار یا رسالہ خرید کر پورا اخبار یا رسالہ نہیں پڑھتا بلکہ اپنی پسند کے کالم نگار کا کالم پڑھتا ہے۔

اپنی تحریر کو "پڑھنے کے قابل" بنانے کے لیے آپ کو اپنی تحریر میں دلچسپی اور اثر پذیری کی خوبیاں پیدا کرنے کا فن آنا چاہیے، ورنہ آپ کی تحریر شاید خوبصورت ہو، شائع بھی ہوجائے لیکن پڑھی نہیں جائے گی، قلم کار تو بن جائیں گے، لیکن کامیاب قلم کار بننے سے رہ جائیں گے۔

لہٰذا یہ جاننا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ اپنے خیالات کو محض الفاظ میں منتقل کردینے کا نام تحریر نہیں ہے۔ آپ کی تحریر اور تصنیف آپ کو اس وقت کامیاب اہل قلم کی صف میں کھڑا کرے گی جب آپ کی تحریر میں درجہ ذیل پانچ خوبیاں موجود ہوں:

۱-براہ راست۔ ۲-وضاحت۔ ۳-مقصدیت ۴-اختصار و جامعیت۔ ۵-مکمل بات

آیئے! آپ کو ان پانچ خوبیوں کے متعلق تفصیل سے بتائیں:

پہلی خوبی-براہِ راست:

آپ کون ہیں؟ تحریر لکھنے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ آپ کی بات میں کتنی سچائی ہے---؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے آپ کی تحریر پڑھنے والا یعنی آپ کا قاری واقف نہیں۔ چناں چہ یہ ضروری ہے کہ آپ کی بات مستند ہو اور براہِ راست ہو۔ مثال کے طور پر آپ کسی واقعے کے بارے میں معلومات لکھ رہے ہیں تو آپ کو اسی واقعے سے متعلق جملے لکھنے چاہییں۔ جیسے یہ واقعہ کب ظہور میں آیا؟ اس کی تاریخ وقوع کیا ہے؟ کہاں پیش آیا؟ کیوں پیش آیا؟ گویا

آپ اگر ایک واقعہ کے بارے میں معلومات (حقائق) اپنے قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں تو وہ حقائق آپ کے قاری تک پہنچنے چاہئیں۔ایسا نہ ہو کہ آپ تذکرہ تو ایک واقعہ کا لے کر بیٹھے ہیں مگر آپ کی تحریر میں ہر شئی کا تذکرہ ہے اور اس واقعے کا ذکر تحریر میں آتا ہی نہیں۔

یہ معاملہ محض رسالے یا اخبار کے لیے لکھیں گے مضمون کے لیے ہی نہیں، عام خط و کتابت حتی کہ سرکاری خط و کتابت کے لیے بھی بہت اہم ہے۔مثال کے طور پر آپ کسی ادارے کو شکایتی خط لکھ رہے ہیں تو اس میں براہِ راست اس واقعے کی طرف اشارہ کیجیے تا کہ آپ کی درخواست پڑھنے والا افسر فوری طور پر سمجھ سکے کہ معاملہ کیا ہے؟ کیا اس سے پہلے آپ نے اس سلسلے میں کوئی درخواست پیش کی ہے؟ اس کا حوالہ نمبر کیا ہے؟ کیا کوئی پیش رفت ہوئی۔۔۔وغیرہ۔اس طرح متعلقہ افسر کو آپ کے مسئلے کی تہہ تک پہنچنے میں آسانی ہوگی، اور آپ کا کام بھی نسبتاً جلد ہوگا۔

غور کیجیے کہ آپ کا مضمون یا درخواست پڑھنے والے کو آپ سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔اگر آپ کی تحریر میں طول پن ہے اور آپ مطلب کی بات پر نہیں آرہے تو اس کے لیے آپ کی تحریر میں کوئی کشش نہیں ہے، لہٰذا اپنی بات کو دوسرے تک پہنچانے کے لیے براہِ راست موضوع پر آیئے اور اس سے متعلق ضروری حقائق و معلومات کو اپنی تحریر میں مرکزی حیثیت دیجیے۔

دوسری خوبی وضاحت:

قاری اس وقت تک کوئی تحریر نہیں پڑھتا جب تک اس تحریر میں اس کے لیے دلچسپی پیدا نہ ہو اور تحریر میں دلچسپی تب پیدا ہوتی ہے جب تحریر اس کی سمجھ میں آجائے اور اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا اُسے جواب مل جائے، چناں چہ آپ کی تحریر کا واضح ہونا ضروری ہے ایک واضح اور صاف تحریر کو سمجھنا چوں کہ قاری کے لیے آسان ہوتا ہے، اس لیے وہ ایسی ہی تحریر پڑھتا ہے، غیر واضح تحریر پڑھنے پر آپ قاری کو مجبور نہیں کر سکتے، اپنی تحریر کو صاف اور واضح رکھنے کے لیے درج ذیل تین باتوں پر عمل کیجیے۔

۱۔الفاظ بھی چھوٹے رکھیے۔یعنی ایسے الفاظ استعمال کیجیے جو زیادہ پیچیدہ نہ ہوں، الفاظ سادہ اور مانوس ہوں، دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ اپنی تحریر کو پُر مغز اور دل کش بنانے کے لیے غیر مانوس اور پیچیدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جس تحریر کے الفاظ قاری کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں، وہ تحریر قاری کے لیے بے مزہ اور غیر دلچسپ ہوجاتی ہے۔

۲۔جملے مختصر رکھے۔ایک طویل جملے کے مقابلے میں کئی چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کو سمجھنا آسان ہوتا ہے۔اس کے علاوہ طویل جملے میں قاری کے لیے اپنی توجہ مرکوز کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے اپنی بات کو مختلف جملوں میں تقسیم کر کے قاری تک پہنچایئے، اگر آپ کا ایک جملہ تین سے چار سطروں کا ہے تو اسے دو یا تین چھوٹے جملوں میں تقسیم کر لیجیے۔

۳۔پیراگراف چھوٹے رکھئے۔پیراگراف سے بات لمبی ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی روانی بھی متاثر ہوتی

ہے۔اس کے علاوہ تحریر کا حسن بھی متاثر ہوتا ہے۔ایک اوسط پیراگراف پانچ سے زیادہ سطروں کا ہونا چاہیے۔

تیسری خوبی۔مقصدیت:

یہ کسی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔جب بھی آپ تحریر لکھنے بیٹھیں، اپنے آپ سے یہ سوال کر لیجیے کہ آپ یہ تحریر کیوں لکھ رہے ہیں؟ بہ الفاظ دیگر آپ کی تحریر سے کوئی نتیجہ نکلنا چاہیے۔اس نتیجے(Conclusion) سے قاری کا اتفاق کرنا یا نہ کرنا الگ معاملہ ہے، لیکن آپ کی تحریر سے کوئی نتیجہ نکلنا ضروری ہے اگر آپ محض صفحات سیاہ کر رہے ہیں اور اپنا نام چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کی تحریر میں کبھی جان پیدا نہیں ہو سکتی اور آپ کامیاب قلم کار نہیں بن سکتے۔

تحریر میں ''نتیجہ'' پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو اپنی بات، اپنی رائے تحریر میں بیان کرنے کا سلیقہ آتا ہو۔یہ سلیقہ ''مقصدیت'' ہے۔

اس سلیقے کا اظہار اس دور کی تحریروں میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے کہ جب کسی خاص موضوع پر لکھنے پر پابندی عائد ہو۔اس طرح یہ سلیقہ طنزیہ او رمزاحیہ تحریروں میں بھی خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔الغرض تحریر مزاحیہ ہو یا سنجیدہ' مقصدیت کا عنصر اس میں لازماً ہونا چاہیے۔

فنِ تحریر سیکھنے کا طریقہ

لکھنے کی ابتدا کیسے؟

تحریر کا عمل بڑا مفید اور دلچسپ ہے آدھی سے زیادہ دنیا اس کا شوق رکھتی اور اسے سیکھنا چاہتی ہے، آپ کو بھی یقیناً لکھنے کا شوق ہوگا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے آپ بھی دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح یہ سمجھتے ہوں گے کہ لکھنے کے عمل کی ابتدا لکھنے سے ہوتی ہے، بس قلم انگلیوں میں پکڑا، کاغذ ہاتھ میں لیا اور لکھنا شروع ہو گئے ------ نہیں میرے عزیز نہیں ------ ! لکھنے کی ابتدا لکھنے سے نہیں، مطالعے سے ہوتی ہے۔لکھنے سے پہلے آپ ادبی مطالعے کی عادت ڈالیں۔مستند اہل قلم کی نگارشات کے مطالعے کے دوران آپ کو ان کی تحریر کے مختلف اجزا، عناصر، اسلوب اور محاسن سے شناسائی ہوگی۔آپ کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوگا تحریر کا سلیقہ او رذوقِ سلیم پیدا ہوگا۔لاشعور میں ملکۂ تحریر راسخ ہوتا جائے گا، اور کچھ عرصے بعد جب آپ آئندہ مذکورہ طریقہ سے حاصل مطالعہ کا اندراج سیکھ جائیں گے، تو ان شاء اللہ وہ دن بھی جلد آجائے گا جب آپ اللہ کے فضل سے قلم کی طاقت کو دعوت وارشاد جیسے اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کرنے کے قابل کے ہو جائیں گے۔

یہ غلط فہمی عام ہے کہ مضمون یا کالم لکھنے کا آغاز مضمون یا کالم لکھنے سے کیا جائے۔دنیا کے تمام دوسرے علوم وفنون سیکھنے کے لیے نیچے سے اوپر جایا جاتا ہے۔بس یہ ایک ایسا فن رہ گیا ہے کہ براہ راست ایک ہی چھلانگ میں چوٹی

تک پہونچ جانے کا شوق بے تاب کرتا اور کامیابی سے محروم رکھتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ ایک نوآموز اور ناتجربہ کار براہ راست اچھا مضمون کیسے لکھ سکتا ہے؟

مضمون تو چند پیراگرافوں سے پیراگرف جملوں سے اور جملے حروف والفاظ سے بنتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اینٹیں اکھٹی نہ کرے، نہ ان کو جوڑنے کے لیے مسالہ مہیا کرے، تو وہ کس طرح سے دیوار کھڑی یا مکان تعمیر کرسکتا ہے؟

بالکل اسی طرح جس طالب علم کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہ ہو یا اس نے الفاظ جوڑ کر جملے بنانے کی مشق نہ کی ہو وہ پیراگراف کس طرح پورا کرے گا اور اگر پیراگراف میں بے ربطی یا جھول ہوگا تو وہ اچھا مضمون لکھنے میں کیوں کر کامیاب ہوگا؟

اس لیے میرے عزیز! قلم کی نوک کو کاغذ کے سینے پر چلانے سے پہلے آپ ادبی طریق مطالعہ کی عادت ڈالیں۔ اس مطالعے کے نتیجے میں جو ہیرے، موتی اور جواہرات ہاتھ آئیں انہیں اپنی "بیاض" یا "اسکیٹنگ چارٹ" میں محفوظ کرلیں۔ ان کی تراش خراش اور انہیں نگینوں کی شکل میں جمانے کا سلیقہ سیکھیں۔ یعنی مطالعے کے دوران منتخب کئے گئے الفاظ سے پہلے جملے بنائیں اور پھر چھوٹے چھوٹے پیراگرف لکھیں، کچھ عرصہ کی مشق کے بعد آپ یقیناً ایک اچھے قلم کار بن جائیں گے۔

"ادبی طریق مطالعہ" کیا ہے؟ آیئے ایک نظر اس پر ڈالتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ اطمینان کر لیجئے کہ یہ مطالعہ شروع کرنے سے پہلے آپ کے پاس آگے دیا گیا اسکیٹنگ چارٹ یا ایک صاف ستھری بیاض (نوٹ بک) تیار موجود ہونی چاہیے۔ نوٹ بک تیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر نوٹ بک چھوٹی ہے تو آپ نے اس میں بارہ مختلف صفحات پر وہ بارہ عنوانات لکھ رکھے ہوں جو اگلے صفحے پر دیے جارہے ہیں۔ اگر نوٹ بک کے صفحات بڑے ہیں تو ایک صفحے پر تین یا چار کالم بنا کر ہر کالم کے اوپر آگے دیے گئے عنوانات لکھے جاچکے ہوں تاکہ مطالعہ شروع کرنے کے بعد ہر لفظ کو اس کے متعلقہ مقام پر آسانی سے درج کیا جاسکے۔

ادبی طریقۂ مطالعہ

☆ ادبی مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ جس تحریر کا مطالعہ کریں اس میں موجود موتیوں کو چن کر حاصل مطالعہ کے طور پر اپنے پاس محفوظ کرتے جائیں۔ اس غرض کے لیے آگے دئے گئے اسکیٹنگ چارٹ سے مدد لیں یا ذاتی بیاض بنائیں اور اس میں بارہ صفحات پر درج ذیل بارہ عنوانات درج کریں۔ اگر کچھ صفحات پر لکیریں کھینچ کر تین تین، چار چار کالم بنالیے جائیں، تو یہ بھی درست ہے۔ وہ بارہ عنوانات ہیں:

۱۔ نئے اور اچھوتے الفاظ	۲۔ شگفتہ تراکیب اضافی	۳۔ حسین تراکیب وصفی
۴۔ انوکھی تراکیب عطفی	۵۔ مترادف ومتضاد	۶۔ محاورات وضرب الامثال
۷۔ تشبیہات واستعارات	۸۔ تلمیحات ولطائف	۹۔ سابقے لاحقے

۱۰-خیال انگیز اور موثر ترین جملے او رفقرے

۱۱-پسندیدہ ملفوظات اور اشعار

۱۲-تحقیق طلب الفاظ

☆علم کتابی کے علاوہ ذوق ادب کی آبیاری، فکرونظر کی تربیت اور ادبی استعداد کی نمو کے لیے درج ذیل عملی مطالعہ مستقل مزاجی اور عمیق الفکری سے کرتے رہیں:

۱-انسانوں کا مطالعہ

۲-فطرت کا مطالعہ

۳-معاشرہ اور اس کے مختلف کرداروں کا مطالعہ

۴-ادبی و علمی کتابوں کا مطالعہ

ایک صاحب علم کا طریقِ مطالعہ:

"میرے مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ ایک پینسل ہاتھ میں اور ایک نوٹ بک جیب میں ہوتی۔میرے کتاب خانہ میں مشکل سے کوئی کتاب ہوگی جس پر تاریخ ابتدا اور انتہائے مطالعہ درج نہ ہو۔جو فقرے ادبی، تاریخی یا کسی اور حیثیت سے پسندیدہ ہوتے ان پر یا تو کتاب ہی میں نشان لگا دیا جاتا اور بار بار اس پر نظر ڈالی جاتی یا پھر نوٹ بک میں درج کر لیا جاتا اور اس کو یاد کرنے کی کوشش کی جاتی۔

والد مرحوم کی خدمت میں شمالی ہند کے اکثر اصحاب علم تشریف لایا کرتے تھے۔ان کی گفتگو سن کر اپنی زبان کے نقائص کا احساس بڑھتا گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے زیادہ توجہ زبان کی درستی پر مرکوز رہی۔کوئی اچھی ترکیب، کوئی نئی تشبیہ، کوئی انوکھا استعارہ نظر سے گزرتا تو سب سے بڑی فکر یہ دامن گیر ہو جاتی تھی کہ اس کو جلد سے جلد صحیح طریقے پر اپنی گفتگو میں استعمال کر لیا جائے۔ابتداً یہ تمنا صرف جذبۂ خودنمائی کا نتیجہ تھی لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ حافظہ کسی بات کو اس وقت تک صحیح طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتا جب تک ایک مرتبہ زبان یا قلم اس کو استعمال نہ کر لے۔آج اپنی زندگی میں اپنی اس ابتدائی عادت کے نتائج کو پوری طرح کار فرما دیکھتا ہوں۔اس عادت نے رفتہ رفتہ اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ میں اچھے ادیبوں کے کئی کئی فقرے بے تکلف اور بلا کم و بیش استعمال کرتا تھا اور یہی میری زبان کی درستی کا سب سے بڑا آلہ ثابت ہوا۔

جب ہم اپنے گھر میں جوان اور بڑے سمجھے جانے لگے، تو ہماری بیٹھک کے کمرے الگ کر دیے گئے اور احباب کی محفلیں جمنے لگیں۔لغویات سے فطرتاً نفرت تھی، علم و ادب زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ بن گئے تھے۔ابتداً محض تفریح کے طور پر میں نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر مطالعہ کرنا شروع کیا یعنی یہ ہوتا کہ الہلال، ہمایوں، ہزار داستان، معارف، زمانہ، یا کوئی اور معیاری ادبی و علمی رسالہ یا کوئی اچھی کتاب، کسی ایک صاحب کے ہاتھ میں ہوتی تو اکثر میں ہی قاری کی خدمت انجام دیا کرتا تھا۔ایک ایک فقرے پر ہم اکٹھے خیال آرائیاں کرتے۔اختلاف و اتفاق ہوتا۔بحث و تکرار ہوتی اور یہ بحث دماغ کے صفحہ پر خیالات کے کبھی نہ مٹنے والے ارتسامات کا باعث بنتی، تجربے نے بتلایا کہ خاموشی اور انفرادی مطالعہ سے یہ مشترکہ مطالعہ زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد ہے۔

جب سیر و تراجم، تذکرہ و تاریخ سے آگے بڑھ کر ذوق مطالعہ نے ٹھوس [illegible] جو سیاسی اخلاقی و مذہبی علوم کی طرف توجہ کی تو ایک اور طریقے نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ فلسفہ اور علم کلام یا مذہب و سیاست کا کوئی مقام اگر سمجھ میں نہ آتا تو میں اس کو اپنی اس چھوٹی نوٹ بک میں جو میری جیب کا مستقل سرمایہ بن گئی تھی، نوٹ کر لیتا تھا اور جن بزرگوں کی نظر ان علوم پر میرے نزدیک عمیق ہوتی تھی ان سے ملاقات کے جلد سے جلد مواقع تلاش کرتا اور ان سے ان اشکال کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔ آج اپنے ان لمحات کو اپنی حیات گزشتہ کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔

لوگ صرف کتاب پڑھنے کو مطالعہ سمجھتے ہیں میرے نزدیک کسی مطالعہ کا یہی سب سے اچھا مطالعہ جو بیان ہوا ۔جب والد المحروم کے انتقال کی وجہ سے اٹھارہ برس کی ابتدائی عمر ہی میں میرے سر پر گھر کی ساری ذمہ داری کا بوجھ پڑ گیا اور مدرسہ کی تعلیم ناقص حالت میں ختم ہوگئی، تو میرے مطالعہ کا سب سے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے مختلف اصناف علم میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا ہو ان کو اپنے اطراف جمع کر لوں یا ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور ان کے عمر بھر کے مطالعہ کا نچوڑ ان سے سنوں اور پھر کانوں کے ذریعے اس کا مطالعہ کروں۔ اس تمنا نے آوارہ گردی و صحرا نوردی پر آمادہ کیا۔ مصر و شام، عراق، ترکی، ایران، و افغانستان کی مشکل سے کوئی اہم ہستی ایسی ہوگی جس سے شرف تقرب کی کوشش نہ کی ہو اور آج اپنے قلب و دماغ کو ان کے مطالعہ کی نتائج کا مرہون منت پاتا ہوں۔ لوگ اوراق اور کاغذ کے مجموعے کو الٹنے اور اس میں لکھی ہوئی سیاہ لکیروں کو پڑھنے کا نام مطالعہ سمجھتے ہیں میرے پیش نظر ہمیشہ سے ایک اور کتاب رہی ہے جس کے صرف دو ورق ہیں لیکن جس میں سب کچھ ہے اور یہ کتاب صحیفۂ کائنات ہے۔ آسمان اور زمین کے ان دو اوراق کے درمیان مہر و ماہ، کواکب و سیارات، شفق، قوس قزح، ابر و باد، کوہ و صحرا، سمندر اور ریگستان نے ایسے ایسے خطوط کھینچے ہیں جن میں فکر کرنے والی نگاہ اپنی لیے بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے۔ مجھے اس کتاب کی طرف آذر کے بیٹے نے متوجہ کیا۔ جس نے ڈوبتے سورج کو دیکھ کر ''فاطر السموات و الارض'' کا پتہ چلا لیا تھا۔ میرے اس خیال کی تصدیق حرا کے بیٹھنے والے صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کی ہے اور یہی دو ورق مجھے اس مطالعہ کی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہوئے اور پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ کس طرح دنیا میں اگنے والے درختوں کا ہر ورق معارف کردگار کا ایک دفتر ہے۔

مطالعہ کس چیز کا کیا جائے؟

مستند و معتبر اردو اہل قلم کی ممتاز تصانیف اور دواوین کا ادبی و لسانی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کو معمول بنائیں اور انوکھی تراکیب و جملے اپنی بیاض میں نقل کرتے رہیں۔ ذیل میں چند مفید اور دواوین کی فہرست دی جاتی ہے:

تصانیف:

مولانا شبلی نعمانی	الفاروق، سیرۃ النعمان

مولانا سید سلیمان ندوی	خطبات مدارس، یادِ رفتگان
مولانا شبیر احمد عثمانی	تفسیری حواشی
مولانا مناظر حسن گیلانی	النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم
مولانا منظور نعمانی	دین وشریعت
مولانا ابوالکلام آزاد	غبارِ خاطر
مولانا عبدالماجد دریابادی	تصوف اسلام
مولانا ابوالحسن علی ندوی	تاریخ دعوت وعظیمت، المرتضیٰ
مولانا ادریس کاندھلوی	سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
مولانا تقی عثمانی	جہانِ دیدہ
جناب شورش کاشمیری	فنِ خطابت
مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی	قصص القرآن
مولانا معین الدین ندوی	سیرت عمر بن عبدالعزیز

دواوین:

بال جبریل (اقبال) سرور زندگی (اصغر) آتش گل (جگر) کشکول مجذوب (حضرت خواجہ مجذوب) صہبائے سخن (حضرت عارفی) کیفیات (ز کی کیفی)۔

تحریر کی مشق کیسے کی جائے؟:

مطالعہ کا طریقہ آپ نے معلوم کر لیا، اب آیئے اس مطالعہ کو کارآمد بناتے ہوئے تحریر کی مشق کا طریقہ سیکھتے ہیں۔تحریر کی مشق کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک "اسکیننگ چارٹ" (حاصل مطالعہ محفوظ کرنے کا جدول) بنایئے۔پھر کسی مشہور صاحب علم وقلم کی تحریر کا مطالعہ کرکے اس چارٹ کو بھر لیجئے۔اس کے بعد:

۱-شروع شروع میں اس چارٹ کے مندرجات کو الگ الگ کرکے اپنے جملوں میں استعمال کریں۔شروع شروع میں یک سطری جملہ کافی ہے۔بعد ازاں رفتہ رفتہ بڑھا کر دو سطری اور سہ سطری جملوں تک لے جائیں۔یہ جملے خیال انگیز اور بامعنی ہونے چاہییں۔

۲-دس چارٹوں کی مشق کے بعد آپ مزید دس چارٹوں کی مدد سے پانچ پانچ سطروں پر مشتمل ایسے پیراگراف لکھیں جن میں یہ مندرجات ملے جلے استعمال ہوئے ہوں۔ان پیراگرافوں کی سطریں باہم مربوط اور کسی مکمل پیغام پر مشتمل ہونی چاہییں۔

جب آپ بیس چارٹ تیار کرکے اس طرح کی مشق کر لیں گے، تو آپ کی تحریری استعداد میں روانی اور نکھار

پیدا ہونا شروع ہو جائے گا، اور آپ تدریجی طور پر مضمون لکھنے کے لیے ذہناً وعملاً تیار ہو جائیں گے، مشق جاری رکھیے ان شاء اللہ کامیابی جلد ہی آپ کے قدم چومے گی۔

"اسکیننگ چارٹ" یا "حاصل مطالعہ کا جدول" اگلے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔ اس سے استفادہ کا طریقہ یہ کہ آپ کسی مشہور ادیب یا کالم نگار کی تحریر لیجیے اور درج ذیل: بڑھتے جائیے۔ اگر آپ جملوں اور پیراگراف کی بیس مشقیں اچھی طرح کر چکے ہیں، تو آپ کے پاس الفاظ کا اتنا ذخیرہ یقیناً جمع ہو چکا ہو گا کہ الفاظ خود بخود نوک قلم سے برآمد ہو کر کاغذ پر گل بوٹے بناتے جائیں گے۔

اسکیننگ چارٹ:

"اسکیننگ چارٹ" یا "حاصل مطالعہ کا جدول" اگلے صفحے پر دیا جا رہا ہے۔ اس کو بھرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی مشہور ادیب یا کالم نگار کی تحریر لیجیے اور درج ذیل امور کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلے زیر لب اور بلند آواز سے اس کی خواندگی کیجیے:

۱۔ تلفظ کی صحت ۲۔ لب ولہجہ کی عمدگی

۳۔ آواز کا اتار چڑھاؤ۔ (اس کا مطلب ہے کہ ہلکے پھلکے اور زور دار جملوں میں فرق کرتے ہوئے آواز میں دھیما پن یا زور واٹھان سمونا، دوسرے لفظوں میں الفاظ کے معانی کے ساتھ آواز کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں نشیب وفراز پیدا کرنا۔

۴۔ وصل ووقف یعنی اس بات کا لحاظ کہ کہاں بالکل نہیں رکنا، کہاں لمحہ بھر کو رکنا ہے اور کہاں پورا سانس توڑنا ہے

۔

آپ دو مرتبہ عبارت پڑھ چکے۔ ایک مرتبہ زیر لب اور ایک مرتبہ قدر بلند آواز سے۔ اب تیسری مرتبہ اس کو پڑھتے جائیے اور الفاظ منتخب کر کے چارٹ کو بھرتے جائیے۔ چارٹ بھر لینے کے بعد اللہ کا نام لے کر کاغذ قلم سنبھال لیے اور اوپر دیے گئے طریقے کے مطابق چارٹ میں درج منتخب الفاظ کو اپنے جملوں اور پیراگرافوں میں استعمال کیجیے۔ اللہ نے چاہا اور اس کا فضل وکرم شامل حال رہا تو آپ چند دنوں میں نتائج خود ملاحظہ کر لیں گے۔ آپ میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی کہ آپ مضمون لکھنے کو معمول کا کام سمجھتے ہوئے بے جھجک لکھنے کا آغاز کریں گے اور خوبصورت انداز میں اس کے اختتام تک جا پہنچیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مضمون نویسی

اپنے خیالات، جذبات، محسوسات اور مشاہدات کو صاف، شستہ اور موثر زبان میں ادا کرنے کا نام مضمون نویسی ہے۔ مضمون نویسی کے لیے چار چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) خیالات:

کسی مضمون میں خیالات جس قدر بلند اور وسیع ہوں گے اسی قدر وہ مضمون اعلیٰ ہوگا۔ خیالات کی بلندی اور عمدگی کے لیے مطالعہ کی وسعت اور مشاہدہ کی گہرائی ضروری ہے۔

(۲) طرز بیان:

ایسے ہی انسان کے پاس عمدہ سے عمدہ خیالات موجود ہوں مگر ان کو پیش کرنے کے لیے وہ مناسب طرز بیان اختیار نہ کرے تو اس کے عمدہ خیالات کی وقعت اور قدر و قیمت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۳) ترتیب:

اگر مضمون نگار اپنی معلومات کو ضروری ترتیب کے ساتھ قرطاس پر منتقل نہ کرے تو اس سے قارئین صحیح معنوں میں مستفید نہیں ہو سکتے۔ ربط، ترتیب اور تسلسل کے بغیر جو کچھ بھی لکھا جائے گا اس کی حیثیت لفظوں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہ ہوگی۔

(۴) صحت زبان:

ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ صحت زبان کا خیال رکھنا بھی ازبس ضروری ہے۔ یعنی جو کچھ لکھا جائے، املا، لغت، محاورۂ زبان اور قواعد کے لحاظ سے پوری طرح درست ہو۔

مضمون کے حصے:

ایک مضمون کے مندرجہ ذیل تین حصے ہوتے ہیں:

(۱) ابتدائیہ (۲) مرکزی خیال (۳) خاتمہ

ابتدائیہ:

اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے چند سطروں میں اپنے موضوع کی طرف اشارہ کرنے کا نام ابتدائیہ اور تمہید ہے۔ اس سے پڑھنے والے کی طبیعت آنے والے بیان کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ تمہید کے بغیر مضمون ایسا ہی ہے جیسے چہرے کے بغیر جسم، اس لیے مضمون کے آغاز میں ایک تمہیدی پیراگراف ضرور لکھیے۔ تمہید طویل نہیں ہونی چاہیے، بل کہ اس کا مختصر او ردلچسپ ہونا ضروری ہے۔ مضمون کا اندازہ عام طور پر تمہید ہی سے لگایا جاتا ہے۔

مرکزی خیال:

یہ حصہ مضمون کا اصل، سب سے اہم اور مرکزی حصہ ہوتا ہے۔ اس کو بڑی محنت اور توجہ سے لکھنا چاہیے۔ نفس مضمون ایک ہی پیراگراف پر مشتمل نہیں ہوتا بل کہ حسب ضرورت اسے کئی پیراگرافوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔

خاتمہ:

یہ مضمون کا آخری حصہ ہوتا ہے۔اسے ہم پورے مضمون کا حاصل یا نچوڑ یا آخری کہتے ہیں۔ جس طرح مضمون کی تمہید کا مختصر او رد لکش ہونا ضروری ہے، اسی طرح مضمون کا اختتام بھی بڑا موثر اور دل پذیر ہونا چاہئے۔مرکزی خیال میں جو کچھ لکھا گیا ہو اس کا خلاصہ اور ما حصل آخری پیراگراف میں سمو دینا، پڑھنے والے کو کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

مضمون کی قسمیں:

مضمون مختلف قسم کے ہوتے ہیں:

خطابی: جس میں خطابت وتقریر کا انداز ہو۔

فکری: جس میں کسی موضوع پر اپنی فکر کا نچوڑ پیش کیا گیا ہو اور اس کا تعلق خالص غور وفکر اور ذہن واحساس سے ہو۔

علمی وتحقیقی: جس میں کسی موضوع پر حوالہ جات کے ساتھ علمی وتحقیقی انداز میں بحث کی گئی ہو۔

بعض حضرات نے مضمون کی تین قسمیں اس طرح بیان کی ہیں:

مضمون بیانی: جس میں کسی چیز، جگہ یا جاندار کا بیان ہو، مثلاً: دارالعلوم دیوبند پر مضمون لکھنا ہو تو اس کا محل وقوع، اس کی تاریخی اہمیت، قیام کا پس منظر ومقاصد، بانی اور مشہور شخصیات، اس کی خدمات اور قربانیاں اس کی عمارت اور ذیلی ادارے۔۔۔۔کوئی اور مدرسہ ہو تو اس کا محل وقوع، اس کو قائم کرنے والوں کا تذکرہ، اس کی درس گاہوں اور اساتذہ اور طلبہ کا ذکر، اس علاقہ میں اس کی ضرورت واہمیت وخدمات کا بیان۔۔جانور مثلاً: شیر پر لکھنا ہو تو اس کی شکل وصورت، جسمانی بناوٹ، اس کی خصوصیات اور اسکے فوائد ونقصان کا تذکرہ، رہن سہن کا بیان۔

مضمون حکائی: جس میں کوئی واقعہ یا کسی کی سوانح عمری بیان کی جائے مثلاً: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ، ہجرت کا واقعہ، فتح مکہ کا واقعہ، سوانح مثلاً حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالی کے حالاتِ زندگی لکھنے ہوں تو ولادت، خاندان کا تعارف، ولادت کی تاریخ اور جگہ، بچپن کے حالات، تعلیم وتربیت، بیعت وارشاد، اخلاق وکردار، خدمات وکارنامے اور وفات کا تذکرہ۔آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، سوانح خاکے اور سفرنامے وغیرہ بھی حکائی مضمون کے زمرے میں آتے ہیں۔

مضمون ذہنی: جو خالص ذہن وعقل اور غور وفکر سے متعلق ہوں۔یہ وہی ہے جسے پہلے "مضمون فکری" سے تعبیر کیا گیا تھا۔اس میں بہت سوچنا پڑتا ہے، ذہن پر زور دینا ہوتا ہے، تیز خاطر اور فکر رسا کی ضرورت ہوتی ہے۔ظاہر بات ہے کہ ایک ایک بات کو سوچ سوچ کر لکھنا آسان کام نہیں، مثلاً یہ موضوعات "مضمون ذہنی وفکری" سے تعلق رکھتے ہیں۔

حفظانِ صحت، مقصدِ زندگی، ایمان داری، انسانیت، خودداری وغیرہ۔

عمومی ہدایات:

مضمون نگاری سیکھنے کے لیے درج ذیل ہدایات غور سے پڑھیں اور ان پر عمل کریں، ان شاء اللہ تعالیٰ مضمون نگاری آجائیگی۔

(۱) اچھے مضمون کے لیے وسیع مطالعہ ضروری ہے، لہٰذا جسے مضمون لکھنے کا شوق ہے اسے چاہیے کہ مطالعہ کو عادت بنائے اور کتابوں سے دل لگائے۔ جب کسی موضوع پر اتنا پڑھ چکیں کہ دل کا پیالہ چھلکنے لگے تو سمجھے کہ اب آپ روانی سے مضمون لکھ سکیں گے۔ اس لیے مضمون لکھنا ہو یا نہ ہو، دوسرے مضامین اور کتابوں کا مطالعہ ضرور کیجئے تا کہ مختلف موضوعات پر آپ کو مواد ملے، معلومات میں اضافہ ہو اور کسی موضوع پر لکھنے کے لیے آپ کو مواد تلاش کرنا ہو تو ذہن میں رہے کہ فلاں کتاب اور فلاں رسالہ میں ملے گا۔

مطالعہ ان کتابوں کا کیجئے جو معتبر و مستند علماء و فضلا اور مشہور ادیبوں کی تصانیف ہوں اور ایسے رسائل و جرائد ہوں جن میں اسی قسم کے حضرات کے مضامین و مقالات شائع ہوتے ہوں۔

وہ تحریریں جن میں دینی و علمی مواد کے ساتھ زبان و ادب کی چاشنی بھی ہو آپ کے لیے اس اعتبار سے بے حد مفید ثابت ہونگی کہ اس سے آپ کا اسلوب تحریر بھی نکھرے گا۔

(۲) جس کتاب یا مضمون کا مطالعہ کیا ہو، مطالعہ کرنے کے بعد سوچیے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے؟ آپ کے ذہن میں اس کی کون کون سی باتیں موجود ہیں؟ انہیں اپنے الفاظ میں لکھیے۔ باتیں اگر ذہن سے نکل گئی ہوں تو دوبارہ کتاب یا مضمون پر سرسری نگاہ ڈال لیجیے تا کہ تازہ ہو جائیں۔ عادت ڈال لیجیے کہ مطالعہ کے وقت پنسل ہاتھ میں ہو اور اہم باتیں (اگر کتاب اپنی ہے) خط کشیدہ ہوتی جائیں نیز بہت اہم نکات کی یادداشت کتاب کے شروع میں ملحقہ خالی کاغذ پر سلیقہ اور ترتیب سے لکھی جاتی رہیں۔

(۳) خالص طبع زاد مضمون لکھنے سے پہلے بطور مشق کسی دوسری زبان مثلاً عربی رسائل و جرائد کے مقالات و مضامین کو سامنے رکھ کر اس کی روشنی میں اسی موضوع پر اپنے الفاظ میں اردو مضمون لکھیے۔

(۴) اور اب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آ گیا۔ خود سے کوئی عنوان سوچیے یا اپنے استاذ سے کوئی عنوان پوچھ لیجیے، پھر غور کیجیے کہ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کیا کیا باتیں آ رہی ہیں؟ سب کو کسی کاغذ پر الگ الگ نمبر ڈال کر لکھتے جایئے۔ اس بات پر بھی غور کیجیے کہ آپ کے عنوان کا مواد کن کتابوں اور رسالوں میں مل سکتا ہے؟ وہ کتابیں اور رسالے حاصل کر کے متعلقہ مضمون پڑھ ڈالیے۔

پہلے سے پڑھ رکھا ہو تو بھی ایک سرسری نگاہ ضرور ڈالیے۔ اگر عنوان پر کتب و رسائل کے نام خود ذہن میں نہ آ سکیں، تو اپنے اساتذہ سے معلوم کر لیجیے۔

(۵) اب آیئے مضمون کی ترتیب کی طرف :

آپ نے اپنے ذہن میں آئی ہوئی جو باتیں الگ الگ نمبر ڈال کر لکھ رکھی ہیں انہیں دیکھیے کہ ان میں کیا چیز

کب اور کس ترتیب سے آنی چاہیے۔

(۶) اب مضمون لکھنا شروع کیجیے اور جو بات جس ترتیب سے لکھنا مناسب نظر آئے لکھ ڈالیے، مضمون لکھتے وقت بھی بہت سی باتیں ذہن میں آسکتی ہیں انہیں بھی لکھ ڈالیے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جو باتیں آپ نے پہلے لکھ رکھی تھیں ان میں سے کچھ کا لکھنا مناسب نظر نہ آئے انہیں چھوڑ دیجیے۔

(۷) عنوان متعین ہوجانے کے بعد نو آموزوں کو سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مضمون شروع کس طرح کریں؟ تمہید میں کیا باتیں لکھیں؟ اس میں بہت دیر لگ جاتی ہے اور طبیعت گھبرانے اور اکتانے لگتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ خواہ کتنی ہی دیر لگے، کتنی ہی طبیعت گھبرائے ہمت نہ ہاریے، اٹھا کر نہ رکھ دیجیے، سوچتے رہیے، عنوان کی تعریف وتعارف میں غور کرتے رہیے، سوچتے سوچتے کوئی بات ذہن میں آئے گی ضرور، اور جب کوئی بات ذہن میں آجائے فوراً لکھنا شروع کردیجیے، خواہ بعد میں وہ کتنی ہی بے جوڑ اور نا مناسب لگے، مضمون صاف کرتے وقت اسے کاٹ دیجیے گا لیکن اس وقت اس کو ضرور لکھ لیجیے۔

مضمون شروع ہوجانے کے بعد درمیان میں بھی طبیعت اُچاٹ ہونے لگتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں؟ ایسی صورت میں اگر ذہن پر زیادہ زور ڈالنے کے باوجود سمجھ میں نہ آوے تو اُٹھا کر رکھ دیجیے، پھر کسی وقت لکھنے بیٹھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب کوئی بات ضرور ذہن میں آئے گی۔ اگر لکھتے لکھتے پھر اکتاہٹ ہونے لگے تو اُٹھا کر رکھ دیجیے، پھر کسی وقت میں لے کر بیٹھیے گا۔

خلاصہ یہ کہ پورا مضمون ایک نشست میں مکمل کرنے کی فکر ہرگز نہ کیجیے بل کہ مختلف نشستوں میں کام کیجیے، اس سے آپ کا مضمون مکمل بھی ہوجائے گا اور زیادہ عمدہ بھی، کیوں کہ ہر بار دل ودماغ تروتازہ ہونے کی وجہ سے ذہن میں باتیں خوب آئیں گی۔ تنہائی اور سکون کا ماحول مہیا کرنے سے ذہن خوب ساتھ دیتا ہے۔

(۸) لفاظی اور مسجع مقفی عبارتیں لانے سے پرہیز کیجیے۔ جو پرشکوہ الفاظ خود سے نوک قلم پر آجائیں لکھ ڈالیے، بالقصد اس قسم کی کوششیں فضول ہیں اور آج کے ادب میں متروک، اسی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشکل الفاظ استعمال کرنا اور عبارت کو دق وگنجلک بنانا بھی آج کے اسلوب تحریر کے خلاف ہے۔

(۹) اب کچھ باتیں سلیقۂ تحریر کے متعلق:

دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھیے، ایک بات کو بار بار نہ لکھیے۔ حروف درست ہو، املا صحیح ہو، سطریں سیدھی ہو، سطروں کے درمیان مناسب جگہ چھوڑی گئی ہو، اس کے لیے صاف ستھرا کاغذ بہتر ہے، کاغذ کے صرف ایک طرف لکھیے، ایک بات مکمل ہوجانے کے بعد پیراگراف بدل دیجیے۔

کاما، ڈیش، سوالیہ، بریکٹ اور رواوین وغیرہ کے استعمال سے واقفیت حاصل کیجیے، دوسرے کی عبارت کیسے نقل کی جاتی ہے؟ اگر اسے پورا نقل نہ کرنا ہو تو محذوف عبارت کی جگہ کس طرح نقطے لگائے جاتے ہیں، یہ ساری باتیں مضمون نگاری سیکھنے والوں کو جاننا ضروری ہے۔

تحریر کے تین مرحلے ہوتے ہیں: ترتیب، تسوید، اور تبییض، مراجع کا مطالعہ کرکے اور ضرورت کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد سوچیے کہ کس ترتیب سے لکھا جائے۔ بعض اوقات پہلے کی قائم کردہ ترتیب ہی کافی ہے، بعض اوقات اس میں ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ کو ختم کرنا پڑتا ہے، کچھ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے، کچھ میں تقدیم وتاخیر کرنی پڑتی ہے، جیسی ضرورت ہو اس کے مطابق اور اسی ترتیب سے لکھنا شروع کیجیے۔

اس طرح لکھیے کہ بات مرتب انداز میں شروع ہو اور مرتب انداز میں اختتام تک پہنچے۔ مسودہ تیار ہونے کے بعد اسے دو تین بار پڑھ لیجیے۔ عبارتوں میں کاٹ چھانٹ اور اضافہ وترمیم کیجیے۔ جب دل مطمئن ہو جائے، تو آخری بار اسے دوسرے کاغذ پر نقل کر لیجیے۔ گویا مسودہ کو مبیضہ کی شکل دیجیے۔

(۱۰) مسودہ کو مبیضہ بنانے کے لیے اس مضمون کو کسی دوسرے کاغذ پر نقل کیجیے۔

اب بھی جو عبارت اچھی نہ لگتی ہو یا زائد معلوم ہو اسے بدل دیجیے یا حذف کر دیجیے۔ جو بات لکھنے کے قابل سمجھ میں اسے شامل کر دیجیے۔ یقیناً مضمون صاف کرتے وقت بہت سی نئی باتیں سمجھ میں آئیں گی، اور پہلے کی لکھی ہوئی بعض باتیں معلوم ہونگی، کہیں انداز تحریر اچھا نہ لگے گا، لہٰذا سب میں ترمیم کرتے جائیں اور جس پر دل مطمئن ہو وہ عبارت لائیں۔ اگر ابتدائی مراحل میں کئی کئی مرتبہ کسی مضمون کو صاف کرنا پڑے تو بھی نہ گھبرائیں۔ انہی مشقتوں سے گزرنے والا ہی کندن بنتا ہے لگاتار کوشش ضروری ہے ہر ماہ کم ایک مضمون لکھے۔ کوشش کیجیے کہ فل اسکیپ ساز کے ایک صفحہ سے کم کا نہ ہو۔

استاذ کی رہنمائی

مضمون نگاری سیکھنے کے لیے کسی استاذ (جو مضمون نگار ہو) کی رہنمائی حاصل کیجیے، ان سے عنوان ومواد پر مشورہ لیجیے، اپنے لکھے ہوئے مضامین اصلاح کے لیے پیش کیجیے، وہ ان میں کاٹ چھانٹ کریں گے، بعض وقت لمبی لمبی عبارتیں کاٹ دیں گے، اور اس کی جگہ مختصر سا جملہ لکھ دیں گے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری عبارت کاٹ دیں اور کچھ نہ لکھیں۔

بعض اوقات آپ کے استاذ ایسی عبارتوں کو کاٹ دیں گے جو آپ نے بڑی محنت سے لکھی ہوں گی اور آپ کے خیال میں بڑی اہم ہوں گی، مگر چوں کہ متعلقہ موضوع پر استاذ کی نگاہ میں وہ غیر ضروری، غیر مفید، یا اسلوب تحریر کے اعتبار سے نامناسب ہوگی، اس لیے وہ اُسے قلم زد کر دیں گے۔

آپ اس سے بالکل نہ گھبرائیں اور دل چھوٹا نہ کریں، کوئی بڑے سے بڑا مضمون نگار ایسا نہیں مل سکتا جس کے مضامین ابتداء ردی کی ٹوکری میں نہ ڈالے جاتے رہے ہوں اور ان میں کاٹ چھانٹ نہ کی جاتی رہی ہو۔ یہی کاٹ چھانٹ آئندہ آپ کے ذہن کو جلا بخشے گی، اور آپ ضروری وغیر ضروری متعلق وغیر متعلق، مفید وغیر مفید کے درمیان تمیز وتفریق کرنا سیکھ جائیں گے۔

مضمون نگاری سیکھنے کے بعد اپنے ابتدائی مضامین کو آپ دیکھیں گے تو [illegible] ۱۴۳۲ھ گا کے استاذ کی کاٹ چھانٹ بالکل برمحل تھی، آپ خود ان میں پھر سے ترمیم کی ضرورت محسوس کریں گے۔

مضمون نگاری سیکھنے کا ایک آسان طریقہ:

صحافت و اخبار نویسی بھی مضمون نگاری کی ہی ایک قسم ہے۔اس کے لیے مختلف اخبارات وجرائد کا مستقل مطالعہ ضروری ہے۔خبروں کی رپورٹنگ اس کا ابتدائی مرحلہ ہے۔کالم نگاری درمیانی مرحلہ اور اداریہ وغیرہ لکھنا انتہائی مرحلہ۔کسی قومی وملی مسئلہ پر اخبارات میں مراسلہ بھیجنا بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔نوآموز طلبہ اسی سے اپنی صحافتی مشق کا آغاز کرسکتے ہیں۔

آپ اپنے یہاں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں مرتب کرکے اخبارات میں بھیجئے یعنی نامہ نگاری سے ابتدا کیجیے، مثلاً آپ کے مدرسہ میں سالانہ جلسہ ہوا، اس کی خبر اخبار میں روانہ کیجیے، کسی اہم مہمان کی آمد واستقبال کی خبر بھیجئے، کسی ملی مسئلہ پر اخبار کو مراسلہ بھیجئے ،وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب صحافت سیکھنے کے طریقے ہیں۔

ہدایات:

☆جو کچھ لکھئے اپنے موضوع کے عین مطابق لکھیے۔ادھر ادھر کی غیر متعلق باتیں لکھ کر مضمون کو خواہ مخواہ طویل بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

☆مضمون کی ابتدا چونکا دینے والی، تجسس پیدا کرنے والی اور انتہا تشفی اور تسکین دینے والی ہونی چاہیے ۔جس مضمون نگار کو اس پر قدرت حاصل ہو وہ کامیاب اور مقبول مضمون نگار رہتا ہے، اور کامیابی سے مطلوبہ نظریہ، قارئین تک پہنچا سکتا ہے۔

☆مضمون میں الفاظ یا معانی کا تکرار ہرگز نہ ہونا چاہئے۔الفاظ کو مکرر لانا پڑے تو مترادفات کا استعمال کریں، اس سے عبارت میں حسن بھی پیدا ہوجائے گا۔

☆کسی واقعہ کو بیان کرتے وقت، اس کی ترتیب کو قائم رکھئے، آگے کی بات پیچھے، اور پیچھے کی بات آگے لکھنے سے مضمون بے ربط ہو کر رہ جاتا ہے۔

☆مضمون کے آغاز یا خاتمے پر، موقع کی مناسبت سے کوئی عمدہ شعر لکھنا بہت اچھا ہے، درمیان میں بھی حسب ضرورت لکھا جاتا ہے، لیکن مضمون میں اشعار کی بھرمار ہرگز نہیں ہونا چاہیے، بالعموم ایک مضمون میں دو یا تین شعر کافی ہوتے ہیں۔

☆مضمون میں ایک ایسا شعر نہ لکھیے جو آپ کو صحیح طور پر یاد نہ ہو، نیز اس شعر کا آپ کے موضوع سے تعلق بھی ضرور ہونا چاہیے، علاوہ ازیں کوئی ایسا لفظ یا محاورہ مضمون میں ہرگز استعمال نہ کیجیے، جس کے معنی آپ کو نہ آتے ہوں، یا

جسے آپ سمجھ نہ سکتے ہوں۔

☆مضمون مکمل ہو جانے کے بعد نظر ثانی ضروری ہے تاکہ اغلاط کی تصحیح ہو سکے یا تحریر کی نوک پلک درست کی جاسکے۔نظر ثانی کرتے وقت مضمون میں کاٹ چھانٹ ،حذف واضافہ کیجیے،اور اپنے اعتبار سے ایک بار پھر مکمل کیجیے۔

تحریر و مضمون نگاری کے لیے اتنا کافی ہے،لہٰذا طلبہ سے دردمندانہ اپیل کی جاتی ہے،کہ وہ بھی قلم ہاتھ میں تھامیں اور میدان کارزار میں کود پڑیں۔

امید ہے کہ جہاد بالقلم سے بھی بہت سے لوگوں کو ہدایت مل جائے گی،تاکہ ہماری نجات کا سبب بن جائے۔

آمین یارب العالمین!

قرآن خیر کے انقلاب کا داعی

آج جتنا قرآن سے دور ہوتے جارہے ہیں اتنا ہی فساد برپا ہو رہا ہے اور شر کا انقلاب آتا جارہا ہے کہ لوگ خیر سے شر کی طرف آرہے ہیں۔علم سے جہالت کی طرف آرہے ہیں تہذیب سے بد تہذیبی کی طرف۔تو انقلابِ حسن کو قرآن پیدا کرتا ہے اور انقلابِ شر ترکِ قرآن پیدا کرتا ہے۔قرآن کو ترک کردو گے تو دوسرا انقلاب آتا چلا جائے گا،تہذیب سے بد تہذیبی ہوتی چلی جائے گی؛علم ختم ہو جائے گا،جہالت سے اخلاقِ حسنہ جاتے رہیں گے،بداخلاقیاں پیدا ہوتی جائیں گی؛اس لیے علم،اخلاق اور کمالات،یہ قرآن ہی سکھاتا ہے؛جب آدمی اس جڑ سے وابستہ نہ رہے تو کمالات کی شاخیں سامنے کہاں سے آجائیں گی۔بہر حال قرآن برکت بھی ہے،ہدایت بھی ہے،نور بھی ہے اور انقلاب بھی ہے،کہ جب آتا ہے تو کایا پلٹ دیتا ہے۔

(ملفوظ:حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ،جواہر حکمت:ص ۴۵)

تحسین خط اور رموز اوقاف

مولانا افتخار احمد قاسمی بستوی
استاذ:جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں اور ان گنت احسانات میں ایک عظیم نعمت واللہ کی مربانی قلم کی نعمت ہے جس کی شکر گذاری ہی یہ ہے کہ:

میری زبان وقلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی کو شکوہ نہ ہو زیر آسمان مجھ سے

زبان وقلم کا صحیح استعمال، شریعت اسلامیہ کا ایک حکم، سماج کا ایک قانون، صحافت وادب کا ایک ضابطۂ اخلاق اور تہذیب کی ایک واضح پہچان ہے۔

کوئی بھی زبان ہو،اس کو دو طرح استعمال کیا جاسکتا ہے ایک تو یہ ہے کہ اسے بولا جائے اور مخاطب اس کا مفہوم سمجھ کر اس پر عمل درآمد کرے اپنی ذمے داری سے عہدہ برا ہو جائے، دوسرے یہ ہے کہ اس زبان کو قید تحریر میں لا کر اور اسے کسی کاغذ وغیرہ پر لکھ کر دوسرے کی خدمت میں پیش کیا جائے، جسے وہ پڑھ کر، مطلب سمجھے پھر اس کو عمل میں لاکر اپنی حاجت برآری کرے۔ظاہری بات ہے کہ زبان کے ان دونوں طریقہائے استعمال میں جو چیز مقصود و مطلوب بن کر ابھرتی ہے، وہ اس کی تفہیم وتشریح اور مخاطب تک اپنی سوچی سمجھی فکر کو پہونچانا ہے، اس تفہیم وتشریح اور ترسیلِ فکر میں وضاحت وسلاست، سلامتی وتحسین کا سب سے بڑا دخل ہے۔

ایک آدمی اپنی فکر کی ترسیل بول کر، کرنا چاہتا ہے، تو یہ عقلی قانون ہوگا، کہ زبان صاف وشستہ ہو، الفاظ و عبارات کی بندش مخاطب کی صلاحیت وپرداخت کے معیار سے ہم آہنگ ہو، فصاحت وبلاغت کا درجہ اتنا اونچا بھی نہ ہو کہ مخاطب سمجھ بھی نہ سکے اور اتنا فروتر بھی نہ ہو کہ اوچھا پن معلوم ہو، بات سادگی کا پیکر، حسن وجمال کی تجسیمی شکل اور سلیقہ مندی وصفائی کا معدن ہو۔

اسی طرح ایک آدمی اپنی فکر کی ترسیل تحریر کو ذریعہ بنا کر کرنا چاہتا ہے، تو ظاہری بات ہے کہ عقل وخرد کا یہی فیصلہ ہوگا کہ تحریر کی بناوٹ قابلِ قبول ہو، الفاظ وحروف اتنے صاف اور بڑے ہوں کہ کم از کم یہ تو نظر آئے کہ لکھا کیا ہے، پڑھا کیا جائے۔عبارات وجملے ایسی ترکیب لیے ہوں کہ پڑھنے والے پڑھتے پڑھتے مفہوم اپنے ذہن میں بٹھا لے جائیں۔انہیں کسی طرح کی ایسی دشواری پیش نہ آئے کہ لکھنے والے نے کیا لکھ دیا ہے، اور مجھے اس تحریر کو پڑھ کر کیا کرنا چاہیے؟

اسی مفہوم کی ترسیل کا سادہ وغیر مرئی عمل تحریر کے ذریعے اگر پیش آرہا ہے، تو تفہیم وتشریح میں جتنی چیزیں ممد ومعاون ثابت ہوں گی، سنجیدگی کے تقاضے میں وہ ذوق ووجدان کے فیصلے سے اصول کا روپ لے لیں گی۔

پھر بھی اہلِ زبان وقلم نے اپنی معلومات کی حد تک بہت سے ایسے اصول وضوابط تشکیل دے ہی دیے ہیں جن مین تفسیر وتشریح اور تفہیم وترسیل کا عمل بھی بآسانی انجام پا جاتا ہے۔

چناں چہ اس سلسلے کی سب سے پہلی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک پڑھے لکھے انسان کے لیے یہ بات از حد ضروری ہے کہ اس کی تحریر کا خط کم از کم ایسا ہو کہ وہ خود پڑھ سکے، ''لکھیں موسیٰ، پڑھیں خدا'' کا مصداق نہ ہوں اس کے

حروف اور نقطے ایسے صاف اور واضح نگارش کے ساتھ ہوں کہ پتہ چلے کہ "ص" بنایا ہے یا "ض"، نقطے جن حروف پر ہوں انہیں پر رکھے جائیں، ایسا نہ ہو کہ نقطے رکھنا مطلوب ہے آنے والے حرف پر اور رکھ دیا ہے اس سے پہلے ہی والے حرف پر، اس طرح پڑھنے والا اس لفظ کو کچھ کا کچھ پڑھ لے گا اور مقصد بدل کر تحریف معنوی کا مفہوم پیدا کر دے گا۔

استاذ گرامی مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہٗ ایڈیٹر ماہنامہ "الداعی" عربی دارالعلوم دیوبند تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ "حسن خط انسان کا بہت خوب صورت زیور ہے، میں تو کہا کرتا ہوں کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے لیے زیبا نہیں کہ وہ بدخطی کے مرض میں مبتلا ہو، اگر خدانہ خواستہ مبتلا ہو تو اسے "زود اثر دواؤں" کے ذریعے اس کا ازالہ کرنا چاہیے، طالب علمی کے زمانے میں، میں حسنِ خط کا اس درجے رسیا تھا کہ جس طالب علم، بل کہ عالم کا خط برا دیکھتا تھا، تو مجھے اس کے علم کے متعلق بدظنی ہو جایا کرتی تھی اور مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ اس کو کچھ بھی آتا پتا نہیں ہے، یہ جاہل مطلق ہے، جب اس نے اپنا خط تک درست نہیں کیا، سطریں ٹیڑھی میڑھی ہوتی ہیں حد یہ ہے کہ املا تک درست نہیں ہے، تو اس نے خاک پڑھا ہوگا، ۔۔۔۔۔۔۔ میرا یہ یقین ہے کہ بدخطی اندرونی نفسیاتی اور ذہنی خامیوں، انتشار اور بے ترتیبی کی عکاس ہوتی ہے۔

(حرف شیریں: ۸۷،۸۸)

چناں چہ علمائے نفسیات (Seycholigical Researchars) آدمی کی خوش خطی اور اس کی بدخطی سے، اس کی اندرونی منفی و مثبت کیفیات کا بہ خوبی اندازہ لگا لیتے ہیں، کیوں کہ انسان کی نفسیاتی خصوصیتیں اس کے ظاہری اعمال و کردار میں تجسیمی شکل میں ظاہر ہو جایا کرتی ہیں جس سے نفسیات کا طالب علم کسی کے اندرون کو پڑھ لینے پر قادر ہو جاتا ہے۔

تحسین خط اور نفسیاتی حقائق

علمائے نفسیات نے تحسین خط اور تحسین و تقویم سطور کے سلسلے میں کچھ حقائق قلم بند کیے ہیں جن کو جاننا اور دوسروں تک ان حقائق کو پہونچانا ضروری ہے۔

(۱) علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ اگر عبارت کی سطریں سیدھی ہیں، اور لائن بالکل خط مستقیم پر چل رہی ہے، تو اس سے کاتب کی سلامت روی اور گردو پیش سے باخبری معلوم ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والا پیش آنے والے نقصانات و خطرات سے کسی قدر چوکنا اور باخبر ہے۔

(۲) اگر کسی راقم کی تحریریں، لکھتے لکھتے اوپر کی جانب چلی جائیں تو اس سے راقم کی بلند ہمتی عالی حوصلگی معلوم ہوتی ہے۔ ان حضرات کا تجربہ ہے کہ دنیا میں جو لوگ بڑی بڑی تجارتوں کے مالک ہیں ان کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا تو شروع شروع میں ان کی تحریری سطریں سیدھے خط مستقیم پر جارہی ہوتی ہیں لیکن آگے چل کر وہ اوپر کو چڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔

(۳) اس کے برعکس اوپر سے نیچے کو اترتی ہوئی سطریں جو سیدھی شروع ہو کر آہستہ آہستہ نیچے کو مڑتی چلی جاتی ہیں راقم و کاتب کی گم نامی، قناعت سے دل چسپی اور بے نامی کی طرف غماز ہوتی ہیں، ایسی تحریریں عموماً خواتین اور گوشہ نشین

لوگوں کی ہوا کرتی ہیں۔

(۴) کبھی آپ دیکھتے ہوں گے کہ تحریر ٹیڑھی میڑھی، اوپر نیچے کو جاتی ہوئی نظر آتی ہے، اس تحریر سے علمائے نفسیات راقم کے ذہنی تردد، فیصلہ کی قوت میں کمی، الجھاؤ اور نامعلوم وحشت کا پتہ لگاتے ہیں۔

(۵) ایسی تحریر جس کے حروف بالکل متوازن ومتناسب ہوں، لکھنے والے کی طبعی نظافت، سلیقہ شعاری، اور ترتیب پسندی کو بتلاتی ہے۔

(۶) اگر ج، س، ش، ع، ح، کے دائروں کو توجہ والتفات سے خوب گول اور عمدہ بنانے کی کوشش کرکے تحریر لکھی گئی ہو تو راقم کے صبر شعار، متین طبع اور ٹھنڈے مزاج کی دلیل ہے۔

(۷) بعض تحریروں میں آخری حرف کو خوب کھینچ کر لکھا ہوا دیکھایا جاتا ہے، اس سے کاتب کی مبالغہ پسند طبیعت اور عیش کوشی کا پتہ چلتا ہے۔

(۸) تحریر کے حروف ایک دوسرے سے مل جائیں تو اس سے کاتب کی عجلت پسندی اور جلد بازی کا پتہ چلتا ہے۔

(۹) تحریر کی شکل وصورت کا اعتدال کاتب کے معتدل المزاج ہونے اور اس کی حلم جوئی، نرم خوئی، خوش اخلاق اور وسیع القلبی کا غماز ہے۔

(۱۰) مرتب تحریر جس کے حروف چھوٹے چھوٹے ہوں تو راقم کی لطیف المزاجی اور جذبات کی پاکیزگی کی غماز ہے۔

(۱۱) بخیل، لالچی، جزرس کم خرچ آدمی کی تحریر باریک حروف والی اور اس کے حروف ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔

(۱۲) بحث ومباحثے کا عادی شخص جب کچھ لکھتا ہے تو اس کی تحریر کے حروف عموماً کھڑے کھڑے اور الف لام وغیرہ پائے کی طرح ہوتے ہیں۔

(۱۳) اپنی ذات کے سلسلے میں لاپرواہ اور جلد باز اشخاص کی تحریروں میں "ب" اور "ف" میں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ علمائے نفسیات کی ان مذکورہ بالا تحقیقات کی روشنی میں یہ باور کرنا آسان ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑ ہی جاتا ہے، اور باطن ظاہر کے ذریعہ اپنے مثبت یا منفی وجود کی اطلاع بتلا ہی دیتا ہے، اس لیے تحسین خط اپنے معانی کی ترسیل میں ایک مثبت مفہوم کی راہ دکھلاتا ہے۔ جس کی آج کل مدارس وجامعات اور عصری درس گاہوں تک میں اشد ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تحسینِ خط کا عمل نوایجاد کمپیوٹر کی مشینری نے لے لیا ہے، اور آئے دن اس کی کثرت تحریر وتحسین کی اہمیت گھٹانے میں بڑا اہم رول ادا کررہی ہیں۔ لیکن اسی کی باوجود ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر کی اہمیت جوں کی توں برقرار ہے، کمپیوٹر سے وہی آدمی صحیح صحیح بٹن دباکر "کی بورڈ" استعمال کرنے میں ماہر ہوسکتا ہے جو تحسینِ خط کا قدرے مشاق ہو، اور ہاتھ کی تحریر آج بھی قدر کی نظروں سے دیکھی جارہی ہے اور ہاتھ کی تحریر والوں کی کوناگوں اقسام ہی تو کمپیوٹر کے حوالے کی گئی ہے لہٰذا تحسینِ خط ترسیل معانی کے عمل کو صحت کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے۔

معانی کو دوسروں تک پہونچانے میں ممدو معاون ایک دوسری چیز رموز اوقاف ہیں، رموز اوقاف کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر اس کا حد درجے صحیح صحیح خیال و استعمال نہ کیا جائے تو مثبت سے منفی، سوال سے جواب اور ایجاب سے سلب کا معنی ولبادہ اوڑھ لیتا ہے، اور قاری عبارات وجملوں کا مطلب بالکل اس کے برعکس سمجھتا ہے جو کاتب یا رائٹر لکھنا چاہ رہا ہے؛ رموز اوقاف کی اہمیت عربی، اردو اور انگلش کے علاوہ دنیا کی تمام قابلِ لحاظ بولی اور لکھی جانے والی زبانوں میں ہے۔

اس وقت انگلش زبان کا چلن چوں کہ بہت زیادہ ہے اس لیے آپ دیکھیں گے کہ انگریزی زبان کے ماہرین واستعمال کنندگان نے رموزِ اوقاف کے ضابطے انگریزی زبان میں طے شدہ ہیں، ان کو بڑی پختگی اور پابندی سے استعمال کرتے ہیں، حتی کہ انگریزی کے سرکاری اسکولوں میں انگریزی کے امتحانات کے پرچوں میں اگر رموز اوقاف (Punctuation) کی رعایت کے ساتھ تحریر نہ لکھی گئی تو جتنی رموز اوقاف سے متعلق غلطیاں راقم سے سرزد ہوں گی سب کے نمبرات علیحدہ کٹ جائیں گے۔

لیکن یہی رموز اوقاف جب عربی، قائین یا اردو قارئین کو برتنے کے لیے کہا جاوے تو اسے بالکل درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے، یا سادہ سی بات کہہ کر ٹال جاتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رموز اوقاف کی رعایت شاید ان کی نظر میں کوئی خاص توجہ کی چیز نہیں۔

حالاں کہ انگریزی کی طرح بل کہ اس سے کہیں زیادہ رموزِ اوقاف کی اہمیت عربی میں ہے، جس کا اندازہ اسلاف کی کتابوں سے ہوتا ہے۔

عربی زبان وادب کے جملے اور عبارات اگر رموزِ اوقاف سے آراستہ ہوں تو اس کو کاتب بار بار رک کر لکھنے میں الجھن محسوس کرتا ہے، جیسے کہ یہ کوئی چیز نہیں، حالاں کہ رموزِ اوقاف کی رعایت کو اصولاً انگریزی زبان سے دل چسپی رکھنے والوں نے (Dark Aage) میں مسلمانوں ہی کی عربی زبان سے لے کر اپنی زبان کو اس سے آراستہ کیا ہے۔

اب صورتِ حال ایسی بدلی کہ مسلمان عربی زبان وادب میں رموزِ اوقاف کی رعایت کو ایک امر زائد تصور کر بیٹھے ہیں، جب کہ مسلمانوں کے نزدیک معانی کی ترسیل میں جتنے باریک باریک فرق ہیں اتنا کسی اور مذہب ودین کے ماننے والوں کے نزدیک نہیں، ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ ایک حکم مباح، مستحب، سنت غیر موکدہ اور سنت موکدہ واجب اور فرض ہو جاتا ہے، اور اس کو اس کے مقام سے ذرا بھی اوپر نیچے کرنے سے ملا علی قاری حنفی کی تصریح کے مطابق وہ عمل بدعت بن جاتا ہے؛ اس لیے ایک مسلمان کی تحریر جہاں عرف وسماج کے تقاضے کی روشنی میں عمدہ اور معانی کی ادائیگی کا حق ادا کرنے والی ہوتی ہے، وہیں وہ تحریر عبادت کے تقاضوں کو بھی، اپنی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ پورا کرنے والی ہوتی ہے۔

رموزِ اوقاف:

جب ترسیل معانی کے گوناگوں پہلوؤں کو سامنے رکھنے سے رموز اوقاف کی اہمیت کا قدرے اندازہ ہو چکا، تو اب رموزِ اوقاف کے بارے میں کچھ قواعد وضوابط اور ان کے عربی، اردو، انگریزی ناموں کو بھی جانتے چلیں

شمار	رموز اوقاف	اردو نام	انگریزی نام	عربی نام
۱	،	چھوٹا ٹھہراؤ،سکتہ	COMME	الشولة
۲	؛	ٹھہراؤ،وقفہ	SEME COLON	الشولة المنقوطة
۳	۔	وقف تام،وقفہ	FULL STOP	النقطة
۴	:	رابطہ	COLON	النقطتان
۵	؟	سوالیہ نشان	SIGN OF IMTEROGATION	علامة الاستفهام
۶	!	ندائیہ،فجائیہ	NOTE OF EXCLAMATION	علامة الانفعال
۷	-	خط	DASH	الشرطة
۸	“ ”	واوین	INECRTED COMMAS	التضبیب
۹	( )	بین القوسین	BRACKETS	القوسان الهلالان

رموز اوقاف سے متعلق بری بڑی کتابوں میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔مفتی ابولبابہ شاہ منصور نے ''تحریر کیسے سیکھیں؟'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے،اس میں بھی رموز اوقاف سے بحث کی ہے،مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ نے حرف شیریں'' کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی ہے۔جس میں رموز اوقاف سے بحث کی ہے۔

یہاں جو زیادہ استعمال ہونے والی علامات ہیں صرف ان کا تذکرہ کیا گیا ہے،اب ہر ایک علامت پر کچھ اجمالی باتیں مثالوں کے ساتھ سپرد قلم کی جارہی ہیں:

۱۔سکتہ (،):

یہ علامت بہت زیادہ استعمال کی جاتی ہے اس کے استعمال کا ضابطہ یہ ہے کہ مختصر ترین وقفے کی علامت کے طور پر اسی استعمال کی جائے ،متکلم کی جس جگہ سانس ٹوٹ جائے ،لیکن ٹھہرے نہیں وہاں پر سکتے کی یہ علامت (،) استعمال ہوگی،عبارتوں میں قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے،اسی کے استعمال کی جگہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) الفاظ معطوفہ کے درمیان: مثال کے طور پر: مروت، نرمی، خوش اخلاقی، نرمی اولی اور خیر خواہی کے ذریعہ، کسی کا بھی دل جیتا جاسکتا ہے ایک ضروری بات ذہن نشین کرنے کی یہ ہے کہ الفاظ مفردہ جب عربی میں استعمال ہوں تو وہاں پر ہر لفظ کے بعد ''واو'' اور (،) کاما دونوں آئے گا،لیکن اردو میں ہر جگہ ہر لفظ کے بعد صرف (،) آئے گا ،اخیر میں صرف اور آئے گا،کاما (،) نہیں آئے گا۔

(۲) مختلف جملے ایسے استعمال ہورہے ہیں ،جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں،تو ان سب جملوں میں معطوف معطوف علیہ کے درمیان (،) کاما استعمال ہوگا۔

مثال: قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے،محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں،اسلام خدا کا آخری دین ہے،حدیث

رسول شریعت کی تفسیر ہے اور عربی زبان پر دست رس، کتاب وسنت کو صحیح طور پر سمجھنے کی کلید ہے۔
(۳) شرط و جزا کے درمیان (،) کاما آتا ہے۔ جیسے: اگر ہم جانتے داغِ جدائی، نہ کرتے اتنی الفت تم سے بھائی۔
(۴) طویل جملے کے مختلف اجزا کے درمیان۔ مثلاً: تم مدرسے سے بازار گئے، بازار سے ریلوے اسٹیشن گئے، وہاں سے پوسٹ آفس گئے، اب پوسٹ آفس سے گھر آگئے۔
(۵) کسی نثر و نظم میں الفاظ کی الٹ پھیر، یا کلام کی طوالت سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کو دور کرنے کے لیے بھی اہل زبان (،) کاما استعمال کرتے ہیں۔ جیسے: نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا، کہے
دوسری مثال: تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابر بہار۔

۲۔ وقفہ (؛)

وقفہ کا استعمال ایسی جگہ ہوتا ہے، جہاں پڑھنے والے کو سکوت کے ساتھ، سانس لینے کی بھی اجازت ہو۔
(الف) کئی الفاظ کے درمیان جب سکتے کی علامت (،) لگی ہو تو جملے کے آخری جزو سے قبل، وقفے کی علامت (؛) استعمال کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ مثلاً: لکھنو، گورکھپور، فیض آباد، مراد آباد؛ یہ بھی یوپی کے بڑے شہر ہیں۔
(ب) اگر جملے کے مختلف اجزا پر زیادہ زور مطلوب ہو تو وہاں بھی وقفے (؛) کا استعمال کیا جائے گا۔ مثلاً:

آنا، تو خفا آنا؛ جانا، تو رلا جانا	آنا ہے، تو کہا آنا؛ جانا ہے، تو کہا جانا

(ج) جب جملوں کے ایسے دو حصوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ہو جن میں اندرونی طور پر سکتہ (،) موجود ہو، تو وقفے کی علامت (؛) استعمال کی جائے گی۔
جیسے: مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی القراء الواضحہ القراء الواضحہ القراء الواضحہ، اول، دوم، سوم؛ مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ کی مفتاح العربیۃ، اول؛ مفتاح العربیۃ دوم؛ عربی زبان و ادب کی بہترین کتابیں ہیں۔

۳۔ ختمہ: (۔)=(.)

اس علامت کا استعمال جملہ مکمل ہونے پر کیا جاتا ہے اس علامت کو عربی اور انگریزی میں نقطہ (.) رکھ کر لکھتے ہیں اور اردو میں چھوٹا ڈیش (۔) لگا کر۔ مثال: You write a letter. کتب رسالة --------۔ اور اردو میں: میں ایک خط لکھ رہا ہوں۔

۴۔ رابطہ (:)

اس علامت کو قول یا کہاوت کے بعد اس طرح (:) یا کسی جملے کی تفصیل سے پہلے، یا مفصل کے اجمال سے پہلے، اس علامت (:) کا استعمال ہوتا ہے۔
مثلاً: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: ”من ساوی یوماہ فھو فی الخسران“ (بخاری) جس آدمی کے دو دن (نیک عمل میں) برابر ہوگئے وہ بھی گھاٹے میں ہے (اس کو اگلے دن گذشتہ دن سے زیادہ نیکی کرنا چاہیے)۔

کیا خوب سودا ہے: اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے

(نظیر اکبرآبادی)

یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے

جو ہے راہِ عمل پر گام زن، محبوب فطرت ہے

(علامہ اقبال)

۵۔ سوالیہ نشان (؟)

سوالیہ جملوں کے آخر میں استعمال کرتے ہیں مثلاً: کیا آپ مسجد جارہے ہیں؟

کیا تم ایک نیکی کورایگاں سمجھتے ہو؟

تم کون ہو؟ تمہاری حقیقت کیا ہے؟

۶۔ فدائیہ، فجائیہ (!)

(الف) یہ علامت منادیٰ کے بعد لگائی جائے گی۔ مثلاً:

حضرات! سامعین! عزیز طلبہ! پیارے بچو!

جس کو پکارا جائے وہ "منادیٰ" کہلاتا ہے۔

(ب) ناراضگی، حقارت، اظہار تعجب، خوف، یا نفرت کے موقعوں پر بھی یہ علامت (!) استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً:

میں اور بزم مے سے تشنہ کام آؤں!

سبحان اللہ! بہت خوب! معاذ اللہ! زیادہ تعجب اور نفرت کے موقعے پر ایک سے زیادہ علامتیں بھی لگا سکتے ہیں، مثلاً: سنا ہے کہ بلی دودھ کی حفاظت کررہی تھی!!

۷۔ خط (-)

(الف) جملہ معترضہ کے شروع اور آخر میں اس علامت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے ہی -جو رحیم وکریم ہے- ہمیں پیدا کیا ہے۔

(ب) کسی لفظ کی تشریح میں، کئی الفاظ لکھیں جائیں تو بھی (-) یہ علامت استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے پورا شہر خلیل آبادی۔ درخت، مکان، سڑکیں- سخت کہرے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

۸۔ واوین (" ")

کوئی اقتباس، یا کسی کی تحریر، یا قول نقل کرنا ہوتو واوین (" ") کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: فضائل اعمال: ۱/۵۶۲ پر شیخ زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں: "ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے پاؤں میں پھوڑا نکل آیا، طبیبوں نے کہا: اگر ان کا پاؤں نہ کاٹا گیا تو ہلاکت کا اندیشہ ہے، ان کی والدہ نے کہا: ابھی ٹھہر جاؤ، جب یہ نماز کی نیت باندھ لیں تو کاٹ لینا، چناں چہ ایسا ہی کیا گیا، ان کو خبر بھی نہ ہوئی"

(ب) کوئی خاص نام، جگہ، شہر، یا کوئی خاص اصطلاح ہو تو اس کو بھی واوین میں لکھتے ہیں۔ جیسے ہندوستان کے شہر ''مئو'' میں فسادات کا بازار گرم کیا گیا، ''اسلام'' کو ''دہشت گردی'' کہا گیا۔

۹۔قوسین ()۔[ ]۔{ }

(الف) جملہ معترضہ طویل ہو اور ان کے درمیان سکتوں کا استعمال کیا گیا ہو تو قوسین () استعمال کرتے ہیں۔ جیسے: دارالعلوم دیوبند کے حادثے سے (جس کو ذرائع ابلاغ نے خوب اچھالا، کچھ سمجھدار مسلمانوں نے بھی حصہ لیا) سب سے زیادہ تکلیف مسلمانوں ہی کو ہوسکتی تھی اور ہوئی۔

(ب) کسی وضاحتی جملے کو قوسین میں لکھتے ہیں جب کہ اس کی طرف توجہ دلانا ہو۔ جیسے: حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اکثر کتابیں (جو مطبوعہ اور متداول ہیں) میرے کتب خانے میں ملتی ہیں۔

بے نمازی کی سزا، ۲ ر کروڑ ۸۸ ر لاکھ سال جہنم میں جلنا

قرآن کریم میں: ''لٰبِثِیْنَ فِیْھَآ اَحْقَابًا'' (النباء:۲۳) کے ذریعہ اللہ نے نافرمانوں کو تنبیہ کی ہے۔

حدیث میں آیا ہے جو شخص نماز کو قضا کر دے، گو، وہ بعد میں قضا پڑھ بھی لے (پھر بھی جان بوجھ کر قضا کرنے کی وجہ سے) ایک حُقُب جہنم میں جلے گا۔ (فضائل اعمال بحوالہ مجلس ابرار)

اس حُقُب کی مقدار سے پردہ اٹھانے کو دل چاہتا ہے۔ حضرت حسن حقب کو غیر متناہی زمانہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ (روح المعانی: ۵/ ۳۱۶)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث منقول ہے جس میں ایک حُقُب کو ۸۰ سال کے برابر قرار دیا ہے، پھر ابن عمر، ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نقل کرتے ہیں کہ حُقُب کا ہر دن دنیا کے سالوں کے اعتبار سے ہزار سال کا ہے۔ (روح المعانی: ۱۵/ ۳۱۶)

ابن عمرؓ مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ حُقُب کی مقدار تقریباً ۸۰ ر سال کچھ اوپر بتائی گئی ہے، ہر سال ۳۶۰ ر دن کا ہے اور ہر دن ۱۰۰۰ ر سال کا، دنیا کے حساب کے مطابق۔ (حوالہ بالا بحوالہ بزار)

اس حساب سے تقریباً کل مدت ۲ ر کروڑ ۸۸ ر لاکھ سال بنتی ہے، لہٰذا نماز میں کوتاہی کرنے والوں کو متنبہ ہو جانا چاہیے اور اپنے آپ کو جہنم کے طویل عذاب سے بچانے کی کوشش اور فکر کرنی چاہیے۔

فن خط

(عبدالرحیم زاہد القاسمی)
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کو

تحریر اور خط کی اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے، کہ خود حق تعالیٰ نے قلم سے سکھانے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا، اور تحریر وقلم کی قسم کھائی ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ''اقرأ وربک الاکرم، الذی علم بالقلم'' دوسری جگہ ارشاد فرمایا ''ن والقلم وما یسطرون''۔

بتایا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مرتبہ ایک جن سے پوچھا، کہ کلام اور گفتگو کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: وہ تو ایک ہوا ہے جو فنا ہو جاتی ہے، آپ نے پوچھا: اس کو کس طرح قید کیا جا سکتا ہے؟ جواب ملا: لکھ کر۔

عبید اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: تحریر ہاتھ کی زبان ہوتی، صاحب ''زاد المسافر'' لکھتے ہیں: تحریر ہاتھ کی زبان، اور دل کی ترجمان ہوتی ہے، پس اس کی خرابی ایک ادبی بیماری، اور اس کی خوبی بلند مرتبوں پر فائز کرانے والی ہے۔

علم خط کی تاریخ:

علم خط کی ابتداء کے بارے میں علما ومورخین کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے لکھا۔

جس کی تائید حضرت ابو ذر غفاریؓ کی اس روایت سے ہوتی کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آدمؑ پر کون سا صحیفہ نازل ہوا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: اب ت ث ج الخ۔

(۲) شیخ ابو عمرو دانی اپنی کتاب ''التنبیہ علی نقط المصاحف وشکلها'' میں لکھتے ہیں کہ: حروف تہجی کا نزول حضرت ہود علیہ السلام رہوا۔

(۳) بعض حضرات نے اس کی ابتداء کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔

خط کا سلسلہ سند:

علم خط اپنی ابتدا سے انتہا تک کن سلسلوں اور مرحلوں سے گذرا، اور کن ناموں سے جانا جاتا رہا، اور کس نے کس سے اخذ کیا اس سلسلے میں بھی مورخین عرب اور مورخین مغرب کا اختلاف ہے۔

مورخین عرب کی رائے کے مطابق اس کا سلسلہ سند اس طرح ہے:

خط فرعونی

خط فینیقی

خط مسند　　خط آرمی

خط صفوی　　خط ثمودی　　خط لحیانی　　خط حمیری

خط حیری　　خط انباری

خط حجاری

خط کوفی

مورخین یوروپ کی رائے:

خط فرعونی

خط فینیقی

خط مسند　　خط آرمی

خط سریانی　　خط نبطی

خط سطرنجیلی　　خط حیری و انباری

خط کوفی　　خط حجازی

ایک یورپی محقق مورتیز کی رائے یہ ہے، جس کی تائید شکیب ارسلان نے بھی کی ہے کہ: خط فینیقی، خط فرعونی سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ وہ خط مسند یمن سے ماخوذ ہے، اس کی رائے کو مان لیا جائے تو پھر اکثر خطوط کا ماٴخذ خط مسند کو مانا جائے گا، اِس کی موافقت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس رائے کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے، تمام تحریری سلسلے خَفلَجان سے جا کر ملتے ہیں، جو حضرت ہود علیہ السلام کے کاتبِ وحی تھے۔

نیز ان خطوط کے عربی جامہ پہننے کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ ہے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے

ہیں: (موجودہ) عربی کے حروف قبیلہ طی کی ایک ذیلی شاخ بُولان کے تین شخصوں کا کارنامہ ہے، جو اپنے وطن "حیرہ" سے "انبار" آئے، ان میں مُرامر بن مُرّہ نے صورتیں بنائیں، اسلم بن سدرہ نے فصل ووصل (توڑ جوڑ) کا طریقہ ایجاد کیا، اور عامر بن جدرہ نے معجم اور مہمل ہونے کے ضابطے طے کئے، (یعنی نقطے اور بنا نقطے کے پڑھنے کا معاملہ حل کیا) اس طرح انبار میں تحریر کا چلن ہوا، انہیں انبار والوں میں سے قبیلہ کندہ کا ایک شخص بشر بن عبدالملک کندی مکہ آیا اور حضرت ابوسفیانؓ کی بہن صہبا بنت حرب سے نکاح کیا، مکہ والوں نے اسی لکھنا سیکھا اور اس طرح مکہ میں لکھنے کا چلن ہوا، قبیلہ کندہ کا ایک شاعر اسی حوالے سے مکہ والوں پر احسان جتلاتے ہوئے یوں کہتا ہے۔"تجحدوا نعماء بشر عليكم" (بشر کے تم پر جو احسانات ہیں ان کا انکار نہ کرو) "فقد كان ميمون النقيبة ازهرا" (وہ ایک مبارک اور روشن مشورہ دینے والا شخص تھا)

"اتاكم بخط الجزم فحفظتموا"

(اس نے آکر تمہیں خط جزم سکھایا پس)

"من المال ما قد كان شتى مبعثرا"

(تم نے بہت سا بکھرا ما سمیٹا)

اہل مدینہ میں تحریر کے رواج کا قصہ یوں کہ مدینہ میں ایک یہودی شخص تھا، جو لکھنا جانتا تھا، وہ بچوں کو لکھنا سکھاتا تھا، یہاں تک کہ جب مدینہ میں اسلام پہنچا تو ان میں بیس کے لگ بھگ لکھنے والے موجود تھے، جن میں سعید بن زرارہ، منذر بن عمرو، ابی بن کعب، اور زید بن ثابت شامل تھے، یہ سب عربی اور عبرانی دونوں زبانیں لکھ لیتے تھے، اسی طرح رافع بن مالک، اسید بن حضیر، معن بن عدی، ابوعبس بن کثیر، اوس بن خولی اور بشیر بن سعد بھی لکھنا جانتے تھے۔

ہجرت کے بعد جب اسلام کی پہلی جنگ "جنگ بدر" پیش آئی، اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، تو اس کے بعد کفار مکہ کے جو لوگ قید کر کے لائے گئے ان میں بہت سے لکھنا جانتے تھے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر رہائی کے لیے یہ شرط رکھی کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو تحریر سکھائیں، اس طرح مسلمانوں میں تحریر کو فروغ ملا۔

صحابہ کرامؓ میں مشہور لکھنے والے حضرات یہ تھے: حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت سعید بن عاص، اور حضرت عبدالرحمن، بن حارث بن ہشام، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ابتدائی دور میں شکل وصورت کے اعتبار سے خط کے دو نام تھے:

(۱) خط مقور جسے خط لین بھی کہا جاتا ہے، موجود خط نسخ کی اصل یہی خط ہے جس میں حروف کی شکلیں نیچے کی طرف ڈھلان اور جھکاؤ لیے ہوئے ہوتی ہیں، بیشتر خط وکتابت اور روزمرہ کی تحریروں میں اسی کا چلن تھا۔

(۲) خط مبسوط جسے خط یابس بھی کہا جاتا ہے، موجودہ خط کوفی اسی کی سدھری ہوئی شکل ہے، اس کے حروف کی شکلیں نشیب وڈھلان والی نہیں ہوتیں، بل کہ آگے کی سمت جگہ بنائے ہوئے ہوتی ہیں، حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں جب قرآن کریم کے سات نسخے لکھے گئے، وہ اسی خط میں تھے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین بھی از راہ برکت اسی خط کو استعمال کرتے رہے، فن خط کی ترقی کا آغاز بنوامیہ کے آخری دور میں ہوا ''کشف الظنون'' میں لکھا ہے: پہلی صدی میں جس شخص نے اچھے انداز میں عربی خط لکھا وہ ''خالد بن ابوالھیاج'' ہے جس کو حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں کوفہ کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص نے قرآن کریم، اشعار وغیرہ لکھنے پر مامور کیا تھا، اس وقت خط عربی وہی تھا، جسے اب خط کوفی کہا جاتا ہے، جیسا کہ ''شرح العقلیہ'' میں لکھا ہے۔

بنوامیہ کے آخری دور میں قطبہ نامی ایک شخص نے تحریر وخطاطی کے فن میں نکھار پیدا کیا، اسی نے اقلام اربعہ (چار قسم کے خط) ایجاد کیے، اور ایک خط سے دوسرا خط بنایا، وہ اس وقت کا سب سے اچھا کاتب تھا، پھر عباسیین کا زمانہ شروع ہوا، اور سفّاح خلیفہ ہوا، اس کے زمانے میں ضحاک بن عجلان کاتب نے تحریر وکتابت کو پروان چڑھایا، اور قطبہ کے بنائے خطوط میں اضافہ کیا، پھر منصور اور مہدی کے زمانے میں اسحاق بن حماد نے اس فن کو آبرو بخشی، اس نے بہت سے اچھے کاتب تیار کیے، ہارون رشید کے زمانے میں خشنام بصری، اور مہدی کوفی نے بھی کافی شہرت پائی، پھر مامون کے زمانے میں ''احول محرر'' نامی ایک شخص نے اس میں بڑا کمال پیدا کیا، اس نے اس کے شوشوں پر باضابطہ بحث کی اور خط کی کئی قسمیں ایجاد کی، اسی طرح معتصم باللہ کے زمانے میں ابوحدی بھی اس فن کا ماہر گذرا، وہ کوفہ کے ذہین ترین افراد میں سے تھا۔

پھر جب ہاشمیوں کا زمانہ آیا تو ایک نیا خط وجود میں آیا جسے ''خط عراقی'' کہا جانے لگا، خط محقق بھی اسی کو کہتے ہیں، پھر ابوالحسین اسحاق بن ابراہیم تمیمی کا چرچا ہوا، جو خلیفہ مقتدر باللہ اور اس کے صاحبزادوں کا استاذ تھا، یہ فن خطاطی میں یکتائے روزگار تھا، اس نے اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا، جس کا نام تحفۃ الوامق ہے، پھر وزیر ابوعلی محمد بن علی بن مقلہ کا دور آیا، جس نے خط بدیع ایجاد کیا، اسی طرح اس کا بھائی ابوعبداللہ حسن بن علی، انہیں دونوں نے خط نسخ، اور خط جلیل، کی موجودہ شکلوں کو درجۂ کمال تک پہنچایا، حروف کو ناپنے کے پیمانے مقرر کیے اور ان کے حسن وقبح کو پرکھنے کے ضابطے طے کیے، ابن مقلہ کو فن خطاطی میں وہ مقام حاصل ہے جو کسی اور کو نہیں، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ خلیفہ راضی کے زمانے میں بغداد کے گورنر ابن رائق نے کسی سازش کے الزام

میں ابن مقلہ کو گرفتار کیا، پہلے اس کا ہاتھ پھر زبان کاٹ دی، یہاں تک کہ ۳۲۸ھ کا انتقال ہو گیا، اور تین خلفاء کا وزیر رہنے، قدر و منزلت پانے کے بعد خطاطی کے بے تاج بادشاہ کا اسطرح بڑا اندوھناک انجام ہوا، اس کے بعد اس کے شاگرد محمد بن اسد کاتب کے تربیت یافتہ اور خط جمیل کے ماہر علی بن ہلال نے شہرت پائی، جو ابن بواب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جہاں تک فن کی بات ہے اس نے ابن مقلہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، یہ اور بات ہے کہ ابن مقلہ کو تقدم حاصل ہے، بعد کے دور میں ابوالمجد یاقوت نے بھی خوب نام کمایا، اسطرح اسوقت تک یہ چھ قسم کے خطوط لوگوں میں رائج ہو گئے، ثلث، نسخ، تعلیق، ریحان، محقق، رقاع، بعد میں اسی پر خط دیوانی اور خط دشتی کا اضافہ ہوا۔

پھر جب خلافت عثمانیہ قائم ہوئی تو ترکی خطاطوں نے اس فن کا جادو جگایا، خلفائے عثمانیہ نے بھی اس کی طرف بھرپور توجہ دی اور ۱۳۲۶ء میں پہلی مرتبہ راجد ھانی استنبول میں تحریر و کتابت کے باضابطہ ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔

عثمانیوں کے بعد یہ فن ترکی سے مصر منتقل ہوا، اور وہاں بھی اس فن کو سیکھنے سکھانے، بنانے سنوارنے کا ایک ادارہ قائم کیا گیا۔

عثمانی دور کے کچھ خطاط:

حمد اللہ اماسی، جلال الدین، درویش علی، حافظ عثمان، عبداللہ زہدی، انہی آخر الذکر نے خط جلیل سے مسجد نبوی علی صاحبہ السلام، کے در و دیوار کو مزین کیا اسی طرح مونس آفندی، بعد کے تمام مصری خطاطین انہی کے یا ان کے شاگرد محمد جعفر بک کے تربیت یافتہ ہیں۔

اخیر دور کے مشہور خطاطوں میں: شیخ عبدالعزیز رفاعی، سامی آفندی، احمد کامل، ہاشم محمد بغدادی، محمد عارف، بدوی دیرانی اور حسنی البابا ہیں۔

قرآن کا رسم الخط:

ابن خلکان نے حجاج بن یوسف کے تذکرے میں لکھا ہے: "ابو احمد عسکری کا بیان ہے کہ لوگ ۴۰/۴۲ سال تک حضرت عثمانؓ کے دور کے مرتب کردہ قرآنی نسخوں ہی میں پڑھتے رہے، تقریبا عبدالملک بن مروان کے زمانے تک، پھر جب قرآن مجید لکھنے کا رواج عام ہوا، اور عراق میں اس کا پھیلاؤ ہوا، تو حجاج ابن یوسف نے اپنے ماتحت کاتبوں کو ان پر علامتیں اور اعراب لگانے کا حکم دیا، پس اس کے حکم سے ایک قول کے مطابق نصر بن عاصم نے اور ایک قول کے مطابق یحیٰ بن یعمر نے نقطے لگائے، جو حروف کے معجم اور مہمل ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

قرآن کریم کا ایک خاص رسم الخط ہے، جو حضرت زید بن ثابتؓ کا اختیار کردہ اور صحابہ کرامؓ کا پسندفرمودہ

ہے، کوئی غیر قرآنی تحریر اس رسم الخط میں نہیں لکھی جائے گی۔

ابن درستویہ اپنی کتاب ''الکتاب'' میں فرماتے ہیں ''دو خط ایسے ہیں جن پر قیاس نہیں کیا جاسکتا (۱) خط قرآن، کیوں کہ وہ سنت ہے، (۲) خط عروض، کہ اس میں اسی کو باقی رکھا جاتا ہے جو ملفوظ ہو اور غیر ملفوظ کو ساقط کر دیا جاتا ہے۔

وضاحت:

قرآن کے طرز تحریر اور رسم الخط پر قیاس نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جو جملے اور الفاظ جس انداز میں لکھے جاتے ہیں عام تحریروں میں اس رسم الخط کو استعمال نہ کیا جائے گا۔ مثلاً: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کہ اس میں ''اسم'' کے ہمزہ کو حذف کر کے لکھا جانا قرآنی رسم الخط کا حصہ ہے، لہٰذا غیر قرآنی تحریروں میں ''با'' حرف جر کے دخول کے بعد ''اسم'' کے ہمزہ کو ساقط نہ کیا جائے بل کہ ''باسم'' لکھا جائے گا۔

اور خط عروض کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شعر کی اس کی متعلقہ بحر پر تقطیع کی جاتی ہے اور اسے جس انداز میں لکھا جاتا غیر شعر کو اس طرح نہ لکھا جائے گا، مثال کے طور عربی کا یہ شعر:

ستبدی لک الایام ماکنت جاھل ٭ ویاتیک بالاخبار من لم تزود

فعو لن، مفاعیلن، فعو لن، مفاعلن، فعو لن، مفاعیلن، فعو لن، مفاعلن

جسے دوران تقطیع اس طرح لکھا جائے گا۔

ستبدی: لکلایا، مما کن، تجاھلن

ویاتی۔ کبلاخبا، رمللم، تزوودی

یا اردو کا یہ شعر: ''جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے، یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے'' جس کی تقطیع اس طرح ہوگی:

جگاجی، لگانے، کدنیا، نہیے ☆ یہ عبرت، کجاہے، تماشا، نہیے

فعو لن، فعو لن، فعو لن، فعو لن، فعو لن فعو لن فعو لن فعو لن

الغرض خط عروض پر بھی قیاس نہ کیا جائے گا اس لیے کہ اس میں شعر کے ملفوظ کو متعلقہ بحر کی حرکات وسکنات وتعداد حروف کے اعتبار سے کاٹ کاٹ کر بحر کے اجزا پر منطبق کیا جاتا ہے۔

فن خطاطی کے لوازمات:

اس فن کے لیے بنیادی طور پر جن باتوں کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے: (۱) قلم کو چھیل کر اسے درمیان سے شق کرنا اور قط (قلم کا منہ اور نب) بنانا (۲) روشنائی اور کاغذ کی خامی وخوبی سے واقفیت (۳) قلم کو پکڑنے اسے رکھنے، لکھنے کے آغاز کا مقام اور سہل سے سہل انداز میں حروف بنانے کی جانکاری (۴) کسی خط سے دوسرا خط بنانے کی صلاحیت (۵) اور سب سے بڑی بات یہ کہ نفاست طبع اور سلامتی ذوق کی خداداد خوبی۔

خط کی مشہور اقسام:

ثلث، نسخ، رقعہ، دیوانی، فارسی، توقیع، ریحانی، کوفی

مصادر و مراجع:

قرآنی املاء اور رسم الخط (قاری ابوالحسن اعظمی)
اردو سیکھنے کا نیا طریقہ (ڈاکٹر سید تنویر حسین)

مصادر و مراجع:

(۱) کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون: ج ۱
(۲) صبح الاعشی فی صناعۃ الانشاء: ج ۳
(۳) معجم علوم اللغۃ العربیۃ
(۴) الاملاء و الخط: بین النظریۃ و التطبیق۔
(۵) خط رقعہ: کیوں اور کیسے سیکھیں؟
(۶) املا نامہ
(۷) اردو کیسے لکھیں؟
(۸) املاء اور رموز اوقاف کے مسائل
(۹) تدریسِ کتابت
(۱۰) صحیفۂ خوشنویسان
(۱۱) تحریر کیسے سیکھیں؟
(۱۲) اردو املا و رموز اوقاف
(۱۳) اردو املا و قواعد
(۱۴) حرفِ شیریں

اسلام سرمایہ داریت و اشتراکیت کے درمیان تقابل

ابوحمزہ دستانوی

"آج سے تقریباً دو سال قبل جامعہ سے شائع ہونے والا مشہور و مقبول ماہنامہ جہان مصطفیٰ" کے خصوصی شمارہ "مسائل تجارت" کے لیے یہ مضمون تحریر کیا گیا تھا، اسی کو نفع عام کے خاطر "علم معیشت" کے تعارف کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ اس موضوع کے لیے بہترین اور موزوں اگر کوئی کتاب ہے، تو وہ شیخ الاسلام، فقیہ العصر، ادیب اریب، مفکر قوم وملت، حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی تصنیف "اسلام اور جدید معیشت وتجارت" ہے"۔ (ادارہ)

الحمد للہ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے دین کو صرف عبادات میں منحصر نہیں کیا بلکہ زندگی کے ہر ہر گوشہ کو دین سے وابستہ کیا، چاہے وہ معاشرت ہو، چاہے معیشت، غرض کہ انسان صحیح معنی میں زندگی کیسے گذارے اور اس کے لیے وہ کن کن چیزوں اور کس کس طرح کے مسائل سے دوچار ہوسکتا ہے ہر ایک کے سلسلہ میں چند جامع اور معنی خیز اصول پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردے جس کی روشنی میں قیامت تک پیش آنے والی مسائل کو مسلمان حل کرتا چلا جائے گا، اسی لیے قرآن کریم نے اسلام کی مثال ایک ایسے درخت سے دی جس کی جڑیں زمین میں پیوست اور اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہو۔

اسلامی نظام ہی وہ نظام ہے جس نے دنیا سے ظلم وجبروت کا قلع وقمع کیا، انسان کو زندگی بسر کرنے کے اصول سکھائے، چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے ہیں تو آپ نے جواباً فرمایا: انا قد ارسلنا لنخرج الناس من ظلماۃ الجہالۃ الی نور الایمان ومن جور الملوک إلی عدل الإسلام۔

ہمیں بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نور ایمان کی طرف نکالیں اور شہنشاہی استبداد سے نجات دلا کر عدل اسلام سے روشناس کروائیں۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تعالیٰ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں اسلامی اصول کی تعیین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کا حق نہ دلا دوں۔"

جو مذہب دنیا میں ظلم ختم کرنے اور انصاف کو قائم کرنے کے لیے انسانوں کے لیے رحمت بن کر نازل ہوا آج اسی دین کو دہشت گرد اور کیسے کیسے برے القاب سے یاد کیا جارہا ہے، تو آج ہم اسی کا تقابل کرنا چاہیں گے کہ جو لوگ انسانی حقوق کی پاس داری کے بے بنیاد نعرے کستے چلے جارہے ہیں ان کے درمیان اور اسلامی تعلیمات کے درمیان کیا فرق ہے ان کے نظام سے دنیا کو کیا نقصان ہورہا ہے اور اسلامی نظام میں انسانیت کے لیے کتنی سلامتی اور امن ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اشتراکیت اور اور سرمایہ داریت پر ایک سرسری نظر ڈالیں یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ یہ دونوں نظام اگرچہ بظاہر ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں ایک مشرق ہے تو دوسرا مغرب لیکن اسلام کے مقابلہ میں یہ

دونوں آپ ہی میں مشترک ہیں اور اسلام کے مقابلہ میں اپنے پس منظر کے ساتھ ایک ہی سکے کی دو شاخیں ہیں اسلام جہاں مادیت کے مقابلے میں روحانیت اور اس کی دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے، وہیں یہ دونوں نظام صرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں اور اسی مادہ پرستی کے حصول کے لیے جب کوئی نظام ان کے راستے میں رکاوٹ بنتا دکھائی دیا تو انہوں نے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی انتھک کوششیں کیں، یہ بات الگ ہے کہ وہ کامیاب نہ ہوسکے، اب ظاہر بات ہے کہ یہ روڑا اور رکاوٹ ان کے لیے اسلام کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا، اسی لیے آپ اگر تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اشتراکیت نے بھی جب سر اٹھایا تو روس میں انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیسا ظلم کیا کہ قلم اس کو معرض تحریر میں لانے سے کپکپا اٹھتا ہے، لاکھوں مسلمانوں کو گولیوں کی نوک پر بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اتنے مسلمانوں اور علما کو ایک ساتھ شہید کیا جاتا تھا کہ ٹیلوں کی مانند لاشوں کا انبار لگ جاتا تھا، جس کسی کے چہرے پر ڈاڑھی دیکھی کہ بس گولی۔۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ علما کو اور مسلمانوں کو ٹرین میں بٹھایا جاتا اور کہا جاتا ہم تمہیں کسی جگہ چھوڑ آتے ہیں، پھر راستہ میں مال گاڑی کے ساتھ اسے ٹکرا دیا جاتا، اگر کوئی عورت لمبے بال والی نظر آتی تو سرے عام اس کے سر کو مونڈھ دیا جاتا، جو کوئی قرآن کا یا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لیتا اسے اسی وقت پھانسی پر چڑھا دیا جاتا، جس بچہ کو سلام بولنا آجاتا اس کے باپ کو پھانسی دیدی جاتی، جگہ جگہ لکھا ہوتا کہ مسلمانوں کا خدا بوڑھا ہو چکا ہے (العیاذ باللہ) بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ چسپاں تھے جس پر نحیف اور کمزور بوڑھا بنا ہوتا، اور ایک موٹا تازہ انسان ہوتا نحیف پر لکھا ہوتا اسلام اور وہ موٹا کک مارتا دیکھایا جاتا کہ اب اسلام بوڑھا ہو چکا، اس کو لاتیں مار مار کر دنیا سے نکال دیا جائے گا۔

فانوس بن کر جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے خدا روشن کرے

غرض یہ اشتراکی نظام کا حال ہوا کہ اس نے انصاف کے نام پر کیسے کیسے خونریز واقعات کو تاریخ کے صفحات پر رقم کروادیا۔ اب آیئے سرمایہ دارانہ نظام نے انصاف کے نام پر انسانیت پر کیا ظلم ڈھائے اور اب بھی ڈھاتا چلا جا رہا ہے، اس کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔

روز آفرینش سے انسانی تہذیب وتمدن میں قدرتی وسائل کی جتنی ریل پیل اور بہتات آج ہوئی ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی، دنیا مشینی نظام پر آگئی اور سپر فاسٹ بن گئی، لیکن یہ بات بھی فراموش نہ ہونے پائے کہ اسی مشینی صنعت کی وجہ سے تمام افراد میں پیسوں کے متعلق ناخوشگوار جذبات کا ایک سیلاب اور طوفان برپا ہوگیا ہے، اور یہی وسائل آج کل انسانوں کے لیے مایوسی آشفتہ حالی اور جذباتی نفسیاتی ذہنی امراض کا سبب بن گئے ہیں، جب یہ صنعتی نظام انگلستان میں رائج ہوا تو پہلے صرف مزدور طبقہ کی زندگی تباہی کے دہانے لاکھڑا کردیا، پھر لامتناہی کاروبار کا بڑھا چڑھا کر تقابل اور تفاخر کے ساتھ فروغ دینے والے اپنے اپنے شعبہ کار کو پروان چڑھانے والے اور اپنی کارکردگی کی گھات میں ترقی اور منافع کا رجحان اور رُخ پہچاننے والے ماہرین صنعت وحرفت کم سے کم سود دے کر زیادہ سے زیادہ

نفع کمانے والے مشاق ماہرین اقتصادیات اور تمام صنعتوں اور کاروبار کو گھمانے اور الٹ پلٹ کر رکھ دینے والے شاطران صنعت وحرفت یہ اوران جیسے ہزاروں عناصر مل کر صنعتی نظام کو عظیم سے عظیم تر بنانے میں ایسے مشغول اور منہمک ہیں کہ نہ کسی جان کی پرواہ نہ عزت کا خیال اور نہ اخلاقی قدروں کی نگہداشت بس مال مال نفع نفع اور نفع کے خواب میں مست ہیں۔ اسی سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا میں سود کی لعنت عام کی اور پوری دنیا پر اجارہ داری قائم کردی، اسی لیے جو لوگ معیشت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے کہ دنیا کی ساری دولت وقسمت کو ترقی یافتہ، دولت مند گروپ جو آٹھ ممالک پر مشتمل ہے جس میں امریکہ کناڈا روس جاپان برطانیہ فرانس اٹلی جرمنی نے اپنے پنجہ استبداد میں جکڑ رکھی ہے، اس لیے کہ دنیا کے چار سو ستانوے (۴۹۷) دولت مند ترین کھرب پتی افراد ان ہی ملکوں سے وابستہ ہیں۔ Forbes میگزین کی رپورٹ ۲۰۰۲ء کے مطابق سال ۲۰۰۱ء میں ان ۴۹۷ر امراء کی مجموعی دولت 1544.20 بلین ڈالر تھی جب کہ دنیا کی پوری آبادی کی تمام بنیادی ضرورتوں کے لیے درکار رقم صرف ۸۰ بلین ڈالر سالانہ ہے جو پوری ہی نہیں ہوتی، اور ۲۰۰۵ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ان آٹھ ملکوں کے علاوہ دوسرے ۱۹ر ملک: انڈورا، آسٹریلیا، بیجم، ڈنمارک، فن لینڈ، یونان، آئس لینڈ، آئرلینڈ لچنسٹین، لکوم برگ، موناکو، ہائی لینڈ، نیوزیلینڈ، ناروے، پرتگال، اسپین، سویڈن، سوئزرلینڈ، روس، دوسرے ملک جو غریب ممالک ہیں جس میں بدقسمتی ہمارا ملک ہندوستان بھی شامل ہے، ۴۵ر ہزار بلین ڈالر سے زیادہ کے مقروض تھے یہ ممالک ہر سال ایک سو پچیس ارب ڈالر سود ادا کررہے تھے، اور سود کی شکل میں اصل سے کہیں زیادہ رقم ادا کرچکے تھے، لیکن قرض کی اصل رقم ابھی واجب الاداء ہے۔

اب ذرا آپ اوپر کی رپورٹ پڑھ کر غور کیجیے، کہ اس سودی لعنت نے دنیا میں غربت کو عام ہونے دینے میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے، اب اس پر بھی ایک رپورٹ پڑھتے چلیں، ۱۹۹۹ء کی UNDP کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سب سے غریب 20% اور سب سے مالدار 20% کے درمیان آمدنی کا فرق ۱۸۲۰ء میں 3.1 تھا، اور ۱۹۱۳ء میں 11.1 ہوا، اور پھر ۱۹۷۰ء میں 60.1 اور ۱۹۹۷ء میں 86.1 ہوگیا تھا۔ گویا ۱۹۹۷ء میں آبادی کا سب سے امیر طبقہ جو 20% ہے دنیا کی مجموعی پیداوار کے 86% پر قابض تھا جب کہ ۱۸۵۰ء عالمی پیداوار کے 86% پر قابض تھا، جب کہ ۱۸۵۰ء میں عالمی پیداوار 35% فیصد پر ترقی یافتہ ممالک قابض تھے ۱۹۸۰ء میں ان کا حصہ 86 ہوگیا، ۱۸۰۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان ترقی یافتہ اور غریب ممالک کے فی کس آمدنی کا فرق 1000% بڑھ گیا۔ ایک سروے کے مطابق دنیا کا ایک طبقہ ۳۵/ ارب ڈالر کا منیرل واٹر (Mineral Water) پی جاتا ہے، جب کہ ایک ارب انسان ایسے ہیں کہ جو بیچارے صاف ستھرے پانی سے محروم ہیں۔ یہی اجارہ دار یورپ اور سود خور یورپ ایک سال میں ۱۱/ ارب ڈالر کی آئس کریم کھا جاتا ہے، یورپ میں ۱۷/ ارب ڈالر پالتو جانور پر خرچ کئے جاتے ہیں، جب کہ لاکھوں افریقی اور غریب باشندے بھوک سے مرجاتے ہیں، اسی یورپ نے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے جال میں ایک بڑے طبقے کو پھنسا کر بے روزگار رہنا دیا ہے۔

ایک نئی رپورٹ کے مطابق تیسری دنیا کے ملک اپنی سستی اور اچھی زرعی پیداوار اور ڈیری کا سامان امیر

ملکوں کے بازار میں فروخت نہیں کرسکتے ۔لیکن تیسری دنیا کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ امیر الکڑی کا غیر ضروری سامان مل کہ کوڑا کرکٹ اور Junk بھی اپنی بازاروں میں آزادی کے ساتھ بیچنے کی اجازت دیں، ڈبلیوٹی اور کا یہ دعویٰ صد فیصد جھوٹ ہے کہ جب اس کی شرطوں پر دنیا میں تجارت ہونے لگے گی تو تیسری دنیا کی غریبی بھی دور ہوگی کیونکہ ابھی تک ڈبلیوٹی او نے غریب ملکوں کی قیمت پر صرف امیر ملکوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔گیٹ (Gatt) مذاکرات سے لے کر ڈبلیوٹی او کے قیام تک پچھلے بیس پچیس برسوں میں دنیا میں غریبی گھٹنے کے بجائے اور زیادہ بڑھی ہے، نیوزویک (۲۱ر نومبر ۲۰۰۵ء) میں شائع ڈیوڈ روٹ کوف (David Rothkopf) کی ایک رپورٹ میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ صرف گذشتہ پانچ چھ برسوں کے دوران (۱۹۹۱ء سے تا حال) دنیا کے امیر ترین ملکوں کی آمدنی میں پینتیس گنا اضافہ ہوا ہے۔یعنی جن امیر ملکوں کی آمدنی ۱۹۹۹ء تک غریب ملکوں کی مجموعی آمدنی سے محض سولہ گنا زیادہ تھی وہ ۲۰۰۵ء میں بڑھ کر ۳۵ گنا زیادہ ہو چکی ہے۔

عالمی بینک کے ایک ماہر اقتصادیات برینکو میلانووچ (Branko Milanovic) کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "منقسم دنیا" (Worlds Apart) کے حوالے سے ڈیوڈ روٹ کوف نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۰ء تک دنیا میں اکتالیس ایسے امیر ممالک تھے جن کی آمدنی 'اطمینان بخش' کے زمرے میں آتی تھی۔ پینتالیس سال بعد (۲۰۰۵ء میں) دنیا کے اطمینان بخش آمدنی والے ملکوں کی تعداد گھٹ کر محض اکتیس (۳۱) رہ گئی ہے۔۱۹۶۰ء میں امریکہ اور یورپ کے باہر غیر مغربی امیر ممالک کی تعداد انیس (۱۹) تھی۔آج ۲۰۰۵ء میں غیر مغربی امیر ملکوں کی تعداد محض نو (۹) ہے! کوئی ہمیں بتائے کہ یہ معاشی آزادی لبرلائزیشن اور عالم کاری گلوبلائزیشن کا نتیجہ ہے تو اور کیا؟

ہانگ کانگ ڈبلیوٹی او رچوٹی کانفرنس کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں کے اتحاد (الائنس) کی سربراہ الزبتھ تانگ نے غلط نہیں کہا ہے کہ ڈبلیوٹی او دنیا سے غریبی دور کرنے میں پوری طرح ناکام ہو چکی ہے۔۱۹۸۹ء میں بیجنگ کے تیامن اسکوائر میں طلبا کے مظاہروں کی قیادت کرنے والی لیڈر ہانگ ڈانگ فانگ نے ۱۱ر دسمبر کو ہانگ کانگ میں WTO کے خلاف مظاہرہ کرنے والے چینی باشندوں کی قیادت کرتے ہوئے کہا کہ ۲۰۰۱ء میں ڈبلیوٹی او میں شمولیت کے بعد سے چین کی حکومت اور حکمراں ٹولہ تو ضرور پہلے سے کہیں زیادہ امیر ہو گیا ہے لیکن چینی عوام کی اکثریت پہلے سے کہیں غریب ہو گئی ہے اور چینی مزدوروں کے حقوق سلب ہو چکے ہیں!

اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس سودی نظام نے دنیا میں غریبی اور امیری کے درمیان فاصلوں کو کتنا بڑھا دیا یہ تو ہوا مادی پہلو۔اب اور تصویر کا ایک رُخ اب سرمایہ داریت کی تصویر کے دوسرے رُخ کو دیکھا جائے کہ اس نے اپنے اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے کتنوں ملکوں پر بے جا حملے کیے اور لاکھوں انسانوں کو قتل کر کے اپنے اوپر ایک سیاہ تلک لگا دیا، غریب اور مفلس افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی، پیٹرول سے مالا مال عراق جیسے پُرامن ملک میں امن وسلامتی کو عنقا کر دیا، اور بھی بے شمار منصوبے بنا چکا ہے، جس کی تکمیل کے درپے ہے اور جیسا کہ اشتراکیت یعنی Communism نے اسلام کی بیخ کنی اور استحصال کے منصوبے بنائے تھے، اللہ نے اسے ملیامیٹ کر کے چھوڑ

دیا، ایسے ہی انشاء اللہ بہت جلد امریکہ اور اس کے ہم نوا بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے (۱۲ ربیع الآخر ۱۴۲۳ھ) اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

یہ تو ہوئی ایک سرسری اسلام کے مدمقابل دو باطل نظاموں کی تاریخ پر ایک نظر اب آپ اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ حضرت ابوبکر کا زمانہ خلافت کیسی خوشحالی کا زمانہ تھا، پھر عمر فاروق کے زمانہ پر نظر کیجئے تو عدل وانصاف اور سود کی لعنت سے پاک کیسا خوشحال موسم گذرا۔اسی طرح حضرت عثمان غنی حضرت علی مرتضیٰ کا زمانہ معیشت کے اعتبار سے مسلمان کسی پریشانی میں مبتلا نہیں تھے، یہاں تک حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے دور کے بارے میں بتلایا جاتا ہے آپ کے زمانہ میں لوگ اتنے آسودہ اور صاحب ثروت ہو چکے تھے کہ اگر کوئی آدمی زکوۃ نکالنا چاہتا تو کوئی زکوۃ لینے والا ہی نہیں ملتا تھا۔

قبل اس کے آپ اسلامی نظام معیشت کی بنیادی اور اساسی اصول سے واقف ہوں سرمایا داری اور اشتراکیت دونوں کی بنیاد کس پر قائم ہے اور ان میں کیا کیا بگاڑ اور خرابی۔

تو اولاً ہم سرمایہ داریت ہی کے اصول کو معلوم کریں کہ اس کا نظام کس بنیاد پر قائم ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد آزادی پر قائم ہے یعنی ہر شخص کو میدان تجارت میں بے مہار چھوڑ دیا جائے اس پر کسی طرح کی کوئی پابندی عائد نہ کی جائے نہ دینی پابندی نہ ملکی پابندی اور نہ اخلاقی پابندی، بس ایک قدرتی قانون Law of Demand and Supply پر سب کچھ چھوڑ دیا جائے، چاہے وہ ترجیحات کا تعین ہو (Determination of Priorities) یا وسائل کی تخصیص ہو (Allocation of Resources) یا آمدنی کی تقسیم (Distribution of income) یا ترقی (Development) ہو کچھ بھی، بس اسی قانون رسد وطلب پر چلتا رہے گا، زمین کا کرایہ بھی اسی کو سامنے رکھ کر متعین کیا جائے گا۔اسی طرح محنت کرنے والے مزدور کی مزدوری کا تعین سرمایہ لگانے والے کو شرح سود سب کچھ اسی پر موقوف۔اب چوں کہ فرد پر کسی طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں تو وہ سرمایہ دار ہونے کی صورت میں بیٹھا بیٹھا لوگوں سے سود کھاتا رہے گا، اگر تاجر ہے تو احتکار و ادخار یعنی قیمت بڑھانے کے لیے ذخیرہ اندوزی کرے گا، اگر وہ خوبصورت عورت ہے تو ایڈورٹائز کے لیے اپنے جسم کی نمائش کرے گی، اگر آواز اچھی ہے تو گلوکار بن جائے گا، اگر خوبصورت ہے تو ہیرو ہیروئن مضبوط ہے تو کھیلاڑی، عزت دار ہے تو اشتہار بازی میں بڑھ کر حصہ لے گا۔غرض مادیت اور پیسے کے لیے جو چاہے کرے گا، نہ اس کے دل میں معاشرے کے بارے میں کوئی ہمدردی نہ اخلاق کا کوئی پاس و لحاظ۔گویا انسانیت کے دائرے سے نکل کر بہیمیت کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔بہر حال اس نظام سے دنیا کو بہت نقصان پہنچا اور اب بھی پہنچتا ہی چلا جا رہا ہے، اب دیکھنا ہے کب تک دنیا اس نظام کو لے کر چلتی اور کب یہ ملعون نظام اوندھے منہ گر کر ختم ہوتا ہے، ویسا اب قرائن کچھ ایسا بتلا رہی ہیں کہ اس کی موت قریب ہی آ پہنچی ہے۔

اشتراکیت Socialism یہ نظام دنیا میں سرمایہ داریت کے ظلم کو رفع کرنے کا نعرہ لگا کر میدان میں آیا اور انسانیت کو انصاف دینے کا دھوکہ دیا یا پھر اچھے جذبہ کے ساتھ کھڑا تو ہوا مگر سرمایہ داریت کا نعم البدل مہیا نہ کر سکا بجائے

اس کے کہ ظلم کو رفع کرتا اس سے بھی بڑا ظالم ثابت ہوا کیونکہ اس نے اپنے نظام کی بنیاد اجتماعی ملکیت پر استوار کی یعنی کوئی فرد کسی چیز کی ملکیت نہیں رکھے گا، سب حاکم کے تحت Planing کے ساتھ کام میں لائے جائیں گے۔ تو گویا اشتراکیت نے بالکل جکڑ کر رکھ دیا اور ظاہر بات ہے کہ جکڑنے کے لیے ظالم و جابر حکمرانی کی ضرورت پڑی تو اس نے اس سے بھی دریغ نہ کیا اور اجتماعی مفاد Collective Interest اور آمدنی کی منصفانہ تقسیم Equilable Distribution of Income کے کھوکھلے دعوے کیے، جب کہ دونوں میں ایک بھی صحیح طور پر ذرا برابر بھی پورا نہیں کر سکا، خیر یہ نظام تو روس کے ٹوٹ جانے کے بعد ختم تو نہیں لیکن ختم جیسا ہو چکا ہے، اور اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

یہ تو ہوئے دونوں نظاموں کی تاریخ اور ان کے اصول اور اس پر تبصرے اب آیئے اسلامی نکتۂ نظر معیشت کے بارے میں کیا فلسفہ پیش کرتا ہے تو جان لیجیے کہ اسلام کا راستہ بالکل متوسط، نہ افراط پر مبنی نہ تفریط نہ تو فرد کو بالکل آزاد بے مہار چھوڑ دیا ہے جیسا کہ سرمایہ داریت نے کیا اور نہ بالکل انسان کو جکڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بلکہ اس کی نفسیات اور طبیعت کا پورا خیال رکھتے ہوئے آزادی ضرورت کی صورت میں آزادی فراہم کرتا ہے، اور پابندی کی ضرورت کی صورت میں پابندی عائد کرتا ہے بات دراصل یہ ہے کہ مذکورہ دونوں نظاموں نے درحقیقت انسان کے مقصد پیدائش کو نہیں مدنظر رکھا، انہوں صرف مادیت کو مدنظر رکھا، اور دنیا کے سامنے دین بزار خدا بیزار انسانیت بیزار آخرت بیزار نظام پیش کیا گویا دوسرے جانوروں کی طرح انسان بھی کھانے پینے، سونے اور کمانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے ایک بار مر جاتا ہے پھر گویا اسے زندہ ہی نہیں ہونا ہے نہ رب کی حضور حساب و کتاب دینا ہے اور نہ برائیوں پر سزا پانا ہے بالکل بے فکر ہو کر دنیا کے پیچھے لگ جانا ہے اور بس جب کہ اسلام نے اولاً انسانی تخلیق کے مقصد کو مدنظر رکھا اور بتایا کہ و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون۔ کہ انس و جن کو دنیا میں نہ تو زیت و زینت کے لیے پیدا کیا جیسا کہ آج کا انسان سمجھ بیٹھا ہے اور زراعت کے لیے نہ تجارت کی غرض سے نہ کسی اور غرض سے بل کہ تخلیق انس و جن محض عبادت و بندگی کے لیے کی گئی ہے لہٰذا انسان کو اپنی ساری صلاحیتوں کو کسب و معاش میں کھو یا دنیا انسان کے لیے کسی بھی حالت میں زیبا نہیں دیتا بقدر ضرورت انسان دنیا کمانے کے پیچھے لگے جیسے اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بیت الخلاء میں جاتا ہے اور ضرورت پوری ہوتے ہی فوراً واپس ہو جاتا ہے بس اسی طرح دنیا کا حال ہونا چاہیے مگر افسوس ہے کہ مسلمان مال کے پیچھے ایسا دیوانہ ہو گیا ہے کہ نہ اسے نماز کی فکر نہ روزے کی نہ حج کی نہ اپنی آخرت کی کوئی فکر اللہ ہی رحم فرمائے، اللہ رب العزت نے بے شمار مقامات میں عبادت و بندگی کا حکم دیا ہے جیسے فرمایا: یا ایھا الناس اعبدو ربکم الذی خلقکم۔ عبادت کرو لوگوں تمہارے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ذالکم اللّٰہ ربکم خالق کل شئ فاعبدوہ۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے ہر چیز کا پیدا کرنے والا لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا: قل انی اُمرت ان اعبد اللّٰہ و لا اشرک بہ۔ آپ کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کروں، اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا: واعبد ربک حتی یاتیک الیقین۔ عبادت کر اپنے رب کی یہاں تک کہ تجھے موت آجائے، یعنی موت تک عبادت میں مشغول رہ اور ابھی کئی آیتیں ہیں، تو معلوم ہوا کہ انسان کا ہر کام عبادت ہو اگر آپ واقعتاً اسلام کے مطالبات پورا کریں اور حلال حرام کی پوری تمیز کے ساتھ کاروبار کرتے رہو تو کاروبار بھی عبادت بن جائے گی، بل کہ مفتی اعظم مفتی شفیع صاحبؒ نے حافظ نعیم کے حوالے سے ایک عجیب روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمای کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو نہ نماز پڑھنے سے معاف ہوتے ہیں اور نہ روزہ و صدقہ سے معاف ہوتے ہیں مگر وہی گناہ حلال کمائی کے راستے سے میں پیش آنے والی پریشانیوں سے معاف ہوجاتا ہے، اللہ اکبر۔ خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے اپنے معاشی مسائل میں مادیت کے ساتھ روحانیت کو بھی پورے پورے طور پر مدنظر رکھا تو آیئے اب ہم اسلامی نظام معیشت پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے چلیں۔

اسلامی معیشت کے بنیادی اصول:

(۱) جس شئی کو فروخت کیا جائے وہ مال کی تعریف میں آتی ہو جیسے کپڑا جوتا وغیرہ، نہ کہ گوبر مینگنی وغیرہ۔

(۲) دھوکہ دہی اور مکر وفریب سے مکمل اجتناب۔

(۳) مجہول ومعدوم چیز کی خرید وفروخت سے اجتناب۔

(۴) غیر مقبوضہ چیز جو دوسرے کے ضمان میں ہو اس کی خرید وفروخت کی ممانعت۔

(۵) تجارت اور کاروبار میں سچائی کا پورا لحاظ اور جھوٹ سے مکمل اجتناب۔

(۶) تمام معاملات کا سود سے مکمل طور پر پاک ہونا۔

(۷) کوئی ایسی شرط بیع میں لگانا جس کی وجہ سے بائع یا مشتری دونوں میں کسی کو زائد فائدہ حاصل ہو اس سے مکمل پرہیز۔

(۸) کاروبار میں قمار یعنی جوا کا معاملہ نہ کرنا۔

(۹) ناپ تول میں پورا انصاف ذرا برابر بھی کمی زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔

(۱۰) ذخیرہ اندوزی کسی بھی حالت میں جائز نہیں۔

(۱۱) حرام اشیاء کی خرید وفروخت سے مکمل طور پر اجتناب۔

(۱۲) جھوٹی قسم سے اجتناب۔

(۱۳) کوئی ایسا معاملہ کرنا جو جھگڑے کا باعث ہو اس سے اجتناب۔

بہر حال اسلام نے قانون رسد وطلب کو تسلیم کیا مگر مطلق نہیں۔ تین طرح کی پابندیوں کے ساتھ:

(۱) خدائی پابندیاں، جیسے سود، قمار

(۲) عارضی حکومتی پابندیاں، جیسے کسی بیماری کے پھیلنے سے حکومت کا عارضی طور پر پابندی عائد کرنا۔

(۳) اخلاق پابندیاں یعنی اخلاق عمدہ ہونے چاہیے جیسے عورتوں کا نیم عریاں پھرنا، فحش تصاویر کا آویزاں کرنا وغیرہ وغیرہ۔

یہ اسلامی اصول ہے اتنے جامع اور دل بھاتے ہیں، پچھلے چند سالوں سے دنیا کے بڑے بڑے ماہر اقتصادیات جو غیر ہیں مگر اس بات کو سراہتے ہیں کہ دنیا میں غریبی کو ختم کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کے لیے اگر کوئی نظام موزوں ہو تو وہ اسلام کا نظام ہے یہ سودی نظام کو دنیا سے ختم کیا جاوے اور مضاربہ، مشارکہ والے قوانین نافذ کر دیے جائیں، ورنہ یہ سودی نظام ساری دنیا کو بھوک مری کے دہانے لا کر کھڑا کر چکا ہے، اب جب میں نے تفصیل کے ساتھ تینوں کو ذکر کر دیا ہے، تو آپ ہی فیصلہ فرمایئے کہ ہم مسلمان ہو کر اس پر کتنا عمل کرتے ہیں اور اغیار کے طریقوں کو کیوں نمونہ بنا کر چل رہے ہیں، یاد رکھو! رزق میں کمی زیادتی کرنا اللہ کے قبضِ قدرت میں ہے، لہٰذا اس کے منشا کے مطابق کام کیا جائے اور تجارت کی جائے تو کتنی خوش کن بات ہوگی کہ اللہ کی ذات راضی ہو جائے اور یہ ہمارا مقصد ہے۔

دعا فرمایئے کہ اللہ رب العزت ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، اور حرام خوری، سود خوری اور شیطانی راستہ سے ہماری پوری حفاظت فرمائے، اور دنیا و آخرت کی کامیابی سے ہم سب کو ہمکنار فرمائے۔

قرآن کریم کی عجیب شان

قرآن شریف کی عجیب شان ہے کہ اسے پڑھو تو اس سے بہتر وظیفہ کوئی نہیں، اس کا علم سیکھو تو اس سے بڑھ کر کوئی علم نہیں، اُسے دستورِ علم بناؤ تو اس سے بڑھ کر کوئی قانون نہیں، اگر اس کے حقائق کھولو تو اس سے بڑھ کر کوئی حکمتیں نہیں اور اس کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر لو تو اس سے بڑھ کر کوئی سکونِ قلب نہیں۔

(ملفوظ، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ، جواہر حکمت:53)

سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ بحران۔ اسباب اور حل

۱۵ رستمبر ۲۰۰۸ کو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا بدترین بحران سامنے آیا جب امریکہ کی دوسرے بڑے بینک لیہمن برادرز (Lehman Brothers) کا خسارہ نا قابل برداشت حدود کو پار کر گیا۔ نیویارک سٹاک ایکسچینج میں ایک شیئر کی قیمت ۸۰ ڈالر سے گر کر 1.65 پر آ گئی، یعنی اس بینک کے سرمایہ کی مالیت ۱۸۵ ڈالر سے گر کر صرف ۵۶۵ ارب ڈالر رہ گئی اور لیہمن برادرز کے ۳۰ ملکوں میں پھیلے ہوئے ۱۶۰۰۰ ملازمین کی نوکریاں خطرے میں پڑ گئیں۔ اسی دن امریکہ کی بین الاقوامی شہرت کے حامل انشورنس کمپنی AIG (امریکن انٹرنیشنل گروپ) کریش کر گئی اور اس نے اپنی بقا کے لیے امریکن حکومت سے ۸۵ ارب ڈالر کی رقم کا مطالبہ کر دیا۔ صورت حال اس قدر خطرناک ہو گئی کہ نیویارک اسٹاک ایکسچینج ایک ہی رات میں ۵۰۴ پوائنٹس سے گرا اور امریکی شیئر مارکیٹ ۲۰ گھنٹوں میں ۸ فیصد گر گئی۔ صرف ستمبر کے مہینے میں بینکوں کے ایک لاکھ ستر ہزار ملازمین اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں وال اسٹریٹ کے تیس ہزار ملازمین بھی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یورپین ممالک سے لے کر مشرق بعید تک پورا سرمایہ دارانہ نظام لڑکھڑا گیا۔ کمیونزم کے بعد کیپٹل ازم کا اقتصادی نظریہ و نظام ناکام ہو کر زمین بوس ہوتا نظر آیا۔ بش حکومت نے اپنے سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کے لیے لیہمن برادرز اور AIG کو کنٹرول میں لے لیا۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی رات میں ڈیڑھ کھرب کے خسارے کو امریکن حکومت کے منظور کردہ پیکج کے ۷۰۰ ارب ڈالر بچا نہیں سکتے تھے۔ ماہرین کے مطابق اس بحران سے دنیا میں چھ، سات کھرب (ٹریلین) ڈالر ڈوب سکتے ہیں، اور لاکھوں کروڑوں انسان اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی سے محروم ہو کر بھکاری بن سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۹۲۹ء میں امریکہ میں اسی طرح کا اقتصادی بحران آ چکا ہے جب سینکڑوں کی تعداد میں امریکن بینک دیوالیہ ہو گئے تھے، امریکی سٹاک مارکیٹ پوری طرح تباہ ہو کر بکھر گئی تھی اور ڈالر بے وقعت ہو گیا تھا۔ اس وقت کے امریکی صدر روزویلٹ نے اس وقت بھی امریکی عوام کی ٹیکس کی رقم سے سرمایہ کاری کر کے سرمایہ دارانہ نظام کی عمارت کو زمین بوس ہونے سے بچایا تھا۔ آج ٹھیک ۷۸ سال بعد یہ عمارت پھر دھڑام سے زمین پر آ رہی۔

موجودہ اقتصادی بحران کے اسباب

امریکہ کے اس بینکنگ بحران کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بینکوں نے سود کی لالچ میں لوگوں کو آسائش و خواہشات کی راہ پر ڈال دیا کہ آؤ، ہم سے قرضہ لے کر اپنی خواہشیں پوری کرو، اور ہمیں سود دو۔ مثلاً ایک امریکی بینک سے دو لاکھ ڈالر قرضہ لے کر مکان خریدتا ہے۔ دو سال بعد اسی بینک کا لیٹر ملتا ہے کہ اب تمہارے مکان کی قیمت (ویلیو) اڑھائی لاکھ ہو گئی ہے، اس لیے ہم سے مزید 50 ہزار ڈالر قرضہ لے کر نئی کار، نیا ٹی وی، نیا فرنیچر خرید سکتے ہو، چنانچہ وہ شخص بینک سے مزید 50 ہزار ڈالر قرض اٹھا کر نئی چیزیں خرید لیتا ہے۔ غرض بینکوں نے سود کی حرص و لالچ میں ایسے لوگوں کو

قرضہ دیا جن میں قرضہ لوٹانے کی طاقت نہیں تھی۔

اسے موجودہ بینکنگ کی اصطلاح میںN.I.N.J.A LAONS کہتے ہیں۔یعنی NO INCOME NO JOB, ONLY APPLICATION(نہ آمدنی، نہ کام،صرف درخواست کر کے قرضہ اٹھائے لوگ)۔

جب بینکوں سے قرضہ لینے والے لوگوں کی بھاری اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگئی جن کی پاس قرضہ کی ادائیگی کے لیے نہ آمدنی تھی نہ کام اور بینکوں نے محسوس کرلیا کہ ہمارے اکثر قرضے وصول نہیں ہوں گے تو انہوں نے امریکی حکومت کے سامنے اپنے ہاتھ اٹھا دیے کہ اگر تم نے مزید سرمایہ فراہم نہیں کیا تو ہمارے پاس مارکیٹ چھوڑ کر بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا۔امریکی حکومت خوب جانتی ہے کہ بینکوں یا زیادہ صحیح الفاظ میں بینکاروں (سرمایہ داروں) کی راہ فرار سے ملک میں ایسی ہاہا کار مچے گی کہ چند دن حکومت چلانا مشکل ہوجائے گا،اس لیے صدر بش نے بینکوں کو بچانے کے لیے 700 رارب ڈالر کا پیکیج کانگریس کے سامنے پیش کردیا۔پہلے مرحلے میں کانگریس نے اسے نامنظور کردیا۔نامنظور کرنے والوں میں اکثریت کا تعلق خود صدر بش کی حکمران ری پبلک پارٹی سے تھا۔یہی صحیح فیصلہ تھا کہ ۷۰۰ رارب ڈالر کی خطیر رقم سے بینکاروں کی جیبیں بھرنے کی بجائے اس سرمایہ سے نئی صنعتیں اور انڈسٹریاں لگا کر عوام کو روزگار فراہم کیا جاتا (کیوں کہ یہ 700 ارب ڈالر عوام ہی کے پیسے تھے)جو عوام کے ٹیکسوں سے وصول کیے جائیں گے)اس بحران کی دوسری اہم وجہ صدر بش کی احمقانہ جنگی پالیساں ہیں جو یہودی او راسرائیل بنکاروں کا آلہ کار بن کر دنیا بھر میں روا رکھی گئی ہیں۔صدر بش کے جنگی جنون نے امریکہ کا جنگی خسارہ ماہانہ 70 ارب ڈالر تک پہنچا دیا یعنی فی منٹ 112500 ڈالر۔ان احمقانہ جنگوں نے امریکی معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔صدر بش نے بینکوں کے لیے جتنی رقم (700 ارب ڈالر) کا پیکیج منظور کیا ہے،تقریباً اتنی ہی عوام کے ٹیکسوں کی رقم وہ دہشت گردی کے خلاف میں ضائع کرچکے ہیں۔اب پھر صدر بش نے عوام کے ٹیکس کے 700 ارب ڈالر سرمایہ داروں (بنکاروں) کی جیبوں میں ڈال دیے۔اس 700 ارب ڈالر کے پیکیج کے منظور ہوتے ہی امریکی بنکاروں نے ایسے جشن منائے کہ ایک رات لاکھوں ڈالر شباب پر اڑادیے اور اپنی تنخواہیں مزید بڑھالیں۔پہلے ہی ان کی تنخواہیں کئی کئی ملین ڈالر ہیں۔یہ ہے مختصر کہانی سرمایہ دارانہ نظام کے حالیہ بحران کی۔

مغربی ملکوں کی اقتصادی دہشت گردی

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے غیر سودی یا اسلامی بینک اس بحران سے پوری طرح محفوظ ہیں۔اگرچہ میرے نزدیک موجودہ اسلامی بینک سو فیصد اسلامی نہیں،البتہ اسلام کے مبارک اقتصادی نظام کی طرف ایک کوشش ضرور کہے جاسکتے ہیں۔اس عالمگیریت کے دور میں جب دنیا سکڑ کر ایک گاؤں بن گئی ہے،عالمی اقتصادی نظام پر مغربی سرمایہ داروں کا غلبہ و تسلط قائم ہے۔اس منحوس نظام سے پوری طرح آزاد ہوکر مکمل طور پر اسلامی معاشی نظام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پوری اسلامی دنیا ہمت کرکے ایک ساتھ اس مبارک غیر سودی نظام کو اپنا

نے کا فیصلہ نہ کرے۔اس بحران سے مغرب کی سرمایہ دارانہ دہشت گردی اور [illegible] ازبام ہوگئی۔وہ اس طرح کہ ایک طرف cat معاہدہ اور قومی مارکیٹ اکانومی کے مغرب نواز نظام کے ذریعہ مغرب کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ہر ملک میں گھس کر اپنا جال بچھانے،نفع کمانے،سرمایہ لوٹنے اور قوموں اور تہذیبوں کو نچوڑ کر کنگال بنانے کی پوری آزادی ہے۔اب جب کہ مغرب کی غلط پالیسیوں کی بدولت دنیا اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آئی تو ہم نے دیکھا امریکہ ،برطانیہ فرانس سمیت ہر ملک صرف اپنے ملک وقوم کو اس بحران سے بچانے کی فکر کر رہا ہے۔غریب لوگوں اور ملکوں کی جو تباہی مغرب کی غلط پالیسیوں کے سبب ہوئی ہے،ان کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا جا رہا بلکہ مغرب نے اس بحران میں سب سے پہلے عربوں اور مشرقی ممالک کے سرمایہ پر ہاتھ صاف کیا جنہوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام پر اعتماد کر کے گزشتہ نصف صدی سے اپنی تمام جمع پونجی امریکہ ویورپ کے بینکوں میں رکھ چھوڑی تھی،بہر حال دنیا کے اقتصادی ماہرین اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ امریکی صدر بش نے 700 ارب ڈالر کا پیکیج منظور کر کے اپنے (سرمایہ دارانہ) نظام کو بچانے کی کوشش کی،اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کوما (COMA) کے مریض کی مشین کے ذریعے سانسیں جاری رکھی جائیں،یہ محض وقتی حیلہ ہے،ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ٹوٹ کر بکھرنے کے قریب پہنچ چکا ہے،کاش ہم مسلمان اس قابل ہوتے کہ دنیا کو بتا سکتے کہ انسانیت کو تباہی سے بچانے کا نسخہ ہمارے پاس ہے،اسلامی نظام (اقتصادی) پہلے بھی تقریباً ایک ہزار سال تک بین الاقوامی طور پر دنیا کے بڑے حصہ (ایشیاء،افریقہ ،یورپ) پر نہایت کامیابی سے چلا ہے،اور اس طویل عرصہ میں نہ اس طرح کا کوئی معاشی بحران آیا،نہ اس طرح کی کمر توڑ مہنگائی آئی۔آج کی مجلس میں ہم دونوں اقتصادی نظاموں (اسلامی ومغربی) کا موازنہ وتجزیہ کریں۔

اسلامی اقتصادی نظام کی بنیادیں

جس طرح انسانی حیات کے لیے اس کی رگوں میں خون کی گردش ضروری ہے،اسی طرح نظام کائنات کی حیات مال کی صحیح گردش پر موقوف ہے جو تجارت اور اقتصادی نظام کے ذریعہ وجود میں آتی ہے،اور جس طرح خون کا جسم کے کسی حصہ میں جمع ہو جانا اور دوسرے حصوں تک نہ پہنچ پانا جسم کی موت ہے،اسی طرح سرمایہ اور دولت کا چند ہاتھوں میں جمع ہو کر رہ جانا نظام کائنات کی تباہی ہے،اسلام کے اقتصادی نظام کی بنیاد قرآن کی زبان میں ''کی لا تکون دولۃ بین الاغنیاء منکم'' ہے،تا کہ دولت وسرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز (جمع) نہ ہو جائے۔اسلام کے اقتصادی نظام کی بنیاد زکوۃ وصدقات،عشر وخراج پر ہے یعنی زراعت،باغات اور زمین کی پیداوار میں غریب عوام کا حق۔اگر زمین بارش سے سیراب ہو رہی ہو تو دسواں حصہ اور اگر کسان نے خود مشقت کر کے زمین کو پانی دیا تو بیسواں حصہ۔اسی طرح اسلام نے وراثت کی تقسیم کے ایسے جامع اور پر حکمت احکامات دیے کہ اگر ساری دنیا کی دولت بھی کوئی فرد اکٹھی کر لے تو چند پشتوں میں وہ ساری دولت وراثت کے احکامات کے ذریعہ معاشرہ میں پھیل جائے گی۔غرض ہر وہ چیز جس سے مال وسرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتا ہے،اسے اسلام نے ممنوع وحرام قرار دیا جیسے سود،ذخیرہ اندوزی،جوا وغیرہ

وغیرہ۔اسلام پورے اقتصادی نظام کا مقصد تو اہل ثروت سے مال لے کر بے وسائل غرباء تک پہنچانا ہے، اسلام انسانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ یہی ہمدردی، اخوت، تعاون، مواساۃ کا معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔یاد رہے کہ قرآن کا اقتصادی نظریہ حلال طریقے سے افزائش دولت Production کے ساتھ ساتھ تقسیم دولت Dustribution ہے۔یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلامی معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظاموں سے ممتاز کرتا ہے۔دنیا کے تقریباً تمام ہی معاشی نظام افلاطون کی یوٹوپیائی نظام سے لے کر موجود دور کے مارکسی نظام معیشت یا مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام تک سب کا مقصد زیادہ سے زیادہ حصول دولت اور ارتکاز سرمایہ ہی ہے۔یہ سب معاشی نظام حصول دولت کے لیے معاشرے کو تباہ کرنے والے اور نقصان پہنچانے والے ذرائع کے اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتے۔جب دنیا میں کوئی قرآن کا پیش کردہ اقتصادی نظام ہوا تو چند سالوں کے اندر ایسی خوش حالی کا دور دورہ ہوا کہ مملکت اسلامی کے کسی شہر میں کوئی زکوۃ لینے والا نہیں ملتا تھا غور کیا جائے تو اسلام کی اصل بنیاد دو ہی چیزیں ہیں۔اولاً خدائے واحد کی عبادت کا قیام او ردوسرا انسانیت کو سود کی لعنت سے نجات دلانا۔سود اتنی بڑی لعنت و برائی ہے کہ اسلام نے سود کے مسئلہ پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا تو اس میں صراحت کی گئی تھی کہ سودی کاروبار کی صورت میں یہ معاہدہ کالعدم سمجھا جائے گا۔اسی طرح اگر کوئی کسی مسلمان کو قتل کردے یا مسلمانوں کے خلاف سازش کرے، جاسوسی کرے تو سزائے موت صرف اس فرد کو ملے گی، من حیث القوم انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔مگر سودی لین دین پر پوری قوم کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ختم ہوجائے گا۔اسی طرح خلفائے راشدین کے عہد زرین میں دنیا بھر کی اقوام مذاہب وتہذیبوں سے جو معاہدے ہوئے، ان تمام میں واضح طور یہ شق تھی کہ اگر تم نے سودی لین دین کیا تو ہم سے معاہدہ ختم ہوجائے گا۔سود اس درجہ کی برائی، شر اور لعنت ہے۔جو کسی حالت میں برداشت نہیں کی جاسکتی۔سود واحد جرم ہے جس کو قرآن نے اللہ اور رسول کے ساتھ کھلا اعلان جنگ کہا ہے۔افسوس آج مسلم ممالک کے ہر چوراہے اور ہر سڑک پر اللہ اور رسول کے ساتھ اعلان جنگ قبول ومنظور کرنے کا اظہار سودی بینکوں کے شکل میں کر رکھا ہے۔یہ بات پورے یقین ووثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر آج بھی مسلمان قرآن کے اصولوں پر صرف مالیاتی نظام لے آئیں تو مغرب کی بالادستی وغلبہ سے نجات پاجائیں۔

سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کی خرابیاں

اسلام کے اقتصادی نظام کے مقابلے میں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو بیسویں صدی کے اوائل سے دنیا بھر میں غالب ومروج ہے۔اس سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد سود ہے، ذخیرہ اندوزی اور جوا (سٹہ) ہے۔اس نظام کے ثمرات ونتائج یہ ہیں کہ دنیا بھر میں امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہوتا جارہا ہے پوری دنیا کا سرمایہ ووسائل چند مٹھی بھر ہاتھوں میں منتقل ہورہا ہے۔اس وقت پوری دنیا کا ۸۰ فی صد سے زائد سرمایہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ملکیت بن چکا ہے تقریباً دنیا کے ہر ملک میں سرمایہ ووسائل چند لوگوں کے ہاتھ میں سمٹ گئے ہیں۔مثلاً بھارت کی آبادی ایک ارب

کے قریب ہے۔وہاں ۸۰ کروڑ انسانوں کے پاس جتنا سرمایہ ہے، اتنا بھارت کے چار ہزار سرمایہ داروں کے پاس ہے۔پاکستان کے ۱۴ کروڑ لوگوں کے پاس جتنا سرمایہ ہے،اس کا بڑا حصہ چند لوگوں کے پاس ہے۔دنیا میں تیزی سے دو طبقات وجود میں آئے ہیں: (۱)انتہائی امیر (۲)انتہائی غریب

متوسط طبقہ تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ مغرب کی ذہنی غلامی میں پوری دنیا مغرب کے قرون وسطیٰ کے تاریک دور کی طرف بڑھ رہی ہے، جب یورپ میں لارڈ اور جاگیردار یا ان کے غلام تھے،حتیٰ کہ دنیا بھر کی حکومتیں بشمول امریکہ و یورپ کے مٹھی بھر سرمایہ داروں کی غلام بن چکی ہیں۔آج جمہوریت کی تعریف یہ نہیں رہی کہ حکومت عوام کے ذریعہ مفاد کے لیے بل کہ آج جمہوریت کا مطلب ہے سرمایہ داروں کی حکومت،سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کے ذریعے،سرمایہ داروں کے مفاد کے لیے۔اس غیر فطری اور انسان دشمن اقتصادی نظام نے پوری دنیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا کیسے ہوئی؟

مغرب کے اس سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جو لوگ سونے چاندی کا کاروبار کرتے تھے یعنی سنار،وہ اپنے سونے کی حفاظت کے لیے مضبوط و مستحکم مکان و تجوریاں بنواتے تھے۔عام لوگ بھی اپنی بچت کا سونا حفاظت کے لیے ان کے پاس جمع کرتے۔یہ سنار حفاظت کرنے کی مخصوص رقم لیتے ،اور لوگوں کو رسید لکھ دیتے کہ اس شخص کا اتنا سونا ہمارے پاس جمع ہے۔اب وہ شخص اس رسید مکان، زمین یا کوئی چیز خریدتا یا اپنا قرضہ ادا کرتا اس طرح چالاک سناروں نے اندازہ لگایا کہ لوگ جمع شدہ سونے کا دسواں حصہ خرچ کرتے ہیں اور نو حصے ان کے پاس جمع رکھتے ہیں۔انہوں نے حرص،لالچ اور بد دیانتی سے لوگوں کے امانت رکھے ہوئے سونے کے بدلے نو الگ الگ رسیدیں جاری کرنی شروع کردیں،یعنی نہ سناروں کے پاس سونا موجود نہ لوٹانے کی طاقت محض لوگوں کے اعتبار پر ان کا کاروبار چلتا رہا،اور یہودی سناروں کا سرمایہ بڑھتا رہا۔جب یورپ میں موجودہ بینکنگ کا نظام شروع ہوا تو چوں کہ سارا سرمایہ ان کی تجوریوں میں تھا اس لیے بینکوں پر خود بخود ان کا قبضہ ہوگیا۔عوام کے پاس جو تھوڑی بہت بچت تھی،اس پر قبضہ کرنے کے لیے ان چالاک سناروں نے لوگوں کو دوسرا جھانسا دیا کہ اگر تم خود کاروبار کروگے تو سرمایہ ڈوب بھی سکتا ہے،اس لیے نقصان کے غم میں گھلنے کے بجائے اپنی رقم ہمیں دے دو،ہم تمہیں ہر ماہ ہر سال ایک مقرر (FIXED) منافع دیتے جائیں گے۔اس طرح عام لوگوں کا بچا ہوا روپیہ بھی ان کے قبضے میں آگیا۔اب یہ سنار، بینکار بن کر پورے یورپ کے آقا و مالک بن بیٹھے۔ان سناروں کی بھاری اکثریت نسلاً یہودی تھی۔یہودیوں کی سود خوری کی تاریخ ضرب المثل رہی ہے۔جس پر تمام آسمانی کتب شاہد ہیں،حتیٰ کہ انہوں نے سونے کے بچھڑے کی پوجا اپنے نبی حضرت موسیٰ کی موجودگی ہی میں شروع کردی تھی۔ظہور اسلام کے وقت مدینہ اور عرب کے تمام قبائل یہودیوں کے سود کے جال میں جکڑے ہوئے تھے اور تمام تجارت و بازوں پر ان کا قبضہ تھا۔یاد رہے کہ سود خوری،خود غرضی،ظلم،استحصال اور لوٹ کھسوٹ

کاذہن پیدا کرتی ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ سود خور کی حرص ولالچ اور حرام خوری لازمی علامات کی بدولت قمار بازی (سٹہ) کی لت پڑ رہی ہے۔آج دنیا کے سٹاک ایکسچینجز کی تقریباً سترفی صد رولنگ (سرمایہ کی گردش) سٹہ یعنی جوئے پر ہورہی ہے۔سود کینہ وحسد پیدا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں فساد اور جنگیں چھڑتی ہیں۔سود خور جنگیں بھڑکا کر عوام اور قیدیوں کو غلام بناتے ہیں۔مثلاً پہلی جنگ عظیم کے وقت برطانیہ پر اور دوسری جنگ عظیم تک امریکہ پر کوئی قرضہ نہیں تھا۔ان یہودی بینکاروں نے جنگ کی آگ بھڑکا کر مختلف حیلوں سے برطانیہ اور امریکہ مل کہ پورے یورپ کو جنگ میں الجھا کر اپنا مقروض وتابعدار بنالیا۔ان ہی خونخوار بینکاروں نے موجودہ بینکنگ کا بحران پیدا کرکے ایک بار پھر عوام کے ٹیکسوں سے 700 ارب ڈالر ہڑپ کر لیے۔یہ مکار بینکار پوری بات دنیا کو کبھی نہیں بتاتے۔مثلاً: یہ تو سب جانتے ہیں کہ پاکستان پر ۴۲ ارب ڈالر قرضہ ہے، برطانیہ وفرانس پر ہزاروں ارب ڈالر اور امریکہ پر تقریباً دس کھرب (ٹریلین) ڈالر مگر یہ حقیقت دنیا کے سامنے کبھی نہیں آئی کہ یہ قرض کن درندوں کا ہے۔ان بنکاروں کی بھیانک شکل کبھی سامنے نہیں لائی جائے گی۔واشنگٹن ڈی سی میں روڈ کی ایک طرف ورلڈ بینک کا دفتر ہے اور دوسری طرف IMF کا۔ایک دنیا بھر کے ملکوں کو قرضہ دیتا ہے، دوسرا وصول کرتا ہے۔ان دونوں کے اصل مالکوں کا نام زبان پر لانے کی جرأت نہ صدر بش میں ہے نہ برطانیہ کے گورڈن براون میں۔ان سب حکمرانوں کی حیثیت یہودی بینکاروں کے زر خرید کنیز و باندی سے زیادہ نہیں۔شاید اس لیے کہ ایک یہودی اسکالر سمویئل ھننگٹن نے کلیس آف سولائزیشن کا نظریہ پیش کیا تا کہ مغربی تہذیب کے خاتمہ کو تہذیبوں کا تصادم بنا کر مسلمانوں کے سر منڈھ دے اور تباہی پھیلانے والے درندوں کو صاف بچا لے جائے۔ہماری بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے جتنے معاشیات واقتصادیات ماہرین ہیں، وہ ذہنی طور پر اس قدر غلام ہیں کہ مغرب نے انہیں معاشیات کا جو سبق رٹا دیا، اس سے آگے سوچ نہیں سکتے۔حقیقت یہ ہے کہ مسلم ممالک کے وزرائے خزانہ یا مشیر خزانہ جب اپنے ملکوں کی اقتصادی منصوبہ کرتے ہیں تو ان کے سامنے اپنے ملکوں سے زیادہ مغرب کا مفاد ہوتا ہے۔پاکستان کی سابق وزرائے اعظم ہوں یا آج کے حکومتی ذمہ داران، یہ سب لوگ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ایجنٹ ہیں۔ان کی اصل ڈیوٹی ان اداروں کے بروقت سود کی ادائیگی کے لیے کام کرنا ہے۔اربوں میں سود لیتے ہیں اور کھربوں میں سودا کرتے ہیں۔

یہ سب لوگ اسی کی تنخواہ پاتے ہیں بالآخر ان لوگوں نے دوبارہ پاکستان کو IMF کے جال میں پھنسا دیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا انجام مکمل تباہی ہے

آج سود کے منحوس نظام کے بدولت دنیا کی ۹۰ فیصد عوام کا جینا دوبھر ہو چکا ہے۔سود اور مہنگائی کا لازم ملزوم ہے۔جب سے اس منحوس نظام نے دنیا پر اپنے خونی پنجے گاڑ رہے ہیں، روز مہنگائی بڑھ رہی ہے۔مہنگائی بڑھانے کے جنون کا حال یہ ہے کہ امریکہ ہر سال اپنے کسانوں کو ۱۲ ارب ڈالر اس لیے دیتا ہے کہ وہ مہنگائی بڑھانے کے لیے زرعی پیداوار میں کمی کریں۔ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فالتو رقم امریکہ کے پاس بھی نہیں ہوتی چنانچہ انہیں خونخوار بینکوں سے سود پر

قرض لے کر رقم کسانوں کو دی جاتی ہے۔یہ شقاوت و بد بختی کی نہایت عبرت ناک ہے۔قرآن نے تقریباً چودہ سو سال پہلے یہ حقیقت انسانوں کے سامنے واشگاف طور پر بیان کی تھی اور پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا کہ سود کا مال کتنا ہی بڑھ جائے ،اس کا انجام افلاس و تباہی ہے ۔معاشیات کی پوری اس پر شاہد ہے کہ سودی معیشت جب کساد بازی کا شکار ہوتی ہے تو انسانیت ایسے ہولناک انجام سے دو چار ہوتا ہے کہ ایک لمحہ میں کروڑوں انسانوں کی جمع پونجی ڈوب جاتی ہے ۔آج دنیا کا کوئی ماہر معاشیات ایسا نہیں جس نے معاشرہ پر سود کے مہلک و منفی اثرات کو تسلیم نہ کیا ہو اور موجودہ دور کے تمام ماہرین معاشیات و اقتصادیات خواہ وہ امریکہ و یوروپ کے ہوں یا روس و جاپان کے ،اس بات پر متفق ہیں کہ سودی نظام بہت جلد پوری دنیا کو تباہ کر دے گا ۔بہت جلد دنیا بھر کے تمام سرمایہ و وسائل کے مالک مٹھی بھر بنکار بن جائیں گے تو اس دنیا کے سات ارب انسانوں کے اندر رجور دعمل ہوگا ،ایسی بھیانک تباہی آئے گی ،کروڑوں اربوں کا خون بہے گا ،یا ماہرین اقتصادیات اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے ہیں ۔

تباہی سے بچنے کا واحد راستہ

موجودہ دور کے تمام ماہرین معاشیات اس نکتہ پر متفق ہیں کہ اقتصادی تباہی سے دنیا کو بچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ سود کو ختم کیا جائے ۔سود کی شرح کو گھٹاتے گھٹاتے صفر کی حد پر لایا جائے یا سود کی شرح صرف اتنی رکھی جائے کہ نظام چلانے کے اخراجات نکل سکیں تقریباً ایک ڈیڑھ فی صد ۔چناں چہ گزشتہ ۸ سال سے یورپی اقتصادی کونسل نے شرح سود ساڑھے تین فی صد برقرار رکھی ہے اور یہاں کے ماہرین معاشیات کا کہنا ہے کہ اسے تدریجاً کم کرتے صفر یا ایک فیصد کر دیا جائے ،مگر یہاں کے خونخوار بنکار جن کی بھاری اکثریت صہیونیوں پر مشتمل ہے اور جو سودی نظام کی بدولت پوری دنیاں کے آقا بنے ہوئے ہیں وہ اس انسانیت دشمن منحوس نظام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ سود کی بدولت ان کا ایک ایک فرد اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ درجنوں ملکوں سے زیادہ دولت سرمایہ ایک ایک کے پاس جمع ہوگئی ہے جیسے جورج سوروس Jeorge Soros اور روشیلڈ Rothchild وغیرہ ۔ایسا ایک شخص برطانیہ اور فرانس جیسی مضبوط معیشت کو بھی ایک رات میں تباہ کر سکتا ہے ۔جورج سوروس نے ۸۰ کی دہائی میں مشرق بعید (انڈونیشیا ،ملائیشیا ، ہانگ کانگ)وغیرہ کی معیشت ایک رات میں تباہ کی تھی ۔

مغرب کے سیاسی و معاشی نظاموں کی ناکامی

مغرب آج تک اپنے جس سیاسی نظام (ڈیموکریسی)اور معاشی نظام (فری مارکیٹ اکانومی)پر فخر کرتا تھا اور ساری دنیا کو اپنی پیروی کی دعوت دیتا تھا موجودہ بحران نے اس پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے ۔برطانیہ کے مشہور اخبار ڈیلی گارڈین نے کیا خوب تبصرہ کیا ہے آج تک کہا جاتا تھا کہ جمہوریت وفری مارکیٹ توام (جڑواں بہنیں)ہیں لیکن اس بحران نے ثابت کر دیا ہے کہ آزاد معیشت کے ساتھ نہیں چل سکتی ۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ و یورپ کی حکومتیں بنکوں کو نیشلائز کر رہی ہیں حتیٰ کہ مغربی میڈیا صدر بش کو کامریڈ بش اور USSAR یعنی یونائیٹڈ سوشلسٹ سیٹ ری پبلک

آف امریکہ کہہ رہے ہیں۔ مغرب کو اپنا حشر روس کی طرح نظر آنے لگا ہے۔ کہاوت ہے کہ "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"۔ جب حرام خوری کی لت پڑ جائے تو حلال میں مزہ نہیں آتا۔ اس لیے مغرب قرآن کی پیش کردہ یقینی فلاح وکامیابی اور انسانی بہبود کے معاشی نظام کے بجائے دوبارہ سوشلسٹ کی گلی سڑی لاش کی طرف متوجہ ہو رہا ہے اور بنکوں کو نیشلائز کر رہا ہے۔ یہ تجربہ ایشیا میں پوری طرح ناکام ہو چکا ہے۔

موجودہ دور کے تمام ماہرین اقتصادیات صدیوں کی ریسرچ وتحقیقات اور تجربات کے بعد جس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ اقتصادی تباہی کا واحد سبب سودی نظام ہے قرآن نے اس حقیقت کو ۱۴۰۰ سال پہلے انسانیت کے سامنے آشکارہ کر دیا دیا تھا اور انسانیت کے بہبود کے لیے پیغمبر اسلام نے ایسا معاشی نظام قائم کر دیا تھا جس سے انسانیت تقریباً ہزار سال تک مستفید ہوتی رہی۔ مغرب کے متعدد بینک قرآن کے اس غیر سودی معاشی نظام کو اپنا رہے ہیں اور دن بدن غیر سودی معیشت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا کہ امت مسلمہ اور مسلم ممالک قرآن کے معاشی نظام پر لبیک کہیں اور انسانیت کی رہنمائی کریں؟ حقیقت بالآخر خود کو منوا کر رہتی ہے۔ آج نہیں تو کل دنیا کو قرآن کے پیش کردہ معاشی نظام کی طرف آنا ہی ہوگا، کیوں کہ اس کے سوا تباہی سے بچنے کا کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

"دھو آیا ہوں"

یادِ آقا میں دن رات رو، آیا ہوں
کچھ تو دامن میں موتی سمو، لایا ہوں

تاکہ لکھا کروں نعتِ ختمِ رُسُل
اپنا کوثر میں خامہ ڈبو، لایا ہوں

قبر میں تاکہ حاصل ہو چین و سکوں
کوچۂ پاک میں جاکے سو، آیا ہوں

لوگ کہتے تھے مجھ کو غلامِ نبی
اس غلامی سے مشہور ہو، آیا ہوں

قافلے والو! تم رک کے ڈھونڈو ذرا
دل مدینے کی گلیوں میں کھو، آیا ہوں

سیرِ فردوس کو اب تو جاؤں گا میں
روضۂ پاک سے پہلے ہو، آیا ہوں

تاکہ میں لے سکوں نامِ نامیؔ ولیؔ
مشک و عنبر سے منہ اپنا دھو، آیا ہوں

یہ نعت پاک، بتاریخ ۵ رذوالحجہ ۱۴۲۹ھ مطابق ۳ دسمبر ۲۰۰۸ء بروز بدھ بوقت بعد ۸ بج کر ۲۵ منٹ رات مدینے سے مکے کی طرف آتے ہوئے بس میں کہی گئی۔ (ولی بستوی)

آرزوئے قیامِ مدینہ

ولی اللہ ولیؔ قاسمی بستوی
جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر

(مدینہ سے روانگی کے دن)

مرے آقا! پڑوسی تیرا بن کر ہی، رہا ہوتا
سگِ در کی طرح گلیوں میں پھر کر ہی، رہا ہوتا

ترے روضے کو ہر دم دیکھتا، تسکین، دل پاتا
تری چوکھٹ کی لکڑی کاش بن کر ہی، رہا ہوتا

لگاتا پھیرے صبح و شام میں شہرِ مدینہ میں
گدا تیرے درِ عالی کا بن کر ہی، رہا ہوتا

تری بزمِ وفا میں دل جلے عاشق کی صورت میں
ترانے تیری الفت کے میں گا کر ہی، رہا ہوتا

کڑکتی بن کے بجلی یاد تیری میرے سینے میں
محبت کی جگر پر چوٹ کھا کر ہی، رہا ہوتا

چلا آتا پتنگوں کی طرح میں شمعِ زیبا پر
دلِ بے خود کو پروانہ بنا کر ہی، رہا ہوتا

مثالِ حضرتِ حسان بن ثابت مرے آقا!
تمہاری نعت کے نغمے سنا کر ہی، رہا ہوتا

میں ہوتا چاکِ دل، چاکِ گریباں، چاکِ داماں بھی
ملنگ و مجنوں کی صورت بنا کر ہی، رہا ہوتا

سلگتی ہے وہ جس میں عشق کی ہر آن چنگاری
میں سینے کو وہی بھٹی بنا کر ہی، رہا ہوتا

لگاتا سات پھیرے، منزلِ عشق و محبت کے
ترے دربار میں دیوانہ بن کر ہی، رہا ہوتا

تری فرقت میں رہ کر جو مسلسل زخم کھائے ہیں
تمہیں وہ دل کا آئینہ دکھا کر ہی، رہا ہوتا

جو ہوتے بال و پر تو میں یہیں اُڑتا پھرا کرتا
ترے گنبد پہ میں بن کے کبوتر ہی، رہا ہوتا

مُواجَہ کی طرف سے صلِّ سلِّم گنگناتا میں
ترے روضے کی جالی کو میں چھو کر ہی، رہا ہوتا

”ولیؔ“ کی ہے تمنا کہ سدا رہتا مدینے میں
نہ زندہ رہ سکا تو کاش مر کر ہی، رہا ہوتا

یہ نعتِ پاک، بتاریخ ۵/ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ مطابق ۳/دسمبر ۲۰۰۸ء بروز بدھ بوقت بعد نماز فجر ۶/بجے بمقام مسجد نبوی شریف، صفۂ اصحاب کے پاس روضۂ اطہر شریف کے رُوبرو کہی گئی۔ (ولیؔ بستوی)

(رباعیات)

نذرانۂ شاہراہِ علم

"نتیجۂ فکر"
ولی اللہ ولی قاسمی بستوی
جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر

برائے سہ ماہی مجلہ "شاہراہِ علم" طلبۂ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

گوہرِ علم وہنر ہے شاہراہِ علم و فن — اہلِ حق کی رہگذر ہے شاہراہِ علم و فن
موہ لیتا ہے دلوں کو خوب بھاتا ہے ہمیں — سرمۂ اہلِ نظر ہے شاہراہِ علم و فن

اس سے تابندہ، ہوئی ہے علم وفن کی شاہراہ — اس سے رخشندہ ہوئی ہے علم وفن کی شاہراہ
صفحۂ اردو ادب پر چھوڑے ہیں گہرے نقوش — جس سے پائندہ ہوئی ہے علم وفن کی شاہراہ

شاہراہِ علم وفن ہے طالبوں کے واسطے — تختۂ مشقِ سخن ہے طالبوں کے واسطے
اک متاعِ علم ہے یہ پُربہار و خوش نظر — کاشفِ رنج ومحن ہے طالبوں کے واسطے

اس سے روشن ہوگئی ہے شاہراہِ علمِ دیں — ظلمتِ کفر و ضلالت میں ہے یہ شمعِ یقیں
شوق مندوں کے لیے ہے اک عروسِ دلربا — رہروانِ شامِ غم کے واسطے صبحِ حسیں

شاہراہِ علم وفن ہے علم کی سوغات ہے — گلشنِ علم و ہنر پر نور کی برسات ہے
جس کے مجنوں ہیں ہزاروں ہے وہ لیلائے ادب — جس میں تارے ہیں درخشاں وہ منوررات ہے

اک منور شاہراہِ علم و فن دنیا میں ہے　　　　جاذبِ قلب و نظر، حسنِ چمن دنیا میں ہے

اک نشانِ راہِ منزل، مشعلِ راہِ حیات ہے　　　　بیش قیمت، خوشنما دُرِّ عدن، دنیا میں ہے

اے "ولی" یہ شاہراہِ علم و فن ہے شاندار　　　　ہے یہ سہ ماہی مجلہ دیدہ زیب و جاندار

جس کی تیراکی، کی خاطر اک زمانہ چاہیے　　　　ہے وہی علم و ادب کا بحرِ ناپیدا کنار

جسٹس حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے تاثر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی! اما بعد!

مجلہ "**شاهراه علم**" کا "**فقه المناسبات**" نمبر نظر نواز ہوا، مصروفیت کی بنا پر پورا دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا، البتہ سرسری طور پر دیکھا، ماشاء اللہ خوب ہے، مختلف مناسبات سے متعلق شرعی احکام و ہدایات کو سلیقے کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ اللہ اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور مسلمانوں کے لیے نافع بنائیں۔ آمین!　　　　والسلام

بندہ

تقی عثمانی

۲۹/۸/۲۹ھ